Jamal-ul-Quran

جمال القرآن

تشریح و توضیحات

سورۃ الفاتحہ و پارہ عم

علم جدید کی روشنی میں

شارح

محمد عبدالغفار (ایم اے انگلش)

پرنسپل جامع العلوم کنی پورہ

خطیب جامع مسجد بیت النور قاضی باغ، باغ مہتاب سرینگر

نظر ثانی:

فہیمؔ محمد رمضان

بی ایس سی، ایم اے اردو، فاضلِ دینیات، ایم فل اسلامیات و اقبالیات

جملہ حقوق بحق مؤلف محفوظ ہیں

نام کتاب: جمال القرآن

نوعیت: حاصل مطالعہ و مزید توضیحات

مؤلف: محمد عبدالغفار

نظرثانی: فہیم محمد رمضان، فاضل دینیات

ناشر:

اشاعت اوّل: ۱۴۴۳ھ / 2022ء

صفحات: 665

تعداد:

ہدیہ:

فہرست

نمبر شمار

سورہ

صفحہ

انتساب

پیش لفظ

دیباچہ

مقدمہ

۱۔ سورۃ الفاتحہ

پارہ عم ایک نظر میں

۷۸۔ سورۃ النَّبَا

۷۹۔ سورۃ النّٰزِعٰتِ

۱۱۱

۸۰۔ سورۃ عَبَسَ

۱۴۵

٨١۔ سورۃ التَّكْوِيْرِ

١٧٠

٨٢۔ سورۃ الْاِنْفِطَارِ

١٩٣

٨٣۔ سورۃ الْمُطَفِّفِيْنَ

٢٠٩

٨٤۔ سورۃ الْاِنْشِقَاقِ

٢٢٩

٨٥۔ سورۃ الْبُرُوْجِ

٢٤١

٨٦۔ سورۃ الطَّارِقِ

٢٥٧

٨٧۔ سورۃ الأعلیٰ

٢٦٩

٨٨۔ سورۃ الغاشیۃ

٢٨٥

٨٩۔ سورۃ الفجر

٢٩٩

٩٠۔ سورۃ البلد

٣٢٥

٩١۔ سورۃ الشمس

٣٤٩

٩٢۔ سورۃ اللیل

٣٦٥

٩٣۔ سورۃ الضُّحٰی

٣٨١

٩٤۔ سورۃ اَلۡنَشۡرَح

٣٩٥

٩٥۔ سورۃ التِّیۡنِ

٤٠٩

٩٦۔ سورۃ اَلۡعَلَقِ

٤٢١

٩٧۔ سورۃ اَلۡقَدۡرِ

٤٣٩

٩٨۔ سورۃ اَلۡبَیِّنَۃِ

٤٤٥

۹۹۔ سورۃ الزِّلزَال

۴۶۱

۱۰۰۔ سورۃ العٰدِیٰت

۴۷۳

۱۰۱۔ سورۃ القَارِعَۃ

۴۸۳

۱۰۲۔ سورۃ التَّکَاثُر

۴۸۹

۱۰۳۔ سورۃ العَصر

۴۹۷

۱۰۴۔ سورۃ الھُمَزَۃ

۵۰۷

١٠٥۔ سورۃ الفیل

٥١٣

١٠٦۔ سورۃ القریش

٥٢٥

١٠٧۔ سورۃ الماعون

٥٣٣

١٠٨۔ سورۃ الکوثر

٥٤٥

١٠٩۔ سورۃ الکفرون

٥٥٣

١١٠۔ سورۃ النصر

٥٧٣

۱۱۱۔ سورۃ اللّھَبِ

۵۸۳

۱۱۲۔ سورۃ الْاِخْلَاصِ

۵۹۷

معوذتَین

۶۲۳

۱۱۳۔ سورۃ الْفَلَق

۶۳۹

۱۱۴۔ سورہ النَّاسِ

۶۵۳

انتساب

میں اپنی اس قرآنی خدمت کو صاحبِ قرآن، اُمّی لقب پیغمبرِ اعظم و آخر حضرت محمدّ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام مُعَنوَن کرتے ہوئے دعا گو ہوں کہ ربِّ محمدّ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں قبولیت

پائے۔ آمین

بندہ عاجز

محمد عبدالغفار

پیش لفظ

انسانوں پر اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ قرآن مجید کے ترجموں اور تفسیروں کی کوئی کمی نہیں۔ اس سلسلے میں آج تک جو کام ہوچکا ہے اس سے محسوس ہوتا ہے کہ اب کسی اور تفسیر کی ضرورت نہیں لیکن اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ قرآن پاک کی تفسیر کا سلسلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے ہی شروع ہوا ہے اور آج تک بفضل اللہ تعالیٰ جاری ہے اور اب تک مختلف زبانوں میں بہت ساری تفسیریں لکھی گئی ہیں۔ چنانچہ ہر دور میں انسان کے علم میں ترقی ہوتی رہی، نئی نئی باتیں سامنے آتی رہیں اور نئے نئے فلسفے پیش کیے جاتے رہے۔ نئی نئی ایجادات سے انسانی زندگی میں انقلابات آتے رہے یہاں تک کہ زندگی تبدیلیوں کے بام عروج پر پہنچ گئی۔

اللہ کی کتاب پچھلی پندرہ صدیوں سے ان انقلابوں سے گزر کر کامیابی کے ساتھ حالات کا مقابلہ کررہی ہے اٹھارہویں صدی سے سائنس اور ٹیکنالوجی کا جو انقلاب رونما ہوا دنیا کے بڑے بڑے مذاہب اس کا مقابلہ نہ کرسکے اس لئے مذہبوں کی بالادستی کو یا تو ختم کردیا گیا یا ان کو انسانوں کے علم کے ماتحت کرکے سیکولرزم یعنی لادین سیاست کے تابع ہوکر جامدیت کا شکار ہونا پڑا۔ لیکن اللہ کی کتاب کو یہ اعجاز حاصل ہے کہ یہ دور جدید کے علوم کا اچھی طرح سے مقابلہ کررہی ہے اور اپنی افادیت اور اہمیت کو برقرار رکھے ہوئی ہے۔ ترمذی کی حدیث ہے لاَیَنْقَضِیْ عَجَائِبَہٗ یعنی اس (کتاب) کے عجائب ختم نہ ہوں گے اس لئے ہر تفسیر میں وقت کے ساتھ ساتھ نئے نئے نکات اور نئے نئے گوشے سامنے آتے رہتے ہیں اور ہر نئی تفسیر اپنی پیش رو تفسیر وسے مختلف ہوتی ہے اس حقیقت کے پیش نظر اگر کوئی نئی تفسیر شائع کردی جائے تو وہ محض برکت و سعادت کی خاطر نہیں بلکہ کوئی ایسی کمی پوری کرنے کے لئے لکھی جاتی ہے جو پچھلی تفاسیر میں رہ گئی ہو یا قرآن کے مطالعہ کرنے والوں کی کسی ایسی ضرورت کو پورا کررہی ہو جس کے وہ خواہاں ہوں۔ عصرِحاضر میں خاص طور سے نوجوانوں کے اس انتشار کو دور کرنے کی اشد ضرورت ہے، جس کی وجہ سے وہ سائنس اور فلسفہ کے علوم سے متاثر ہوکر الجھنوں میں پڑے ہوئے ہیں اور ان کے سروں پر دین سے انحراف کے خطرات منڈلاتے رہے ہیں۔

اس احساس کے پیش نظر پارہ عم کو علم جدید کی روشنی میں تشریح و توضیح کے لئے چُن لیا گیا اور طالبین قرآن کی ان الجھنوں کو دور کرنے کی کوشش کی گئی جن کا سامنا انہیں سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں کرنا پڑرہا ہے۔ یہ کام اس امید سے کیا گیا کہ بارگاہ الٰہی میں جو بھی کام خلوص کی بنیاد پر کیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ ضرور مدد فرماتا ہے۔

اس کام کی انجام دہی کے دوران اللہ کے فضل و کرم سے میری ملاقات ایک اہم ذی شعور و ذی علم شخصیت جناب فہیم محمد رمضان (فاضل دینات، ایم فل) سے ہوئی جب میں نے ان سے اس کام میں دست تعاون کی درخواست کی تو انہوں نے کشادہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کٹھن کام کو قبول کیا اور اپنی فرصت کے قیمتی لمحات وقف کرکے اس کتاب کی نظرِ ثانی جیسے اہم کام کو انجام دے کر اس خدمت قرآن کو پائیہ تکمیل تک پہنچانے میں کلیدی کردار ادا کیا جس کے لئے میں ذاتی طور پر ان کا بہت ہی ممنون و مشکور ہوں اور لَایَشکر اللہ مَنْ لَا یَشکر النَّاس حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر میں نے اس کثیر اللسان، بالغ الدِّماغ اور بالغ العلوم شخصیت کا تذکرہ کرنا ضروری سمجھا۔

دعا ہے کہ: اے اللہ! اس خدمت کو قبول فرما اور ہماری لغزشوں اور گناہوں کو معاف فرما۔

خاکسار

محمد عبدالغفار

دیباچہ

جب سے دنیا میں زندگی کا آغاز ہوا تب سے ہی حق و باطل کی جنگ جاری ہے۔ خدا کو ماننے والے حضرت آدم علیہ السلام کو ابتدائی انسان مانتے ہیں اور اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ پہلا انسان جس نے زمین پر قدم رکھا حضرت آدم علیہ السلام تھے۔ اگرچہ مادہ پرست اور خدا کو نہ ماننے والے کچھ لوگ اس بات کو مانتے ہیں کہ زمین پر جو مختلف قسم کے حیوانات موجود تھے انسان ان ہی حیوانات میں سے ایک حیوان کی ارتقائی شکل و صورت ہے۔ انیسویں صدی میں ڈارون (Darwin) نے اس نظریہ کو عروج پر چڑھایا اور بہت سے لوگوں کو اپنی اس بے وزن دلیل (Theory) سے گمراہ کردیا۔ حتیٰ کہ کئی مسلمانوں کے ذہن بھی اس متعدی مرض (Infectious disease) سے بچ نہ سکے۔

ایک طرف ڈارون کی اس بے وقعت اور بے بنیاد دلیل نے بہت سارے لوگوں کو متاثر کردیا تو دوسری طرف دنیا میں مادیت کا پروپگنڈا شروع کیا گیا۔ مذہب کو ایک طرف رکھ کر مادی ترقی کا ڈھنڈورا پیٹا گیا۔ خدابیزار لوگوں نے علمِ اقتصادیات اور فلسفیات کا دعویٰ کرکے دین دار طبقے کو مسترد کیا اور دنیا کی معاشیات اور اقتصادیات کو اپنی تحویل میں لے لیا تو دوسری طرف مشینی دور کے آغاز کا خوب چرچا کرکے لوگوں کو اپنے ہاتھوں کام کرنے پر انحصار کرنے کی مہم زور وشور سے چلائی گئی اور اس بات کا دعویٰ کیا گیا کہ جو کام کرے اور کمائے وہی اس دنیا میں رہنے کا حق دار ہے اور جو کام کرنے کا اہل نہ ہو اسے اپنے حال پر چھوڑ دو۔ اس نظریہ کو Survival of the fittest کا نام دیا گیا۔ یعنی جو اس دنیا میں جسمانی طور کام کرنے کے قابل ہیں وہ جینے کا حق رکھتے ہیں اور جو کمزور اور ناکارہ ہیں انہیں مرنے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ (The weaker should go to the walls) اس نظریہ نے ساری انسانی ہمدردیوں کو خاک میں ملادیا اور انسان انسان کے خون کا پیاسا بن گیا۔ مادیت اور روپے پیسے کی ریل پیل نے ہلچل مچادی۔ انسان مادی دنیا کی حرص و محبت میں محو ہوگیا اور اس طرح دنیا سے انسانیت اور ہمدردی کا جنازہ اٹھ گیا۔ دین دار لوگ بھی اس غیر منصفانہ اور سفاکانہ انقلاب کی زد میں آگئے۔ کئی لوگ مذہب اور دین کو شک کی نظروں سے دیکھنے لگے اور اپنے مذہب کے بجائے سوشلزم (Socialism)، کمیونزم (Communism) اور مارکسزم (Marxism) جیسے خود ساختہ ادیان پر انحصار کرنے لگے۔ کارل مارکس (Karl Marx) نے لوگوں کے دل و دماغ سے مذہب کے عقیدہ کو نکالنے کی بے حد کوشش کی۔ اگرچہ یہ شخص لوگوں کے دلوں سے پوری طرح دین نہ نکال سکا پھر بھی اس نے بہت سارے لوگوں کو دین اور دینی اقدار سے بے رغبت کردیا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں جب سائنس نے ترقی کی منزلیں طے کرلیں اور علم فلسفہ کے مقابلے میں دنیا کو سائینسی علوم نے چار چاند لگادئے۔ دنیا کو محسوس ہونے لگا کہ علم سائنس زیادہ تر مشاہدات (observations) اور عملی تجربات (practical experiments) پر ہی انحصار کرتا ہے اور جو چیزیں انسان کی نظروں سے اوجھل ہیں ان کی تحقیق تو کرتی ہے لیکن ان پر حتمی یقین کرنے سے گریز کرتی ہے۔ تاہم سائینسی علوم نے مشاہدات کے علاوہ محجوبات (پوشیدہ حقائق) کا انکشاف بھی کیا ہے۔ جن پوشیدہ حقائق کو سائنس تسلیم کرتا ہے، ان سائنسی حقائق سے اللہ کے نازل کردہ حقائق کی بھی تصدیق ہوتی ہے یعنی قرآن پاک کی بہت سی آیات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس طرح سائنس کے انکشافات اور حقائق نے قرآن کے حقائق کی تصدیق کی اور ان شاء اللہ آئندہ بھی سائنسی تحقیق و تخلیق کے ساتھ ساتھ قرآنی آیات کی تصدیق بھی ہوتی رہے گی اور یہ کام تب تک جاری رہے گا جب تک دنیا باقی رہے گی اور ہر ایک آیت کی تحقیق و تصدیق پائیہ تکمیل کو پہنچے گی اور یوں ہر ایک شخص کو حقی الیقین کی نعمت حاصل ہوجائے گی۔

غیر یقینی صورتحال دور کرنے اور تشفی و تسلی حاصل کرنے کے لیے سائنس کے تناظر میں قرآن مجید کی چند آیات کریمہ پیش کی جاتی ہیں:

بیسویں صدی تک کائینات کے متعلق خیال کیا جاتا تھا کہ یہ خود ساختہ ہے اور اس کا بنانے والا کوئی نہیں ہے اور نہ اس کی ابتدا ہے اور نہ انتہا۔ لیکن اکیسویں صدی کے آغاز میں سائنس دانوں نے مشاہدات اور تجربات کی بنیاد پر اس بات کا انکشاف کیا کہ یہ کائینات نابود (out of nothing) سے وجود میں آگئی اور اس کی ابتدا بھی اور انتہا (end) بھی ہے۔ وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَیَوْمَ یَقُوْلُ كُنْ فَیَكُوْنُ(الانعام:۷۳) ''اور وہی ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ اور جس دن وہ کہے گا (ختم) ہوجا تو وہ (ختم) ہوجائیں گے''

كُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍo وَّیَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِo (الرحمٰن:۲۶،۲۷) ''جو کچھ بھی (زمین اور

آسمانوں میں ہے) فنا ہونے والا ہے اور باقی رہے گی اُس پروردگار کی ذات جو بزرگ اور عظمت والا ہے‘‘

سائنس کی تحقیق ہے کہ یہ پوری کائینات (Universe) ایک زبردست دھماکے سے وجود میں آگئی ہے۔ جسے بگ.بینگ (Bigbang) کا نام دیا گیا ہے ۔ اس تحقیق سے قرآن کی اس آیت کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ کائینات ایک ہی مادے کا ٹکڑا تھا پھر ہم نے اسے الگ الگ کردیا۔ أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقاً فَفَتَقْنَاهُمَا (الانبیاء:۳۰) ''بے شک سارے آسمان اور زمین آپس میں ملے ہوئے تھے تو ہم نے انہیں پھاڑ کر الگ کیا''۔ وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا بِأَيْدٍ وَّ إِنَّا لَمُوسِعُونَo (الزاریات:۴۷) ''ہم نے ہی آسمان کو بنایا اور بے شک ہم ہی اسے پھیلا رہے ہیں (یعنی اس میں توسیع کررہے ہیں)۔ آسمان سے مراد پوری کائینات ہے ۔

ایک امریکی ماہر فلکیات (Astronomer)ایڈوِن ہبل (Edwin Hubble)نے دریافت کیا کہ ستارے اور کہکشاں (galaxies) لگاتار ایک دوسرے سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ انہوں نے جو تھیوری پیش کی اس کا نام بگ کرنچ تھیوری(Big Crunch theory) ہے ۔

The big chrunch theory proposes that the universe, that began expanding with the Bigbang will collapse with increasing speed. According to the theory this collapse of the universe will continue untill the universe has lost all its mass and turned into a single point of infinite density.

بگ کرنچ تھیوری (بڑے بحران کی تھیوری) یہ رائے پیش کرتی ہے کہ کائنات جس نے بگ.بینگ بڑے دھماکے کے ساتھ پھیلنا شروع کیا ہے.... بڑھتی ہوئی رفتار کے ساتھ ٹوٹ پڑے گی۔.... تھیوری کے مطابق کائینات کی یہ ٹوٹ جاری رہے گی یہاں تک کہ کائینات اپنا تمام مادہ (Mass) کھو بیٹھے گی اور کثافت (ٹھوس پن) کے ایک نکتہ میں تبدیل ہوجائے گی۔

يَوْمَ نَطْوِي السَّمَاءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُ وَعْداً عَلَيْنَا إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَo (الانبیاء: ۱۰۴) ''جس دن ہم آسمان کو اس طرح لپیٹ دیں گے جیسے دفتر میں مکتوبات سمیٹے جاتے ہیں ۔ جس طرح

ہم نے پہلے تخلیق کی ابتدا کی تھی اُسی طرح ہم پھر اس کا اعادہ کریں گے (یعنی جس طرح کائینات کو پھیلایا گیا تھا اسی طرح اسے لپیٹ لیں گے) یہ ہمارے ذمہ ایک وعدہ ہے یہ ہم ضرور کرکے رہیں گے۔''

قیامت کے دن کائینات اللہ تعالیٰ کی دائیں مٹھی میں ہوگی وَالْأَرْضُ جَمِيعاً قَبْضَتُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَالسَّمَاوَاتُ مَطْوِيَّاتٌ بِيَمِينِهِ (الزمر:٦٧) ''اور قیامت کے دن ساری زمین اُس کے قبضے میںہوگی اور آسمان اس کی داہنی مٹھی میں لپٹے ہوئے ہوں گے'' وَكُلٌّ فِي فُلْكٍ يَسْبَحُونَ (یٰس:۴۰) ''سب اجرام فلکی اپنے اپنے مدار کے اندر تیر رہے ہیں''۔

کروڑوں ستارے (Stars) اور کہکشان (galaxies) اس کائینات میں اپنے اپنے مداروں (orbits) پر گھوم رہے ہیں۔ کہکشان تین سو بلین یعنی تین ارب ستاروں کے ساتھ اپنے اپنے مداروں پر چل رہی ہیں۔ لیکن حیرت ہے کہ کوئی حادثہ پیش نہیں آتا ہے۔ کیونکہ ہر ایک جرم فلکی اور کہکشان اپنے ہی راستہ (path) پر چلتا ہے اور کوئی کسی سے ٹکراتا نہیں۔

سائنس اور فلسفیات کے انقلاب نے دنیا کے بڑے بڑے مذہبوں میں ہلچل مچادی۔ یہاں تک کہ کئی مذہبوں کا وجود ہی مٹ گیا۔ کیونکہ ان کے نظریات اور خیالات علم جدید کا سامنا نہ کرسکے۔ اس لیے مذہب کو انسانی زندگی سے الگ کردیا گیا۔ دین سے سیاست کا کوئی واسطہ نہ رہا۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ انسانوں کے یہ خود ساختہ ادیان سائنسی علوم سے ٹکرا گئے۔ قرآن چونکہ اللہ کی نازل کردہ کتاب ہے اور ہر طور سے اپنی اصل شکل میں محفوظ ہے، اور اسلام اللہ کا دین ہے اس لیے قرآن اور اسلام نے اس سائنسی دور میں بھی تمام منزلیں طے کرکے اپنی حقیقت اور صداقت ثابت کردی اور قرآن پوری طرح سے ایک ایک آیت اور ایک ایک لفظ کے ساتھ روز روشن کی طرح تابان اور محفوظ ہے۔ یہ اللہ کی کتاب ہے اور اللہ نے خود اس کتاب کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے۔ اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ o (الحجر:۹) ''بے شک ہم نے اس (کتاب) کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں''۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن مجید کو یہ حفاظت تاقیامت جاری رہے گی۔ بے شک قرآن مجید دنیا کی واحد مذہبی کتاب ہے جس کی آیات کا موجودہ دور کے سائنسی اور فلسفیانہ علوم سے کوئی اختلاف نہ ہوا۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے اور اسلام اللہ کا دین ہے۔

اسلام کا معنی ہے اطاعت کرنا یعنی اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کرنا اور اس کی پناہ میں آکر سلامتی حاصل کرنا۔ گھر کی زندگی سے لے کر پارلیمنٹ تک تمام شعبوں کو اللہ کے احکام کے تابع کردینے کے طرز عمل کو اسلام کہتے ہیں اور اللہ کے نزدیک یہی دین (طرز عمل) پسندیدہ اور مطلوب ہے۔ یہ دین خالصتاً قرآن کریم کے احکام پر قائم ہے۔ جو آدمی یا قوم اللہ کے دین کو مان کر اس میں اپنی پیوندکاری کرنے لگتی ہے تو وہ قوم دین اسلام کے بجائے اپنے نفس کا دین اختیار کرلیتی ہے۔ یا اگر یہ حق

پارلیمنٹ کو دیتی ہے تو اُس قوم کا خدا پارلیمنٹ بن جاتی ہے اور وہ پارلیمنٹ کی مرضی کو اپنا دین بنالیتی ہے۔

انسانوں کے طرز زندگی کے لیے اصول اور قوانین فراہم کرنے کے لیے تمام تعلیم یافتہ قوموں نے انتھک کوشش کی اور اب بھی اس کوشش میں بے قرار ہیں۔ دنیا کے سامنے مختلف نظریے اور اصول وقوانین پیش کیے گئے لیکن سب ناکام ہوئے۔ ایمپریلزم (Imperialism)، سیکیولرازم (Secularism)، کیمیونزم (Communism)، اِنڈیوجیولزم (Individualism) جیسے نظریے پیش کئے گئے۔ لیکن یہ سب بے سود اور بے کار ثابت ہوئے۔ مگر آج سے چودہ سو سال پہلے ایک نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں دنیا کے سامنے ایک کتاب پیش کی گئی جس نے دنیا کا باطل نظام ایک پُرامن نظام میں تبدیل کردیا جس کی حقیقت اور تصویر آج بھی دنیا میں روزِ روشن کی طرح موجود ہے۔ اگر اس کے اصلاحی اور عالمگیر نظریہ پر دنیا آج بھی عمل پیرا ہوجائے تو تمام مشکلات سے نجات پائی جائے گی۔ غربت کی خوف ناک کشمکش کا خاتمہ ہوجائے گا اور دنیا کو امن یُسر ہوجائے گا۔ اسلام نے جب دنیا میں قدم رکھا اُس وقت انسانوں کی اجتماعی زندگی درہم برہم تھی۔ لوگ مختلف قومیتوں اور قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے۔ حسب ونسب اور رنگ و نسل کی جنگ چل رہی تھی۔ کہیں وطنی سیاست اور تعصب باعث فتنہ و فساد تھا کہیں دین و مذہب پر لڑائی کی آگ شعلہ زن تھی۔ انسان کٹ رہے تھے بستیاں اجڑ رہی تھیں۔ ان حالات میں اسلام نے اپنی انقلاب انگیز صدا بلند کی اور نفاق، پھوٹ، تعصب، فرقہ پرستی، بدعنوانی اور بد اخلاقی، بددیانتی، بدکرداری اور بدچلنی کے ایک ایک سرچشمے کو بند کردیا۔ دنیا میں ہمدردی اور انسانیت کی حکومت قائم ہوگئی، کالے اور گورے کی تفریق مٹ گئی، مشرق و مغرب کے انسان ایک خاندان بن گئے۔ آج مسلمان اپنے گریبان میں جھانک لیں تو انہیں اپنا حال صاف دکھائی دے گا کہ اہل قرآن نے احکام قرآن کو اپنی نجی اور قومی زندگی سے خارج کردیا اور اسلام پر قائم نہ ہونے کی وجہ سے صفحۂ ہستی سے مٹ رہے ہیں۔ ان میں نہ توحید باقی رہی نہ اتحاد، نہ اطاعت رسول نہ ایثار و قربانی کا جذبہ، نہ خوف خدا نہ خوف عذاب اور نہ ایمان بالآخرت اور نہ مقارم اخلاق رہے۔ جب اہل قرآن کی یہ حالت ہو تو پھر یہ شکوہ بے بنیاد ہے کہ برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر۔ قانون قدرت سب قوموں کے لیے یکساں ہے۔ لیکن بنی اسرائیل کی طرح کچھ مسلمان ابھی تک اس خام خیالی میں مبتلا ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے ہیں اور اس کی چنی ہوئی محبوب قوم ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ مسلمان ہونے کے ناطے خصوصی سلوک کرے گا۔ لیکن پچھلے ڈیڑھ ہزار سال کی تاریخ گواہ ہے کہ ایں خیال است ومحال است وجنوں۔ اگر

مسلمان بے غیرتی میں کافروں کے برابر ہوجائیں تو ان کے ساتھ روایتی مسلمان ہونے کے ناطے کوئی خصوصی سلوک نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اللہ کا قانون اٹل ہے اور اللہ کے قانون کے مطابق تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔قوم میں جب خرابی پیدا ہوجاتی ہے اور سرطان کی طرح پورے نظام کو اپنی لپیٹ میں لے جاتی ہے۔ تو قدرت الٰہی کا کوڑا برستا ہے۔یہ کوڑا کبھی چنگیز خان اور ہلاکو خان کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور کبھی تیمور اور نادر شاہ کی صورت میں اور کبھی روس اور امریکہ کی جارحیت کی شکل میں۔ چنگیز خان نے جب نام نہاد مسلمانوں پر حملہ کردیا تو ان کی بے غیرتی کی انتہا یہ تھی کہ ایک تاتاری فوجی جب ایک بستی میں بھیڑ بکریوں کی طرح لوگوں کا قتل عام کرتا ہے تو کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ اس اکیلے تاتاری کا قصہ تمام کردے۔ جب جرأت، ایمانی قوت اور اخلاقی زبوں حالی کی یہ کیفیت ہو تو پھر مسلمانوں کے ساتھ جو ہوا وہ ان کا مقدر بن چکا تھا۔ ہسپانیہ (اسپین(Spain میں مسلمانوں کا ان کی لاپرواہی سے قتل عام ہوا۔ چھ سو سال بعد انہیں اسپین سے بے دردی سے مار مار کے نکال دیا گیا۔ مسجد قرطبہ آج بھی اسپین میں گواہی دے رہی ہے کہ یہاں مسلمان آباد تھے اور اسلامی حکومت کررہے تھے۔ لیکن قرآن کے حاملین کو قرآن کو بھول جانے کی سزا میں وطن سے بے وطن کردیا گیا ہے۔ اٹھارویں صدی کے مغل حکمرانوں اور مسلمانوں کا انگریزوں کے ہاتھوں یہی حشر ہوا۔ دور جدید میں ارض القرآن یعنی قرآن کی سرزمین پر اہل قرآن کا یہی حال ہے۔ قرآن پر عمل نہ کرنے والے ان حاملین قران کو مغربی طاقتوں کی جارحیت کی سزا مل رہی ہے۔ اپنے وطن میں رہ کر انہیں امن و سکون حاصل نہیں ہے۔ بیغمبروں کی اس سرزمین پر روز بموں اور گولیوں کی بوچھاڑ ہوتی رہتی ہے۔ کسی کو امن سے جینے نہیں دیتے ہیں۔ عراق، شام، ایران و لبنان سب امن کی بھیک مانگ رہے ہیں۔ مگر مغربی طاقتیں انہیں چین سے بیٹھنے نہیں دیتی ہیں۔یہ سزا انہیں اس لیے ہے کہ یہ لوگ اہل قرآن ہیں لیکن قرآن سے دور ہوگئے ہیں۔ اس لیے اس کی سزا بھگت رہے ہیں۔

اور یہ اللہ کی حدیں ہیں اور منکرین کے لیے دردناک عذاب ہے ۔ (القرآن)

تارک قرآن اور ان بگڑے ہوئے مسلمانوں کو علامہ اقبالؒ اپنے اسلاف اہل قرآن کی یاد دہانی کرتے ہوئے فرماتے ہیں

وہ زمانے میں معزز تھے مسلمان ہوکر

اور تم خوار ہوئے تارک قرآن ہوکر

تارکین قرآن کو اگر آج بھی میدان حشر میں اللہ رب العالمین کی بارگاہ میں جواب دہی کے لیے کھڑا ہونے کا احساس ہوجائے اور اللہ کی کتاب قرآن مجید کو سینے سے لگائیں اسے اپنی زندگی کا دستور عمل بنائیں اور اللہ کی بندگی میں شامل ہوجائیں۔ دنیا کی عارضی اور فنا ہونے والی زندگی سےپیار و محبت کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں اور پورے اطمینان سے صرف اسی کی عبادت کریں اور اس بات کا ثبوت دیں کہ اللہ نے انہیں صرف اس لیےپیدا کیا کہ وہ اس کی عبادت کریں تو بلا شبہ پوری دنیا ان کے قدموں میں آئے گی اور کوئی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکے گا۔ ورنہ آخرت میں وہ منکرین اور کافرین سے بڑھکر سزا کے مستحق قرار پائیں گے۔

حاملین قرآن اس حقیقت کو نظر انداز نہ کریں کہ دور جدید میں مختلف مذہبوں سے تعلق رکھنے والے مختلف طبقوں کے لوگ دین اسلام میں داخل ہورہے ہیں۔ ایک سروے (survey) کے مطابق دنیا میں روزانہ غیر مسلموں کی اچھی خاصی تعداد اسلام قبول کررہی ہے اور تبدیلی مذہب کے اس رجحان سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ وہ وقت دور نہیں ہے کہ جب پوری دنیا میں مسلمانوں کا غلبہ ہوگا اور اقبالؒ کے اس سخن کی تعبیر نکل آئے گی ؎

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

اہل اسلام اگر مسلکی اور نظریاتی اختلافات فراموش کرکے تحریک اتحاد اسلامی میں داخل ہوجائیں، حاملین قرآن اور عاملین احکام قرآن بن کر اسلامی جھنڈ لہرا کر معبود حقیقی، خالق کائینات، رب العالمین کے عطا کردہ دین اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کےپیش کردہ آئین کی پیروی کریں، ایک دوسرے پر غلبہ پانے یا ایک دوسرے کےتئیں بے اعتمادی کے جذبے کو اپنے دل و دماغ میں جگہ نہ دیں اور اس فکر میں رہیں کہ ایک دن خدا کو منہ دکھانا ہے اور اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ مسلک پرست خدا پرست نہیں ہے۔ وہ تو اللہ رب العالمین کی بندگی اور عبادت کرنے کے بجائے خود ساختہ مسلک کی اطاعت اور پوجا کرتا ہے۔ صحیح مسلمان کی شان اور پہچان یہ ہے کہ وہ نہ حنفیؔ ہے نہ شافعیؔ، نہ مالکیؔ نہ حنبلیؔ، نہ سلفیؔ ہے نہ وہابیؔ، نہ بریلویؔ ہے نہ دیوبندیؔ، وہ نہ اہلحدیثؔ کا مُعتمد (اعتماد کرنے والا) ہے نہ اہل اللہ کا مُعتقِد(اعتقاد رکھنے والا) ہے وہ نہ خانقاہوں اور درگاہوں کا مجاور (جاڑو دینے والا) ہے نہ بے دین سیاست کاروں کا متعاہد(معاہدہ کرنے والا) ہے بلکہ وہ حق آشنا، اللہ اور اس کی کتاب پر ایمان لانے والا اور خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین اسلام کا علم بردار غازی ہے۔ تو وہ دن ضرور آئے گا جب ساری دنیا دارالاسلام بن جائے گی اور عالم انسانیت ملت اسلامیہ میں تبدیل ہوجائے گی اور ساری دنیا اللہ کے نور سے منور ہوجائے گی۔

خاکسار

محمد عبدالغفار

باغ مہتاب سرینگر پرنسپل جامع العلوم کنی پورہ سرینگر کشمیر

تاریخ: ۲جون ۲۰۲۰ء

مقدمہ

اَلحَمدُ لِلّٰہِ نَحمَدُہٗ و نَستَعِینُہٗ وَنَستَغفِرُہٗ وَنُؤمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیہِ وَنَعُوذُ بِاللہِ مِنْ شُرُورِ اَنفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعمَالِنَا۔ اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّااللہُ وَحدَہٗ لَاشَرِیکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدً عَبدُہٗ وَرَسُولُہٗ۔ صَلی اللہ تعالی و سلم علیہ وعلی اٰلہٖ وصحبِہٖ اجمعین ومن تَبِعَھُمْ بِاِحسَانٍ اِلٰی یَومِ الدِّین۔ اما بعد

قرآن مجید کا تعارف خود صاحب قرآن پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نہایت ہی دلآویز حدیث میں پیش فرمایا ہے۔ محدثین میں سے اس حدیث کو امام ترمذیؒ اور امام دارمیؒ نے روایت کیا ہے: عَنِ عَلِیٍ رضی اللہ عنہ قَالَ اَنَا سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم یَقُوْلُ: ''اَلَا اِنَّہٗ سَتَکُوْنُ فِتْنَۃٌ۔ قُلْتُ مَا الْمَخْرَجُ مِنْھَا یَارسولَ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ کِتَابُ اللہ !

جناب علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ سنو! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے خود سنا کہ: ''خبردار! عنقریب ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ ایک فتنہ (یا فتنوں کا سلسلہ) رونما ہوگا!'' میں نے عرض کیا ''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! پھر اس فتنے سے باہر نکلنے کی کیا صورت ہوگی؟!'' حضورؐ نے فرمایا ''کتابُ اللہ یعنی قرآن مجید ہی وہ ذریعہ ہوگی جس سے اُس فتنے سے بچا جا سکتا ہے''

فِیہِ نَبَأُ مَا قَبْلَکُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَکُمْ وَحُکْمُ مَا بَیْنَکُمْ

اس قرآن میں آپ سے پہلے گزری قوموں کے عروج و زوال کے احوال ہیں اور اس میں تمہارے بعد آنے والوں کی خبریں بھی ہیں اور یہ بھی ہے کہ تمہارے معاملات میں فیصلہ کرنے کی صورت کیا ہے۔

ھُوَ الْفَصْلُ، لَیْسَ بِالْھَزْلِ۔۔۔یہ قرآن ایک سنجیدہ اور فیصلہ کن کلام ہے، کوئی مذاق کی چیز نہیں ہے۔

مَنْ تَرَکَہٗ مِنْ جَبَّارٍ قَصَمَہُ اللہُ ۔۔۔ جو کوئی ظالم و جبار آدمی (اقتدار کے نشے میں) اس قرآن کو چھوڑے گا، اللہ تعالیٰ اُس کو کچل کر رکھ دے گا!

وَمَنِ ابْتَغَی الْھُدیٰ فِیْ غَیْرِہٖ اَضَلَّہُ اللہُ ۔۔۔ اور جو کوئی اس قرآن کو چھوڑ کر کسی اور جگہ سے ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کرے گا، اللہ تعالیٰ اُسے گمراہ اور ضائع کردے گا!

وَھُوَ حَبْلُ اللہِ الْمَتِیْنُ ۔۔۔ اور یہ قرآن ہی اللہ تعالیٰ کی مضبوط رسی ہے۔

وَھُوَ الذِّکْرُ الْحَکِیْمُ۔۔۔ اور یہ حکمت بھری باتوں پر مبنی یاد دہانی اور نصیحت ہے۔

وَھُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِیْمُ۔۔۔ اور یہی سیدھا راستہ ہے

وَھُوَ الذِّیۡ لَاتَزِیۡغُ بِہِ الۡاَھۡوَاءُ وَلَاتَلۡبِسُ بِہِ الۡاَلۡسِنَۃُ۔۔۔

یہ قرآن ایسی چیز ہے کہ انسانی تخیلات اور میلانات اسے غلط راستے پر نہیں لے جاسکتے اور زبانیں اور بولیاں اس میں کسی قسم کی آمیزش نہیں کر سکتیں۔

وَلَا یَشۡبَعُ مِنۡہُ الۡعُلَمَآءُ ۔۔۔ اور یہ وہ کتاب ہے جس سے علماء کبھی سیر نفس نہیں ہوسکتے !

وَلَایَخۡلُقُ عَنۡ کَثۡرَۃِ الرَّدِّ۔۔۔ اور یہ کہ اس قرآن کو خواہ کتنا بھی پڑھو، یہ پرانا نہیں ہوتا !

وَلَایَنۡقَضِیۡ عَجَآئِبُہٗ۔۔۔ اور اس کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہوں گے !

ھُوَ الذِّیۡ لَمۡ تَنۡتَہِ الۡجِنُّ اِذۡ سَمِعَتۡہُ حَتّٰی قَالُوۡا اِنَّا سَمِعۡنَا قُرۡاٰنًا عَجَبًا یَّھۡدِیۡ اِلَی الرُّشۡدِ فَاٰمَنَّا بِہٖ۔۔۔ یہ قرآن ایسا متاثر کُن کلام ہے کہ جب جنوں کی ایک جماعت نے اس کو (رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے) سنا تو وہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ ''ہم نے ایک نہایت حسین کلام سنا، جو ہدایت کی طرف رہنمائی کرتا ہے، سو ہم اُس پر ایمان لے آئے !''

مَنۡ قَالَ بِہٖ صَدَقَ ۔۔۔ جس بھی انسان نے قرآن کے مطابق بات کی، اُس نے سچ بولا۔

وَمَنۡ عَمِلَ بِہٖ اُجِرَ۔۔۔ اور جس نے اس کے مطابق عمل کیا، وہ یقیناً اجر یافتہ ہوگیا۔

وَمَنۡ حَكَمَ بِهٖ عَدَلَ۔۔۔ اور جس شخص نے اس قرآن کے مطابق فیصلہ کیا، اس نے بہر حال عدل کا فیصلہ کیا۔

وَمَنۡ دَعَآ اِلَيۡهِ هَدٰى (اَوۡهُدِىَ) اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمَ۔

قرآن مجید اللہ سبحانہٗ تعالیٰ کا کلام ہے اور کائینات میں موجود تمام کلاموں میں اس کا مقام و مرتبہ وہی ہے جو خود ذاتِ ذوالجلال کا اُس کی تمام مخلوقات میں ہے۔ اس کلام کے حُسن، اس کی تاثیر، اس کے پیش کردہ افکار و حقائق، مسائل حیات کے پائیدار حل کے لیے اس کے قوانین اس کی وہ خوبیاں ہیں جنہوں نے اس کلام کو اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت جاودانی عطا کی ہے۔ یہ وہ کتابِ حفیظ ہے جس کے مضامین کی پاکی کے سلسلے میں خود اللہ تبارک و تعالیٰ کا فرمانِ ذی شان ہے کہ لَّا يَأۡتِيهِ الۡبَاطِلُ مِنۢ بَيۡنِ يَدَيۡهِ وَلَا مِنۡ خَلۡفِهٖ تَنۡزِيۡلٌ مِّنۡ حَكِيۡمٍ حَمِيۡدٍ ۝ (حٰمٓ السجدہ:۴۲) یعنی یہ وہ زبردست کتاب ہے جس کے نہ سامنے سے باطل کی یورش ہو سکتی ہے، نا ہی پیچھے سے آکر اس میں ملاوٹ کر سکتا ہے کیونکہ یہ اُس دانا وہ بینا پروردگار کی نازل کی ہوئی ہے جو اپنی ذات میں ہی سراپا تعریف ہے!

610ء سے 632ء کے درمیانی زمانے میں یہ کتابِ عزیز اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کی طرف سے ختمی مرتبت پیغمبر جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ یہ وہ دور ہے جب عالم انسانی کے لیے عرشِ مجید سے عظیم ترین رحمتوں کا نزول ہوتا رہا اور یوں انسانیت روح وبدن کی معرکہ آرائی سے نکل کر اخلاقی ارتقاء کی معراج پر فائز ہو گئی، ہرچند کہ اُس وقت بھی استعماری اور استبدادی قوتوں نے جنگ و جدال کی خون ریزیوں سے بحر و بر کو بھر دیا تھا، جس کی تصویر کشی قرآن مجید نے ان الفاظ میں کی ہے:

ظَهَرَ الۡفَسَادُ فِى الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ بِمَا كَسَبَتۡ اَيۡدِى النَّاسِ لِيُذِيۡقَهُمۡ بَعۡضَ الَّذِىۡ عَمِلُوۡا لَعَلَّهُمۡ يَرۡجِعُوۡنَ ۝ (الروم:۴۱)

خشکی اور تری میں فساد برپا ہوگیا ہے، لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے، تاکہ مزہ چکھائے اُن کو اُن کے بعض اعمال کا، شاید کہ وہ باز آئیں!

مگر یہ قرآن مجید کا اعجاز اور اس کی تیر بہدف تاثیر تھی کہ اُس وقت کی معلوم دنیا کی سب سے اُلھڑ اور وحشی قوم چند سالوں کے اندر ہی زمانے کی مہذب و منظم ترین جماعت بن کر ابھری اور دیکھتے ہی دیکھتے تین براعظموں ۔۔۔۔۔ ایشاء، افریقہ اور یورپ ۔۔۔ پر چھا گئی! یہ جماعت ہر رنگ اور امتیاز سے مبرّیٰ اور بے نیاز ہو کر قرآن کے رنگ میں رنگ گئی۔ ان کی دوستیاں اور دشمنیاں، ان کی صلح و جنگ، ان کی عطاء و منع، ان کا اتحاد و بکھراؤ اور ان کے لیے عزت و ذلت کی واحد قدر اور مِعیار قرآن بن گیا۔ علامہ اقبال نے اسی پاک باز جماعت کا کیا خوب تعارف دیا ہے:

رہزناں از حفظ او رہبر شدند

از کتابے صاحبِ دفتر شدند

اور بیسویں صدی میں قرآنِ عظیم کے معروف غوّاص اور تفسیر ''فی ظِلالِ القرآن'' کے مصنف جناب پروفیسر سید قطب شہید رحمۃ اللہ علیہ کے بقول رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ابتدائی جماعت تشکیل کی وہ بغیر کسی مبالغہ کے ''ایک بے مثال قرآنی امت'' کہلانے کے لائق تھی۔ یہی جماعت جب ایک ہاتھ میں قرآن کی کتاب اور دوسرے ہاتھ میں صاحبِ قرآن علیہ الصّلوٰۃ السلام کی سنتِ مطّہرہ لے کر اٹھی تو افراد و اقوام کے دلوں پر ایسی چھا گئی کہ اگر وقت کے خلیفۃ المسلمین کے حکم پر کسی مصلحت یا ضرورت کے پیش نظر کوئی مفتوحہ شہر چھوڑنا پڑا تو وہاں کی رعایا رو رو کر کہنے لگی کہ خدا را ہمیں چھوڑ کر نہ جائیں اور ہمیں اپنی ہی قوم کے ظالم حکمرانوں کے ظلم و ستم کا تختہ مشق پھر سے نہ بننے دیں!'' یہ سب قرآنِ مجید کی وہ بے مثال معجزہ آرائیاں ہیں جنہیں تاریخ انسانی اپنے سینے میں جگہ دیتے ہوئے بجا طور پر فخر محسوس کرتی رہی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت مقامی اور وقتی نہیں، بلکہ عالمی اور ہمہ وقتی ہے۔ اسی طرح قرآنِ کریم کی مخاطَب صرف اقوامِ عرب نہیں بلکہ اقوامِ عالم ہیں۔ اس مُہتم بالشّان امرِ واقعہ کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کے تحت دوسری زبانوں میں قرآن کے معانی و مفاہیم کو منتقل کرنا ایک لازمی معاملہ تھا اس ضرورت کو مدّنظر رکھتے ہوئے قرآنِ مجید کے تراجم اور تفاسیر کا سلسلہ شروع ہوا اور یوں علوم دینیہ میں ایک عظیم اور مستقل شاخ یعنی ترجمہ و تفسیرِ قرآن کی بنیاد پڑی۔ چنانچہ نہایت معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اوّلین کڑی کے طور پر خیر القرون میں ہی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد و اجازت سے حضرت سلمانِ فارسی رضی اللہ عنہ نے ایک ایرانی وفد کو دعوت دین سے واقف کرانے کے لیے سورۃ الفاتحہ کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا (المبسوط للسّرخسی، روح المعانی للسّیوطی)۔ اگرچہ یہ ترجمہ اب معدوم ہوچکا ہے، تاہم ان روایات کی رُو سے یہ جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے مفہومات کی ترجمانی و ترجمہ کا کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منشا و اجازت سے کیا گیا ہے، وہیں یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ پہلی غیر عربی زبان جس میں قرآن مجید کے کسی جزوٗ کا ترجمہ کیا گیا وہ فارسی ہے اور یہ بھی کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ پہلے مترجم قرآن ہیں۔ جہاں تک تفسیر کا تعلق ہے تو یہاں بھی عربی کے بعد یہ اعزاز فارسی زبان کو ہی حاصل ہے۔ فارسی میں قرآن کریم کی قدیم ترین اور مکمل تفسیر جو دستیاب ہے، وہ تفسیر طبری ہے۔ تاہم یہ بات نوٹ کرنے کے لائق ہے کہ تفسیر طبری اصل میں عربی ہے اور مشہور مورخ امام محمد بن جریر طبری (م:۳۱۰ھ) کی لکھی تفسیر موسوم بہ ''جامع لابیان فی تفسیر القرآن'' ہے۔ تاریخی حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تفسیر کا یہ فارسی ترجمہ امام طبری کی وفات کے چالیس سال بعد کیا گیا۔

برصغیر (موجودہ ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش وغیرہ) کے ساحلی علاقوں، مالابار وغیرہ میں تاریخی حوالوں کے مطابق اسلام کی آمد اگرچہ دور صحابہؓ میں ہی ہوئی، تاہم اس کے غالب حصّہ میں اسلام کی اشاعت دور صحابہ و تابعین کے بہت بعد ہوئی۔ جن حضرات کی کوششوں سے یہاں اسلام متعارف ہوا اور پھیلا، وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے براہِ راست جانشین اور شاگرد نہ تھے بلکہ عرب سے لے کر مشرقی ترکستان تک کے علاقہ جات کے ملے جلے مسلمان تھے۔ اُن میں اگرچہ علماء کی ایک تعداد بھی تھی تاہم زیادہ تعداد صوفیا، تجار اور اہلِ حِرفہ کی تھی۔ ان حضرات کی مخلصانہ جدوجہد اور ذاتی کردار کے نتیجہ میں متفرق مواقع اور مرحلوں میں اس وسیع و عریض خطۂ ارض پر اسلام کی اشاعت ہوئی۔ نتیجتاً برصغیر میں دینِ اسلام کے مرکزِ ثقل کی حیثیت سے نہ تو قرآن و سنت کو قبولِ عام حاصل ہوا اور نہ ہی ان سے متعلق علوم کی طرف طویل زمانے تک کوئی سنجیدہ توجہ دی گئی۔

یہ سعادت دراصل قاسمِ ازل نے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے حصے میں لکھی تھی جنہوں نے اپنی تمام علمی و تدریسی کاوشوں کا مرکز و محور قرآن مجید کو بنا کر برصغیر کی تاریخ میں پہلی دفعہ اس کا کسی غیر عربی زبان میں ترجمہ کرکے عرصۂ دراز سے بند پڑے ایک عظیم کام کا سرِ نو آغاز کیا۔ اٹھارویں صدی کے مغلیہ دور کے ہندوستان میں چونکہ فارسی کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل تھا اور عوامی سطح پر یہی زبان زیادہ تر مستعمل تھی۔ اس چیز کے پیش نظر شاہ صاحب نے ''فتحُ الرّحمٰن بترجمۃِ القرآن مع مختصر حواشی'' کے نام سے اسی زبان میں قرآنِ کریم کے معانی سے عوام النّاس کو متعارف کرانے کی ایک محمود و مسعود سعی انجام دی۔ اس دوران چونکہ اردو زبان پنپنے لگی تھی اور غیر محسوس انداز میں یہ فارسی کی جگہ لے رہی تھی۔ لہٰذا جلد ہی ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ قرآن پاک کا اس نوخیز لشکری زبان میں بھی ترجمہ موجود ہو۔ خدا کی کاری گری دیکھئے کہ یہ سعادت بھی شاہ صاحب ہی کے دو فرزندوں کو نصیب ہوئی۔ پہلے ان کے تیسرے فرزند حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے سلیس زبان میں رواں ترجمہ بھی کیا اور ''موضح القرآن'' کے نام سے مختصر مگر جامع حواشی بھی لکھے، جو آج تک علماءِ تفسیر کی نظروں میں نہایت مؤقر ہیں۔ اس کے بعد شاہ صاحب کے ہی دوسرے فرزندِ ارجمند شاہ رفیع الدین نے اردو میں ہی قرآن مجید کا تحت اللفظ ترجمہ کیا۔

خانوادہ ولی اللّٰہی کے بعد اردو اور انگریزی کے علاوہ بر صغیر کی تقریباً تمام بڑی زبانوں میں قرآن مجید کے تراجم یا تفسیریں لکھی گئیں، جن میں سے کئی تفسیریں عوام الناس میں نہایت مقبول ہوئیں اور یہ سلسلہ تا ایں دم جاری و ساری ہے۔ گویا بقولِ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ:

اردو زبان بھی اللہ تعالیٰ کے فضل سے عالمی سطح پر بولی جانے والی زبانوں میں شامل ہوچکی ہے اور اسلامی لٹریچر بھی بڑی مقدار میں اس زبان میں شائع ہورہا ہے جس کا سلسلہ ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتا ہی جارہا ہے۔ علوم القرآن جن میں سب سے زیادہ تفسیری کتب طبع ہیں ۔۔۔۔ زاد بھی اور دیگر زبانوں میں شائع شدہ تفسیروں کے ترجمے بھی ۔۔۔۔ اردو میں شائع ہورہے ہیں۔ یہاں تک کہ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ شاید ہی کوئی ایسی اہم اور مقبول عام تفسیر ہو جو ابھی تک اردو میں منتقل نہیں ہوئی ہو۔

کشمیر میں ترجمہ قرآن اور اس کی تفسیر کی طرف ماضی قریب تک کوئی خاص توجہ نہیں ہوپائی تاہم گزشتہ صدی کے نصفِ آخر سے یہاں بھی کئی اہل علم کی خصوصی توجہ کا مرکز، قرآن کریم ٹھہرا نتیجتاً یہاں بھی کئی اصحاب نے اس میٹھی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ اور مکمل یا غیر مکمل تفسیریں لکھیں۔ ستر کی دہائی میں جموں و کشمیر میں تحریک اسلامی کے بانی جناب سعدالدین تاربلی رحمۃ اللہ علیہ نے پارہ عم کا آیت بہ آیت سلیس اردو ترجمہ کیا۔ اس ترجمے کو یہاں تحریکی اور دعوتی حلقوں میں اللہ کی تائید سے قبول عام حاصل ہوا۔ اس کے بعد کئی حضرات نے بھی ایسی ہی کوششیں بروئے کار لاکر ترجمہ و تفسیر قرآن پر مبنی کتب شائع کیں۔ ابھی حال ہی میں ہمارے دو رفقاء جناب خاکی محمد فاروق اور جناب غلام نبی شائق نے پارہ عم کی تفسیر پر مشتمل دو ضخیم کتابیں منظر عام پر لائیں۔ دونوں کتابیں اپنے علمی مواد کے لحاظ سے قابل قدر ہیں۔

جناب محمد عبدالغفار ایک جانے مانے ماہر تعلیم ہیں۔ سرکاری محکمہ تعلیم میں طویل زمانے تک تعلیم و تعلم کے فرائض انجام دینے کے بعد اس وقت شہر سرینگر کی مضافات میں واقع ایک معروف دینی درسگاہ ''جامع العلوم گنڈ چک پورہ، کنی پورہ'' میں پرنسپل کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ موصوف گہری علمی بصارت رکھتے ہیں اور قرآن مجید کے ساتھ ان کے قلبی شغف کی یہ کیفیت ہے کہ روزانہ کی بنیادوں پر کئی کئی گھنٹے مطالعۂ تفاسیر میں گزارتے ہیں۔ مطالعہ کے اسی رسوخ کا نتیجہ یہ ہے کہ پارۂ عم کی توضیحات پر مشتمل یہ ضخیم کتاب اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ راقم الحروف کو یہ سعادت حاصل ہوئی کہ جناب موصوف کی اس قابل قدر علمی کاوش کی شروع سے آخر تک اس نے نگرانی کی۔ اسے موصوف کے وسیع مطالعہ پر ہی محمول کریں گے کہ اس کتاب کا حجم موجودہ صفحات سے تقریباً سوا گنا زیادہ تھا۔ لیکن خوف طوالت اور دیگر کئی فنی مسائل کے پیش نظر راقم نے اس میں حسب ضرورت کانٹ چھانٹ کی اور اس کے بالاستیعاب مطالعہ کے نتیجے میں راقم نے اس کو فنی اور عروضی نقطۂ نظر سے پہلے سے بہتر صورت دے دی۔ یہ محمد عبدالغفار صاحب کا بڑا پن ہے کہ انہوں نے نظر ثانی کا کام مجھ جیسے ہیچمدان کے سپرد کیا اور میری تمام تجاویز کو برسر و چشم قبول کیا۔ میرا ماننا ہے کہ تفسیری توضیحات پر مشتمل یہ کتاب اہل علم کے لیے ایک بہترین تحفہ ثابت ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں صمیم قلب سے دعا گو ہوں کہ وہ اس مبارک علمی کاوش کو اپنے ہاں شرف قبول سے نوازے اور مؤلف، اس کے جملہ اعانت کاروں اور راقم احقر کے لیے مغفرت کا باعث بنائے۔ ایں دعا از من، و از جملہ جہاں آمین باد۔

وباللہ التوفیق وبہ نستعین

۲۶ر شعبان المعظم ۱۴۴۳ھ راجیٔ نجات و غفران

مطابق ۳۰ر مارچ ۲۰۲۲ء فہیم محمد رمضان

فاضل دینیات، ایم فل، اسلامیات

سورۃ الفاتحۃ

اٰیاتہا: 7 رکوعھا: 1

پس منظر

سورہ فاتحہ قرآن مجید کی پہلی سورت ہے ۔ سات آیات پر مشتمل یہ چھوٹی سی سورت فصاحت، بلاغت اور جامعیت کے لحاظ سے عظیم اور بلند مرتبہ کی سورت ہے۔ یہ سورت نماز کی ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے۔

فاتحہ کا معنیٰ آغاز ہے۔ کتاب کے آغاز میں چند کلمے تمہید کے طور پر لکھے جاتے ہیں۔ سورہ فاتحہ بھی قرآن کی تمہید ہے جس سے اللہ کی اس مقدس کتاب کا تعارف کرایا گیا ہے۔ احادیث میں اس سورت کے متعدد نام ہیں۔ جیسے اُمُّ القُرآن، سَبْعَ مثَانِیْ، اَسَاسُ القُرآن اور سورہ شفاء وغیرہ۔ سَبْعَ مثانی یعنی سات دہرائی جانے والی آیات کا نام قرآن سے ثابت ہے۔ وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرآنَ الْعَظِیْمَ (سورہ حجرات: ۸۷) ''بے شک ہم نے تم کو سات دہرائی جانے والی آیات اور قرآن عظیم عطا کیا۔'' اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ اس آیت میں سبع مثانی سے مراد سورہ فاتحہ ہے جو سات آیات پر مشتمل ہے۔ حدیث قدسی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ قَسَمْتُ الصَّلَاۃَ بَیْنِیْ وَبَیْنَ عَبْدِیْ (صحیح مسلم) ''میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان تقسیم کردیا ہے۔ اس کا نصف حصہ میرے لیے اور نصف میرے بندے کے لیے ہے۔ پہلے حصے کی تین آیات اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَo الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِo مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِo اللہ کے لئے ہیں کیونکہ ان آیات میں اللہ کا بندہ اللہ کی تعریف کرتا ہے اور اللہ کی صفات بیان کرتا ہے۔ چوتھی آیت اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُo اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان مشترک ہے کیونکہ اس آیت میں بندہ اپنے معبود کی عبادت کرنے کا وعدہ کرتا ہے جو اللہ کے لئے ہے اور اللہ معبود برحق سے مدد بھی مانگتا ہے جو اسے اپنے لئے ہے۔ اس لئے یہ آیت اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان مشترک ہے۔

دوسرے حصے کی تین آیات اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَo صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْo غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَo بندوں کے لیے خالص ہیں۔ کیونکہ ان آیات میں بندہ اپنے معبود اللہ تعالیٰ سے اُس ہدایت کی استدعا کرتا ہے جو اُس نے اپنے نیک بندوں پر عنایت فرمائی ہے۔ اور اس راستے پر چلنے سے نجات مانگتا ہے جس پر چل کر لوگ گمراہ ہوئے اور جن پر اللہ کا غضب ہوا۔

نبی صلی اللہ علی وسلم نے فرمایا ۔ لَا صَلٰوۃَ لِمَنْ لَّمْ یَقْرَأْ بِفَاتِحَۃِ الْکِتَابِ۔ (صحیح بخاری و مسلم) یعنی اس شخص کی نماز نہیں جس نے سورہ فاتحہ نہیں پڑھی۔ آپؐ کا یہ ارشاد گرامی ہر نماز کے لئے سنت مؤکدہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ لہٰذا ہر نماز کے لئے سورہ فاتحہ پڑھنا ضروری ہے۔ البتہ آپؐ نے امام کے ساتھ قرآن پڑھنے کو منع فرمایا ہے اور قرآن مجید میں بھی قرآن خاموشی سے سننے کا حکم ہے۔ وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا (سورہ الاعراف:۲۰۴) ''اور جب تمہارے سامنے قرآن پڑھا جائے تو اسے توجہ سے سنو اور خاموش رہو''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جہری نمازوں میں مقتدی امام کی قرأت خاموشی سے سنے اور امام کے ساتھ قرآن نہ پڑھے۔

سورہ کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے کیا گیا ہے۔ یعنی شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔ انسان کو سکھایا گیا ہے کہ وہ عبادت کا آغاز اپنے خالق حقیقی معبود برحق اللہ رب العالمین کے نام سے کرے اور اپنا ہر کام اسی کے نام سے شروع کرے۔ انسان جب خدا کے نام سے کام شروع کرتا ہے تو اس کے دل میں خدا کا خوف پیدا ہوجاتا ہے اور اس طرح وہ بُرے کاموں سے دور رہ جاتا ہے اور خدا تعالیٰ کی تائید اور توفیق اس کے شامل حال رہتی ہے۔ وہ شیطان کے وسوسوں اور فتنوں سے بچ جاتا ہے۔ کوئی بھی کام کرنے کے لئے جب بندہ اپنے رب کی طرف رجوع کرتا ہے۔ تو اس کا رب بھی اس کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سورہ نمل میں ایک آیت کا جُز ہے۔ إِنَّهُ مِن سُلَيْمَانَ وَإِنَّهُ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ o (سورہ نمل:۳۰) ''وہ خط سلیمان کی طرف سے ہے اس طرح شروع ہوتا ہے۔ اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ ہر کام کے شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنا چاہئے جو سنت بھی ہے اور ایسا کرنے سے کام آسان ہوجاتا ہے، برکت بھی حاصل ہوجاتی ہے اور اللہ بھی راضی ہوجاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے مشرکین عرب اپنے کاموں کا آغاز بتوں کے نام سے کیا کرتے تھے۔ جب آپؐ پر پہلی وحی اُتری اسے اللہ کے نام سے شروع کیا گیا۔ فرمایا گیا: اقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ (سورہ علق:۱) ''پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے آپ کو پیدا کیا'' اس آیت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دی گئی کہ آپ کو ہر کام اللہ کے نام سے شروع کرنا چاہیئے۔ اس کے بعد آپؐ کا معمول بن گیا تھا کہ آپ ہر کام کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے کرتے تھے اور مسلمانوں کو بھی اس پر عمل کرنے کا حکم دیا۔

حضرت نوح علیہ السلام کو جب کشتی میں سوار ہونے کے لئے اللہ کا حکم ملا تو آپ نے جو کلمات پڑھے وہ قرآن میں اس طرح نقل ہوئے ہیں وَقَالَ ارۡکَبُوۡا فِیۡهَا بِسۡمِ اللّٰهِ مَجۡرٖىهَا وَمُرۡسٰىهَا۔ (سورہ ھود:۴۱) ''اللہ کے نام سے اس کا ٹھہرنا اور چلنا بھی ہے۔ اس طرح واضح ہوجاتا ہے کہ کسی بھی کام کو شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ پڑھنا اللہ کی سنت ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اطاعت کرکے اس سنت کو قائم کیا اور مسلمانوں نے اسے اپنی زندگی کا شعار بنایا۔

قرأت قرآن سے پہلے تعوذ یعنی اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم پڑھنا بھی سنت ہے اور قرآن مجید میں بھی اس کے پڑھنے کا ارشاد ہے۔ فَاِذَا قَرَاۡتَ الۡقُرۡاٰنَ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ۝ (سورہ نحل:۹۸) ''یعنی جب تم قرآن کی تلاوت کرو تو اللہ سے پناہ مانگو شیطان مردود کے شر سے''۔ لہٰذا جب قرآن شریف کی تلاوت کی جائے تو پہلے اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم اور اس کے بعد بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنا چاہیئے تاکہ اللہ کی سنت برقرار رہے۔

سورۃ الفاتحۃ

اٰیاتہا:7 رکوعھا: 1

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ(۱)

سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو سب جہانوں کا رب ہے

الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ(۲)

جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے

مَالِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ(۳)

روز جزا کا مالک ہے

اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ(۴)

ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں

اھدِنَا الصِّرَاطَ ا لمُستَقِیۡمَ(۵) صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنعَمتَ عَلَیۡہِمۡ(٦)

ہم کو سیدھا راستہ دکھا۔ ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا۔

غَیۡرِ المَغضُوبِ عَلَیۡہِمۡ وَلاَ الضَّآلِّیۡنَ(۷)

جو مغضوب نہیں ہوئے اور جو گمراہ نہیں ہیں

توضیحات: سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو سب جہانوں کا رب ہے

حَمدٌ: انسان اللہ کی مخلوق ہے اور سب مخلوقات میں بہتر مخلوق ہے۔ اس کے خالق اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی بندگی کرنے اور اس کا شکر بجالانے کے لیے ہی پیدا کیا ہے۔ اس لیے اپنے خالق اللہ ربُ العالمین کا شکر کرنا اس پر لازم ہے۔ لیکن اس میں وہ صلاحیت موجود نہیں ہے کہ وہ خود سے اپنے خالق اور معبود کا شکر کما حقہٗ ادا کرسکے اور اس کی تعریف کرسکے۔ اس لیے اللہ رب العالمین نے اسے ایک ایسی دعا سکھائی جس کے ذریعے وہ اپنے خالق، مالک اور معبود برحق کا شکر ادا کرے اور یہ شکر وہ اللہ کی تعریف کرکے بجا لاتا ہے اور کہتا ہے کہ تعریفوں کے لائق صرف وہ ذات پاک ہے جس نے کائینات بنائی اور اس کائینات میں تمام مخلوقات کو پیدا کیا جن میں انسان کو سب مخلوقات پر برتری عطا لی۔ جس نے انسان کو اشرف المخلوقات ساری مخلوقات سے برتر ہونے کا شرف بخشا اور اس نعمت کے جذبہ سے سرشار ہوکر انسان اپنے خالق حقیقی کی بارگاہ میں اپنے وجود کا شکرانہ ادا کرتا ہے۔ لیکن وہ اپنے وجود کے شکرانے کی یہ رسم پوری احسان مندی کے ساتھ بینڈ باجے اور ناچ نغمے کی دھن کے بجائے اللہ تعالیٰ کی خوبیاں بیان کرکے اور اس کی تعریفیں کرکے انجام دیتا ہے۔ اس حیثیت سے یہ انسان کی اللہ کے تئیں قدر شناسی اور احسان شناسی کا تقاضا ہے کہ وہ اس کی تعریف میں رَطبُ الّسان ہو یعنی اس ذات کریم کی بہت تعریف کرے جس نے اسے پیدا کیا اور اپنی نعمتوں سے نوازا۔ یعنی انسان اپنی احسان مندی کا اظہار کرتا ہے۔ اور خالق کائینات و مخلوقات اپنی عظیم مخلوق یعنی انسان کو تعریف کرنے کا طریقہ بھی سکھاتا ہے۔ تاکہ تعریف کرنے والا خدا کا بندہ خدا کی تعریف کرنے کا حق اچھی طرح ادا کرسکے۔ اس لیے اسے سکھایا گیا ہے کہ وہ کہے کہ سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔ اس ذات مقدس کے لیے جس نے اس کائینات کو بنایا اور اس میں تمام مخلوقات کو پیدا کیا اور جس نے ان مخلوقات میں سے اس مخلوق کو اپنی بندگی کے لیے چُن لیا جسے انسان کی شکل میں پیش کیا اور زینت و زیبائی بخشی اور قوت گویائی (بات کرنے کی قوت) عطا فرمائی۔ اسے اُسی رب نے ناطق (بولنے والا) بنایا اس لیے انسان کو زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے خالق کے بجائے کسی اور کی تعریف کرے۔ بلکہ اسے یہی زیب دیتا ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے پروردگار کی تعریف میں کہے کہ تعریفیں صرف اس اللہ کے لیے مخصوص ہیں جس نے اسے پیدا کیا اور اس کے رزق کا انتظام کیا۔ اس آیت سے ایک بڑی حقیقت سے پردہ اٹھایا گیا اور حقیقت کی اس تلوار کی پہلی ضرب سے مخلوق پرستی کی جڑ کاٹ دی گئی اور یہ بات عیاں ہوگئی کہ دنیا میں جو چیز جہاں جس حُسن، شکل اور کمال میں موجود ہے

اس کا سرچشمہ اللہ ہی کی ذات ہے کسی انسان ، کسی دیوتا، کسی سیارے اور کسی مخلوق کی ذات نہیں۔ دنیا میں جو بھی ایجادات اور دریافتیں (inventions and discoveries) ہوئی ہیں یہ ان ایجاد کرنے والوں اور دریافت کرنے والوں کے ذاتی کمال کا نتیجہ نہیں بلکہ جب خالق کائینات نے ان ایجادات کے لیے مادہ -خام مال- (matter and raw material) زمین کے اندر پیدا کرکے رکھ دیا ہے۔ تب ہی انسان نے اس میٹیریل سے استفادہ کرکے حیران کن چیزوں کو ایجاد کیا، یا اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ عقل کا استعمال کرکے اس نے کائینات میں غور وفکر کے بعد ان چیزوں کو دریافت کیا جن کی تخلیق اللہ تعالیٰ نے فرمادی ہے۔ انسان اپنے کمال سے ایک ذرہ بھی پیدا نہیں کرسکتا ہے۔ وہ جو کچھ ایجا د کرتا ہے اور دریافت کرتا ہے وہ دراصل اللہ کی پیدا کردہ شئے ہوتی ہے۔ اس لیے اسے اپنے خالق یعنی پیدا کرنے والے خدائے بزرگ و برتر کا پرستار، احسان مند، نیاز مند، شکرگزار، ثناخواں اور مدح سرا ہونا چاہیے کہ اس کے پیدا کرنے والے نے اس کے لیے زندگی کا ہر سامان پیدا کیا ہے۔ انسان پر اللہ تعالیٰ کا یہ ایک عظیم احسان ہے جسے وہ اللہ کی تعریف کرنے سے ہی اتار سکتا ہے۔

انسان اللہ تعالیٰ کا جتنا شکر اور تعریف کرتا ہے اتنا وہ اس کے نزدیک آتا ہے اور اس کی پناہ گاہ میں داخل ہوجاتا ہے۔ اس لیے انسان کو ہمیشہ اللہ کا شکرگزار بندہ بن کر اُس کی تعریف میں مشغول رہنا چاہیے۔

بیشتر اردو مترجمین نے الحمد کا ترجمہ ''تعریف'' سے کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ حمد کا لفظ شکر کے مقابلے میں زیادہ وسیع ہے اور ہر قسم کی خوبیوں اور کمالات کے اعتراف کے لیے عام ہے۔ چاہے اُن کا فیض خود حمد کرنے والے کی ذات کو پہنچ رہا ہو یا نہ پہنچ رہا ہو۔ جب کہ شکر کا لفظ صرف ان خوبیوں اور کمالات کے اعتراف کے موقعہ پر بولا جاتا ہے۔ یا ایک دوسرے کے اظہارِ ہمدردی کے لیے بولا جاتا ہے۔ لیکن بعض کا خیال ہے کہ شکر کا مفہوم ''حمد'' لفظ کا جز ہے۔ اس لیے ترجمہ کا پورا پورا حق ادا کرنے کے لیے یا تو تعریف کے لفظ کے ساتھ شکر کا لفظ بھی ملایا جائے یا پھر شکر ہی کے لفظ سے کام لیا جائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے سے ہی اپنے خالق رب العالمین کی رضا حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس کے لیے یہ مترجمین قرآن کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔ مثلاً وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدَانَا لِهٰذَا ... (سورہ اعراف:۴۳) ''شکر اللہ کا جس نے ہم کو اس مقام تک پہنچایا...''

الحَمدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ وَہَبَ لِیۡ عَلَی الۡکِبَرِ اِسۡمٰعِیۡلَ وَاِسۡحٰقَ ... (ابراہیم:۳۹) ''شکر ہے اللہ کے لیے جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق عطا فرمائے''۔ ان آیات میں ''حمد'' شکر کے معنی میں آیا ہے۔ ابن عباس سے روایت ہے کہ الحمدللہ کا معنی ''شکر اللہ کے لیے ہے'' امام طبری فرماتے ہیں الحمد للہ کا معنی ہے ''شکر خالص اللہ کے لیے ہے'' یعنی سب نعمتیں اللہ کی ہیں اس لیے نعمتوں کے پانے پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ حمد نعمتوں پر ہوتی ہے یعنی نعمت پانے والا نعمت عطا کرنے والے کی حمد کرتا ہے یعنی وہ نعمت دینے والے کا شکر ادا کرتا ہے۔ اس لیے حمد کا معنی شکر ہے لیکن اس کے برعکس جو مترجمین حمد کا ترجمہ ''تعریف'' سے کرتے ہیں ان کا خیال ہے کہ اللہ نے چونکہ انسان کو پیدا کیا اسے رزق دیا اور قسم قسم کی نعمتیں عطا کیں اس لیے اس کی قدرت اور اس کی الوہیت اور ربوبیت کی تعریف کرنا انسان کا اولین فرض ہے کہ جس خدا نے انسان کو پیدا کردیا اس کے زندہ رہنے کے لیے ہر طرح کے وسائل پیدا کردئے۔ جن پر اس کی زندگی کا دارومدار ہے۔ اس دنیا میں ہر چھوٹے سے چھوٹے وائرس سے لے کر بڑے سے بڑے چوپائے تک کوئی جاندار خدا کی رزق سے محروم نہیں ہے۔ اس لیے ایسی ذات کریم جو سب مخلوق کو رزق پہنچاتی ہے اور اپنی نعمتوں سے نوازتی ہے، قابل تعریف ہے۔ اس ذات کریم کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ کم ہے۔ حمد دراصل وہ جذبہ احساس ہے جو اللہ کے احسانات کی یاد میں مومن کے دل میں ابھرتا ہے۔ انسان کا وجود خدا کے فضل و کرم کا فیضان ہے اور یہ خدا کے احسانات ہی ہیں کہ جن سے انسان کا دل حمد و ثنا کے جذبہ سے لبریز ہوتا ہے اور ہر لمحہ، ہر لحظہ اور ہر قدم پر انسان پر اللہ کی بے حد و حساب نعمتوں کی پیہم بارش ہوتی رہتی ہے۔ ان احسانات میں اگرچہ ساری مخلوقات غرق ہیں مگر انسان پر اس کا خصوصی لطف و کرم ہے۔ اس لیے انسان اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کا زیادہ احسان مند ہے اس لیے اپنے خالق اور رازق کا احسان اپنی گردن سے اتارنے کے لیے ہر لمحہ اللہ کا شکر اور اس کی تعریف کے لیے اس کی زبان کھل جاتی ہے اور وہ اس کے شکر اور اس کی تعریف میں اس کے سامنے سر جھکاتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے وَهُوَ اللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْأُولَى وَالْآخِرَةِ (القصص:۷۰) ''اور وہی ہے اللہ، نہیں کوئی معبود اس کے سوا، اسی کے لیے ہے تعریف دنیا و آخرت میں''

مومن جب الحمداللہ کہتا ہے تو اس کے لیے اتنی بڑی نیکی لکھی جاتی ہے جو سب نیکیوں پر بھاری ہوتی ہے۔ سنن ابن ماجہ میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ ''اللہ کے ایک بندے نے کہا اے رب تیرے ہی لیے حمد ہے فرشتوں کو سخت دشواری ہوئی کہ وہ اسے کس طرح لکھیں وہ اللہ کے پاس پہنچے اور عرض کیا کہ ایک بندے نے ایک ایسی بات کہی جسے ہم سمجھ نہیں پا رہے ہیں کہ کیسے لکھیں اللہ نے پوچھا کہ میرے بندے نے کیا کہا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اس کے بندے نے کیا کہا تھا فرشتوں نے کہا کہ اُس نے کہا تیرے ہی لیے حمد ہے، اللہ نے فرمایا میرے بندے نے جیسے کہا ویسے ہی لکھ لو یہاں تک کہ وہ میرے پاس آئے تو میں اس کی جزا اسے دوں''۔

اس حدیث سے حمد باری تعالیٰ کی جو اہمیت واضح ہوجاتی ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اس سے سورہ فاتحہ کی اہمیت بھی واضح ہوجاتی ہے۔ جو نماز میں پڑھی جاتی ہے اور ہر رکعت میں دہرائی جاتی ہے اور اس طرح اللہ کی خوب تعریف کی جاتی ہے اور جس کے پڑھنے سے نیکیوں کے کھاتے میں بہت بڑا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اگر ایک آدمی اپنے فہم و شعور سے کام لے تو وہ اپنے آپ کو اللہ کی نعمتوں کے سایہ میں پائے گا۔ سخت محنت اور مشقت کا کام کرنے کے بعد وہ درخت کے سایہ میں آرام کرتا ہے۔پیاس لگنے پر پانی پی کر اپنی پیاس بجھاتا ہے۔ سردی لگ جاتی ہے تو اپنے آپ کو گرم کرنے کے لیے آگ جلاتا ہے یا بجلی سے چلنے والے ہیٹر (Heater) سے اپنے آپ کو گرم کرتا ہے۔ گرمی ستاتی ہے تو ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں میں رہ کر ٹھنڈ محسوس کرتا ہے یا الیکٹرک فین (بجلی پر چلنے والے پنکھے سے) ٹھنڈ حاصل کرلیتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے زندہ رہنے کے لیے ہر طرح کی غذا اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے فراہم کررکھی ہے اور اسے ہر قسم کی سہولیت میسر ہے۔ اس حقیقت پر اگر انسان غور کرے تو وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا میں محو رہے اور اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرتا رہے۔ الغرض اللہ کی عطا کردہ ان نعمتوں پر غور کرنے والا کبھی اللہ کا شکر اور اس کی حمد کئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔ لیکن افسوس اس بات پر ہے کہ کتنے ایسے لوگ ہیں جنہیں اللہ کی بے شمار نعمتیں میسر ہیں لیکن وہ ان نعمتوں کے عطا کرنے والے کو نہیں پہچانتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ خوش نصیب بھی موجود ہیں جو جونپڑیوں میں رہ کر نان شبینہ پر گزارا کرتے ہیں اور ہمیشہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور اس کی قدرت و خداوندی کی تعریف کرتے ہیں۔ اگرچہ انہیں دنیا کی دولت نہ ملی لیکن خدا کی حمد اور اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرکے آخرت کی ایسی دولت پانے کے حقدار بن جاتے ہیں۔ جسے پاکر وہ اتنے خوش ہوجائیں گے جس کا کوئی اندازہ نہیں۔ یعنی وہ جنت میں داخل ہوں گے۔ جہاں وہ ہمیشہ کی زندگی بسر کریں گے۔

اللہ : خدا کی اسم ذات ہے۔ یعنی خدا کا ذاتی نام ہے۔ اسم ذات وہ اسم ہے جس سے ایک چیز کی حقیقت دوسری چیزوں سے الگ سمجھی جائے۔ اس لفظ کا اطلاق کسی اور ہستی پر ہو نہیں سکتا ہے یعنی اللہ کی ذات کے برابر کوئی ذات نہیں اور نہ اس ذات و ہستی کا کوئی شریک ہے اور نہ اس کے بغیر کوئی ذات قابل عبادت واطاعت ہے۔ اسی ذات مقدس نے کائینات بنائی اور اس کے اندر موجود مخلوقات کوپیدا کیا۔ نہ اس ذات کی جمع (Plural) ہے اور نہ اس کی تذکیر وتانیث یعنی مذکر مونث ہے۔ البتہ یہ ایک واحد ذات ہے اور اس جیسی کوئی ذات نہیں ہے۔ اکثر مذہبوں میں خدا کی جمع اور تذکیر وتانیث ہے۔ جیسے دیوی دیوتا، بھگوان بھگوتی اور لوگ کئی خداؤں کو مانتے ہیں۔ اسلام میں صرف ایک خدا کا تصور ہے جس کا ذاتی نام اللہ ہے۔ مگر اس کے بہت سارے صفاتی نام ہیں۔ مثلاً رحمٰن ، رحیم، قدوس، سلام، عزیز، علیم، متکبر، غنی، ہادی، نور، بدیع، باقی، صادق، ستار، خالق، غفار، قہار، رزاق وغیرہ یعنی رحم کرنے والا، مہربان، مقدس، سلامتی والا، غالب، بہت جاننے والا، عزمت والا، نرمی کرنے والا، ہدایت کرنے والا، روشنی،پیدا کرنے والا، باقی رہنے والا، سچا، پردہ پوش، تخلیق کرنے والا، مغفرت کرنے والا، قہر کرنے ولا، رزق دینے والا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے چند صفاتی نام ہیں۔ ہم کسی کو خدا کے صفاتی نام سے پکارتے ہیں لیکن ذاتی نام سے نہیں پکار سکتے ہیں۔ یعنی ہم کسی کو رحیم غفار اور عزیز وغیرہ خدا کے صفاتی نام سے پکار سکتے ہیں۔ لیکن اس کے ذاتی نام اللہ سے نہیں پکار سکتے ہیں۔ البتہ عبداللہ یعنی اللہ کا بندہ کے نام سے پکار سکتے ہیں۔ زیادہ بہتر یہی ہے کہ اللہ کے صفاتی نام کو بھی عبدل یعنی اللہ کے بندے کے نام سے پکارا جائے۔

نزول قرآن سے پہلے عرب میں بھی الٰہ کا لفظ خدا کے اسم ذات کے لیے بولا جاتا تھا۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں میں جب توحید کے تصور میں بگاڑ پیدا ہوا۔ اور شرک کی مختلف صورتیں وجود میں آگئیں جن میں ستارہ پرستی اور بت پرستی قابل ذکر ہیں اور جوں جوں شرک کا عقیدہ بڑھتا گیا بت پرستی اور ستارہ پرستی میں اضافہ ہوتا گیا۔ لوگ جب ستاروں اور بتوں کو معبود ماننے لگے تو ان کے معبودوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ بہت سے الٰہوں اور دیوی دیوتاؤں کے نام ظہور میں آگئے۔ لیکن بت پرستی کی اس وسعت کے باوجود ایک ایسی ہستی کے تصور سے انسان کا ذہن کبھی خالی نہیں رہا۔ جو سب سے اعلیٰ اور سب کو پیدا کرنے والی ہستی ہے اس لیے کوئی نہ کوئی ایسا لفظ ضرور استعمال میں رہا جس کے ذریعے سے ایک اعلیٰ ترین ہستی کو پکارا جاتا تھا۔ عرب کے لوگ بہت سے الٰہوں ... خداؤں... کو مانتے تھے لیکن ان میں ایک بڑے خدا کا تصور بھی تھا۔ اسی طرح اہل کتاب میں بھی ایک خدا (God) کے علاوہ کئی خداؤں (gods) کا تصور پیدا ہوگیا۔ اس طرح سے خدا کے وجود کے بارے میں مذہبوں میں انارکی (Anarchy) - بد نظمی پیدا ہوگئی۔ اس مذہبی انتشار اور عقیدہ کی بے نظمی کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح دور کیا ہے وَهُوَ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْأُولَى وَالْآخِرَةِ (القصص:۷۰) ''وہ اللہ ہے اس کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں ،اسی کے لیے حمد ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی'' یعنی ایک اللہ کے بغیر کوئی اور اِلٰہ یا خدا نہیں ہے جس کی پرستش کی جائے ۔ اللہ وہ ہے جو ہر بے بس و بے کس کا حاجت روا ہے۔ جس کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے بلکہ وہ ہر جگہ پر محیط ہے۔ اُس کی پناہ گاہ میں ہر کسی کو پناہ ملتی ہے۔ وہ تمام ضرورت مندوں اور حاجت مندوں کی ضروریات اور حاجتیں پوری کرتا ہے۔ وہ تمام قوتوں سے بالاتر قوت ہے۔ وہ تمام ہستیوں سے بالاتر اور عظیم تر ہستی ہے۔ وہ پریشان حال اور اجڑے دل کو سکون بخشنے والا ہے۔ کائینات کا ایک ایک ذرہ اُس کی قدرت کے سامنے بے بس اور لاچار ہے۔ اس کے اقتدار میں کسی کو شریک نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اللہ نے اس کائینات کو پیدا کیا اور وہ اس کا نظام خود چلارہا ہے۔ اس کی فرمانروائی ایک ایسی اٹل حقیقت ہے جس سے کسی طرح کا انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ قرآن غیر اللہ کی عبادت واطاعت کو مسترد کرتا ہے اور خدائے واحد کی عبادت واطاعت پر زور دیتا ہے۔ خدا کی نازل کردہ کتاب کا استدلال یہ ہے کہ زمین و آسمان میں ایک ہی ہستی تمام اختیارات اور اقتدارات کی مالک ہے۔ وہ ہستی اللہ وحدہٗ لاشریک لہ ہے۔ یعنی وہ خدا جس کی خدائی میں کوئی شریک نہیں ہے۔ خلق اس کی، نعمت اسی کی، اقتدار اور امر اسی کا اور قوت و طاقت

اسی کے پاس ہے۔ ہر چیز چار و ناچار اسی ایک خدا کی اطاعت کر رہی ہے۔ اس کے سوا نہ کسی کے پاس کوئی اختیار ہے اور نہ کسی کے پاس کوئی اقتدار ہے اور نہ اس کے بغیر کائینات میں کسی کا حکم چلتا ہے اور نہ کوئی اس کے انتظام اور تدابیر کے رازوں سے واقف ہے اور نہ کوئی اس کی حکومت اور اختیارات میں ذرہ برابر شریک ہے۔ اس لیے اس اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور اس اللہ کے بغیر کسی سے پناہ ڈھونڈنا اور سفارش کی درخواست کرنا کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے۔ اس طرح کے تعلقات اللہ کے بغیر کسی اور سے قائم کرنا شرک ہے۔ اس قسم کے تعلقات صرف اللہ کے لیے مخصوص ہیں۔ کیونکہ وہی اکیلا صاحب اقتدار ہے۔ قرآن کا استدلال ہے وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِن دُوْنِ اللّٰهِ لاَ يَخْلُقُوْنَ شَيْئاً وَهُمْ يُخْلَقُوْن (سورہ النحل:۲۰) ''خدا کو چھوڑ کر یہ جن دوسروں کا پکارتے ہیں وہ تو کسی چیز کو بھی پیدا نہیں کر سکتے ہیں بلکہ وہ خود پیدا کیے جاتے ہیں''۔

یہ آیت ان لوگوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے جو خدائے وحدہٗ لاشریک کو چھوڑ کر درگاہوں آستانوں اور انسانوں سے اپنی حاجتیں مانگتے ہیں جب کہ قرآن شدت سے اس کی مخالفت کرتا ہے اور اس فعل کو فعل بد قرار دیتا ہے۔ صرف اللہ ہی کی ذات ہے جہاں پریشانی اور مصیبت میں پناہ ملتی ہے۔ اسی ذات کریم کی آغوش میں انسان سکون پاتا ہے۔ انسان جس قدر بھی اس ذات مقدس پر غور کرے اس کی عقل کی حیرانگی بڑھتی جائے گی کہ انسان بہرحال ایک مخلوق ہے وہ خالق کی وسعتوں کو سمیٹ نہیں سکتا ہے۔ اس کی عقل محدود ہے جب کہ اللہ کی وسعت غیر محدود ہے۔ محدود میں غیر محدود سما نہیں سکتا ہے اور انسان کے پریشان دل کو اُس وقت تک قرار نصیب نہیں ہوگا جب تک کہ وہ اللہ کا ذکر نہ کرے اور جب تک کہ وہ اس کی دی ہوئی تعلیمات سے اپنی فکر کو روشن نہ کرے۔ اللہ کی تعلیمات پر عمل کرنے سے ہی انسان کو اپنے خالق کی پہچان ہوجاتی ہے۔

رب العالمین: رب کا معنی مالک اور آقا ہے پرورش کرنے والے اور نگہبانی کرنے والے کو بھی رب کہتے ہیں۔ فرمانروا اور مدبّر و منتظم کو رب کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب معنوں میں کائینات اور اس میں موجود مخلوقات کا رب ہے۔ یعنی وہ چونکہ کائینات کا خالق -پیدا کرنے والا ہے اور جو کچھ بھی اس کائینات میں ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کا ہی پیدا کردہ ہے۔ اس لیے عقل کا تقاضا یہی ہے کہ اللہ ہی اس کائینات اور مخلوقات کا مالک ہو۔ وہی اپنی سب مخلوق کی پرورش کرتا ہے اور ان کا نگہبان بھی وہی ہے اور وہی اللہ تعالیٰ اس کائینات کا مدبر، منتظم اور فرمانروا ہے۔ عربی زبان میں سردار کو بھی رب کہتے ہیں۔ قبیلے یا قوم کا سردار اپنے قبیلے یا قوم کی اصلاح، نگہبانی اور تربیت کرتا ہے۔ رب کا معنی آقا بھی ہے، جو اپنے ماتحت غلام یا نوکر کو کام کرنے کا حکم دیتا ہے اور پرورش بھی کرتا ہے۔ ان معنوں کے لحاظ سے اللہ وہ حاکم اور آقا ہے جس کے ماتحت تمام مخلوقات ہیں اور وہ سب کا نگہبان اور پروردگار ہے۔ ایک سردار ایک قبیلے یا قوم کی دیکھ بال کرتا ہے۔ ایک آقا ایک یا ایک سے زیادہ افراد کا آقا ہوتا ہے اور ان کی پروش کرتا ہے اور ان پر حکم چلاتا ہے۔ اسی طرح ایک مالک ایک یا ایک سے زیادہ چیزوں کا مالک ہوتا ہے یا کئی پراپٹیز (properties) یا زمین کے کسی حصے کا مالک ہوتا ہے۔ مگر اللہ ربُ العالمین ہر شئے کا مالک ہے اور کوئی چھوٹی یا بڑی چیز اس کی نظروں سے غائب نہیں سمندر کی تہہ میں باریک سے باریک تر جاندار یا پہاڑ کی کسی چوٹی پر رہنے والا یا زمین کے اندر موجود کوئی جرثومہ جیسا باریک جاندار ہو اللہ کی نظر سے اوجھل نہیں۔ اس طرح اللہ ہر ایک شئے کا مالک، پروردگار اور نگہبان ہے اور ہر ایک چیز اس کی نظر میں ہے۔ چونکہ ہر جاندار اور بے جان مخلوق کو اللہ نے ہی پیدا کیا ہے۔ اس لیے وہی ہر چیز کا مالک ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کائینات کو پیدا کرکے اس نے کائینات کو چھوڑ نہیں دیا ہے۔ بلکہ وہ اپنی اس پیدا کردہ کائینات اور اس میں موجود مخلوقات کی پوری نگرانی کرتا ہے۔ سب مخلوقات اللہ کی حفاظت اور نگرانی میں ہیں۔ جاندار جنم لیتے ہیں اور پھر موت پاتے ہیں۔ لیکن ان جانداروں کا پیدا کرنے والا رب العالمین ہر آن اپنی شان میں موجود ہے اور اس کائینات کا نظام چلا رہا ہے۔

عالمین- عالم یعنی دنیا کی جمع ہے۔ رب العالمین کا مطلب سب جہانوں کا رب یا مالک ہے۔ لیکن قرآن میں عالمین اہل جہاں کے معنی میں بھی آیا ہے۔ مثلاً وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ o (سورہ الانبیاء :۱۰۷) ''اور اے نبی ہم نے تمہیں سب اہل جہاں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے''

إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ o (سورہ تکویر:۲۷)''یہ قرآن صرف یاد دہانی ہے جہاں والوں کے لیے''

وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ o (سورہ بقرہ:۴۷) ''اور یہ کہ میں نے تمہیں جہاں والوں پر برتری بخشی تھی''
ان آیات میں رب العالمین کا مطلب تمام دنیا کے لوگوں کا رب ہے۔

لیکن عالمین سے مخلوقات کی الگ الگ جنسیں بھی مراد ہو سکتی ہیں مثلاً عالم انس- انسانوں کا عالَم، عالَم ملائیکہ - فرشتوں کا عالَم، عالَم حیوانات - حیوانوں کا عالَم، عالَم طیور- پرندوں کا عالَم وغیرہ ۔ ان مخلوقات کی ضرورتیں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ لیکن رب العالمین سب کی ضروریات مہیا فرماتا ہے۔

سائنس کے مطابق اس دنیا میں مخلوقات کی الگ الگ قسمیں ہیں۔ جنہیں نوع (Species) کا نام دیا گیا ہے۔ Species- a group of living organisms consisting of similiar individuals capable of exchanging genes or interbreeding. ''نوع- جانداروں کے ایک جیسے افراد کا گروپ جو جنین تبدیل کرنے اور آپس میں نسل بڑھانے کے اہل ہوتے ہیں''۔

اس طرح جانداروں کی بہت سی قسمیں انواع ہیں۔ جن کو عالمین کہا جا سکتا ہے۔ یعنی انسانوں کا عالم، حیوانات کا عالَم، حشرات کا عالَم اور پیڑ پودوں کا عالَم اور پرندوں اور کیڑے مکوڑوں کا عالَم، سیاروں اور ستاروں کا عالَم وغیرہ۔ کائینات میں بہت سارے ستارے اور سیارے ہیں جو ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔ کائینات میں موجود بہت سی کہکشانیں ہیں جو ایک دوسرے سے اتنے دور ہیں کہ ان کی دوری کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ عالمین سے مراد مخلوقات کے الگ الگ

عالم ہوگے۔ ان عالَموں میں بھی ہر ایک نوع کا الگ الگ عالَم ہے۔ مثلاً حیوانوں میں بہت سے اقسام ہیں، پرندوں، کیڑے مکوڑوں اور پیڑ پودوں کے بھی بہت سے اقسام ہیں اور ہر قسم کا ایک الگ عالَم ہے۔ اس لیے مخلوقات کے ان تمام اقسام کو عالمین کہا جاسکتا ہے۔ اور تمام عالموں کو اللہ تعالیٰ نے ہی پیدا کیا ہے وہی ان کا مالک ہے اور وہی رب العالمین ہے۔ جو تعریفوں کے لائق ہے۔

نزول قرآن سے پہلے لوگوں نے مختلف رب بنا رکھے تھے اور مختلف ارباب جنہیں وہ الٰہ کہتے تھے کی پرستش کرتے تھے۔ جس طرح آج بھی لوگ مختلف قسم کے بتوں کو بھگوان مانتے ہیں اور ان کی پوجا کرتے ہیں۔ یہ بت پرست سمجھتے تھے کہ یہ جو کائینات کا نظام چل رہا ہے اس کے چلانے میں کسی نہ کسی طرح ملائیکہ، بزرگ انسان اور اجرام فلکی وغیرہ کا عمل دخل ہے۔ اس لیے وہ دعا، استعانت اور عبادت میں اللہ کے بجائے ان بناوٹی الٰہوں (خداؤں) کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ان کو وہ اپنے ارباب سمجھتے تھے۔ اس گمراہی کو دور کرنے کے لیے ابتدا سے انبیا آتے رہے۔ یہاں تک کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت آخری رسول تشریف لائے۔ ان سب کی دعوت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی حقیقی رب ہے اس کی ربوبیت ناقابل تقسیم ہے۔ اس کائینات کو جس نےپیدا کیا وہی اس کا مالک ہے اور وہی اس کی فرمانروائی کرتا ہے، وہی تمہارا پیدا کرنے والا ہے، وہی تمہاری عبادت کا مستحق ہے، وہی تمہاری دعاؤں کا ملجا و ماویٰ ہے، وہی تمہاری ضرورتوں کو پورا کرتا ہے، وہی آپ کا مالک ہے، وہی بادشاہ ہے، وہی قانون ساز ہے اور وہی تمہارا کارساز ہے۔

اس حقیقت کے پس منظر میں اللہ تعالیٰ نے رب العالمین یعنی سب جہانوں کا رب ہونے کا اعلان فرمادیا اور ان سارے خودساختہ ارباب، الٰہوں، معبودوں اور بھگوانوں کو کالعدم قرار دیا اور صرف اس ایک اللہ کی بندگی کا حکم صادر فرمایا جو پوری کائینات اور کائینات میں موجود مخلوقات کا خالق اور مالک ہے اور رب العالمین ہے یعنی ہر جاندار اور بے جان مخلوق کا رب ہے اور اس رب العالمین کے بغیر کائینات میں کوئی رب نہیں۔ کائینات کا ذرہ ذرہ اس کی اطاعت وعبادت میں مشغول ہے۔ تمام حیوانات، نباتات اور حشرات رب العالمین کے کنٹرول میں ہیں۔ اس رب العالمین کی بارگاہ میں انسان بھی مجبور ہے۔ اگرچہ اسے اشرف المخلوقات ہونے کے ناطے اچھے اور برے اور نیکی اور بدی کا اختیار حاصل ہے اسے رب العالمین کی بارگاہ میں سرخم کرکے توبہ و استغفار میں رہنا چاہیے تاکہ اسے اس گمراہی سے نجات ملے جس گمراہی میں وہ مبتلا ہوچکا ہے۔

بہت سے لوگ خدا کو کائنات کا واحد خالق ماننے کے باوجود یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ کائنات کے متعدد رب ہیں جن کا حکم چلتا ہے۔ یہ بات اگرچہ عجیب اور مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے مگر دنیا میں ہمیشہ موجود رہی ہے۔ قرآن نے مشرکین کے ایک گروہ کا قول نقل کیا ہے، جس میں ان کے ارباب کے متعلق ذکر ہے مَا نَعۡبُدُهُمۡ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَآ إِلَى ٱللَّهِ زُلۡفَىٰٓ... (سورہ الزمر:۳) ''ہم ان کی پرستش صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں خدا سے قریب کریں۔'' اہل کتاب کے ایک گروہ کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ٱتَّخَذُوٓاْ أَحۡبَارَهُمۡ وَرُهۡبَٰنَهُمۡ أَرۡبَابٗا مِّن دُونِ ٱللَّهِ ...(سورہ توبہ:۳۱) ''انہوں نے اپنے علما اور مشائخ کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا ہے''

عدی بن حاتمؓ جو اسلام لانے سے پہلے عیسائی تھے، نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے بارے میں پوچھا کہ ہم نے کب اپنے علما و مشائخ کو رب بنایا اور ان کی عبادت کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا ایسا نہیں ہوا کہ جس چیز کو انہوں نے حلال کیا اسے تم نے حلال سمجھا اور جسے حرام کیا اسے حرام سمجھا، انہوں نے کہا ہاں تو آپ نے فرمایا یہی ان کی عبادت ہے کہ تم نے اللہ کے حکم کو چھوڑ کر اپنے علما اور مشائخ کے حکم پر عمل کیا۔

افسوس کی بات ہے کہ آج بھی بہت سے دین دار مسلمانوں نے یہی روش اختیار کر رکھی ہے۔ انہوں نے کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے اپنے علما اور مشائخ کے فرمودات کو دین سمجھ لیا ہے اور دین سے بیگانہ ہوکر بے دین راہنماؤں کی غیر مشروط اطاعت قبول کرلی ہے اور اللہ کے احکام اور قانون کے بجائے لادین قانون اور اصول کو بہتر سمجھتے ہیں اور ان بے دین اصولوں کو قانون الٰہی پر ترجیح دیتے ہیں۔ رب العالمین کی اس آیت نے اللہ تعالیٰ کی کامل ربوبیت کو ظاہر کردیا اور مذہب کی بدنظمی (Anarchy) کو ختم کردیا اور اس عقیدے کو مضبوط کردیا کہ سب انسان ایک ہی رب کی طرف رجوع کریں۔ اور ایک ہی سیادت و قیادت کو تسلیم کریں اور مختلف ارباب (خداؤں) کے عقیدے اور اقتدار کے بوجھ کو اتار دیں تاکہ مختلف خداؤں کی پرستش کی مصیبت سے نجات پاسکیں اور رب العالمین کی ربوبیت کے زیر سایہ سکون پاسکیں اور انہیں اس بات کا اطمینان ہوجائے کہ اللہ رب العالمین کی سرپرستی و حفاظت دائمی اور لازوال ہے۔ یہ ہے اسلام کا تصور خدا جو ارسطو (Aristotle) جیسے بڑے بڑے فلسفیوں (Philosphers) کے تصور خدا سے قطعی مختلف ہے۔ جن کا خیال تھا کہ خدا نے کائینات کو پیدا تو کردیا مگر وہ اس کا انتظام نہیں چلا رہا ہے۔ God is the creator of the universe but not the sustainer of it. (theory of Deism) ''خدا نے کائینات کو پیدا تو کیا لیکن وہ اس کا رب یعنی نظام چلانے والا نہیں ہے''

انسانوں کے اس نظریہ کو رب العالمین نے بے بنیاد قرار دیا ہے اور اپنا تعارف اس طرح فرمایا ہے ... هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُo خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ...(سورہ زمر:۵،۴) ''وہ اللہ اکیلا ہے اور سب پر غالب ہے۔ اسی نے آسمان اور زمین برحق پیدا کیے۔'' ...فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِيْنَo هُوَ الْحَيُّ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَo (مومن:٦٤، ٦٥) ''پس بہت ہی بابرکت ہے اللہ جو پوری کائینات کا رب ہے۔ وہی زندہ جاوید ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں لہٰذا تم اسی کی عبادت کرو دین کو اُسی کے لیے، خالص کرکے سب تعریفیں اللہ رب العالمین کے لیے ہیں''

مذہب اور عقیدہ کی انارکی اور مختلف خداؤں کے عقیدوں میں بھٹکنے پھرنے کی مثال آج بھی دنیا کے مشرکانہ مذاہب میںموجود ہے۔ ان مشرکانہ مذاہب میں خرافات کا اتنا انبار ہے کہ انسان تا عمر بھٹکتے رہے اور کبھی ساحل نہ پاسکے۔ جب تک انسان کا اپنے خدا اور اس کی صفات سے متعلق تصور اور عقیدہ واضح نہ ہو اور اوہام اور خرافات کے انبار سے نجات پاکر واضح اور محکم فکر و یقین سے بہرہ ور نہ ہو تب تک وہ کائینات کے خالق و مالک رب العالمین کو پہچان نہیں سکتا۔ اسلام کی اولین توجہ اسی امر کی طرف ہے کہ عقیدہ کو پاک و صاف کرکے مستحکم کیا جائے اور اللہ کی ذات و صفات سے مخلوقات کا تعلق اور مخلوقات کا اس سے تعلق کے عقیدہ کو اس طرح واضح کردیا جائے کہ انسانی قلب و ضمیر پورے اطمینان کے ساتھ رب العالمین سے وابستہ ہوجائے۔ اس عقیدے کی آبیاری سے خالص اور کامل توحید جس میں شرک کا کوئی شائبہ تک نہ ہو اسلامی فکر کی اولین اساس ہے۔ اسلام نے توحید کے تصور کو انسانی ضمیر کے لیے واضح کردیا اور اس سلسلے میں ہر طرح کے شک و شبہات دور کردئے تاکہ توحید کا تصور ہر طرح سے پاک ہوجائے اور دل و دماغ میں اس طرح پیوستہ ہوجائے کہ وہم و گمان کو اس میں داخل ہونے کی کوئی گنجائش نہ رہے جو ان بے ہودہ فلسفوں، عقیدوں، قصوں، کہانیوں اور خرافات میں انسانوں کو بتلا کردیتا ہے۔ جاہلیت کے عقائد، تصورات اور فلسفوں کو چھوڑ کر الوہیت اور ربوبیت پر اگر انسان غور کرے تو اس پر یہ بات پوری طرح منکشف ہوجائے گی کہ اسلامی عقیدہ عظیم رحمت ہے جس میں دین کی وضاحت بھی ہے اور توازن بھی برقرار ہے، تو فوراً اس کی زبان پر الحمد اللہ رب العالمین کے الفاظ جاری ہوں گے۔ یعنی سب تعریفیں اس رب کے لیے ہیں جو تمام عالمین کو تھامے ہوئے ہے اور جس نے کائینات بنائی اور اس کے اندر موجود ہر مخلوق کوپیدا کیا اور انسان کو ایک بہترین ساخت میںبنایا اور اسے تمام مخلوقات پر برتری عطا کی۔ لہٰذا انسان کی زبان پر ہمیشہ اپنے خالق و مالک رب العالمین کی بارگاہ میں عاجزی و انکساری کے ساتھ صدائِ الحمد اللہ رب العالمین کی گونج ہوگی۔

جو بڑا مہربان، رحم والا ہے

رحمٰن: بڑا مہربان، بہت رحم کرنے والا اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموںمیں ایک نام ہے۔

رحیم: مہربان، رحم کرنے والا، شفیق، ہمدردیہ بھی اللہ تعالیٰ کا ایک صفاتی نام ہے۔

اللہ خدائے تعالیٰ کی اسم ذات ہے۔ اسم ذات وہ اسم ہے جس سے ایک چیز کی حقیقت دوسری چیزوں سے الگ سمجھی جائے۔ اس طرح لفظِ اللہ خدائے تعالیٰ کا ذاتی نام جو صرف اسی کے لیے مخصوص ہے۔ عرب کے لوگ خدا کو الٰہ کہتے تھے اور ان کے الٰہوں کے تعداد ایک سے زیادہ ہوتی تھی۔ اس عقیدہ کو ختم کرنے کے لیے خدائے تعالیٰ نے سورہ فاتحہ میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی آیت میں اپنے ذاتی نام ''اللہ'' سے اپنا تعارف کرایا۔ قرآن پڑھنے والا قرآن کی تلاوت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کرتا ہے اور مسلمان ہر کام کو شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھتا ہے۔ یعنی میں یہ کام اس اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔

رحمٰن اور رحیم کے مفہوم کے سلسلے میں اکثر مترجمین اور مفسرین کی رائے ہے کہ رحمٰن اور رحیم دونوں ہم معنیٰ ہیں، مگر رحمٰن میں صیغہ مبالغہ ہے۔ رحمٰن کا مطلب سب سے بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ سب سے بڑا مہربان اور رحم کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ کوئی انسان نہیں کیونکہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے ہی پیدا کیا ہے۔ اس لیے یہ نام صرف اللہ کے لیے مخصوص ہے اور کسی بندے کے لیے نہیں۔ اس لیے کسی بندے کو رحمٰن کے نام سے پکارنا جائز نہیں ہے۔ رحیم کا مطلب مہربان، شفیق، ہمدرد اور رحم کرنے والا ہے۔ انسان تو ایک دوسرے کے ہمدرد اور شفیق ہوتے ہیں اور ایک دوسرے پر مصیبت یا تکالیف کے وقت رحم دلی کا اظہار کرتے ہیں۔ جب ایک انسان دوسرے انسان کو مصیبت اور تکلیف کے وقت کام آتا ہے اور اس کی مدد کرتا ہے تو وہ اس کے لیے رحیم ہوتا ہے۔ یعنی وہ اس پر رحم کرتا ہے کہ وہ اس کی مدد کرتا ہے۔ اس لیے انسان کو ہم رحیم کہہ سکتے ہیں اور اس نام سے پکار سکتے ہیں۔ لیکن مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کسی انسان کو اللہ تعالیٰ کے ذاتی نام یا صفاتی نام سے براہ راست (directly)پکارنا شرک ہے۔ اس لیے اس شرک سے بچنے کے لیے اللہ کے ذاتی یا صفاتی نام میں عبد ال وغیرہ شامل کرنا ضروری ہے۔ یعنی عبداللہ، اور عبدالرحمان، عبدالرحیم کے نام سے جب کسی کو پکارا جائے تو اس میں کوئی شرک نہیں ہے۔

رحمٰن اور رحیم کے الفاظ میں ایک اور پہلو سے بھی فرق ہے۔ وہ یہ ہے اللہ کی طرح رحمٰن بھی قرآن مجید میں اسم علم کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ اسم علَم وہ اسم ہے جو کسی خاص شخص یا چیز کا نام ہو مثلاً اللہ ایک خاص ذات کا نام ہے۔ جو کسی اور شخص کے لیے بولا نہیں جا سکتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں رحمٰن کا نام بھی قرآن میں اسم علَم کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً اَلرَّحۡمٰنُ عَلَی الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰی (طٰہٰ:۵) ''رحمٰن عرش پر مستوی ہوا۔ وَعِبَادُ الرَّحۡمٰنِ الَّذِیۡنَ یَمۡشُوۡنَ عَلَی الۡاَرۡضِ ھَوۡنًا (فرقان:۶۳) ''اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر وقار کے ساتھ چلتے ہیں''۔ الرَّحۡمٰنُ o عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ o (الرحمٰن:۲،۱) ''رحمان نے قرآن سکھایا''۔ قُلِ ادۡعُوا اللّٰہَ اَوِ ادۡعُوا الرَّحۡمٰنَ اَیًّا مَّا تَدۡعُوۡا فَلَہُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی... (بنی اسرائیل:۱۱۰) ''کہو - اسے اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر جس نام سے بھی پکارو اس کے سب نام اچھے ہیں''۔ ان آیات میں الرحمٰن جو اللہ کا صفاتی نام ہے اسم علَم یعنی اللہ کے ذاتی اور مخصوص نام کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ تاہم یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اللہ کے سب نام اچھے ہیں۔ اس لیے چاہے اللہ کو اس کے ذاتی نام سے پکارو یا صفاتی نام سے یہ سب نام اللہ کے اچھے نام ہیں۔ لیکن اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ کسی کو جب پکارنا ہو تو اللہ کے بندے کے نام سے پکارنا بہتر اور جائز ہے۔ یعنی عبدالرحمٰن - رحمٰن کے بندے کہہ کر پکارنا صحیح ہے۔ اللہ تعالیٰ رحمٰن اور رحیم ہے۔ یعنی بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ انسان پر اللہ نے جو رحم فرمایا ہے اگر وہ اس پر غور کرے تو اسے فوراً یہ حقیقت سمجھ میں آجائے گی کہ اللہ نے انسان کو پیدا کیا اور اس کی زندگی کو وہ زینت اور زیبائی بخشی جس سے اسے ہر مخلوق پر برتری حاصل ہو گئی۔ دراصل اللہ تعالیٰ نے انسان کو بندگی اور عبادت کے لیے ہی پیدا کیا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے: وَمَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَالۡاِنۡسَ اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنِ ''یعنی میں نے جن و انس کو صرف اس لیے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں''۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو عدم سے وجود میں لایا۔ یعنی نیستی (نہ ہونا) سے کائنات پیدا کی۔ The universe was created out of nothing. اور اس کائنات میں مختلف قسم کی مخلوقات پیدا کی۔ اور ہر مخلوق کے لیے سامان زندگی فراہم کیا اور ہر ایک کی نگرانی اور نگہبانی کر رہا ہے۔ انسان کو اشرف المخلوقات یعنی سب مخلوقات میں بہتر مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا۔ تاکہ اس سے اپنی بندگی اور عبادت کرائے۔ اسے زندہ رہنے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت تھی ان کو پیدا کیا اور انسان کے لیے ہر طرف سے اللہ کی نعمتوں کا فیضان ہے۔ اور اس فیضان نعمت سے وہ اپنی ساری مخلوقات کو نوازتا

ہے۔ سورج، چاند، ستارے، ہوا، بارش، دریا، سمندر، پہاڑ، پیڑ پودے، ندی نالے اور سرسبز لہلہاتی کھیتیں اور چراگاہیں، سبزہ زار اور گلستان و بوستان انسان کی زندگی کے لیے پیدا کیے۔ ہر طرح کی نعمت انسان کو میسر ہے جو اللہ تعالیٰ کے رحمٰن اور رحیم ہونے کا ثبوت پیش کررہی ہے۔ انسان جو رزق کھاتا ہے وہ اللہ کے کرم اور اس کی مہربانی سے ہی کھاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے یاد دلاتا ہے: فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ إِلَىٰ طَعَامِهِ۝ (سورہ عبس:۲۴) ''انسان کو چاہیے کہ اپنے کھانے کو دیکھے''۔

انسان کو چاہیے کہ اپنے کھانے پر غور کرے کہ وہ جو غذا کھاتا ہے وہ کہاں سے آتی ہے۔ یقینا وہ زمین میں دانہ بو کر یا پیڑ پودے لگا کر کاشت کاری کر کے اپنا رزق تلاش کرتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ زمین میں بوئے ہوئے اس دانہ کو زمین سے فصل کی صورت میں کون اگاتا ہے۔ یہ پیڑ پودے جن کے لذیذ میووں سے وہ لطف اٹھاتا ہے کس نے پیدا کیے۔ اور یہ ہوا، پانی جس پر انسانی زندگی کا دارومدار ہے کس نے پیدا کیے۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات کے لیے پیدا کیا ہے۔ جن میں انسان سب سے زیادہ خوبصورت اور باشعور مخلوق ہے۔ جسے اللہ نے اپنی بندگی کے لیے چُن لیا ہے۔ یہ سب کچھ انسان پر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے اور اس کے رحمٰن اور رحیم ہونے کا ثبوت ہے۔ نوعِ انسانی اس رحمٰن اور رحیم خدائے وحدہٗ لاشریک کی نظر عنایت کی محتاج ہے۔ انسان کے لیے خدائے رحمٰن و رحیم نے جو بے شمار نعمتیں پیدا کیں سراسر رحمت ہیں۔ اگرچہ انسان اللہ کی عطا کردہ ان نعمتوں کا قدر شناس نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر سب سے بڑا رحم یہ کیا ہے کہ اس نے ان کی راہنمائی کے لیے رسول بھیجے اور کتابیں نازل کیں اور قرآن مجید کو آخری کتاب کے طور پر نازل فرمایا۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری رسول کی حیثیت سے بھیجا اور یہ راہنمائی اور ہدایت انسانوں کے لیے سراسر رحمت ہے۔ جو خدائے رحمٰن و رحیم نے ان کی طرف بھیجی ہے۔ اس راہنمائی اور ہدایت کو اس نے رحمت سے تعبیر کیا۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے: وَاِنَّہٗ لَہُدًی وَّرَحۡمَۃٌ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ o (نمل:۷۷) ''یہ قرآن مومنوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے'' ۔... وَرَحۡمَتُ رَبِّکَ خَیۡرٌ مِّمَّا یَجۡمَعُوۡنَ o (زخرف:۳۲) ''تیرے رب کی رحمت (قرآن) بہتر ہے ان تمام خزانوں سے جن کو یہ لوگ جمع کرتے ہیں'' ۔ وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ o (انبیا:۱۰۷) ''اور (اے رسول) ہم نے تمہیں سارے جہانوں کے لیے رحمت ہی رحمت بنا کر بھیجا ہے''۔

اللہ تعالیٰ نے رسول کریم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمت بنا کر بھیجا ہے جو تاقیامت مکمل راہنما، آئیڈیل (ideal) اور نور کا مینار بن کر قائم رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان پر اپنی نعمت اور رحمت کے دروازے کھول دئے اور بے حدو حساب نعمتیں عطا کیں لیکن اسے بے لگام اونٹ کی طرح آزاد نہیں چھوڑا۔ بلکہ اسے اپنی عبادت کا پابند بنادیا اور اسے اس بات کی یقین دہانی کرائی کہ ایک دن جسے قیامت کا دن کہا گیا ہے اسے اللہ تعالیٰ کے پاس حاضر کیا جائے گا۔ اور جو نعمتیں اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کی تھیں ان کا وہ حساب لے گا۔ اسے کہا جائے گا میں نے تمہیں انسان بنایا تھا اور اتنی ساری نعمتیں عطا کیں تھیں۔ لیکن تم نے حیوان کی طرح زندگی گزاری تمہیں اپنی ذمہ داریوں کا کوئی احساس نہ رہا۔ تم نے دنیا میں خرمستی کی اور عیش و عشرت کی زندگی گزاری۔ تمہیں خدا کی عبادت کرنے کے لیےپیدا کیا گیا تھا لیکن توخدا کو بھول گیا۔ تم نے ان ساری نعمتوں کے باوجود نفس پرستی اور شیطان کی پیروی کی اب تم کو ان گناہوں کا مزہ چکھنے کے لیے جہنم میں داخل کیا جائے گا۔ اور تم کو ہمیشہ کے لیے وہاں ہی رہنا ہے۔ اسے اب یاد آئے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے فرمایا تھا: أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثاً وَ أَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ٥ (مومنون:۱۱۵) ''کیاتم نے گمان کررکھا ہے کہ ہم نے تمہیں عبس اوربیکارپیدا کیا اور تم ہماری طرف نہیں لوٹائے جاؤگے''۔ اب اسے اللہ تعالیٰ کے رحمٰن رحیم ہونے کا احساس ہوگا۔ مگر اسے پچھتانے کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔

روز جزا کا مالک

یوم دین سے مراد روز جزا ہے یعنی وہ دن جب تمام اگلی پچھلی نسلوں کو رب العالمین کی بارگاہ میں اپنے عملوں کا حساب چکانے کے لیے حاضر کردیا جائے گا۔ سب لوگ خوفزدہ، لرزاں اور حیران ہوں گے۔ بارگاہ الٰہی میں کسی کو بات کرنے کی اجازت نہ ہوگی سوائے اس کے جسے اللہ تعالیٰ اجازت فرمائیں گے۔ يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفّاً لَّا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَنُ وَقَالَ صَوَاباً٥ (النبا:۳۸) ''جس دن روح اور فرشتے صفوں میں کھڑے ہوں گے کوئی نہ بولے گا سوائے وہ جسے رحمٰن اجازت دے اور وہ ٹھیک بات کہے'' اس دن کا مالک اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں ہے۔

عقیدہ آخرت اسلامی عقیدوں میں ایک اہم اور خاص عقیدہ ہے۔ جس قدر انسان کا عقیدۂ آخرت مضبوط ہواس قدر اس کا ایمان بھی مضبوط ہے اور اس قدر اس کی زندگی پاکیزہ ہے اور اس کا عمل صحیح اور صالح ہے۔ اسے دنیائی فکر کی نسبت آخرت کی فکر زیادہ ہوتی ہے۔ آخرت کی زندگی اور خدا کے روبرو جواب دہی کا احساس ہی اسے برائیوں سے دور رکھ سکتا ہے اور اسے خدا کے قریب لاسکتا ہے۔ یہ زندگی دراصل آخرت کی کامیابی کا امتحان ہے جو اس امتحان میں کامیاب ہوجائے گا وہ آخرت میں اس کی جزا پائے گا اور جو ناکام ہوجائے گا وہ آخرت میں اس کی سزا پائے گا۔

رب العالمین کائینات کے ذرے ذرے کا مالک ہے۔ کیونکہ کائینات کے ذرے ذرے کو اسی نے وجود بخشا ہے اور ہر چیز کی بقا اسی کے رحم وکرم پر ہے۔ تو پھر ''اللہ تعالیٰ کے روز جزا کا مالک'' فرمانے کی کیا ضرورت تھی۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اختیار دے دیا کہ وہ دنیا میں اپنی زندگی بسر کرنے کے لیے کسی نہ کسی طرح اپنی ملکیت بنائیتاکہ اپنےپیٹ کی آگ بجھانے کے لیے اللہ کا فراہم کیا ہوا رزق تلاش کریں۔ لیکن اس عارضی ملکیت کے نشے میں چور انسان سمجھ بیٹھا ہے کہ میں اس ملکیت اور پراپرٹی کا مالک ہوں۔ جس کا اختیار اللہ نے اسے دے دیا ہے۔ اور اس محدود اختیار کو حاصل کرکے وہ دنیا میں بے لگام اونٹ کی طرح زندگی گزارتا ہے۔ اور آخرت کی کوئی فکر نہیں کرتا ہے۔ اسے یہ خیال تک بھی نہیں آتا ہے کہ ایک دن یہ دنیا فنا ہوجائے گی۔ اور مجھے دنیا بنانے والے اور اس میں انسانوں کو بسانے والے کے سامنے اپنی زندگی کے ہر کام کا جواب دینا ہے۔ مالک یوم الدین - روز جزا کا مالک کی آیت سے انسانوں کو اطلاع دی گئی اور انہیں متنبہ کیا گیا کہ ایک دن ضرور آئے گا جب آپ کو اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے۔ اور ہر ایک انسان کو اپنی زندگی کے بارے میں ہر چیز کا جواب دینا ہے۔ اس دن کا مالک اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں ہے۔ اس کی تعلیم کے لیے اللہ نے رسول بھیجے جو انسانوں کو خدا کی عبادت اور اس کی بندگی کرنے کی ہدایت دیتے ہیں۔ اور یوم الدین یعنی قیامت کے دن اپنے خالق ومالک کے سامنے کھڑے ہونے کی اطلاع دیتے ہیں۔ اس دن دنیا کی عارضی ملکیت رکھنے والے جو اپنی ملکیتوں پر ناز کرتے تھے خدا کے سامنے ہاتھ اٹھاکر کھڑے ہوں گے اور بڑے بڑے حکمران جنہیں ان کے اقتدار نے فریب میں بتلا کر رکھا تھا، اس کے سامنے سر جھکائے سہمے ہوئے کھڑے ہوں گے۔ پھر اس دن اللہ ذو لجلال، واحد القہار اعلان فرمائیں گے: اے دنیا کے حکمرانو! دنیا میں دھوکہ کھاکر تم نے میری حکمرانی اور میرے اقتدار کو نظر انداز کیاآنکھیں کھول کر دیکھو کہ آج کس کی حکومت اور کس کا اقتدار ہے۔ تمہارے وہ اقتدارات اور جاہ وحشمت اور جلال کہاں ہیں۔ اور تمہاری وہ حکمرانیاں کہاں گئیں۔ آج یومُ الدین- روز جزا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس کا مالک ہے۔ جس کی اطلاع تم کوپیغمبروں نے دی تھی۔ مگر تم نے اس اطلاع کو نظرانداز کیا۔ تم نے اس پر عمل نہیں کیا۔ اس دن کا حال یہ ہوگا کہ خدا کے مقرب بندے بھی سر جھکائے کھڑے ہوں گے۔ اور خدا کے رسول اور انبیا بھی زبان کھولنے کی ہمت نہ کرسکیں گے۔ اس دن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: یَوۡمَ ھُم بَارِزُونَ لَا یَخۡفَی عَلَی اللہِ مِنۡھُمۡ شَیۡئٌ لِّمَنِ الۡمُلۡکُ الۡیَوۡمَ لِلّٰہِ الۡوَاحِدِ

الْقَهَّارِo الْيَوْمَ تُجْزَى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ إِنَّ اللهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِo (مومن:۱۷،۱۶) ''وہ دن جب سب لوگ بے پردہ ہوں گے ان کی کوئی بات اللہ پر چھپی نہ ہوگی اس دن پوچھا جائے گا کہ آج کس کی بادشاہی ہے؟! سارا عالم پکار اٹھے گا اللہ واحد القہار کی۔ آج ہر شخص کو اس کی کمائی کا بدلہ دیا جائیے گا۔ آج کسی پر ظلم نہ ہوگا بے شک اللہ بہت جلد حساب چکانے والا ہے''۔

یہ دنیا جزا و سزا کے لیے نہیں ہے۔ یہ دارالعمل ہے۔ یہاں انسانوں کو عمل کرنے کے لیے مہلت دی گئی ہے۔ تاکہ انسان آنے والے قیامت کے دن کی تیاری کر سکیں۔ یہاں وہ جو کچھ کریں گے اس کا بدلہ آنے والے اُس دن میں پائیں گے۔ نیکی کرنے والوں کو نیکی کا اجر ملے گا اور برائی کرنے والوں کو برائی کا بدلہ ملے گا۔ اس لیے دنیا کے ہر شخص کو یوم الدین یعنی قیامت کے دن کی جوابدہی کا احساس ہونا چاہیے۔ عائد کی گئی ذمہ داری چاہے انفرادی ہو یا اجتماعی، اس کی ادائیگی انسان پر واجب ہے۔ لیکن ذمہ داری نبھانے والے خدا کے بندے کو دنیا میں تکلیف بھی پہنچ سکتی ہے۔ یہ اس کی آزمائش ہوتی ہے کہ وہ کس حد تک اللہ کی راہ پر ثابت قدم رہتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی برائی کرنے والے شخص کو دنیا میں اچھی اچھی نعمتیں میّسر ہوتی ہیں اور دنیا میں وہ خوشحال نظر آتا ہے یہ بھی اس کی آزمائش ہے کہ وہ کس حد تک خدا کی بندگی اور فرمانبرداری کے بجائے سرکشی اور نافرمانی پر قائم رہتا ہے۔ یوں انسانی زندگی کے تمام راز اور اسرار یوم الدین میں کھل جائیں گے جہاں نیکوکاروں کو نیکیوں کی جزا اور بدکاروں کو ان کی بدیوں اور بدکاریوں کی سزا ملے گی۔

اس کارخانہ الٰہی میں دنیا کی دولت اور عیش و آرام کس کو ملتے ہیں اور کس کو نہیں اور مصیبتوں اور تکالیف میں کون مبتلا ہے اور کون نہیں، ان حکمتوں اور مصلحتوں کو اللہ کے بغیر کوئی نہیں جانتا ہے۔ البتہ جو شخص ہمیشہ آخرت کی فکر میں موت کو یاد کرتا ہے وہی شخص خدا کی بندگی اور فرمانبرداری پر قائم رہ سکتا ہے۔ اور جو موت اور آخرت کو بھول جاتا ہے وہ گمراہی اور خدا کی نافرمانی میں ملوث ہوجاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رفع حاجت کے لیے نکلے اور میں پانی کا برتن لے کر ہمراہ ہوگیا۔ رفع حاجت سے فارغ ہوکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً زمین پر بیٹھ کر تیمم فرمایا پھر مجھ سے پانی طلب کیا اور اس کا استعمال فرمایا۔ میں نے عرض کی اے اللہ کے رسول میں آپ کے قریب تھا اور میرے پاس پانی آپ کے استعمال کے لیے حاضر تھا آپ نے تیمم کیوں فرمایا آپ نے ارشاد فرمایا ''عبداللہ کیا مجھے اس بات کا یقین ہوسکتا تھا کہ پانی تک پہنچنے سے پہلے اللہ مجھے اپنے پاس نہ بلالے! اس بات سے یہ تصور دینا مقصود تھا کہ موت کو ہر وقت اپنے قریب جانو ے

جوہر انسان عدم سے آشنا ہوتا نہیں

آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں

موت انسان کی دنیائی زندگی کا خاتمہ ہے لیکن انسان فنا یعنی نیست و نابود نہیں ہوجاتا ہے۔ اس کا مادہ (Matter) موجود رہتا ہے جسے آخرت میں دوسری زندگی ملے گی۔ انسانوں اور جنوں کے علاوہ جتنی بھی جاندار مخلوق ہیں، وہ اپنی طبعی (Natural) عمر کو پہنچ کر زندگی کا سفر ختم کردیتی ہیں اور اپنی جبلی (instinctive)ذمہ داریاں پورا کرکے خاک میں مل کر فنا ہوجاتی ہیں، کیونکہ انہیں اسی مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ انسان اس طرح کی موت پاکر فنا نہیں ہوجاتا ہے۔ کیونکہ اسے خدا کی بندگی کے لیےپیدا کیا گیا ہے۔ اور اسے جواب دہی کے لیے آخرت میں حاضر کیا جائے گا۔ اس لیے انسان موت کے بعد فنا نہیں ہوجاتا ہے بلکہ وہ اپنی دنیاوی ذمہ داریوں سے فارغ ہوکر دوسری دنیا یعنی آخرت میں پہنچ جاتا ہے۔ جہاں اسے اللہ کے سامنے اپنی ذمہ داریوں کا حساب دینا ہے۔ اس کی واپسی کے لیے ارشاد فرمایا گیا ہے : قُلْ إِنَّ الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّونَ مِنْہُ فَإِنَّہُ مُلَاقِیْکُمْ ثُمَّ تُرَدُّونَ إِلَی عَالِمِ الْغَیْبِ وَالشَّہَادَۃِ فَیُنَبِّئُکُم بِمَا کُنتُمْ تَعْمَلُونَo (جمعہ:۸) ’’بے شک وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو، اس سے ملنا ہی ہے پھر اس خدا کے پاس لوٹائے جاؤگے جو حاضر و غائب کو جاننے والا ہے اور وہ تم کو تمہارے کرتوت بتائے گا‘‘۔ إِلَی اللہِ مَرْجِعُکُمْ جَمِیْعاً (مائدہ:۴۸)’’تم سب کو خدا کی طرف لوٹ کر کا جانا ہے‘‘۔

ہر انسان کے وفات پر یا کوئی نقصان ہونے پر یہ کلمات اِنَّ لِلہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُوْنَ پڑھے جاتے ہیں۔ یعنی ہم سب خدا کی پیدا کردہ مخلوق ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جائیں گے۔ کافر اور خدا کے نافرمان اور گنہگار بندوں کی موت کا ذکر اس طرح فرمایا گیا ہے وَلَوْ تَرَیٰ إِذِ الظَّالِمُونَ فِي غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَالْمَلَائِکَۃُ بَاسِطُو أَیْدِیہِمْ أَخْرِجُوا أَنفُسَکُمُ الْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْہُونِ بِمَا کُنتُمْ تَقُولُونَ عَلَی اللہِ غَیْرَ الْحَقِّ وَکُنتُمْ عَنْ آیَاتِہِ تَسْتَکْبِرُونَ o (سورہ انعام:۹۳) ’’اگر تم دیکھو جس وقت گنہگار موت کی بے ہوشی میں ہوں گے اور فرشتے ہاتھ کھولے کہہ رہے ہوں گے نکالو اپنی جسموں کے اندر سے اپنی روحوں کو آج تم کو اس پر ذلت کی سزا ملے گی کہ تم خدا کی شان میں جھوٹی باتیں کہتے تھے اور ان کی باتوں کو ماننے سے انکار کرتے تھے۔ ‘‘

جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا اور اپنی زندگی کے انجام اور آخرت کو یاد رکھا اور اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اللہ سے ملاقات کرنی ہے اور موت کو ہمیشہ یاد کرتے ہیں ان کی سعید روحوں کو موت کے وقت یہ صدا سنائی دیتی ہے: یَا أَیَّتُہَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُo ارْجِعِیٓ إِلَی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃًo (فجر:۲۸،۲۷) ''اے مطمئن روح! تو اپنے مالک سے خوش اور تیرا مالک تجھ سے خوش تو اپنے مالک کے پاس چلی جا''۔

جب تک انسان موت کی حقیقت کو نہ سمجھے اور اس پر غور کرکے اپنی منزل - آخرت کو نہ سمجھے تب تک وہ راہ راست پر نہیں آسکتا ہے۔ بلکہ وہ اس دنیائے فانی میں دردر کی ٹھوکریں کھاتا رہے گا اور آخر میں موت پاکر رسوائی کی حالت میں خدا کی بارگاہ میں حاضر ہوجائے گا۔ انسان مہلت عمل کو ختم کرکے خدا کی بارگاہ میں پیش ہونے کے لیے رخصت ہوجاتے ہیں لیکن روز قیامت تک ان کی روحیں عالم برزخ میں جمع کی جاتی ہیں۔ اور جب قیامت برپا ہوگی تو ان روحوں کو خدا کی بارگاہ میں جسموں کے ساتھ عملوں کی جوابدہی کے لیے حاضر کردیا جائے گا۔

برزخ کا لفظ قرآن میں کئی جگہوں پر آیا ہے۔ ہر جگہ اس کا معنی دو چیزوں کے درمیان پردہ یا اوٹ ہے۔ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیَانِo بَیْنَہُمَا بَرْزَخٌ لَّا یَبْغِیَانِo (الرحمٰن:۱۹) ''اُس نے آپس میں ٹکراتے ہوئے دو دریا روان کئے ان کے درمیان ایک پردہ حائل ہے کہ وہ اپنی حد سے تجاوز نہیں کرتے ہیں''۔ وَھُوَ الَّذِیْ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ ھَذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَھَذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ وَجَعَلَ بَیْنَہُمَا بَرْزَخاً وَحِجْراً مَّحْجُوراًo (الفرقان:۵۳) ''اور وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے دو دریاؤں کو ملا دیا ایک میٹھا اورپیاس بجھانے والا اور دوسرا کھاری اور کڑوا ہے اور ان کے درمیان ایک اوٹ بنائی ہے''۔ حَتَّیٰٓ إِذَا جَاء أَحَدَھُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُونo لَعَلِّیٓ أَعْمَلُ صَالِحاً فِیْمَا تَرَکْتُ کَلَّا إِنَّہَا کَلِمَۃٌ ھُوَ قَائِلُہَا وَمِن وَرَائِہِم بَرْزَخٌ إِلَیٰ یَوْمِ یُبْعَثُونَo (مومنون:۱۰۰،۹۹) ''یہاں تک جب ان میں سے کسی کو موت آتی ہے تو وہ کہتا ہے اے میرے پرودگار مجھ کو واپس لوٹا دے تاکہ میں ان کاموں میں اچھا عمل کروں جن کو میں چھوڑ کر آیا ہوں خبردار! یہ صرف اس شخص کے کہنے کی بات ہے اور ان کے آگے اس دن تک برزخ (پردہ) ہے جس دن یہ دوبارہ اٹھائے جائیں گے''۔

ان آیات میں برزخ سے مراد پردہ ہے لہٰذا برزخ سے مراد وہ عالم ہے جس میں فوت شدہ انسانوں کی روحیں رکھی جاتی ہیں۔ قیامت کے دن ان تمام روحوں کو جسم کے ساتھ بارگاہ الٰہی میں اپنے اعمال کا حساب دینے کے لیے حاضر کردیا جائے گا اور ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتے وقت انسان خواہش کرتا ہے کہ وہ دنیا میں دوبارہ آئے اور نیک اعمال کرکے اپنے آپ کو خدا کا نیک بندہ ثابت کردے۔ لیکن اس کی یہ خواہش ہرگز پوری نہیں ہوگی بلکہ لوگوں کی روحیں قیامت کے دن تک دنیا اور آخرت کے درمیان عالم برزخ میں رہیں گی اور وہاں انہیں سزا کا احساس ہوتا رہے گا۔

عالم برزخ سے انسانوں کی روحیں اپنے ٹھکانے کا نظارہ کرتی رہتی ہیں جنت میں جانے والوں کی روحیں بڑے اطمینان کے ساتھ خوش رہتی ہیں۔ جب کہ جہنم میں جانے والی روحیں اپنے اعمال پر پچھتاتی رہتی ہیں۔ اور ہمیشہ پریشان اور خوفزدہ ہوتی ہیں۔

نزول قرآن کے وقت لوگ اگرچہ الوہیت کے معتقد تھے یعنی وہ خدا کو مانتے تھے اور وہ یہ بھی مانتے تھے کہ خدا نے ہی انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ لیکن وہ آخرت کے معتقد نہیں تھے۔ یعنی وہ اس بات کے قائل نہ تھے کہ موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونا ہے اور اس زندگی کا محاسبہ ہوگا۔ وہ اس بات کے بھی قائل تھے کہ خدا نے اس کائینات کو پیدا کیا اور اس کے اندر موجود تمام مخلوقات کو اسی نے پیدا کیا ہے۔ لیکن وہ یوم الدین روز جزا کو نہیں مانتے تھے۔ ان کے اس عقیدے کی گواہی قرآن مجید پیش کرتا ہے۔ ایک طرف ان کی حالت یہ تھی کہ:

وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللهُ... (زمر:۳۸) ''اگر آپ ان سے پوچھیں کہ کون ہے وہ ہستی جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تو کہیں گے اللہ'' ... تو دوسری جانب وہ آخرت کو کسی بھی طور پر قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے:

أَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَاباً ذَلِكَ رَجْعٌ بَعِيدٌ(ق:۳) ''کیا جب ہم مرجائیں گے اور مٹی ہوجائیں گے (تو ہم دوبارہ زندہ کئے جائیں گے) یہ واپسی سمجھ سے باہر ہے''

وَنَسِیَ خَلْقَهٗ قَالَ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَهِیَ رَمِیْمٌ۝ (یٰس:۷۸) ''(انسان) اپنی پیدائش کو بھول جاتا ہے اور کہتا ہے کون زندہ کرے گا ہڈیوں کو جب کہ وہ بوسیدہ ہوچکی ہوں گی''۔

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ان بیہودہ باتوں کو رد کردیا کہ لوگ اس دنیا میں جو کچھ کریں اس کا حساب نہیں لیا جائے گا اور آخرت کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ روز جزا پر اعتقاد اسلامی عقیدہ کے بنیادی اصولوں میں سے ایک بیش بہا اصول ہے۔ اس عقیدہ کے نتیجے میں انسانوں کی نظریں زمین سے بلند ہو کر دوسرے عالم پر جم جاتی ہیں۔ دنیا کا مال و دولت اور مادیت کے رجحانات ان کو نہیں ستاتے ہیں اور دنیا کی ضروریات انہیں بے قابو نہیں کردیتی ہیں۔ بلکہ ان کی زندگی میں اعتدال پیدا ہوجاتا ہے۔ وہ اس دنیا کی فانی زندگی اور اس کے مال و متاع کو آخرت کی ابدی زندگی پر ترجیح نہیں دیتے ہیں۔ وہ دنیا کے حکمرانوں کی رضا کے بجائے آخرت اور روز جزا کے مالک کی رضا حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگ جاتے ہیں۔ وہ اپنی اس محدود اور مختصر مگر قیمتی زندگی کو دنیا کی خرافات اور بے وقعت کاموں میں ضائع نہیں کردیتے ہیں۔ بلکہ وہ دنیائی زندگی کے ہر لمحے کو خدا کی رضا جوئی میں صرف کردیتے ہیں۔ آخرت پر یقین کرنے سے ہی ان میں اللہ کی رضا کے لیے عمل کرنے کی طاقت پیدا ہوجاتی ہے۔ اپنے اعمال کی جزا ملنے کے سلسلے میں انہیں انتظار کرنے کی صلاحیت اور قوت حاصل ہوجاتی ہے۔ وہ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور اللہ پر مکمل ایمان، اعتماد، استقامت اور یقین کی اعلیٰ صفات سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔

آخرت پر اعتقاد اسلام کا وہ بنیادی اصول ہے جو حق و باطل کی دو راہوں کو ایک دوسرے سے بالکل جدا کردیتا ہے۔ یہ اصول اور عقیدہ انسان کو خواہشات اور مرغوبات کی غلامی سے نجات دلاتا ہے اور اللہ کی بندگی اور فرمانبرداری کرنے اور اس کی ربوبیت اور حاکمیت کے آگے سر تسلیم خم کرنے کی توفیق عطا کرتا ہے۔ آخرت کا عقیدہ انسان کو اس بلند ترین مقام پر پہنچا دیتا ہے جہاں وہ خدا کے نور کے بغیر کچھ نہیں دیکھتا ہے۔ وہ صرف اپنی اس منزل پر پہنچنے کے لیے بے تاب ہوتا ہے اور اس منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے خدا کے فرمانبردار اور نیک و کار بندے کی حیثیت سے اس کی بندگی کرتا ہے اور برائیوں، گندگی اور گندے عقائد سے دور رہتا ہے اور وہ راستہ اختیار کرلیتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے پسند فرمایا ہے یعنی صراط المستقیم۔ ایسے مومن کی روح جب اس کے جسم سے عالم ارواح کی طرف پرواز کرتی ہے۔ تو وہ بڑے اطمینان اور آرام سے ان سعید روحوں میں

شامل ہوجاتی ہے جو یوم الدین - روز جزا میں اپنے خالق و مالک رب العالمین کی ملاقات کے انتظار میں ہیں۔

جب تک انسانی ذہن میں آخرت کا عقیدہ اچھی طرح جاگزیں نہ ہوجائے اور انسانوں کے دل اس بات پر مطمئن نہ ہوجائیں کہ دنیائ زندگی کی کامیابی اور ناکامی مستقل کامیابی اور ناکامی نہیں ہے بلکہ مستقل اور مکمل کامیابی اور ناکامی آخرت کی کامیابی اور ناکامی ہے۔ یعنی اگر وہ دنیا کی زندگی میں اچھے اعمال کرکے آخرت کی زندگی میں کامیاب ہوں گے یہی کامیابی ان کی اصل کامیابی ہے۔ اور جب تک انہیں یقین نہ ہو کہ انہیں ایک اور زندگی ملے گی تب تک وہ اس آخرت کی زندگی کے لیے دنیائ زندگی کی کوئ قربانی دینے کے لیے تیار نہ ہوجائیں گے اور ان کی زندگی اللہ تعالیٰ کے بلند وبرتر نظام پر قائم نہیں ہو سکتی ہے۔ آخرت کا اعتماد ہی ان میں یہ شعور پیدا کردیتا ہے کہ اس فانی اور حقیر زندگی کے مقابلے میں آخرت کی لافانی اور باوقار زندگی بہتر ہے اور اس زندگی کو پانے کے لیے وہ ہر ممکن کوشش کرتے ہیںاور خدا کی فرمانبرداری اور بندگی میں اپنی دنیائ زندگی کا ہر ایک لمحہ صرف کردیتے ہیں۔

ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں

اس آیت میں بندوں سے تاکید کی گئ ہے کہ وہ صرف ایک خدا - اللہ رب العالمین کی عبادت کریں اور استعانت ومدد کی درخواست بھی اسی سے کریں۔ کیونکہ جس خدا نے بندوں کو پیدا کیا ہے وہی ان کی مدد کرنے والا ہے اور اسی کے پاس ان کی مشکلات کا حل ہے۔ لفظ عبادت کئ معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس سے پرستش ، فرمانبرداری، بندگی، غلامی اور اطاعت مراد ہے۔ یعنی اس آیت میں اللہ کے بندے اعلان کرتے ہیں کہ اے اللہ ہم تیری ہی پرستش کرتے ہیں تیری ہی فرمانبرادری کرتے ہیں اور صرف تیری ہی بندگی اور غلامی کرتے ہیں۔ یعنی ہر حیثیت سے ہماری عبادت کا تعلق صرف تیرے ساتھ ہے۔ اور کسی سے نہیں اور ہماری استعانت کا تعلق بھی صرف تیرے ساتھ ہے۔ یعنی ہم تیرے سوا کسی کے سامنے استعانت اور مدد کے لیے ہاتھ نہیں پھیلاتے ہیں۔ بلکہ ہم صرف تجھ ہی سے مدد کی استدعا کرتے ہیں۔

توحید کا یہ عقیدہ بنی نوع انسان کا ہر قسم کی غلامی سے آزادی کا اعلان ہے۔ یہ باطل پرستی کی غلامی سے آزادی کا اعلان ہے۔ انسانی نظاموں اور ان کے بنائے ہوئے قوانین کی پیروی سے آزادی کا اعلان، رسم و رواج اور سماجی طور طریقوں کی غلامی سے آزادی کا اعلان ہے کہ جب بندگی صرف اللہ کی ہو اور مدد صرف اللہ سے ہی مانگی جائے تو پھر انسانی قلب و ضمیر کو ان خود ساختہ نظاموں، سماجی رسم ورواج اور انسانوں کی غلامی کی کیا ضرورت ہے۔ اللہ کی طرف رجوع کرنے سے اسے ان تمام خرافات، اوہام اور قصہ کہانیوں کی غلامی سے نجات ملتی ہے۔

خدا کی بندگی کرنے والا ہمیشہ خدائی نظام حیات کی پیروی کرتا ہے اور زندگی کا ہر ایک قدم اللہ کی رضا جوئی کے لیے اٹھاتا ہے۔ جب کہ غیروں کی بندگی اور فرمانبرداری کرنے والا خدا سے بے تعلق ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ خدا بیزار اور بے دین طاقتوں کی مدد اور سپورٹ کرتا ہے اور انسانوں کے خود ساختہ قانون اور رسم و رواج کی مدد کرتا ہے۔ اور خدا اور خدا کے قانون کے خلاف بغاوت کرتا ہے۔ مومن باطل قوتوں کی ان حرکتوں سے خوفزدہ نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ ہمت اور صبر سے خدا کی بندگی، اس کی فرمانبرداری اور اس کی اطاعت کرتا ہے۔ وہ انسانوں کی غلامی سے آزاد ہوکر اللہ تعالیٰ کی غلامی اختیار کرلیتا ہے اور اس بات کا یقین رکھتا ہے کہ اس کی غلامی میں ہی اس کی آزادی ہے اور اسے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور غلامی میں سکون ملتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اللہ کی غلامی میں محفوظ پاتا ہے۔

تاریخ اسلام سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے اللہ کی غلامی میں رہ کر ہی دنیا کو فتح کرلیا اور دنیا کے انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے آزاد کرکے خدا کی غلامی میں شامل کردیا۔ گمراہ لوگوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ خدا کی غلامی کے بجائے ان لوگوں کی غلامی کرتے ہیں جو خود گمراہ ہوتے ہیں۔ اور اس گمراہی کی وجہ سے یہ لوگ ہمیشہ اندھیرے میں بھٹک کر رہتے ہیں الا یہ کہ کوئی خدا کی بندگی اختیار کرلے اور ہدایت کا راستہ پالے۔

انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے جو محدود خود اختیاری عطا کی ہے تاکہ محدود پیمانے پر وہ دنیا میں اپنے اختیار سے کام کریں۔ اس مختصر خود اختیاری کے ساتھ ساتھ انہیں اس بات کا بھی احساس دلایا گیا اور پیغمبروں

کے ذریعے سے یہ تعلیم بھی دی گئی کہ وہ خدا کی بندگی کریں اور گمراہی سے دور رہیں۔ ورنہ قیامت کے روز مجرموں کی حیثیت سے پکڑے جائیں گے۔

انسان اگر اپنےپیدا کرنے والے رب العالمین کی کرم فرمائیوں پر نظر ڈالے تو اسے ہر طرف اللہ کی عطا کی گئی نعمتیں اور نوازشات دکھائی دیں گی۔ اگر وہ حق شناس ہو تو وہ بے ساختہ اپنےپیدا کرنے والے کی تعریف کرنے لگتا ہے اور اپنی ذات کی نفی کرکے اس کی عبادت میں مشغول ہوجاتا ہے اور اپنے معبود حقیقی کے دروازے پر دستک دے کر عاجزی سے پکارتا ہے کہ اے میرے معبود، میرے خالق و مالک میں صرف تیری ہی عبادت کرتا ہوں اور صرف تجھ ہی سے مدد مانگتا ہوں۔ تو اس کے معبود حقیقی، رحمٰن و رحیم کی بارگاہ سے آواز آتی ہے کہ اے میرےپیارے بندے تم نے مجھے پکارا اور مجھ سے مدد مانگی۔ لو میں نے تیرے لیے اپنی رحمت کے دروازے کھول دئے اور میں تیری مدد کرنے کے لیے تیار ہوں۔ کیونکہ میں ضرور اس کی مدد کرتا ہوں جو صرف میری ہی عبادت کرتا ہے اور صرف مجھ ہی سے مدد مانگتا ہے۔

جنگ بدر حق و باطل کی جنگ تھی اور اس جنگ کی فتح پر مسلمانوں کی بقا کا دارومدار تھا۔ مسلمانوں کی فوجی تعداد اور قوت بھی دشمن کے مقابلے میں کم تھی اور ان کے پاس سامانِ جنگ اور وسائل کی بھی کمی تھی۔ اس بے سروسامانی میں مسلمانوں کا فتح یاب ہونا بظاہر ناممکن تھا جب مسلمانوں کے رہبر اعلیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی بارگاہ میں سر جھکایا اور عاجزی و انکساری سے مدد کی درخواست کی تو خدا کی خدائی جوش میں آگئی اور مسلمانوں پر رحمت برسادی۔ دیکھتے دیکھتے مسلمانوں نے ایک عظیم فتح حاصل کرلی۔ جو فتح جنگ بدر کے نام سے مشہور ہے اور یہ فتح اسلام اور مسلمانوں کے غلبہ کے لیے سنگ میل (Mile stone) کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے بعد بھی خدائے وحدہٗ لاشریک کی عبادت کرنے والے مسلمان وسائل کی کمی کے باوجود رب العالمین کی فرمانبرداری کے باعث ہر محاذ پر کامیاب رہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اس وقت کی پوری معلوم دنیا میں اسلامی انقلاب (Revolution) برپا کیا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونَ o (ذاریات:٥٦) ''میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیےپیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں''۔

انسانوں کی ہدایت کے لیے جو بھی نبی اور رسول آیا سب کی ایک ہی دعوت تھی کہ ایک خدا کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک مت کرو۔ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولاً أَنِ اعْبُدُواْ اللّهَ وَاجْتَنِبُواْ الطَّاغُوتَ... (النحل:٣٦) ''ہم نے ہر امت کی طرف رسول بھیجا (کہ وہ لوگوں کو کہیں) لوگو! اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو''۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ... (البقرہ: ۲۱) ''اے لوگو عبادت کرو اپنے رب کی جس نے تمہیں پیدا کیا اور جس نے پیدا کیا تم سے پہلے لوگوں کو بھی''۔

تمام انبیا اور رسولوں کی یہی دعوت تھی کہ ایک اللہ کی بندگی اور عبادت کرو یہی دعوت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں تک پہنچائی اور اس دعوت کی بالادستی کے لیے مسلمانوں نے اپنی جانوں اور اموال کی قربانیاں پیش کیں۔

جو لوگ بت پرستش کرتے ہیں ان کی عقل قابل افسوس ہے اور اس قسم کی پرستش اور پوجا پاٹ ذی شعور اور عاقل لوگوں کی شان کے خلاف ہے اور بے سود بھی ہے۔ ان لوگوں کی عقل بھی قابل افسوس ہے جو اللہ کے بغیر کسی مخلوق کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں اور اس سے اپنی حاجات اور مرادیں پوری ہونے کی دعائیں مانگتے ہیں۔ اس طرح کی عبادت کرنے والے اپنے پیدا کرنے والے رب العالمین کو ناراض کردیتے ہیں اور اس کی عبادت کا حلیہ بگاڑ کر عبادت کو مضحکہ خیز بنادیتے ہیں۔

دنیا میں علم جدید (Modern education) کے طالب علموں اور تحقیق کرنے والوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ بڑے بڑے سائنسدان (Scientists) اور فلاسفر (Philosphers) موجود ہیں جنہوں نے علم جدید کے میدان میں انقلاب لایا اور کائینات کے بیشتر حقائق کا انکشاف کیا اور دنیائی علوم سے دنیا کا نقشہ بدل دیا لیکن بد قسمتی سے علم کے میدان میں اتنی ترقی کے باوجود انسانوں کی بے ہودہ باتوں اور بے مقصد کاموں میں کوئی سدھار نہ آسکا۔ علم جدید کی ترقی کے باوجود انسانوں کے دل و دماغ توہم پرستی اور بے ہودہ چیزوں کی پرستش کرنے سے پاک نہ ہوسکے۔ سماج میں ایسی بے ہودہ حرکتیں، برے رسم و رواج اور بے مقصد مذہبی عقیدے موجود ہیں جن کو دیکھ کر ایک باضمیر انسان کا دل رنجیدہ ہوجاتا ہے۔ ان محققین نے کائینات کا مطالعہ کیا اور غور وفکر کے بعد بڑے بڑے راز افشا کئے اور خدا کی مخلوقات جیسے چاند، ستارے اور کہکشان وغیرہ سے پردہ ہٹاکر انسانوں کے علم میں لایا اور ایسی پوشیدہ مخلوقات کی جانکاری دی جن کا انسان کو تصور بھی نہ تھا۔ زمین کی سالانہ گردش، سورج گرہن اور چاند گرہن کے متعلق جانکاری فراہم کی۔ ایسے ستاروں اور سیاروں کی نشاندہی کی جو زمین سے لاکھوں اور کروڑوں میل دور ہیں اور ایسی دوربین (Telescope) ایجاد کی جس سے ان سیّاروں کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اس بے انتہا کائینات کی بہت سی چیزوں کی جانکاری فراہم کی۔ الغرض انسان دریافتوں اور ایجادات کے میدان میں بہت آگے بڑے۔ مگر اس کائینات اور اس میں موجود مخلوقات کے خالق و مالک اور اپنے پیدا کرنے والے خدائے ذوالجلال کو پہچان نہ سکے۔ دھوکہ کھاکر خود بھی گمراہ ہوگئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرنے کی کوشش کی۔ ان میں سے اکثر نے کائینات بنانے والی ذات سے یہ کہہ کر انکار کیا کہ یہ کائینات خود بخود وجود میں آگئی اور اس کے بنانے میں کسی کا ہاتھ نہیں اور اگر کسی نے اس کے بنانے والے کو تسلیم کیا بھی مگر اس نے یہ کہہ کر انکار کیا کہ خدا نے کائینات بنائی مگر اس میں اس کی کوئی مداخلت نہیں ہے۔ بلکہ یہ کائینات خود بخود چل رہی ہے اور کوئی اس کا نظام چلانے والا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ایسے انسانوں کی کوئی وقعت نہیں ہے جو دنیا کی ایجادات اور دریافتوں میں اپنی زندگی کھپادیں مگر اُس ذات پاک کو نہ سمجھ سکیں جس نے ان تمام چیزوں کو پیدا کیا جو ان انکار کرنے والوں نے دریافت کیں یا جن کو انہوں نے ایجاد کیا۔ اللہ کی بارگاہ میں ایسے لوگ پسندیدہ محبوب اور مقبول ہیں جو اس کی بندگی میں اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ صرف کرتے ہیں ۔

نزول قرآن کے وقت دنیا میں عبادت کا تصور اور طریقہ مختلف تھا۔ مشرکین مکہ خدا کو اپنا معبود تو مانتے تھے مگر وہ صِرف چند رسم و رواج اور پوجا پاٹ کے طریقوں کو بجالاتے تھے۔ وہ بیت اللہ کا طواف کرتے تھے اور بتوں کے سامنے جانوروں کی قربانی کرتے تھے۔ بس یہ ان کا دین تھا۔ دنیا بھر میں بھی بتوں کی پوجا کی جاتی تھی۔ ترک دنیا یعنی دنیا کو چھوڑ دینا بھی ایک بڑی عبادت سمجھی جاتی تھی۔ لوگ ترک دنیا کر کے گیان حاصل کرنے کے لیے جنگلوں میں جاتے تھے یا پہاڑوں پر بیٹھ جاتے تھے اور اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ تکلیف دینے اور شادی بیاہ سے دور رہنے کو ایک بڑی عبادت سمجھتے تھے۔ ہندوؤں میں اس قسم کی بندگی اور عبادت کا تصور عام تھا۔ عیسائیت کے پیروکاروں نے بھی عیسٰی علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنا رکھا تھا اور ہندوؤں کے جوگیانی طرز پر رہبانیت اختیار کی تھی او روہ بھی ترک دنیا اور اپنے آپ کو تکلیفوں میں مبتلا کرنا خدا کی بندگی سمجھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنے اور تکلیف دینے سے خدا کو خوش کیا جا سکتا تھا اور آج بھی ہندوؤں کی طرح ان میں یہ رسم موجود ہے۔ یہودی مذہب کے پیروکار بھی اس طرح کی عبادت اور بندگی سے دور نہ تھے۔ بلکہ وہ بھی عزَیر کو خدا کا بیٹا سمجھتے تھے۔ یہ لوگ بھی شرک میں مبتلا ہو چکے تھے۔ یہ تابوت سکینہ اور اولاد ہارون علیہ السلام کے واسطے کے بغیر اللہ کی عبادت کو معیوب سمجھتے تھے۔ ان میں یہ عقیدہ آج بھی موجود ہے۔ نزول قرآن اور رسالت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام تصورات اور غلط عقیدوں کی اصلاح کی۔ قرآن نے اپنی ابتدائی تعلیم سے ہی واضح کیا کہ عبادت صرف ایک خدا کو سزاوار ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے جن میں سب سے زیادہ اہمیت نماز کو ہے ۔ اس عبادت کے ذریعے انسان کو اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ پانچ وقت نماز پڑھنے سے ایک نمازی پانچ بار بارگاہ الٰہی میں پہنچ کر اللہ سے ملاقی ہوتا ہے۔ نماز کی اہمیت اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان فرمائی کہ نماز قائم کرو اور مشرکین میں سے نہ ہوجاؤ۔ نماز مسلمانوں کو شرک سے الگ کرتی ہے۔ قیامت کے دن سب سے پہلا سوال نماز کے متعلق ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ... وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي ○ (طٰہٰ:۱۴) ''اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو''۔ إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ (عنکبوت:۴۵) ''نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے''۔

الغرض زندگی کے ہر مرحلے پر اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری کو عبادت کہتے ہیں اور اس کے ہر حکم کی تعمیل کو بندگی کہتے ہیں۔

عبادت کو اگر غلامی کے معنی میں لیا جائے تو پھر عبادت خدا کی غلامی ہے اور عبادت کرنے والا اس کا غلام ہے۔ قرآن میں کئی جگہوں پر عبد کا لفظ غلام کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے: ... اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ... (البقرہ:۱۷۸) ''آزاد(شخص) کے بدلے میں آزاد اور غلام کے بدلے میں غلام''۔ وَأَنْكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنْكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ (نور:۳۲) ''اور نکاح کرا دو جو تم میں سے بے نکاح ہوں اور تمہارے غلاموں اور لونڈیوں میں سے''۔

اس آیت میں غلاموں کے لیے عباد لفظ استعمال ہوا ہے۔ عباد عبد کی جمع ہے۔ الغرض عبد سے مراد غلام اور عبادت سے مراد غلامی ہے۔اس معنی کے لحاظ سے اللہ کی عبادت کرنے سے اللہ کی غلامی کرنا مراد ہے۔ تاریخ میں ایک واقعہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مبارک نے ایک نوجوان کو سردیوں کی رات میں معمولی سا مہین لباس پہن کر کام کرتے دیکھا اور از راہ ہمدردی اس سے پوچھا کہ تم نے اس سردی میں گرم کپڑے کیوں نہیں پہن لیے ہیں۔ غلام نے جواب دیا کہ میں غلام ہوں۔ اس نے کہا کہ کیا تم نے اپنے مالک سے گرم کپڑے نہیں مانگے غلام نے عرض کیا کہ میرے آقا جانتے ہیں کہ میرے پاس گرم کپڑے نہیں ہیں لیکن وہ میرے اسی حال میں کام کرنے سے خوش ہے اور میری غلامی کا تقاضا ہے کہ میرا آقا جس طرح مجھ سے خوش رہے میں اسی طرح اسی حال میں رہوں اور اپنے مالک کو خوش رکھوں۔ میں اپنے مالک سے شکایت کرکے اسے ناراض نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت عبداللہ بن مبارک نے کہا اے نوجوان تم نے میری آنکھیں کھول دیں اور آج مجھے معلوم ہوا کہ غلامی کا حقیقی مفہوم کیا ہے۔

لیکن اس بات کا خیال رہے کہ غلامی اسلام کی نگاہ میں انتہائی مکروہ ہے اور اسلام میں ایک آزاد قوم کا تصور ہے۔ جو قوم آزاد ہوتی ہے وہی انسانوں کی غلامی کے بجائے اللہ کی غلامی کر سکتی ہے۔ تاریخ کا ایک واقعہ ہے کہ جنگ قادسیہ میں حضرت ربعی بن عامر جب مسلمانوں کی طرف سے سفیر بن کر رستم کے دربار میں پہنچے، رستم نے پوچھا کہ تم کس غرض کے لیے آئے ہو۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم اس لیے آئے ہیں تاکہ انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے آزاد کریں اور اللہ رب العالمین کی غلامی میں شامل کریں۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں غلامی کا تصور ناپسندیدہ اور ناقابل قبول ہے۔ لیکن اس بات کا بھی پورا خیال رکھنا ہے کہ انسان کو انسان کی غلامی سے آزاد کرکے اللہ کی غلامی میں شامل کرنا اسلام کا نظریہ اور اسلام کی تعلیم ہے اور قرآنی تعلیمات کا حقیقی مقصد انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کا غلام بنانا ہے۔ یعنی انسانوں کو صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری کرنی ہے۔ اور اس کی اطاعت اور فرمانبرداری انسان کی زینت اور زیور ہے۔ عبد کا لفظ قرآن میں فرمانبرداری کے سلسلے میں بھی استعمال ہوا ہے۔ فرشتوں کی تعریف میں اللہ کا ارشاد ہے: بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُونَ٥(انبیا:٢٦) ''وہ تو خدا کے معزز فرمانبردار ہیں'' حضرت سلیمان کے بارے میں فرمایا گیا ہے: وَوَهَبْنَا لِدَاوُودَ سُلَيْمَانَ نِعْمَ الْعَبْدُ٥ (ص:٣٠) ''ہم نے داود کو سلیمان جیسا بیٹا عطا فرمایا کتنا اچھا فرمانبردار ہے''۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی معراج کے وقت عبد کے نام سے نوازا گیا۔ سُبْحَانَ الَّذِيْ أَسْرَى بِعَبْدِهِ لَيْلاً مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الأَقْصَى (بنی اسرائیل:١) ''پاک ہے وہ ذات جو لے گئی اپنے فرمانبردار بندے کو ایک رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک''۔

اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں عبدیت انسان کے لیے سب سے بڑا اعزاز ہے۔ یہ لفظ کلمہ شہادت میں استعمال ہوا ہے۔ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّداً عَبدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے عبد یعنی فرمانبردار بندے اور رسول ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ زندگی کے ہر معاملے میں اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری کو بندگی اور عبادت کہتے ہیں۔ جو شخص دوسروں کی اطاعت، فرمانبرداری اور بندگی سے آزاد ہو کر اللہ کی اطاعت، فرمانبرداری اور بندگی میں شامل ہوجاتا ہے۔ وہی اللہ کا وفادار اور محبوب بندہ ہے۔ وہی عابد اور زاہد ہے، وہی متقی اور خدا کا فرمانبردار بندہ ہے۔ انسانوں کی غلامی سے نجات پاکر اللہ کی غلامی

اختیار کرنے میں انسان کی مکمل آزادی ہے۔ لیکن یہ آزادی اللہ کی بندگی اس کی اطاعت اور عبادت کرنے سے ہی حاصل ہوجاتی ہے۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے

ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اللہ کی پناہ میں آکر اس کی غلامی اختیار کرنے سے وہ آزادی ملتی ہے جو ہروقت انسان کے دل و دماغ کو سکون بخشتی ہے اور انسان دنیا کی گندگی اور آلودگی سے دور رہنے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور اسے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ عبادت زندگی کا وہ ہمہ گیر عمل ہے جس کا تعلق انسان کی انفرادی زندگی اور اجتماعی زندگی دونوں سے ہے اور زندگی کا کوئی شعبہ اس سے باہر نہیں ہے اور ہر ایک انسان اپنےپیدا کرنے والے معبود حقیقی کی عبادت کرنے کا پابند ہے۔ اجتماعی اور انفرادی زندگی سے لے کر قوموں کی زندگی اور ان کی کامیابی کا دارومدار اللہ کی بندگی اور عبادت پر ہے۔یہ کہنا حق بجانب ہے کہ زندگی کا مطلب اللہ کی بندگی ہے اور بے بندگی کی زندگی شرمندگی ہے۔ ؎

زندگی آمد برائے بندگی

زندگی بے بندگی شرمندگی

ہم کو سیدھا راستہ دکھا

اس آیت میں مومنوں کی اجتماعی دعا ہے کہ اے اللہ ہمیں راہ راست دکھا اور اس پر ثابت قدم رہنے کی توفیق عطا فرما۔

اللہ کی پیدا کردہ اس کائینات میں ہر مخلوق اللہ کے مقرر کیے ہوئے راستے پر گامزن ہے اور اس کی اطاعت وفرمانبرداری میں شد و مد سے اپنا سفر جاری رکھی ہوئی ہے۔

سورج، چاند، ستارے، سیّارے اور دیگر سب اجرام فلکی اپنے اپنے مدار پر گھوم رہے ہیں۔ کوئی کسی سے ٹکراتا نہیں۔ زمین پر جتنے بھی جاندار ہیں، زندہ رہنے کے لیے قانون قدرت یعنی جبلت (Instincts) کی مدد سے زندگی کے میدان میں رواں دواں ہیں۔ ہر ایک جاندار اپنی فطرت کے مطابق زندگی گزارتا ہے۔ یعنی اس کے اندر موجود جبلت اس کی راہنمائی کرتی ہے۔ اگرچہ انسان کو بھی قوت جبلت سے نوازا گیا ہے لیکن ماسوائے انسان سب جاندار آخرت کی جوابدہی سے بری ہیں۔ چونکہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اس حیثیت سے اسے قانون الٰہی کے مطابق زندگی کا سفر جاری رکھنے کا حکم ملا ہے اور اسے بارگاہ الٰہی میں اپنی زندگی کا جواب دینے کے لیے پابند کیا گیا ہے۔ اس لیے وہ اللہ کی ہدایت اور راہ راست کی راہنمائی کا محتاج ہے۔ وہ اپنی زندگی کی کامیابی کے لیے اللہ سے دعا کرتا ہے کہ اے اللہ مجھے اپنی زندگی کے مقصد کو حاصل کرنے کا وہ راستہ دکھا جس پر چل کر میں آخرت کی ہمیشہ رہنے والی زندگی حاصل کرسکوں اور مجھے اس راہ مستقیم پر ثابت قدم رہنے کی توفیق عطا فرما۔ کیونکہ راہ مستقیم اختیار کرنے میں ہی دنیا و آخرت کی سعادت اور سرخ روئی کی ضمانت ہے۔

کائینات کی ہر مخلوق خالق کائینات کی ہدایت کے مطابق اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا فریضہ انجام دے رہی ہے اور خالق یعنی اللہ تعالیٰ جان داروں کی ہر ایک نوع (Species) کو جبلت کے ذریعے راہنمائی فرما رہا ہے۔ اس نے مچھلی کو پانی میں تیرنے کی صلاحیت دی، پرندے کو ہوا میں اڑنے کی صلاحیت بخشی، حشرات الارض - کیڑے مکوڑوں کو زمین کے اندر اور باہر زندہ رہنے کی صلاحیت عطا کی۔ پیڑ پودوں کو زمین سے اپنی غذا نکالنے کی اور ہوا میں سانس لینے کی طاقت بخشی ہے۔ اسی طرح سورج، چاند، ستارے اور دیگر تمام اجرام فلکی کو کائینات میں اپنا اپنا کام کرنے کی ہدایت دے رکھی ہے۔ جن اور انسان کے بغیر کسی بھی مخلوق کو خدا کی نافرمانی کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ سب متین و فرمانبردار ہیں۔ جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے: لَا الشَّمْسُ يَنبَغِي لَهَا أَن تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ o (یٰس:۴۰) ''سورج کی مجال نہیں ہے کہ وہ چاند کو پکڑے اور رات کو اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ دن سے آگے بڑھ جائے ہر ایک کا اپنا دائرہ کار ہے اور اپنے دائرے میں مصروف عمل ہے''۔ اس طرح اس پوری کائینات کی مخلوقات کو ہمہ گیر ہدایت ہے اور اس ہدایت سے کوئی بھی شئے بے خبر نہیں ہے اور ہر شئے رب العالمین کی ہدایت پر عمل پیرا ہے۔ صرف نوع انسانی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس ہمہ گیر ہدایت پر عمل کرنے یا نہ کرنے کا اختیار دیا ہے۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق زندگی گزارے گا تو قیامت کے دن کامیاب ہوجائے گا اور جنت کی ابدی زندگی پائے گا۔ اور اگر وہ اللہ کی ہدایت سے ہٹ کر زندگی گزارے گا تو قیامت کے دن اس کی ناراضگی سے بچ نہ پائے گا اور اسے جہنم کی آگ میں ڈالا جائے گا۔ جہاں وہ ہمیشہ جلتا رہے گا۔ نوع انسانی کی زندگی کے پیش نظر انسان کو اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ وہ راہ راست پر ثابت قدمی کا مظاہرہ کرے تاکہ روز قیامت میں عذاب الٰہی سے بچ جائے۔

حیوانات کو اللہ تعالیٰ نے جبلّی طور پر اور فطرتاً اطاعت کا پابند بنایا ہے۔ یہ اپنی فطرت اور جبلت سے کھانے پینے کی ضرورت اور نفسانی و شہوانی خواہشات پوری کرتے ہیں۔ ہر کوئی حیوان اپنی اس فطرت پر زندگی گزارتا ہے جس فطرت پر اللہ رب العالمین نے اسے پیدا کردیا ہے۔ اس طرح وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔ حیوانوں کو آخرت کی جواب دہی کے لیے پیدا نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ ان کو دنیا کی رونق اور زینت کے لیے پیدا کیا گیا ہے ۔ اور انسانوں کو ان پر فوقیت بخشی گئی ہے۔ ان کو انسانوں کے کنٹرول میں دیا گیا ہے۔ ان کی عقل بھی اس حد تک محدود ہے جس حد تک وہ اپنا رزق تلاش کرسکیں۔ اس کے برعکس انسان کو اللہ تعالیٰ کی بندگی اور عبادت کرنے کے لیے ہی پیدا کیا گیا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے عقل سلیم سے نوازا ہے۔ اسے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دی۔ اسے خدا کی بندگی کا پابند بنا دیا اور نافرمانی کی صورت میں اسے سزا کا مستوجب قرار دیا۔ اس لیے اسے زندگی گزارنے کے لیے جبلی قوت اور فطرت کے علاوہ ہدایت کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے عقل دی ہے تاکہ اچھے اور برے میں فرق کرکے وہ زندگی گزارے اور خدا کی بندگی کرے۔ لیکن اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے کہ صرف عقل ہی انسان کے لیے کافی نہیں ہے۔ کیونکہ عقل پر کُلی انحصار کرکے انسان کبھی غلطی کا شکار بھی ہوسکتا ہے۔ اور صحیح اور غلط کو پہچاننے میں دھوکہ بھی کھا سکتا ہے۔ اس لیے کہا گیا ہے عشق است امام من عقل است غلام من ''میرا عشق میرا امام ہے، میری عقل میرا غلام ہے'' یعنی عشق انسان کا رہبر ہے اور اس کی عقل اس کا غلام ہے۔ جہاں پر انسان کی عقل کی انتہا ہوتی ہے وہاں پر اس کی عقل اس کا غلام بن جاتی ہے۔ یعنی عقل انسان کی راہنما ہے مگر مکمل راہنما نہیں ہے۔ اس لیے اسے زندگی کے ہر دائرہ عمل میں راہنما نہیں سمجھنا چاہیے۔ عقل حضرت ابراہیمؑ کو نمرود کی آگ میں کودنے کا مشورہ نہیں دیتی لیکن عشق الٰہی نے اسے اس آگ میں کودنے سے نہیں روکا۔ انسان کی زندگی میں ایسے کام اور ایسی باتیں ہیں جن کو عقل سلیم تسلیم نہیں کرتی ہے۔ یہ صرف عشق - نادیدہ یقین (blind faith) ہے جس کی بنیاد پر انسان ان باتوں پر عمل کرتا ہے اور ان کاموں کو سرانجام دیتا ہے۔ عقلیت پسندوں(Rationalists) کے نزدیک جو شخص جذبات اور خواہشات نفس کی پیروی کرتا ہے وہ عاقل ہے کیونکہ عاقل انسان ہی نفس کی ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور ہر وہ کام کرتا ہے جس سے اس کے نفس کی خواہشات پوری ہوجاتی ہیں اور وہ خوش ہوکر اپنے دل و دماغ کو سکون فراہم

کرتا ہے۔ ان کے خیال میں بُرے اور بھلے کی تمیز ضروری نہیں ہے۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ کوئی چیز بُری یا اچھی نہیں ہوتی ہے۔ صرف اچھا یا بُرا سمجھنے سے کوئی چیز اچھا یا بُرا ہوتا ہے۔ "Nothing is good or bad but thinking makes it so" عقل کے اس طرح کے استعمال سے دنیائی زندگی میں تباہی مچ جاتی ہے۔ عقل کے استعمال سے ایٹم بم ایجاد ہوا لیکن عقل کا دعویٰ کرنے والوں نے ہی اس کا استعمال کرکے دنیا کے بڑے بڑے شہروں کو تباہ و برباد کردیا اور لاکھوں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ اور آج بھی عقل کا دعویٰ کرنے والے خفیہ ایجنسیوں (Secret agencies) کے ذریعے لوگوں کا قتل عام کراتے ہیں اور پھر اس قتل عام پر فخر کرکے اپنی عقل کی داد دیتے ہیں۔ شرم و حیا انسان کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ لیکن خالص عقل کے پیروکاروں نے مردوں اور عورتوں کے بغیر شادی شدہ ہونے کے میل ملاپ کو جائز قرار دے کر اس کی دھجیاں اڑادیں اور اس قسم کی عقل، دلائل اور فتاویٰ سے انسانیت کو رسوا کردیا۔ اسلام کی تاریخ میں ایک فرقہ باطنیہ کے نام سے گزرا ہے۔ اس کے ایک لیڈر عبداللہ القیروانی کا فتویٰ ہے کہ شادی بیاہ کے سلسلے میں قریبی رشتہ داروں کا آپس میں رشتہ جوڑنا نہ صرف جائز ہے بلکہ زیادہ بہتر ہے۔ اس کا کہنا ہے ''اس سے زیادہ تعجب کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک شخص عقل کا دعویدار ہونے کے باوجود ایسی حماقتیں کرتا ہے کہ اس کے پاس نہایت خوبصورت بہن یا بیٹی ہو مگر وہ اس خوبصورت بہن یا بیٹی کو اپنے اوپر حرام کردے اور اسے کسی اجنبی کی بیاہ میں دے۔ ان جاہلوں کو اگر عقل ہوتی تو وہ یہ سمجھتے کہ ایک اجنبی شخص کے مقابلے میں اپنی بہن اور بیٹی کے وہ زیادہ حق دار ہیں'' اس نام نہاد مسلمان شخص کو جس نے عقلی بنیادوں پر یہ فتویٰ جاری کیا اگرچہ مسلمانوں نے فی الفور مسترد کردیا اور علمائے وقت نے ایسے فحاش پر لعنت و ملامت کرکے اس ملعون کے اس نظریہ کو حرام قرار دیا۔ لیکن آج بھی اس غلاظت کی بو دنیا میں موجود ہے۔ آج کل کے ترقی یافتہ دور میں اس طرح کی عقل کا استعمال کیا جاتا ہے اور آزادانہ جنسی اختلاط (Free sex) کی وکالت کرکے اخلاقی قدریں پامال کی جاتی ہیں۔ جس سے سماجی بے راہ روی میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ برطانیہ کی پارلیمنٹ نے ہم جنس پرستی (homosexuality) کا بل منظور کردیا۔ یہ وہی خصلت ہے جس کی وجہ سے قوم لوط پر اللہ کا عذاب نازل ہوا ہے۔ دنیا میں اب ایسی کوئی برائی نہیں ہے جس میں ملوث ہونے کی ماڈرن عقل پرستوں نے اجازت نہ دی ہو۔ ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے انسان کو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آتی

ہے کہ انسان کو اشرف المخلوقات کا شرف پانے اور عقل کی نعمت سے بہرہ ور ہونے کے باوجود اللہ کی ہدایت کی کیا ضرورت تھی اور اللہ تعالیٰ سے راہ راست پر چلنے کی توفیق بخشنے کی دعا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ فعل بد اور برے کاموں سے نجات پانے کے لیے اس طرح کی دعا کیوں سکھائی گئی ہے۔ انسانی عقل کے بس کا کام نہیں ہے کہ وہ اللہ کی ہدایت کے بغیر برائیوں سے نجات پا سکے گا۔ وہ اللہ کی ہدایت کے بغیر زندگی کے سفر میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا ہے۔ دین اور دنیا میں کامیابی کی ضمانت بھی اسی راہ راست پر چلنے میں ہے۔ صراط المستقیم کی جو دعا سکھائی گئی ہے وہ سب کے لیے ہے ۔ اس میں عوام و خواص شامل ہیں۔ انبیائے کرام بھی اللہ سے صراط المستقیم کی دعا مانگتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ فاتحہ کی دعا میں صراط المستقیم کی آیت کو مستقل طور پر شامل فرمایا ہے تاکہ مسلمان ہر نماز میں اللہ سے راہ راست کے لیے دعا مانگا کریں۔ ان کی یہی راہ مستقیم آخرت میں کام آئے گی۔ اور یہی راستہ انسان کو سیدھے جنت میں پہنچانے کا ذریعہ ہے۔

اھدنا صراط المستقیم میں جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے یعنی راہ راست طلب کرنے والا اکیلا فرد واحد کی حیثیت سے دعا نہیں مانگتا ہے بلکہ اجتماعی طور اللہ سے دعا مانگتا ہے کہ اے اللہ ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔ سیدھے راستہ سے مراد وہ راستہ ہے جس پر سفر کرنے سے انسان اللہ کے عذاب سے بچ کر سیدھے جنت میں پہنچ جائے۔ اور صیغہ جمع دعا مانگنے سے اس بات کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ امت مسلمہ کو اجتماعی حیثیت سے صراط المستقیم یعنی راہ راست کی ضرورت ہے۔ اگر امت بکھر جاتی ہے تو اس کی کوئی وقعت نہیں رہ جاتی ہے۔ اس لیے امت کے ہر فرد کے لیے ضروری ہے کہ وہ جب اللہ سے دعا کرے تو صرف اپنے لیے ہی نہیں بلکہ پوری امت کے لیے دعا کرے۔ جب پوری امت یا قوم ہدایت یافتہ ہو اور راہ راست پر قائم ہو، خدا کے دین پر قائم ہو اور ہمیشہ اپنے خالق اور مالک رب العالمین سے راہ راست کی دعا مانگ رہی ہو تو وہ امت کبھی گمراہ نہیں ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اس دعا میں مسلمانوں کی یکجہتی اور یکتائی کا تصور موجود ہے۔

صراط المستقیم سے مراد وہ سیدھی راہ ہے جو انسان کو منزل مقصود تک پہنچا دے گی۔ سیدھی راہ پر چلنے سے انسان صحیح سلامت منزل پر پہنچ جاتا ہے اور ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں کو اختیار کرنے والا آسانی سے منزل تک نہیں پہنچ جاتا ہے بلکہ اکثر راستہ بھول کر منزل مقصود کو ہی نہیں پہنچتے ہیں۔ اور سیدھے راستے کے بغیر راستے غلط بھی ہوتے ہیں جن کو اختیار کرکے انسان درماندہ ہوجاتا ہے۔ صراط المستقیم کا مطلب انسانی زندگی کا صحیح طرز عمل ہے اور وہ صحیح طرز عمل اسلام ہے۔ جس کے سایہ میں زندگی گزار کر انسان زندگی کا مقصد حاصل کرلیتا ہے اور وہ دنیا وآخرت دونوں جہانوں میں کامیاب ہوجاتا ہے۔

عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں، ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگلی سے ایک لکیر کھینچی اور فرمایا کہ یہ اللہ کا ٹھہرایا ہوا سیدھا راستہ ہے اس کے بعد اس لکیر کے دونوں طرف بہت سی ترچھی لکیریں کھینچ لیں اور فرمایا یہ طرح طرح کے راستے ہیں جو بنالئے گئے ہیں اور ان میں کوئی راستہ نہیں جس کی طرف بلانے کے لیے شیطان موجود نہ ہو اور پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: وَأَنَّ هَذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ... (الانعام:۱۵۳) ''اور بے شک یہ قرآن میرا سیدھا راستہ ہے پس اس پر چلو''

راہ ہدیٰ حاصل کرنے کے لیے بہترین قول یہ ہے : اِنَّ خَیْرَ الْحَدِیْثِ کِتَابُ اللہِ وَخَیْرَ الْھَدْیِ ھَدْیُ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ''بے شک بہترین کلام اللہ کا کلام یعنی قرآن مجید ہے اور بہترین راستہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ ہے'' مَنْ یَّھْدِہِ اللہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلِ اللہُ فَلَا ھَادِیَ لہ ''جسے اللہ ہدایت بخشے گا وہ کبھی گمراہ نہیں ہوجائے گا اور جسے اللہ گمراہ کرے گا وہ کبھی ہدایت نہ پائے گا۔''

الغرض عالم انسانیت کی ہدایت کے لیے بہترین کتاب اللہ کی کتاب ہے اور بہترین راستہ وہ ہے جس پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چلے اور جس پر آپؐ نے چلنے کی ہدایت فرمائی۔ چونکہ انسان کو اللہ نے پیدا کیا ہے۔ اس لیے اسے اپنے پیدا کرنے والے کے کلام یعنی قرآن مجید کے مطابق زندگی گزارنی ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں جن پر یہ کتاب نازل ہوئی ہے ، جنہوں نے اللہ کی اس کتاب پر عمل کرنے کا طریقہ سکھایا ہے۔ اس لیے آپ کی دکھائی ہوئی راہ کے بغیر انسان کے لیے کوئی راہ نہیں ہے۔ جو اس کی کامیابی کی ضمانت دار ہو۔

ان لوگوں کا راستہ (دکھا) جن پر تو نے انعام فرمایا،

جو مغضوب نہیں ہوئے، اور جو گمراہ نہیں ہیں

اس آیت میں صراط المستقیم کو واضح کیا گیا ہے کہ صحیح اور سلامتی کا راستہ وہ راستہ ہے جس پر اللہ کے منظور نظر لوگ چلتے رہے ہیں۔ یہ راستہ گناہوں سے پاک راستہ ہے۔ حضرت آدمؑ سے لے کر آج تک جو اس راستے پر چل پڑا وہ اللہ کے انعامات کا مستحق ہوا اور اس کی نعمتوں سے مالامال ہوکر رہا۔ اور جو لوگ اس راستے سے ہٹ کر چلتے رہے وہ گمراہ ہوگئے۔ ان لوگوں سے مومنین کو دور رہنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ انعام سے مراد حقیقی اور پائیدار انعامات ہیں جو خدا کی بندگی، اطاعت اور فرمانبرداری کے نتیجے میں حاصل ہوجاتے ہیں نہ کہ وہ عارضی اور دکھاوے کے دنیاوی انعامات جو گمراہ لوگوں کو ظاہری دنیا میں عارضی طور پر ملتے رہے ہیں اور جو آج بڑے بڑے ظالموں، بدکاروں اور گمراہوں کو ملتے ہیں۔ جن پر یہ ظالم اور مغرور لوگ فخر کرتے ہیں اور ان انعامات کو اپنے لیے خدا کی

عنایت اور نوازش سمجھتے ہیں اور ان انعامات کو دیکھ کر نادان لوگ ان گمراہوں کو خدا کے منظور نظر اور برگزیدہ سمجھتے ہیں اور خود بھی ان گمراہ لوگوں کا راستہ اختیار کر کے گمراہ ہوجاتے ہیں۔

صراط المستقیم یعنی راہ راست کی وضاحت کے لیے ان لوگوں کا حوالہ دیا گیا ہے جو اس راستے پر ثابت قدم رہے اور اللہ کے انعامات کے مستحق ہوگئے۔ صراط المستقیم کو صراط اللہ یا صراط الرسول قرار دینے کے بجائے انعام پانے والوں کا راستہ قرار دیا گیا ہے۔ اس میں جو حکمت ہے وہ اللہ کو معلوم ہے لیکن انسانی عقل کے مطابق ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں انسانی فطرت کا لحاظ کیا گیا ہے۔ کیونکہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ سامعین نصیحت کرنے والے کی شخصیت سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ کیونکہ انسانی فطرت یہ ہے کہ انسان کتابوں سے اس قدر نہیں سیکھتے ہیں جس قدر انسانی شخصیات سے متاثر ہوکر سیکھتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے جو کتابیں اتاریں وہ نبیوں اور رسولوں کے ذریعے ہی لوگوں تک پہنچا دی گئی ہیں کیونکہ انسانوں کی تربیت کے لیے شخصیات کا ہونا ضروری تھا۔

اس لیے راہ راست پر چلنے والوں اور راہ راست سے ہٹ کر چلنے والوں کا تذکرہ کیا گیا ہے تاکہ راہ راست پر چلنے والے کی شخصیت اور کردار سے راہ حق کا متلاشی متاثر ہوکر راہ راست پر اطمینان سے ثابت قدم رہے اور اس راہ سے ہٹ کر چلنے والے گمراہ لوگوں کے کردار کو دیکھ کر ان لوگوں سے اور ان کے راستے سے دور رہنے کی کوشش کرے۔ اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا ہے کہ اللہ کے دین کو پیغمبروں کے ذریعے ہی لوگوں تک پہنچایا گیا اور پیغمبر کی شخصیت سے متاثر ہوکر ہی لوگ دین میں شامل ہوگئے اور ایک امت بن گئی اور پیغمبروں کے بعد خدا کے نیک بندوں نے پیغمبروں کا مشن آگے بڑھایا اور خدا کے فرمانبردار اور باکردار بندوں نے ہی اللہ کے دین کو پھیلایا اور اسے زندہ رکھا۔ اس لیے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ جب امت پچھلی امتوں کی طرح مختلف فرقوں میں بٹ جائے گی تو ان میں کون سی جماعت حق پر ہوگی۔ تو آپؐ نے فرمایا مَآ اَنَا عَلَیۡہِ وَاَصۡحَابِیۡ ''جس پر میں ہوں اور میرے صحابہ'' یعنی میرے لوگوں کو راہ ہدایت اور راہ راست پر چلنے کی راہنمائی میرے صحابہ سے ملے گی۔ یعنی صحابہ کرام اللہ کا انعام پانے والے ہیں۔ قرآن میں انعام پانے والوں کا ذکر اس طرح ہے: وَمَن يُطِعِ اللهَ وَالرَّسُولَ فَأُوْلَئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنعَمَ اللهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ ... (النساء:٦٩) ''وہ لوگ جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا انبیاء، صدیقین،

شہدا اور صالحین ہیں''۔ یہ چار طرح کے لوگ ہیں جن پر اللہ کا انعام ہوا اور جن کو اللہ نے عزت اور آبرو سے نوازا اور یہ لوگ آخرت میں سربلند ہوں گے۔

خدا اور اس کے رسول کی تصدیق کرنے والے کو صدیق کہتے ہیں۔ جو بھی شخص بصدق دل اسلام قبول کرتا ہے۔ وہ صدیق کہلاتا ہے ۔ حضرت ابوبکرؓ کا نام بھی اللہ کے رسول کی ہر بات قبول کرنے اور ہر خبر کی تصدیق کرنے پر صدیق پڑگیا۔ ان کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میں نے جس کسی کے سامنے بھی اسلام پیش کیا اسے ماننے میں تھوڑا یا زیادہ وقت لگ گیا۔ لیکن جب میں نے ابوبکر کے سامنے اسلام پیش کیا تو انہوں نے فوراً اسے قبول کیا۔

شہید کا معنی گواہ ہے۔ یعنی جو دین کے لیے اپنی حمایت کی گواہی پیش کرے۔ لیکن شہید اس آدمی کو بھی کہتے ہیں جو دین کی سربلندی کے لیے اپنی جان قربان کرتا ہے۔ وہ جانی قربانی سے دراصل اللہ کے دین اور اس کے رسولوں کی سچائی کی گواہی دیتا ہے۔ اس لیے دین کے لیے جان دینے والے کو شہید کہتے ہیں اور وہ اس شہادت اور گواہی کے لیے ہمیشہ زندہ ہوتا ہے۔ صالحین سے مراد نیکوکار ہیں جن کی زندگی کا طرز عمل نیکیوں سے بھرا ہوا ہو۔ جو ہر لحاظ سے اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق زندگی گزارتے ہیں۔

مومنین میں یہ تینوں صفات پائی جاتی ہیں وہ صدیق ہیں۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کی تعمیل اور تصدیق کرتے ہیں اور راہ راست پر چلنے کے لیے انہیں کوئی چیز مانع نہیں ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ صراط المستقیم پر چل کر صالح زندگی بسر کرتے ہیں اور اللہ کی عبادت میں مشغول رہتے ہیں۔ اس طرح سے ایک مومن ان تینوں صفات سے لیس ہوتا ہے۔ وہ صدیق ہے، کیونکہ وہ اللہ کے ہر حکم کی تصدیق اور تعمیل کرتا ہے۔ اسے اللہ کی دکھائی ہوئی راہ پر چلنے کے لیے کوئی چیز رکاوٹ نہیں بنتی ہے۔ وہ شہید ہے کیونکہ وہ دین کی حفاظت کرنے والا ہے۔ اور دین کے لیے اپنی جان قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتا ہے۔ وہ صالح ہے کیونکہ وہ ایک صالح انسان کی طرح زندگی گزارتا ہے اور اگر کبھی اسلام کے لیے جان دینے کی ضرورت پڑے تو اس سے بھی دریغ نہیں کرتا ہے اور دین اسلام کے دائرے میں رہ کر وہ ہمیشہ اسلام کی ہر بات پر لبیک کہتا ہے۔یہی وہ صراط المستقیم ہے جس پر چلنے والوں کو اللہ کا انعام حاصل ہوا۔یہی وہ راستہ ہے جس کے نظرانداز کرنے والوں پر اللہ کا غضب اور قہر نازل ہوا۔ وہ

مغضوب ہوئے یعنی اللہ ان سے ناراض ہے اور آخرت میں ان گمراہوں کو ایک بڑے عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔

حدیث میں آیا ہے کہ جب بھی آدمی سورہ فاتحہ کی تلاوت کرے تو تلاوت کرنے والا اور سننے والے آخر میں آمین کہیں۔ آمین اگرچہ سورہ فاتحہ کا حصہ نہیں ہے لیکن یہ سنت ہے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق آمین کہنے سے دعا کی قبولیت کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ اور آمین اونچی آواز سے کہے یا خاموشی سے کہے دونوں صورتوں میں جائز ہے۔ (وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّى الْبَلَاغُ الْمُبِيْنَ)

بسم االله الرحمٰن الرحیم

پارہ عم ایک نظر میں

سورہ النّبا پارہ عم کی پہلی سورت ہے۔ سورہ بینّہ اور سورہ نَصر کو چھوڑ کر اس پارہ کی باقی تمام سورتوں کا ایک ہی رنگ ڈھنگ ہے۔ یہ سورتیں ایک تسبیح میں مختلف رنگوں کے دانوں کی طرح پروئے ہوئے (penetrated) ہیں۔ ان تمام سورتوں کا لہجہ تقریباً ایک ہی انداز کا ہے اور ان سورتوں کا مضمون بھی مختلف رنگوں میں قریب قریب ایک ہی ہے کیونکہ ان سورتوں میں قیامت اور آخرت کے موضوع پر ہی ایک خاص انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ جو لوگ غفلت کی نیند سو رہے ہیں اور دنیا کے لہو و لعب میں مست و مدہوش ہیں، انہیں اس غفلت کی نیند سے بیدار کیا جا رہا ہے اور انہیں احساس دلایا جارہا ہے کہ آپ کو دنیا ومَافیھا (دنیا اور جو کچھ اس میں ہے) چھوڑنا ہے لیکن دنیا سے رخصت لے کر اور دُنیا کی دلدل کو چھوڑ کر آپ کو کسی اور جگہ جسے آخرت کہتے ہیں اپنے کرتوتوں اور اپنے اعمال کا جواب دینا ہے۔ آپ سے پوچھا جائے گا کہ آپ کو اللہ نے جو زندگی عطا کی تھی اور جسے گزارنے کے لیے پیغمبروں کے ذریعے رہنمائی فرمائی تھی۔ آپ نے کس طرح اُسے گزارا؟ اور پیغمبرؑ جو اللہ کا پیغام لے کر آپ کے پاس آئے تھے ان کی آپ نے پیروی کی اور انہوں نے جو رہنمائی کی تھی اس کے مطابق زندگی گزاری؟، اس پارہ کے مضامین میں یہ بات خاص ہے کہ دنیا میں وفات کے بعد آپ کا خاتمہ نہیں ہوجائے گا بلکہ آپ کو دوسری دُنیا میں منتقل (Transfer) کیا جائے گا جہاں آپ کو معلوم ہوگا کہ ہم کس لیے دنیا میں آئے تھے اور ہم کیا کما کر واپس اللہ کے پاس آئے ہیں۔ پارہ کی ساری سورتوں کا ایک ہی لہجہ (Tone) اور ایک ہی اندازبیان دکھائی دیتا ہے۔ دلوں کو چھونے والے ایک خاص انداز اور لہجے میں روز جزا کے کچھ خاص واقعات بیان کئے گئے ہیں تاکہ دنیا والے ہوش کے ناخن لیں اس دُنیاوی زندگی کے خاتمے کے بعد آخرت یعنی دوسری زندگی کا آغاز ہوجائے گا جہاں ہر ایک انسان سے ذرّے ذرّے کا حساب لیا جائے گا۔ زندگی کا اختتام شاعر کے ان اشعار پر نہیں ہوگا جو قبروں پر لکھے جاتے ہیں:

آئے تھے ہم مثل بُلبل سیر گلشن کر چلے

لے لو مالی باغ اپنا ہم تو اپنے گھر چلے

انسان اس دُنیا میں عیش و عشرت اور سیر و تفریح کے لیے نہیں آیا ہے بلکہ اس کے یہاں آنے کا ایک بہت بڑا مقصد ہے جسے اس کے امتحان سے ہی پورا کیا جا سکتا ہے۔

پارہ کی اکثر سورتوں کے الفاظ میں رنگین بیانی ہے یعنی ایسے الفاظ کا استعمال ہوا ہے جو پُر معنی، پُر تاثیر وشدید ہیں تاکہ انسان متاثر ہوکر خدا کی بندگی پر آمادہ ہوجائیں اور گمراہی کی راہ ترک کریں۔ اکثر سورتوں میں انسانوں کو غور و فکر کی دعوت دینے کے لیے ایک ہی لہجہ (Tone) کا استعمال کیا گیا ہے۔

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖۤ۔

انسان ذرا اپنے کھانے پر نگاہ ڈالے۔ (عبس:۲۴)

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ۔

انسان غور کرے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔ (طارق:۵)

اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ

کیا وہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے ہیں کہ وہ کیسے بنائے گئے ہیں۔ (غاشیہ:۱۲)

اَلَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى۔

جس نے پیدا کیا اور ٹھیک ٹھاک کیا۔ (اعلیٰ:۲)

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْۤ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ

بے شک ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔ (التین:۴)

اِذَا الشَّمۡسُ کُوِرَت۔ وَاِذَا النُّجُومُ انکَدَرَتُ

جب سورج لپیٹ دیا جائے گا۔ اور جب تارے بے نور ہوجائیں گے۔ (سورۃ التکویر: ۲،۱)

اِذَا السَّمَاءُ انفَطَرَتۡ۔ وَاِذَ الۡکَوَاکِبُ انتَثَرَتۡ۔

جب آسمان پھٹ جائے گا اور جب تارے بکھر جائیں گے۔ (سورہ الانفطار:۲،۱)

اِذَا السَّمَآءُ انۡشَقَّت

جب آسمان پھٹ جائے گا۔ (انشقاق:۱)

اِذَا زُلۡزِلَتِ الۡاَرۡضُ زِلۡزَالَہَا

جب زمین شدت سے ہلاڈالی جائے گی۔ (سورہ زلزال:۱)

وَالۡفَجۡرِ

قسم ہے فجر کی (سورہ فجر:۱)

وَالشَّمۡسِ وَضُحٰہَا

قسم ہے سورج اور اس کی دھوپ کی (الشمس:۱)

وَالَّيۡلِ اِذَا يَغۡشٰى

قسم ہے رات کی جب وہ چھا جائے (سورہ لَیل: ۱)

وَالضُّحٰى وَالَّيۡلِ اِذَا سَجٰى

قسم ہے روز روشن کی۔ اور قسم ہے رات کی جب وہ چھا جائے۔ (سورہ الضحیٰ: ۲، ۱)

اس طرح اکثر سورتوں میں ہم آہنگ الفاظ کا استعمال ہے۔

طَآمَّة... (قیامت کا ہنگامہ) صَآخَّة (بڑا دشوار) قارعہ (بہت بڑی آفت) غاشیہ (ہمہ گیر مصیبت) وغیرہ ایسے الفاظ بیان کیے گئے ہیں جن سے انسانوں کے دلوں کو ہلادیا گیا ہے۔ تمام سورتوں میں حساب و کتاب، جزا و سزا انعام و عذاب کا دل دہلا دینے والا تذکرہ ہے۔ اور کئی جگہوں پر گزشتہ نافرمان قوموں کی تباہی کا تذکرہ بھی ہے۔ پارہ عم ان مثالوں اور تنبیہوسے بھرا ہوا ہے جن کا لہجہ اور اندازِبیان ایک جیسا ہے۔

پس منظر

سورہ النبا میں قیامت اور آخرت کی دلیل پیش کی گئی ہے جس کے انکار کرنے والوں کو قیامت کے دن کے عذاب اور اس دن کی رسوائی سے خبردار کیا گیا ہے اور ایمان لانے والے متقی اہل جنت کو اس دن کے ملنے والے انعامات اور خلودابدی کی بشارت سنائی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اسلام کی تبلیغ کا آغاز کیا تو اس کی بنیاد تین عقائد پر تھی:

۱، توحید، ۲، رسالت، ۳، آخرت

توحید

توحید یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو اس کی خدائی میں شریک نہ کرنا۔ صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا اس کے بغیر کسی کے سامنے مدد کے لیے ہاتھ نہ پھیلانا اور نہ اس کے بغیر کسی کی بندگی اور عبادت میں شامل ہوجانا

رسالت

خداتعالیٰ کے احکام بندوں تک پہنچانے کے عمل کو رسالت کہتے ہیں اور اللہ کے بندوں تک اللہ کے احکام پہنچانے والے کو رسول کہتے ہیں۔ خدا کے بندوں تک اللہ کا پیغام پہنچانے کے لیے بہت سے رسول مبعوث کئے گئے جنہوں نے اللہ کے احکام اور اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچایا اور ان کی رہنمائی کی۔ اس سلسلے کا آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے جنہیں قرآن نے خاتم النبیین یعنی آخری نبی ہونے کی سرٹیفکیٹ عطا کی ہے۔

آخرت

آخرت وہ عالم ہے جہاں انسانوں کے عملوں کا حساب و کتاب ہوگا اور عملوں کے مطابق جزا و سزا ملے گی۔ جن لوگوں نے رسولوں پر ایمان لایا اور نیک اعمال کیے انہیں اس آخرت کے عالم میں جنت ملے گی جہاں وہ ہمیشہ کے لیے آرام کی زندگی گزاریں گے۔ اور جنہوں نے رسولوں کا انکار کیا اور برے اعمال کئے انہیں جہنم میں ڈال دیا جائے گا جہاں وہ ہمیشہ کے لیے جلتے رہیں گے۔

مکے والوں کو اگرچہ ان تینوں عقیدوں میں توحید کا عقیدہ سخت ناگوار تھا تاہم وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے منکر نہ تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کو خالق اور رازق بھی مانتے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ دیگر ہستیوں کو بھی اپنے معبود سمجھتے تھے اور ان کی پوجا بھی کرتے تھے اس لیے انہیں صرف اس بات پر اختلاف تھا کہ خدا کی پیدا کردہ مخلوق جن کو وہ خدا کے وسیلے اور سفارشی سمجھتے تھے ان کی پوجا سے انہیں کیوں روکا

جائے۔ اس لیے اللہ کی قدرت اور اس کی خدائی میں ان مخلوق کو شامل کرنے کے باوجود توحید کے عقیدے سے یہ لوگ زیادہ برہم (Irritate) نہیں تھے۔

دوسرا عقیدہ رسالت کا تھا اس عقیدے کو بھی لوگ ماننے سے تو انکار کرتے تھے کیونکہ رسالت یعنی لوگوں کی ہدایت کے لیے رسولوں کا آنا ان کے عقیدے کے خلاف تھا لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کرنا ان کے لیے کوئی آسان کام نہیں تھا کیونکہ جو زندگی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوائے رسالت سے پہلے ان کے درمیان گزاری تھی اس سے یہ لوگ بخوبی واقف تھے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو انہوں نے کبھی جھوٹا یا دھوکہ باز نہیں پایا تھا وہ خود آپ ؐ کی شرافت، دیانت داری، امانت داری، حسن اخلاق اور دانائی و دور اندیشی کے قائل تھے اور ان کی ان خوبیوں کا اعتراف بھی کرتے تھے اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو یہ لوگ یکسر مسترد نہیں کر سکتے تھے اس لئے انہوں نے ان پر الزام تراشی شروع کردی انہوں نے حضور پر کبھی جادو کا الزام لگایا کبھی ساحر کہا اور کبھی مجنون قرار دیا۔

تیسرا عقیدہ آخرت اور وقوع قیامت کا تھا۔ چونکہ توحید اور رسالت پر لوگ اتنا برہم نہیں تھے جتنا یہ آخرت اور قیامت برپا ہونے کے عقیدہ پر برہم اور ناراض تھے اس لیے جب اس عقیدے کو ان کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے اسی عقیدے کی سب سے زیادہ مخالفت کی، اس کا مذاق اڑایا اور اس پر سب سے زیادہ حیرانی، تعجب اور ناراضگی کا اظہار کیا اور اس عقیدے کو بالکل بعید از عقل قرار دیا۔ لیکن اسلام کے دائرے میں لانے کے لیے یہ ضروری تھا کہ ان لوگوں کے دل و دماغ میں آخرت کے اس عقیدے کو اتارا جائے تاکہ ان کا ایمان راسخ اور مضبوط ہوجائے۔ کیونکہ اس کو تسلیم کرنے کے بغیر یہ لوگ راہ راست اور حق کے راستے پر چلنے کے لیے تیار نہ ہوتے جس پر اسلام انہیں چلانا چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ کے ابتدائی دور میں جو سورتیں نازل ہوئیں ان میں توحید اور رسالت کی بہ نسبت آخرت پر ایمان لانے کے لیے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ البتہ دلائل اس انداز میں دئے گئے ہیں کہ توحید کا تصور بھی واضح ہوگیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور قرآن کے برحق ہونے کے دلائل بھی سامنے آئے۔

سورۃ النَّبَاء

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ o عَنِ النَّبَإِ الْعَظِيمِ o الَّذِي هُمْ فِيهِ مُخْتَلِفُونَ o كَلَّا سَيَعْلَمُونَ o ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُونَ o أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهَادًا o وَالْجِبَالَ أَوْتَادًا o وَخَلَقْنَاكُمْ أَزْوَاجًا o وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا o وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا o وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا o وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا o وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَهَّاجًا o وَأَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً ثَجَّاجًا o لِنُخْرِجَ بِهِ حَبًّا وَنَبَاتًا o وَجَنَّاتٍ أَلْفَافًا o إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيقَاتًا o يَوْمَ يُنفَخُ فِي الصُّورِ فَتَأْتُونَ أَفْوَاجًا o وَفُتِحَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا o وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا o إِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا o لِّلطَّاغِينَ مَآبًا o لَّابِثِينَ فِيهَا أَحْقَابًا o لَّا يَذُوقُونَ فِيهَا بَرْدًا وَلَا شَرَابًا o إِلَّا حَمِيمًا وَغَسَّاقًا o جَزَاءً وِفَاقًا o إِنَّهُمْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ حِسَابًا o وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كِذَّابًا o وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ كِتَابًا o فَذُوقُوا فَلَن نَّزِيدَكُمْ إِلَّا عَذَابًا o إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ مَفَازًا o حَدَائِقَ وَأَعْنَابًا o وَكَوَاعِبَ أَتْرَابًا o وَكَأْسًا دِهَاقًا o لَّا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا كِذَّابًا o جَزَاءً مِّن رَّبِّكَ عَطَاءً حِسَابًا o رَّبِّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمَٰنِ ۖ لَا يَمْلِكُونَ مِنْهُ خِطَابًا o يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفًّا ۖ لَّا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَقَالَ صَوَابًا o ذَٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ۖ فَمَن شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ مَآبًا o إِنَّا أَنذَرْنَاكُمْ عَذَابًا قَرِيبًا يَوْمَ يَنظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ وَيَقُولُ الْكَافِرُ يَا لَيْتَنِي كُنتُ تُرَابًا o

اس سورہ میں سب سے پہلے ان چرچوں اور چہ میگوئیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو قیامت اور آخرت کی خبر سن کر مکہ میں ہر جگہ ہر محفل میں ہو رہی تھیں۔ ان انکار کرنے والوں کو جو دن رات آخرت اور قیامت کے متعلق غلط پروپیگنڈہ (Propaganda) کرکے عام لوگوں کو بدظن کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ مناظر کائنات کی طرف متوجہ کیا گیا اور انہیں بارگاہ الٰہی کی طرف دھیان دینے کی تلقین کی گئی ہے۔ ان سے سوال کیا جاتا کہ کیا تمہیں یہ زمین نظر نہیں آتی جسے ہم نے فرش کی طرح بنایا اور یہ پہاڑ جنہیں ہم نے زمین میں گاڑ دیا ہے اور کیا تم اپنے آپ پر نظر نہیں ڈالتے ہیں کہ کس طرح تمہیں عورتوں اور مردوں کے جوڑوں میں پیدا کیا اور کیا تم اپنی رات کی نیند کو نہیں دیکھتے ہو جس کے ذریعے دن میں محنت و مشقت کرنے کے بعد تمہاری خستگی اور تھکاوٹ دور ہو جاتی ہیں۔ دن میں آپ کام کرتے ہیں اور رات کو آرام کرتے ہیں۔ اور کیا آپ اپنے اوپر آسمانوں کے بندے ہوئے نظام کو نہیں دیکھتے۔ سورج کو نہیں دیکھتے ہو جس کی بدولت تم کو روشنی ملتی ہے اور اس بارش کو نہیں دیکھتے ہو جو بادلوں سے برستی ہے جس کی بدولت غلے، سبزیاں اور گھنے باغ اُگتے ہیں۔ کیا آپ ان حقیقتوں کو دیکھ کر غور نہیں کرتے ہیں کہ جس قادر مطلق نے ان تمام مخلوقات کو پیدا کیا ہے وہ ختم ہونے کے بعد آپ کو دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہے اور وہ قیامت اور آخرت کو بھی پیدا کر سکتا ہے۔ کیا آپ نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ انسان کو فضول پیدا کیا گیا ہے اور اسے اپنے کیے ہوئے پر کسی جگہ کسی کے پاس جواب نہیں دینا ہے اس طرح کی سوچ آپ کی نادانی اور کم فہمی اور نا سمجھی کے بغیر کچھ نہیں ہے۔

ان دلائل کے بعد پھر انسانوں کو اطلاع دی جاتی ہے کہ فیصلے کا دن مقرر ہے جو اللہ کے حکم کے مطابق اپنے مقررہ وقت پر قیامت کی صورت میں رونما ہوگا اور تم فوج در فوج اپنا حساب چکانے کے لیے نکل آؤ گے اور اللہ کی بارگاہ میں جمع ہو جاؤ گے۔ پھر اس دن (قیامت کے دن) کا نظارہ پیش کیا گیا ہے کہ آسمانوں کو کھول دیا جائے گا اور پہاڑ اڑا دئے جائیں گے یہاں تک کہ وہ سراب (Mirage) بن جائیں گے۔ اس وقت آپ لوگوں کو پتہ چل جائے گا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے خیر خواہ تھے اور جس آفت کی وہ آپ کو خبر دے رہے تھے وہ صحیح تھی۔

جو لوگ آخرت کی جوابدہی اور حساب و کتاب کو جھٹلاتے ہیں ان کے کرتوت اور ان کے اعمال محفوظ ہیں اور جہنم گھات لگا کر ان کے انتظار میں ہے۔ اور جن لوگوں نے نیک اعمال سے اپنی آخرت درست کی انہیں اطمینان دلایا جاتا ہے کہ ان کو ان کے نیک عملوں کے بدلے میں جنت حاصل ہوگی جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

آخر میں خدا کی عدالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ بروز قیامت اللہ کے سامنے کسی کو بلا اجازت زبان کھولنے کا اختیار نہ ہوگا اور جسے بات کرنے کی اجازت ہوگی وہ بھی سچ بات ہی کہے گا۔ اب اس بات سے خبردار کیا جاتا ہے کہ جس دن کو ماننے سے لوگ انکار کرتے ہیں وہ دن آکر رہے گا اور وہ دن دور نہیں بلکہ قریب آلگا ہے۔ اب جس کا جی چاہے اسے مان کر اپنے رب کا راستہ اختیار کرے اور جو اس کا انکار کرے گا وہ پچھتائے گا اور افسوس کے ساتھ کہے گا کہ کاش میں مٹی ہوتا تاکہ یہ دن (قیامت کا دن) نہ دیکھنا پڑتا۔

عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ o عَنِ النَّبَاِ الْعَظِیْمِ o اَلَّذِیْ ھُمْ فِیْہِ مُخْتَلِفُوْنَ o

سورہ کا آغاز سوالیہ فقرے سے کیا گیا ہے کہ لوگ کس چیز کے بارے میں پوچھ گچھ (Discussion) کر رہے ہیں۔ لیکن سوال پوچھ گچھ کی حقیقت یا جانکاری حاصل کرنے کی غرض سے نہیں کیا گیا ہے بلکہ سوال کرنے کی غرض صرف ان لوگوں کی عقل پر تعجب اور تشویش کا اظہار کرنا ہے جو لوگ اس بڑی خبر یعنی قیامت برپا ہونے پر غور و فکر کرنے کے بجائے اسے مشتبہ اور مشکوک بنانے کی کوشش کرتے تھے تاکہ اس خبر پر کوئی یقین نہ کرے۔ نبا العظیم ایک بڑی خبر کو کہتے ہیں یہ بڑی خبر کیا ہے جس پر یہ لوگ اختلاف کر رہے تھے کچھ علما کے نزدیک اس بڑی خبر سے مراد قرآن ہے کیونکہ اللہ نے قرآن کو عظیم فرمایا ہے۔

قُل ھُوَ نبأٌ عظیم۔ کہو یہ (قرآن) ایک بڑی خبر ہے۔ قتادہ کے نزدیک اس بڑی خبر سے مراد قیامت اور آخرت کی خبر ہے جسے سن کر اہل مکہ طرح طرح کی چہ میگوئیاں کرتے تھے اور ایک دوسرے سے کہتے تھے۔ بھائی کیا تم نے یہ کبھی سنا ہے کہ انسان مرکر اور اس کی ہڈیاں بوسیدہ ہوکر مٹی سے مل چکی ہوں دوبارہ زندہ ہوگا۔ کیا یہ خلاف عقل بات تم نے آج تک کسی سے سنی ہے۔ کیا اگلی پچھلی ساری نسلیں دوبارہ زندہ ہوکر ایک جگہ جمع ہوجائیں گی کیا یہ ممکن ہے کہ یہ بڑے بڑے پہاڑ روئی کی طرح ہوا میں اڑجائیں گے۔ کیا یہ سورج چاند اور تارے سب بے نور ہوکر ختم ہوجائیں گے اور کیا یہ دُنیا بھی ختم ہوجائے گی۔ یہ آدمی جو ہماری طرح ایک انسان ہے اور ہمارے ساتھ بستا ہے کس طرح کی باتیں کرتا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا دانا آدمی تھا لیکن اسے کیا ہوگیا ہے کہ یہ اس طرح کی باتیں کرنے لگا ہے۔ اور یہ جو ہمیں آخرت، جنت اور دوزخ کی خبریں سنا رہا ہے کیسے ممکن ہے۔ اس کے اس طرح کی باتیں کرنے سے لگتا ہے کہ وہ دیوانہ ہوگیا ہے۔ وہ خبر جس میں وہ اختلاف رکھتے ہیں۔ اس خبر کے اختلاف کے بارے میں مختلف آراہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ کچھ لوگ اس بڑی خبر کے قطعی منکر تھے اور کچھ لوگ تردد اور تشویش (Suspense) میں پڑے ہوئے تھے۔ یہ بھی ایک رائے ہے کہ اہل مکہ اس خبر کے بارے میں دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے ایک گروہ تصدیق کرتا تھا لیکن پورا یقین نہ ہونے کی وجہ سے تذبذب میں تھا۔ اس لیے اپنی تشنگی کو دور کرنے کے لیے سوال پہ سوال کرتا تھا۔ دوسرا گروہ صاف منکر تھا اور محض استہزا کے لیے پوچھ گچھ کرتا تھا۔ ایک اور رائے یہ ہے کہ عقیدے کے لحاظ سے یہ لوگ متفق نہ تھے ان کے عقیدے میں مختلف خیالات پائے جاتے تھے۔ کچھ لوگ عیسائیت سے متاثر تھے جو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کو مانتے تھے لیکن جسمانی زندگی کو نہیں مانے تھے بلکہ روحانی زندگی کو مانتے تھے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو آخرت کا قطعی انکار نہیں کرتے تھے مگر شک میں پڑے ہوئے تھے کہ دوبارہ زندہ ہونا کیسے ممکن ہے۔ قرآن میں اس قسم کے لوگوں کے متعلق فرمایا گیا ہے۔ اِن نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَمَا نَحۡنُ بِمُسۡتَیۡقِنِیۡنَ (الجاثیہ:۳۲) ''ہم تو بس ایک گمان سا رکھتے ہیں یقین ہم کو کچھ نہیں'' کچھ لوگ صاف کہتے تھے۔ اِنۡ ھِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنۡیَا وَمَا نَحۡنُ بِمَبۡعُوۡثِیۡنَ (الانعام:۲۹) ''ہماری اس دنیا کی زندگی کے سوا کوئی زندگی نہیں اور ہم ہرگز دوبارہ اٹھائے جانے والے نہیں ہیں۔'' حالانکہ یہ لوگ مانتے تھے کہ کسی ہستی نے اس دُنیا کو بنایا ہے لیکن وہ اس کا کنٹرول نہیں کررہی ہے۔ کچھ لوگ جو دہریئے کہلاتے تھے ان کا خیال تھا کہ یہ دنیا خود بخود بن گئی ہے وہ کہتے تھے مَا ھِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنۡیَا نَمُوۡتُ

وَنَحۡيَا وَمَا يُهۡلِكُنَا إِلَّا الدَّهۡرُ (الجاثیہ:۲۴) ''یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے۔ یہیں مرنا ہے اور جینا ہے اور گردش ایام کے سوا کوئی چیز ہمیں ہلاک نہیں کرتی''۔ کچھ دوسرے لوگ دہریے تو نہیں تھے مگر مرنے کے بعد دوسری زندگی کو ناممکن قرار دیتے تھے۔ وہ خدا کو تو مانتے تھے مگر یہ نہیں مانتے تھے کہ خدا لوگوں کو دوبارہ زندہ کرسکتا ہے یہ لوگ کہتے تھے:

مَنۡ یُّحۡیِ الۡعِظَامَ وَھِیَ رَمِیۡمٌ(یٰس: ۷۸) ''ان ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا جب کہ یہ بوسیدہ ہوچکی ہوں۔''

اس لئے اہل مکہ کا یہ اختلاف خود بتا رہا ہے کہ ان کے پاس اس آخرت کے بارے میں کوئی علم نہ تھا بلکہ وہ محض گمان اور قیاس کے تیر چلا رہے تھے۔ اگر ان کے پاس علم ہوتا تو کسی ایک بات پر متفق ہوتے۔

زمانہ جدید بھی اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ دنیا میں مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ سوشلزم (Socialism) کا نظریہ اختیار کئے ہوئے ہیں کچھ کمیونزم (Comminism) کا دعویٰ کرتے ہیںکچھ سیکولرزم (Secularism) لادینی دنیاوی سیاست کے قائل ہیں۔ جو لوگ مذہب کو مانتے ہیں وہ بھی زمانہ جاہلیت کی طرح آپس میں اختلاف کرتے ہیں۔

مذہبوں کے ایک دوسرے کے ساتھ اختلاف ہونے میں کوئی شک نہیں ہے لیکن ہر ایک مذہب کے اندر بجائے خود اختلاف ہے اس طرح دین اسلام کو بھی اندرونی کشمکش اور اختلافی مذہب بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس کے نتیجے میں کئی فرقے وجود میں آگئے جن کا نظریہ اور طریقہ زمانہ جاہلیت کی طرح الگ الگ ہے۔ ان میں کچھ لوگ اعتقاد کی بنیاد پر بزرگان دین سے مدد مانگنا جائز سمجھتے ہیں۔ کچھ لوگ رسول کریم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حیات النبی خیال کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں انہیں مردہ کہنا جائز نہیں ہے۔

کَلَّا سَیَعۡلَمُوۡنَ(۴)

ہرگز نہیں عنقریب انہیں معلوم ہوجائے گا۔

ثُمَّ کَلَّا سَیَعۡلَمُوۡنَ(۵)

ہاں ہرگز نہیں بہت جلد انہیں معلوم ہوجائے گا۔

منکرین کے اختلاف کی وجہ یہ تھی کہ وہ توحید آخرت اور رسالت سے انکار کرتے تھے۔ ان کو اطلاع دی جاتی ہے کہ عنقریب انہیں معلوم ہوجائے گا جب یہ اس دنیا سے مرکر آخرت کی دُنیا میں پہنچ جائیں گے اور عذاب میں بتلا ہوجائیں گے۔ عذاب کی دھمکی دو بار سنائی گئی اور ہرگز سے شروع کی گئی۔ ہرگز لفظ استعمال کرنے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جس حقیقت سے آپ انکار کررہے ہیں وہ ہرگز صحیح نہیں ہے اور دھمکی کو دوبار دھرانے سے معلوم ہوتا ہے کہ دھمکی کی اطلاع میں زبردست وزن اور زور ہے۔ کیونکہ جب کوئی بات کئی بار دہرائی جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بات بہت اہم ہے اور اس میں دم خم ہے۔ چونکہ کلام زور دار ہستی کی طرف سے نازل ہورہا تھا اس لیے زور دار کلام سے منکروں کو للکارا گیا تاکہ ان کے دلوں میں اعتماد پیدا ہوجائے۔ اور وہ توحید ر، سالت اور آخرت کی صداقت اور حقیقت کو تسلیم کرلیں۔

قرآن بحثوں کا جواب بحثوں سے نہیں دیتا ہے بلکہ سوالات کرنے والوں اور بحث کرنے والوں کو اپنے زور کلام سے براہ راست مختصر الفاظ میں جواب دیتا ہے۔ ان مباحثوں اور سوالات پوچھنے سے دراصل یہ منکرین آخرت کی حقیقت کو بازاری لوگوں کا قصہ بنا کر بے وزن کرنا چاہتے تھے اس لیے ان کو مختصر بات میں بتایا گیا ہے کہ وہ وقت دور نہیں کہ جب وہی چیز حقیقت کی صورت میں ان کے سامنے آجائے گی جس کے بارے میں یہ فضول باتیں کررہے تھے۔ اُس وقت انہیں پتہ چل جائے گا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خبر ان کو دی تھی وہ صحیح تھی اور جو باتیں یہ بنارہے تھے ان کی کوئی وقعت نہ تھی لیکن اب حقیقت معلوم ہونے پر انہیں ندامت ہوگی اور وہ ایمان لائیں گے لیکن ان کے ایمان لانے کی اب نہ کوئی ضرورت ہوگی اور نہ ان کا ایمان لانا اللہ کو قبول ہوگا۔

اَلَمۡ نَجۡعَلِ الۡاَرۡضَ مِهٰدًا (٦)

کیا ہم نے زمین کو فرش نہیں بنایا

وَّالۡجِبَالَ اَوۡتَادًا (٧)

اور پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دیا

وَّخَلَقۡنٰكُمۡ اَزۡوَاجًا (٨)

اور ہم نے تمہیں جوڑا جوڑا پیدا کیا

وَّجَعَلۡنَا نَوۡمَكُمۡ سُبَاتًا (٩)

اور ہم نے تمہاری نیند کو (باعث) آرام بنایا

وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاساً (١٠)

اور ہم رات کو لباس (پردہ پوش) بنایا

وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشاً (١١)

اور ہم نے دن کو روزی کمانے کے لیے بنایا

وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعاً شِدَاداً (١٢)

اور ہم نے تمہارے اوپر سات مضبوط (آسمان) بنائے۔

وَجَعَلْنَا سِرَاجاً وَهَّاجاً (١٣)

اور ہم نے ایک بہت روشن گرم چراغ بنایا۔

وَأَنزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاء ثَجَّاجاً(١٤)

اور ہم نے بادلوں سے کثرت سے برسنے والا پانی برسایا

لِنُخْرِجَ بِهِ حَبّاً وَنَبَاتاً (١٥)

تاکہ ہم اس کے ذریعہ سے غلہ اور پودے اُگائیں

وَجَنَّاتٍ أَلْفَافًا(١٦)

اور گھنے باغات

ان آیات میں اللہ رب العالمین نے چند مناظر کائنات کے ذریعے بعض حقایق کی طرف توجہ دلائی ہے۔ انسان کو مخاطب کیا گیا ہے کہ اگر انسان کائنات کے مناظر پر غور کرے تو اسے ہر جگہ اللہ تعالیٰ کی قدرت دکھائی دے گی اسے یقین آئے گا کہ اس اتنی بڑی کائنات کا نظام چلانے والا کوئی نہ کوئی تو ضرور ہوگا اور وہ خدائے بزرگ وبرتر خالق کائنات ہی ہے اور اس خالق کائنات خدائے بزرگ و برتر نے دنیا بنائی اور اس دنیا میں انسان کوپیدا کردیا اور اس کے ساتھ حیوان اوردیگر بے شمار جانداروں کو وجود بخشا۔ انسان کو خصوصی صلاحیتیں دے کر اہم حیثیت عطا کی اسے بے شمار نعمتوں سے نوازا گیا اور عقل دے کر زمین پرپیدا کئے گئے تمام حیوانات پر ترجیح دی گئی۔ اور اسے خدا کی بندگی کرنے کی ہدایت دی گئی۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِيٓ أَحْسَنِ تَقْوِيمٍo بے شک ہم نے انسان کو بہترین ساخت پرپیدا کیا۔ اب اللہ کی عطا کی گئی نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے زمین کا تذکرہ ہو رہا ہے۔

(٦)کیا ہم نے زمین کو فرش نہیں بنایا۔ فرمایا گیا ہے کہ زمین کو اللہ تعالیٰ نے فرش اور گہوارہ بنا کر انسان کا جائے قرار بنایا ہے۔ انسان حیوان اور نباتات کی زندگی کا دارومدار زمین پر موجود مطلوبہ گیسوں (gases) اور اس سے نکلنے والی پیداوار پر ہے۔ زمین کے اندر اس مواد کو مناسب طریقے سے فِٹ کردیا گیا جو انسان کے علاوہ بے شمار قسم کے حیوانات نباتات اور دیگر ہر قسم کے جانداروں کے زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے۔ سمندروں سے پانی کو بھاپ کی صورت میں اٹھایا جاتا ہے اور پھر زمین پر بارش برسائی جاتی ہے اور پھر یہ پانی انسانوں کے علاوہ ہر جاندار کی زندگی کا ذریعہ بن جاتا ہے اور ان قوتوں میں ایسا تناسب قائم کیا گیا ہے جس سے تمام جانداروں کی زندگی کو نشوونما نصیب ہوا۔ اور ہر طرح کے جانداروں کی بے شمار ضرورتیں پوری ہوگئیں۔

اس زمین کو جن حکیمانہ مناسبتوں کے ساتھ قائم کیا گیا ہے ان کی تفصیلات پر غور کرنے سے انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ مناسبتیں ایک حکیمُ دانا قادر مطلق کی تدبیر کے بغیر قائم نہیں ہوسکتی ہیں۔ یہ زمین (کرہ ارض) فضا میں معلق ہے۔ کسی چیز سے باندھی ہوئی نہیں ہے۔ اس کے باوجود اس میں کوئی اضطراب اور لہلہاہٹ (ہوا سے ہلنے کی کیفیت) نہیں ہے۔ اگر اسے پیڑ

پودوں کی طرح ہوا سے ہلنے کی کیفیت ہوتی تو یہاں کوئی آبادی ممکن نہ تھی۔ ان خطرناک نتائج کا اندازہ زلزلہ کے جھٹکے کے آنے سے لگایا جا سکتا ہے۔

زمین کا ایک حصہ باقاعدگی کے ساتھ سورج کے سامنے آکر دن بناتا ہے اور دوسرا حصہ سورج کے پیچھے رہ کر رات بناتا ہے اگر اس کا ایک ہی رُخ ہر وقت سورج کے سامنے رہتا اور دوسرا رُخ ہر وقت پیچھے رہتا تو یہاں کوئی آبادی ممکن نہ ہوتی کیونکہ ایک رخ کو سردی اور بے نوری نباتات اور حیوانات کی پیدائش کے قابل نہ رکھتی اور دوسرے رُخ کو گرمی کی شدت بے آب و گیاہ اور غیر آباد بنادیتی۔ اس کرۂ ارض (زمین) پر پانچ سو میل کی بلندی تک ہوا کی ایک کثیف چادر چڑھادی گئی ہے جو شہابوں (Shooting stars) کی خوفناک بم باری سے زمین کی اس فرش کو بچاتی ہے ورنہ ایک تجزیہ کے مطابق روزانہ دو کروڑ شہاب جو تیس (30) میل فی سیکنڈ کی رفتار سے زمین کی طرف گرتے ہیں ایسی تباہی مچاتے کہ کوئی انسان، حیوان یا درخت زندہ نہ رہ سکتا تھا۔ لیکن یہ شہاب زمین کے ہوا کی اس چادر سے ٹکرا کر راکھ ہوجاتے ہیں اور زمین کے فرش کو کوئی آنچ نہیں آتی۔

زمین پر موجود ہوا درجہ حرارت کو قابو میں رکھتی ہے یہی ہوا سمندروں سے بادل اٹھاتی ہے اور پھر بادلوں کے ذریعے بارش برساتی ہے اور یہی انسان، حیوان اور نباتات کی زندگی کو مطلوبہ گیسز (gases) فراہم کرتی ہے اگر یہ ہوا موجود نہ ہوتی تو زمین کسی آبادی کے لیے جائے قرار نہ بن سکتی۔ زمین کے اندر معدنیات اور مختلف قسم کے کیمیائی اجزا (Chemicals) کے ذخیرے موجود ہیں۔ جو نباتاتی، حیواناتی اور انسانی زندگی کو مطلوب ہیں۔ زمین کی جس جگہ پر یہ معدنیات اور کیمیاوی اجزا موجود نہیں ہیں وہ جگہ زندگی کو سہارا دینے کے قابل نہیں ہے۔

اس زمین پر سمندروں، دریاؤں ، جھیلوں اور چشموں کی شکل میں پانی کا ذخیرہ فراہم کردیا گیا ہے۔ پہاڑوں پر بھی برف کی صورت میں اس پانی کو منجمد کرکے پھر پگلا کر دریاؤں اور ندی نالوں میں بہایا جاتا ہے۔ آب رسانی کی اس تدبیر کے بغیر زمین پر زندگی ناممکن تھی۔ پھر اس پانی، ہوا اور زمین پر پائی جانے والی تمام اشیاء کو سمیٹ کر رکھنے کے لیے اس زمین میں مناسب کشش رکھی گئی ہے۔ یہ کشش اگر کم ہوتی تو درجہ حرارت اتنا زیادہ ہوتا کہ زندگی دشوار ہوجاتی اور یہ کشش اگر زیادہ ہوتی تو ہوا کا دباؤ بڑھ جاتا اور بخارات کا اٹھنا مشکل ہوجاتا، سردی زیادہ ہوتی اور بارش بھی نہ برستی۔ اس لیے زمین کے بڑے بڑے حصوں پر آبادی نہ ہوتی اور کشش ثقل (Gravity) بہت زیادہ ہونے کی صورت میں

انسانوں اور حیوانوں کی جسامت کم ہوتی اور ان کا وزن اتنا زیادہ ہوتا کہ نقل وحرکت ان کے لیے مشکل ہوتی۔

زمین کو سورج سے اس فاصلے (Distance) پر رکھا گیا ہے جو آبادی کے لیے مناسب ترین ہے اگر اس کا فاصلہ زیادہ ہوتا تو زمین کو حرارت کم ملتی اور سردی زیادہ ہوتی جس کی وجہ سے یہ آبادی کے قابل نہ ہوتی اور اگر فاصلہ کم ہوتا تو گرمی زیادہ ہوتی اور اس طرح بھی یہ آبادی کے قابل نہ ہوتی۔ لہٰذا یہ وہ مناسبتیں (appropriateness) ہیجنکی بدولت زمین اپنی موجودہ آبادی کے لیے جائے قرار اور گہوارہ بن گئی ہے۔

(۷)پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دیا

پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دینے کا مطلب یہ ہے کہ زمین پر پہاڑ نصب کئے گئے ہیں جن کی وجہ سے زمین کی گردش کو ضبط یعنی کنٹرول(control) میں رکھا گیا ہے تاکہ زمین کی گردش کو اضطراب یعنی خلل سے بچا کر باقاعدہ (regulate) کیا جائے۔

سائنس کے مطابق پہاڑ زمین کا توازن (Balance) برقرار رکھتے ہیں۔ زمین کے متعلق سائنس کا انکشاف ہے کہ زمین آسمان میں معلق سورج کے گرد باقی سیاروں کی طرح ایک دوسرے کی کشش ثقل (gravity) میں گھوم رہی ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ زمین کو ثبات بخشتے ہیں۔ پہاڑوں کی وجہ سے سمندروں کی گہرائیوں اور پہاڑوں کی بلندیوں میں توازن پیدا ہوجاتا ہے ورنہ سمندروں کی گہرائیاں پہاڑوں کے بغیر زمین کو غیر متوازن (imbalance) کردیتیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب دیگر اجرام فلکی سیاروں کی طرح زمین بھی کشش ثقل کی وجہ سے ضبط میں ہے اور اسے گرنے کا کوئی خطرہ نہیں ہے تو پھر پہاڑوں کا میخوں کی طرح گاڑ دینے کا کیا مطلب ہوسکتا ہے۔ اس الجھن کو اس حقیقت سے دور کیا جاسکتا ہے کہ پہاڑوں سے زمین کا توازن برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ زمین پہاڑوں کی وجہ سے زلزلوں، آتش فشانوں اور اندرونی ہیجانات کے باعث کسی طرف جھکنے نہیں پاتی۔

اس کے علاوہ ان پہاڑوں کو زمین پر میخوں کی طرح گاڑ دینے کا صرف یہ مطلب نہیں ہوسکتا ہے کہ یہ زمین کا توازن قائم کیے ہوئے ہیں بلکہ ان پہاڑوں کا سلسلہ جسے اللہ نے زمین پر قائم کردیا ہے ان کا

موسموں کے تغیرات، تبدیلی میں، بارش برسنے میں، دریاؤں کی پیدائش میں، ذرخیز وادیوں کے وجود میں آنے میں، درختوں کے اُگنے میں اور قسم قسم کی معدنیات اور طرح طرح کے پتھروں کی فراہمی میں بڑا دخل ہے۔ اور یہ ساری کی ساری ایسی چیزیں ہیں جن پر انسانوں کی زندگی کا دارومدار ہے اور جو انسانی زندگی کی اہم ضرورت ہے او راس طرح یہ پہاڑ انسانوں کی زندگی کی کشش کو باندھنے کے لیے میخوں کا کام کرتے ہیں۔ یعنی انسانی زندگی کی بہت ساری ضرورتیں پورا کرتے ہیں۔

جوڑوں کی شکل میں پیدا کیا

(۸) اور تمہیں (مردوں اور عورتوں کے) جوڑوں کی شکل میں پیدا کیا

اللہ تعالیٰ نے نہ صرف انسان کی ضرورتیں پوری کیں بلکہ اسے زندگی کا سکون بھی عطا کیا یہ سکون حاصل کرنے کے لیے اسے جوڑے کی شکل میں پیدا کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کریمہ سے سب جانداروں کے جوڑے پیدا کئے جس کے ناتے وہ اپنی نسل کو آگے بڑھاتے ہیں اور ایک دوسرے سے جنسی لطف بھی اٹھاتے ہیں۔ انسان کے لیے رزق کی فراہمی کے بعد اس سے بڑھ کر اور کوئی نعمت نہیں ہو سکتی ہے۔ اللہ ذوالجلال نے انسان کی جوڑی میں ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی اور پیار و محبت کا جذبہ رکھا ہے جس کی بنیاد پر وہ دنیاوی کاموں میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیتا ہے اور اپنی نسل کو بھی آگے بڑھاتا ہے۔ مرد اور عورت کے اس جوڑے کی محبت اور آپسی تعلقات کو قرآن نے اس طرح پیش کیا ہے۔ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ۔ وہ (عورتیں) تمہارے لیے لباس ہیں اور تم (مرد) ان کے لیے لباس ہیں۔ یعنی جس طرح لباس اور جسم کے درمیان کوئی پردہ نہیں رہ سکتا، بلکہ دونوں کا باہمی تعلق غیر مُنفک (جدا نہ ہونے والا) ہوتا ہے اسی طرح تمہارا اور تمہاری بیویوں کا تعلق بھی ہے۔ یعنی مرد اور عورت کے جوڑے کا تعلق لباس اور جسم کی طرح ہے۔

رب العالمین نے انسان کو جوڑے میں پیدا کر کے اسے جنسی قوت عطا فرمادی۔ پھر اس جنسی قوت اور آپسی میل ملاپ سے اس کی خواہشات بڑھادیں۔ ان خواہشات کی وجہ سے اس نے دُنیاوی معاملات میں انتہائی دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور اس دنیا کی رونق بڑھادی۔

اس حقیقت کو بے دین فلسفیوں (Philosphers) نے غلط رنگ میں پیش کر کے دنیا کو گمراہ کرنے کی کوشش کی کہ دُنیا مادہ پرستی (Materialism) اور جنسی خواہشات و نفس پرستی کا نام ہے۔ اور دُنیا کے لوگوں کی دوڑ دھوپ اور کشمکش (struggle) صرف ان دو چیزوں کے لیے ہے۔ مذہب نام کی کوئی چیز دنیا میں نہیں ہے اور نہ دنیا کو اس چیز کی ضرورت ہے اور جو کچھ مذہب کی حمایت میں کہا جاتا ہے ان کی نظروں میں وہ سب کچھ بے بنیاد ہے۔

انسان کا پہلا جوڑا بنانے کے بعد اللہ کا یہ کرشمہ ہے کہ ایک حقیر پانی کی بوند سے انسان جیسی حیرت انگیز مخلوق پیدا کی اور اس سے بڑھ کر کرشمہ یہ ہے کہ انسان کے مادہ مَنْوِیَہ کے قطرے میں سے ایک نمونہ نہیں بلکہ دو نمونے (مرد اور عورت) پیدا ہوتے ہیں جو انسانیت میں یکسان مگر جسمانی اور نفسانی خصوصیات میں بالکل مختلف ہیں یہ خالق انسان کی عظیم حکمت ہے کہ اس نے انسان کی صرف ایک صنف (sex) نہ بنائی بلکہ اسے دو صنفوں کی شکل میں پیدا کیا اور پھر ان دو صنفوں کے درمیان حیرت انگیز مناسبت رکھدی کہ ان دونوں صنفوں کے افراد کو آغاز آفرینش سے برابر تناسب کے ساتھ جاری رکھا۔ آج تک کسی قوم یا کسی خطۂ زمین میں یہ نہیں دیکھا گیا کہ لڑکے ہی لڑکے پیدا ہوتے ہیں اور نہ کسی جگہ یہ دیکھا گیا کہ وہاں لڑکیاں ہی لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں بلکہ پیدائش میں ایک خاص توازن برقرار ہے۔

(۹) اور ہم نے تمہاری نیند کو تمہارے لیے باعث آرام بنایا

اللہ تعالیٰ نے نیند کو انسان کے لیے آرام و سکون کا ذریعہ بنایا۔ سَبْت کا معنیٰ ہے کام کاج سے قطع تعلق کرلینا اور سُباتًا کا معنیٰ ہے منقطع کرنے والا انسان کو جب نیند آتی ہے تو شعوری اور عملی جدوجہد سے منقطع ہوجاتا ہے اور اس پر ایسی حالت طاری ہوجاتی ہے جو نہ موت ہوتی ہے اور نہ زندگی بلکہ وہ موت اور زندگی کی درمیانی حالت میں ہوتا ہے۔ نیند انسان کے بدن اور اس کے اعصاب کو آرام پہنچاتی ہے اور بیداری کی حالت میں اس کی زندگی کی جدوجہد اور کام کاج میں جو جسمانی و دماغی قوت صرف ہوجاتی ہے وہ نیند کے ذریعے سے واپس آجاتی ہے۔ اگر انسان دن رات کام کرتا رہے گا تو اس کے جسم کے ہر عضو کو تھکاوٹ آئے گی اور اس کا اعصابی نظام (Nervous system) کمزور ہوجائے گا اور آرام نہ ملنے کی وجہ سے انسان کا جسم ناکارہ ہوسکتا ہے اور اسے کام کرنے کی صلاحیت کے کھو بیٹھنے کا اندیشہ ہے۔

جس ہستی نے انسان کو زندگی بخشی ہے اسی ہستی نے اس میں نیند ودیعت کردی اور اس نیند کو اس کی تھکاوٹ اور سستی دور کرنے اور تازہ دم (Refresh) ہونے کا ذریعہ بنایا اس لیے تمام جاندار زندہ رہنے کے لیے نیند کے پابند ہیں۔ کوئی زندہ وجود نیند کے بغیر زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا ہے اگر خارجی حالات اسے جاگتے رہنے پر مجبور کردیں تو اس کا ہلاک ہونا یقینی ہے۔ جسم اور اعصاب کو آرام پہنچانے کے علاوہ نیند کے کچھ اور بھی اسرار ہیں۔ نیند زندگی کو سکون و آرام بخشتی ہے۔ اس سے زندگی کے تکالیف اور غم دور ہوجاتے ہیں اور روح کو سکون و راحت ملتی ہے۔ تکالیف اور غموں کی وجہ سے انسان جب تھکاوٹ محسوس کرتا ہے تو وہ اپنے ہتھیار رکھ دیتا ہے اور تھوڑی دیر کے لیے نیند کے ذریعے خود کو سکون اور سلامتی کے حوالے کردیتا ہے۔ بعض حالات میں یہ صورت حال معجزے کی صورت میں پیش آتی ہے جنگ کی حالت میں اس قسم کی نیند آسکتی ہے جب اس کی روح بوجھل، اعصاب مضمحل (کمزور) طبیعت بے قرار اور دل خوفزدہ ہوتا ہے تو اسے چند لمحوں کے لیے نیند آجاتی ہے۔ جو اس کے لیے تجدید (نئے سرے سے کام شروع کرنے) کا کام کرتی ہے۔ یعنی جب وہ نیند سے بیدار ہوتا ہے تو گویا وہ بالکل نیا وجود پاتا ہے۔ یہ معجزہ واضح شکل میں غزوہ احد کے پریشان حال مسلمانوں کے اطمینان و سکون کے لیے ظہور پذیر ہوا۔ ثُمَّ أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّن بَعْدِ الْغَمِّ أَمَنَةً نُّعَاساً يَغْشَى طَآئِفَةً مِّنكُمْ (آل عمران:۱۵۴) ''پھر اللہ نے تم پر نیند کی شکل میں ، جو تم میں سے ایک گروہ کے لوگوں پر طاری ہوگئی، اطمینان کی کیفیت نازل فرمائی''

یہ جنگ احد کے واقعے کا تذکرہ ہے جب مسلمانوں کی صفوں میں افراتفری پھیل گئی اور افراتفری اور بھاگ دھوڑ کے عالم میں انہوں نے اپنی ہی جماعت میں ایک دوسرے پر تلوار چلائی پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر نیند طاری کردی اور تھوڑا سا وقفہ لے کر اور تھوڑا سا آرام کرکے جب انہیں تکالیف اور پریشانی سے نجات ملی انہوں نے دوبارہ اپنا کام شروع کردیا۔ ایسے بہت سارے واقعات ہیں جن میں لوگوں کے اس طرح کی نیند کا تذکرہ ہے۔ نیند کے ذریعے شعوری اور عملی حرکات سے علاحدگی زندہ ہستی کے وجود اور بقا کے لیے ایک ناگزیر ضرورت ہے اور یہ خالقِ مخلوقات کے پوشیدہ رازوں میں سے ایک راز اور اس کی عطا کردہ نعمتوں میں سے ایک بہت بڑی نعمت ہے۔

(۱۰، ۱۱)ہم نے رات کو پردہ پوش بنایا اور دن کو روزی کمانے کا ذریعہ بنایا

کام کرنے کے بعد آرام کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر نیند کا عامل جبلت (Instinct) میں رکھ دیا ہے جو تھکاوٹ کے بعد اسے کچھ وقت کے لیے سونے پر مجبور کردیتا ہے۔ اس نیند کے لیے اللہ تعالیٰ نے رات بنائی اور اس رات کو تاریک بنایا تاکہ انسان روشنی اور گرمی سے محفوظ رہ کر زیادہ آسانی کے ساتھ دن کی تمام مشغولیات اور مصروفیات کو چھوڑ کر نیند کے ذریعے سکون حاصل کرسکے۔ دن کو حصولِ معاش کا ذریعہ بنایا تاکہ اس میں انسان زیادہ سہولت کے ساتھ اپنے معاش کے لیے کام کرسکے لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ انسان کی نیند اور اسکے آرام کے لیے اللہ نے رات بنائی لیکن انسان کبھی دن میں بھی سوتا ہے اور کبھی رات میں بھی حصول معاش کے لیے کام کرتا ہے اس لیے نہ رات میں کام کرنے کو ممنوعہ قرار دیا گیا اور نہ دن میں آرام کرنے سے منع کیا گیا۔ سورہ روم میں اس حقیقت کا تذکرہ اس طرح کیا گیا ہے۔

آیت:۲۳ وَمِنْ آيَاتِهِ مَنَامُكُم بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَاؤُكُم مِّن فَضْلِهِ۔ اور اس کی نشانیوں میں سے تمہارا رات اور دن کو سونا اور تمہارا اس کے فضل کو تلاش کرنا ہے۔

انسان اگرچہ بالعموم رات کو سوتا اور دن میں اپنے معاش کے لیے جدوجہد کرتا ہے لیکن یہ کلیّہ (عام قاعدہ) نہیں ہے۔ اگرچہ ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے تاہم اللہ تعالیٰ نے دن کو کام کرنے کے لیے اور رات کو آرام کرنے کے لیے مقرر کیا ہے۔

(۱۲) اور ہم نے تمہارے اوپر سات مضبوط (آسمان) بنائے

اگرچہ سات محکم چیزوں سے، جو اہل زمین کے اوپر بنائی گئی ہیں مراد سات آسمان ہیں۔ تاہم آیت میں سات مضبوط کا جو ذکر ہے اسے اللہ ہی جانتا ہے کہ سات کی تحدید کی اصل حقیقت کیا ہے اس سے ستاروں کے سات کہکشانی نظام (System of galaxies) بھی مراد ہو سکتا ہے۔ ہر کہکشانی نظام میں تقریباً دس کروڑ ستارے ہوتے ہیں اور یہ وہ کہکشانی نظام بھی ہو سکتا ہے جس کا ہماری زمین اور نظامِ شمسی سے خاص تعلق ہو۔ یا اس سے مراد کچھ اور بھی ہو جو اللہ کے علم میں ہے۔ لیکن آیت سے واضح ہوتا ہے سَبۡعًا شِدَادًا یعنی سات مضبوط خدا کے وہ مخلوق ہیں جو تخلیق میں محکم اور تعمیر میں مضبوط ہیں اور کسی ایسی قوت سے بندھے ہوئے ہیں جو انہیں بکھرنے سے روکے ہوئے ہیں۔ سائنس کے مطابق یہ آسمانی مخلوق (Heavenly bodies) ستارے اور سیارے وغیرہ کشش ثقل (gravitational pull) کی وجہ سے بندھے ہوئے ہیں۔ ان سات مخلوق کا، چاہے یہ کہکشاں ہوں یا آسمان، مضبوط ہونے کا مطلب یہ بتایا گیا ہے کہ ان کی سرحدیں اتنی مستحکم ہیں کہ ان میں ذرہ برابر تغیر و تبدل نہیں ہونے پاتا اور ان سرحدوں کو پار کر کے عالم بالا کے بے شمار ستاروں اور سیاروں میں سے کوئی نہ کسی سے ٹکراتا ہے اور نہ کوئی زمین پر آگرتا ہے۔ ''سات آسمانوں کی حقیقت کیا ہے اس کا تعیّن مشکل ہے۔ انسان ہر زمانے میں آسمان یا بالفاظ دیگر ماورائے زمین کے متعلق اپنے مشاہدات یا قیاسیات کے مطابق مختلف تصورات قائم کرتا رہا ہے جو برابر بدلتے رہے ہیں۔ ان میں سے کسی تصور کو بنیاد قرار دے کر قرآن کے ان الفاظ کا مفہوم متعین کرنا صحیح نہ ہوگا۔ بس مجملاً اتنا سمجھنا چاہیے کہ یا تو اس سے مراد یہ ہے کہ زمین سے ماورأ جس قدر کائنات ہے، اسے اللہ نے سات محکم طبقوں میں تقسیم کر رکھا ہے یا یہ کہ زمین کائنات کے جس حلقے میں واقع ہے وہ سات طبقوں پر مشتمل ہے۔'' تفہیم القرآن

(۱۳) اور ہم نے ایک روشن گرم چراغ (سورج) بنایا

روشن چراغ سے مراد سورج ہے جو دونوں روشنی اور گرمی دیتا ہے اس کی روشنی اور گرمی پر زمین اور اس کی تمام ذی حیات مخلوق کی زندگی کا دارومدار ہے۔ سورج اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کی عظیم الشان نشانی ہے۔ اس کا قطر زمین کے قطر سے تقریباً ۱۰۹ گنا اور اس کا حجم زمین کے جسم سے تین لاکھ تنتیس ہزار (3,33,000) گنا زیادہ بڑا ہے۔ اس کا درجہ حرارت ایک کروڑ چالیس لاکھ (1,40,00,000) ڈگری سنٹی گریڈ ہے۔ زمین سے نو کروڑ تیس لاکھ (9,30,00,000) میل دور ہونے کے باوجود اُس کی روشنی کا یہ حال ہے کہ انسان برہنہ آنکھ سے اس کی طرف دیکھ نہیں سکتا اور اس کی گرمی کا حال یہ ہے کہ زمین کے بعض حصوں میں اس کی تپش کی وجہ سے درجہ حرارت ایک سو چالیس (140) ڈگری فارن ہائٹ تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ اللہ کی حکمت ہے کہ اس نے زمین کو اس سے ٹھیک اپنے فاصلے پر رکھا ہے کہ نہ اس سے بہت قریب ہونے کے باعث بے انتہا گرم ہے اور نہ بہت دور ہونے کے باعث بے انتہا سرد، اسی وجہ سے یہاں انسان، حیوان اور نباتات کی زندگی ممکن ہوئی ہے۔ اسی سے قوت کے بے حساب خزانے نکل کر زمین پر پہنچ رہے ہیں۔ جو ہمارے لیے سبب حیات بنے ہوئے ہیں۔ اسی سے ہماری فصلیں پک رہی ہیں اور ہر مخلوق کو غذا بہم پہنچ رہی ہے۔ اسی کی حرارت سمندروں کے پانی کو گرم کرکے وہ بھاپیں اٹھاتی ہے جو ہواؤں کے ذریعہ سے زمین کے مختلف حصوں پر پھیلتی اور بارش کی شکل میں برستی ہیں اس سورج میں اللہ نے ایسی زبردست بھٹی سلگا رکھی ہے جو اربوں سال سے روشنی حرارت اور مختلف اقسام کی شعائیں (Rays) سارے نظام شمسی میں پھینکے چلی جارہی ہے۔ (تفہیم القرآن)

سورج روشنی اور گرمی کا ایسا منبع (Source) ہے جس کی بدولت زمین پر رہنے والے تمام انسان و حیوان اور دیگر جاندار و نباتات زندہ ہیں۔ اگر انسان اس حقیقت پر غور کرے تو اسے خدا کو پہچاننے اور ماننے میں کوئی دیر نہیں لگے گی۔

Water Cycle

(۱۴) اور ہم نے بادلوں سے کثرت سے برسنے والا پانی برسایا تاکہ ہم اس کے ذریعہ سے غلہ اور پودے اور گھنے باغات اگائیں

چونکہ سورج ہی بادل بنانے کا ذریعہ ہے وہ اس طرح کہ سورج کی حرارت سے زمین پر موجود سمندر آبی بخارات بن کر بادل بن جاتے ہیں۔ ان بادلوں کے نچوڑنے سے پانی بارش کی شکل میں زمین پر برستا ہے۔ آغاز آفرینش میں اللہ تعالیٰ نے بیک وقت اتنی مقدار میں پانی نازل فرمادیا ہے جو قیامت تک اس کرۂ ارض کی ضرورت کے لیے (اس کے علم کے مطابق) کافی ہے۔ اور یہ اسی پانی کا الٹ پھیر ہے جو گرمی سردی اور ہواؤں کے ذریعے سے ہوتا رہتا ہے۔ اسی کو بارشیں، برف پوش پہاڑ، دریا اور چشمے اور کنوے زمین کے مختلف حصوں میں پھیلاتے رہتے ہیں اور وہی بے شمار چیزوں کی پیدائش اور ترکیب میں شامل ہوتا ہے۔ اور پھر ہوا میں تحلیل ہوکر اصل ذخیرے کی طرف واپس جاتا رہتا ہے۔ جسے واٹر سائکل (Water Cycle) کہتے ہیں۔ شروع سے آج تک پانی کے اس ذخیرے میں نہ ایک قطرے کی کمی ہوئی اور نہ ایک قطرے کا اضافہ کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ پانی ہائیڈروجن (hydrogen) اور آکسیجن (oxygen) دو گیسوں کی ملاوٹ سے بنا ہے اور یہ پانی ایک ہی دفعہ اتنا بن گیا کہ اس سے سمندر بھر گئے اور اب اس کے ذخیرے میں نہ ایک قطرے کا اضافہ ہوتا ہے اور نہ ایک قطرے کی کمی ہوتی ہے۔ کون ہے جس نے ایک وقت میں ہائیڈروجن اور آکسیجن کے دو گیسوں کو ملاکر اس قدر پانی بنایا اور اسے کمی بیشی کے بغیر قائم رکھا۔ اور پھر اللہ کی قدرت سے زمین بارش کے پانی سے سیراب ہوکر غلے، نباتات اور گھنے باغات اگاتی ہے۔

ان آیات میں پے درپے بہت سے آثار و شواہد پیش کئے گئے اور قیامت و آخرت کے منکرین کو یہ بتایا گیا ہے کہ اگر تم آنکھیں کھول کر زمین اور پہاڑوں اور خود اپنی پیدائش، اپنی نیند اور بیداری، روز و شب کے انتظام، کائنات کے بندھے ہوئے نظام، آسمان کے چمکتے ہوئے سورج اور تارے، بادل سے برسنے والی بارش اور اس سے پیدا ہونے والی نباتات کو دیکھو تو تمہیں دو باتیں ان میں نمایاں نظر آئیں گی۔ ایک یہ کہ یہ سب کچھ ایک زبردست قدرت کے بغیر نہ وجود میں آسکتا ہے اور نہ اس باقاعدگی کے ساتھ جاری رہ سکتا ہے۔ دوسری یہ کہ ان میں ہر چیز کے اندر ایک عظیم حکمت کام کر رہی ہے اور کوئی کام بھی بے مقصد نہیں ہو رہا ہے۔ اب یہ بات صرف ایک نادان ہی کہہ سکتا ہے کہ جو قدرت ان ساری چیزوں کو وجود میں لانے کی قادر ہے وہ انہیں فنا کر دینے میں اور دوبارہ پیدا کرنے میں قادر نہیں ہے اور یہ بات بھی صرف ایک نادان ہی کہہ سکتا ہے کہ جس حکیم نے اس کائنات میں کوئی کام بھی بے مقصد نہیں کیا ہے اس نے اپنی بنائی ہوئی دنیا میں انسان کو سمجھ بوجھ، خیر و شر کی تمیز، اطاعت و نافرمانی کی آزادی اور اپنی مخلوقات پر تصرف کے اختیارات بے مقصد ہی دے ڈالے ہیں۔ اور انسان اُس کی دی ہوئی ان چیزوں کو اچھی طرح استعمال کرے یا بری طرح دونوں صورتوں میں اس کا نتیجہ نہیں نکلتا ہے؟! کوئی بھلائی کرتے کرتے مرجائے تو بھی مٹی ہی میں مل کر ختم ہوجائے گا اور کوئی برائیاں کرتے کرتے مرجائے تو بھی مٹی میں ہی مل کر ختم ہوجائے گا۔ نہ بھلائی کرنے والے کو اس کی بھلائی کا کوئی اجر ملے گا اور نہ برائی کرنے والے کو اس کی برائی کی کوئی سزا ملے گی۔ یعنی اس دنیا میں نہ بھلائی کے کاموں کی کچھ قیمت ہے اور نہ برے کام کرنے میں کوئی قباحت ہے۔ جیسا کہ مغربی تہذیب اختیار کرنے والے لوگ یہ بات کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے ہیں کہ کوئی معاملہ اچھا یا بُرا نہیں ہے مگر سوچنے سے ایسا ہوتا ہے۔ (Nothing is good or bad but thinking makes it so) اسی طرح کوئی چیز اچھی نہیں ہے سوائے وہ جسے انسان اچھی سمجھے۔ یعنی ان لوگوں کی نظروں میں نہ کوئی چیز بری ہے اور نہ کوئی چیز اچھی ہے۔ صرف انسان کی رائے کے مطابق کوئی چیز اچھی ہے اور کوئی چیز بری۔ شراب خوری کو جو لوگ اچھا سمجھتے ہیں ان کے لیے یہ اچھا ہے اور جو لوگ اسے برا سمجھتے ہیں ان کے لیے یہ برا ہے۔ اسی طرح زنا کاری کو جو لوگ برا سمجھتے ہیں ان کے لیے یہ برائی ہے اور جو لوگ اسے برا نہیں سمجھتے ان کے لیے یہ بری چیز نہیں ہے بلکہ جائز ہے۔ دُنیا میں جو برائیوں اور بے راہ روی کا دور دورہ ہے ان کے پیچھے ایسے ہی باطل خیالات کارفرما ہیں جب تک انسان ان

خیالات کی آبیاری کرتا رہے گا تب تک اس کے اخلاق اور آداب میں کوئی سدھار نہیں آئے گا۔ اور ان اخلاق سوز خیالات اور نظریات نے دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اس لیے وقت کی اہم ضرورت ہے کہ ان نظریات کے خلاف قرآن و حدیث کی روشنی میں تحریک چلائی جائے تاکہ نئی نسل اس کی بربریت سے نجات پاسکے گی۔

انسان کو چاہیے کہ واضح حقیقت پر غور کرے کہ کیا کسی خالق حکیم کی منصوبہ سازی کے بغیر یہ مناسبتیں حادثہ کے نتیجے میں خود بخود قائم ہو سکتی ہیں ! اگر ایسا نہیں ہے اور ایسا کبھی بھی ممکن نہیں تو پھر اس عظیم ہستی رب العالمین کی طرف رجوع کرنے میں دیر کس وجہ سے ہے؟

إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيقَاتاً (١٧)

بے شک فیصلے کا دن ایک مقرر وقت ہے

يَوْمَ يُنفَخُ فِي الصُّورِ فَتَأْتُونَ أَفْوَاجاً (١٨)

جس روز صور میں پھونک ماردی جائے گی تو تم فوج درفوج نکل آؤ گے۔

وَفُتِحَتِ السَّمَاء فَكَانَتْ أَبْوَاباً (١٩)

اور آسمان کھول دیا جائے گا تو وہ دروازے ہی دروازے بن کر رہ جائے گا

وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَاباً (٢٠)

اور پہاڑ چلائے جائیں گے تو وہ سراب بن جائیں گے۔

(١٧) بے شک فیصلے کا دن ایک مقررہ وقت ہے

سورہ الجاثیہ آیت:٢٢ میں فرمایا گیا ہے: ''اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا فرمایا تاکہ ہر شخص کو اس کی کمائی کا بدلہ دیا جائے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا''

اس آیت سے انسانی زندگی کا مقصد واضح ہوتا ہے کہ اسے ایک خاص مقصد کے لیے دنیا میں لایا گیا ہے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے اسے امتحان و آزمائش میں ڈالا گیا تاکہ ہر شخص کو اپنے کیے ہوئے کام کا بدلہ ملے۔ کسی پر ظلم نہ کیا جائے گا بلکہ انسان کے ساتھ نیکی کا بدلہ نیکی سے دیا جاے گا اور نیکی کرنے والے کو جنت میں داخل کیا جائے گا اور بدی کا بدلہ بدی سے دیا جائے گا اور بدی کرنے والے کو واصل جہنم کیا جائے۔

منکرین (مشرکین و کافرین) کا خیال تھا کہ دُنیا میں جو نیکی یا بدی کی گئی ہو اس کی جزا یا سزا نہیں ہے۔ نہ ظالم سے باز پرس ہوگی اور نہ مظلوم کی دادرسی ہوگی۔ ان کا خیال تھا کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے یہ سب بے مقصد اور بے نتیجہ ہے۔ اس کا کوئی نتیجہ نکلنے والا نہیں ہے۔ ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا کہ یقینا ایک دن سارے انسانوں کو اللہ کی بارگاہ میں جمع ہونا ہے اور انہیں ہر بات اور ہر کام کا جواب دینا ہے اور اس جوابدہی کے لیے ایک دن مقرر ہے جس دن تمام انسانوں کے فیصلے کئے جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بلا اِرادہ اور بے مقصد پیدا نہیں کیا اور نہ اسے بے لگام اپنی مرضی کا غلام بنا کر چھوڑ دیا۔ حق یہ ہے جس خدا نے انسان کو ایک منصوبہ بند اور بامقصد زندگی عطا کی وہ خدا انسان کو اس حال میں نہیں چھوڑے گا کہ وہ ایسی بے مقصد اور بے معنی زندگی گزارے جس کا خاتمہ اور انجام کسی نتیجہ کے بغیر ہو۔ وہ دنیا میں نیکی کا کام کرے یا فتنے اور فساد پھیلاتا رہے، اپنی زندگی میں راہ راست پر چلے یا گمراہیوں میں بھٹکتا پھرے، دنیا میں انصاف کرے یا اسے ظلم سے بھر دے اور خیال کرے کہ ان چیزوں کا کوئی نتیجہ نہیں اور وہ یہ بھی خیال کرے کہ ظلم کرنے والے اور انصاف کرنے والے، نیکی کا کام کرنے والے اور بدی کا کام کرنے والے، فتنہ فساد کرنے والے اور امن قائم کرنے والے، خدا کی بندگی کرنے والے اور اس کی نافرمانی کرنے والے سب یکساں ہیں اور یہ کہ مرنے کے بعد کسی جگہ دوبارہ زندہ نہیں ہونا ہے اور نہ دُنیا میں کئے گئے کام کا کہیں پر حساب ہوگا۔ انسان کی ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے فرمایا گیا کہ یقینا فیصلے کا دن آئے گا اور دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سب کے بارے میں فیصلہ ہوگا اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔ اسی دن کا اللہ وعدہ فرماتا ہے۔ اور اسی دن کو یوم الفصل قرار دیا گیا ہے۔

(۱۸) جس روز صور میں پھونک ماردی جائے گی تو تم فوج در فوج نکل آؤ گے

صُور کو آج کل کی اصطلاح میں بگل (Whistle) کہا جا سکتا ہے جو لوگوں کو جمع کرنے کے لیے بجایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کو سمجھانے کے لیے وہ اصطلاحیں استعمال فرماتا ہے جو انسانی زندگی میں استعمال ہوتی ہیں اور جن سے لوگ واقف ہوتے ہیں تاکہ لوگوں کو آسانی سے بات سمجھ میں آسکے گی۔ جب کہیں کسی جگہ بگل بجتا ہے تو لوگ یک دم آواز کی طرف متوجہ ہوجاتے ہیں۔ قدیم زمانے سے لوگوں کو جمع کرنے اور اہم اعلان کرنے کے لیے کسی طرح کا بگل بجایا جاتا۔ بگل کے بجائے اونچی آواز میں بھی لوگوں کو پکارا جاتا ہے۔ فیکٹریوں (Factories) میں سائرن (Siren) بجا کر کام کرنے والوں (Workers) کو بلایا جاتا ہے۔ اس طرح کی آواز سے بلانے کو اللہ نے صور کا نام دیا ہے۔ ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسرافیل صور پر منہ رکھے عرش کی طرف دیکھ رہے ہیں اور منتظر ہیں کہ کب صور پھونکنے کا حکم ہوتا ہے۔ یہ صور تین مرتبہ پھونکا جائے گا۔ پہلا نفختہ الفزع جو زمین و آسمان کی ساری مخلوق کو سہما دے گی۔ دوسرا نفختہ الصّعق جس کی آواز سنتے ہی سب ہلاک ہو کر گر جائیں گے۔ پھر جب اللہ احد وصمد کے بغیر کوئی باقی نہ رہے گا تب تیسری بار صور پھونکا جائے گا جس کی آواز سنتے ہی لوگ میدان حشر میں جمع ہونے کے لیے دوڑ پڑیں گے۔ جیسا کہ سورہ یٰس میں فرمایا گیا ہے۔ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَإِذَا هُم مِّنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنسِلُونَ ''اور جب صور پھونکا جائے گا یکایک یہ اپنے رب کے حضور پیش ہونے کے لیے اپنی قبروں سے نکل پڑیں گے۔''

جب قبروں سے نکل پڑیں گے تو گھبرا کر کہیں گے کہ کس نے ہمیں ہماری خواب گاہ سے اُٹھایا۔ آواز آئے گی کہ یہ وہی چیز ہے جس کا خدائے رحمان نے وعدہ کیا تھا اور رسولوں نے سچ بتایا تھا ایک زور دار آواز سے سب کے سب اللہ کے سامنے فوج درفوج حاضر کردئے جائیں گے۔

سورہ طٰہٰ میں اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کے بارے میں فرماتے ہیں، ''اس دن جب صور پھونکا جائے گا اور ہم مجرموں کو اس حال میں گھیر لائیں گے کہ ان کی آنکھیں دہشت کے مارے پتھرائی ہوئی ہوں گی۔ اور آپس میں چپکے چپکے کہیں گے کہ دُنیا میں مشکل ہی سے تم نے کوئی دس دن گزارے ہوں گے'' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہمیں خوب معلوم ہے کہ وہ کیا باتیں کررہے ہوں گے۔ اُس وقت ان میں سے جو زیادہ سے زیادہ محتاط اندازہ لگانے والا ہوگا وہ کہے گا کہ نہیں تمہاری زندگی بس ایک دن کی زندگی تھی۔ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر قیامت کے دن لوگوں کی اس طرح کی باتیں بیان کی گئی ہیں کہ لوگ اپنی زندگی کے متعلق یہ اندازہ لگائیں گے کہ وہ بہت تھوڑی تھی۔ ایک جگہ ارشاد ہوا ہے: ''اللہ تعالیٰ پوچھے گا کہ تم زمین میں کتنے سال رہے؟ وہ جواب دیں گے ایک دن یا دن کے ایک حصے میں رہے ہوں گے۔ (المومنون) موت کی حالت میں پڑے رہنے کے بارے میں بھی ایسی ہی باتیں کہیں گے ''جس روز قیامت قائم ہوجائے گی تو مجرم لوگ قسمیں کھاکھا کر کہیں گے ہم موت کی حالت میں گھڑی بھر سے زیادہ نہیں پڑے رہے تھے۔ اسی طرح وہ دنیا میں بھی دھوکے کھاتے رہتے تھے'' ان تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ دنیا کی زندگی اور برزخ کی زندگی دونوں کو وہ بہت قلیل سمجھیں گے دُنیا کی زندگی کے متعلق وہ اس لیے یہ باتیں کریں گے کہ اپنی امیدوں کے برخلاف جب انہیں آخرت کی ابدی زندگی میں آنکھیں کھولنی پڑیں گی اور جب وہ دیکھیں گے کہ یہاں کے لیے وہ کچھ بھی تیاری کرکے نہیں آئے ہیں تو حسرت کے ساتھ وہ اپنی دنیوی زندگی کی طرف پلٹ کر دیکھیں گے اور افسوس سے کہیں گے کہ چند دن کے لطف و مسرت اور فائدہ و لذت کی خاطر ہم نے ہمیشہ کے لیے اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماردی۔ قیامت کا منظر دیکھ کر اب انہیں یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ دنیا ان کے لیے ایک آزمائش گاہ تھی جہاں انہیں ان کے اعمال سے آزمایا گیا۔ اب نیک عمل کرنے والوں کو قیامت کے دن کے عذاب سے نجات ملے گی اور برے اعمال کرنے والوں کو سخت عذاب دیا جائے گا اور رسولوں کی اطاعت کرنے والے اور خدا کی صحیح بندگی کرنے والے جنت میں جائیں گے جبکہ رسولوں کو جھٹلانے والے اور خدا کی نافرمانی کرنے والے جہنم میں داخل کردئے جائیں گے۔ قیامت کے روز لوگوں کو جمع کرنے کے لیے صور پھونکنے یعنی بگل بجانے کی اللہ تعالیٰ کو کیا ضرورت ہے۔ اس کی وضاحت میں پھر سے یہ بات دہرائی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی باتوں کو سمجھانے کے لیے انسانی الفاظ اور اصطلاحات (terms) کا استعمال فرماتے ہیں۔ خوفناک آواز کے بعد لوگوں کا بیک وقت ہلاک ہوجانا اور اسی آواز

پر دوبارہ زندہ ہونا اور پھر افراتفری کے عالم میں اِدھر اُدھر دوڑنا اور فوج در فوج بڑے بڑے گرہوں میں رب العالمین کی بارگاہ میں حاضر ہونا یہ سب ایسے مناظر ہیں جن کے خوف سے لوگوں کو اللہ کی راہ اختیار کرنے میں دلچسپی بڑے گی اور وہ آخرت کی فکر کریں گے جو لوگ قیامت کے ان مناظر پر ایمان رکھتے ہیں وہ ان مناظر قیامت کے خوف سے ہمیشہ آخرت کی ابدی زندگی کو مدنظر رکھ کر دنیا میں مشکلوں سے بھری زندگی کو آرام دہ زندگی پر ترجیح دیتے ہیں اور آخرت کی رسوائی سے بچنے کے لیے اللہ اور اس کے رسولوں کی اطاعت کرکے آخرت کی کامیابی اور عزت افزائی کے لیے مشکلات برداشت کرتے ہیں اور مصیبت پر صبر کرتے ہیں اور اس طرح وہ دنیا کی آزمائش میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔
واللہ علم

(۱۹، ۲۰) اور آسمان کو کھول دیا جائے گا تو وہ دروازے ہی دروازے بن کر رہ جائے گا اور پہاڑ چلائے جائیں گے تو وہ سراب بن جائیں گے

آسمان کو کھول دیئے جانے سے مراد یہ ہے کہ عالم بالا میں کوئی بندش اور رکاوٹ باقی نہ رہے گی اور سارے دروازے کھل جائیں گے یعنی آسمان جو انتہائی مضبوط اور محکم ہے ٹکڑے ٹکڑے ہوجائے گا اور اس کے دروازے ہی دروازے نظر آئیں گے۔ پہاڑوں کے چلائے جانے کا مطلب اور ان کا سراب بن کر رہ جانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ پہاڑ دیکھتے ہی دیکھتے ریزہ ریزہ ہوکر ہوا میں اڑجائیں گے۔ سورہ طٰہٰ میں فرمایا گیا ہے کہ یہ پوچھتے ہیں کہ آخر اس دن یہ پہاڑ کہاں چلے جائیں گے ان سے کہو میرا رب ان کو دھول بناکر اڑادے گا اور زمین کو ایسا چٹیل میدان بنادے گا کہ اس میں کوئی اتار و چڑاؤ نہ دیکھو گے۔

پہاڑوں کی تباہی کو مختلف جگہوں پر مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ پہاڑ جو میخوں کی طرح زمیں میں جمے ہوئے ہیں زمین پر سے ہٹا دیئے جائیں گے وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوکر ذرات کے مانند ہوا میں اڑتے پھریں گے۔ بہ الفاظ دیگر پہاڑوں کا وجود باقی نہ رہے گا وہ سراب کی طرح بے حقیقت ہوجائیں گے۔ ریگستان میں ایک صحرا نورد کو دھوپ کی لپٹوں میں دوری پر پانی کی لہریں دکھائی دیتی ہیں لیکن وہ پانی نہیں ہوتا ہے بلکہ پانی کا دھوکہ ہوتا ہے ۔ اسے سراب کہتے ہیں۔ اسی طرح اس دن پہاڑ سراب دکھائی دیں گے۔ سراب کا ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پہاڑوں کے یہ بکھرے ہوے ذرات سورج کی شعاعوں سے چمکیں گے اور انہیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوگا، گویا کوئی سراب ہے۔ الغرض ان پہاڑوں کی ایسی ہیئت ہوجائے گی جس سے ہم ناآشنا ہیں اور جس سے صرف اللہ واقف ہے۔ تاہم کائنات میں ٹوٹ پھوٹ اور انقلاب کا ہولناک منظر سب انسانوں کو آخرت کا خوف دلانے کے لیے ہے تاکہ وہ ان خوفناک مناظر سے متاثر ہوکر اللہ کی راہ اختیار کرلیں ورنہ اس حقیقت کو اگر ہم سائنس کی نگاہ سے دیکھ لیں گے تو پھر یہ کائنات جیسا کہ قرآن سے بھی ثابت ہے کہ ایک ہی مادے کا ٹکڑا تھا پھر اللہ نے اسے الگ الگ کردیا۔ سائنس کی موجودہ تحقیقی بِگ بینگ تھیوری (Bigbang theroy)

کے مطابق یہ کائنات یکجا تھی پھر ایک دھماکہ کے ذریعے یہ الگ ہوئی اور یہ ساری مخلوقات، سورج، چاند ستارے، سیارے اور کہکشان وجود میں آگئیں جو ایک کشش ثقل سے بندھے ہوئے ہیں۔ جس خالق کائنات نے ان سب مخلوقات کو ایک دوسرے کی کشش کے ذریعے ایک نظام بخشا ہے اسی خالق کائنات کے ایک اشارے پر یہ سارا نظامِ کائنات لمحہ بھر میں اس کشش ثقل کے سمیت نیست و نابود ہوجائے گا یہی قیامت ہے۔

اللہ تعالیٰ کو نہ آسمان میں دروازے بنانے کی ضرورت ہے اور نہ پہاڑوں کو ریت کے ذرے یا اون کے ٹکڑے بنانے کی ضرورت ہے بلکہ یہ سب کچھ انسانوں کو انسانی الفاظ میں سمجھانے کے لیے ہے تاکہ انسان حقیقت کو سمجھ کر خدا کی بندگی اختیار کریں اور آخرت کی کامیابی حاصل کریں۔

إِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَاداً (٢١)

بے شک جہنم ہمیشہ گھات میں ہے

لِلطَّاغِينَ مَآباً (٢٢)

سرکشوں کے لیے ٹھکانا ہے

لَابِثِينَ فِيهَا أَحْقَاباً (٢٣)

وہ مدتوں اسی میں رہنے والے ہیں۔

لَّا يَذُوقُونَ فِيهَا بَرْداً وَلَا شَرَاباً (٢٤)

نہ اس میں کوئی ٹھنڈ چکھیں گے اور نہ کوئی پینے کی چیز

إِلَّا حَمِيمًا وَغَسَّاقًا (٢٥)

سوائے کھولتا ہوا پانی اور بدبو دار پیپ

جَزَاءً وِفَاقًا (٢٦)

پورا پورا بدلہ دینے کے لیے

إِنَّهُمْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ حِسَابًا(٢٧)

بلاشبہ وہ کسی حساب کی امید نہیں رکھتے تھے

وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كِذَّابًا(٢٨)

اور انہوں نے ہماری آیات کو بری طرح جھٹلایا

وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ كِتَابًا(٢٩)

اور ہر چیز کا ریکارڈ ہم نے محفوظ رکھا ہے

فَذُوقُوا فَلَن نَّزِيدَكُمْ إِلَّا عَذَابًا (٣٠)

بس چکھو عذاب ! ہم تمہیں عذاب کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہیں کریں گے

(۲۱، ۲۲، ۲۳)بے شک جہنم ہمیشہ گھات میں ہے۔ سرکشوں کے لیے ٹھکانہ ہے

وہ مدتوں اس میں رہیں گے

جب سے انسان کو پیدا کیا گیا ہے تب سے جہنم خدا کے باغیوں کی گھات میں منتظر ہے۔ خدا کے سرکش اور باغی جب وہاں پہنچیں گے تو یہ دیکھ کر حیران ہوجائیں گے کہ جہنم پہلے سے ان کے انتظار میں ہے گویا وہ کہیں سفر پر چلے گئے تھے اور لوٹ کر اب اپنے ٹھکانے پر واپس آگئے ہیں۔ انہیں معلوم ہوگا کہ اب انہیں اسی ٹھکانے پر ہمیشہ رہنا ہے اور مدتوں آگ کے شعلوں میں جلتے رہنا ہے۔ گھات اس جگہ کو کہتے ہیں جو شکار کو پھانسنے کے لیے بنائی جاتی ہے تاکہ وہ بے خبری کی حالت میں اچانک اس میں پھنس جائے۔ جہنم کے لیے یہ لفظ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ خدا کے باغی اسی سے بے خوف ہوکر دنیا میں یہ سمجھتے ہوئے اُچھل کود کرتے پھر رہے ہیں کہ خدا کی خدائی اُن کے لیے ایک کھلی آماجگاہ ہے۔ یہاں کسی پکڑ کا خطرہ نہیں ہے۔ جس طرح کوئی شکار آزادی سے پھرتے ہوئے گھات لگائے ہوئے شکاری کے نشانہ پر آتا ہے اور بے خبری میں شکار ہوجاتا ہے یا شکاری کے بچھائے ہوئے جھال میں اچانک پھنس کر پکڑا جاتا ہے اسی طرح جہنم خدا کے نافرمانوں کے لیے ایک چھپی ہوئی گھات یا بچھایا ہوا جال ہے۔ جس میں وہ اچانک پھنس جائیں گے اور پھر وہاں سے انہیں نکلنے کی کوئی صورت نہ ہوگی۔ وہ ہمیشہ اسی جہنم کے جال میں پھنسے رہیں گے اور عذاب کا مزہ چکھتے رہیں گے۔ لیکن یاد رہے کہ جو شکاری اپنے شکار کے لیے گھات لگاتا ہے اسے اپنے شکار کے لیے اس لیے انتظار کرنا پڑتا ہے کہ اسے معلوم نہیں ہوتا کہ شکار کب اس کے نشانے پر آجائے یا جھال میں پھنس جائے لیکن اللہ تعالیٰ کی گھات ایسی گھات یا جال ہے جو ہمیشہ اللہ کے علم میں ہے اللہ جانتا ہے کہ کون برائیوں میں مبتلا ہوکر اس جال میں پھنس جاتا ہے اور کون شکاری کے نشانے پر آجاتا ہے۔ لیکن اس نے اپنے بندوں کو ڈھیل دے رکھی ہے تاکہ اس ڈھیل کے دوران کوئی گنہگار بندہ گناہوں سے توبہ کرکے شکاری کے جال سے نکل جائے لیکن جو نافرمان اور گنہگار اور مغرور بندے بے خوف اور لاپرواہ ہوکر خرمستیاں کرتے رہیں گے انہیں شکاری کے جال میں پھنسے ہوئے شکار کی طرح پکڑ کر واصل جہنم کردیا جائے گا۔ جہاں یہ مدتوں پڑے رہیں گے۔ جہنم میں داخل ہونے والوں کے لیے احقاب کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی ہیں پے درپے وقفوں (periods) میں آنے والا طویل زمانہ جس میں ایک دور ختم ہوتے ہی دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ لیکن بعض لوگوں نے احقاب یعنی مدتوں کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ جہنم کی زندگی جنت کی زندگی کی طرح ہمیشہ رہنے والی زندگی نہیں ہے کیونکہ انہوں نے مدتوں کا مطلب ایک طویل زمانہ سمجھا ہے جو آخر ختم ہوجائے گا اور جس کے ختم

ہونے کے بعد اہل جہنم کو وہاں سے عذاب دے کر نکال دیا جائے گا لیکن یہ استدلال غلط ہے اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ احقاب ایسے ادوار کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو لگاتار ایک دوسرے کے بعد آتے چلے جائیں گے ہر ایک دور کے بعد دوسرا دور آئے گا اور اس طرح یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن کی آیت کا ایسا مفہوم نکالنا جو قرآن کی کسی آیت سے متصادم ہو غلط ہے۔ قرآن میں ۳۴ مقامات پر اہل جہنم کے لیے خلود (ہمیشگی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے تین جگہ پر خلود کے علاوہ ابداً ابدا (ہمیشہ ہمیشہ) کا بھی اضافہ کیا گیا ہے اور ایک جگہ صاف ارشاد ہوا ہے کہ ''وہ چاہیں گے کہ جہنم سے نکل جائیں مگر وہ اس سے ہرگز نکلنے والے نہیں ہیں اور ان کے لیے قائم رہنے والا عذاب ہے'' (المائدہ:۳۷) ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے کہ ''اس حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے جب تک کہ زمین وآسمان قائم ہیں الا یہ کہ تیرا رب کچھ اور چاہے۔ (ہود: ۱۰۷، ۱۰۸)

واضح رہے کہ زمین و آسمان قائم رہنے کے الفاظ یا تو عالم آخرت کے زمین و آسمان مراد ہیں یا پھر محاورے کے طور پر ان کو دوام اور ہمیشگی کے معنی میں استعمال کیا گیا۔ بہرحال موجودہ زمین و آسمان مراد نہیں ہوسکتے ہیں کیونکہ قرآن کے بیان کی رو سے یہ قیامت کے روز بدل دیئے جائیں گے اور یہاں جن واقعات کا ذکر رہو رہا ہے وہ قیامت کے بعد پیش آنے والے ہیں۔ قیامت کے روز زمین و آسمان سمیت کائنات کے تمام مظاہر تہس نہس کردئے جائیں گے اور ہر کوئی چیز نیست و نابود ہوجائے گی۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍo وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِo ہر ایک چیز فنا ہونے والی اور صرف تیرے رب کی جلیل اور کریم ذات ہی باقی رہنے والی ہے۔ خالق کائنات کے منشا کے مطابق اس کائنات کی تجدید نو (Reinvigoration) اور reshuffle ہوجائے گی۔ جنت اور جہنم قائم کردئے جائیں گے۔ اللہ کے فرمانبرداروں کو ان کے نیک اعمال کی جزا میں جنت ملے گی اور نافرمانوں کو ان کے بُرے عملوں کی سزا میں جہنم واصل کیا جائے گا جو ان کا ابدی ٹھکانہ ہوگا۔

ان تصریحات کے بعد لفظ احقاب یعنی مدتوں کے معنی کی بنیاد پر جہنم کے قیام کو دائمی کے بجائے عارضی کہنا غلط ہے۔ واللہ علم۔

(۲۴، ۲۵، ۲۶) نہ اس میں کوئی ٹھنڈ چکھیں گے اور نہ کوئی پینے کی چیز سوائے کھولتے ہوئے پانی اور بدبودار پیپ کے

جہنمیوں کو جہنم کی تپش سے پیاس لگے گی انہیں پیاس بجھانے کے لیے گرم کھولتا ہوا پانی اور ان کے جھلستے ہوئے زخموں سے نکلنے والا بدبودار پیپ دیا جائے گا۔ کھولتا گرم پانی ان کے حلق اور پیٹ کو بھون کر رکھدے گا اور زخموں سے نکلنے والے بدبودار پیپ کی بو (smell) ان کو بے ہوش کردے گی۔ ان ہی چیزوں سے ان کے بُرے اعمال کا بدلہ انہیں مل جائے گا۔

(۲۷، ۲۸) یہ لوگ کسی حساب کی امید نہیں رکھتے تھے اور ہماری آیات کو جھٹلاتے تھے

یہ لوگ کسی حساب و کتاب کی توقع نہیں رکھتے تھے اور خدا کی طرف سے جو آیات نازل ہوتی تھیں ان کو جھٹلاتے تھے۔ ان وجوہات کی بنا پر یہ لوگ جہنم کے اس خوفناک عذاب کے مستحق ہوگئے۔ ایک تو یہ دُنیا میں یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کرتے تھے کہ انہیں کبھی خدا کے سامنے حاضر ہوکر اپنے اعمال کا جواب نہیں دینا ہے دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کے ذریعے ان کی ہدایت کے لیے جو آیات بھیجی تھیں یہ ان کے ماننے سے قطعاً انکار کرتے تھے اور جو انبیاء ان تک یہ آیات پہنچا دیتے تھے ان کو بھی جھوٹے قرار دیتے تھے اور ان کو ناحق ستاتے تھے یہاں تک کہ ان کا بے دریغ قتل بھی کرتے تھے۔ ان کے ان اعمال بد کی وجہ سے آج انہیں اس خطرناک سزا اور عذاب کا سامنا ہے۔

(۲۹) ہر چیز کا ریکارڈ ہم نے محفوظ رکھا ہے

چونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے اقوال و افعال، ان کی حرکات و سکنات حتیٰ کہ ان کی نیتوں اور خیالات کا مکمل ریکارڈ تیار کر رہے ہیں جس سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز چھوٹ نہیں جاتی ہے لیکن منکرین اس پر یقین نہ کر کے اپنی مرضی اور خواہش سے جو کچھ چاہتے ہیں کرتے رہتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی باز پرس کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ ان ہی کا ذکر ہو رہا ہے کہ جہنم میں جب خدا کے یہ نافرمان بندے جل رہے ہوں گے تو اس وقت ان کو یہ چیزیں یاد دلائی جائیں گی۔ حالانکہ وہ خود اپنے کرتوتوں پر پچھتاتے ہوں گے لیکن یاد دہانی جلتی پر تیل کا کام کرے گی۔ انسان کی حرکات و سکنات اللہ کی بارگاہ میں کس طرح ریکارڈ ہو رہی ہیں۔ آج کے سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں اس حقیقت کو سمجھنا نزول قرآن کے دور کی نسبت زیادہ آسان ہے۔ اُس زمانے میں کسی چیز کو ریکارڈ کرنے یا محفوظ کرنے کا طریقہ قلم اور سیاہی کا استعمال کر کے لکھنے کا تھا۔ لیکن دور جدید میں ٹیکنالوجی (Technology) کی مدد سے ایلکٹرانک آلات (Electronic gadgets) کے ذریعہ سے انسانوں کی حرکات و سکنات (Activities) ان کی آواز اور تصویر کے ساتھ ریکارڈ کر کے محفوظ کی جاتی ہیں۔ انسانی حرکات و سکنات ریکارڈ کرنے کا علم جو انسان کو حاصل ہوا وہ سمندر میں قطرے کے برابر بھی نہیں ہے۔ انسان کے اس علم میں کتنا اضافہ ہوگا وہ وقت ہی بتائے گا لیکن یہ خیال کہ انسانوں کے اعمال خدا کے پاس کس طرح ریکارڈ ہو رہے ہیں یہ صرف اس خدائے ذوالجلال کو معلوم ہے جس نے اس علم کا تھوڑا سا حصہ اپنی مصلحت اور حکمت کے پیش نظر انسان کو بخشا۔ ہمیں صرف اس بات پر راسخ ایمان ہونا چاہیے کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں باری تعالیٰ کے پاس یہ سب کچھ ریکارڈ ہو رہا ہے اور یہ ریکارڈنگ ہر طرح کے خطرے سے محفوظ ہے۔ اس باتصویر ریکارڈنگ کی کیسٹ(cassette) کو جب کل رب العالمین کی بارگاہ میں نمائش (play) کیا جائے گا تو اس وقت کو یاد کرنا چاہیے کہ کون اپنے اعمال کی audio-video display کو دیکھ کر خوشی سے جھوم اٹھیں گے اور کون اپنے اعمال بد کی فلم دیکھ کر اپنی آنکھیں بند کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ مگر آنکھیں بند کرنے سے ان کے عذاب میں کمی نہ ہوگی۔

(۳۰) پس چکھو عذاب ! ہم تمہیں عذاب کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہیں کریں گے

اب سرکشوں اور باغیوں کی ملامت کی جاتی ہے۔ ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا جاتا ہے کہ اللہ کے فیصلے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی بلکہ ان کے عذاب میں اضافہ کیا جائے گا۔ یہ منکرین حق جہنم کے عذاب میں روئیں گے اور سینہ کوبی کریں گے۔ ہر طرف ان کے رونے دھونے اور آہ و فغاں کا شور وغل ہوگا ان کا خیال ہوگا کہ شاید اس آہ و زاری اور سینہ کوبی سے انہیں جہنم سے نکال دیا جائے گا یا ان کے عذاب میں تخفیف کی جائے گی لیکن ان کی ناامیدی میں اضافہ ہوگا جب ان سے کہا جائے گا کہ مزا چکھو اس عذاب کا ہم تمہارے عذاب میں کوئی کمی نہیں کریں گے بلکہ اسے بڑھاتے ہی جائیں گے۔ یہ ہوگا خدا کے باغی اور نافرمان بندوں کے عذاب جہنم کا منظر۔

إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ مَفَازاً(۳۱)

بے شک متقیوں کے لیے ایک بڑی کامیابی ہے

حَدَائِقَ وَأَعْنَاباً(۳۲)

باغات اور قسم قسم کے انگور ہوں گے

وَكَوَاعِبَ أَتْرَاباً(۳۳)

اور ہم عمر نوخیز لڑکیاں ہوں گی

وَكَأْساً دِهَاقاً(۳۴)

اور چھلکتے ہوئے شراب کے پیالے

لَّا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْواً وَلَا كِذَّاباً(٣٥)

وہاں وہ کوئی لغو اور جھوٹی بات نہ سنیں گے

جَزَاءً مِّن رَّبِّكَ عَطَاء حِسَاباً(٣٦)

یہ تیرے رب کی طرف سے بدلے میں بہت بڑا عطیہ ہوگا

(٣١) بے شک متقیوں کے لیے بڑی کامیابی ہے

جس طرح خدا کے باغیوں اور نافرمانوں کا ٹھکانہ جہنم ہے جس سے بچ کر وہ کہیں جا نہیں سکتے ہیں بلکہ ہمیشہ جلتے رہیں گے۔ اسی طرح خدا ترس اور خدا کے فرمانبردار بندے فوز وفلاح سے ہمکنار ہوں گے۔ انہیں ان کی کامیابی کا صلہ جنت کی نعمت سے ملے گا جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے اور عیش و عشرت کی زندگی گزاریں گے۔ متقیوں کا لفظ ان لوگوں کے مقابلے میں استعمال کیا گیا جو کسی حساب کی توقع نہ رکھتے تھے اور جنہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا تھا۔ اس لیے اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ کی آیات کو مانا اور دنیا میں یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کی کہ انہیں رب العالمین کے سامنے پیش ہونا ہے اور اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔

(٣٢) ان کے لیے باغ ہوں گے اور قسم قسم کے انگور۔ ہم عمر لڑکیاں اور چھلکتے ہوئے جام

متقیوں کی کامیابی کے بعد اب اس کی تصویر کشی کی جاتی ہے کہ ان کے لیے وہاں بڑی بڑی دلچسپ نعمتیں حاضر ہوں گی۔ ان کے لیے قسم قسم کے باغات اور کھانے کے لیے میوے ہوں گے۔ باغات سے مراد قسم قسم کے باغ ہیں جن میں انار اور کھجوروں کے باغات بھی شامل ہیں لیکن پھلوں میں خاص طور پر انگوروں کا ذکر کیا گیا ہے کیونکہ انگوروں سے مخاطب قرآن یعنی قرآن سننے والے لوگ اچھی طرح واقف تھے۔ اور اسے لوگ پسند بھی کرتے تھے۔ انگوروں کے باغات کی حدبندی کھجوروں کے درختوں سے کی جاتی تھی۔ ان باغات اور انگوروں کے پھلوں کے ذکر کرنے سے دراصل مراد متقیوں کو جنت میں ملنے والی نعمتوں سے آگاہ کرنا ہے جو ان ہی میوہ جات کی طرح ہیں جن سے لوگ واقف تھے۔

(۳۳) ہم عمر نوخیز لڑکیاں

متقیوں کو خوبصورت ہم عمر لڑکیاں زوجیت میں دی جائیں گی جس کا ذکر قرآن میں دوسری جگہ پر آیا ہے۔ وَعِنۡدَهُمۡ قٰصِرٰتُ الطَّرۡفِ اَتۡرَابٌ۔ ان کے پاس شرمیلی ہم سن بیویاں ہوں گی۔ (سورہ جن آیت:۵۲)

یہ لڑکیاں جوان متقیوں کی بیویاں ہوں گی آپس میں ہم عمر ہوں گی یا جن کی زوجیت میں دی جائیں گی ان کی ہم عمر ہوں گی یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپس میں ہم عمر ہوں گی اور میاں بیوی جوڑے کی حیثیت سے اپنے اپنے جوڑے کے بھی ہم سن ہوں گی۔

جس طرح انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے جوڑوں میں پیدا کرکے دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے ان گنت نعمتوں سے نوازا ہے، جن میں ان کے جوڑے بنانا ان کے لیے ایک بہترین نعمت ہے۔ متقیوں کو آخرت میں اللہ تعالیٰ اسی قسم کی مگر اس سے بہتر نعمتوں سے نوازے گا۔ جن میں دنیاوی زندگی کے جوڑوں کی طرح ان کے جوڑے ہوں گے جو ان کے لیے ایک بڑی نعمت ہوگی۔ انہیں دنیا کی عورتوں کی طرح آخرت میں خوبصورت جوان اور ہم سِن بیویاں عطا کی جائیں گی۔ ان کی صفات میں فرمایا گیا ہے کہ یہ بیویاں دنیا کی بیویوں کے مقابلے میں نہایت حسین اور پر کشش ہوں گی انہیں دنیا کی عورتوں کی طرح نہ بڑھاپا آئے گا اور نہ موت آئے گی اور نہ ان کے حسن وجمال میں کوئی تبدیلی آئے گی۔ وہ ہم سن اور ہم عمر ہوں گی اور ان متقیوں کے ساتھ ہمیشہ ایک شان بان میں رہیں گی۔ حُسن وجمال میں بھی وہ دنیا کی عورتوں سے کہیں زیادہ حسین وجمیل ہوں گی ان کے حسن و جمال کو کواعبٌ اَترابا میں بیان کیا گیا ہے۔ کواعبٌ کے معنی نوخیز جوان لڑکیاں اور اتراب کا معنی ہم سن اور ہم عمر لڑکیاں ہیں یہ دونوں الفاظ لڑکیوں کے حسن و جمال کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔ کواعبٌ کا ایک اور ترجمہ بھی ہے۔ کواعب کا عِبۃٌ کی جمع ہے یہ لفظ کعب سے بنا ہے جس کا معنی ٹخنہ ہے جس طرح ٹخنہ ابھرا ہوا ہوتا ہے ان کی چھاتیوں میں بھی ایسا ابھار ہوگا جو ان کے حسن و جمال میں اضافہ کرتا ہے۔ لفظ کعب کے اس معنی کی بنیاد پر اس آیت کا ترجمہ ابھری ہوئی چھاتیوں والی ہم سن لڑکیاں کیا گیا ہے۔

(۳۴) چھلکتے ہوئے جام

چھلکتے ہوئے شراب کے پیالے ہوں گے یہ شراب نشہ، بدبو اور آمیزش سے پاک ہوگی جو پینے والے کو بے ہوش نہیں کرے گی۔ یہ شراب طہور دنیا میں پینے والی شراب کے بدلے میں دی جائے گی۔ جس طرح دنیا بھر میں آج بھی شراب نوشی کا رواج عام ہے۔ اکثر لوگ شراب نوشی میں اپنی پریشانیوں کا حل ڈھونڈتے ہیں اسی طرح عرب میں عام طور اور اہل مکہ کی مجلسوں اور محفلوں میں خاص طور ر شراب نوشی کی جاتی تھی اور شراب نوشی محفلوں کی زینت اور رونق سمجھی جاتی تھی۔ شراب نوشی کے بغیر یہ لوگ اپنی زندگی کو نامکمل (incomplete) اور بے فائدہ سمجھتے تھے۔ چونکہ قرآن نے شراب نوشی پر دُنیا کی زندگی میں ہمیشہ کے لیے روک (ban) لگادی ہے۔ لیکن جنت میں شراب پینے کی عام اجازت دے دی گئی۔ مگر اس اجات کے فوراً بعد فرمایا گیا کہ وہاں کوئی لغو اور جھوٹی بات وہ نہ سنیں گے۔

(۳۵) فرمایا گیا کہ وہاں کوئی لغو اور جھوٹی بات وہ نہ سنیں گے

قرآن مجید میں کئی مقامات پر جنت میں جھوٹی اور لغو بات نہ سننے کی حقیقت کو جنت کی بڑی نعمتوں میں شمار کیا گیا ہے۔ لَایَسمَعُوَ فِیھَا لَغوًا اِلَّا سَلٰما۔ وہاں وہ کوئی بے ہودہ بات نہیں سنیں گے بلکہ صرف ٹھیک بات سنیں گے۔ (سورہ مریم:٦٢) جنت میں جانے والے وہاں بے ہودہ جھوٹی اور گندی باتیں نہیں سنیں گے اور نہ وہاں فضول گپ شپ ہوں گی اور نہ گالم گلوچ، بہتان سازیاں اور الزام تراشیاں ہوں گی۔ اس آیت میں متقیوں کی نعمتوں میں اور اضافہ کیا گیا ہے فرمایا گیا ہے: وَلَھُم رِزقُھُم فِیھَا بُکرَۃً وَّعَشِیًا۔ ان کے لیے وہاں صبح اور شام کا رزق ہوگا۔ دنیا میں انسان کو نفسانی خواہشات کی کشمکش اور دوڑ دھوپ (struggle) سے گزارنا پڑتا ہے۔ اسے جھوٹ وفریب، دھوکہ زنی لوٹ مار، ڈھاکہ زنی، بدکاری، ظلم و جبر، فتنے فسادات، لڑائی جھگڑے، بے حیائی و بے شرمی، عریاں کاری، منافرت و طعنہ زنی، خودکشی وقتل غارت جیسے واقعات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسے ماحول میں ایک مومن کے لیے صرط المستقیم، راہِ ہدیٰ پر چلنا تلوار کی دھار پر چلنے کے برابر ہوتا ہے۔ ہر طرف فحش کلامی کی آوازیں گونج رہی ہیں اور عریاں کاری اور بے حیائی کا بازار گرم ہے۔ ایسے حالات میں مومنوں اور متقیوں کو اپنے آپ کو گناہوں سے بچانا ہے اور دوسروں کو بھی بچانے کی سعی و کوشش کرنی ہے۔ اس جدوجہد میں انہیں طعنہ زنی کا شکار بھی ہونا پڑتا ہے۔ ان برائیوں ور فحش کاموں اور عریاں کاری سے دلچسپی رکھنے والے ان متقیوں کو طعنہ دیتے ہیں کہ یہ لوگ دنیا کی زینت اور رونق سے بے زار ہیں۔ اس لیے دنیا کی خوشیوں اور عیش و عشرت سے محروم ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی دنیا پرست لوگ انہیں دنیا بے زار لوگ ہونے کے طعنے دیتے ہیں۔ ان لوگوں کے جواب میں فرمایا گیا ہے کہ آخرت میں یہ متقی لوگ ان تمام بے ہودگیوں سے نجات پائیں گے نہ کوئی بری بات سنیں گے اور نہ کوئی برا کام دیکھیں گے۔ دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے رزق کی تلاش میں اور خدا کی بندگی کرنے میں ان متقیوں کو بہت ساری مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان حالات میں گناہوں سے بچنے کے لیے انہیں پھونک پھونک کر چلنا پڑتا ہے اس کے بدلے میں ان سے اللہ تعالیٰ وعدہ کرتا ہے کہ جنت میں داخل ہوکر انہیں رزق کی تلاش میں کوئی جستجو اور دوڑ دھوپ نہیں کرنی پڑے گی بلکہ انہیں صبح و شام بغیر محنت و مشقت رزق ملتا رہے گا۔ اس طرح جنت میں ان کی زندگی بہت آرام اور سکون سے گزرے گی۔ وہاں یہ نہ کوئی لغو بات سنیں گے اور نہ انہیں کسی برے کام سے واسطہ پڑے گا یہ رزق اور یہ نعمتیں انہیں دنیا میں منکرین حق کی طعنہ زنی اور مشکلات پر صبر کرنے کے عوض حاصل ہوجائیں گی۔

یہ تیرے رب کی طرف سے بہت بڑا عطیہ ہوگا

یہ نعمتیں اللہ کی طرف سے ان متقیوں کو دنیا میں خدا کی راہ میں تکلیف اٹھانے کے بدلے میں عطا کی جائیں گی۔ اندازِبیان سے محسوس ہوتا ہے کہ اللہ رب العالمین پیاری زبان اور ہمدردانہ انداز میں اپنے محبوب بندوں سے خطاب فرما رہے ہیں جنہوں نے خدا کی راہ میں قربانیاں دے کر دین اسلام کی شمع کو روشن رکھا اور جسے باطل قوتیں اپنی پھونکوں سے بجھانا چاہتی تھیں۔

جزا کے بعد کافی انعام عطا کرنے کا ذکر کا مطلب یہ ہے کہ ان کو صرف اتنی ہی جزا نہ دی جائے گی جس کے وہ اپنے نیک اعمال کی بنا پر مستحق ہوں گے بلکہ انہیں بہت زیادہ، ان کی امیدوں سے بڑھ کر، انعامات سے نوازا جائے گا۔ اس کے برعکس اہل جہنم کے بارے میں صرف اتنا فرمایا گیا ہے کہ انہیں ان کے کرتوتوں کا بھرپور بدلہ دیا جائے گا یعنی ان کی سزا میں نہ اضافہ کیا جائے گا اور نہ کمی کی جائے گی۔ جیسا کہ سورہ یونس کی آیت:۲٦ میں فرمایا گیا ہے: (جن لوگوں نے بھلائی کا طریقہ اختیار کیا ان کے لیے بھلائی ہے اور مزید فضل) یعنی ان کی نیکیوں کے مطابق ہی انہیں اجر نہیں ملے گا بلکہ اللہ اپنے فضل و کرم سے ان کو مزید انعام بھی بخشے گا۔ (جن لوگوں نے برائیاں کمائیں ان کی برائیاں جیسی ہیں ویسا ہی وہ بدلہ پائیں گے) یعنی نیکوکاروں کے برعکس انہوں نے جتنی برائیاں کمائیں ہیں انہیں اتنی ہی سزا دی جائے گی۔ جرم سے زیادہ ذرہ برابر سزا نہ دی جائے گی۔

رَبِّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمَنِ لَا يَمْلِكُونَ مِنْهُ خِطَاباً(۳۷)

جو رب ہے آسمانوں اور زمین کا اور ہر اس چیز کا جو ان دونوں کے درمیان ہے۔ تاہم اس سے کسی کو بات کرنے کا یارانہ ہوگا۔

يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفّاً لَّا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَنُ وَقَالَ صَوَاباً(۳۸)

جس دِن روح اور فرشتے صفوں میں کھڑے ہوں گے، کوئی نہ بولے گا مگر وہ جسے رحمٰن اجازت دے اور وہ ٹھیک ٹھیک بات کہے گا۔

(۳۷) یہ جزا و سزا اس مالک و آقا کی طرف سے ہوگا جو زمین وآسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب مخلوقات کا رب ہے

اب سورہ کے آخر میں قیامت کا منظر پیش کیا گیا ہے جس کے بارے میں اختلاف کرنے والے اختلاف کر رہے ہیں۔ میدان حشر میں دربار الٰہی کے رعب کا یہ عالم ہوگا کہ جبرئیل علیہ السلام اور سب فرشتے انتہائی عاجزی اور نیازمندی سے صف بستہ رحمان کے حضور کھڑے ہوں گے اور اس لرزہ انگیز موقع پر کسی کو بولنے کا یارانہ ہوگا سوائے رحمٰن کے اِذن سے اور رحمان بھی اسی کو بات کرنے کی اجازت دے گا جو صحیح بات کرے گا۔

جہنم میں جانے والوں کے جرائم میں ایک جرم یہ ہوگا کہ وہ دنیا میں یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ قیامت کے دن جس کا انہیں یقین نہیں تھا، اگر دیکھنا بھی پڑے گا تو ہمارے یہ خود ساختہ دیوی دیوتا (self made gods) ہمیں خدا کی گرفت سے بچالیں گے۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ وہاں صورت حال ایسی ہوگی کہ کسی کو رب ذوالجلال کی گرفت سے بچانا تو درکنار کوئی اس کے سامنے بات کرنے کی جرأت نہیں کرسکے گا۔ اللہ ہی زمین وآسمانوں کو پیدا کرنے والا ہے اور جو کچھ زمین اور آسمانوں کے درمیان ہے اس کا پیدا کرنے والا بھی وہی ہے اور وہی اس کا مالک ہے۔ دنیا میں اس نے ہر انسان کو کسی حد تک اپنی مرضی کے مطابق بولنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ لیکن قیامت کے دن اس کے سامنے کوئی دم نہیں مارسکے گا۔ آج بھی جو لوگ یہ غلط عقیدہ رکھتے ہیں کہ ہمارے بزرگ، پیر و فقیر، اولیاء و انبیاء قیامت کے روز ہماری سفارش کریں گے اور ہم نے جتنے بھی گناہ کئے ہوں ان کی سفارش پر معاف ہوں گے۔ ایسے لوگوں کو اس آیت پر غور کرنا چاہیے اور اپنے عقیدہ کو درست کرنا چاہیے۔

صحیح احادیث کے مطابق یہ اس وقت کا ذکر ہے جب اللہ تعالیٰ فیصلے کے لیے میدان حشر میں نزول فرمائیں گے اور لوگ قیامت کے خوف ودہشت سے گھبرا جائیں گے اور وہ آدم علیہ السلام سے لے کر عیسٰی علیہ السلام تک سب انبیاء کے پاس جائیں گے کہ وہ حساب و کتاب شروع کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے سفارش کریں لیکن کسی نبی کی ہمت نہ ہوگی کہ وہ اللہ تعالیٰ سے بات کرے آخر کار خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش پر حساب شروع ہوجائے گا۔ صحیح بخاری

(۳۸) کوئی نہ بولے گا سوائے وہ جسے رحمٰن اجازت دے اور وہ ٹھیک بات کہے گا

اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر اس دن کوئی بات نہ کرسکے گا اور جسے اللہ تعالیٰ بات کرنے کی اجازت دے گا وہ بھی صحیح بات کہے گا۔ سفارش کرنے والے کے لیے دو شرطیں ہیں پہلی شرط یہ کہ رحمٰن اسے اجازت دے۔ دوسری شرط یہ کہ وہ سفارش کے لیے حق بات کہے اس شخص کی سفارش نہ کرے جو سفارش کا مستحق نہ ہو جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام اپنے والد آزر کو قیامت کے روز سفارش نہ کرسکیں گے اور جس طرح حضرت نوع علیہ السلام کو اپنے بیٹے کی سفارش سے منع کردیا گیا ۔ اسی طرح قیامت کے روز بھی وہ اس کی شفارش نہ کرسکیں گے۔

اس طرح سفارش کرنے والا بجا اور درست بات کہے بے جا سفارش نہ کرے اور جس کے بارے میں سفارش کر رہا ہو وہ دنیا میں کم ازکم کلمہ حق کا قائل رہا ہو۔ یعنی صرف گنہگار ہو کافر نہ ہو۔ قرآن میں اکثر جگہوں پر فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش کرنے والا نہ ہوگا۔ دنیا کی تدبیر و انتظام میں بھی کسی دوسرے کا دخل دینا تو درکنار کوئی اتنا اختیار بھی نہیں رکھتا کہ خدا سے سفارش کرکے اس کا کوئی فیصلہ بدلوادے یا کسی کی قسمت بنوادے یا بگڑوا دے زیادہ سے زیادہ جو کچھ کرسکتا ہے وہ بس اتنا ہے کہ خدا سے دعا کرے مگر اس کی دعا قبول ہونا یا نہ ہونا بالکل خدا کی مرضی پر منحصر ہے۔ خدا کی بارگاہ میں اتنا زور دار کوئی نہیں ہے کہ اس کی بات چل کر رہے اور اس کی سفارش ٹل نہ سکے۔

ذَلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ فَمَن شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ مَآباً (۳۹)

یہ دن برحق ہے اب جس کا جی چاہے اپنے رب کے پاس ٹھکانا بنالے۔

إِنَّا أَنذَرْنَاكُمْ عَذَاباً قَرِيباً يَوْمَ يَنظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ وَيَقُولُ الْكَافِرُ يَا لَيْتَنِي كُنتُ تُرَاباً (۴۰)

بے شک ہم نے تم کو اس عذاب سے آگاہ کردیا ہے جو جلدی آنے والا ہے اس دن ہر شخص وہ کچھ دیکھ لے گا جو اس نے اپنے ہاتھوں سے آگے بھیجا ہے اور کافر کہے گا کاش میں مٹی ہوجاتا۔

(۳۹) یہ دن برحق ہے اب جس کا جی چاہے اپنے رب کے پاس ٹھکانا بنالے

یہ ان لوگوں کے لیے تنبیہہ اور وارننگ ہے جو قیامت کے بارے میں اختلاف کر رہے ہیں ان سے کہا جاتا ہے کہ اس دن کا آنا یعنی قیامت کا آنا یقینی ہے۔ تمہارے بحث و مباحثوں اور اختلافات کی وجہ سے اسے ٹالا نہیں جاسکتا ہے۔ وقت غنیمت سمجھ کر اپنے رب کے پاس ٹھکانا بنالو قبل اس کے کہ دوزخ تمہارا شکار کرکے تمہیں اپنا ایندھن بنالے۔

بے شک ہم نے تم کو اس عذاب سے آگاہ کردیا جو جلد آنے والا ہے:

اب آخری وارننگ دی جاتی ہے کہ تمہیں عذابِ آخرت سے خبردار کردیا گیا ہے جو قریب آلگا ہے۔ انسان کو قیامت سے واسطہ اسی وقت پڑتا ہے جب اسے موت آجاتی ہے موت سے اس کی دنیاوی زندگی کا خاتمہ ہوجاتا ہے اور اسے عالم برزخ میں محشر کے میدان میں حاضر ہونے کا انتظار ہوتا ہے۔ پھر جب قیامت کا وہ دن آئے گا جس کا اللہ کی طرف سے اعلان کیا جاتا ہے اس دن ہر شخص اپنی آنکھوں سے وہ کچھ دیکھ لے گا جو اس نے آگے بھیجا ہے۔

(۴۰) اور کافر کہے گا کاش میں مٹی ہوتا

یہ دن ایسا سخت اور خوفناک ہوگا کہ کافر جو آج دلیری سے انکار کرتا ہے اس دن کہے گا کہ کاش میں مٹی ہوتا اور آج ایسا دن نہ دیکھنا پڑتا اور اس طرح کا عذاب سہنا نہ پڑتا۔ کہا جاتا ہے کہ ابلیس جس نے آدم کو یہ کہہ کر سجدہ کرنے سے انکار کردیا۔ اَنَا خَیۡرٌ مِنۡہُ۔ خَلَقۡتَنِیۡ مِنۡ نَّار وَخَلَقۡتَہٗ مِنۡ طِیۡن۔ ''میں اس آدم سے بہتر ہوں کیونکہ آپ نے مجھے نار سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے آج یہ کافر کہے گا کہ کاش میں مٹی ہوتا تاکہ مجھے عذاب کا شکار نہ ہونا پڑتا۔ بہرحال قیامت کے دن جہنم کا عذاب دیکھ کر تمام کافر اور خدا کے نافرمان بندے عذاب جہنم سے ڈر کر چیخ اٹھیں گے کہ کاش ہم لوگ مٹی ہوتے تاکہ اس عذاب سے بچ جاتے۔ لہٰذا خدا کے بندوں کو وارننگ دی جاتی ہے کہ اس خوف ناک سزا سے بچنے کی وہ ہر ممکن کوشش کریں ورنہ عذاب سے بچنے کے لیے وہ اس دن اپنی خفت کو مٹا کر مٹی جیسی چیز کے ہونے کی تمنا کریں گے جسے وہ دُنیا میں حقیر سمجھتے تھے۔ اللہ ہمیں اس عذاب سے بچالے۔

سورۃ النازعات

آیا تھا:۴۶ رُکوعا تُھا:۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَالنَّازِعَاتِ غَرْقًا o وَالنَّاشِطَاتِ نَشْطًا o وَالسَّابِحَاتِ سَبْحًا o فَالسَّابِقَاتِ سَبْقًا o فَالْمُدَبِّرَاتِ أَمْرًا o يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ o تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ o قُلُوبٌ يَوْمَئِذٍ وَاجِفَةٌ o أَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ o يَقُولُونَ أَإِنَّا لَمَرْدُودُونَ فِي الْحَافِرَةِ o أَإِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً o قَالُوا تِلْكَ إِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ o فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَاحِدَةٌ o فَإِذَا هُم بِالسَّاهِرَةِ o هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ مُوسَىٰ o إِذْ نَادَاهُ رَبُّهُ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى o اذْهَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ o فَقُلْ هَل لَّكَ إِلَىٰ أَن تَزَكَّىٰ o وَأَهْدِيَكَ إِلَىٰ رَبِّكَ فَتَخْشَىٰ o فَأَرَاهُ الْآيَةَ الْكُبْرَىٰ o فَكَذَّبَ وَعَصَىٰ o ثُمَّ أَدْبَرَ يَسْعَىٰ o فَحَشَرَ فَنَادَىٰ o فَقَالَ أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ o فَأَخَذَهُ اللَّهُ نَكَالَ الْآخِرَةِ وَالْأُولَىٰ o إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَن يَخْشَىٰ o أَأَنتُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَمِ السَّمَاءُ ۚ بَنَاهَا o رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوَّاهَا o وَأَغْطَشَ لَيْلَهَا وَأَخْرَجَ ضُحَاهَا o وَالْأَرْضَ بَعْدَ ذَٰلِكَ دَحَاهَا o أَخْرَجَ مِنْهَا مَاءَهَا وَمَرْعَاهَا o وَالْجِبَالَ أَرْسَاهَا o مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ o فَإِذَا جَاءَتِ الطَّامَّةُ الْكُبْرَىٰ o يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْإِنسَانُ مَا سَعَىٰ o وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ لِمَن يَرَىٰ o فَأَمَّا مَن طَغَىٰ o وَآثَرَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا o فَإِنَّ الْجَحِيمَ هِيَ الْمَأْوَىٰ o وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ o فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ o يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا o فِيمَ أَنتَ مِن ذِكْرَاهَا o إِلَىٰ رَبِّكَ مُنتَهَاهَا o إِنَّمَا أَنتَ مُنذِرُ مَن يَخْشَاهَا o كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا عَشِيَّةً أَوْ ضُحَاهَا o

پس منظر

سورہ میں قیامت اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کے دلائل ہیں اور خدا کے رسول کو جھٹلانے والوں کی تنبیہہ کی گئی ہے کہ جو لوگ رسولوں کو جھٹلاتے ہیں ان کا انجام بُرا ہوگا۔ وہ جہنم میں داخل کردئے جائیں گے۔ سورہ کا مقصد اور مطلب قلب انسانی میں اس حقیقت کا شعور پیدا کرنا ہے کہ موت کے بعد بارگاہ الٰہی میں دوبارہ زندہ ہوکر ہر معاملے اور ہر بات کا جواب دینا ہے۔ حکم الٰہی کے مطابق ہر مخلوق کو ایک منظم طریقے (systematic order) میں موت آجاتی ہے۔ کوئی مردہ بچے کی شکل میں جنم لیتا ہے، کوئی بچپن میں اور کوئی جوانی میں مرتا ہے اور کوئی بوڑھا ہوکر مرجاتا ہے اور یہ سلسلہ (process) تب تک جاری رہے گا جب تک اللہ کی مرضی ہے اور پھر ایک دن ایسا آئے گا کہ زمین اور آسمانوں میں موجود تمام مخلوقات تباہ ہوجائیں گی۔ تمام جاندار، انسان و حیوان بیک وقت موت کے شکار ہوں گے یہ دن قیامت کا دن ہوگا۔ فرمایا گیا ہے کہ یہ کام جسے تم لوگ ناممکن سمجھتے ہو اللہ کے لیے مشکل نہیں۔ اس کام کے لیے اللہ تعالیٰ کو کوئی بڑے پلان بنانے اور تیاری کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بس ایک زور دار جھٹکا دنیا کے اس نظام کو درہم برہم کردے گا اور ایک دوسرے جھٹکے کے بعد یکایک اول سے آخر تک پیدا شدہ سب لوگ اپنے آپ کو دوبارہ زندہ اور موجود پائیں گے اس وقت وہی لوگ جو قیامت کا انکار کرتے تھے خوف سے کانپ اٹھیں گے اور سہمی ہوئی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتے رہیں گے یہاں تک کہ نیکوکاروں اور گنہگاروں کو الگ الگ کردیا جائے گا۔

حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے تاریخی واقعہ سے خبردار کیا گیا ہے کہ فرعون نے اللہ کے بھیجے ہوئے پیغمبر حضرت موسیٰؑ کو جھٹلایا تو اس کا انجام اُس نے دنیا میں ہی دیکھ لیا کہ جب وہ حضرت موسیٰ کے پیچھے پڑ گیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے پانی میں ڈبو کر ہلاک کر دیا اور صدیوں بعد اس کی لاش برآمد کی گئی جو مصر کے عجائب گھر میں موجود ہے۔ لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ اگر وہ اس واقعہ سے عبرت حاصل کر کے باز نہ آجائیں تو ان کا بھی وہی انجام ہوگا جو فرعون اور اس کے لشکر کا ہوا۔ اس کے بعد منکرین آخرت کو یہ بات سمجھائی جاتی ہے کہ جس خالق کائنات نے پہلی بار اس کائنات اور اس دنیا کو پیدا کیا ہے۔ اس کے لیے انسانوں کو دوبارہ پیدا کرنا کیسے ناممکن ہے۔ اس کے بعد انسانوں کی توجہ زمین کی طرف مبذول کرائی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے کہ یہ زمین جو انسانوں اور حیوانوں کی زندگی کے لیے بنائی گئی ہے اس میں موجود ہر چیز اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ یہ ایک بڑی حکمت کے ساتھ کسی خاص مقصد کو پورا کرنے کے لیے بنائی گئی ہے۔ انسان کو اس بات کا احساس دلایا جارہا ہے کہ یہ جو لوگ سوچتے ہیں کہ اس کائنات اور اس میں موجود مخلوقات کو یونہی بس ایک تماشے کے طور پر پیدا کیا گیا ہے اور انسانوں کے اعمال کی کوئی پوچھ تاچھ نہ ہوگی۔ وہ ہر طرح کے کام کر کے مر جائیں اور خاک میں ملکر ہمیشہ کے لیے فنا ہوجائیں گے اور کبھی ان سے حساب نہ لیا جائے گا کہ دنیا میں انہوں نے کس طرح کے کام کیے ہیں۔ کیا عقل یہ بات مانتی ہے کہ ایک انسان دنیا میں طاقت کے بل بوتے پر ہزاروں انسانوں کا بے گناہ قتل کردے اور پھر اسے کہیں پر اس قتل عام کا جواب نہ دینا ہوگا۔ یا اس نے رشوت خوری، بد دیانتی اور لوٹ کھسوٹ کر کے لوگوں کو ایذا دی ہو اور دنیاوی قانون کے شکنجے سے بچ کر کوئی سزا نہ پائی ہو اب اسے کوئی سزا نہ ملے گی۔ اس طرح کی سوچ نہ صرف غیر معقول (irrational) بلکہ احمقانہ ہے۔ اگر انسان کا ضمیر اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ برے اعمال کرنے والوں کو سزا ملنی چاہیے تو پھر آخرت کی نئی زندگی سے انکار کرنا سراسر غیر معقول اور خلافِ عدل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانوں کو اس دنیا میں صرف اس مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ خدا کی بندگی کریں اور اس کے احکام اور قوانین کی تعمیل کریں۔ دنیا میں انصاف قائم کریں اور انسانیت کے اس معیار کو قائم کریں جس کو لے کر ان کو حیوانوں سے ممیّز کردیا گیا ہے۔ انسانوں سے فرمایا گیا ہے کہ وہ ضد اور ہٹ دھرمی سے پاک ہوکر ایمانداری کے ساتھ اس بات پر غور کریں کہ انسان کو دنیا میں اختیارات اور ذمہ داریاں سونپنے کا عقلی، منطقی اور اخلاقی تقاضا یہی ہے کہ آخرت میں اس کے اعمال کا محاسبہ کیا جائے اور ہر کسی کو اس کے عملوں کے مطابق جزا یا سزا دی جائے گی۔

سورہ کے آخر میں کافروں کے اس سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ قیامت کب آئے گی اس کے جواب میں فرمایا گیا کہ قیامت کے آنے کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ رسولوں کا کام صرف خبردار کرنا ہے کہ وہ دن ضرور آئے گا۔ اب جو اس دن کا خوف کرے گا اور نیک اعمال کرے وہ اس دن کے عذاب سے بچ جائے گا اور جو شخص اس دن سے انکار کرے گا اور برے کاموں میں مبتلا ہوجائے گا وہ اس دن ضرور عذاب پائے گا۔ جو لوگ اس دنیا پر مرمٹتے ہیں اور اسی دنیا کو سب کچھ سمجھتے ہیں وہ لوگ اس دن محسوس کریں گے کہ دنیا میں وہ صرف ایک دن کے پچھلے پہر یا اگلے پہر تک رہے ہیں اس وقت انہیں احساس ہوگا کہ اس چند دن کی زندگی کی خاطر انہوں نے ہمیشہ رہنے والی زندگی یعنی آخرت کی زندگی کو کیوں برباد کردیا۔

کافر لوگ کہتے ہیں کہ کیا وہ الٹے پاؤں لوٹائے جائیں گے اس کے بعد جب وہ بوسیدہ ہڈیاں ہوجائیں گے ان سے کہا جاتا ہے کہ بے شک ان کو قیامت کے دن ایک ہی ڈانٹ (threat) پر اللہ کے روبرو حاضر کردیا جائے گا۔ سب مرے ہوئے اور سڑے ہوئے انسانوں کو ان کے مادے سے دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ سائنس دان بھی اس نتیجے پر پہنچ گئے ہیں کہ مادی دنیا کی کوئی چیز بھی ضائع نہیں ہوجاتی ہے بلکہ کسی نہ کسی صورت میں محفوظ ہوجاتی ہے۔ یعنی اس کا مادہ موجود رہتا ہے ختم نہیں ہوجاتا ہے۔ ان کے کہنے کے مطابق مادہ (matter) فنا نہیں ہوجاتا ہے۔ یہ لافانی ہے۔ (Matter is immortal) اس لیے ہر کوئی چیز جو بظاہر ختم ہوجاتی ہے مگر اس کا مادہ موجود رہ جاتا ہے۔ خدا کا قانون بھی یہی ہے کہ انسان کا کوئی بھی عمل ضائع نہیں ہوجاتا ہے۔ نیکی ہو یا بدی ہر چیز محفوظ ہوجاتی ہے۔ قیامت کے روز ہر ایک انسان کو اپنے ہی مادے سے دوبارہ پیدا کیا جائے گا اور اس کے محفوظ شدہ اعمال کے ساتھ اسے اللہ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

تخلیقِ کائنات اللہ تعالیٰ کی چار صفات پر مبنی بتائی گئی ہے۔ اس کی پہلی صفت اِبداع (ایجاد) ہے۔ اس سے مراد کسی چیز کو بغیر کسی مادے ک پیدا کرنا ہے (To create anything out of nothing) جیسا کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی یہ صفت اس طرح بیان ہوئی ہے۔ بَدِيْعُ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ (البقرۃ:۱۱۷) فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ(فاطر:۱)۔ یعنی اللہ تعالیٰ آسمانوں اور ازمین کو پیدا کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو بغیر کسی مادے کے پیدا کیا ہے یعنی زمین اور آسمان بجائے خود ایک مادہ (matter) ہے جسے اللہ تعالیٰ نے کُنْ (ہوجا) فرما کر پیدا کیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی پہلی صفت ہے کہ وہ جس چیز کو فرماتے ہیں ہوجاؤ تو وہ ہوجاتی ہے اس صفت کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ بدیع۔ ایجاد کرنے والا ہے اور وہ کسی بھی چیز کو بغیر کسی مادے یا آلے (tool) کے پیدا فرما دیتا ہے۔ اِبداع کی یہ صفت انسان کی سمجھ سے باہر ہے کیونکہ یہ عالم شہادت میں موجود نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کی دوسری صفت خلق ہے اس سے مراد کسی چیز کو کسی مادے سے پیدا کرنا ہے۔ اللہ نے آدم کو مٹی کے مادے سے پیدا فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی پہلی صفت اِبداع کے لحاظ سے زمین وآسمان اور پوری کائنات کو بغیر کسی مادے کے پیدا فرمایا لیکن جب مادہ پیدا ہوگیا تو پھر اس مادے سے اس نے پہلے آدم علیہ السلام کو بحیثیت پہلا انسان پیدا کیا اور جنات کو آگ سے پیدا کردیا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے: خَلَقَ الْاِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ کَالْفَخَّارِo وَخَلَقَ الْجَانَّ مِن مَّارِجٍ مِّن نَّارٍo (رحمٰن:۱۴، ۱۵) اس نے انسان کو سڑی ہوئی مٹی سے پیدا کیا جو ٹھیکری کی طرح تھی اور جن کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا۔ فرشتوں کو نور سے پیدا کیا اور بعض دوسری چیزوں کو دوسرے مواد سے پیدا کیا جس طرح انسان ایک مادے سے دوسرے مادے کو پیدا کردیتا ہے یعنی ایک چیز سے دوسری چیز بنادیتا ہے۔ مثلاً چقماق (ignite) کے رگڑ سے بجلی پیدا کردی گئی۔ انسانوں کے نر اور مادہ (Male-female) کے مادہ ہائے تولید سے بچے کی صورت میں دوسرا مادہ پیدا کیا جاتا ہے اور یہ سلسلہ (process) جاری ہے۔

اللہ تعالیٰ کی تیسری صفت اللہ کی تدبیر (planning) ہے۔ اللہ تعالیٰ کائنات کی ہر چیز کی تدبیر کرتا ہے بے جان اور جاندار چیزوں جیسے حیوانوں اور انسانوں کو پیدا کرنے کی تدبیر کرتا ہے چیزوں کے عروج و زوال کی تدبیر کرتا ہے اور موت اور زندگی کی تدبیر کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی چوتھی صفت تخلیق نو (regeneration) یعنی مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنا ہے۔ تمام جنّوں اور انسانوں کو اللہ تعالیٰ کی اس صفت تخلیق نو کے مطابق دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ ایک دن ایسا آئے گا جسے قیامت کہتے ہیں جب تمام انسان اور حیوان ایک وقت ہلاک ہوجائیں گے اور پھر اللہ تعالیٰ سارے انسانوں کو اپنی صفت تخلیق نو کے مطابق سڑے ہوئے اور خاک میں ملے ہوئے مواد سے دوبارہ پید فرمادیں گے اور اپنے پاس حاضر کردیں گے۔ یہی آخرت ہے جس کا ذکر اس سورہ کے علاوہ قرآن میں مختلف جگہوں پر کیا گیا ہے کہ قیامت کے دن انسانوں کو دوبارہ زندہ ہونا ہے اور اپنے اعمال کے ساتھ اللہ کے پاس حاضر ہونا ہے۔ اس سورہ میں انسان کو غور و فکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے کہ اس کے سامنے ہر روز قیامت برپا ہوتی ہے۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ اس دنیا میں کسی چیز کو دوام حاصل نہیں ہے اگر انسان زمین کی پیداوار پر غور کرے تو وہ دیکھ لے کہ زمین میں فصل اُگتی ہے اور پک کر ختم ہوجاتی ہے اور پھر نئی فصل نئی زندگی کے ساتھ اُگ آتی ہے۔ انسان و حیوان اور دوسری قسم کے جاندار پیدا ہوجاتے ہیں اور پھر مرجاتے ہیں اور ان کے بدلے میں انسان و حیوان اور دوسری قسم کے جاندار پیدا ہوتے رہتے ہیں اور ایک خاص مدت کے بعد مرجاتے ہیں یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا آخر میں یہ پوری کائنات وقت مقررہ پر اللہ کے حکم کے مطابق درہم برہم ہوجائے گی اور ایک نیا نظام قائم ہوجائے گا جس میں ایک چٹیل ہموار میدان وجود میں آئے گا جسے میدان حشر یعنی قیامت کا میدان فرمایا گیا ہے جہاں اول سے آخر تک دنیا میں پیدا ہونے والے تمام انسانوں کو جمع کیا جائے گا اور ان سے ان کے اعمال کا جواب لیا جائے گا۔

سورہ کا تمہیدی کلام مفہوم کے اعتبار سے غامض ہے جو مشکل سے سمجھ میں آتا ہے۔ جس کا معنی واضح نہیں ہے جس سے غور وفکر تجسُس اور خوف کی ملی جلی کیفیات پیدا ہوتی ہیں اس وجہ سے ان ابتدائی آیات کی کیفیات کو مختلف انداز سے تفسیر کی گئی ہے۔ کسی نے کہا کہ یہ آیات تیز ہواؤں کے متعلق ہیں اور کسی نے کہا کہ ان کا تعلق ستاروں اور سیاروں کے گردش سے ہے اور کسی نے کہا کہ ان آیات سے مراد جان نکالنے والے فرشتے ہیں جو ایمان والوں کی جان آرام سے نکالتے ہیں اور کافروں کی جان بڑی سختی سے نکالتے ہیں۔ بہرحال آیات کے لہجہ میں ایک کپکپاہٹ اور تھرتھراہٹ نمایاں ہے لیکن آیات کے معنی کی کھوج میں پڑنا ضروری نہیں کیونکہ ان آیات کے لہجہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن ایک ہنگامہ ہوگا جس سے ہر کوئی شخص خوفزدہ ہوگا اور اس لہجہ سے انسان کو اپنی موت کا نظارہ یاد آتا ہے کہ موت کے وقت اس کا حال کیا ہوگا اس لیے وہ موت سے پہلے موت کا سامان کرنے کی تیاری میں لگ جاتا ہے اور یہ خیال رکھتا ہے کہ نیک اعمال کرنے والوں کی موت آسان ہوتی ہے جبکہ برے اعمال کرنے والوں کی موت سخت اور بری ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے سامنے حضرت عمرؓ کا اسوہ ہے۔ انہوں نے لوگوں سے فرمایا ''کتاب الٰہی کا جس قدر مفہوم تمہاری سمجھ میں آجائے اس کا اتباع کرو اور جو کچھ سمجھ میں نہ آئے اسے چھوڑ دو حضرت عمرؓ کے ان الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ بندے کو خدائے بزرگ و برتر کے عظیم کلام کے سلسلے میں کس طرح مُئودَّب اور مُہذَب ہوکر رہنا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض اوقات خدا تعالیٰ کے کچھ کلمات کا غیر واضح ہونا مقصود بالذّات ہوتا ہے۔ یعنی ان کلمات کے معنیٰ کا تعلق خود اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے پاس محفوظ (reserve) ہوتا ہے جس کا جاننا حروف مقطعات کی طرح غیر ضروری ہے۔ اس لیے ایسے کلمات اور ایسی آیات کے معنی میں الجھنا ٹھیک نہیں ہے۔

وَالنَّازِعَاتِ غَرۡقاً(۱)

قسم ہے ان کی جو ڈوب کر کھینچتے ہیں

وَالنَّاشِطَاتِ نَشۡطاً(۲)

اور آہستگی سے نکال لے جاتے ہیں

وَالسَّابِحَاتِ سَبْحًا(۳)

جو تیزی سے تیرتے پھرتے ہیں

فَالسَّابِقَاتِ سَبْقًا(۴)

پھر سبقت کرتے ہیں

فَالْمُدَبِّرَاتِ أَمْرًا(۵)

پھر معاملات کا انتظام چلاتے ہیں

سورہ کی ابتدائی آیات میں پانچ مخلوقات کی قسم کھائی گئی ہے معلوم نہیں ہے کہ یہ پانچ مخلوقات کون ہیں۔ بعض علمائے نے ان چیزوں کو جن کی قسم کھائی گئی ہے ہوائیں قرار دے دیا ہے۔ خاص طور پر وہ ہوائیں جو قوموں کو عذاب دینے کے لیے بھیجی جاتی ہیں لیکن اکثر علمائِ تفسیر نے ان کو فرشتے قرار دے دیا ہے اگرچہ اس کی کوئی قطعی دلیل پیش نہیں کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ کسی صحیح حدیث میں ایسا کوئی معنی اور تفسیر منقول نہیں ہے۔ چونکہ چند اکابر صحابہ اور تابعین نے ان سے فرشتے مراد لیے ہیں۔ اس لیے یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ صحابہ نے یہ معنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہوگا۔ اس معنی اور تفسیر کے راوی یہ اکابر صحابہ ہیں۔ (۱) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ (۲) حضرت عبداللہ بن عباسؓ (۳) حضرت سعید بن جُبَیر (۴) ابو صالحؒ (۵) حضرت علیؓ۔ ان اکابر صحابہ نے ان سے فرشتے مراد لیے ہیں جن کی قسم کھائی گئی ہے اور حسن بصری نے اس کی تائید کی ہے۔ اس لیے ان اکابر صحابہ کی تفسیر کو اگرچہ حتمی نہ کہا جائے تب بھی ان صحابہ رضوان اللہ علیہم کی رائے کو ترجیح دی جا سکتی ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وقوع قیامت اور حیات بعدا لموت پر فرشتوں کی کیوں قسم کھائی گئی ہے جب کہ یہ فرشتے قیامت کی طرح غیر محسوس ہیں اور جب منکرین قیامت جیسی غیر محسوس حقیقت کو نہیں مانتے تھے تو وہ فرشتوں کی غیر محسوس حیات کو کیوں کر تسلیم کرتے۔ تفہیم القران کی روشنی میں اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ اہل عرب فرشتوں کے منکر نہ تھے وہ مانتے تھے کہ موت کے وقت انسان کی جان فرشتے ہی نکالتے ہیں اور یہ کہ فرشتوں کی حرکت بہت تیز ہے جو زمین سے آسمان تک آناً فاناً (within no time) کسی بھی جگہ پہنچ جاتے ہیں اور یہ بھی مانتے تھے کہ فرشتے حکم الٰہی کے تابع ہو کر کائنات کا انتظام چلاتے ہیں لیکن جہالت کی بنا پر اگرچہ وہ ان کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے اور ان کو معبود بھی بناتے تھے لیکن ان کا یہ عقیدہ ضرور تھا کہ اصل اختیارات ان کے ہاتھ میں نہیں ہیں۔ اس لیے یہاں وقوع قیامت اور بعث بعد الموت پر ان کے اوصاف کی دلیل پیش کی گئی یعنی جس خدا کے حکم سے فرشتے انسان کی جان نکالتے ہیں اسی کے حکم پر وہ دوبارہ جان ڈال بھی سکتے ہیں اور جس خدا کے حکم سے وہ کائنات کا انتظام چلا رہے ہیں اسی کے حکم سے وقت مقررہ پر اس کائنات کو درہم برہم کر سکتے ہیں اور اسی کے حکم سے دوسری دنیا بھی بنا سکتے ہیں اور اس کے حکم کی تعمیل میں ذرہ برابر تاخیر نہیں کر سکتے ہیں۔ الغرض ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ موت کے وقت فرشتے کافروں کی جان سختی سے نکالتے ہیں اور نہایت آرام کے ساتھ مومن کی روح قبض کرتے ہیں اور اس نیک روح کو عزت و احترام کے

ساتھ اچھے ٹھکانے پر پہنچادیتے ہیں۔ اور بری روح کو برے ٹھکانے لگادیتے ہیں۔ حضرت براء بن عازب سے روایت منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب ایک مومن جان کنی کی حالت میں ہوتا ہے تو خوب رو اور خوبصورت ملائیکہ بہشتی کفن لے کر آتے ہیں اور اس کے پاس بیٹھ جاتے ہیں اور ملک الموت اس کے سرہانے بیٹھ کر کہتا ہے:

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً

(سورۃ الفجر: ۲۷-۲۸)

اے اطمینان والے نفس اپنے رب کی طرف لوٹ جاؤ اس حال میں کہ تو (اپنے انجام نیک سے) خوش اور (اپنے رب کے نزدیک) پسندیدہ ہے۔

تو فوراً جان اس طرح باہر آجاتی ہے جیسے مشکیزہ سے پانی کا قطرہ اور فوراً اس پاک روح کو ملک الموت کے ساتھی ملائیکہ اپنی تحویل میں لے لیتے ہیں۔ اور کافر بندہ جب دنیا سے قطع تعلق کی حالت میں ہوتا ہے تو آسمان سے سیاہ رو ملائیکہ اس کے پاس آتے ہیں پھر ملک الموت اس کے پاس بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے اے نفس خبیث اللہ کے غضب کی طرف نکل کر چل۔ جان بدن کے اندر دوڑتی پھرتی ہے مگر ملک الموت اس کو اس طرح کھینچ کر نکال لیتا ہے جیسے خاردار تار اُون کی بوری سے اُون کھینچ کر نکالتا ہے۔ اس کے بعد ملائیکہ اس کو لمحہ بھر تاخیر کے بغیر لے لیتے ہیں اس کے جسم سے بدبو نکلتی ہے اور اس طرح سے اس انسان کی روح کو نکال لیا جاتا ہے۔ ہر انسان کی روح کو موت کے بعد عالم برزخ میں پہنچایا جاتا ہے اور وہیں سے یہ ارواح اپنے اپنے ٹھکانے کا انتظار کرتے ہیں اور کبھی کبھی ان کو اپنے اپنے ٹھکانے کی جھلک بھی دکھائی جاتی ہے۔ مومن اپنے ٹھکانے جنت کو دیکھ کر خوش ہوجاتا ہے اور مسکراتا ہے اور کافر اپنے ٹھکانے جہنم کو دیکھ کر روتا ہے اور پچھتاتا ہے لیکن رونے دھونے کے سوا اس کے پاس اب کچھ نہیں ہوتا ہے۔

يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ (٦)

جس روز ہلا مارے گا زلزلے کا جھٹکا

تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ (٧)

اور اس کے پیچھے ایک اور جھٹکا آئے گا

قُلُوبٌ يَوْمَئِذٍ وَاجِفَةٌ(۸)

کچھ دل اس روز خوف سے کانپ رہے ہوں گے

أَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ(۹)

نگاہیں ان کی سہمی ہوئی ہوں گی

وقوع قیامت کی تصویر

ان آیات میں قیامت کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ پہلے جھٹکے سے مراد نفخۃ اولیٰ یعنی پہلا صور پھونکنا جس سے زمین اور آسمانوں کے درمیان جو کچھ بھی ہے گر کر تباہ ہوجائے گا سوائے ان چیزوں کے جنہیں اللہ تعالیٰ زندہ رکھنا چاہے گا۔ دوسرے جھٹکے سے مراد نفخۃ ثانیہ یعنی دوسری بار صور پھونکنا۔ جب دوسری بار صور پھونکا جائے گا تو سب اپنی اپنی قبروں سے نکل پڑیں گے اور میدان حشر کی طرف چل دوڑیں گے۔ سورہ یٰس میں اس نفخہ صور کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَإِذَا هُم مِّنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنسِلُونَ(۵۱) قَالُوا يَا وَيْلَنَا مَن بَعَثَنَا مِن مَّرْقَدِنَا هَٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمَٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُونَ(۵۲) إِن كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً فَإِذَا هُمْ جَمِيعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُونَ(۵۳)

آج روز قیامت کے ذکر سے مشرکین، منکرین اور کافرین خوفزدہ اور فکرمند ہونے کے بجائے مذاق کرتے ہیں لیکن جب یہ لوگ قیامت کے دن میدان حشر میں کھڑے ہوں گے تو ان پر خوف طاری ہوگا۔ دل کانپ رہے ہوں گے، آنکھیں سہمی ہوئی ہوں گی کسی کو بات کرنے کا یارا نہ ہوگا لیکن جن مسلمانوں کا دنیا میں یہ لوگ مذاق اڑاتے تھے سورہ انبیا کی آیت:۱۰۳ کی شہادت کے مطابق وہ اس روز افراتفری اور خوف و دہشت کے عالم میں بھی خوفزدہ نہ ہوں گے اور ذرہ برابر پریشان نہ ہوں گے ملائیکہ ان کا استقبال کریں گے اور انہیں ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ یعنی انہیں اس طرح خوش آمدید (welcome) کریں گے جس طرح کسی پروٹوکول (protocol) کے تحت مہمانوں کو خوش آمدید کرکے وصول (recieve) کیا جاتا ہے۔ اور کہیں گے یہ تمہارا وہی دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔

لَا یَحۡزُنُہُمُ الۡفَزَعُ الۡاَکۡبَرُ وَتَتَلَقّٰہُمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ ہٰذَا یَوۡمُکُمُ الَّذِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ o (سورہ انبیاء:۱۰۳)

لیکن کچھ دل اس دن خوفزدہ ہوں گے یعنی کچھ لوگ قیامت کے روز خوف سے کانپ رہے ہوں گے ان کی نگاہیں سہمی ہوئی ہوں گے ان دلوں کا مطلب وہی لوگ ہیں جو قیامت کا انکار کرتے تھے اور یوم الحساب یعنی حساب کے دن کو مذاق بناتے تھے۔

یَقُولُونَ أَئِنَّا لَمَرۡدُودُونَ فِی الۡحَافِرَةِ(۱۰)

یہ لوگ کہتے ہیں کیا ہم پہلی حالت میں بے شک لوٹائے جائیں گے؟!

أَئِذَا کُنَّا عِظَاماً نَّخِرَةً(۱۱)

جب ہم کھوکھلی اور بوسیدہ ہڈیاں ہو چکے ہوں گے؟

قَالُوا تِلْکَ إِذاً کَرَّۃٌ خَاسِرَۃٌ(۱۲)

کہتے ہیں پھر تو یہ لوٹایا جانا گھاٹے کا موجب ہوگا !

کافروں کے استہزا کی تصویر

ان آیات میں کافروں کے استہزا اور مذاق کی تصویر کھینچی گئی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کافروں کو قیامت کے روز ان کی جواب دہی سے آگاہ کرتے تھے کہ تمہیں ایک دن ضرور زندہ کیا جائے گا اور میدان حشر میں حاضر کیا جائے گا اور تم سے حساب لیا جائے گا تو یہ لوگ از راہ مذاق ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ بھائیو ایک نئی بات سنئے کہتے ہیں کہ ایک دن ہمیں دوبارہ زندہ کیا جائے گا جب کہ ہماری ہڈیاں خاک میں مل چکی ہوں گی اس طرح خوب ہنستے تھے اور مسخری کرتے تھے۔ یہ مسخرے بظاہر سنجیدہ شکل بنا کر سنجیدہ مزاج (serious mood) میں کہتے کہ اگر ایسی باتوں کا ہونا ممکن ہے تو پھر ہم مارے گئے خسارے کی بات ہوگی تو ہم کیا کریں گے اس مسخرے پن کا مطلب و مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ قیامت کے بارے میں ان باتوں کو خارج از عقل قرار دے کر لوگوں سے انکار کروایا جائے اور لوگوں سے کہنا مطلوب تھا کہ بھائیو غلط فہمی میں نہ پڑ جانا جس قیامت سے ہمیں ڈرایا جارہا ہے اس کا برپا ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ جب سب مخلوقات کی ہڈیاں بوسیدہ ہوکر خاک میں مل چکی ہوں گی تو ان کو از سر نو کیسے زندہ کیا جائے گا۔ تمسخری کا ایک واقعہ ہے کہ ایک روز ایک شخص بوسیدہ ہڈیاں لے کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا محمدؐ کیا بوسیدہ ہڈیاں دوبارہ انسان کی صورت میں زندہ ہوں گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں تو اس شخص نے ان بوسیدہ ہڈیوں کو چورہ بنا کر ہوا میں پھینک دیا اور مذاق میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا لیجیے ان کو زندہ کیجیے۔ ان مذاقوں کے جواب میں فرمایا گیا ہے:

فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَاحِدَةٌ(۱۳)

یہ تو بس ایک زور دار ڈانٹ ہوگی

فَإِذَا هُم بِالسَّاهِرَةِ(۱۴)

یکدم یہ سب میدان حشر میں موجود ہوں گے

مذاق کا مختصر جواب

ان آیات میں کافروں کے ان مذاقوں کا جواب دیا گیا ہے جو مذاق یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کرتے تھے۔ ان سے کہا گیا ہے کہ یہ لوگ جتنا چاہیں مذاق کرلیں مسخرہ پن اختیار کرلیں سخن سازیاں کرلیں لیکن یہ وہ حقیقت ہے جسے گیدڑ پھبتیوں اور مذاق و مسخرہ پن سے روکا نہیں جاسکتا ہے۔ قیامت ایک بڑی ناقابل انکار حقیقت ہے جسے بہرحال برپا ہونا ہے۔ خالق کائنات جو بے پناہ قدرتوں کا مالک ہے جب چاہے قیامت کو وقوع میں لائے اس کے لیے نہ کسی سے مشورہ کرنا ہے اور نہ کسی سے مدد لینے کی ضرورت ہے وہ مدبر بلا وزیر ہے یعنی اسے تدبیر کرنے کے لیے وزیروں اور مشیروں کی ضرورت نہیں ہے اس کسے لیے صرف ایک ڈانٹ یا ایک چنگاڑ کافی ہے۔ کن فیکون کے حکم سے خالق کائینات نے اس کائینات کو وجود میں لایا اور اسی کن فیکون کے حکم سے وہ اس کائینات اور اس میں موجود تمام مخلوقات کو نیست و نابود کردے گا اور اسی حکم کے اشارے سے لوگوں کو دوبارہ زندہ کرکے میدان حشر میں جمع کردے گا۔ کوئی خاک میں ملا ہو یا راکھ بن چکا ہو کوئی سمندر میں ڈوب کر پانی کے ساتھ مل گیا ہو یا کسی کو درندے نے کھا کر اپنے پیٹ میں ختم کرلیا ہو یہ سب ہر طرف سے دوڑ کر میدان حشر میں جمع ہوجائیں گے اور اس حقیقت کو مذاقوں اور تمسخروں سے ٹالا نہیں جاسکتا ہے۔

هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ مُوسَى(١٥)

کیا تمہیں موسٰی (کے واقعہ) کی خبر نہیں پہنچی ہے؟

إِذْ نَادَاهُ رَبُّهُ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى(١٦)

جب اس کے رب نے اسے طویٰ کی وادیٔ مقدس میں پکارا

اِذْهَبْ إِلَى فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَى(١٧)

کہ جاؤ فرعون کے پاس بے شک وہ سرکش ہوگیا ہے

فَقُلۡ هَل لَّکَ إِلَى أَن تَزَكَّى(١٨)

اور کہو کہ کیا تجھے اس بات کی رغبت ہے کہ خود کو پاک کرے

وَأَهۡدِيَکَ إِلَى رَبِّکَ فَتَخۡشَى(١٩)

اور میں تیرے رب کی طرف تیری رہنمائی کروں تاکہ تیرے اندر اس کا خوف پیدا ہو

حضرت موسٰی کی ہمدردانہ دعوت اور فرعون کی سرکشی

آیات ۱۸ تا ۲۶ میں فرعون کو حضرت موسیٰ کی دعوت اور بدلے میں اس کی سرکشی بیان کی گئی ہے۔ کافروں کو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا واقعہ سنایا جاتا ہے اور انہیں فرعون کا پانی میں ڈوبنے کا انجام یاد دلایا جاتا ہے۔ فرمایا جارہا ہے کہ لوگ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کرتے ہیں حالانکہ حضرت موسٰی بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح فرعون کی طرف رسول بن کر آئے تھے لیکن جب اس نے حضرت موسٰی علیہ السلام کی رسالت کا انکار کیا اور سرکش بن گیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے سمندر کی موجوں اور لہروں کے حوالے کردیا اور اسے ہر دور کے آنے والے لوگوں کے لیے عبرت کا نشانہ بنادیا حضرت موسٰی کو مقدس وادیٔ طویٰ میں اللہ تعالیٰ نے بلایا اور منصب نبوت پر مقرر کرکے حکم دیا کہ فرعون کے پاس جاؤ کیونکہ وہ سرکش ہوگیا ہے۔

فرعون کی سرکشی کے دو پہلو تھے ایک اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں تھا یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اپنے آپ کو رب اعلیٰ قرار دیتا تھا اور اپنی حکومت اور معاملات میں اپنے آپ کو سب سے برتر اور اعلیٰ سمجھتا تھا۔ اس کی بات قانون مانی جاتی تھی اور اس کی ذات سب سے اعلیٰ اور برتر سمجھی جاتی تھی اس کی مرضی اور اس کی خواہش ہر ایک کے لیے واجب الاتباع تھی اور اس کے احکام غیر مشروط طور پر واجبِ اطاعت تھے او رلوگوں کے سامنے وہ اپنے آپ کو رب بنا کرپیش کرتا تھا۔

فرعون کی سرکشی کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ اس نے اپنی مملکت میں لوگوں کو مختلف گروہوں اور طبقوں میں بانٹ دیا تھا ایک طبقے کو اس نے غیر معمولی مراعات دے دیئے تھے اور انہیں خاص قسم کے حقوق بھی دیئے گئے تھے۔ دوسرا طبقہ عام لوگوں اور غریبوں پر مشتمل تھا ان غریبوں پر اکثر ظلم کی تلوار لٹکتی رہتی تھی خصوصاً بنی اسرائیل کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ان پر مظالم ڈھائے جاتے تھے۔ اس طرح اس کی مملکت میں حقوق کی نابرابری اور ناانصافی تھی۔ عدل و انصاف کے ترازو کا ایک پلڑا اوپر اور دوسرا نیچے تھا۔

ان آیات پر غور کرنے سے ایک اور بات بھی سامنے آتی ہے کہ یہ جو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ حضرت موسٰی کو فرعون کے پاس صرف اس لیے بھیجا گیا تھا کہ وہ بنی اسرائیل کو وہاں سے نکال دے اور انہیں فرعون کے ظلم سے نجات دلائے اور اس کے چُنگل سے آزاد کرائے بالکل غیر معتبر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت موسٰی علیہ السلام کو صرف بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے نہیں بھیجا گیا تھا بلکہ انہیں فرعون کے پاس بھیجنے میں فرعون اور اہل مصر کو ہدایت دینا بھی مقصود تھا۔ ان آیات میں حضرت موسٰی علیہ السلام کو فرعون سے بات کرنے کا طریقہ بھی بتایا گیا تھا کہ فرعون کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی سے بات کی جائے اور موسٰی علیہ السلام سے فرمایا گیا کہ فرعون کو بولنا کیا تو اس کے لیے تیار ہے کہ پاکیزگی اختیار کرے اور میں تیرے رب کی طرف تیری رہنمائی کروں تو اس کا خوف تیرے اندر پیدا ہو۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک داعی اور مبلغ کو بگڑے ہوئے لوگوں کی ہدایت کے لیے حکمت کے ساتھ تبلیغ کرنی چاہیے۔ پہلے سننے والے کے دل میں اللہ کی معرفت اور اللہ کا خوف ڈالدیا جائے۔ کیونکہ جب تک انسان کے دل میں معرفت الٰہی اور خوف خدا موجود نہ ہو تب تک اس کی زندگی میں کوئی بدلاؤ اور انقلاب نہیں آسکتا ہے اور نہ وہ تبلیغ کو قبول کرسکتا ہے۔ خدا کی معرفت اور اس کے خوف کے بغیر انسان کی اصلاح ناممکن ہے۔

۱۵: کیا تمہیں موسٰی کے واقعہ کی خبر پہنچی۔ ۱٦: جب اس کے رب نے اسے طویٰ کی مقدس وادی میں پکارا۔ ۱۷: کہ جاؤ فرعون کے پاس وہ سرکش ہوگیا ہے

ان آیات میں موسٰی علیہ السلام اور فرعون کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس واقعہ سے ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دلانا مقصود ہے تو دوسری طرف قیامت کا مسئلہ سمجھانا ہے۔ چونکہ فرعون نے بھی حضرت موسٰی علیہ السلام کو پیغمبر ماننے سے انکار کیا اللہ تعالیٰ نے اس کے برے انجام سے آگاہ فرمادیا اور کافروں کو تنبیہہ کی کہ تم لوگ بھی اگر فرعون کی طرح انکار کرتے رہو گے تو تمہارا حشر بھی وہی ہوگا جو فرعون اور اس کے ساتھیوں کا ہوا اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لاؤ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول مان لو۔

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو طویٰ کی مقدس وادی میں پکارا۔ یہ اشارہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیغمبری کی طرف ہے۔ مشرکین مکہ خیال کرتے تھے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ہمارے ساتھ زندگی گزارتے ہیں ہمارے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں ایک یتیم بچے کی حیثیت سے ہماری نظروں میں جوانی کی عمر کو پہنچ گئے تو آج اچانک وہ کس طرح پیغمبر بن گئے۔ اس لیے فرمایا گیا کہ کیا آپ کے پاس موسیٰ کی بات نہیں پہنچی جب اس کے رب نے اسے طویٰ کی وادی میں پکارا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ وہ نبوت سے سرفراز فرمائے جارہے ہیں۔ آپ مصر سے اس وجہ سے بھاگ گئے تھے کہ دو آدمی آپس میں جھگڑ رہے تھے تو موسیٰ علیہ السلام نے مظلوم کو ظلم سے بچانے کے لیے ظالم کو ایک مکا مارا جس سے وہ ہلاک ہوگیا فرعون اور اس کی قوم کو موسیٰ علیہ السلام کی اس کاروائی پر بہت غصہ آیا اور انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کا اعلان کردیا۔ اس لیے وہ فرعون کے خوف سے مصر سے نکل کر مَدین چلے آئے۔ وہاں پھر حضرت شعیب کے گھر میں دس سال تک قیام کرنے کے بعد وہاں سے ہجرت کی حضرت شعیب سے اجازت لے کر اپنی بیوی کے ہمراہ آپ وہاں سے نکل گئے اور طویٰ کی وادی میں پہنچ گئے۔ سفر کے دوران انہیں آگ کی ضرورت پڑی۔ انہیں دور آگ دکھائی دی۔ انہوں نے گھر والوں سے کہا کہ میں آگ کا انگارہ لاؤں تاکہ تم لوگ آگ سینکو۔ جب وہ آگ لانے کے لیے گئے تو آواز آئی ۔ اِنِّیۡۤ اَنَا اللّٰہُ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ(قصص:۳۰)۔ میں اللہ ہوں، سب جہانوں کا رب۔ الغرض حضرت موسیٰ علیہ السلام وادی طویٰ میں آگ حاصل کرنے کے لیے جب آگے بڑھے تو رحمت خداوندی جوش میں آئی اور اسے نبوت عطا کی یعنی گئے تھے وہ آگ لانے لیکن وہاں پہنچ کر آگ کے بدلے میں نبوت ملی حالانکہ اس نبوت کو حاصل کرنے کی وہ کوئی تیاری نہیں کررہے تھے۔

مشرکین مکہ کہتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرح ایک عام آدمی ہے ہمارے ساتھ زندگی گزارتا ہے تو وہ پیغمبر کیسے بنا۔ اس سلسلے میں حضرت موسیٰ کا واقعہ پیش کیا گیا کہ حضرت موسیٰ بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح عام لوگوں میں زندگی گزارتے تھے۔ اپنا کام کرتے تھے۔ بکریاں چَراتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی مرضی تھی کہ انہیں اپنا رسول چن لیا۔ اسی طرح اللہ نے چاہا تو بھیڑ بکریاں چرانے والے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا رسول چن لیا جو تم لوگوں کو اللہ کی بندگی کی طرف بلا رہے ہیں اور تم کو بتوں کی پوجا کرنے سے بعض رہنے کی تلقین کرتے ہیں اور صرف ایک خدا کی بندگی کرنے کی تاکید کرتے ہیں۔

۱۸: اور کہو کیا تجھے اس بات کی رغبت ہے کہ خود کو پاک کرے:

۱۹: اور میں تیرے رب کی طرف تیری رہنمائی کروں تاکہ تیرے اندر اس کی خوف پیدا ہو۔

موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس جاؤ اور اسے کہو کیا تم میں پاک ہونے کی رغبت ہے۔ تزکیہ سے مراد اندرونی اور بیرونی پاکیزگی ہے۔ فرعون کو اس بات کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ اگر حق قبول کرنے کا کوئی مادہ تم میں موجود ہے تو آؤ میں تمہیں تمہارے رب کی طرف راہ بتلاؤں گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تیرے اندر اللہ کا خوف پیدا ہو۔

تزکیہ: تزکیہ پیغمبروں کے فرائض منصبی میں سے ہے جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل کی دعا سے ثابت ہے کہ جب انہوں نے اللہ سے دعا کی کہ اے اللہ ہماری اولاد میں سے ایک رسول بھیج دے جو ان پر تیری آیتیں پڑھے اور انہیں حکمت سکھائے اور انہیں پاک کرے۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولاً مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ (سورہ بقرہ: ۱۲۹)

اے ہمارے رب ان ہی میں سے ایک رسول بھیج جو ان پر تیری آیتیں پڑھے اور انہیں کتاب و حکمت سکھائے اور انہیں پاک کرے۔

اس لیے موسیٰ علیہ السلام کو ارشاد ہوا کہ فرعون کا تزکیہ کرو اسے کہو اگر تم پاک ہونا چاہتے ہو یعنی تم اگر تکبر کرنا چھوڑدو گے اور خدائی کا دعویٰ کرنے سے بعض آؤ گے اور خدا کی بندگی میں شامل ہوجاؤ گے تو تمہارا تزکیہ ہوجائے گا یعنی تم پاک ہوجاؤ گے۔ تزکیہ کا پہلا حکم یہ ہے کہ انسان کفر و شرک اور نفاق جیسی بری صفات سے پاک ہوجائے۔ اگر یہ چیزیں کسی شخص میں موجود ہوں تو وہ پاک نہیں ہے۔ سورہ اعلیٰ میں فرمایا گیا ہے: قَدۡ أَفۡلَحَ مَن تَزَكَّى (سورہ اعلیٰ:۱۴) بے شک وہ کامیاب ہوا جس نے تزکیہ کیا یعنی جس نے اپنے آپ کو پاک کرلیا جو شرک کفر و نفاق اور دیگر گندے عقیدوں سے پاک ہوگیا۔ اگر کسی انسان میں ان ناپاک چیزوں میں سے کوئی چیز موجود ہو تو نہ اس کی نماز قبول ہوتی ہے اور نہ کوئی اور عبادت لہٰذا جسمانی پاکیزگی کے ساتھ ساتھ شرک و نفاق کی گندگی سے بچنا ضروری ہے لیکن اس بات پر افسوس ہے کہ شرک و بدعات میں ڈوبے ہوئے لوگ تزکیہ کی حقیقت کو نہیں سمجھتے ہیں۔ مسجدوں کے محرابوں میں یاغوث المدد جیسے مشرکانہ الفاظ لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ ذرا غور کریں کہ جب مسجد میں جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے بنائی جاتی ہیں ایسے شرکیہ کلمات لکھے ہوئے ہوں تو وہاں توحید کا کیا حال ہوگا۔ قبروں کی حالت جب دیکھ لیتے ہیں تو ان پر آستانے اور زیارت گاہیں بناکر غیراللہ کی نذر و نیاز ہورہی ہیں۔ لوگ آستانہ پرستش اورپیر پرستی کی لعنت میں گرفتار ہیں حالانکہ قبروں پر آستانے اور زیارت گاہیں بنانے کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔ اورپیروں فقیروں سے مرادیں مانگنا بھی کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے۔ حالانکہ پیر فقیر اور خدا کے محبوب ہدایت دینے اور دین سمجھانے کے لیے ہوتے ہیں۔ ان سے مرادیں مانگنا شرک عظیم اور گناہ کبیر ہے۔ الغرض یہ سب چیزیں گندگی ہیں اور اس گندگی سے مسلمانوں کو دور رہنے کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

يَوۡمَ لَا يَنفَعُ مَالٞ وَلَا بَنُونَ إِلَّا مَنۡ أَتَى ٱللَّهَ بِقَلۡبٖ سَلِيمٖ

قیامت کے دن کسی کا مال و اولاد کام نہیں آئیں گے البتہ فائدہ اس کو ہوگا جو قلب سلیم لے کر اللہ کی بارگاہ میں پہنچا۔ قلب سلیم رکھنے والا وہ شخص ہے جو کفر و شرک اور بدعات سے پاک ہے جس کا دل ہر قسم کی برائیوں سے پاک ہے۔

اور میں تیرے رب کی طرف تیری رہنمائی کروں

تاکہ تیرے اندر اس کا خوف پیدا ہو

تزکیہ کرنے کی خبر دینے کے بعد حضرت موسٰی علیہ السلام فرعون سے خدا کی طرف رہنمائی کرنے اور اس کے دل میں خدا کا خوف پیدا کرنے کی بات کر رہے ہیں اور اس سے کہتے ہیں کہ میں تجھے تیرے رب کی طرف رہنمائی کروں تاکہ تیرے اندر خدا کا خوف پید ہو۔ میری بات مان لو اور میری اتباع کرو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اپنے باپ سے یہی بات کہی تھی کہ تو گمراہی پر ہے میری بات مان لو میں تجھے ہدایت کا راستہ بتاؤں گا۔ آپ نے اپنے باپ سے بحیثیت پیغمبر کہا تھا۔ فَتَبعنی میری اتباع کرو، ہر نبی کا یہی طریقہ رہا ہے کہ انہوںنے اپنی قوم سے کہا یا قوم اتبعون اے میری قوم میرا اتباع کرو تاکہ تمہاری رہنمائی کروں اور تمہارا تزکیہ ہوجائے۔ گویا نبی کا اتباع اور اس کی اطاعت فرض ہے اس لیے اس کی اطاعت اور اس کے اتباع کے بغیر انسان کی کامیابی ناممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ارشاد فرمایا: اِنَّکَ لَتَھدَیٰ صِراطَ مُستَقِیم آپ صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں۔ حضرت موسٰی نے بھی فرعون کو اس طرح کی دعوت دی اور اس سے کہا کہ اگر تو میری دعوت قبول کروگے تو میں خدا کی اطاعت اور اس کی بندگی کرنے کے لیے تمہاری رہنمائی کروں تاکہ تمہارے دل میں خدا کا خوف پیدا ہوجائے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے انسان کا سب سے اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کا اظہار کرے اور کسی قسم کا تکبر نہ کرے اور جو لوگ ایسا نہیں کرتے ہیں وہ ہدایت نہیں پاسکتے ہیں۔ فرعون نے تکبر کیا اور خدا کا خوف نہ کیا اور حضرت موسیٰ سے برہم ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اسے پوری قوم سمیت غرق آب کرکے ہلاک کردیا اور اس طرح وہ برباد ہوگیا۔ حضرت موسٰی علیہ السلام اور فرعون کے واقعہ سے دراصل مشرکین اور منکرین کو احساس دلایا جاتا ہے کہ اگر وہ خدا کا خوف نہ کریں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت نہ کریں بلکہ فرعون کی طرح تکبر میں آپؐ کی نبوت کا انکار کریں تو ان کا حشر بھی وہی ہوگا جو فرعون اور اس کے ساتھیوں کا ہوا۔

فَأَرَاهُ الْآيَةَ الْكُبْرَى(۲۰)

پھر موسیٰ نے فرعون کو بڑی نشانی دکھائی

فَكَذَّبَ وَعَصَى(۲۱)

اس نے جھٹلایا اور نافرمانی کی

ثُمَّ أَدْبَرَ يَسْعَى(۲۲)

پھر چالبازیوں کے لیے پلٹا

فَحَشَرَ فَنَادَى(۲۳)

پس اس نے لوگوں کو جمع کرکے پکارا

فَقَالَ أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَى(۲۴)

اور کہا میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں

حضرت موسیٰ کا عظیم معجزہ

۲۰: پھر موسیٰ نے فرعون کو بڑی نشانی دکھائی

اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق حضرت موسیٰ فرعون کے دربار میں پہنچے اور اسے کائنات کے حقیقی رب کی طرف دعوت دی اور خدا کی طرف سے بھیجا ہوا رسول ہونے کا دعویٰ کیا۔ اس پر فرعون نے رسول ہونے کی سند طلب کی تو موسیٰ علیہ السلام نے ایک بڑی نشانی عصایِ موسیٰ معجزے کے طور پر دکھائی جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بڑی نشانی قرار دیا ہے۔ اسے بڑی نشانی اس لیے قرار دیا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام کے اکثر معجزے اسی عصایِ موسیٰ کے ذریعے ظاہر ہوئے اور یہ وہ معجزہ تھا جس کی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام کی نبوت ہر موقع پر سربلند رہی اور فرعون کے جادو سحر اور طلسمات پر غالب آگئی۔

فرعون کا رویہ

۲۱:فرعون نے جھٹلایا اور نافرمانی کی۔ ۲۲: پھر چالبازیوں کے لیے پلٹا۔۲۳: اس نے لوگوں کو جمع کیا۔

اتنے بڑے معجزے کو دیکھنے کے بعد بھی فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رسول ماننے سے انکار کردیا اور انہیں ساحر اور جادوگر قرار دیا پھر انکار نبوت کے بعد بھی خاموش نہ رہا۔ اس نے محسوس کیا کہ موسیٰ علیہ السّلام کی دعوت اپنے اندر بے پناہ اثر رکھتی ہے اور جس معجزے کا انہوں نے اظہار کیا اگر اس کا مقابلہ نہ کیا گیا اور اسے نہ روکا گیا تو ان معجزوں سے متاثر ہوکر لوگ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائیں گے۔ چنانچہ اس نے فوراً اپنے مشیروں کو بلایا اور مشورہ طلب کیا۔ مشیروں نے مشورہ دیا کہ موسٰی علیہ السلام ایک بہت بڑا جادو گر ہے لہٰذا تمام جادوں گروں سے اس کا مقابلہ کرایا جائے۔ اس طرح تمام جادوگروں کو دعوت دی گئی اور ایک کھلے میدان میں مقابلہ کیا گیا اور یہ مقابلہ عام لوگوں کے مجمع میں ہوا۔ جادوگروں اور ساحران مصر کو نہ صرف شکست ہوئی بلکہ انہوں نے ایمان لاکر فرعون کی شکست کو تسلیم کرلیا اور موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کو ثابت کردیا اور اس کا اعتراف کیا اور کہا یہ جادو نہیں معجزہ ہے۔ جادوگری کے مناظرے اور مقابلے میں جب موسٰی علیہ السلام کے معجزے کے سامنے فرعون کا سارا طلسم ٹوٹ گیا تو اس نے لوگوں کو جمع کیا تاکہ حضرت موسٰی علیہ السلام کے

معجزے کا جو اثر لوگوں پر پڑا اسے ختم کیا جائے اور مجمع عام میں اپنا اثر بحال کرنے کے لیے تقریر کی جس کا ذکر سورہ زخرف میں ہے۔

وَنَادَىٰ فِرْعَوْنُ فِي قَوْمِهِ قَالَ يَا قَوْمِ أَلَيْسَ لِي مُلْكُ مِصْرَ وَهَٰذِهِ الْأَنْهَارُ تَجْرِي مِن تَحْتِي أَفَلَا تُبْصِرُونَ o أَمْ أَنَا خَيْرٌ مِّنْ هَٰذَا الَّذِي هُوَ مَهِينٌ وَلَا يَكَادُ يُبِينُ o (سورہ زخرف: ۵۱-۵۲)

فرعون نے اپنی قوم میں اعلان کیا۔ اے لوگو کیا مصر پر میری حکومت نہیں ہے کیا میرے محل کے نیچے یہ نہریں نہیں بہہ رہی ہیں۔ کیا تم نہیں دیکھتے۔ خود فیصلہ کرو، میں بہتر ہوں یا یہ شخص جو حقیر ہے اور جو کھول کر بیان نہیں کر سکتا۔

اس نے مزید کہا کہ آخر اس پر سونے کے کنگن کیوں نہیں اتارے گئے یا اس کے ساتھ پر باندھے ہوئے فرشتے کیوں نہیں آئے اس طرح اس نے اپنی قوم کو بے وقوف بنایا اور وہ اس کے کہنے میں آگئے یقینا وہ لوگ فاسق ہی تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ پھر جب انہوں نے ہمیں غضبناک کردیا تو ہم نے انہیں سزا دی اور ان سب کو غرق کردیا۔ اور اس واقعہ کو بعد والوں کے لیے عبرت کا نمونہ بنا کر چھوڑدیا۔

فرعون کے رب اعلیٰ ہونے کا مفہوم

فرعون کا رب ہونے کا دعویٰ قرآن مجید میں کئی مقامات پر بیان ہوا ہے۔ ایک مقام پر اس نے حضرت موسٰی سے کہا کہ ''اگر تم نے میرے سوا کسی اور کو خدا بنایا تو میں تمہیں قید کردوں گا۔'' (سورہ شعراء آیت:۲۹)

ایک اور موقع پر اس نے دربار میں لوگوں سے کہا ''اے سرداران قوم' میں نہیں جانتا کہ میرے سوا تمہارا اور کوئی رب بھی ہے۔ حالانکہ ان باتوں سے فرعون کا مطلب یہ نہ تھا کہ وہ کائنات کا خالق ہے اور اسی نے یہ دُنیا پیدا کی ہے اور یہ بھی مطلب نہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا منکر ہے اور خود رب العالمین ہے اور نہ وہ اپنے آپ کو مذہبی طور پر معبود قرار دیتا تھا۔ قرآن مجید میں اس بات کی شہادت موجود ہے کہ وہ خود دوسرے معبودوں کی پرستش کرتا تھا ایک موقع پر اہل دربار اس سے کہتے ہیں۔ کیا آپ موسٰی اور اس کی قوم کو آزادی دینے چلے جائیں کہ وہ ملک میں فساد پھیلائیں اور آپ کو اور آپ کے معبودوں کو چھوڑ دیں۔ (سورہ اعراف آیت:۱۲۷)

پس اس سے معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت وہ مذہبی معنوں میں نہیں بلکہ سیاسی معنوں میں اپنے آپ کو رب اور رب اعلیٰ کہتا تھا۔ یعنی اس کے رب ہونے کا مطلب یہ تھا کہ میں اقتدار اعلیٰ کا مالک ہوں میرے سوا کسی کو میرے ملک میں حکم چلانے کا حق نہیں ہے اور میرے اوپر کوئی بالاتر طاقت نہیں ہے جس کا میرے ملک میں فرمان جاری ہو۔

نمرود نے بھی اسی طرح رب ہونے کا دعویٰ کیا تھا اور کہا تھا اَنَا اُحیِیَ وَ اُمِیتُ میں زندہ رکھتا ہوں اور مارتا ہوں اپنی بات منوانے کے لیے اس نے ایک بے گناہ کو مارڈالا اور دوسرے کو زندہ رہنے دیا اور لوگوں سے کہا کہ میں بھی کسی انسان کو مارسکتا ہوں اور کسی کو زندہ رکھ سکتا ہوں۔ مگر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے طلوع آفتاب کی دلیل پیش کی اور نمرود سے کہا کہ میرا رب مشرق سے آفتاب کو نکالتا ہے اگر تم رب ہونے کا دعویٰ کرتے ہو تو اسے مغرب سے نکالو اس دلیل پر نمرود ذلیل و خوار ہوکر رہ گیا۔ خدا کے ایک نافرمان بندے منصور حلاج نے مسلمان ہونے کے باوجود اس طرح کا دعویٰ کیا اور ''اَنَا الحق'' یعنی میں حق (خدا) ہوں کا دعویٰ کیا اس نے یہ دعویٰ یہ کہہ کر کیا کہ مجھ میں خدا کی تجلی ہے اور میں خدا ہوں بعد میں اسے سزائے موت دے دی گئی۔ بہرحال فرعون نے جب رب اعلیٰ ہونے کا دعویٰ کیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے دنیا میں ہی پکڑکر رسوا کرکے عبرت ناک سزا دے دی۔ انسانوں کا رب وہی ہے جس نے انسانوں کوپیدا کیا ہے۔ جو خود مخلوق ہے وہ کسی کا رب نہیں ہوسکتا ہے۔ اس کارب اعلیٰ ہونے کا دعویٰ کرنا اس کے لیے شرمندگی ہے۔ دنیا میں آج بھی فرعون جیسے سرکش لوگ موجودہیں جو اپنی حکمرانی میں فرعون کی طرح رب اعلیٰ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور حکمرانی کے نشے میں احکام الٰہی کا انکار کرتے ہیں اور رب اعلیٰ بن کر لوگوں پر حکومت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو احکم الحاکمین رب اعلیٰ اور رب العالمین ماننے سے انکار کرتے ہیں یہ لوگ قیامت اور آخرت کا بھی انکار کرتے ہیں۔ بلاشبہ ان لوگوں کا حشر بھی فرعون کی طرح ہوگا اوریہ بھی نشان عبرت بن کررہیں گے۔ تاریخ گواہ ہے کہ فرعون جیسے متکبر لوگ دنیا میں ہی فرعون کی طرح سزا پاکر آنے والی نسل کے لیے نشان عبرت بن کر رہ جاتے ہیں۔ لیکن ایسے واقعات دیکھ کر بھی گمراہ اور متکبر لوگ ایسی بری حرکتوں سے باز نہیں آتے ہیں اورنہ ان کے دل میں خدا کا خوف پیدا ہوتا ہے بلکہ یہ لوگ ان واقعات کو قصہ اور کہانی سمجھتے ہیں۔ اس لیے ایمان وہدایت کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے گمراہی کا راستہ اختیار کرلیتے ہیں اور خدا کے نافرمان بندوں میں شامل ہوجاتے ہیں۔

فَأَخَذَهُ اللهُ نَكَالَ الْآخِرَةِ وَالْأُولَى(۲۵)

آخرکار اللہ نے اسے آخرت اور دنیا کے عذاب میں پکڑ لیا۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَن يَخْشَىٰ(٢٦)

درحقیقت اس میں بڑی عبرت ہے اس شخص کے لیے جو ڈرے

ان آیات میں فرعون کا دُنیا اور آخرت میں ملنے والے عبرت ناک عذاب کا تذکرہ ہے

فرعون نے جب معجزات دیکھ لینے کے بعد بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رسالت اور اللہ تعالیٰ کے پیغام کو ماننے سے انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے دُنیا اور آخرت کے غضبناک عذاب میں پکڑ لیا اسے سمندر میں ڈبودیا اور ڈوبتے وقت اس نے چیختے ہوئے اللہ تعالیٰ کو پکارا کہ میں نے بنی اسرائیل اور موسیٰ کے رب کو تسلیم کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر اس کے ایمان کو ٹھکرادیا کہ اب جو زندگی کے آخری لمحہ پر ایمان لاتا ہے فضول اور ناقابل قبول ہے۔ سمندر کی لہروں نے اسے اوپر نیچے کرکے تڑپا کر ہلاک کردیا۔ یہ اس کا دنیائی عذاب تھا اور آخرت کا عذاب باقی ہے جو اسے قیامت کے دن دیا جائے گا اور عالم برزخ میں اسے وہ عذاب دکھایا جاتا ہے جیسا کہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ عالم برزخ میں ہر کسی کو آخرت کا ٹھکانہ دکھایا جاتا ہے اور گنہگار جہنمی اپنا ٹھکانہ دیکھ کر لرزتا ہے اور ایمان دار جنت میں اپنا ٹھکانہ دیکھ کر مسکراتا ہے۔ فرعون کو عبرت کا نشانہ بنایا گیا ہے اور اس عبرت میں ایسا سبق موجود ہے جو تا قیامت جاری ہے۔ فرعون کی لاش کو سمندر نے آخر میں باہر پھینک دیا جسے صدیوں بعد سمندر کے کنارے سے نکالا گیا جس پر نمکین تہہ چڑھی تھی۔ اسے مصر کے لاش گھر میں رکھا گیا ہے۔ اس طرح سے اس کی لاش بھی عبرت کا نشانہ بنی ہوئی ہے۔

دراصل فرعون کی سرگزشت کافروں کو سنانی مقصود تھی کہ جس طرح فرعون اور اس کے ساتھیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا رسول ماننے سے انکار کیا اور حکومت اور دولت کے نشے میں چور ہوکر اس کے خلاف اعلان جنگ کردیا۔ اسی طرح آپ لوگ بھی طاقت اور ثروت کے نشے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہیں، انہیں تکلیف پہنچاتے ہیں اور ایذا دیتے ہیں۔ لیکن یاد رکھو جس طرح فرعون کے نشے کو چکناچور کیا گیا ویسا ہی حال آپ کا بھی ہوگا اگر آپ لوگ باز نہ آئے۔

لیکن ساتھ میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ عبرت وہی حاصل کرتا ہے جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف ہو عبرت حاصل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کا خوف ہونا ضروری ہے جب تک لوگوں میں اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا نہ ہو تب تک ان واقعات سے عبرت حاصل کرنا ناممکن ہے۔ اس لیے فرمایا گیا ہے کہ فرعون کا واقعہ ان لوگوں کے لیے عبرت کی نشانی ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔ آج کل کے زمانے میں کتنے فرعون جیسے حکمران موجود ہیں جو فرعون کا رول ادا کرتے ہیں۔ کافر حکمران اگر فرعون کی طرح حکمران ہوں تو کوئی ملال نہیں لیکن مسلمان حکمران خدا اور خدا کے رسول کو ماننے کے باوجود خدا کے قانون کو ٹھکرا کر فرعون کی طرح اپنے اقتدار کے نشے میں چور فرعون کی طرح رب بن کر حکمرانی کریں تو معاملہ بہت دلدوز اور شرمناک ہے۔

أَأَنتُمْ أَشَدُّ خَلْقاً أَمِ السَّمَاءُ بَنَاهَا(۲۷)

کیا تمہارا بنانا مشکل ہے یا آسمان کا اللہ نے اس کو بنایا ہے

رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوَّاهَا(۲۸)

اس کی چھت کو بلند کیا اور اس کا توازن قائم کیا

وَأَغْطَشَ لَيْلَهَا وَأَخْرَجَ ضُحَاهَا(۲۹)

اور اس کی رات کو تاریک بنایا اور ظاہر کیا اس کے دن کو

وَالْأَرْضَ بَعْدَ ذَلِكَ دَحَاهَا(۳۰)

اور اس کے بعد زمین کو ہموار کیا

أَخۡرَجَ مِنۡهَا مَاءَهَا وَمَرۡعَاهَا(۳۱)

اس کے اندر سے اس کا پانی اور چارہ نکالا

وَالۡجِبَالَ أَرۡسَاهَا(۳۲)

اور پہاڑوں کو زمین کا لنگر بنایا

مَتَاعاً لَّكُمۡ وَلِأَنۡعَامِكُمۡ(۳۳)

بطور سامان زیست تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے

مظاہر قدرت یعنی اللہ کی نشانیوں اور فیضان ربوبیت سے قیامت کی دلیل

ان آیات میں دو باتوں پر دلالت کی گئی ہے ایک اللہ تعالیٰ کی قدرت پر اور دوسرے اس کی عنایات اور فیضان پر۔ قدرت کا اظہار اس طرح فرمایا گیا ہے کہ آسمان کی تخلیق پر غور کریں کہ یہ نیلا آسمان جو ہمارے سروں پر چھایا ہوا ہے جس میں بے شمار ستارے اور سیارے ہیں، حیران کن نظام شمسی ہے، لاتعداد کہکشانیں ہیں اور ان سب کا ایک زبردست اور حیران کن نظام ہے۔ یہ کائینات ایک ایسی حیران کن تخلیق ہے کہ انسان کے ایجاد کردہ محیر العقول آلات کی تحقیق (research) کے باوجود کوئی صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا ہے، اس کی وسعتوں کو ناپا نہیں جا سکتا ہے۔ اس کے ستاروں اور سیاروں کو شمار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ کہکشاں (galaxies) کو پوری طرح دیکھا نہیں جا سکتا ہے صرف ایک اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کائینات کی وسعت انسانی علم کے لیے چلینج بنی ہوئی ہے۔ انسان آنکھیں

کھول کر دیکھ لے، زمین سے آسمان تک نگاہ ڈالے تو اس کے سامنے خدا کی ہستی اور وحدانیت کے بے شمار دلائل نظر آئیں گے۔

۱) زمین جس نظام شمسی میں ہے اس کی عظمت دیکھئے، سورج زمین سے تین لاکھ گنا بڑا ہے اور اس کے بعید ترین (outermost / farthest) سیارے نیپچون (Neptune)کا فاصلہ سورج سے کم سے کم 2ارب79 کروڑ 30 لاکھ میل ہے۔ پلوٹو (Ploto) 4، ارب 60 کروڑ میل سورج سے دور ہے۔ اس کے باوجود یہ نظام شمسی ایک بڑی کہکشاں کا ایک چھوٹا حصہ ہے۔ جس کہکشان میں ہمارا نظامِ شمسی شامل ہے، اس میں تقریباً 3ارب آفتاب پائے جاتے ہیں۔ اس کا قریب ترین آفتاب ہماری زمین سے اتنا دور ہے کہ اس کی روشنی زمین تک چار سال تک پہنچ جاتی ہے۔ اس کائینات میں صرف ایک کہکشان نہیں بلکہ اب تک کے مشاہدات کے مطابق معلوم ہوا ہے کہ اس کائینات میں 20لاکھ کہکشانیں موجود ہیں۔ ان میں سے جو قریب ترین کہکشاں ہے اس کی روشنی زمین تک 10لاکھ سال میں پہنچتی ہے۔

وہ دور ترین اجرام فلکی سورج، چاند، ستارے اور سیارے جو ہمارے موجودہ آلات سے نظر آتے ہیں ان کی روشنی کو زمین تک پہنچنے کے لیے 10کروڑ سال تک لگ جاتے ہیں پھر بھی نہیں کہا جاسکتا ہے کہ انسان نے ساری کائینات کا مشاہدہ کیا۔ یہ خدا کی کائینات کا تھوڑا سا حصہ ہے جو اب تک انسانی مشاہدہ میں آیا ہے۔ آگے نہیں معلوم کہ مزید مشاہداتی ٹیکنالوجی کے ذرائع (means of technoloy) فراہم ہونے پر اور کتنی وسعتیں اور حیران کن حقائق انسان پر منکشف ہوگی۔ تمام معلومات جو اس وقت تک کائینات سے فراہم ہوئی ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ پورا عالم ایک ہی مادے سے بنا ہوا ہے جس میں ہماری یہ چھوٹی سی زمین بھی شامل ہے۔ قران بھی اسکی تصدیق کرتا ہے کہ یہ کائینات ایک ہی مادے کا ٹکڑا تھا پھر ہم نے اسے جدا جدا کردیا اس کو سائنس نے Big bang theory کا نام دیا ہے۔

أَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقاً فَفَتَقْنَاهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ٥ (سورۃ الانبیاً آیت:۳۰)

کیا ان کفر کرنے والے لوگوں نے کبھی غور نہیں کیا کہ یہ آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے پھر ہم نے ان کو الگ الگ کردیا اور ہم نے ہر چیز کو پانی سے زندگی بخشی۔ کیا ان کو یقین نہیں آتا ہے۔

یہ ساری کائینات ایک ہی خدا کی تخلیق ہے اور اس کا ایک ہی فرمانروا ہے اور جو یہ لاکھوں کہکشان اور اس کے اندر گھومنے والے کھربوں ستارے اور سیارے(Trillions of stars and planets) پائے جاتے ہیں۔ اس حقیقت کو دیکھ کر کیا کوئی صاحب عقل انسان یہ تصور کرسکتا ہے کہ یہ سب کچھ آپ سے آپ ہوگیا اس نظم کے پیچھے کوئی ناظم نہیں، اس حکمت کے پیچھے کوئی حکیم نہیں، اس صنعت کے پیچھے کوئی صانع نہیں اور اس مناسبت اور منصوبہ بندی کے پیچھے کوئی منصوبہ ساز نہیں ہے۔ انکار کرنے والوں سے سوال کیا گیا ہے کہ جس ہستی نے اتنی بڑی کائینات کو وجود بخشا اور اس کا اتنا بڑا نظام بنادیا کیا اس کے لیے انسانوں کوپیدا کرنا کوئی مشکل کام ہے۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت کے مظاہر اور مناظر کی دلیل کے بعد اب اس کی قدرت کے فیضان و عنایت پر غور کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے۔ فیضان ربوبیت کے ذکر میں پہلے زمین کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ زمین چونکہ مخلوقات کے لیے سب سے پہلی ضرورت ہے۔یہ مخلوقات کا مسکن اور مدفن ہے انسان زمین سے اللہ کا عطاکیا ہوا چارہ نکالتا ہے اور اسی کےپیٹ میں جل کر یامر کر چلا جاتا ہے اور اسی کےپیٹ سے قیامت کے روز اسے نکالا جائے گا۔

زمین کے اندر سے پانی نکالا گیا اور اس پانی کے ذریعے ہر چیز کو زندگی بخشی گئی ظاہر ہے کہ تمام جانداروں اور نباتات کی زندگی کا انحصار پانی پر ہے۔ پانی کے بغیر نہ کوئی جاندار زندہ رہ سکتا ہے اور نہ کوئی پیڑ پودا اُگ سکتا ہے۔ انسان کا نطفہ بھی ایک قسم کا پانی ہے اور پانی کے اس مادے کو انسانوں کی پیدائش کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ مرد اور عورت کے ملاپ کے بعد اسی پانی کے مادے سے بچے کی تشکیل ہوتی ہے۔ اگرچہ پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔ زمین کے اکثر جاندار مخلوق چرند و پرند، کیڑے مکوڑے، پیڑ پودے اور حیوان اور انسان کو پانی کے ذریعے ہی زندگی ملتی ہے۔ ہر جاندار کے مادہ حیات میں پانی کی کثرت ہوتی ہے۔ انسانی زندگی کا دارومدار خون کے دورہ (Blood circulation) پر موقوف ہے۔ جدید تحقیق کے مطابق خون میں اسی (۸۰) فیصد پانی اور بیس (۲۰) فیصد دیگر اجزا ہوتے ہیں۔ اس لیے اس لحاظ سے بھی کہا جاسکتا ہے کہ زندگی کا انحصار پانی پر ہے۔ اگر کسی جاندر میں پانی کی کمی ہوجاتی ہے تو خون منجمد ہوجاتا ہے اور پانی کی کمی اس کی موت کا باعث بن جاتی ہے۔ اس لیے فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ غور نہیں کرتے ہیں کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے جانداروں اور نباتات کو پانی کے ذریعے زندگی بخشی ہے۔ یہ اس کے فیضان و برکات ہیں کہ اس نے زمین کے اندر سے پانی نکالا اس میں پانی کے چشمے ابل رہے ہیں۔ ندی نالے اور ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا بہتے ہیں۔ سرسبز و شاداب درخت اور رنگ برنگ فصلیں کھیتوں میں لہلہاتی ہیں۔ اس پانی پر جانوروں، مویشیوں اور انسانوں کی زندگی کا دارومدار ہے یہ اللہ تعالیٰ کے فیضان اور عنایات ہیں۔

اس کے بعد پہاڑوں کا ذکر ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو زمین کا لنگر بنایا۔ یعنی اس نے زمین پر پہاڑ گاڑ دیئے ہیں تاکہ زمین کا توازن برقرار رہے ماہرین ارضیات کے مطابق زمین میں سمندروں کی گہرائی اور پہاڑوں کی اونچائی زمین کے توازن کو برقرار رکھتی ہیں۔ جس طرح ترازو کے دو پلڑوں میں برابر کا وزن رکھ کر ترازو کا توازن برقرار رکھا جاتا ہے اسی طرح سمندروں کی گہرائی کے مقابلے میں پہاڑوں کو کھڑا کرکے زمین کے توازن کو برقرار رکھا گیا ہے تاکہ زمین ہل نہ جائے۔ سورہ النبا میں فرمایا گیا ہے:

أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهَادًا ۝ وَالْجِبَالَ أَوْتَادًا ۝

ہم نے زمین کو فرش بنایا اور (اس پر) پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دیا

پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑنا زمین کے توازن کو برقرار رکھنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے اس لیے یہ آیت زمین کے توازن کو برقرار رکھنے کی حقیقت کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کے علاوہ زمین پر موسموں کے تغیرات میں بارشوں کے برسنے میں، دریاؤں کی پیدائش میں، ذرخیز وادیوں کے وجود پذیر ہونے میں، بڑے بڑے جنگلات کے اگنے میں، قسم قسم کی معدنیات اور طرح طرح کے پتھروں کی فراہمی میں پہاڑوں کا اہم رول ہے۔ بہرحال یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی حکمت پر دلالت کرتی ہیں۔ ان تمام شواہد کے باوجود یہ لوگ اگر خدا کی وحدانیت سے اعراض کرتے ہیں تو یہ ان کی نادانی اور کم عقلی ہے۔

ان حقایق سے اللہ تعالیٰ نہ صرف کافروں کو اپنی قدرت کے مظاہر فیضان عنایات اور برکات پر غو رکرنے کی تلقین فرماتے ہیں بلکہ انسانیت کو ان حقایق سے خبردار کرتے ہیں کہ اس بے پناہ کائینات کو جس نےپیدا کیا ہے کیا وہ خالق کائینات زمین میں سڑے ہوئے مخلوقات کو دوبارہپیدا نہیں کرسکتا ہے اور جس پروردگار کے دسترخوان سے تمہیں پالا جارہا ہے اور جس زمین پر تمہاری ہر ضرورت پوری کی جارہی ہے کیا یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ تمہیں کھلائے پلائے اور تم موج مستیاں کرکے یہ سمجھ لیں کہ ہماری زندگی ختم ہوجائے گی اور دوبارہ زندہ کرکے اٹھایا نہیں جائے گا اور تمہارے اعمال کی کوئی پُرسش اور جواب دہی نہیں ہوگی۔ کیا دنیا کسی خالق حکیم کی پیدا کردہ نہیں ہے کیا یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل تماشا ہے؟! نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا کو پروردگار نے کسی مقصد کے لیےپیدا کیا ہے اور اس مقصد کے لیے آپ کو دنیا میں آپ کے اعمال سے آزمایا جائے گا۔ اس امتحان اور آزمائش کے بعد قیامت کو برپا کیا جائے گا تاکہ دنیا میں انسانوں کی زندگی کا مقصد پورا کیا جائے۔

فَإِذَا جَاءَتِ الطَّامَّةُ الْكُبْرَى (۳۴)

پھر جب وہ ہنگامۂ عظیم برپا ہوگا

يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْإِنسَانُ مَا سَعَى (۳۵)

اس دن انسان اپنا سب کیادھرا یاد کرے گا

وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى(٣٦)

اور ہر دیکھنے والے کے لیے جہنم بے نقاب کردیا جائے گا۔

احوال قیامت

۳۴: پھر وہ ہنگامۂ عظیم برپا ہوگا۔ ۳۵: اس دن انسان سب کیا دھرا یاد کرے گا۔ ٣٦: اور ہر دیکھنے والے کے لیے جہنم بے نقاب کردیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت، نظام کائینات، انسانوں کے لیے عنایات، برکات، فیضان اور انعام و اکرام کے دلائل کے بعد لوگوں کو قیامت کی طرف توجہ دلائی جاتی کہ اس روز بہت بڑا ہنگامہ ہوگا اور بہت بڑی ہلچل ہوگی۔ اس روز سب لوگ جی اٹھیں گے اور میدان حشر میں پہنچ جائیں گے۔ یہ دن بہت بڑی آفت اور مصیبت کا دن ہوگا سب لوگ محشر میں پریشان اور پراگندہ ہوں گے ہر کسی کو فکر لاحق ہوگی کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ انتظار کی یہ گھڑی بہت سخت ہوگی۔ قیامت کو اب یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں گے۔ ہر شخص لرزان اور خوف زدہ اپنی زندگی کے ایک ایک عمل کو یاد کر رہا ہوگا کیونکہ انہیں یاد آئے گا کہ دنیا میں ہم سے کہا گیا تھا کہ قیامت کے دن ایک ایک عمل کا حساب ہوگا۔

جو لوگ قیامت کو نہیں مانتے تھے آج انہیں یاد آئے گا کہ ہم نے جو بڑے بڑے مظالم کیے، عیش و عشرت میں ڈوبے رہے اور ہر وہ کام کیا جس سے انسانیت تار تار ہوگئی، اپنے اعمال کی فلم (film) ہر شخص کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہی ہوگی۔ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ جب کوئی شخص اچانک قانون کے شکنجے میں آتا ہے اور وہ دیکھ رہا ہوتا کہ میری قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے تو اسے اپنی زندگی کے سب کارنامے یاد آتے ہیں اور وہ چیز بھی اسے یاد آتی ہے جس کا اس نے انکار کیا تھا اور جس کے الزام میں اسے پکڑا گیا تھا۔

منکرین قیامت جس جہنم کا مذاق اڑاتے تھے جب یہ لوگ میدان حشر میں جمع ہوں گے تو وہ جہنم ان کے لیے بے نقاب کردی جائے گی اور فوراً انہیں معلوم ہوجائے گا کہ جس جہنم سے انہیں دنیا میں ڈرایا جاتا تھا حکم ملتے ہی انہیں اس میں جھونک دیا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ جہنم کو بے نقاب کرکے صرف ان لوگوں کو سامنے لایا جائے گا جو جہنم میں جانے والے ہوں گے جنہوں نے اس بڑی حقیقت کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے وہ بندے جو ہمیشہ اللہ کے کے حضور اور جہنم کے عذاب سے ڈر رہے تھے جہنم سے دور ہوں گے وہ اس کی آہٹ بھی نہ سنیں گے۔

قیامت کو طامۃ الکبریٰ کہا گیا ہے جس کا معنیٰ بہت بڑا ہنگامہ ہے۔ یعنی قیامت کے روز زبردست افراتفری اور بہت بڑی ہلچل ہوگی۔ سائنس دانوں نے بھی کائینات کے متعلق اس قسم کی افراتفری اور ہلچل کا اظہار کیا ہے۔ ماہرین فلکیات کہتے ہیں کہ کائینات میں جتنے بھی سیارے اور ستارے ہیں جن میں ہماری زمین بھی ایک سیارے کی حیثیت سے شامل ہے سب ایک ہی قانون کشش ثقل، کھینچاتان (gravitational pull) کے تحت اپنے اپنے دائرے میں کام کررہے ہیں اور اس طرح اس نظام کو بچائے ہوئے ہیں۔ اگر اس کششِ ثقل کا نظام نہ ہوتا تو سارے اجرام فلکی چاند، ستارے، سورج، سیارے آپس میں ٹکراکر ختم ہوجاتے اور کائینات کا سارا نظام درہم برہم ہوجاتا۔ یہ قانون کشش ثقل ہے جس کی وجہ سے اجرام فلکی ایک دوسرے کو کھینچ رہے ہیں اور اس نظام کو بچائے ہوئے ہیں۔ ماہرین فلکیات کے کہنے کے مطابق ایک دن یہ کشش ختم ہوجائے گی جس کے ساتھ یہ کائنات بھی تہس نہس ہوجائے گی۔ قرآن مجید میں قیامت کے لیے اسی قسم کا وعدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اشارے پر اس کائینات کو ختم ہونے کا حکم مل جائے گا تو اس کی اطاعت میں یہ سب اجرام فلکی اور آسمانی اجسام (Heavenly bodies) اس کشش ثقل کو ختم کرکے پارہ پارہ ہوجائیں گے اور اسی کے ساتھ کائینات کا وجود بھی ختم ہوجائے گا اور اس میں موجود تمام مخلوقات بھی نیست و نابود ہوجائیں گے اور اللہ کے حکم سے ایک نیا نظام وجود میں آئے گا جسے نظام آخرت کہتے ہیں اور اس نظام کے تحت تمام مرے ہوئے اور سڑے ہوئے انسانوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور انہیں اللہ کی بارگاہ میں حساب اور جواب دہی کے لیےپیش کیا جائے گا۔

فَأَمَّا مَن طَغَىٰ(۳۷)

پس جس نے سرکشی کی

وَآثَرَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا(۳۸)

اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی

فَإِنَّ الْجَحِيمَ هِيَ الْمَأْوَى(۳۹)

تو بے شک جہنم ہی اس کا ٹھکانا ہوگا

وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَى(۴۰)

اور جو رب کے حضور پیش ہونے سے ڈرا اور اپنے نفس کو خواہشات کی پیروی سے روکا

فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَى(۴۱)

تو جنت اس کا ٹھکانا ہوگا

جنت اور جہنم کے اسباب

۳۷: پس جس نے سرکشی کی اور اپنی زندگی میں گناہوں کی طغیانی اور طوفان برپا کیا اس کا ٹھکانا جہنم ہے دریا میں جب طغیانی آتی ہے تو وہ اپنے کناروں کو توڑ کر باہر نکل جاتا ہے۔ اسی طرح انسان کی زندگی میں جب طغیانی اور سرکشی آتی ہے تو وہ اللہ کے مقرر کردہ حدود کو توڑ کر اللہ کی نافرمانی پر اتر آتا ہے۔ توحید اور شرک، حلال اور حرام، جائز اور ناجائز میں اسے کوئی فرق نظر نہیں آتا ہے وہ آوارہ جانور کی طرح زندگی گزارتا ہے۔ وہ دنیا کے عیش و عشرت میں غرق ہو کر آخرت کو بھول جاتا ہے وہ ہر اس چیز کے درپے ہوتا ہے جو اس کی زندگی میں عیش و عیاشی کا ذریعہ بن سکے اور اسے حلال و حرام میں کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ وہ ہر آستانے کے در پر اپنے حقیر مقاصد کے لیے سر جھکاتا ہے۔ اسے یہ فکر نہیں ہوتی ہے کہ مجھے کس نے پیدا کیا اور مجھے کس کی اطاعت و بندگی کرنی ہے۔ اسے زندگی بھر کبھی آخرت کا خیال تک نہیں آتا ہے۔ اس کے احساسات، اس کے خیالات، اس کے افکار اور اس کے اعمال پر صرف خواہشات نفس کا کنٹرول ہوتا ہے۔ اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی ہے کہ میں جو کر رہا ہوں اس سے میرا پروردگار خوش ہوگا یا ناراض۔ اللہ نے مجھے زندگی گزارنے کا جو دستور دیا ہے وہ میرے ہاتھوں محفوظ ہے اور میں اس پر عمل کر رہا ہوں یا اسے پامال کر رہا ہوں وہ بے لگام اونٹ کی طرح زندگی گزارتا ہے۔ اللہ ایسے شخص سے ناراض ہے اور اس کا ٹھکانا یقینا جہنم ہے۔

اس کے بعد ان لوگوں کا ذکر ہے جن کا ٹھکانا جنت ہوگا جو اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار اور مقبول بندے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت کی نعمتوں سے نوازے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی زندگی اللہ کی فرمانبرداری اور شریعت کے مطابق گزارتے ہیں جن کا ہر قول اور ہر عمل اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہوتا ہے وہ اپنے نفس کو بری خواہشات کی پیروی سے دور رکھتے ہیں اور اسے اللہ کی شریعت کی لگام دیتے ہیں۔ جو ہر کام کرنے سے پہلے شریعت کی پیروی کرنے کی فکر کرتے ہیں۔ انہیں غصہ آتا ہے تو شریعت کے قابو میں رہتے ہیں۔ خوش ہوتے ہیں تو بھی دینی حدود میں رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا ٹھکانا جنت ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تربیت یافتہ صحابہ ایسی زندگی کے نمونے اور نمائندے تھے۔

مولانا حالی نے ان کی زندگی کی تصویر اس طرح کھینچی ہے

بھڑکتی نہ تھی خود بخود آگ ان کی

شریعت کے قبضے میں تھی باگ ان کی

جہاں کر دیا نرم، نرما گئے وہ

جہاں کردیا گرم، گرما گئے وہ

يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا(۴۲)

یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ قیامت کب آئے گی

فِيمَ أَنتَ مِن ذِكْرَاهَا(۴۳)

تمہیں اس کے ذکر سے کیا سروکار

إِلَى رَبِّكَ مُنتَهَاهَا(۴۴)

قیامت کی انتہا کا علم تیرے رب کے پاس ہے

إِنَّمَا أَنتَ مُنذِرُ مَن يَخْشَاهَا(۴۵)

آپ صرف خبردار کرنے والے ہیں۔ ان لوگوں کو جو قیامت سے ڈرتے ہیں

كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا عَشِيَّةً أَوْ ضُحَاهَا(۴۶)

جس دن یہ قیامت دیکھیں گے انہیں ایسا لگے گا کہ وہ دنیا میں صرف ایک شام یا ایک صبح رہے تھے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تسلی اور اطمینان اور منکرین قیامت کو تنبیہ

قیامت کے منکرین و مشرکین طنز کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرتے تھے کہ جس قیامت کے بارے میں آپ ہمیں بار بار دھمکیاں دیتے ہیں آخر وہ قیامت کب آئے گی یہ آفت آخر کہاں رُکی ہوئی ہے اور ہمارے پاس کب ڈھیرہ ڈالے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا جارہا ہے کہ آپ کو اس قیامت کی بحث سے کوئی سروکار نہیں آپ لوگوں کی ہدایت کے لیے تشریف لائے ہیں۔ یہ دن کب آئے گا، صرف اللہ کو معلوم ہے۔ پیغمبر کا کام یہ ہے کہ وہ اس دن کی خبر دیں اور لوگوں کو ڈرائیں تاکہ وہ عمل صالح کرکے اس دن رب کے حضور پیش ہونے کی تیاری کریں قیامت کے واقعہ ہونے کی تاریخ معلوم کرنا ایسا ہے جیسے ایک آدمی کو نصیحت کی جاتی ہے کہ دنیا میں نیک کام کرو۔ آخر ایک دن موت آئے گی اور دنیا کے کام ادھورے رہیں گے وہ آدمی کتنا نادان ہے جب وہ نیک عمل کرنے کے بجائے موت آنے کی تاریخ معلوم کرتا ہے۔ اس طرح اللہ کے نبی آخرت کی جوابدہی سے ڈراتے ہیں لیکن نادان لوگ پوچھ رہے ہیں کہ وہ دن کب آئے گا۔ ہر چیز کے علم کا جاننا صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے کسی پیغمبر کی نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی علیم وخبیر ہے۔ کائینات کے اسرار کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی کو کائینات کے راز جاننے کی ضرورت نہیں اور ایسا کرنا اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف اور مخلوق کی مصلحت کے منافی ہے۔

آج یہ لوگ قیامت کو خلاف عقل سمجھ کر انکار کرتے ہیں یا قیامت کو تسلیم تو کرتے ہیں لیکن لاپرواہی لی وجہ سے عیش و عشرت، ٹھاٹھ باٹھ اور من مرضی کی زندگی کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان سے فرمایا جارہا ہے کہ جب قیامت کے دن انہیں اٹھایا جائے گا تو انہیں دنیا میں گزاری ہوئی زندگی ایسی لگے گی کہ جیسے ایک شام گزری ہو یا ایک صبح ۔ اس لیے لوگوں کو خیال کرنا چاہیے کہ دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح نہ دیں کیونکہ آخرت میں انہیں جو زندگی ملے گی وہ ہمیشہ کے لیے ہے اور اس کے مقابلے میں دنیا کی زندگی جسے تم لوگ آخرت پر ترجیح دیتے ہیں اور اپنا سب کچھ اس کے لیے داؤ پر لگادیتے ہیں، ابدی زندگی کے مقابلے میں یہ زندگی وہ درجہ بھی نہیں رکھتی ہے جو دنیا کی زندگی کے ایک دن کا اگلا یا پچھلا پہر ہے۔ لہٰذا قیامت کے بارے میں فکرمند نہ ہونا ایک ایسا خسارہ ہے جس کے لیے آخرت میں ہمیشہ پچھتانا پڑے گا۔ انسان کے سامنے دنیاوی زندگی کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے کہ دنیا کی زندگی ایک مختصر وقفہ ہے جس کے لیے اہل دنیا جنگ و جدل کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو ہلاک کرتے ہیں۔ اس دنیائی کامیابی کے لیے جرائم، ظلم و جبر اور بڑے بڑے گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں اور خواہشات نفس کی تکمیل میں شب و روز ڈوبے رہتے ہیں۔ یہ دنیائی زندگی خود دنیا میں رہنے والوں کی نظر میں سمٹ کر اتنی مختصر ہوجائے گی کہ گویا وہ ایک صبح یا ایک شام ہو۔ یہ ہے دنیا اور دنیا کی زندگی۔ مختصر، جلد فنا ہونے والی، حقیر و ناپائیدار اور بے وقعت جس کی خاطر انسان ہمیشہ رہنے والی زندگی کو قربان کردیتے ہیں۔ یہ بہت بڑی حماقت ہے۔ ایسی حماقت جس کا ارتکاب کوئی ہوشیار اور ہونہار انسان نہیں کرسکتا ہے۔

حیاتِ دنیا بہت مختصر ہے، مگر یہی آخرت کی لازوال زندگی کی کھیتی ہے، جو وقت کی تیز رفتار سواری پر سوار ہوکر ہر لمحے موت کے قریب تر آرہی ہے۔ بقول شاعر

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے

عمر یوہی تمام ہوتی ہے

سورہ عَبَس

اٰیٰتُھَا:۴۲ رکوعٰتُھَا:۲

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَبَسَ وَتَوَلَّىٰ o أَن جَاءَهُ الْأَعْمَىٰ o وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّىٰ o أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنفَعَهُ الذِّكْرَىٰ o أَمَّا مَنِ اسْتَغْنَىٰ o فَأَنتَ لَهُ تَصَدَّىٰ o وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَزَّكَّىٰ o وَأَمَّا مَن جَاءَكَ يَسْعَىٰ o وَهُوَ يَخْشَىٰ o فَأَنتَ عَنْهُ تَلَهَّىٰ o كَلَّا إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ o فَمَن شَاءَ ذَكَرَهُ o فِي صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ o مَّرْفُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ o بِأَيْدِي سَفَرَةٍ o كِرَامٍ بَرَرَةٍ o قُتِلَ الْإِنسَانُ مَا أَكْفَرَهُ o مِنْ أَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهُ o مِن نُّطْفَةٍ خَلَقَهُ فَقَدَّرَهُ o ثُمَّ السَّبِيلَ يَسَّرَهُ o ثُمَّ أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ o ثُمَّ إِذَا شَاءَ أَنشَرَهُ o كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَا أَمَرَهُ o فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ إِلَىٰ طَعَامِهِ o أَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا o ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا o فَأَنبَتْنَا فِيهَا حَبًّا o وَعِنَبًا وَقَضْبًا o وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا o وَحَدَائِقَ غُلْبًا o وَفَاكِهَةً وَأَبًّا o مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ o فَإِذَا جَاءَتِ الصَّاخَّةُ o يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ o وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ o وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ o لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ o وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ o ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ o وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ o تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ o أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ o

پس منظر

مفسرین اور محدثین کو اس بات پر اتفاق ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے چند بڑے سرداروں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دے رہے تھے اسی دوران ابن اُمِ مکتوم نابینا حاضر ہوئے اور اسلام کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ دریافت کرنا چاہا۔ چونکہ وہ نابینا تھے اس لیے انہیں معلوم نہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت چند بڑے سرداروں سے مخاطِب ہیں۔ آپ ان سے بے رخی کرکے سرداروں کی طرف ہی متوجہ ہوے۔ ابنِ اُم مکتوم کیا پوچھنا چاہتے تھے اس بات پر اختلاف ہے۔ اس سلسلے میں حضرت عائشہؓ کی روایت پیش کی جاتی ہے کہ ابن اُم مکتوم نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اَرشدنی مجھے راہ راست دکھایئے۔ (ترمذی)

حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت ہے کہ انہوں نے ایک آیت کا مطلب پوچھا ان بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن اُم مکتوم ایمان لاچکے تھے۔ دوسری طرف ابن زید لَعَلَّهُ يَزَّكَّىٰ شاید کہ وہ نصیحت (اسلام) قبول کرنے سے یہ مطلب لیتے ہیں کہ انہوں نے ابھی ایمان نہیں لایا تھا بلکہ ایمان کی دولت حاصل کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تھے۔

بظاہر ہر انسان کو معلوم ہوتا ہے کہ نابینا سے بے رخی برتنے اور بڑے بڑے سرداروں پر توجہ دینے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر عِتاب فرمایا گیا ہے لیکن پوری طرح غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت یہ عتاب ان کافروں اور منکر سرداروں پر کیا گیا ہے جو تکبر اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو مسترد کرتے تھے البتہ عتاب کا رخ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے ۔ اگرچہ کلام صیغہ غائب میں ہے حقیقت یہ ہے کہ آپ ﷺ کی نابینا سے بے رخی اس وجہ سے نہ تھی کہ آپ بڑے لوگوں(Elite people) کو معزز سمجھ کر ترجیح دیتے تھے بلکہ اصل معاملہ یہ ہے کہ ایک داعی اپنی دعوت کا آغاز اس فطری رجحان سے کرتا ہے کہ قوم کے بڑے بڑے اور بااثر لوگ اگر اس دعوت کو قبول کرلیں، تو عام لوگوں پر اس کا اثر پڑنا لازمی امر ہے۔ اور ابتدا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی طریقہ اختیار فرمایا تھا۔ جس میں دعوت کو فروغ دینا مطلوب تھا نہ کہ چھوٹے لوگوں کی تذلیل۔ لیکن پیغمبر بھی انسان اور بشر ہوتے ہیں۔ اس لیے ان سے اس قسم کے سَہو کا احتمال ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت اور تبلیغ کا صحیح طریقہ سمجھایا کہ دعوت کے سلسلے میں ہر وہ شخص اہمیت اور توجہ کا حقدار ہے جو طالب حق ہو چاہے وہ غریب، کمزور، معذور یا سماج میں بے اثر ہو اور ہر وہ شخص غیر اہم اور ناقابل توجہ ہے جو حق سے بے زار، خدا بے زار اور دین دشمن ہو اس لیے آپ اسلام کی دعوت بلا امتیاز خاص وعام تک پہنچائیں اور آپ کی توجہ کے زیادہ حقدار وہ مخلص لوگ ہیں جن میں قبول حق اور اسلام کی تڑپ ہو اور ان ہی لوگوں کو جب ایمان اور اسلام کی نعمت حاصل ہوجائے گی تو آپ ان مغرور، تکبر اور طاقت کے نشے میں چور لوگوں کے سامنے انسانیت کے ان بلند اخلاق اور بلند کردار لوگوں کو بطور نمونہ پیش کریں گے۔

دعوت کے مخاطَب دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں پہلی قسم کے وہ لوگ ہیں جو بظاہر مہذب، شائستہ، دانا، عاقل اور تمیز والے ہوتے ہیں مگر غور و فکر کی صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں یعنی باطنی طور پر وہ نادان اور بے وقوف ہوتے ہیں۔ دوسری قسم کے لوگ وہ ہوتے ہیں جو ظاہری طور پر بالکل سادہ ہوتے ہیں جن کا طرز زندگی (life style) سادہ ہوتا ہے ان میں سے کوئی جسمانی طور پر بھی ناکارہ (handicaped) ہوسکتا ہے اور ان کی ظاہری صورت سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں دین سمجھنے کی کوئی صلاحیت موجود نہ ہو مگر اندر سے یہ لوگ بڑے بردبار، شائستہ، عاقل اور تمیز والے ہوتے ہیں اور غور وفکر کی دولت سے مالامال ہوتے ہیں۔ ان میں بات سمجھنے اور نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم ہوتی ہے اور ان کا باطن روشن ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورہ میں ابن ام مکتوم کے حوالے سے ان دونوں قسم کے لوگوں کی نشاندہی فرمائی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطَب کرکے ان متکبر، منکرین اور مشرکین کی تنقید فرمائی۔ آپ ﷺ سے فرمایا گیا ہے کہ آپ ان لوگوں کی طرف زیادہ توجہ دے رہے ہیں جو بظاہر مہذب اور سمجھدار نظر آرہے ہیں مگر اندرونی طور پر وہ بے وقوف اور جاہل ہیں وہ ایک خدا کی بندگی کے بجائے بہت سارے خداؤں کی بندگی کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس لیے وہ عقل کے مارے ہیں اور بے وقوف لوگ ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو سماج کے بڑے لوگ سمجھ کر اس غرض سے زیادہ توجہ دے رہے تھے۔ کہ وہ اسلام کے لیے سنگ میل ثابت ہوسکتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عتاب کے پیرایہ میں خطاب فرمایا کہ یہ لوگ جن کو آپ عاقل، شائستہ اور مہذب سمجھتے ہیں اور جن سے آپ امید کرتے ہیں کہ یہ دین اسلام قبول کریںگے بالکل غلط ہے۔ ان کے بجائے وہ لوگ قبول اسلام کے لیے قابل اعتماد ہیں جو بظاہر سیدھے سادھے اور بھولے بھالے ہیں حتیٰ کہ اگر وہ جسمانی طور کمزور اور ناکارہ بھی ہوں۔ لہٰذا ان لوگوں کی طرف توجہ دینا زیادہ مناسب اور بہتر ہے جبکہ ان میں دین سیکھنے کی تڑپ ہو۔ اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھنے والے مشرکوں اور منکروں سے بہتر ان لوگوں کو دعوت دین دینا مناسب اور بہتر ہے جو اپنے آپ کو شرک اور کفر کی لعنت سے دور رکھنا چاہتے ہیں اور جو حق کے متلاشی ہیں اگرچہ مالی طور کمزور بھی ہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جان بوجھ کر ابن ام مکتوم کو نظر انداز نہیں کیا تھا بلکہ آپ نے صرف اس غرض سے ان کو اپنی توجہ سے مؤخر کیا تھا کہ اُس وقت اشراف مکہ جمع تھے۔ آپ ﷺ نے پہلے ان کی طرف متوجہ ہونا ضروری سمجھا لیکن

اللہ تعالیٰ نے اس عمل کو بے رخی قرار دے کر فوراً اپنے محبوب کو روکا اور سمجھا دیا کہ جو شخص دین اسلام قبول کرنے کے لیے بے قرار ہو اس سے بے رخی کرنا کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے ایسے شخص کو ان منکرین خدا پر ترجیح دینا بہتر ہے جو دین اسلام کی مخالفت کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ابن ام مکتوم سے بے رخی کرنے کی مثال اس طرح ہے کہ ایک ڈاکٹر کسی بستی میں بیماری کی اطلاع پاکر لوگوں کا علاج کرنے کے لیے چلا گیا۔ بستی میں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ لوگوں میں ایک وبائی بیماری (epedeimc disease) پھیل گئی ہے وہ لوگوں کو اس بیماری سے بچانے کے لیے ہاتھ بڑھاتا ہے مگر یہ لوگ ڈاکٹر کی بات سننے اور ااس سے علاج کرانے سے انکار کرتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر ان کا علاج کرنے پر مُصر ہے اسی دوران ایک کمزور اور ناتوان بیمار دوڑ کر آتا ہے اور ڈاکٹر کو پکارتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب میں بیمار ہوں میرا علاج کیجئے، مجھے دوائی دیجئے۔ لیکن ڈاکٹر اس بیمار سے یہ سوچ کر بے رخی کرتا ہے کہ یہ شخص وبائی بیماری میں بتلا نہیں ہے اسے معمولی تکلیف ہے جس کا علاج بعد میں کیا جاسکتا ہے لیکن ڈاکٹر کو معلوم نہ تھا کہ وبائی بیماری میں بتلا یہ لوگ اپنی بیماری کا علاج کرانا نہیں چاہتے تھے اس لیے وہ اس علاج کے متلاشی بیمار سے توجہ ہٹا کر ان کی طرف زیادہ دھیان دے رہا تھا اور انہیں دوائیاں لینے پر زور دے رہا تھا۔ لیکن جو ڈاکٹر وبائی بیماری میں بتلا ان لوگوں کا علاج کرنا چاہتا تھا وہ کوئی عام ڈاکٹر نہ تھا بلکہ وہ پروردگار کی طرف سے بھیجے گئے ڈاکٹر تھے۔ اسی لیے اس نے اپنے بھیجے ہوئے محبوب اور ہمدرد ڈاکٹر صاحب کو وبائی بیماری میں بتلا لوگوں سے روکا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان بیماروں کا علاج کرنے کے بجائے اس بیمار کی طرف متوجہ ہونے کی تاکید فرمادی جو مخلص اور مُضطرب تھا اور اپنی بیماری کا علاج کرانا چاہتا تھا یعنی ہدایت کا طلب گار تھا اگرچہ وہ معمولی بیماری میں بتلا تھا اور بستی کے لوگوں کے مقابلے میں کمزور اور ناتوان تھا۔

عَبَسَ وَتَوَلَّى(۱)

ترش رو ہوا اور بے رخی برتی

أَن جَآءَهُ الْأَعْمَىٰ(۲)

اس بات پر کہ اس کے پاس ایک نابینا آیا۔

واقعہ کو بیان کرنے کے لیے صیغہ غائب (Indirect form of speach) کا استعمال کیا گیا ہے اور (Third person) یعنی غیر مخاطب شخص کے پیرائے میں بات کی گئی ہے کلام کے اسلوب سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نابینا کے ساتھ پیش آنے کا طریقہ اللہ کو ناپسند ہے لیکن اگر اس واقعہ کو صیغہ حاضر (Direct form of speah) یعنی حاضر شخص کے صیغے میں پیش کیا جاتا تو یقینا یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تکلیف دہ ہوتا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہوکر نصیحت فرمائی اس طرح کے کلام سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ کی رحمت اور شفقت اور عزت و احترام کا اظہار ہوتا ہے نصیحت کا طریقہ اس طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ استاد اپنے پسندیدہ طالب علم (student) کو کسی بات پر ٹوکنا چاہتا ہے تاکہ اس کی غلطی کی اصلاح ہوجائے تو کلاس میں وہ نام لیے بغیر نصیحت کرتا ہے اور مجموعی طور کلاس کے سب طلبا سے کہتا ہے کہ دیکھو کلاس میں کوئی بری حرکت نہیں کرنی چاہیے۔ اس طرح استاد اپنے پسندیدہ طالب علم کو نصیحت بھی کرتا ہے اور اس کا نام ظاہر (expose) نہ کرکے اس کی عزت بھی رکھدیتا ہے۔ اور طالب علم اپنے آپ کو سدھار بھی سکتا ہے اور بے عزتی کا شکار بھی نہیں ہوتا۔ نصیحت کا رخ بظاہر اس شخص کی طرف ہے جس نے غلطی کی ہے لیکن اس کی عزت اور وقار کو برقرار رکھنے کے لیے صیغہ غائب میں تیسرے شخص کو مخاطب کرکے نصیحت کی جاتی ہے تاکہ جس تک بات پہنچانی ہے اس کی عزت نفس کو ٹھیس نہ پہنچے کیونہ نصیحت پذیر یعنی جس کو نصیحت کی جاتی ہے وہ ناصح (نصیحت کرنے والے) کا پُرخلوص ، بے قصور، بے لوث اور بے نیاز بندہ ہے۔

وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّىٰ(۳)

تمہیں کیا خبر شاید کہ وہ پاکیزگی حاصل کرتا

أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنفَعَهُ الذِّكْرَىٰ(۴)

یا وہ نصیحت سُنتا تو تمہاری نصیحت اُسے نفع پہنچاتی۔

اب صیغہ غائب کو تبدیل کرکے صیغۂ حاضر (Direct speach) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کیا جاتا ہے۔ اس میں لہجہ بہت نرم ہے۔ فرمایا جارہا ہے کہ اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو معلوم نہیں کہ اس نابینا کے آنے اور اس کی ہدایت پانے میں کتنی بڑی خیر رونما ہو سکتی تھی چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین مکہ کے چند بڑے اشراف اور سرداروں کی جماعت جس میں عتبہ، شیبہ، ابوجہل، امیہ بن خلف وغیرہ جیسے اسلام دشمن لوگ شامل تھے، سے محو گفتگو تھے۔ اسی دوران عبداللہ بن امِ مکتوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنے کے لیے آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ اس وقت قریش کے ان سرداروں کی طرف مبذول و مصروف تھی اس لیے اس مشغولیت کے دوران آپ ﷺ کو ابن امِ مکتوم نابینا کی مداخلت ناگوار ہوئی اور ان سے بے رخی کی۔ بے رخی کی وجہ یہ تھی کہ آپ ﷺ جب سرداران مکہ سے محو گفتگو تھے تو عین اسی وقت ابن ام مکتوم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارنا شروع کردیا۔ آپ ﷺ کو یہ بات ناگوار ہوئی کیونکہ اس وقت آپ کی توجہ کسی اور چیز کی طرف منذول تھی اور چونکہ ابن امِ مکتوم نابینا تھے اس لیے انہیں معلوم نہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کون لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اس لیے انہوںنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارا جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہوئے اور آپ ﷺ نے نابینا کی بات کو نظرانداز کردیا لیکن اللہ تعالیٰ علیم الخبیر ہے اس نے اپنے رسول کو ازراہ محبت ٹوکا اور اس طرح غلطی کا ازالہ ہوگیا۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سرداروں کو طبقہ عام پر اخلاقی ترجیح نہیں دیتے تھے اور نہ آپ نے اس وجہ پر نابینا کے ساتھ بے رخی کی کہ نابینا ایک عام اور کمزور آدمی ہے بلکہ آپ کا سرداروں سے محو گفتگو ہونے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ آپ گمان کرتے تھے کہ ان سرداروں کا طبقہ عوام پر کافی اثر ہوتا ہے اور وہ ان سے مغلوب بھی ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر یہ لوگ ایمان لائیں تو عام لوگ جو اکثر ان بڑے لوگوں کے اثر و رسوخ کے تلے دبے ہوتے ہیں، آسانی سے اسلام کے دائرے میں شامل ہوجائیں گے اور اس طرح اسلام کے مددگار بن جائیں گے لیکن اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس خواہش سے روکا اور ان کے اسوہ حسنہ کو چار چاند لگا کر آنے والی نسلوں کے لیے اس واقعہ کو سبق آموز بنادیا۔ کہ ایسی امت جس کا سرمایہ اسلامی تعلیم، بلند اخلاق، صبر و استقلال، معرفت الٰہی، خوف خدا اور اللہ پر توکل و بھروسہ ہو اللہ کے دین کو درکار اور مطلوب ہے۔ رہے وہ لوگ جو اسلام کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اسلام کو ان کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور نہ اسلام ان کا محتاج ہے۔

أَمَّا مَنِ اسْتَغْنَىٰ(٥)

لیکن جو لاپرواہی کرتا ہے

فَأَنتَ لَهُ تَصَدَّىٰ(٦)

تو تم اس کی طرف زیادہ توجہ کرتے ہو

وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَزَّكَّىٰ(٧)

حالانکہ یہ آپ کی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ ضرور تزکیہ حاصل کرتے

وَأَمَّا مَن جَاءَكَ يَسْعَىٰ(٨)

لیکن جو شخص تمہارے پاس دوڑتا ہوا آیا

وَهُوَ يَخْشَىٰ(٩)

اور وہ اللہ سے ڈر رہا ہے

فَأَنتَ عَنْهُ تَلَهَّىٰ(١٠)

تو آپ اس سے بے رخی کرتے ہو

ان آیات میں تبلیغ دین کا وہ نکتہ واضح کیا گیا جس کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ مبذول کی جارہی ہے۔ اس میں دو شخصوں کا الگ الگ کردارپیش کیا جارہا ہے ایک وہ شخص ہے جو اللہ کے دین سے بے خبر اور بے نیاز ہے دنیا کے عیش و آرام میں مشغول ہے۔ دنیا کا مال و دولت اس کی زندگی کا مقصد ہے آخرت کی جوابدہی کا اسے کوئی تصور نہیں ہے۔ اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے شخص کے درپے ہدایت ہیں۔ اس کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ حالانکہ وہ آپ ﷺ سے روگردان ہے اگر وہ راہ راست پر نہ بھی آئے اور کفر و شرک کی بندگی میں لت پت رہے تو آپ ﷺ کو اس سے کوئی باز پرس نہ ہوگی اور نہ آپ کو اس کے معاملات کا ذمہ دار ٹھیرایا جائے گا۔

دوسرا وہ شخص ہے جو حق کا طالب ہے اسے قرآن سننے کی تڑپ ہے اور حصول علم کے لیے بے تاب ہے خدا سے ڈرتا ہے اس کے دل میں خدا کی معرفت اور اسلام کی محبت ہے لیکن آپؐ اس سے ترش رو ہوتے ہیں حالانکہ وہ اسلام کی روشنی حاصل کرنے کے لیے آپ کے پاس دوڑ کر آتا ہے۔ بے شک لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچانا آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ کی ذمہ داری ہے مگر جو لوگ ایمان لانا نہیں چاہتے ہیں اور کفر و شرک کی غلاظت کو چھوڑنا نہیں چاہتے ہیں ان کے ایمان لانے اور اسلام میں شامل ہونے کی آپ کی ذمہ داری نہیں ہے البتہ جو شخص اللہ سے ڈر کر آپ کے پاس آتا ہے تو اس پر توجہ دینا آپ کی ذمہ داری ہے۔

دراصل یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دی جاتی ہے کہ گمراہ لوگوں کے وعظ و تبلیغ میں اپنا قیمتی وقت ضائع نہ کریں یہ لوگ اگر گمراہی میں رہنا چاہتے ہیں تو آپ ان کو کوئی زور وزبردستی کر کے دین میں شامل نہیں کرسکتے ہیں۔ یہ ان لوگوں کی بدقسمتی ہے کہ یہ ہٹ دھرمی کررہے ہیں۔ اور کفر و شرک کی جہالت پر اٹک کر رہ گئے ہیں اور آپ کے لائے ہوئے دین اسلام میں داخل ہونے سے اعراض کرتے ہیں۔ انہیں اپنے حال پر چھوڑ کر آپ اپنا کام کرتے رہیے اور جو لوگ آپ کے دین میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ ان کا استقبال کیجئے اور ان کی رہنمائی فرمادیجئے۔ اور یہ جو آیت نمبر ۷ میں فرمایا گیا ہے: کہ یہ آپ کی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ ضرور تزکیہ حاصل کرلے یعنی وہ ضرور آپ کی بات مان لے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ داعی کی دعوت کو کوئی ایک بار ٹھکرادے تو وہ اسی پر اس کو چھوڑ دے اور دوبارہ اسے دعوت دینے کی کبھی زحمت گوارا نہ کرے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ داعی زور زبردستی کر کے کسی کو اپنی دعوت منوانے کے لیے مجبور نہیں کرسکتا ہے لیکن دعوت دینے کے لیے کسی کے پاس بار بار جانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

کیونکہ دین سمجھنے کے لیے لوگوں کو رہبر اور رہبری کی ضرورت ہے۔ اس لیے دین سمجھانے کے لیے رہبر کو اگر کسی کے پاس بار بار جانا پڑے تو یہ اس کے لیے سعادت مندی ہے اور اللہ تعالیٰ داعی کے اس عمل پر خوش اور راضی ہے اور رسولوں کو اسی مقصد کے لیے مبعوث کیا گیا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دعوت دین کے سلسلے میں بار بار جاتے تھے۔ حالانکہ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ لوگ آپ کی دعوت کو قبول نہیں کرتے تھے بلکہ بغاوت پر اتر آتے تھے اور آپ کو تکلیف بھی پہنچاتے تھے۔ جیسا کہ طائف میں جاکر آپؐ کو کچھ لوگوں کے ذریعے تکلیف پہنچی۔ ان کے پائے مبارک زخمی کردئے گئے۔ لیکن آپ نے کبھی ہمت نہ ہاری آپ نے اپنے مشن کو جاری رکھا یہاں تک کہ آپ کے دور حیات میں پورے عرب میں دین اسلام چھاگیا اور رفتہ رفتہ مسلمانوں کی کوشش اور جدوجہد سے پوری دنیا میں اسلام پھیل گیا۔

دین کے بارے میں آپ کی ہمت، جذبہ اور خلوص کا واقعہ بیان ہوا ہے کہ آپ مکہ میں رسالت کے ابتدائی دور میں گھر گھر جا کر لوگوں کے سامنے دین کی دعوت پیش کرتے تھے۔ آپ کے وصال کے بعد جب صحابیوں کی ایک جماعت حج کے موقع پر مکہ تشریف لائے تو ان کے پاس ایک بزرگ آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں دریافت کیا اور کہا کہ وہ ان سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں جب اس سے کہا گیا کہ آپ ﷺ اب اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ آپ کا انتقال ہوگیا ہے تو وہ زار زار رونے لگا۔ جب صحابہؓ نے رونے کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تھے اور گھر گھر جا کر لوگوں کو دین اسلام کی دعوت دیتے تھے تو وہ میرے پاس بھی آئے لیکن میں نے دعوت قبول کرنے سے انکار کیا تو وہ دوبارہ میرے پاس آئے میں نے پھر انکار کیا یہاں تک کہ وہ میرے پاس بار بار آئے اور میں نے ہر بار انکار کیا۔ لیکن جب میں ایمان لانے کے لیے تیار ہوا تو وہ مدینہ کی طرف ہجرت کر کے چلے گئے۔ اس لیے میرے پاس نہ آسکے چونکہ میں اس وقت بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس لیے ہجرت نہ کرسکا اب میں نے سنا ہے کہ وہ مکہ آئے ہیں تو میں اسلام قبول کرنے کے لیے آپ کے پاس آیا ہوں لیکن آپ کے وصال کی خبر سن کر مجھے بہت بڑا صدمہ ہوا۔ پھر اس نے اسی وقت قبول اسلام کا اعلان کردیا اور مسلمانوں کی صف میں شامل ہوگیا۔ لہٰذا دین کی طرف دعوت دینا سنت رسول ہے اور گھر گھر جا کر فرداً فرداً دین اسلام کی دعوت پیش کرنا دین میں زبردستی نہیں بلکہ یہ سنت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

كَلَّآ إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ(١١)

ہرگز نہیں قران سراپا نصیحت ہے

فَمَن شَاءَ ذَكَرَهُ(١٢)

پس جو چاہے اسے قبول کرے

فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ(١٣)

ایسے صحیفوں میں ہے جو مکرم ہیں

مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ(١٤)

بلند مرتبہ اور پاکیزہ ہیں

بِأَيْدِيْ سَفَرَةٍ(١٥)

ایسے ہاتھوں میں ہیں

كِرَامٍ بَرَرَةٍ(١٦)

جو معزز اور مکرم ہیں

فرمایا جارہا ہے کہ: قرآن ہر لحاظ سے محترم ہے اور ہر انسان کے لیے قابل احترام ہے یہ اللہ کی طرف سے بھیجی ہوئی کتاب ہے یہ کتاب ہر طرح کی خامیوں اور کمزوریوں سے پاک ہے اور جو اللہ کی اس کتاب اور کلام کو خدا کے بندوں تک پہنچانے کا کام کرتے ہیں۔ وہ سب پاک و منزہ ہیں چاہیے وہ فرشتے ہوں یا انسان۔ جو ہستیاں اس کلام کو آسمان سے زمین کی طرف لاتے ہیںوہ محترم اور مکرم ہیں۔ جس ذات مقدس پر یہ قرآن نازل ہورہا ہے وہ بھی محترم اور مکرم ہے اور جن لوگوں کے لیے یہ قرآن نال ہورہا ہے ان میں بھی ایسے پاک لوگ ہیں جو اسے قلم بند کررہے ہیں اور اپنے سینوں میں محفوظ کر رہے ہیں اور جو اس قرآن کو خدا کا کلام مان کر گلے لگا رہے ہیں وہ بھی پاک دل اور پاک باز ہیں سورہ الواقعہ میں فرمایا گیا ہے:

فِیۡ کِتٰبٍ مَّکۡنُوۡنٍ o لَّا یَمَسُّہٗۤ اِلَّا الۡمُطَہَّرُوۡنَ o (آیت:۷۸، ۷۹)

یہ (قرآن) ایک محفوظ کتاب ہے جس تک پاکیزہ لوگوں کی ہی رسائی ہے۔ اس لحاظ سے قرآن کے مشن میں انبیاء کرام اور صحابہ کرام سے لے کر علمائِ حق تک جو کوئی بھی شامل ہے وہ سب مکرم اور معزز ہیں یہ سارے معتمد امانت دار اور امانت کا حق ادا کرنے والے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا جارہا ہے کہ قران جس عظمت و شان کا کلام ہے اسی عظمت اور شان کے کارکنان اس کے مشن (mission) میں کام کررہے ہیں۔ جس طرح باوقار کام کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے اس کے نزول اور اس کی حفاظت پر مامور کیا اس کا تقاضا ہے کہ اس کی دعوت و تبلیغ میں آپ اسی طرح وقار اور دلسوزی کا مظاہرہ کریں۔

ان آیات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جب اتنے عظیم فرشتے دیانت وامانت اور احترام و اہتمام کے ساتھ اس کتاب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا دیتے ہیں تو یقینا اللہ تعالیٰ آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ جنہوں نے اس کتاب قرآن مجید کی کتابت اور حفاظت کر کے اس پیغام الٰہی کو دنیا کے کونے کونے تک پہنچانے کے لیے نہایت محنت اور دیانت کے ساتھ لوگوں کے دلوں اور دماغوں میں اتارنے کا فریضہ انجام دیا اور اس کتاب اللہ کے ایک ایک حرف اور آیت کو اپنے سینوں میں محفوظ کرلیا وہ بھی اس قدر دیانت اور امانت کے حامل ہیں جس قدر آسمانوں پر آسمانی کارندہ اس کی حفاظت کرنے والے تھے آج بھی جو خدا کے فرمانبردار بندے اس قرآن کو دیانت داری اور امانت داری کے ساتھ لوگوں تک پہنچادیتے ہیں، اس کی اشاعت کا کام کرتے ہیں اور اس کی حفاظت و اقامت میں اپنی جانیں قربان کردیتے ہیں، قابل احترام ہیں اور ان کا درجہ بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں بلند و بالا ہے لہٰذا خدا کے ان نیک بندوں کی اطاعت اور احترام واجب ہے۔

تبصرہ: ان آیات میں ابن ام مکتوم کے واقعہ کے متعلق اللہ کی طرف سے جو ہدایتیں نازل ہوئی ہیں وہ بہت عظیم ہیں یہ واقعہ دراصل انسانیت اور انسانیت کے قاعدے و قانون اور نظام زندگی کے لیے ایک لائحہ عمل ہے جسے قائم کرکے انسانیت کی زندگی پر بہترین اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یہ واقعہ دراصل انسانیت اور مساوات قائم کرنے کی پہلی ہدایت ہے۔ یہ ہدایت اگرچہ انفرادی حیثیت سے آئی ہے تاہم یہ حقیقت کے ایک بڑے اصول کی نمائندگی کرتی ہے اس واقعہ کی حقیقت میں اسلام کی تعلیم ہے اور انسانیت اور صداقت کی عمارت کی سنگ بنیاد ہے جو تاقیامت انسانی مساوات کا نمونہ اور پیمانہ رہے۔ یہ واقعہ صرف ایک انفرادی ہدایت نہیں ہے بلکہ یہ لوگوں کی زندگی کے تمام امور اور معاملات کا میزان اور پیمانہ ہے جسے ہمیشہ معیار زندگی کا پیمانہ مانا جائے گا۔ اس ہدایت الٰہی سے جس حقیقت کا قیام مقصود و مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ لوگ زمین پر رہتے ہوئے اپنے پیمانے صرف خدائی تعلیمات سے اخذ کریں اور ان میں زمینی پیمانے، زمینی رجحانات، انسانوں کے تصورات، افکار اور عادات کی آمیزش نہ ہو دنیا میں کسی بھی امر کے لیے کوئی بھی انسان عام ہو یا خاص خدائی ہدایتوں کا ضرورت مند ہے۔ حتیٰ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسی عظیم شخصیت کو بھی اس حقیقت سے مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس واقعہ سے اصل حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ لوگ رشد و ہدایت کے لیے خدا اور خدا کے رسول کی طرف رجوع کریں اور اپنی زندگی کے لیے زمینی قانون اور میزان کے بجائے اللہ کے قانون اور میزان کو اپنا لائحہ عمل بنائیں۔ اس واقعہ میں رب ذوالجلال کا اعلان ہے: اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ۔ تم میں سے خدا کے نزدیک زیادہ معزز وہ ہے جو زیادہ خدا ترس ہے۔ اس لیے جو زیادہ خدا ترس ہے وہ خدا کے نزدیک زیادہ معزز و مکرم ہے اور وہی توجہ کا زیادہ مستحق ہے۔ خواہ نسب، طاقت اور دولت کے لحاظ سے وہ غیر معروف ہو۔ جو ایمان و تقویٰ سے خالی ہو خدا کی بارگاہ میں اس کی کوئی وقعت نہیں ہے۔

اس ضمن میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ہدایت کو جو عِتاب کی صورت میں نازل ہوا لوگوں تک من و عن پہنچایا۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت رفعت اور شان پیغمبری ہے کہ انہوں نے عتاب کے واقعہ کو جوں کا توں پیش کیا ورنہ دنیا کا کوئی بھی انسان جو قوت، اقتدار اور دولت و حشمت کا مالک ہو اس طرح کے عتاب کو اپنے لیے بے عزتی سمجھ کر احتجاج کرتا یا اپنے آپ کو اصلاح کرنے کے بجائے معاملے کو اپنے پاس رکھ دیتا لیکن پیغمبروں کا وطیرہ اور مشن یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے کلام کو اصلی روپ میں پیش کریں۔ یہ ہے معیار اور مقام خانوادہ بنی ہاشم کے چشم و چراغ محمد بن عبداللہ کا جس کے بارے میں قریش نے کہا۔ لَوۡلَا نُزِّلَ هٰذَا الۡقُرۡآن رَجُلٍ مِّنَ الۡقَرۡيَتَيۡنِ عَظِيۡمٍ۔ قرآن دونوں بستیوں (مکہ یا طائف) کے کسی بڑے آدمی پر نازل کیوں نہ ہوا۔

یہ تھی وہ آسمانی قوت جس نے اس حقیقت کو پورے زور و شور کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا پھر یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی تھی جنہوں نے اس حقیقت کو پوری گہرائی اور قوت کے ساتھ دنیا میں جاری کردیا اور یہ حقیقت امت مسلمہ پر مدت ہائے دراز سے چھائی ہوئی ہے۔ اگرچہ دنیا کی مادی تعبیر کے علمبردار کیمونسٹ (communist) اور سوشلسٹ (socialist) انسانی زندگی کی حقائق سے ناواقف اور تنگ نظر زندگی کی تعبیر دنیاوی اور مادی پیمانوں پر پیش کرتے ہیں تاہم قرآن مجید کا یہ واقعہ انسانی مساوات کا روشن مینار (Beacon light) ہے۔ انسانیت کے اس پیغام کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں مسلمانوں کو قیادت و سیادت اور برتری کا مقام حاصل ہوگیا۔ امت مسلمہ انسانیت کے نئے موڑ پر کھڑی ہوگئی۔ امت کے عظیم رہنما نے اس عظیم ہدایت کو سب سے پہلے اپنے وجود میں ضم کردیا کہ اس واقعہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عبداللہ بن ام مکتوم سے مسکرا کر ملتے تھے۔ جب ان سے ملاقات ہوتی تو خوش ہوکر فرماتے تھے یہ وہ شخص ہے جس کے سلسلے میں میرے رب نے مجھے عتاب فرمایا۔ انہیں دوبار مدینہ منورہ کے لیے اپنا قائم مقام مقرر کیا۔

اسلام کی تاریخ اس نقطہ نگاہ سے نہایت تابناک ہے کہ شرف وبزرگی نسل و نسب پر نہیں بلکہ دینداری اور تقویٰ پر مبنی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی خالہ زاد بہن زینب بنت جحش کا نکاح اپنے آزاد کردہ غلام زیدؔ بن حارثہ سے کرایا۔ آغاز ہجرت میں جب مسلمانوں کے درمیان بھائی چارہ قائم ہوا تو اپنے چچا کو اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زید کا بھائی بنایا۔ حضرت خالد بن رویحہ اور حضرت بلال حبشی کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا۔ غزوۂ موتہ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ کو تین ہزار فوج کا فوجی سربراہ(commander in chief) مقرر کیا۔ پھر آپ ﷺ نے شہید زید بن حارثہ کے صاحبزادے حضرت اسامہ کو حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت سعد بن وقاصؓ جیسے صحابہ کی موجودگی میں مہاجرین اور انصار کی کثیر التعداد لشکر کا کمانڈر مقرر کیا جسے روم کی طرف بھیجنا تھا۔ اُسامہ پر چند لوگوں نے جب اعتراض کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زید مجھے زیادہ محبوب ہے اس لیے امارت کا زیادہ حق دار ہے۔ اسی طرح سلمان فارسیؓ پر کچھ زبانیں دراز ہوئیں اور ایرانی عربی کی تفریق پیدا کرنے کی کوشش کی گئی لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کاری ضرب لگاکر اس وطنی امتیاز کو ختم کردیا اور فرمایا: سَلمَانُ مِنَا اَھلُ الْبَیتِ(سلمان ہم میں سے ہے اور ہمارے گھر کا فرد ہے)۔ حضرت ابو ذر غِفاری اور حضرت بلال کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہوا جس دوران ابوذر غفاری نے حضرت بلال کو کالی عورت کا بچہ کہا تو اس پر نبی ﷺ ناراض ہوئے اور پلٹ کر ابو ذر سے کہا کہ اسلام میں سب برابر ہیں کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی برتری اور فضیلت نہیں ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی پر ابوذر اتنا متنبہ ہوئے کہ انہوں نے اپنی پیشانی زمین پر رکھدی اور قسم کھا کر کہا کہ وہ تب تک سر نہ اٹھائیں گے جب تک بلالؓ ان کی گردن کو اپنے پیروں سے نہ روندیں تاکہ ان کی غلطی کی تلافی ہوجائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی صحابہ نے مساوات کے اس مشن کو جاری رکھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روم کے ادھورے مشن کو پورا کرنے کے لیے جب خلیفہ اول حضرت ابوبکرؓ نے اُسامہ بن زید کی قیادت میں لشکر بھیجا اور جب خلیفہ لشکر کو رخصت کرنے نکلے تو اس وقت اُسامہ سوار تھے خلیفۂ رسول ان کے ہمراہ پیدا چل رہے تھے۔ اسامہ کو شرم آئی اور خلیفہ سے عرض کیا کہ اے خلیفہ رسولؐ آپ سوار ہوجائیں ورنہ میں سواری سے اترتا ہوں۔ خلیفہ نے فرمایا خدا کی قسم نہ تم اُترو گے اور نہ میں سوار ہوں گا۔ اس میں کچھ حرج نہیں کہ کچھ دیر کے لیے میرے پیر خدا کی راہ میں گرد آلود ہوجائیں۔

خلیفہ نے چاہا کہ خلافت کے معاملات اور امور کے مشوروں کے لیے عمرؓ کو اپنے پاس روکے رکھیں لیکن وہ فوج میں بحیثیت فوجی بھرتی تھے اس لیے خلیفہ نے اُسامہؓ سے باضابطہ اجازت لے لی۔ اس طرح مساوات اور میزان کی حقیقت اسلامی معاشرہ میں پیوستہ ہوگئی اور عرصۂ دراز تک زمین پر قائم رہی جس کے نتیجے میں مسلمانوںکو سماج میں بلند وبرتر مقام حاصل رہا۔ لیکن جب اس مساوات اور میزان کا چلن زمین سے اُٹھ گیا تو جاہلیت کے طوفان نے زمین کے گوشے گوشے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ امریکہ میں جو مغرب کا امام بنا ہوا ہے انسان کی قدر وقیمت اس کے بینک بیلنس (bank balance) پر منحصر ہے اور روس میں جو مشرق کا امام ہے جہاں کمیونزم اور سوشلزم کا نظام لوگوں پر مسلط ہے انسان کی قیمت آلات سے بھی کم ہے۔ ادھر کمیونسٹ اور سوشلسٹ (communist and socialist state of China) چین میں ملک کی اقتصادی ترقی (Economic progress) کے پیش نظر مذہب کو ملک کے آئین سے خارج کردیا گیا اور اسے مکمل طور لادین سیاست کا ملک قرار دیا گیا جہاں مذہبی عبادت کو Ban کردیا گیا یہاں مذہبی رسومات پر اس لیے قدغن لگادی گئی کہ مذہبی رسومات ادا کرنے میں وقت ضائع ہوتا ہے۔ رہے مسلم ممالک تو ان کا حال بھی کچھ بہتر نہیں۔ اسلام جاہلیت کے نظام کو ختم کرنے کے لیے آیا تھا لیکن جس نظام جاہلیت کو اسلام نے ختم کردیا تھا ان ممالک پر پھر سے وہی عود کر آئی۔ وہ نظریات جنہیں اسلام نے کالعدم کردیا تھا پھر سے ان ممالک میں رائج ہوئے۔ مسلمان اپنے وجود اور اپنی زندگی کے مقصد کو جس کی بنیاد اسلام ہے بھول گئے اور اس خود فراموشی اور خدا فراموشی کے نتیجے کا پھل انہیں یہ ملا کہ خدا نے غیر مسلم قوتوں کو طاقت کے نشہ میں ان پر مسلط کردیا جس کی وجہ سے مسلمان دنیا بھر میں کمزور اور بے وقعت قرار پائے اور انہیں مشرک اور خدا بے زار پاؤں تلے روندنے لگے۔ اب امید کی صرف ایک ہی کرن ہے کہ موجودہ دور کی اسلامی دعوت مسلمانوں کو ایک بار پھر جاہلیت کی لعنت سے نجات دلائے اور اسلام اور اسلامی نظام کو گلے لگاکر انسانیت اور انسانی قدروں کی شمع کو روشن کرے بس یہی ایک راستہ ہے جسے اپنا کر مسلمانوں کو اپنا کھویا ہوا سرمایہ 'اسلام کی دولت' واپس مل جائے اور ان کی عزت اور وقار بحال ہوجائے۔ اس طرح سے قرآن کے اس ایک جملے نے ایک ایسا معاشرہ قائم کیا جس کے نظام کو علامہ اقبالؒ نے یوں بیان کیا ہے:

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز

نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

قُتِلَ الْإِنسَانُ مَا أَكْفَرَهُ(١٧)

ہلاک ہو انسان ! کس قدر وہ ناشکرا ہے۔

مِنْ أَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهُ(١٨)

کس چیز سے اللہ نے اسے پیدا کیا

مِن نُّطْفَةٍ خَلَقَهُ فَقَدَّرَهُ(١٩)

اللہ نے اسے منی کے ایک قطرے سے پیدا کیا پھر اس کی تقدیر مقرر کی

ثُمَّ السَّبِيلَ يَسَّرَهُ(٢٠)

پھر اس کے لیے زندگی کی راہ آسان کی

ثُمَّ أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ(٢١)

پھر اسے موت دی اور قبر میں پہنچایا

ثُمَّ إِذَا شَاءَ أَنشَرَهُ(٢٢)

پھر جب چاہے اسے کھڑا کرے گا

یہاں سے عتاب کا رخ براہ راست کفار کی طرف ہے جو اللہ کے احسانات کو بھول کر حق کا انکار کرتے ہیں اور بغاوت پر اترآتے ہیں۔

۱۷: انسان اپنے عجیب و غریب رویہ پر قتل اور ہلاکت کا مستحق ہے۔ اُسے خدا نے پیدا کیا اور اس کے لیے زندہ رہنے کا مکمل انتظام کیا۔ ہوا، پانی اور دیگر کھانے پینے کی چیزیں اس کے لیے میسر کیں پھر بھی یہ انسان اپنے خالق کی نافرمانی کرتا ہے اس لیے یہ واجب الہلاکت ہے۔ کیونکہ جو کوئی بھی اپنے محسن یا مالک کی نافرمانی کرکے بغاوت پر اتر آتا ہے اس کے لیے یہی سزا واجب ہوتی ہے۔ قرآن میں جہاں بھی ایک انسان سے مخاطب ہوکر تنقید کی گئی ہے اس سے مراد سارے انسان نہیں بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جن کی نافرمانی پر اللہ ناراض ہے اور ان کی نافرمانی اور شرارت کی مذمت کرنا مقصود ہے۔ چونکہ اکثر انسانوں میں یہ مذموم صفات پائی جاتی ہیں اس لیے اگر مخصوص لوگوں کو نشانہ بنا کر ملامت کی جائے تو یہ ناراض ہوکر بغاوت پر اتر آتے ہیں جس طرح ابو لہب کی مذمت پر اُس کی بیوی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بغاوت کا اعلان کیا اور ہر طرح کے دشمنانہ طریقے اپنا کر آپ کی زندگی کے پیچھے پڑ گئی۔ اس لیے مخصوص طریقے کے بجائے عمومی طریقہ اختیار کرکے تمام نوع انسانی کو نصیحت کی گئی۔

۱۸: انسان دراصل اپنے وجود سے بے خبر ہے اس لیے منکرِ حق اور کافر ہے۔ اگر وہ اپنے وجود پر غور کرے کہ کس طرح پانی کے حقیر قطرے سے اللہ نے اسے وجود بخشا اور کس طرح اس نے جنم لیا ہے اور کس بے بسی کی حالت میں اس کی زندگی کی ابتدا ہوئی۔ کس طرح اللہ نے اس کی نشو ونما اور تربیت کا انتظام کیا کس طرح دوسری مخلوقات کی پیدائش کے برعکس اس کی پیدائش کو اہمیت حاصل ہے۔ اس کے پالنے پوسنے کا انتظام بھی اللہ نے حیوانوں کے طریقے سے الگ رکھا۔ حیوان کا بچہ جب جنم لیتا ہے تو کچھ معمولی وقفہ کے بعد اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہوکر اپنی ماں کے تھن کو اللہ کے اشارے سے منہ میں ڈال کر اپنی غذا حاصل کرنے لگتا ہے۔ شایدیہ اس لیے ہے کہ اس کی ماں اسے اپنی گود میں نہیں لے سکتی ہے اور نہ اس کے ایسے ہاتھ ہیں جن سے وہ اپنے بچے کو غذا کھلائے، اس کے برخلاف انسان کے بچے کو اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہونے کے لیے ایک سال سے زیادہ وقت درکار ہوتا ہے اس دوران اسے ماں گود میں دودھ پلاکرپیار اور محبت سے آشنا کردیتی ہے۔ لمحہ لمحہ اور لحظہ لحظہ اسے ماں باپ کی نگرانی میسر ہوتی ہے۔ ان کی پیار بھری پرورش میں ہی بچہ بلوغت کو پہنچ جاتا ہے۔ لیکن افسوس صد افسوس انسان کی عقل پر کہ وہ اس حقیقت کو بھول جاتا ہے اور اپنے خالق کی نافرمانی اور بغاوت پر اُتر آتا ہے۔ انسان کو غور و فکر کرنے کی ہدایت دی جاتی ہے کہ اپنے اس وجود پر نظر ڈالے اور اللہ کے احسان کو فراموش نہ کرے بلکہ اللہ کی بندگی میں شامل ہوجائے اور اپنی پیدائش کی حقیقت کو بھول کر من ہستم (میں ہوں) ہمچوں ما دیگرے نیست (میرے برابر کوئی نہیں) کی بیماری میں بتلا ہوکر غفلت اور غلط فہمی کا شکار نہ ہوجائے۔

۱۹۔ اللہ تعالیٰ ماں کے پیٹ میں ہی انسان کی تقدیر طے کردیتے ہیں۔ اس کی جنس، اس کا رنگ، اس کا قد، اس کی جسامت، اس کے اعضا، اس کی شکل و صورت، اس کی آواز، جسم کی طاقت، ذہن کی صلاحیتیں، خاندان، ماحول، سرزمین جس میں پرورش اور تربیت پائے گا۔ اس کی شخصیت کی تعمیر، زندگی میں اس کا کردار، زمین پر کام کرنے کی مدت، اس کی موت اور اس کی قبر غرض اس تقدیر سے انسان بال برابر ہٹ نہیں سکتا ہے اور نہ اس میں ذرہ برابر ردوبدل کرسکتا ہے۔ پھر کیسی عجیب ہے اس کی یہ جرأت کہ خالق کائینات کی بنائی ہوئی تقدیر کے آگے یہ اتنا بے بس ہے لیکن پھر بھی اس کی خدائی، اس کی قدرت اور اس کے احکام کا انکار کرتا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انسان کی زندگی کی راہ اس کے لیے ہموار کردی اور اس کے لیے ہدایت کی راہ واضح کردی اس کے اندر ایسی صلاحیتیں پیدا کردیں کہ زندگی گزارنے کے لیے ان راہوں پر چلنا اس کے لیے آسان ہوگیا۔ یہاں تک کہ جب زندگی کا سفر ختم ہوتا ہے تو انسان اس انجام کو پہنچ جاتا ہے جس تک ہر زندہ وجود کو پہنچنا ہے۔ اس حقیقت تک پہنچنے کا نہ اسے کوئی اختیار ہے اور نہ کوئی جائے قرار۔ اگر اللہ تعالیٰ اس کے لیے دنیا میں یہ تمام اسباب اور وسائل فراہم نہ کرتا تو اس کے جسم اور دماغ کی ساری قوتیں بے کار ثابت ہوتیں۔ اس کے علاوہ خالق نے اسے یہ موقع بھی دے دیا ہے کہ اپنے لیے خیر یا شر، شکر یا کفر، اطاعت یا نافرمانی کی جو بھی راہ وہ اختیار کرنا چاہیے کرسکے اللہ نے دونوں راستے اس کے سامنے کھول کر رکھ دیئے ہیں اور ہر راہ اس کے لیے ہموار کردی اب یہ اس کی مرضی ہے کہ وہ کس راہ کو اختیار کرلے خیر کی یا شر کی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ۔ اور ہم نے اسے دو راستے دکھا دیے۔

انسان کو راستہ دکھانا اللہ تعالیٰ کا کام ہے لیکن راستے پر چلنا اس کا کام ہے۔ تقدیر کے طے ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے اپنی مرضی کا پروگرام مرتب کرکے اس پر ٹھونس دیا ہے اور اب اس سے وہ بال برابر ہٹ نہیں سکتا ہے۔ بلکہ انسان اپنی مرضی کے مطابق صحیح راستہ یا غلط راستہ اختیار کرلیتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت عطا کرکے تمام مخلوقات پر برتری عطا کی اور اسے اشرف المخلوقات ہونے کا شرف بخشا جسے آج کل کے بے دین تاریخ دان اور فلسفہ دان سوشل (social) اور ریشنل (rational animal) سماجی حیوان اور حیوان ناطق قرار دیتے ہیں۔

۲۰: انسان کی تقدیر کا جو ذکر فرمایا گیا ہے یہ دراصل انسان کی اپنی بنائی ہوئی تقدیر ہوتی ہے جس طرح کوئی انسان اپنی زندگی کے کارنامے خود تحریر کرتا ہے اسی طرح وہ اپنی مرضی سے اپنی تقدیر بناتا ہے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ علیم الخبیر ہیے۔ اس لیے انسان کو خودتیار کردہ اعمال نامہ یعنی تقدیر کے ساتھ اسے دنیا میں بھیج دیتا ہے۔ واللہ اعلم۔

۲۱، ۲۲: اللہ تعالیٰ ہی انسان کو موت دیتا ہے اور اسے قبر میں پہنچا دیتا ہے۔ یہ موت انسان کی تقدیر میں لکھی ہوتی ہے۔ چونکہ انسان کا ریکارڈ (record) یعنی تقدیر اس کی پیدائش سے پہلے اس کے خود کردہ اعمال کے مطابق علیم الخبیر (ہر چیز کا علم رکھنے والا) تقدیر کے نام سے محفوظ کردیتا ہے۔ ایک انسان کس جگہ، کس طرح کی زندگی گزارے گا، کب اور کس جگہ اس کی موت واقع ہوگی، اس کے اعمال کیسے ہوں گے جس کے لیے یہ خود ذمہ دار اور بااختیار ہے لیکن اس کے برعکس انسان کا دنیا میں آنا اور موت پانا اس کے دائیرہ اختیار میں نہیں ہے۔ موت کی نہ کسی کو خبر ہے کہ کب کہاں اور کس طرح مرے نہ وہ اس سے فرار کرسکتا ہے اور نہ لمحہ بھر کے لیے اس کو ٹال سکتا ہے جس وقت جہاں جس حال میں اس کی موت کا فیصلہ کردیا گیا ہو اُسی وقت اُسی جگہ اُسی حال میں اس کی موت آئے گی اور جس نوعیت کی قبر اس کے لیے طے کردی گئی ہو اسی نوعیت کی قبر میں وہ پہنچ جاتا ہے خواہ وہ زمین کا پیٹ یا سمندر کی گہرائیاں، آگ کا الاؤ ہو یا کسی درندے یا پرندے کا معدہ بہرحال خالق کے اس فیصلے کو کوئی نہیں بدل سکتا ہے۔

قبر اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں انسان کی لاش پڑی ہو۔ جہاں سڑ جانے کے بعد بھی اسے اپنا خالق (پیدا کرنے والا) دوبارہ پیدا کردے گا۔

جو شخص جس جگہ مر کر پہنچ گیا ہو، سڑجانے کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوجائے گا۔ جو شخص مرتا ہے وہ فنا نہیں ہوتا ہے بلکہ زمین اسے اپنی تحویل میں لیتی ہے اور قیامت کے دن بطور امانت پیش کردے گی۔ سائنس کا بھی یہی ماننا ہے کہ کوئی چیز فنا نہیں ہوتی ہے بلکہ اسے صرف ایک تبدیلی کا سامنا کرنا پڑتا ہے کسی شے کے مادے (matter) کو لافانی تسلیم کیا گیا ہے (Matter is immortal) مادہ لافانی ہے جو ختم نہیں ہوتا ہے۔ کسی چیز کو یا کسی جاندار کو جلانے یا مارنے سے ختم نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس میں صرف جسمانی (physical) یا کیمیائی (chemical) تبدیلی (change) آجاتی ہے اس کا مادہ ختم نہیں ہوجاتا ہے۔ جیسے لکڑی جل کر راکھ میں تبدیل ہوجاتی ہے اس طرح اس لی جسمانی تبدیلی ہے اور اس کی راکھ موجود رہتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ جب محفوظ کئے ہوئے اس مادے کو دوبارہ زندگی بخشے گا تو چاروناچار سب کو اللہ کے حضور پیش ہونا ہے۔ کسی کی مجال نہ ہوگی کہ اٹھنے سے انکار کرے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے کیونکہ جس نے پانی کی ایک بوند کو انسان کی شکل دی اس خالق حقیقی کے لیے مشکل نہیں ہے کہ وہ قبروں سے اس مادے کو ازسر نو زندہ کرکے وہی انسانی روپ دے۔ اس حقیقت کے باوجود بھی انسان اپنے خالق کا شکر کرنے کے بجائے کفر کرتا ہے۔ اس نے زمین پر اپنا وجود پانے کے بعد یوم حساب کی تیاری نہیں کی بلکہ تکبر اور سرکشی کا مرتکب ہوا۔ اس نے اپنےپیدا کرنے والے خالق حقیقی کو نہ صرف فراموش کیا بلکہ بغاوت اور نافرمانی پر اتر آیا۔ اس نے وہ فرض ادا نہیں کیا جس کا اللہ نے اسے حکم دیا تھا۔ اللہ نے اسے اپنی فرمانبرداری کا حکم دیا تھا لیکن اس نے اپنے وجود کو نافرمانی کا جامہ پہنا کر اسے خاک میں ملادیا۔

كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَا أَمَرَهُ(۲۳)

ہرگز نہیں، اس نے اس حکم کو بجا نہ لایا جو اللہ نے اسے دیا تھا

فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ إِلَىٰ طَعَامِهِ(۲۴)

پھر انسان ذرا اپنی خوراک کو دیکھے

أَنَّا صَبَبْنَا الْمَاء صَبّاً(٢٥)

بے شک ہم نے ہی فراوانی سے پانی برسایا

ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقّاً(٢٦)

پھر ہم نے زمین کو عجیب طریقے سے پھاڑا

فَأَنْبَتْنَا فِيهَا حَبّاً(٢٧)

پھر ہم نے اس میں غلے اگائے

وَعِنَباً وَقَضْباً(٢٨)

اور انگور اور ترکاریاں

وَزَيْتُوناً وَنَخْلاً(٢٩)

اور زیتون اور کھجوریں

وَحَدَائِقَ غُلْباً(٣٠)

اور گھنے باغات

وَفَاكِهَةً وَأَبًّا(۳۱)

اور پھل اور چارے

مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ(۳۲)

تمہارے اور تمہارے میویشیوں کے لیے زندگی کا سامان

انسان کی تخلیق کے بعد انسان کو اللہ تعالیٰ کی عطا کی گئی نعمتوں کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔یہاں اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ انسان کو زندگی بخشنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جو کھانے پینے کا انتظام کیا ہے اس میں انسان کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ جس خدا نے انسان کو وجود بخشا ہے اسی نے اس کے رزق کا انتظام بھی کیا ہے۔ اب اسے ان نعمتوں پر غور کرنے کی تلقین کی جاتی ہے کہ یہ غذا جو آپ کھاتے ہیں، کیسے پیدا ہوتی ہے اگر اللہ نے اس کے اسباب فراہم نہ کیے ہوتے تو انسان کے بس میں نہ تھا کہ وہ اپنے لیے غذا خود تیار کر سکتا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی لاتعداد ایجادت کے باوجود آج تک یہ ثابت نہیں ہے کہ انسان نے اپنے ہاتھ سے غلے کا کوئی دانہ یا کوئی سبزی یا میوہ بنایا ہے اور نہ ایسا ممکن ہے کہ انسان اپنے ہاتھ سے کوئی بیج بنائے جس سے کونپل نکل آئے یا کسی جاندار، انسان، حیوان یا پرندے یا کسی کیڑے مکوڑے کا تخم بنا کر کسی جاندر کو پیدا کرے اس لیے انسان کو خدا کے عطا کئے ہوئے انعامات پر غور و فکر اور شکر و ثناء کی ہدایت دی جاتی ہے۔

اپنے کھانے پر غور کرنے کے بعد اب انسان کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرائی گئی ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کی خوراک کی اہم ضرورت پانی کو پیدا کیا۔ تمام مخلوقات، نباتات، جمادات اور حشرات کی زندگی کا دارومدار پانی پر ہے۔ پانی کا بارش کی صورت میں برسنا ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انسان واقف ہے یہی وجہ ہے کہ اس حقیقت کی طرف انسان کو متوجہ کیا جاتا ہے۔ انسان کے علم میں اضافہ ہونے کے بعد اسے بارش برسنے کا مفہوم اور ذریعہ معلوم ہوچکا ہے۔ جو بارش بار بار زمین پر برستی ہے جسے انسان اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، زمین پر جو بڑے بڑے سمندر ہیں سورج کی حرارت سے ان کا پانی بخارات میں تبدیل ہوتا ہے اور پھر بادل بن کر بارش کی صورت میں زمین پر گرتا ہے۔ پانی کے بارے میں سائنس کی تحقیق یہ ہے کہ یہ سمندر پہلے آسمان میں تخلیق پائے تھے پھر زمین پر گرائے گئے۔ آج تک کائینات کے متعلق سائینس کی جو تحقیق ہوئی ہے اس کے مطابق یہ کائینات ایک ہی مادے کا بنا ہوا ٹکڑا تھا پھر یہ ایک زور دار دھماکے سے الگ الگ ہوا۔ اس تھیوری کو سائنس نے ایک بڑا دھماکہ Big bang theory کے نام سے موسوم کیا ہے۔ جس کی وجہ سے سورج اور دوسرے ستارے اور سیارے اور تمام اجرام فلکی وجود میں آگئے جن میں ہماری زمین بھی شامل ہے جو ایک دلچسپ سیارہ ہے۔ دور حاضر کے ایک سائنس دان اے کرسی موری سن (A. Cressy Morison) کا بیان ہے کہ زمین کے جدا ہونے کے وقت زمین کا درجہ حرارت تقریباً 12000 ڈگری فارن ہائٹ تھا۔ جب تمام عناصر ایک دوسرے سے الگ ہوگئے تو کرۂ ارض کے اجزاء بتدریج ٹھنڈے ہوتے چلے گئے اس وقت تک تمام سمندر آسمان میں تھے۔ زمین پر آکسیجن (Oxygen) اور ہائیڈروجن (Hydrogen) موجود نہ تھے۔ کیونکہ ان کا وجود میں آنا اس وقت تک ناممکن تھا جب تک زمین کا درجہ حرارت 12000 ڈگری سے 4000 ڈگری تک نہ آتا۔ جب زمین کا درجہ حرارت 4000 ڈگری تک نیچے آیا تو آکسیجن اور ہائیڈروجن آپس میں مل گئے جس سے پانی وجود میں آگیا

Man does not stand alone: A. Cressy Morrison

دراصل کائنات کی یہ تجدید اس لیے ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ زمین کو زندگی کی آماجگاہ بنایا جائے اس لیے زمین پر مخلوقات کو پیدا کر کے انہیں زمین کی زینت بنایا گیا اور انسان کو تمام مخلوقات پر ترجیح دے کر اشرف المخلوقات کی حیثیت دی گئی اور اسے باقی تمام مخلوقات کے برعکس خدا تعالیٰ کے پاس جواب دہی کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ انسان کی اس حیثیت کی بنا پر فلاسفروں اور سائنس دانوں نے انسان کو حیوان ناطق (rational animal) کا نام دیا ۔

پانی کو وجود میں لانے کی دلیل کے بعد اب پانی اور اس کی مدد سے پیدا ہونے والی انسانی غذا کی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا ہے کہ اس نے سائنس کی مدد سے زمین پر پانی پیدا کیا یا اس نے انسانی غذا کو وجود بخشا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان جو غذا کھاتا ہے یہ اس پر اللہ تعالیٰ کی عنایت اور مہربانی ہے ورنہ انسان اپنے ہاتھوں سے کسی پھل یا فصل کا بیج پیدا نہیں کر سکتا ہے جو زمین میں ڈال کر پیڑ، پودے یا درخت کی شکل اختیار کر سکے۔ بہرحال بارش برسنے سے زمین بھی سیراب ہوتی ہے اور چشمے اور ندی نالے بھی وجود میں آتے ہیں اور پہاڑوں پر یہی پانی برف کی شکل میں جم کر گرمی ملنے سے پگلتا ہے اور پھر پانی کی شکل میں بہہ جاتا ہے اور دریاؤں اور ندی نالوں میں رواں ہوتا ہے یہ انتظام زمین و آسمان کے خالق اور مالک کے بغیر کوئی نہیں کر سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ زمین کو عجیب طریقے سے پھاڑ دیتا ہے جو بیج یا گھٹلیاں زمین کے اندر بوئی جاتی ہیں یا کسی بھی طرح زمین کے اندر پہنچ جاتی ہیں وہ کونپلیں نکال دیتی ہیں۔ انسان صرف اتنا کر سکتا ہے کہ وہ زمین کو قابل کاشت بنا کر تخم کو زمین میں ڈال دے لیکن زمین سے تخم کا کونپل نکالنا خدا کا کام ہے۔ انسان کا کام نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بے شمار قسم کے تخم پیدا کئے ہیں جن سے بے شمار قسم کے نباتات اُگتے ہیں اور وہی ان اگنے والے نباتات کو معقول غذا فراہم کر کے نشو ونما دیتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ انسان کو ایسا مفید اور حکیمانہ نظام بہم نہ پہنچاتا تو انسان کا غذا نہ ملنے کی صورت میں زندہ رہنا ناممکن تھا انسان جب اس بیج کو زمین میں دفناتا ہے تو اس کی عقل کے مطابق بظاہر یہ بیج زمین کے اندر سڑ جانا چاہیے لیکن اللہ کی قدرت سے یہ بیج زمین کے اندر زندگی پاتا ہے اور کونپل کی صورت میں زمین کو پھاڑ کر باہر آجاتا ہے بیج سے ایک نازک و باریک تنا باہر آکر ایک بڑے درخت کی شکل اختیار کر لیتا یا لہلہاتی ہوئی فصل کی صورت میں ابھرتا ہے اس طرح اللہ کریم زمین سے غلہ، ترکاریاں، سبزیاں اور مختلف قسم کے میوہ جات کے علاوہ دیگر کھانے پینے کی چیزیں انسان کی چارہ گری کے لیے اگاتا ہے۔ انسان کی ان نعمتوں کے علاوہ انسان کے مال و مویشیوں کے لیے بھی چارہ سازی کرتا ہے۔ ان مختلف نعمتوں کے علاوہ گھنے باغات اور بڑے بڑے درخت ہیں جن کا سایہ انسان کے آرام کا ذریعہ اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اور جن کے استعمال سے انسان کی ضروریات زندگی بھی پوری ہوتی ہیں۔ رب کریم فرماتا ہے: وَمَا عَمِلَتۡهُ أَيۡدِيهِمۡ (یٰس:۳۵) نہیں بنایا ان کو انسان کے ہاتھوں نے۔ ان نعمتوں کا ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اپنے فضل و کرم سے نوازا ہے۔ لہٰذا انسان کو یہ جاننے کی کوشش کرنی چاہیے کہ یہ انعامات بلاوجہ نہیں ہیں۔ بلکہ انسان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اللہ کی ان عطا کی ہوئی نعمتوں کے بدلے میں اللہ کا شکر گزار اور فرمانبردار بندہ بن جائے۔

فَإِذَا جَآءَتِ ٱلصَّآخَّةُ (۳۳)

پھر جب بہرہ کر دینے والی آواز آئے گی

يَوۡمَ يَفِرُّ ٱلۡمَرۡءُ مِنۡ أَخِيهِ (۳۴)

اس دن آدمی اپنے بھائی سے بھاگے گا

وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ(۳۵)

اور اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے

وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ(۳۶)

اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے

لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ ط ہر شخص کی حالت اس دن ایسی ہوگی کہ اسے اپنی ہی فکر ہوگی۔

یہاں ان آیات میں نفخ صور۔ قیامت کے روز بگل بجنے کا ذکر ہورہا ہے جس کی آواز کانوں کو بہرا کردینے والی ہوگی۔ اس آواز سے تمام انسان جو اپنے اپنے مرکدوں میں پڑے ہوئے اور سڑ چکے ہوں گے، زندہ ہوکر میدان حشر میں جمع ہونے کے لیے دوڑ پڑیں گے۔ سورہ کے آغاز میں دو طرح کے افراد کا تذکرہ ہے۔ ایک وہ جو خدا سے ڈرتے ہوئے حق کی جستجو میں دوڑتے ہوئے آتے ہیں دوسرے وہ جو ہدایت کو نظر انداز کرکے حق سے روگردانی کرتے ہیں۔ سورہ کی آخری آیات میں دونوں طرح کے لوگوں کے انجام کا تذکرہ ہے یہی خدا کا میزان اور انصاف ہے۔ جب سب لوگ محشر میں جمع ہوں گے اور کانوں کو بہرہ کردینے والی آواز سے خوف زدہ ہوں گے، اپنے انجام کو سامنے دیکھ کر سراسیمہ ہوں گے، اپنے دائیں بائیں اور آگے پیچھے کا ہوش نہ ہوگا ہر کوئی انسان اپنے خاندان، قریبی رشتہ دار اور دوست و دشمن کو پہچاننے سے انکار کرے گا ہر شخص کو اپنی ہی فکر ہوگی حتیٰ کہ بھائی بھائی سے بھاگے گا اور ماں باپ اپنی اولاد سے بھاگیں گے اور اولاد اپنے والدین سے بھاگتے نظر آئیں گے۔ میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہوں گے۔ ایک ماں جو دُنیا میں اپنے بچے کو جنم دیتی ہے اور بچے کے پیار محبت میں دیوانے کی طرح اس کے ساتھ چپک جاتی ہے ہر مصیبت، ہر تکلیف اور ہر خطرے میں ہر وقت اپنے بچے کا ساتھ دیتی ہے لیکن قیامت کے دن وہ ماں بھی بچے کے اس پیار و محبت کو بھول جائے گی یہاں تک کہ وہ اس طرح اپنے بچے سے بھاگے گی، جیسا کہ اُس نے اسے جنم ہی نہیں دیا ہو۔ اہل علم بیان فرماتے ہیں کہ اس پریشانی اور خوف و دہشت کی کیفیت میں لوگ اس لیے ایک دوسرے سے بھاگیں گے کہ کہیں کوئی کسی کو مدد کے لیے نہ بلائے یا سفارش کے لیے نہ پکارے الغرض میدان حشر میں ہر کسی کو یہ احساس ہوگا کہ مجھے خدا کی نافرمانی اور غرور و گھمنڈ کی سزا میں ضرور پکڑا جائے گا۔ اور خدا کے فرمانبردار بندے کو اس بات کی خوشی ہوگی کہ مجھے خدا کی فرمانبرداری اور اطاعت گزاری کا معاوضہ دیا جائے گا۔ خیال رہے کہ مومنین قیامت کی ہولناکی اور خوف و دہشت سے محفوظ رہیں گے۔ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن فرمایا کہ قیامت کے دن سب ننگے ہوگے ایک عورت نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہمارے ستر سب کے سامنے ننگے ہوں گے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی آیت فرمائی۔ آپ نے فرمایا کہ اس دن کسی کو کسی کا ہوش نہ ہوگا یعنی سب لوگوں کو اپنی اپنی فکر ہوگی کوئی کسی کی طرف نہ دیکھے گا۔

وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ(۳۸)

کتنے چہرے اس دن روشن ہوں گے

ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ(۳۹)

ہنستے مسکرائے خوش و خرم ہوں گے

وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ(۴۰)

اور کتنے چہرے اس دن ایسے ہوں گے جن پر خاک اڑ رہی ہوگی

تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ(۴۲)

ان پر سیاہی چھا رہی ہوگی

أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ(۴۲)

یہی لوگ کافر اور بدکردار ہوں گے

قیامت کے دن کافر اور مومن الگ الگ کردئے جائیں گے رب کی طرف سے اعلان ہوگا۔

وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ (یٰس آیت:۵۹)

اے مجرمو! آج کے دن الگ ہوجاؤ۔

اس طرح اللہ کے نافرمان اور مجرم بندے فرمان بردار اور نیکوکار بندوں سے الگ کردئے جائیں گے۔ لوگ دو گروہوں میں کھڑے انتظار میں ہوں گے اور اپنے اپنے چہروں سے پہچانے جائیں گے۔ مومن لوگ روشن چہروں سے اور کافر، مشرکین اور منکرین سیاہ چہروں سے۔ اللہ کے فرمانبردار اور دین اسلام کے خدمت گار اور غمگسار کے چہرے مسکراہٹ سے کِھل اٹھیں گے وہ ہشاش بشاش اور خوش و خرم ہوں گے اور جنت میں داخلہ کے انتظار میں ہوں گے یہی ان کا ٹھکانا ہے اور اسی میں انہیں ہمیشہ رہنا ہے۔ اس کے برعکس کافر، خدا بے زار اور خدا کے نافرمان بندوں کے چہروں پر سیاہی چھائی ہوئی ہوگی۔ وہ نہایت خوف و دہشت میں بتلا ہوں گے اور اپنے اعمال پر پچھتاتے ہوں گے مگر انہیں پچھتانے سے مایوسی اور اداسی کے بغیر کچھ حاصل نہ ہوگا جہنم ان کے سامنے ان کے انتظار میں ہوگی۔ یہی اب ان کا ٹھکانا ہے جس میں انہیں ہمیشہ کے لیے رہنا ہے۔ یہ انسان کی زندگی کی وہ حقیقت ہے جس کو پانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیائے فانی کی امتحان گاہ میں لاکھڑا کردیا ہے تاکہ دنیا میں اسے ایمان اور کفر یعنی اللہ کی فرمانبرداری اور نافرمانی سے آزمائے اور کھرے اور کھوٹے کو الگ کردکھائے۔

سورۃ التکویر

اٰیٰتُھا:۲۹ رُکوعُھا: ۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِذَا الشَّمۡسُ کُوِّرَتۡ o وَاِذَا النُّجُوۡمُ انۡکَدَرَتۡ o وَاِذَا الۡجِبَالُ سُیِّرَتۡ o وَاِذَا الۡعِشَارُ عُطِّلَتۡ o وَاِذَا الۡوُحُوۡشُ حُشِرَتۡ o وَاِذَا الۡبِحَارُ سُجِّرَتۡ o وَاِذَا النُّفُوۡسُ زُوِّجَتۡ o وَاِذَا الۡمَوۡءٗدَۃُ سُئِلَتۡ o بِاَیِّ ذَنۡۢبٍ قُتِلَتۡ o وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتۡ o وَاِذَا السَّمَآءُ کُشِطَتۡ o وَاِذَا الۡجَحِیۡمُ سُعِّرَتۡ o وَاِذَا الۡجَنَّۃُ اُزۡلِفَتۡ o عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّا

أَحْضَرَتْ o فَلَا أُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ o الْجَوَارِ الْكُنَّسِ o وَاللَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ o وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ o إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ o ذِي قُوَّةٍ عِندَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ o مُّطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ o وَمَا صَاحِبُكُم بِمَجْنُونٍ o وَلَقَدْ رَآهُ بِالْأُفُقِ الْمُبِينِ o وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ o وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطَانٍ رَّجِيمٍ o فَأَيْنَ تَذْهَبُونَ o إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ o لِمَن شَاءَ مِنكُمْ أَن يَسْتَقِيمَ o وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ o

پس منظر

سورہ تکویر کے دو حصّے ہیں اور دو الگ الگ موضوع ہیں پہلے حصے میں قیامت اور آخرت کا بیان ہے اور قیامت کا خوف ناک منظر پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں رسالت کا بیان ہے۔ قیامت کے دن ایسے خوف و دہشت کا ماحول ہوگا جس میں سورج بے نور ہوگا۔ ستارے بکھر جائیں گے پہاڑ اڑ جائیں گے سمندروں میں آگ لگ جائے گی کسی کو کسی کا ہوش نہ ہوگا۔ مویشی اور جنگلی جانور خوف کے مارے بدحواس ہوکر اکھٹے ہوجائیں گے اور دیکھیں گے کہ ایک عظیم تباہی کا آغاز ہوچکا ہے جس نے ہر چیز کو الٹ دیا ہے اور پر سکون ماحول کو تباہ کردیا ہے۔ انسانوں کو ہلاکر رکھ دیا ہے۔ اور ان کی زندگی کا سکون چھین لیا ہے۔ تمام انسانوں کو مصیبت میں ڈال دیا ہے اس مصیبت میں ان کا کوئی یار و مددگار نہیں ہے۔ دنیا کے تمام یارانے، دوستانے، رشتے، ہمدردیاں، دوستیاں اور دشمنیاں اور آپسی تصادم اور فتنے اور فسادات سب مٹ جائیں گے کسی کو اپنے سوا کسی کی فکر نہ ہوگی۔ لوگ کھانا، پینا، اٹھنا بیٹھنا اور بحث و تکرار سب کچھ بھول جائیں گے انسان کا تعلق ہر اس معاون اور مددگار سے کاٹ دیا جائے گا جس کی طرف وہ مصیبت کے وقت سکون حاصل کرنے کے لیے رجوع کرتا تھا۔

انسانوں کو یہ (قیامت) کا دن مدنظر رکھنے اور اس پر غوروفکر کرنے کی تاکید کی جاتی ہے کہ وہ اللہ کی آغوش میں آئیں اور اس کی پناہ حاصل کریں۔ اللہ کی پناہ میں آنے سے انہیں قرار و سکون حاصل ہوگا اور یہی قرار و سکون قیامت کے خوف ناک منظر میں انہیں کام آئے گا۔

سورہ کے دوسرے حصے میں رسالت، وحی لانے والے فرشتے کا مرتبہ اور جس رسول کی طرف وحی آتی ہے اس کا مرتبہ اور اس کی عظمت کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ لوگ بھی مخاطب ہیں جو وحی اور حاملین وحی سے انکار کرتے ہیں اور آخر میں اس حقیقت کی نشاندہی کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام ساری انسانیت کے لیے نصیحت ہے مگر اس سے وہی شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے جو اس نصیحت کو قبول کرتا ہے اور اس نصیحت (قرآن) کو اپنی زندگی کا دستور اور منشور قرار دیتا ہے۔

قیامت کا منظر اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ جب کائینات کے تمام اجرام فلکی سورج چاند ستارے بے نور کردئے جائیں گے وحشی جانور، پالتو مویشی اور انسان و حیوان تمام مخلوقات قیامت کے اس خوف و دہشت میں دوڑتے بھاگتے پریشان اور حیران نظر آئیں گے لوگ محسوس کریں گے کہ یہی روز حساب ہے۔ آج کے دن ہر عمل کا حساب ہے ہر کوئی اپنے اعمال پر نظر ڈالے گا اور اپنے اپنے عمل کا حساب کرنے لگے گا جس نے جو کچھ کمایا ہو ساتھ لے کر اللہ رب العالمین کی بارگاہ میں پیش ہوگا۔

اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ یاد دلاتا ہے کہ جس اللہ نے یہ کائینات بنائی وہی ایک دن اس کائینات کو درہم برہم کردے گا۔

اگر ہم سائنس کی اس بِگ بینگ تھیوری کو تسلیم کرتے ہیں کہ ایک دھماکے سے تمام اجرام فلکی چاند سورج اور دوسرے ستارے اور سیارے جو ایک ہی مادے کے بنے ہوئے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ بندے ہوئے تھے الگ الگ کردئے گئے اور اب یہ ستارے اور سیارے ایک دوسرے کی کشش سے اس کائینات میں موجود ہیں تو پھر یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ جس کشش سے یہ ستارے اور سیارے موجود اور قائم ہیں اس کشش کو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ختم کردیں گے اور یہ سب طیاروں کی طرح گر کر تباہ ہوجائیں گے۔ اس حقیقت سے رب العالمین انسانوں میں ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ کائینات کے یہ مادی نظارے جو انہیں مستحکم نظر آتے ہیں آخر میں فنا ہونے والے ہیں اور دنیا کی یہ رنگینی اور خوبصورتی جو انہیں اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور اپنی محبت میں گرفتار کر کے محوِ عیش رکھتی ہے ہمیشہ رہنے والی چیز نہیں ہے بلکہ ایک دن دنیا کی اس خوبصورتی کو زوال آئے گا اور اس کا وجود مٹ جائے گا۔ اس لیے زندگی اور اس کی خوبصورتی کو لازوال سمجھ کر دھوکے میں نہ آئیں یہ دنیا ایک دن فنا ہوجائے گی۔ لیکن یہ آخرت کی کھیتی ہے جو اللہ کی مرضی کے مطابق اس کھیتی میں آخرت کے لیے کمائی کرے گا وہی کل قیامت کے دن اللہ کے سایہ میں ہوگا اور اپنی کمائی کا اچھا مزا چکھے گا۔ اس لیے دنیا کے ان فنا ہونے والے نظاروں سے دل لگانے کے بجائے رب العالمین سے اپنی امیدیں وابستہ کرلیں اور آخرت کی نعمتوں کو حاصل کرلیں جو ابدی اور لازوال ہیں اور دنیا کو آخرت پر ترجیح نہ دیں۔

إِذَا الشَّمۡسُ كُوِّرَتۡ(۱)

جب سورج لپیٹ دیا جائے گا

وَإِذَا النُّجُومُ انكَدَرَتۡ(۲)

اور جب تارے بے نور ہوجائیں گے

وَإِذَا الۡجِبَالُ سُيِّرَتۡ(۳)

اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے

وَإِذَا الۡعِشَارُ عُطِّلَتۡ(۴)

اور جب دس ماہ کی حاملہ اونٹنیاں آوارہ پھریں گی

وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ(۵)

اور جب وحشی جانور اکھٹے ہوجائیں گے

وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ(٦)

اور جب سمندر بھڑکا دئے جائیں گے

وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ(۷)

اور جب نفسوں کو ملایا جائے گا

وَإِذَا الْمَوْؤُودَةُ سُئِلَتْ(۸)

اور جب زندہ دفنائی گئی لڑکی سے پوچھا جائے گا

بِأَيِّ ذَنبٍ قُتِلَتْ(۹)

کہ آخر اسے کس گناہ پر مارا گیا

وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ(۱۰)

اور جب اعمال نامے کھولے جائیں گے

وَإِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ(١١)

اور جب آسمان کا پردہ ہٹا دیا جائے گا

وَإِذَا الْجَحِيمُ سُعِّرَتْ(١٢)

اور جب جہنم بھڑکا دیا جائے گا

وَإِذَا الْجَنَّةُ أُزْلِفَتْ(١٣)

اور جب جنت کو قریب کردیا جائے گا

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا أَحْضَرَتْ(١٤)

ہر شخص جان لے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے

جب سورج لپیٹ دیا جائے گا

سب سے پہلے سورج کا ذکر کیا گیا ہے جس سورج کی روشنی اور حرارت پر زندگی کا دارومدار ہے۔ اسے لپیٹ لیا جائے گا اور اس کی روشنی ختم ہوجائے گی اور اس پر اندھیرا چھاجائے گا

۲: اور جب ستارے بے نور ہوجائیں گے

ستارے بے نور ہوجائیں گے اور بکھر جائیں گے چونکہ نظام شمسی میں سورج کی بڑی اہمیت ہے جب

نظام کی بندشیں ختم ہوجائیں گی تو سورج دم توڑ دے گا اس کے ساتھ تمام ستارے جو اس کے نظام سے وابستہ ہیں بے نور ہوکر ختم ہوجائیں گے۔

۳: اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے

چونکہ جب تمام مخلوقات جیسے سورج، زمین، ستارے اور سیاروں کی کشش ثقل ختم ہوجائے گی تو زمین کے گرنے کے ساتھ ساتھ پہاڑ بھی روئی کی طرح اڑ جائیں گے زمین کی کشش ختم ہونے پر یہ پہاڑ روئی اور بادل کی طرح فضا میں چلتے ہوئے نظر آئیں گے۔

۴: اور جب دس ماہ کی حاملہ اونٹنیاں آوارہ پھریں گی

دس مہینے کی حاملہ اونٹنیاں خوف کے مارے پھریں گھومیں گی۔ نزول قرآن کے وقت عرب میں اونٹ سب سے اہم شئے مانی جاتی تھی اونٹ کو ریگستان کا جہاز مانا جاتا تھا۔ موجودہ زمانے کی ٹرک، بس یا جہاز کو جو سفر اور باربرداری کی اہمیت ہے وہی اہمیت اُس زمانے میں اونٹ کی تھی۔ یہ جو حاملہ اونٹنی کا یہاں ذکر ہے اس کی اہمیت اس وجہ سے تھی کہ دس مہینے کی حاملہ اور بچے کو جنم دینے والی اونٹنی کے انتظار میں عرب کے لوگ لگاتار خدمت گزاری میں مشغول ہوتے تھے اس لیے اونٹنی کی طرف اشارہ ہے کہ جب قیامت برپا ہوجائے گی تو اونٹنی کی حفاظت میں مشغول لوگ (care takers) اس اونٹنی کو اپنے حال پر چھوڑ دیں گے اور خوف زدہ ہوکر اِدھر اُدھر بھاگیں گے۔ یہاں ان لوگوں کے لیے تنبیہہ ہے جو اپنے کاروبار ارو روزگار کی فکر اور ذکر میں مست و مدہوش ہیں اور خوف خدا، یاد الٰہی سے خالی ہیں۔ فانی دنیا کی محبت میں گرفتار ہیں۔ قیامت کی بھاگم بھاگ میں یہ لوگ سب کچھ چھوڑ کر بھاگتے دوڑتے نظر آئیں گے۔

۵: اور جب وحشی جانور اکھٹے ہوجائیں گے

قیامت کے روز جب خوف کے مارے وحشی اور جنگلی جانور ایک جگہ جمع ہوجائیں گے تو نہ وہ ایک دوسرے سے خوف کھائیں گے اور نہ اپنے شکار کا پیچھا کریں گے ان کو صرف اپنی جان بچانے کی فکر ہوگی۔ چھوٹے جانور سے لے کر بڑے جانور تک ہر ایک کو اپنی ہی فکر ہوگی۔ کوئی کسی کی طرف نہ دیکھے گا نہ شکاری جانور اپنے شکار کی طرف دیکھنے کی جرأت کرے گا اور نہ شکار ہونے والا جانور شکاری جانور کو دیکھ کر بھاگے گا کیونکہ اس دن کسی کو کسی کا ہوش نہ ہوگا۔ دنیا میں بھی دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی آفت آتی ہے جیسے کسی جنگل کو آگ لگ جاتی ہے یا کسی بستی میں سیلاب آجاتا ہے تو ہر قسم کے جانور اپنی جان بچانے کے لیے کسی مخصوص اور محفوظ جگہ جمع ہوجاتے ہیں وہاں نہ سانپ ڈستا ہے نہ شیر پھاڑتا ہے خوف و دہشت کی وجہ سے کوئی کسی کی طرف دیکھنے کی زحمت نہ کرتا ہے۔ بس صرف اپنی جان بچانے کی فکر میں ہوتا ہے۔ جب جانوروں کا حال یہ ہوگا تو اس دن انسان کس حال میں ہوں گے۔ اس دن کی یاد دلائی جاتی ہے جس دن قاتل اور مقتول، جابر اور مجبور، ظالم اور مظلوم، سائل اور مسئول، منصف اور انصاف خواہ، حاکم اور محکوم، شاہ اور گدا، امیر اور غریب، طاقتور اور کمزور، غلام اور آقا، افسر اور نوکر اور عام و خاص ایک ہی جگہ جمع ہوں گے کوئی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکے گا نہ کوئی کسی کی طرف دیکھنے کی جرأت کرسکے گا رعب جمانے، ستانے یا ہمدردی جتانے کی کسی کو ہمت نہ ہوگی۔ ہر خاص و عام اپنی ہی فکر میں مشغول ہوگا نہ کوئی بندہ ہوگا نہ کوئی بندہ نواز۔ ایک ہی صف میں کھڑے ہوں گے محمود و ایاز۔ اپنے اپنے عمل کا جواب دینا ہے کوئی کسی کی سفارش کرنے کی جرأت نہ کرسکے گا اور نہ ہی کسی کی سفارش کام آئے گی۔

٦: جب سمندر بھڑکا دیئے جائیں گے

جن لوگوں کو یہ بات عجیب لگتی ہے کہ سمندروں میں آگ بھڑک اٹھے گی انہیں سائنس کی اس حقیقت پر غور کرنا چاہیے کہ پانی کیمیائی طور پر دو گیسوں، آکسیجن اور ہائیڈروجن کا مرکب ہے۔ ایک آگ بھڑکانے والی گیس اور دوسری بھڑک اٹھنے والی۔ اللہ کے اشارے سے یہ دونوں گیسیں (gases) الگ الگ ہوجائیں گے اور پانی کی ترتیب بدل جائے گی اور جس طرح ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم (Atom-bomb - hydrogen bomb) کے ایٹموں کی ایک محدود تعداد کے پھٹنے سے ہولناک آگ پیدا ہوتی ہے سائنس جاننے والے لوگ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں اسی طرح کے عمل سے سمندروں کو بھڑکا دیا جائے گا۔ پانی کے تمام ایٹموں (atoms) کے پھٹنے سے ایک ہولناک آگ پیدا ہوگی جو سمندروں کو بھڑکائے گی اور انہیں ختم کردے گی۔ سمندروں میں جو سونامی (Tsunami) آتی ہے وہ انسانوں کو خوف و دہشت میں مبتلا کردیتی ہے لہٰذا قیامت کے دن سمندروں میں جو سونامی آئے گی کوئی اندازہ نہیں کرسکتا ہے کہ اس کی شدّت کیا ہوگی اور یہ کتنی خوفناک سونامی ہوگی۔

۷: جب جانوں کو (جسموں سے) جوڑا جائے گا

اب قیامت کے دوسرے مرحلے کا ذکر ہے آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جب انسان دوبارہ اسی طرح زندہ کئے جائیں گے جس طرح مرنے سے پہلے وہ جسم اور دماغ کے ساتھ زندہ تھے ان کے جسموں میں روح یعنی جان ڈال دی جائے گی۔ تو وہ میدان حشر میں چلتے پھرتے اور رواں دواں نظر آئیں گے۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اعمال کے لحاظ سے لوگوں کی گروہ بندی کی جائے جیسا کہ سورہ واقعہ میں ہے:

وَ كُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً (آیت:۷) اور تم قیامت کے دن تین گروہوں میں ہوگے وہ تین گروہ یہ ہیں: (۱) دائیں بازو والے (۲) بائیں بازو والے (۳) سبقت لے جانے والے۔ حقیقت میں دائیں بازو والے یعنی نیک عمل کرنے والے اور سبقت لینے والے سب ایمان والوں اور نیکوکاروں میں شامل ہوں گے تاہم جن لوگوں کو ایمان لانے میں سبقت حاصل ہوگی اللہ تعالیٰ نے انہیں الگ گروہ کا نام دیا ہے ورنہ ہر کوئی شخص اپنے عمل کے پیمانے کے لحاظ سے تولا جائے گا۔ اس لحاظ سے سارے مومنین ایک ہی گروہ یعنی دائیں بازو والے گروہ میں شامل ہوں گے۔ رہا سوال بائیں بازو والوں کا تو اس گروہ میں منکرین،

مشرکین، منافقین اور کافرین سب گنہگار شامل ہوں گے۔ ایک اور روایت کے مطابق عملوں کے لحاظ سے دونوں گروہوں یعنی دائیں بازو والے اور بائیں بازو ولے گروہوں کے لوگوں میں ہم عمل اور ہم خیال لوگوں کا علاحدہ علاحدہ گروہ بنایا جائے گا۔ یوں دونوں جماعتوں میں بے شمار گروہ ہوں گے اور گروہوں کے لحاظ سے درجہ بندی ہوگی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ لوگوں کی درجہ بندی ایمان و اخلاق پر ہوگی جو لوگ ایک جیسے اعمال کرتے تھے وہ ایک جگہ اکھٹے کردیئے جائیں گے۔ مثلاً علمائِ دین، مبلغین اور حاملین دین ایک جگہ اکھٹے ہوں گے۔ زاہد و عابد ایک جگہ، مجاہد اور غازی ایک جگہ، صدقہ و خیرات دینے والے ایک جگہ اور اللہ کی راہ میں شہادت پانے والے ایک جگہ جمع ہوں گے۔ اسی طرح بداعمال لوگوں میں چور ڈاکو اور رہزن ایک جگہ، زانی، فحاش، بے شرم اور بے حیا ایک جگہ اور گناہوں میں باہم شریک ہونے والے ایک جگہ جمع ہوں گے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میدان حشر میں ہر شخص اپنی قوم کے ساتھ ہوگا۔ مگر یہ قومیت وطنی یا نسلی نہیں ہوگی بلکہ عمل اور عقیدہ کے لحاظ سے ہوگی۔ نیک عمل کرنے والے ایک قوم اور بد عمل کرنے والے دوسری قوم ہوگی۔ اس لحاظ سے لوگ دو جماعتوں میں حاضر ہوں گے۔ واللہ اعلم۔

۸،۹: اور جب زندہ دفنائی گئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ آخر اسے کس گناہ پر مارا گیا

یہاں رب ذوالجلال غضبناک ہوکر اپنی بیٹیوں کو زندہ دفنانے والے ظالموں پر عتاب فرما رہے ہیں۔ ان ظاہموں کو اللہ تعالیٰ واحد القہار کی صفت میں تنبیہہ فرماتے ہیں لیکن ان سے مخاطب ہوکر اللہ تعالیٰ براہ راست بات نہیں کرتے ہیں بلکہ ان معصوم بیٹیوں سے بات ہورہی ہے جنہیں ان ظالم باپوں نے زندہ درگور کردیا ہے۔ اس گفتگو سے صاف ظاہر ہورہا ہے کہ ان ظالموں پر اللہ تعالیٰ کتنا ناراض ہے کہ ان سے نگاہ پھیر کر مظلوم زندہ دفنائی ہوئی معصوم بچی سے اللہ تعالیٰ ہم کلام ہوں گے اور پوچھا جائے گا کہ اے معصوم بچی ! کس ناکردہ جُرم کی پاداش میں ان ظالموں نے تجھے زندہ زمین میں گاڑ دیا ! ؟ وہ خود اپنے ظلم کی داستان سنائے گی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان ظالموں کی کتنی نفرت ہے جو اپنی بیٹیوں کو پالنے پوسنے کے بجائے زمین کے حوالے کرکے راحت محسوس کرتے ہیں یا اپنے بیٹوں کو بیٹیوں پر ترجیح دے کر ظلم کا شکار بنادیتے ہیں یا انہیں کم درجے کی اولاد سمجھ کر نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

عرب میں لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے کی مختلف وجوہات تھیں۔ ایک یہ کہ معاشی خستہ حالی کی وجہ سے لوگ چاہتے تھے کہ کھانے والے کم ہوں۔ بیٹوں کو چونکہ یہ لوگ معاش کمانے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اس لیے انہیں پیار و محبت سے پالتے تھے اس کے برعکس ان کے خیال سے لڑکیوں کو خواہ مخواہ جوانی تک پالنا پڑتا تھا اور پھر شادی کرکے کسی کے حوالے کرنا پڑتا تھا۔ یہ لوگ بیٹوں کو اپنے حامی و مددگار سمجھتے تھے کیونکہ جنگوں اور لڑائیوں میں یہ ان کے کام آتے تھے۔ اس کے برعکس لڑکیوں کی حفاظت کرنی پڑتی تھی۔ اس لیے یہ لوگ لڑکیوں کو بلائے جان سمجھتے تھے اور اپنی جان چھڑانے کے لیے انہیں ختم کردیتے تھے اور لڑکوں کو اپنی حفاظت کا ذریعہ سمجھ کر بڑی پیار و محبت سے پالتے تھے۔

لڑکیوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے ان لوگوں میں بہت سے طریقے رائج تھے۔ ایک طریقہ یہ تھا کہ لڑکی پیدا ہوئی تو اسی وقت گڑھا کھود کر اسے زندہ دفن کیا جاتا تھا۔ اگر اس طرح کے فعل بد میں کوئی رکاوٹ آتی تو پانچ چھ سال تک اسے زندہ رہنے دیتے تھے پھر کسی بہانے گھر سے لے کر گڑھا کھود کر لڑکی کو زبردستی اس میں پھینک دیتے تھے اور اس طرح اس لڑکی کو ختم کرکے اس سے نجات پاتے تھے۔ جاہلیت میں اس طرح کے ظلم کی داستان ایک شخص خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یوں بیان کرتا ہے کہ میری ایک بیٹی تھی جو مجھ سے بہت پیار کرتی تھی ایک روز میں نے اسے اپنے ساتھ لے لیا اور راستے میں ایک کنواں دیکھا چونکہ میں نے مار ڈالنے کے لیے ہی اپنی معصوم بچی کو گھر سے نکالا تھا اس لیے موقع کو غنیمت پاکر اس کے ہاتھ پاؤں پکڑ کر کنویں میں پھینک دیا۔ اس معصوم بچی کی آخری آواز جو میرے کانوں تک پہنچ گئی یہ تھی۔ میرے ابا میرے ابا میں کنویں میں گِر گئی میں نے اپنے کان بند کردئے اور اپنی اس ظالمانہ کاروائی پر خوش ہوا۔ معصوم بچی چیختے چلاتے مجھے پکار رہی تھی مگر اس معصوم بے چاری کو کیا معلوم تھا کہ اپنے ہی بے رحم باپ نے اسے اپنے ہاتھوں سے کنویں میں ڈال دیا۔ اس بے رحم اور بے درد باپ کا واقعہ سن کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم رو پڑے۔

بچوں کو والدین کے ساتھ جو شفقت اور دل لگی ہوتی وہ اس واقعہ سے معلوم ہوتی ہے جو ایک موقع پر سامنے آیا کہ ماں بچے کو مارتی ہے تو یہ معصوم بچہ اپنے آپ کو اپنی ماں کی گود میں ہی محفوظ پاتا ہے اس کی جبلت(instinct) اسے رہنمائی کرتی ہے کہ وہ اپنی ماں کے پاس محفوظ ہے اس لیے وہ اس مصیبت میں بھی اپنی ماں کی طرف ہی آتا ہے جو اسے مارتی پیٹتی ہے۔ اور پھر جب ماں بچے کو گلے لگاتی ہے تو بچہ خاموش ہوجاتا ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایک ماں سے بچہ چھین لیا گیا تو ماں اپنے بچے کی تلاش میں ایک پاگل کی طرح گھومتی پھرتی نظر آئی تب تک اسے قرار نہ ملا جب تک اسے اپنا بچہ واپس نہ ملا۔ بچے اور والدین کے رشتے اور پیار و محبت کے باوجود عرب کے معاشرے میں بچیوں کو زندہ دفنانے کا بے رحم طریقہ موجود تھا اور لڑکیوں کی نسل کشی کی بیماری ان کے سماج میں اس طرح پیوستہ ہوچکی تھی کہ اپنی لڑکی کو زندہ زمین بوس کرنے پر باپ کے چہرے پر اُداسی کے بجائے مسکراہٹ ہوتی تھی۔

عورتوں پر ظلم ڈھانے کے بھی بہت طریقے رائج تھے۔ مثلاً کسی عورت کا شوہر مرجاتا تو اسے دوسری شادی کرنے سے منع کیا جاتا تھا کوئی یتیم بچی اگر کسی کے سرپرستی میں ہوتی تھی تو وہ اسے جوان ہونے پر بھی شادی کرنے سے روکتا تھا تاکہ بیوی کے مرجانے کے بعد وہ اس سے شادی کرلے۔ اہل عرب کو جاہلیت اور اخلاقی پستی کا احساس دلایا گیا ہے کہ وہ اپنی اولاد کو زندہ دفن کرتے ہیں اور پھر اپنی ان گھناونی، ظالمانہ اور قابل نفرت حرکات پر فخر کرتے ہیں کہ ہم باعزت اور باوقار قوم ہیں، ہم سے بڑا کوئی نہیں ہے اور سرہلاتے زمین پر چلتے پھرتے ہیں۔

یہ اسلام کی خیروبرکت ہے جس نے نہ صرف اس سنگ دلانہ اور شرمناک رسم کا خاتمہ کیا بلکہ اس غلط فہمی کو دور کردیا کہ بیٹی کی پیدائش مصیبت ہے۔ اسلام نے یہ تعلیم دی کی بیٹیوں کی پرورش کرنا اور انہیں اچھی تعلیم وتربیت دینا بہت بڑی نیکی ہے۔ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑکیوں کے بارے میں اس غلط تصور کو جس طرح بدل ڈالا اور عورتوں کے حقوق کو بحال کرکے بلند درجہ عطا کیا اس طرح کی مثال دنیا میں کہیں موجود نہ ہے۔ اس تناظر میں قرآن و حدیث کی روشنی میں چند ارشادات نقل کئے گئے ہیں۔

۱) جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خوش خبری دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑجاتا ہے اور وہ غم کھا رہا ہوتا لوگوں سے چھپا پھرتا ہے اس بری خبر پر جو اسے سنائی جاتی ہے (سوچتا ہے) کہ کیا وہ ذلت کے باوجود اسے رہنے دے یا اسے مٹی میں دبادے کیسے برے ہیں فیصلے جو یہ کرتے ہیں۔ (القرآن سورہ النحل:۵۸-۵۹)

۲) ارشاد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہے: جس مسلمان کے ہاں دو بیٹیاں ہوں، وہ ان کو اچھی طرح رکھے تو وہ اسے جنت میں پہنچائیں گی۔ یہ ہے لڑکیوں کے متعلق اسلام کی تعلیم جس نے نہ صرف عرب میں بلکہ دنیا کی ساری قوموں میں عورت کو عزت کا مقام بخشا اور اس تعلیم کی بدولت عورتوں کو سماج میں ایک اعلیٰ مقام نصیب ہوا۔ اسلام کی اس تعلیم سے ہی عورتوں کے حقوق کو اخلاقی اور قانونی تحفظ مل گیا۔ عورتوں کا قتل عام (genocide) جو (female foeticide) حمل گرانے (abortion) یا جنین کو تباہ کرنے (destruction of fetus) کے ذریعے عمل میں لایا جاتا ہے۔ اسلامی شریعت نے اس پر پابندی لگادی اور اسے اخلاقی طور پر گناہ کبیرہ اور ظلم عظیم قرار دیا۔ قانونی اور فقہی طور پر بھی یہ بات واضح کردی گئی کہ حمل گرانا حرام ہے اور قانونی جرم بھی ہے۔ فقہی طور یہ بات بھی واضح کردی گئی کہ جب حمل چار ماہ کا ہوجائے اس وقت اسے جان بوجھ کر ضائع کرنا ممنوع ہے کیونکہ میڈیکل سائنس میں علم جنین (Embriyology) کے مطابق قرار حمل کو چوتھے مہینے میں جان آجاتی ہے اکثر فقہا کی رائے ہے کہ چار مہینے کا حمل گرانا قتل میں شامل ہے اور چار مہینے پہلے کا حمل گرانا بھی حرام ہے۔ مگر شریعت کے لحاظ سے ہر قسم کی حمل گرانی قطعًا حرام ہے کیونکہ یہ قتل عام (genocide) ہے۔

۱۰: اور جب اعمال نامے کھولے جائیں گے

انسان دنیا میں جو کچھ کرتا ہے اسے محفوظ کیا جاتا ہے۔ اس طرح انسان کے سارے اعمال (activities) قولاً اور فعلاً ریکارڈ ہورہے ہیں جیسے کہ موجودہ دور میں سائنس کی ایجادات سے انسان کے تمام اقوال اور افعال آواز اور تصویر کے ساتھ ریکارڈ کئے جاتے ہیںاور محفوظ بھی رکھے جاتے ہیں۔ اس لیے آج کے انسان کے لیے اس حقیقت کو تسلیم کرنا آسان ہے۔یہی اعمال نامے قیامت کے دن کھولے جائیں گے۔ ہر کسی کا اعمال نامہ پیش کیا جائے گا۔ اس دن انسان حیران ہوکر کہے گا یہ کیسا اعمال نامہ ہے جس میں انسان کا کوئی قول اور فعل چھوٹا یا بڑا چھوڑا نہیں گیا ہے اور میری زندگی کا ذرہ برابر عمل بھی محفوظ ہے۔یہ معاملہ انسان کے لیے شدید تکلیف دہ ہوگا۔ کتنی چھپی ہوئی ایسی برائیاں ہوتی ہیں جنہیں بیان کرنے سے انسان شرماتا ہے۔ اگر اس کی چھُپی ہوئی برائی لوگوں کے سامنے آتی ہے تو شرم سے پانی پانی ہوتا ہے لیکن قیامت کے دن انسان اپنے کسی بھی عمل کو چھُپا نہیں سکے گا اور نہ ہی اس کے پاس چھپانے کا اختیار ہوگا۔ انسان کا نفس اور اس کا ضمیر بھی اس پر بے دریغ ملامت کرے گا جو اب تک خاموش تھا۔ اس لیے یہ دن انسان پر بہت بھاری ہوگا۔

۱۱) اور جب آسمان کا پردہ ہٹایا جائے گا

آسمان کو کھول دیا جائے گا یہ دن وہ ہوگا جب آسمانوں کی تمام مخلوقات، اجرام فلکی، ستارے، سیارے، سورج اور چاند ختم کردئیے جائیں گے۔ اس کائینات کے متعلق سائنس کا انکشاف ہے کہ ایک دن کائینات کا یہ نظام درہم برہم ہوجائے گا اور تمام اجرام فلکی اور کہکشان کا سلسلہ کشش ثقل سے ٹوٹ جائے گا اور کائینات میں موجود تمام چیزیں نیست ونابود ہوجائیں گی کائینات میں صرف ایک سراب دکھائی دے گا۔ سائنس کی اس حقیقت سے قرآن مجید کی اس آیت کی تصدیق ہوتی ہے: كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ (الرحمٰن:۲۶) (کائنات کی) ہر چیز فنا ہوجائے گی۔یہی قیامت ہے اس دن اللہ تعالیٰ تمام مرے ہوئے اور سڑے ہوئے مخلوقات کو زندہ کرکے اٹھائے گا۔ واللہ اعلم۔

۱۲: اور جب جہنم کو بھڑکایا جائے گا

میدان حشر میں جب لوگ جمع ہوں گے اور جواب دہی کے انتظار میں ہوں گے جہنم کافروں اور خدا کے نافرمان بندوں کے لیے بھڑکایا جائے گا۔ اپنے اپنے عملوں کے مطابق ہر کسی کو معلوم ہوجائے گا کہ کس کا ٹھکانا کہاں ہے۔ جہنم کے حقدار اور خریدار جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ سے خوف زدہ ہوں گے وہ جان لیں گے کہ انہیں اس آگ میں جلنا ہے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔ انہیں قرآن کی اس آیت پر یقین آئے گا۔ فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِی وَقُودُ هَا النَّاسُ وَالحِجَارَةُ اُعِدَتْ لِلْكٰفِرِيْنَo

پس ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

جہنمی اپنا ٹھکانا دیکھ کر خوف زدہ ہوجائیں گے۔ ان کا حال اس بھیڑ کی طرح ہوگا جس کو اگر ایک بھیڑیا کے سامنے رکھا جائے تو وہ بھیڑیا کے ڈر سے تب تک چلاتا رہے گا جب تک بھیڑیا اسے اپنے شکم میں ڈال کر ہضم نہ کردے۔ اسی طرح جہنمی اس وقت تک جہنم کی آگ سے کانپتے رہیں گے جب تک جہنم ان کو اپنی لپیٹ میں نہ لے۔ تاہم واضح رہے کہ بیچارہ بھیڑ تو بھیڑیے کی پیٹ میں جاکر ہضم ہوگیا اور اس نے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پایا لیکن بد قسمت اور بد بخت جہنمی جہنم میں جاکر ختم نہیں ہوجائے گا بلکہ قرآن کے مطابق وہ جہنم میں ہمیشہ رہے گا کیونکہ اس کے لیے اللہ کا وعدہ ہے: فِی نارِ جَهَنَّمَ خَالِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا۔ یعنی جہنم میں جاکر وہ ہمیشہ کے لیے جلتے رہیں گے۔

۱۳: اور جب جنت کو قریب کردیا جائے گا

اس کے برعکس جنت کو اللہ کے فرمانبردار بندوں کے قریب لایا جائے گا وہ اپنا ٹھکانا دیکھ کر مسکرائیں گے وہ جنت میں داخل ہونے کے لیے بے تاب اور بے قرار ہوں گے اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ کتنے عرصہ تک جنت اور جہنم محشر کے میدان میں جلوہ گر ہوں گے اور پھر جنتی اور جہنمی اپنے اپنے ٹھکانوں میں پہنچ جائیں گے لیکن اس دوران جہنم میں جانے والے خوف و دہشت میں بتلا ہوں گے اور جنت میں جانے والے جنت کے نظاروں سے دل بہلاتے رہیں گے دراصل اللہ تعالیٰ منکروں، متکبروں اور نافرمانوں کو ان کے تکبر، انکار اور نافرمانی کی وجہ سے جہنم کے خوف سے ڈرا کر مار مار کے جہنم میں ڈلوائیں گے۔ اس لیے اس میں داخل ہونے سے پہلے انہیں اس کا نظارہ کرایا جائے گا اور ایمان لانے والوں 'اپنے فرمانبرداروں' کو خوشی سے جھومتے ہوئے جنت میں داخل کردیں گے۔ اس لیے اس میں داخل ہونے سے پہلے جنت ان کے سامنے لائی جائے گی جسے دیکھ کر مومنین مسکراتے ہوئے اپنے ٹھکانے میں تشریف لے جائیں گے جس میں انہیں ہمیشہ کے لیے رہنا ہے۔

احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ جنت کے حق داروں کو جنت میں داخل ہونے سے زیادہ دیر تک روکا نہیں جائے گا۔ جنت ان کے سامنے لائی جائے گی اور خوش قسمت جنت کے حق دار مسکراتے ہوئے اس میں داخل ہوں گے۔ ان سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ انہیں جنت میں ہمیشہ رہنے کے لیے داخل کیا جائے گا۔ انہیں وہاں نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی غم ان پر لگاتار اللہ کی رحمت برستی رہے گی۔ کیسا مقام اور کیسا ٹھکانا ہے جنت، جسے ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کے لیے تیار رکھا گیا ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ یہ ٹھکانا صرف ان لوگوں کو حاصل ہوگا جو یقین رکھتے ہیں کہ اللہ کا وعدہ حقیقت ہے خواب نہیں۔

۱۴: ہر شخص جان لے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے

قیامت کے دن ہر کسی کو معلوم ہوجائے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے۔ ہر کوئی اپنے بوجھ کے ساتھ حاضر ہوگا اور ہر کوئی جان لے گا اس کے بوجھ میں کیا ہے۔ کسی کے بوجھ میں نیکیاں زیادہ اور گناہ کم ہوں گے اور کسی کے بوجھ میں گناہ زیادہ اور نیکیاں کم ہوں گی کسی کی نیکیاں اور گناہ برابر ہوں گے اور کسی کا بوجھ صرف گناہوں سے لدا ہوا ہوگا اور کسی کے بوجھ میں صرف نیکیاں ہی نیکیاں ہوں گی الغرض جس نے دنیا میں جو کچھ بویا اس کا پھل اور کمائی ساتھ لائے گا۔ کوئی کسی کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ ہر کوئی اپنے عمل کے حساب میں مشغول ہوگا ایمان لانے والے اپنے نیک اعمال پر خوش ہوں گے اور ان پر بار بار نظر ڈال کر حساب کرتے رہیں گے لیکن خدا کے نافرمان گنہگار ناراض ہوکر اپنے سیاہ کرتوتوں کو بھول جانے کی کوشش کریں گے لیکن خوف و ڈر کے عالم میں ایسا کرنا ان کے لیے ناممکن ہوگا۔

فَلَآ أُقۡسِمُ بِٱلۡخُنَّسِ(١٥)

پس نہیں! قسم کھاتا ہوں میں پیچھے ہٹ جانے والے ستاروں کی

ٱلۡجَوَارِ ٱلۡكُنَّسِ(١٦)

چلنے والوں اور چھپ جانے والوں کی

وَٱلَّيۡلِ إِذَا عَسۡعَسَ(١٧)

اور رات کی جب وہ رخصت ہونے لگتی ہے

وَٱلصُّبۡحِ إِذَا تَنَفَّسَ(١٨)

اور صبح کی جب وہ سانس لیتی ہے

إِنَّهُ لَقَوۡلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ(۱۹)

بے شک یہ قرآن رسول کریم کی زبانی ہے

سورہ کے دوسرے حصے میں کائینات کے حسین و جمیل مناظر کی قسم کھا کر ان حقایق سے پردہ اٹھایا گیا ہے جن پر کافرین و منکرین اعتراض کرتے تھے۔ وہ لوگ نزول قرآن کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خود ساختہ کلام قرار دے کر لوگوں کو گمراہ کرنے کی سعی لاحاصل کرتے تھے۔ ایسے راہ گم کردہ لوگ ہر دور میں رہے ہیں۔یہ دراصل ایک روشن دن میں اندھوں کی طرح بھٹکتے پھرتے ہیں۔ انہیں اپنی اصلاح اور بہتری کی فکر نہیں بلکہ اپنی جھوٹی سیادت اور قیادت کی فکر ہوتی ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن کامیاب ہوا تو ان کی سرداری جو جھوٹ اور گمراہی پر قائم ہے خاک میں مل جائے گی۔ اس وجہ سے قریش نے قرآن کے خلاف مخالفت کا محاذ کھڑا کردیا اور بہتان تراشی کے ذریعے حاملین قرآن کی کردار کشی پر اتر آئے۔ مخالفت کا پروپگنڈہ کرنے والے لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے کہا کرتے تھے کہ یہ قران جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کا کلام بتاتا ہے اس کا اپنا کلام ہے یہ اس کی اپنی باتیں ہیں یہ کوئی رسول نہیں بلکہ ہمارے کاہنوں کی طرح ایک کاہن ہے۔ کاہنوں کے متعلق ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ جنات ان کے پاس غیب کی خبریں لاتے ہیں۔ دوسری بات جو انہوں نے مشہور کردی تھی، یہ تھی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا رابطہ نعوذباللہ شیطان سے ہے جو آپؐ کو اپنی باتیں بتاتا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان باتوں کو وحی کا نام دے کر پیش کرتے ہیں۔

۱۵ تا ۱۹ : پس نہیں، قسم کھاتا ہوں میں پیچھے ہٹ جانے والے ستاروں کی

چلنے والوں اور چھپ جانے والوں کی

اور رات کی جب وہ رخصت ہونے لگتی ہے

اور صبح کی جب وہ سانس لیتی ہے

بے شک یہ قرآن رسول کریم کی زبانی ہے

سب سے پہلے ڈوبنے والے یا چھپ جانے والے ستاروں کی قسم کھائی گئی ہے۔ ستاروںکی قسم شاید اس لیے کھائی گئی ہے (واللہ اعلم) کہ کافروں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کاہن قرار دیا ہے کاہنوں کے علم کی بنیاد ستاروں سے وابستہ مانی جاتی تھی اور ان کا خیال تھا کہ آسمانوں میں ستاروں کے پاس جنوں کا ٹھکانا ہے جو وہاں سے کاہنوں کو غیب کی خبریں پہنچاتے ہیں۔ اس لیے قرآن میں اللہ تعالیٰ نے ستاروں کی کیفیات کی قسم کھاکر ان الزامات کو بے بنیاد قرار دے دیا کہ ستارے اللہ کے حکم کی تعمیل میں اپنے فرائض انجام دیتے۔ یہ اللہ کی متحرک بے زبان اور فرمانبردار مخلوق ہیں جو ذرہ برابر نافرمانی نہیں کرتے ہیں اور نہ ان سے کوئی بُری حرکت عمل میں آسکتی ہے اور نہ کوئی ان ستاروں کے پاس آجاسکتا ہے اگر کوئی جن یا شیطان عالم بالا میں جانے کی کوش کرتا ہے تو وہ ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتا ہے۔ سورہ ملک آیت: ۵ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَجَعَلْنَاهَا رُجُوماً لِّلشَّيَاطِينِ

بے شک ہم نے آسمان دُنیا کو چراغوں سے آراستہ کیا اور ہم نے انہیں شیطانوں کو مار بھگانے کا ذریعہ بنایا ہے۔

سورج کے ڈوبنے اور نمودار ہونے سے دن اور رات بنتے ہیں، دن اور رات کے آنے جانے میں انسانوں کی زندگی کا نظام مضمر ہے۔ کائینات کا ذرہ ذرہ اللہ کے حکم کی تعمیل کرتا ہے۔ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ۔ اور سب اپنے اپنے مدار پر چل رہے ہیں۔ کسی آفاقی مخلوق کو ذرہ بھر اپنی پوزیشن سے انحراف کرنے کی جرأت نہیں ہے۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی ستارہ انسان کی تقدیر کی کوئی ادنیٰ سی خبر بتاسکے۔ جو لوگ علم نجوم کا دعویٰ کرتے ہیں اور لوگوں کی قسمت کا فیصلہ سنادیتے ہیں ان کے لیے یہ شعر کافی ہے۔

وہ ستارہ کیا بنائے گا میری تقدیر کا جو ستارہ ایک ذرہ ہے کسی تصویر کا

انسانوں کی قسمت بننے یا بگڑنے پر ستاروں کے اثرات اور جن و شیطین کی عالم بالا سے خبریں لانے کے مفروضات کی تردید کرکے اور رات اور صبح کا اپنے رب کے مقرر کیے ہوئے پختہ نظام کا پابند ہونے کی دلیل دے کر اللہ تعالیٰ اس بات کی ضمانت اور بشارت دیتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کاہن نہیں بلکہ اللہ کے رسول ہیں اور ان پر جو قرآن نازل ہورہا ہے وہ جنات اور شیاطین سے محفوظ ہے۔یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس سیرت بھی بیان کی گئی ہے اور ان کے پاس خدا کا پیغام لانے والے پیامبر کا مرتبہ بھی بیان کیا گیا ہے۔ قرآن کو ایک بزرگ پیامبر پیغام لانے والے کا کلام فرمایا گیا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قرآن پیغام لانے والے کا قول ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قران اللہ کا قول ہے اور پیغام لانے والے کی زبان سے ادا ہورہا ہے۔پیغامبر کے لفظ سے ہی یہ غلط فہمی دور ہوجاتی ہے کیونکہ پیغامبر پیغام لانے کے لیے نہ کہ خود احکامات دینے کے لیے آئے ہیں۔

ذِیۡ قُوَّۃٍ عِنۡدَ ذِی الۡعَرۡشِ مَکِیۡنٍ(۲۰)

جو مالکِ عرش (اللہ تعالیٰ) کے ہاں صاحب قوت اور اونچا مرتبہ والا ہے

مُطَاعٍ ثَمَّ اَمِیۡنٍ(۲۱)

وہ امین ہے اس کی بات مانی جاتی ہے

یہ وحی لانے والے پیغامبر حضرت جبریلؑ کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں فرمایا جارہا ہے کہ اللہ کا پیغام لانے والا ایلچی جو اللہ کا پیغام اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچاتے ہیں، اللہ کے ہاں بلند مرتبہ والا اور قوت والا ہے۔ آسمانوں میں اس کی بات مانی جاتی ہے۔ یعنی وہ فرشتوں کا سردار ہے۔ شیطانی قوتوں کی مجال نہیں کہ وہ اس عظیم اور قوت والے فرشتے کے نزدیک آنے کی ہمت کرسکیں اللہ کا یہ خاص فرشتہ قرآن مجید کی ایک ایک آیت بالکل انہی الفاظ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بہ صحت و سلامت پہنچا دیتے ہیں جن الفاظ میں اللہ تعالیٰ سے حاصل کرتے ہیں۔یہاں اللہ تعالیٰ اپنے

اس خاص فرشتے حضرت جبریل کی دیانت امانت اور حفاظت کی سرٹیفکیٹ (certificate) یعنی صداقت نامہ پیش کرتے ہیں تاکہ منکروں اور کافروں کی زبانوں کو نزول قرآن کی مخالفت اور بے بنیاد الزامات کے لیے بند کیا جائے۔

وَمَا صَاحِبُكُم بِمَجْنُونٍ(۲۲)

اور تمہارا یہ ساتھی کوئی دیوانہ نہیں

وَلَقَدْ رَآهُ بِالْأُفُقِ الْمُبِينِ(۲۳)

بلاشبہ اس نے اس (پیغام لانے والے) کو روشن اُفق پر دیکھا ہے

۲۲: اور تمہارا یہ ساتھی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کوئی دیوانہ نہیں ہے

اہل مکہ کو احساس دلایا گیا ہے کہ جس شخص کو آپ مجنون یا دیوانہ قرار دیتے ہیں وہ کوئی غیر اور اجنبی نہیں بلکہ وہ آپ کا ساتھی ہے۔ رسالت کے دعویٰ سے پہلے جو چالیس سال انہوں نے آپ کے ساتھ گزارے ہیں اس چالیس سال کی عمر کے خاکہ پر نظر ڈالیئے اور ان کی پاک سیرت کو غور سے دیکھئے کہ جس شخص کو آپ مجنون یا دیوانہ کہتے ہیں اُس شخص کو آپ کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ وہ کس قدر دانا، ہوشمند اور سچا انسان ہے جس نے عمر بھر نہ کبھی جھوٹ بولا اور نہ کسی کو دھوکا دیا ہے۔ اب ایسی بے ہودہ باتیں کرنے سے آپ لوگوں کو شرم آنی چاہیے۔

۲۳: بلاشبہ اس نے اس پیغام لانے والے کو روشن افق پر دیکھا

اب ان لوگوں سے فرمایا جارہا ہے کہ جس شخص کی سچائی اور دیانت داری سے آپ واقف ہیں وہی شخص اگر آپ سے کہتا ہے کہ انہوں نے عرش مجید پر اس فرشتے کو دیکھا ہے جو ان کے پاس اللہ کا کلام لاتا ہے تو آپ ان پر یقین کیوں نہیں کرتے ہیں۔ بے شک انہوں نے اللہ کے اس قاصد حضرت جبریلؑ کو افق پر دیکھا ہے جو ان کے پاس اللہ کا کلام لاتا ہے۔ حضرت جبریل علیہ السلام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبار اپنی اصل شکل میں دیکھا ہے۔ سورہ نجم میں ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریلؑ کو اپنی اصلی صورت میں سِدرۃ المنتہیٰ کے پاس دیکھا ہے۔ روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی بار جبرائیل کو دیکھا تو آپ حیرت زدہ رہ گئے۔ ان کا پُرجلال وجود اور ان کے پَر پورے آسمان پر چھائے ہوئے تھے جس رسول نے ان چیزوں کا مشاہدہ کیا ہو ان پر جنوں اور دیوانگی کا الزام لگانا اور کاہنوں سے تشبیہ دینا سراسر نادانی ہے اور عقل اس بہتان کو گمراہ کُن اور بے بنیاد قرار دیتی ہے۔

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ(۲۴)

اور یہ (رسول) غیب بتانے میں ذرا بھی بخیل نہیں ہے۔

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطَانٍ رَّجِيمٍ(٢٥)

اور یہ (قرآن) کسی شیطان مردود کا کلام نہیں ہے۔

فَأَيْنَ تَذْهَبُونَ(٢٦)

پھر تم کدھر چلے جارہے ہو۔

إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ(٢٧)

یہ قرآن اہل جہاں کے لیے ایک نصیحت ہے۔

لِمَن شَاءَ مِنكُمْ أَن يَسْتَقِيمَ(٢٨)

ہر اس شخص کے لیے جو تم میں سے سیدھی راہ پر چلنا چاہتا ہے۔

وَمَا تَشَاؤُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ(٢٩)

تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوگا جب تک اللہ رب العالمین نہ چاہیے

۲۴: اور یہ (رسول) غیب کی باتیں بتانے میں ذرا بھی بخیل نہیں ہے

غیب کی باتیں بتانے میں یعنی قران کو لوگوں تک پہنچانے میں یہ رسول بخیل نہیں ہے۔ یعنی وہ اللہ کے کلام میں سے کوئی بات چھُپا کر نہیں رکھتے ہیں چاہیے وہ بات اللہ کی ذات وصفات کے بارے میں ہو یا جنت اور جہنم کے بارے میں ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ صفت اعلیٰ ہے کہ وہ اللہ کی کسی بات کو نہیں چھپاتے ہیں اس کے برعکس کاہنوں کو کوئی علم غیب نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی انہیں اللہ کے ساتھ کوئی رابطہ اور واسطہ ہوتا ہے اس لیے وہ صرف اپنے من کی باتیں ایک خاص شاطرانہ طریقے سے لوگوں کو بتادیتے ہیں اور ان باتوں سے نادان لوگ دھوکہ کھاکر انہیں علم غیب کے معلم قرار دیتے ہیں۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن باتوں اور جس قرآن کو لوگوں کے سامنےپیش کرتے ہیں ان میں چھپانے کی کوئی بات نہیں ہوتی ہے اس لیے رسول بلارکاوٹ ان باتوں کو لوگوں تک پہنچا دیتے ہیں۔

۲۵: اور یہ قرآن کسی شیطان مردود کا کلام نہیں ہے:

اس سے پہلے فرمایا گیا ہے کہ قران ایک بلند پایہ فرشتے کی زبان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا جاتا ہے اب اللہ تعالیٰ اپنے کلام قران کے بارے میں پھیلائی جارہی مزید غلط بیانیوں کو دور فرماتے ہیں کہ یہ کلام کسی شیطان کا کلام نہیں ہوسکتا ہے کیونکہ شیطان انسان کو شرک، بت پرستی، الحاد اور خدا بے زاری، بری صحبت، برے اخلاق وعادات اور بے شرمی کی تعلیم دیتا ہے۔ لیکن اللہ کے رسول ایسی تعلیم دیتے ہیں جو تمام برائیوں کی جھڑ کاٹ دیتی ہے اور جس تعلیم سے تمام جاہلانہ رسم و رواج، ظلم وجبر، بداخلاقی اور بدکرداری جیسی رذائل کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ خدا پرستی اور انسان دوستی وجود میں آتی ہے یہ ایسی تعلیم ہے جس سے ایک صاف ستھرا معاشرہ تعمیر کیا جاسکتا ہے۔ جس سے انسان کو امن و سکون کی زندگی حاصل ہوسکتی ہے۔ ایسی تعلیم سے شیطان کو کوئی کام نہیں ہے بلکہ ایسی تعلیم شیطان اور اس کے مشن کے خلاف ہے اور اس کے لیے باعث عذاب ہے۔ جس آدمی کے پاس تھوڑی سی عقل بھی ہو تو وہ اس الزام کو یکسر رد کر دیتا ہے۔

۲۶: پھر تم کدھر چلے جارہے ہو

یعنی تم لوگ بہکاوے میں کیوں آتے ہو تم حقیقت اور سچائی کو کیوں نہیں سمجھتے ہو۔ کیا تمہیں کھرے اور کھوٹے کی پہچان نہیں ہے تمہیں سچ اور جھوٹ کی تمیز نہیں ہے کیا تمہارے دماغوں میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہے؟ کیا تمہیں سیدھے اور صاف راستے پر چلنے کی خواہش نہیں ہے؟ اگر ایسا نہیں اور نہیں ہونا چاہیے تو پھر تم لوگ ٹھوکریں کھا کر کہاں جا رہے ہو؟ تم لوگ رحمان کے راستے سے ہٹ کر شیطان کے راستے کو کیوں اختیار کرتے ہو!؟ تم حق سے منہ موڑ کر کدھر جا رہے ہو! یاد رکھو کہ تم جدھر بھی جاؤ گے حق تمہارا پیچھا کرے گا۔ تم اس سے اپنے آپ کو چھڑا نہیں سکتے ہیں۔

۲۷: یہ قرآن اہل جہاں کے لیے ایک نصیحت ہے

۲۸: ہر اس شخص کے لیے جو تم میں سے سیدھی راہ پر چلنا چاہتا ہے

قرآن ایک عالمی دعوت ہے جو سب جہاں والوں کے لیے یکساں ہے لیکن اس نصیحت سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو اس نصیحت کو قبول کرنے کی خواہش رکھتے ہیں اور جو ہدایت کے طلب گار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے ہدایت کا راستہ متعین کر رکھا ہے۔ اب اس راستے پر چلنا انسان کا کام ہے۔ اس پر کسی کو زبردستی نہیں چلایا جا سکتا ہے۔ البتہ جو راہ ہدایت پر چلنا چاہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرماتا ہے اور جو راہ ہدایت سے منہ موڑتا ہے اور اپنے آپ کو شیطان کے حوالے کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ ایسے شخص سے ناراض ہو کر منہ پھیرتا ہے اور اسے اس کے انجام بد پر چھوڑ دیتا ہے۔

۲۹: تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوگا جب تک اللہ رب العالمین نہ چاہے

اب سورہ کے آخر میں اللہ تعالیٰ اپنی مشیت بیان فرماتے ہیں جو سمجھنے کے لیے نازک مگر حکمت سے لبریز ہے۔ اس حقیقت کا اظہار اس طرح کیا گیا ہے کہ بندے کا کوئی بھی کام بندے کی اپنی مشیت اور مرضی کے مطابق ظہور میں نہیں آتا ہے بلکہ ہر کوئی کام اُسی وقت پائیہ تکمیل کو پہنچتا ہے جب اس میں اللہ کی مرضی شامل ہو۔ اگر دنیا میں انسان کو کسی چیز پر پوری قدرت اور اختیار حاصل ہو اور وہ جو چاہیے کر گزرے تو اس طرح دنیا کا نظام درہم برہم ہوجائے گا۔ اس لیے انسان کی مشیت و مرضی پر اللہ تعالیٰ کی مشیت اور مرضی غالب ہے اور انسان وہی کام کرسکتا ہے جس میں اللہ کی حکمت اور مشیت شامل ہو۔ اس طرح انسان خود اپنے بل بوتے پر ہدایت نہیں پاسکتا ہے جب تک اللہ کو اسے اپنی حکمت و مصلحت کی بنا پر ہدایت دینے کی خواہش نہ ہو۔ مثلاً اگر کسی شخص نے ہدایت پاکر کوئی نیک راستہ اختیار کیا پھر اس نیک راستے پر چل کر اسے ناقابل برداشت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور وہ ان مشکلات کا سامنا نہ کرسکا اور ہمت ہار کر اس نے اس نیک کام اور صحیح راستے کو چھوڑ دیا اور پھر سے گمراہی کا راستہ اختیار کیا تو اس کا اپنی مرضی سے ہدایت حاصل کرنا لاحاصل ثابت ہوا یہ اس لیے ہوا کہ خدا نے اسے اپنی مرضی پر چھوڑ دیا تھا۔ اگر اللہ کی مشیت اس کے ایمان میں داخل ہوتی تو وہ راہ ہدایت سے واپس نہ آتا بلکہ ہدایت پاکر اللہ کی راہ میں اپنی جان تک قربان کردیتا کیونکہ اللہ کو اس کے صبر اور بے صبری کا علم تھا جس کی بنیاد پر اسے ہدایت مل جاتی تھی اسی طرح ضلالت کا راستہ اختیار کرنے کا بھی ایک انسان کو پورا اختیار نہیں بلکہ جب اللہ تعالیٰ اس کے اندر گمراہی کی طلب پاتا ہے تو اسے غلط راستوں پر چلنے دیتا ہے لیکن اللہ کی مرضی کے مطابق یہ سب کچھ کرتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی کی جان لینا چاہتا ہے یا کسی کی جائیداد کو تباہ کرنا چاہتا ہے یا کسی کو بے عزت کرنا چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی عظیم حکمتوں اور مصلحتوں کے مطابق وہ شخص صرف اتنا کرسکتا ہے جتنا اللہ کی مرضی ہو ورنہ انسان اپنی مرضی کے مطابق دنیا میں تباہی اور بربادی کی ہلچل مچادے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہی ہے کہ اس نے فرشتوں کو اپنے احکام کی غیر مشروط طور پر تعمیل کرنے کی صلاحیت بخشی اور انہیں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے کے علاوہ کوئی اختیار نہیں دیا۔ لیکن اس کے برعکس انسانوں کو قدرت بخشی کہ وہ ہدایت و ضلالت کے دو راستوں میں سے ایک راستہ اختیار کرسکتے ہیں۔ اہل ایمان پر اس حقیقت کو واضح کردیا گیا ہے کہ وہ خدا کی مشیت کو سب کچھ جان کر اس کا دامن پکڑ لیں اور اسی کے طالب ہوں اور جو راہ وہ اختیار کریں یا چھوڑ دیں ہر حال میں خدا سے مدد مانگیں اب ایک اور

الجھن کو دور کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی وہ یہ ہے کہ مشرکین کہتے ہیں اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے۔ سورہ انعام میں اللہ تعالیٰ اس کا جواب دیتے ہیں فرماتے ہیں:

فَلَوۡ شَآءَ لَهَدٰىكُمۡ اَجۡمَعِيۡن اگر وہ (اللہ) چاہتا تو سب کو ہدایت دیتا

مگر خدا تعالیٰ علیم و حکیم ہے وہ خوب جانتا ہے کہ کون ہدایت کا طالب ہے اس کو ہدایت دیتا ہے او رکون ہدایت کو ٹھکراتا ہے اسے وہ گمراہ کردیتا ہے۔ لہٰذا اس حقیقت کےپیش نظر طالب ہدایت کو چاہیے کہ اس قرآن کا عامل بن جائےیہی نجات کا ذریعہ ہے اور ہدایت کا راستہ ہے۔

سورۃ الانفطار

اٰیٰتُھا:۱۹ رُکوعُھا: ۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

إِذَا السَّمَاءُ انفَطَرَتْo وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انتَثَرَتْo وَإِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْo وَإِذَا الْقُبُورُ بُعْثِرَتْo عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَأَخَّرَتْo يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِo الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَo فِي أَيِّ صُورَةٍ مَّا شَاءَ رَكَّبَكَo كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُونَ بِالدِّينِo وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَo كِرَامًا كَاتِبِينَo يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَo إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍo وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍo يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّينِo وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَo وَمَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الدِّينِo ثُمَّ مَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الدِّينِo يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ۖ وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلَّهِo

پس منظر

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اگر کوئی شخص اپنی آنکھوں سے قیامت کا منظر دیکھنا چاہتا ہے تو وہ سورہ تکویر، سورہ انفطار اور سورہ انشقاق پڑھ لے۔ ان تینوں سورتوںکے پڑھنے سے انسان محسوس کرتا ہے کہ وہ قیامت کے مرحلوں میں شامل ہوچکا ہے جس کا وہ نظارہ کررہا ہے۔

سورہ کی پہلی پانچ آیتوں میں قیامت کا نقشہ کھینچا گیا ہے اس کے بعد کی تین آیتوں میں انسان کو اپنی تخلیق پر نظر ڈالنے اور غور وفکر کرنے کی تلقین ہے۔ اگلی چار آیتوں میں اس امر کی صراحت کی گئی ہے کہ انسان جزا و سزا کو جھٹلانے کی وجہ سے اپنے رب کریم کا باغی ہوچکا ہے، حالانکہ معاملہ یہ ہے کہ اس کی زندگی کا پورا ریکارڈ اللہ کے مقرر کیے ہوئے فرشتے مرتب کررہے ہیں۔ پھر دو آیتوں میں فرمانبرداروں کے لیے جنت کی نعمتوں کا وعدہ دیا گیا ہے اور نافرمانوں کو جہنم کا خوف دلایا گیا ہے۔ اس کے بعد سورہ کی آخری آیات میں قیامت برپا ہونے کی کامل اور بھرپور یقین دہانی کی گئی ہے۔ اس روز کسی کو کسی کے معاملے میں دخل اندازی کی اجازت نہ ہوگی اور نہ کوئی کسی کے کام آئے گا سارا اختیار اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہوگا تمام تراحکامات اور فرمان اسی کے ہوں گے۔

انسان کو اپنی وقعت، اہمیت اور قدر و منزلت جو اللہ تعالیٰ نے اسے دوسری مخلوقات کے مقابلے میں زیادہ بہتر انداز سے عطا فرمائی ہے یاد دلائی گئی ہے اور اسے اس پر غور کرنے کی تلقین فرمائی گئی ہے کہ اسے اللہ نے ایک ٹھیک ٹھاک شکل و صورت میں بنادیا ہے۔ اسے بناوٹ کے لحاظ سے دوسرے جانداروں کی بہ نسبت بہترین صورت میں پیدا کیا۔ اس کے اعضاء اس انداز سے بنائے کہ ان اعضاء سے وہ کوئی بھی کام حیوانوں کے مقابلے میں بہتر طور پر انجام دے سکتا ہے۔ اس کا دماغ تمام حیوانوں سے بہتر بنایا اور اسے سب جانداروں سے زیادہ عقل دی۔ حیوان اپنا دماغ صرف کھانے پینے اور شہوات جیسے کچھ جسمانی حرکات کے لیے استعمال کرسکتا ہے لیکن انسانی دماغ کو اللہ تعالیٰ نے اتنی وسعت دے رکھی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہر ایک چیز پر غور وفکر کرسکتا ہے اور نئی نئی چیزوں کی ایجاد کرسکتا ہے یہاں تک کہ اس نے اپنے دماغ کے صحیح استعمال سے انسانی زندگی میں ایک بہت بڑا انقلاب برپا کردیا جبکہ حیوانوں کا دماغ وہیں پہ ہے جہاں سے اس نے اپنی زندگی کا آغاز کردیا ہے۔ اس لیے انسان پر ایک بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے جس کا اسے احساس دلایا گیا ہے کہ وہ اپنی ساخت اور اپنی دماغی صلاحیتوں پر غور کرے اور اپنے رب یعنی اللہ تعالیٰ کی صحیح بندگی کرے جس نے اسے اس طرح کی بناوٹ میں پیدا کیا اور اس طرح کا دماغ اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت عطا فرمادی۔

إِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ(۱)

جب آسمان پھٹ جائے گا

وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ(۲)

اور جب تارے بکھر جائیں

وَإِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ(۳)

اور جب سمندر پھاڑ دیئے جائیں گے

وَإِذَا الْقُبُورُ بُعْثِرَتْ(۴)

اور جب قبریں کھول دی جائیں گی

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَأَخَّرَتْ(۵)

ہر شخص جان لے گا کہ اس نے آگے کیا بھیجا ہے اور پیچھے کیا چھوڑا ہے

۱، ۲: جب آسمان پھٹ جائے گا۔ اور جب تارے بکھر جائیں گے

سورہ تکویر میں فرمایا گیا ہے جب آسمان کا پردہ ہٹایا جائے گا یہاں اس سورۃ میں فرمایا گیا ہے جب آسمان پھٹ جائے گا۔ قران مجید میں کئی جگہوں پر آسمان پھٹ جانے کا ذکر ہے۔ سورہ الرحمٰن میں ہے۔ ''آسمان پھٹ کر لال چمڑے کی طرح سرخ ہوجائے گا''۔ سورہ حاقہ میں ہے ''آسمان پھٹ جائے گا اور تارے بکھر جائیں گے'' سورہ انشقاق میں ہے ''جب آسمان پھٹ جائے گا''

آسمان پھٹ جانے سے کیا مراد ہے اور پھٹنے کی کیا کیفیت ہوگی حتمی طور اس پر کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے البتہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آسمان میں اجرام فلکی، سورج، ستارے، سیارے اور کہکشان وغیرہ تمام مخلوقات میں جو آپس کی بندش، کشش ثقل (gravitational pull) ہے وہ ختم ہوجائے گی جس کی وجہ سے یہ تمام آسمانی اجرام بکھر جائیں گی۔ اور کائینات کا یہ موجودہ نظام ختم ہوگا اور امرِ الٰہی سے دوسرا نظام قائم ہوجائے گا۔

انسانوں کو اس حقیقت پر غور وفکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے کہ آج جو آپ یہ کائینات کا نظام ایک مضبوط اور منظم صورت میں دیکھ رہے ہیں۔ یہ سورج کا ڈوبنا پھر نمودار ہونا، دن اور رات کا وجود میں آنا اور رات میں چمکتے ستارے جو آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ایک دن آئے گا کہ اللہ کی مرضی سے یہ سب کچھ آناً فاناً تہس نہس ہوجائے گا۔ یہ سورج، چاند، تارے اور ستارے جن کا تم روزانہ نظارہ کرتے ہو، منتشر ہوکر ہوا میں اُڑجائیں گے اور پھر ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائیں گے۔

۳: اور جب سمندر پھاڑ دئے جائیں گے

زمین پر موجود تمام سمندر پھاڑ دیے جائیں گے۔ سورہ تکویر میں فرمایا گیا کہ سمندروں میں آگ بھڑکادی جائے گی۔ یہاں فرمایا گیا ہے کہ سمندروں کو پھاڑ دیا جائے گا۔ اس کا ایک مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ سمندر ابل پڑیں گے اور زمین کے سارے خشک حصے پانی میں ڈوب جائینگے پھر یکایک بخارات میں تبدیل ہوکر فضا میں غائب ہوجائیں گے دوسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ پانی کے دو عناصر (elements) آکسیجن (oxygen) اور ہائیڈروجن (hydrogen) کی کیمائی تجزیہ کاری (Chemical analysis) ہوگی، جس دوران ہائیڈروجن گیس ، جوکہ بھڑکنے والی(combustible)ہے میں آگ لگ جائے گی اور آکسیجن، جوکہ بھڑکانے میں مدد کرنے والی گیس (supporter of combustion) ہے، اس ہائیڈروجن گیس کو مزید بھڑکائے گی اور اس آگ کی وجہ سے سمندر پھٹ جائیں گے او راس طرح ان کا خاتمہ ہوجائے گا۔ یہ تباہی ایسی خطرناک ہوگی جس کے مقابلے میں ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کی ذرہ برابر حیثیت نہیں۔ الغرض کہ سمندر اس طرح پھٹ جائیں گے جو انسانوں کے علم میں نہ ہو اور یہ

معاملہ صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ واللہ علم۔

۴: اور جب قبریں کھول دی جائیں گی

جب لوگوں کو ازسرنو زندہ کرکے اٹھایا جائے گا۔ تمام مرے ہوئے اور سڑے ہوئے لوگوں کو قبروں سے نکال کر میدان حشر میں جمع کیا جائے گا۔ جو جہاں پر پڑا اور سڑا ہوگا، وہ وہیں سے زندہ ہوکر حاضر ہوجائے گا چاہے اس کی قبر پانی ہو یا خشکی یا درندے یا پرندے کا پیٹ ہو یا کسی اور ذریعہ سے اس کی راکھ مٹی میں ملی ہو، جہاں جس جگہ جس انسان کا مادہ زمین میں پڑا ہے، اُسے اللہ نے محفوظ رکھا ہے وہاں سے وہ نئی زندگی پاکر اللہ کے حکم سے کھڑا ہوگا اور یوں سب فوج درفوج نکل آئیں گے۔ یہ وہی دن ہوگا جس دن کی فکر کرنے کی انسان کو تلقین کی گئی ہے اور اسے غفلت کی نیند سے بیدار کیا گیا ہے کہ جس حقیقت کا اس وقت تو انکار کرتا ہے اُسی حقیقت کا کل تجھے اعتراف کرنا پڑے گا لیکن اس وقت نہ کوئی راہ فرار پائے گا نہ جائے قرار۔

۵: ہر شخص جان لے گا کہ اُس نے آگے کیا بھیجا ہے اور پیچھے کیا چھوڑا ہے

انسان نے دنیا میں جو کچھ کیا ہوگا اُس سب کو وہاں موجود پائے گا اور جو کچھ اس نے نہیں کیا ہو وہ بھی اسے یاد آئے گا۔ یعنی دونوں ommissions-commissions یعنی کیا ہوا اور بھولا ہوا اسے معلوم ہوجائے گا۔ جو اچھے اور برے اعمال آدمی نے اپنی زندگی میں کیے ہوں وہ مَاقَدَمَت۔ آگے بھیجا ہوا ہے۔ اور جو اعمال اچھے یا برے پیچھے چھوڑ گیا ہو یعنی انجام دینے سے چھوڑ دیے ہوں وہ مَااَخَرَت۔ پیچھے چھوڑا ہوا عمل ہے۔ یہ وہ دن ہوگا جس دن آدمی سے پوچھا جائے گا کہ یہ زندگی جو آپ کو ملی تھی خدا کی بندگی کے لیے ملی تھی۔ اللہ کے فرمانبردار بندے اور نافرمان بندے دونوں اپنے اپنے اعمال کو جان لیں گے۔ خیر کے عمل کا ایک ایک ذرہ اور شر کے عمل کا ایک ایک ذرہ انسان اپنے سامنے پائے گا اور چیخ اٹھے گا کہ ہائے یہ کیسی عجیب کتاب ہے جس میں کسی بھی بڑے یا چھوٹے عمل کو نہیں چھوڑا گیا ہے۔ بلکہ ذرہ برابر عمل بھی درج کیا گیا ہے۔ یہ بھی مراد ہے کہ جو بھی خیر یا شر کا عمل انسان نے پیچھے چھوڑا ہو وہ بھی انسان کے اعمال نامہ میں جمع کیا جائے گا۔ مثلاً اگر کسی نے کوئی نیک کام کیا ہو۔ اسلام کی اشاعت اور تبلیغ کے لیے کوئی دینی ادارہ قائم کیا ہو جہاں لوگ قرآن اور علم دین سیکھ رہے ہوں یا کوئی خیراتی ادارہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد کے لیے قائم کیا ہو جہاں سے مسکینوں اور لاچاروں کی بازآبادکاری کی جارہی ہو، جب تک یہ ادارہ قائم رہے گا تب تک اس کے قائم کرنے والے کو مرنے کے بعد بھی اس کا ثواب ملتا رہے گا اور وہ اس نیک عمل کے ثواب کو اپنے کھاتے میں اضافے کے طور پر پائے گا۔ اسی طرح اگر کسی نے ایسا کام کیا ہو جو دین کے خلاف تھا یا جس سے انسانوں کو تکلیف پہنچتی تھی تو جب تک دنیا میں اس کی اس حرکت کے اثرات باقی رہے ہوں گے، تب تک اس برے کام کا وبال اس کے اعمال نامے میں جمع ہوتا رہے گا۔ اگر اس نے کوئی فتنہ برپا کیا ہوگا تو جب تک وہ فتنہ زمین پر برقرار رہے گا تب تک اس فتنے کا وبال اس کے کھاتے میں جمع ہوتا رہے گا۔ اسی طرح اگر کسی نے کوئی شرک کا اڈہ قائم کیا ہوگا تو جو بھی شرکیہ کام اس جگہ انجام پاتے رہیں اس کے گناہ شرک کا اڈہ قائم کرنے والے کے سر چڑھتے رہیں گے اور قیامت کے دن وہ اس برے عمل کو اپنے اعمال نامے میں پائے گا۔ اس لیے دونوں صورتوں میں یہ اعمال نیک ہوں یا بد اس کے دنیا میں کئے ہوئے اعمال کے ساتھ جوڑ دیئے جائیں گے اگرچہ اس کے ذاتی اعمال کا ریکارڈ (record) اس کی موت کے ساتھ ہی بند ہوچکا ہے۔ نیک عمل کرنے والے کو خوشی محسوس ہوگی کہ

اس کے نیک عملوں میں اور بھی اضافہ ہوا اور بد عمل کرنے والے کو مایوسی اور پچھتاوا ہوگا اور وہ اپنے آپ سے ناراض ہوگا۔

اسی طرح انسان کے اگلے پچھلے سب کام کا جائزہ لیا جائے گا تاکہ انصاف کا تقاضا پورا ہوجائے۔

يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ(٦)

اے انسان آخر کس چیز نے تجھے تیرے رب کے بارے میں دھوکہ دیا ہے جو بہت کرم کرنے والا ہے

الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ(٧)

جس نے تجھے ٹھیک ٹھاک پیدا کیا اور تجھے متناسب بنایا

فِي أَيِّ صُورَةٍ مَّا شَاءَ رَكَّبَكَ(٨)

پھر جس شکل میں تجھے چاہا سنوارا

كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُونَ بِالدِّينِ(٩)

ہرگز نہیں، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ تم جزا وسزا کو جھٹلاتے ہو

٦: اے انسان آخر کس چیز نے تجھے تیرے رب کے بارے میں دھوکہ دیا ہے جو بہت کرم کرنے والا ہے

اللہ تعالیٰ انسان سے مخاطب ہوکر اسے احساس دلاتے ہیں کہ یہ انسانیت ہی ہے جس سے وہ تمام مخلوقات میں معزز و بزرگ ہے جس کی وجہ سے اسے تمام مخلوقات پر برتری حاصل ہے اور وہ بلند

ترین مقام پر فائز ہے اور اسی وجہ سے وہ اشرف المخلوقات کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہاں ایک مؤثر انداز میں اللہ تعالیٰ انسان کی غفلت کی ملامت کرتے ہیں کہ اے انسان آخر کس چیز نے تجھے اللہ سے گمراہ اور بے خبر کردیا ہے؟ کیا تو اس وجہ سے غافل ہوا کہ تیری غلطیوں اور نافرمانی پر اللہ تعالیٰ تجھے فوراً سزا نہیں دیتا ہے اور تو سمجھتا ہے کہ تجھے پکڑنے والا کوئی نہیں ہے اور ایک بے لگام اونٹ کی طرح جس کھیت میں چاہو جا کر پیٹ بھرو یا یہ سمجھ کر اپنے آپ کو اور دوسروں کو دھوکے میں ڈالتے ہو کہ کھاؤ پیو اور ناچ لو کون جانتا ہے کہ کل پھر سے اٹھنا ہے۔ Eat, drink and dance who knows there is tomorrow.

حضرت عمرؓ سے جب پوچھا گیا کہ کس چیز نے انسان کو اللہ سے غافل کردیا ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ انسان کو اپنی جہالت اور شیطان کے وسوسے نے اللہ سے غافل کررکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اپنی جہالت، لاعلمی، خود غرضی، تکبر اور من مانی اللہ کی راہ سے گمراہ کردیتی ہے۔

اللہ تعالیٰ انسان سے اس کی گمراہی کی وجہ جاننے کے لیے سوال نہیں کرتے ہیں۔ وہ تو علیم وخبیر ہے جسے ہر چیز کا علم ہے۔ یہ صرف کلام کا حسن اور خوبصورتی ہے کہ ایک بہترین سوالیہ انداز میں انسان کی غفلت پر اسے جھنجھوڑا جارہا ہے کہ وہ جس دھوکے میں ہے اس سے نکلنے کے لیے اللہ کے پیغام کو سن لے اور اس دھوکے سے نکل کر اپنے آپ کو سنوار لے تاکہ اسے آخرت میں نجات ملے گی۔

اللہ تعالیٰ کے عِتاب اور اظہار ناراضگی کے بعد اللہ تعالیٰ انسان کو اس دھوکے سے نکلنے کے لیے اُس کے احسانات کو یاد کرتے ہوئے اپنے ہی وجود پر نظر ڈالنے کی ہدایت دیتے ہیں کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے بہترین شکل وصورت میں بنایا ہے۔

۷: جس نے تجھے ٹھیک ٹھاک سے پیدا کیا اور تجھے متناسب بنایا

اے انسان اللہ نے تجھے ایک بہترین ترکیب سے پیدا کیا۔ تمہارے اعضاء ایک خاص ترتیب و تناسب سے بنائے اور جس صورت میں چاہا اسی صورت میں تجھے درست کیا اللہ تعالیٰ نے دوسرے مخلوقات کے اعضا کے مقابلے میں تمہارے اعضا ایک خاص ڈھنگ سے بنائے اور ہر ایک عضو کی ساخت اس طرح سے ہے کہ خود انسان کی عقل اس کے کام (functions)پر حیران ہے۔ انسان کے جسم کی بناوٹ اور اس کے اندر ہڈیوں کا نظام، جلد کا نظام، ہضم کرنے کا نظام، سانس لینے کا نظام، نسل پیدا کرنے کا نظام، پٹھوں کا نظام، رگوں کا نظام (Nerve system)، کھانے پینے کا نظام اور فضلات خارج کرنے کا نظام، چکھنے سونگنے سننے اور دیکھنے کا نظام جس طرح اللہ نے بنایا ہے حیران کن ہے۔ اگرچہ حیوانوں میں بھی اس طرح کا نظام موجود ہے اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے اعضاء کا استعمال کرکے اپنی غذا حاصل کرتے ہیں تاہم ان کے اعضا کا استعمال اس طرح کا نہیں ہے جس طرح انسان کے اعضاء کا استعمال ہے۔ دراصل اللہ تعالیٰ نے انسان کے جسم میں ایسے اعضاء پیدا کیے ہیں جن کے استعمال سے محسوس ہوتا ہے کہ انسان ایک عجیب و غریب مشین ہے۔ انسان کے ہاتھ پر غور کریں یہ ایک ایسا آلہ ہے جو بہت سادہ مگر بہت تیزی سے کام کرنے والا ہے۔ انسان ہاتھ سے کھانا کھاتا ہے کسی چیز کو اٹھاتا ہے کتاب کو اٹھاتا ہے اور پڑھنے کے لیے اس کے اوراق پلٹتا ہے رقوم گِن لیتا ہے۔ ہاتھ میں قلم اٹھا کر لکھتا ہے۔ آج کل کے زمانے میں کمپیوٹر، موبائیل اور دیگر الیکٹرانک مشینوں کا چلانا ہاتھ کے بغیر ناممکن ہے۔ موبائیل یا لیپ ٹاپ کے سکرین پر ہاتھ کی انگلی سے چھونے (finger touch) سے موبائیل یا لیپ ٹاپ کو آن کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہاتھ سے گھر کا سارا کام انجام دیا جاتا ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ انسان کا یہ عضو حیوان کے مقابلے میں کتنا اہم ہے۔ جسے اللہ نے اپنی بہترین کاری گری سے بنایا ہے۔ انسان کی آنکھ کی ساخت کو دیکھئے۔ آنکھ میں دیکھنے کے حاسّہ، محسوس کرنے کی قوت کو روشی اخذ کرنے کے لیے تیرہ کروڑ پردے ہیں یہ ایک چھوٹی سی گیند (ball) جیسی چیز ہے جو ماتھے میں ناک کے دونوں طرف بلب (bulb) کی طرح فٹ کی ہوئی ہیں۔ آنکھ کے ان دو بلبوں کے درمیان ایک خاص طریقے سے ناک کو فٹ کیا گیا ہے جس کے دو سوراخ ہیں جن سے انسان زندہ رہنے کے لیے سانس لیتا ہے اور چیزوں کی خوش بو یا بدبو محسوس کرتا ہے۔

کان بھی ایک عجیب آلہ ہے اس کے اندر تقریباً چار ہزار کمان جیسے باریک اور نازک ریشے ہوتے ہیں یہ کمانوں جیسے ریشے کسی بھی آواز کو دماغ تک پہنچا دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ دماغ ان آوازوں سے محظوظ ہو کر لطف بھی اٹھاتا ہے اور بے مزہ آوازوں سے نفرت بھی کرتا ہے۔

انسان کے چہرے کے پلیٹ میں ایک خاص اہمیت رکھنے والا منہ (mouth) ایک بہترین ساخت میں بنایا ہے۔ اس کے اندر بولنے اور چکھنے کے لیے زبان اور چبانے کے لیے دانت رکھے ہیں۔ اس کے جسم میں ایسا نظام ہاضمہ بنایا جو ایک لیبارٹری(laboratory) کی طرح کام کرتا ہے۔ اس لیبارٹری میں غذا ہضم ہوکر خون میں تبدیل ہوتا ہے اور خون کا دورہ (blood circulation) سے، جس کی رفتار اوسطاً تین سے چار میل فی گھنٹہ (MPH) ہے، جسم کے ذرے ذرے تک یہ خون پہنچ جاتا ہے۔ جسم میں گوشت کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا جو دل (heart) کہلاتا ہے خون کو پمپ (pump) کرکے سرکولیٹ (circulate) کرنے میں مدد دیتا ہے۔ انسان ایک ایسی نازک مشین ہے کہ اگر کسی سسٹم یانظام میں کوئی رخنہ پیدا ہوجاتا ہے تو جسم بے قرار ہوتا ہے یا پھر انسان دم توڑجاتا ہے۔ انسان کی اسی نازک مشین کی طرف اللہ کا اشارہ ہے کہ اپنے اس نظام پر اگر انسان غور کرلے تو کائنات کے ذرے ذرے میں اسے اللہ تعالیٰ کی کاری گری اور اس کی روشنی دکھائی دے گی۔ یہ ہے انسان کی تخلیق اور اس کی ساخت جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: 'اے انسان کس چیز نے تجھے اس رب الکریم کے بارے میں دھوکے میں رکھا جس نے تجھے پیدا کیا اور تجھے ٹھیک ٹھاک بنایا۔ اُس نے تمہیں ایسی خوبیوں سے نوازا جن سے تجھے حیوانوں پر ترجیح ملی۔ تجھے ایسا دماغ اور ایسی عقل دی کہ تو نے دنیا میں حیران کن ایجادات سے تہلکہ مچادیا۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی عقل سے ہی تجھے اشرف المخلوقات ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ مگر آج کل کی سوشل سائنس(Social science) میں تجھے محض ایک سماجی حیوان (soial animal) اور حیوان ناطق (rational animal) کانام دیا گیا ہے۔ پس اگر تو نے اپنے خالق کو نہیں پہچانا تو تمہاری یہ عقل الٹی تیرے لیے زنجیرِپا بن جائے گی۔ جو آدمی اپنی عقل اور فہم و ادراک کو صرف دنیاوی اغراض حاصل کرنے کے لیے کھپادیتا ہے یا خدا اوراُس کے دین کی مخالفت میں اسے استعمال کرتا ہے۔ کل آخرت میں اللہ رب العالمین کے پاس اس کی یہ عقل اس کے خلاف بیان دے گی اور اللہ سے فریاد کرے گی کہ اے اللہ اس خود غرض نے اپنے ہی پیدا کرنے والے خالق و مالک کے خلاف میرا استعمال کیا۔ اس نے دن رات محنت کرکے میری مدد سے کائینات کی کھوج کی۔ فلسفے اور سائنس کی بڑی بڑی تھیوریا پیش کیں۔ نئی نئی دریافتیں اور نئی نئی ایجادات کیں لیکن جس خدا نے اسے ان چیزوں کو دریافت کرنے اور ایجاد کرنے کی صلاحیت بخشی تھی اُسی کا نہ صرف اس نے انکار کیا بلکہ اس کی بغاوت میں زندگی گزاری۔ دنیا میں سمجھ داری، ذہانت

اور عقل کا دعویٰ کرنے والا ایسا بے دین اور خدا بے زار انسان تب اپنے آپ کو سب سے بڑا نادان اور بے سمجھ پائے گا۔

۹: ہرگز نہیں، اصل بات یہ ہے کہ تم جزا و سزا کو جھٹلاتے ہو

گفتگو کے نئے انداز میں سمجھایا جارہا ہے کہ جو لوگ گمراہی اور دنیا طلبی میں مشغول ہوکر اپنے ربِ کریم کو بھول گئے ہیں۔ ان کی گمراہی اور نافرمانی کی اصل وجہ قیامت اور آخرت کا انکار ہے۔ اس انکار کی وجہ سے یہ لوگ ہدایت کی نعمت سے محروم ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جب تک انسان کو اس بات کا احساس نہ ہوکہ اسے اپنے معاملات اور افعال کا ایک عظیم ہستی ۔۔ اللہ ۔۔ کے پاس جواب دینا ہے تب تک اس کے معاملات اور افعال درست نہیں ہوسکتے ہیں۔ ایک طالب علم کو اگر اس بات پر یقین نہ ہو کہ اسے اپنی پڑھائی کے بعد کسی کے پاس حاضر ہونا ہے جو اس کی پڑھائی کی جانچ کرے گا اور اسے کامیاب یا ناکام قرار دے گا اور کامیابی پر اسے مزدوری ملے گی اور ناکامی پر سرزنش کی جائے گی تو وہ اپنی تعلیم اور پڑھائی پر کوئی توجہ نہیں دے پائے گا۔ اسی طرح ایک مزدور کو اگر یہ احساس نہ ہو کہ میرا آجر میرے کام کا جائزہ لے گا اور میرا مؤاخذہ کرے گا تو وہ کام دلچسپی سے نہیں کرے گا۔یہی معاملہ آخرت کی جواب دہی کا ہے کہ جو شخص اس بات پر یقین ہی نہ رکھتا ہوکہ وہ جو کچھ دنیا میں کرتا ہے اس کا کوئی نگران اور حساب لینے والا ہے تو وہ شخص لازماً ایک بے لگام جانور کی طرح زندگی گزارے گا، جو اپنی مرضی سے جس کھیت میں چاہتا ہے، بلا روک ٹوک چلا جاتا ہے اور اس کا ستیاناس کردیتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ انسان کو روزِ جزا و سزا- قیامت و آخرت کا نہ صرف احساس بلکہ یقین دلاتا ہے کہ وہ روز آخرت پر یقین کے ساتھ ایمان لائے اور نیک اعمال کرکے اپنے آپ کو اس دن کے عذاب شدید سے بچالے اور اس جنت کو پانے کی سرتوڑ سعی کرے، جہاں اسے ہمیشہ آرام کی زندگی گزارنی ہے۔

آخرت پر یقین کے ساتھ ایمان لانے کے بغیر کوئی نیک کام کرنا نہ صرف مشکل بلکہ نا ممکن ہے۔
منافقین کا ایمان اس طرح کا ہوتا ہے کہ جو بات وہ کہتے ہیں اس پر ان کو ایمان نہیں ہوتا ہے ۔ اس ظاہری ایمان میں انہیں سادہ لوح لوگوں کا استحصال کرنا مطلوب و مقصود ہوتا ہے۔ جس میں وہ وقتی طور پر کامیاب بھی ہوتے ہیں۔ اصل میں انہیں آخرت پر یقین نہیں ہوتا ہے۔ لیکن اپنے ذاتی مفاد اور مطلب کےپیش نظر یہ لوگ حقیقت کو چھپاتے ہیں تاکہ لوگوں کا استحصال کرنے کا موقع مل جائے۔ اس میدان میں زیادہ حکمران اور سیاست کار بازی مارتے ہیں۔ ان کا یہ ظاہری ایمان اتنا خوشنما ہوتا ہے کہ مومنین و صادقین بھی ان کے سامنے بظاہر بے بس دکھائی دیتے ہیں۔ ان چال بازوں کی چالیں اتنی مضبوط ہوتی ہیں کہ ان کا مقابلہ کرنا نہایت مشکل ہوتا ہے۔ اور ان کے مکر و فریب کے جال اتنے دلکش اور رنگین ہوتے ہیں کہ سادہ طبیعت کا عام انسان اس میں آسانی سے پھنس جاتا ہے اور دھوکہ کھاتا ہے۔ ان عناصر کا ہمیشہ سے یہی وتیرہ رہا ہے کہ یہ دھوکہ دے کر ہی اپنا مطلب نکال لیتے ہیں۔ ان کی یہ دھوکہ بازی اس لیے بے خوف ہوتی ہے کیوں کہ انہیں آخرت پر یقین نہیں ہوتا ہے۔ لوگوں سے ان کی ہمدردیاں اللہ کے خوف اور آخرت پر ایمان کے باعث نہیں ہوتی ہیں بلکہ ان کی ہمدردیاں دکھاوے کی ہوتی ہیں۔ اس لیے یہ خدا سے بے خوف ہوکر معاملات اور مسائل میں انصاف نہیں کرتے ہیں۔ ان لوگوں سے کہا گیا ہے کہ تم روز جزا کو جھٹلاتے ہو حالانکہ تم کو اس سے دوچار ہونا ہے۔ تم نے دنیاوی زندگی میں جو اعمال کیے ہیں آخرت میں ان کا حساب ہوگا۔ تمہارے اعمال میں سے کوئی شئے ضائع نہ ہوگی اور نہ کوئی شئے فراموش ہوگی۔ کچھ صوفیوں کا کہنا ہے کہ وہ رب کی عبادت اور اطاعت اس کی محبت کے باعث کرتے ہیں نہ کہ عذاب کے خوف اور ثواب کی طمع سے وہ اللہ کی بندگی، معرفت الٰہی و عشق الٰہی کی بنیاد پر کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں نہ کہ جہنم کے خوف سے اور جنت کی لالچ سے، لیکن یہاں واضح طور پر انسان کی نافرمانی کی وجہ آخرت کی تکذیب بتائی گئی ہے۔ اس لیے خدا کے فرمانبردار بندوں کو خدا کی معرفت و محبت کے ساتھ ساتھ آخرت، قیامت اور عذاب الٰہی کا خوف ہونا لازمی قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ عذاب الٰہی کے خوف سے ہی معرفت الٰہی حاصل ہوجاتی ہے اور جہنم کے خوف سے ہی انسان برائیوں سے دور رہتا ہے اور جنت کی خوشبو سے نیکیوں کی طرف دوڑ لگاتا ہے۔

وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ(۱۰)

حالانکہ تم پر نگران مقرر ہیں

كِرَامًا كَاتِبِينَ(۱۱)

جو معزز کاتب ہیں

يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ(۱۲)

وہ جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو

ان آیات میں ان فرشتوں کا ذکر ہے جو انسانوں کے نگران ہیں ہر ایک انسان پر دو نگران مقرر ہیں۔ جو اس کے اعمال کا ریکارڈ نوٹ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اے انسان تم پر نگرانی کرنے والے مقرر ہیں جو بہت معزز ہیں اور انسان کے ہر عمل کو ریکارڈ کرتے ہیں۔ وہ سب کچھ جانتے ہیں جو تم کرتے ہو۔ انسانوں کو احساس دلایا گیا ہے کہ تم آخرت کا انکار کرتے ہو۔ تم اس کا مذاق اڑاتے ہو لیکن تمہارے انکار سے حقیقت نہیں بدل سکتی ہے۔ تمہیں بہرحال خدا کے پاس حاضر ہونا ہے اور اپنے اعمال کے ایک ایک ذرے کا جواب دینا ہے۔ آپ کے اعمال ریکارڈ ہو رہے ہیں۔ اس لیے آپ کے ساتھ معزز و مکرم نگران ہیں۔ جو ہر حال میں تمہارے اعمال (activities) ریکارڈ کر رہے ہیں۔ ان سے تمہارا کوئی کام چھپا ہوا نہیں ہے۔ خواہ تم اندھیرے میں ہو یا روشنی میں۔ تنہائی میں ہو یا ہجوم میں، ہر وقت ہر جگہ تم ان کی نگرانی میں ہو اور یہ لمحہ بھر کی کوتاہی نہیں کرتے ہیں۔ یہ نہ کسی سے محبت رکھتے ہیں اور نہ عداوت، بلکہ کسی خیانت کے بغیر غیر جانبداری سے اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔ ان میں کوئی اخلاقی کمزوری نہیں ہے۔ وہ ہر ایک انسان کی نیکی اور بدی محفوظ (save) کرتے ہیں۔ ان کراماً کاتبین کی یہ خصوصیت ہے کہ جو کچھ تم کرتے ہو وہ اسے جانتے ہیں۔ اسی لیے جو اعمال

و افعال وہ مرتب کررہے ہیںیا ریکارڈ کررہے ہیں۔ اس میں ذرہ برابر کی نیکی یا بدی بھی موجود ہے۔ اسی ریکارڈ(record) کو دیکھ کر قیامت کے روز مجرمین اور گناہگار حیران ہوکر کہیں گے کہ یہ کیسا اعمال نامہ ہے جس میں کسی چھوٹی یا بڑی بات کو نہ چھوڑ دیا گیا ہے۔

یہ کراماً کاتبین انسان کا ریکارڈ کس طرح تیار کر رہے ہیں، کیا وہ کاغذ قلم اور سیاہی کا استعمال کر کے یہ کتاب تحریر کر رہے ہیں۔ اور وہی قیامت کے روز بارگاہ الٰہی میں پیش کریں گے، اس کا علم اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی کے پاس نہیں ہے اور نہ اس کیفیت کو جاننے کی کوشش کرنی چاہیے اور نہ اسے جاننے کی ضرورت ہے کیونکہ یہ معاملہ متشابہات میں ہے۔ اس لیے ان کی تاویلات کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اپنے اطمینان کے لیے ہم دور جدید کے سائنسی علوم کی روشنی میں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے ہیں کہ موجودہ دور میں ایسے آلات بنائے گئے ہیں جن میں نہ صرف انسان کی آواز بلکہ اس کی تصویر تک محفوظ کی جاتی ہے۔ اور ضرورت کے وقت اس کو چلا کر (display) آواز کے ساتھ اس کی تصویر بھی دکھائی جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح محافظوں کی نگرانی میں ہر انسان کے اعمال (actions-activities) ریکارڈ ہو رہے ہوں، جنہیں آخرت میں رب العالمین کی بارگاہ میں ہو بہو پیش کیا جائے گا۔ واللہ علم۔

کراماً کاتبین کے متعلق یہ سوال بھی سامنے آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے۔ انسان کے اقوال اور افعال کی کوئی بات اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس کے باوجود فرشتوں کے ذریعے ریکارڈ مرتب کرنے کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ اس ریکارڈ سے انسان پر اتمامِ حجت ہو جائے یعنی اس کے اعمال و افعال کے سارے دلائل سامنے آجائیں جس طرح دنیاوی عدالت میں ملزم کو سزا دینے سے پہلے اس کے خلاف دائر کیے گئے مقدمہ (دعویٰ) کو ثابت کرنے کے لیے تمام دلائل پیش کیے جاتے ہیں اور گواہوں کو بھی پیش کیا جاتا ہے تاکہ ملزم کو انکار کی گنجائش نہ رہے۔

انسان کے ہر عمل کا ریکارڈ موجود ہے۔ قیامت کے دن اس کے اعمال کا یہ سارا ریکارڈ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کیا جائے گا تاکہ انسان اپنے اعمال کو دیکھ کر انکار نہ کر سکے۔ لکھے ہوئے ریکارڈ کے علاوہ انسان کے ہر عمل پر گواہی بھی پیش ہوگی۔ انسان کے ہر اعضاء اس کے خلاف یا اس کے حق میں گواہی دیں گے۔ جیسا کہ سورہ یس میں ہے:

الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ

آج ہم مہر لگادیں گے ان کے دہانوں پر اور کلام کریں گے ہمارے سامنے ان کے ہاتھ اور گواہی دیں گے ان کے پاؤں اُس پر جو کچھ وہ کرتے تھے۔ (سورہ یٰس آیت:٦٥)

اس آیت کے بارے میں ایک حدیث بیان ہوا۔ ایک ملزم کو جب خدا کی بارگاہ میں کھڑا کردیا جائے گا تو وہ اپنے گناہوں سے انکار کرے گا۔ لیکن جب اس کے اعضاء اس کے خلاف گواہی دیں گے تو وہ اپنے اعضاء پر برس پڑے گا اور کہے گا افسوس تم پر! میں تم کو آگ سے بچانے کے لیے جھوٹ بول رہا تھا لیکن تم نے خود اپنے گناہوں کا اعتراف کیا۔ اس لیے جل جاؤ اس آگ میں جو تمہارے لیے تیار ہے۔

إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ(١٣)

بے شک نیک لوگ مزے میں ہوں گے

وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ(١٤)

اور بے شک بدکار لوگ جہنم میں ہوں گے

يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّينِ(١٥)

جزا و سزا کے دن وہ اس میں داخل ہوں گے

وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ(١٦)

اور وہ اس سے غائب نہیں ہوں گے

وَمَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الدِّينِ(١٧)

اور تم کیا جانو جزا و سزا کا دن کیا ہے!

ثُمَّ مَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ(۱۸)

ہاں، تم نہیں جانتے کہ جزا و سزا کا دن کیا ہے!!

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئاً وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلّٰهِ(۱۹)

وہ دن کہ کوئی کسی کے لیے کچھ بھی سفارش نہ کرسکے گا۔ اس دن فیصلہ اللہ کے اختیار میں ہوگا۔

سورہ کی آخری آیات میں زندگی کے انجام کا ذکر کیا گیا ہے کہ بے شک نیکوکار جنت میں ہوں گے اور بدکار لوگ جہنم میں ہوں گے۔ خدا کے نافرمان بندے جو آخرت اور قیامت کا انکار کرتے ہیں انہیں جہنم میں ڈال دیا جائے گا، کیونکہ ان کے لیے یہی موزون جگہ ہے۔ یہ وہ دن ہے جس دن کوئی شخص بھاگنے کی ہمت نہ کرسکے گا اور نہ ہی کوئی بھاگ سکے گا۔ جو لوگ آج جزا و سزا کو جھٹلاتے ہیں اور اس کا مذاق اڑاتے ہیں قیامت کے دن ان کو معلوم پڑے گا کہ جس دن کا وہ انکار کرتے تھے۔ اسی دن سے انہیں اب واسطہ ہے۔ آخر میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن نہ کوئی کسی کی سفارش کرسکے گا اور نہ کسی کے کام آکر اسے سزا سے بچا سکے گا۔ اس دن ہر معاملے کے فیصلے کا اختیار اللہ واحد القہار وجبار کے پاس ہوگا۔ کوئی بات کرنے کی جرأت نہ کرسکے گا اور نہ سفارش کرسکے گا بِدون اللہ کی اجازت کے۔ اور وہ بات کرنے والا بھی صرف صحیح بات کہے گا۔ (سورہ النباء آیت: ۳۸)

حقیقی حکومت دنیا میں اور آخرت میں اللہ تعالیٰ ہی کی ہے اور حقیقی سرپرست اور مالک بھی وہی ہے۔ تمام انبیاء علیہم السلام نے یہی تعلیم دی ہے۔ اب جو لوگ بدبختی کی وجہ سے دوسروں کو اپنا مالک اور حاکم سمجھتے ہیں وہ شرک عظیم میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی کو اپنا سرپرست ماننا اللہ تعالیٰ کی ذات عظیم کا انکار کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے بغیر کوئی حاجت روائی کرنے والا اور مشکل کشائی کرنے والا نہیں ہے۔ قیامت کے دن معلوم ہوجائے گا کہ دنیا کی زندگی محض ایک امتحان تھی۔ حقیقی مالک تو وہاں بھی خدا تھا اور یہاں بھی وہی مالک ہے۔ اس دن اللہ تعالیٰ پوچھے گا آج بادشاہی کس کی ہے؟ کوئی جواب نہیں دے سکے گا۔ اللہ تعالیٰ خود فرمائیں گے آج اللہ واحد القہار کی حکومت ہے۔ تمام قوتوں کا مالک وہی ہے اس دن انسان بالکل بے بس ہوگا اور وہ دن ایسا ہوگا جب کوئی نفس یعنی انسان کسی چیز کا نہ مالک ہوگا اور نہ کسی کے کچھ کام آسکے گا، تمام ظاہری اور باطنی معاملات اللہ کے ہاتھ میں ہوں گے۔

سورۃ المطففین

اٰیٰتُھا:۳۶ رُکوعُھا: ۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَيۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِيۡنَ o الَّذِيۡنَ إِذَا اكۡتَالُوۡا عَلَى النَّاسِ يَسۡتَوۡفُوۡنَ o وَإِذَا كَالُوۡهُمۡ أَو وَّزَنُوۡهُمۡ يُخۡسِرُوۡنَ o أَلَا يَظُنُّ أُولٰٓئِكَ أَنَّهُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ o لِيَوۡمٍ عَظِيۡمٍ o يَوۡمَ يَقُوۡمُ النَّاسُ لِرَبِّ الۡعَالَمِيۡنَ o كَلَّا إِنَّ كِتَابَ الۡفُجَّارِ لَفِي سِجِّيۡنٍ o وَمَا أَدۡرَاكَ مَا سِجِّيۡنٌ o كِتَابٌ مَّرۡقُوۡمٌ o وَيۡلٌ يَوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ o الَّذِيۡنَ يُكَذِّبُوۡنَ بِيَوۡمِ الدِّيۡنِ o وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ إِلَّا كُلُّ مُعۡتَدٍ أَثِيۡمٍ o إِذَا تُتۡلٰى عَلَيۡهِ آيَاتُنَا قَالَ أَسَاطِيۡرُ الۡأَوَّلِيۡنَ o كَلَّا ؕ بَلۡ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ مَّا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ o كَلَّا إِنَّهُمۡ عَنۡ رَّبِّهِمۡ يَوۡمَئِذٍ لَّمَحۡجُوۡبُوۡنَ o ثُمَّ إِنَّهُمۡ لَصَالُوا الۡجَحِيۡمِ o ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيۡ كُنۡتُمۡ بِهٖ تُكَذِّبُوۡنَ o كَلَّا إِنَّ كِتَابَ الۡأَبۡرَارِ لَفِيۡ عِلِّيِّيۡنَ o وَمَا أَدۡرَاكَ مَا عِلِّيُّوۡنَ o كِتَابٌ مَّرۡقُوۡمٌ o يَشۡهَدُهُ الۡمُقَرَّبُوۡنَ o إِنَّ الۡأَبۡرَارَ لَفِيۡ نَعِيۡمٍ o عَلَى الۡأَرَائِكِ يَنۡظُرُوۡنَ o تَعۡرِفُ فِيۡ وُجُوۡهِهِمۡ نَضۡرَةَ النَّعِيۡمِ o يُسۡقَوۡنَ مِنۡ رَّحِيۡقٍ مَّخۡتُوۡمٍ o خِتَامُهٗ مِسۡكٌ ؕ وَفِيۡ ذٰلِكَ فَلۡيَتَنَافَسِ الۡمُتَنَافِسُوۡنَ o وَمِزَاجُهٗ مِنۡ

تَسْنِيمٍo عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُونَo إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا كَانُوا مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا يَضْحَكُونَo وَإِذَا مَرُّوا بِهِمْ يَتَغَامَزُونَo وَإِذَا انقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمُ انقَلَبُوا فَكِهِينَo وَإِذَا رَأَوْهُمْ قَالُوا إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَضَالُّونَo وَمَا أُرْسِلُوا عَلَيْهِمْ حَافِظِينَo فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَo عَلَى الْأَرَائِكِ يَنظُرُونَo هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَo

پس منظر

مکہ میں جب اسلامی دعوت کا آغاز ہوا تو اس دعوت کو سماج کی بہت سی برائیوں کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑی اخلاقی برائی ناپ تول کی کمی سے بھی واسطہ پڑا۔ اس بُرائی کو جڑ سے اکھاڑنا مسلمانوں کے لیے اولین ضرورت تھی۔ کیونکہ اس برائی کے خاتمے میں لوگوں کو انسانیت کی جھلک نظر آتی اور انصاف حاصل کرنے کی امیدیں بڑھ جاتیں۔ کم ناپ تول کی اس بیماری میں لوگ اس لیے مبتلا تھے کیونکہ انہیں آخرت میں جوابدہی کا کوئی تصور بھی نہ تھا۔ اس لیے اخلاق کے ساتھ عقیدہ آخرت کا تعلق نہایت مؤثر طریقے سے واضح کردیا گیا اور فرمایا گیا کہ بدکاروں کے اعمال جرائم پیشوں کے (criminals) رجسٹر (black list) میں درج ہورہے ہیں اور نیک لوگوں کے اعمال نیکوکاروں کے (lawful) رجسٹر (white list) میں۔ دراصل یہ زندگی انسانوں کو آزمائش کے لیے دی گئی ہے۔ یہ ایک آزمائش گاہ (trial field) ہے جہاں انسانوں کو ان کے اعمال اور کارناموں سے آزمایا جاتا ہے۔ زندگی جدوجہد کا میدان ہے جہاں اچھے لوگوں کی جیت اور بُرے لوگوں کی ہار ہوتی ہے۔

.The life is field of struggle, where goodies win and badies lose

یہ سورہ چار حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ دوسرے حصے میں فجار پر مذمت کا تذکرہ ہے۔ ان کی نافرمانی پر شدید تنقید کی گئی ہے۔ قیامت کے روز ان کی سزا کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ سورہ کے آخری حصے میں فجار کی اس اذیت رسانی، بدتمیزی اور ہنسی مذاق کا تذکرہ ہے جو وہ دنیا میں اہل ایمان کے ساتھ روا رکھے ہوئے تھے اور مومنوں کا وہ نظارہ بھی پیش کیا گیا ہے جب کہ وہ سجے ہوئے تختوں پر بیٹھے کافروں کی بدحالی پر ہنس رہے ہوں گے۔ دنیا میں یہ کافرین و منکرین ان مومنین کا مذاق اڑاتے تھے اب یہ مومنین ان کا مذاق اڑا رہے ہوں گے۔

وَيۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِيۡنَ(۱)

بڑی خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے

الَّذِيْنَ إِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ(٢)

کہ جب لوگوں سے ناپ کرلیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں

وَإِذَا كَالُوهُمْ أَو وَّزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ(٣)

اور جب انہیں ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں

سورۃ کا آغاز ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے خلاف اللہ کے اعلان جنگ سے ہوتا ہے۔ جو خریدنے کی صورت میں چیزوں کو بھرپور لیتے تھے لیکن فروخت کرنے کی صورت میں کم دیتے تھے اور پھر ان لوگوں پر حیرت کا اظہار کیا گیا ہے جو اس طرح کرتے ہیں کہ گویا انہیں خدا کے حضور کوئی جوابدہی نہیں ہے۔ اس لیے بے خوف ہوکر یہ اس عملِ بد کا ارتکاب کرتے ہیں۔یہاں ایک ایسے اخلاقی وقانونی جرم کی اطلاع ہے جو اسلامی نظام کے مطابق پوری زندگی کا احاطہ کرتی ہے اور جس سے اسلامی حکومت کے زیر سایہ زندگی کی تشکیل مقصود و مطلوب ہے۔

مکی سماج میں اسلام کو ناپ تول کی کمی کی تشویشناک صورتحال کا سامنا تھا۔ اس برائی کے مرض میں اکثر بڑے بڑے تجارت پیشہ لوگ مبتلا تھے۔ جن کے اس جرم سے سوسائٹی میں تجارت کے نام پر ایک ظالم طبقہ نے ذخیرہ اندوزی اور اجارہ داری کو فروغ دیا تھا۔ ان بڑے بڑے تاجروں اور ذخیرہ اندوزوں کے ہاتھوں میں عرب کی پوری تجارت تھی۔یہ لوگ یمن اور شام سے تجارتی تعلقات رکھتے تھے اور یہ اثر ورسوخ اور اقتدار والے لوگ ان غریب لوگوں کو اپنی مرضی اور خواہشات کے آگے سر جھکانے کے لیے مجبور کرتے تھے۔ اسی لیے قرآن میں اِکۡتَالُوۡا عَنِ النَّاسِ لوگوں سے ناپ کرلیتے ہیں کے بجائے اِکۡتَالُوۡا عَلَی النَّاسِ لوگوں سے جبراً ناپ کرلیتے ہیں کے الفاظ ہیں ۔ لفظ علیٰ میں جبر کا مفہوم ہے۔ آیت کا مطلب ہے کہ یہ طاقتور لوگ طاقت کے بل بوتے پر ان بے بس لوگوں کو کم دیتے تھے اور ان سے زیادہ لیتے تھے۔ عام لوگوں میں یہ جرأت نہ تھی کہ وہ اپنا حق حاصل کرنے کے لیے ان کے منہ لگ جاتے۔یہ دھاندلی قبیلہ کی قوت، سرداری کی طاقت اور دولت کے بل بوتے پر کی جاتی تھی۔ اور ان کی ذخیرہ اندوزی اور اجارہ داری کے باعث غریب عوام ظلم وجبر سہنے پر مجبور تھے۔ اس ظلم و جبر کی مثال آج کل کے بازاروں میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ ملک کی معیشت اور حکومت کا دارومدار سرمایہ داروں (capitalists) اور اجارہ داروں (monopolists) کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ حکومتوں کو بنانے اور بگاڑنے میں ان کا اہم رول ہوتا ہے۔ عوام اور حکومت دونوں ان کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ الغرض مکی معاشرہ میں ناپ تول کی بددیانتی نے تشویشناک صورت اختیار کرلی تھی ۔ اس لیے اسلام کے آغاز میں ہی اس بداخلاقی اور مجرمانہ حرکت کی طرف توجہ دی گئی۔

ناپ تول کا ذکر ایک بڑے قانون کی حیثیت رکھتا ہے اس زمانے میں تجارت کے لین دین میں Batring تبادلہ جنس (exchange of goods) سسٹم رائج تھا۔ لوگ ایک چیز کے بدلے میں دوسری چیز لیتے یا دیتے تھے۔ اس لیے اس تعصبی (biased) ناپ تول کا ذکر کیا گیا جو سماج میں بنیادی قانون کی حیثیت رکھتا تھا۔معاملہ کو ذرا گہرائی اور گیرائی سے دیکھا جائے تو یہ صرف کاروباری لین دین تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس کا اطلاق زندگی کے ہر شعبے اور معاملے پر ہے اور فرائض کی ادائیگی بھی اس سے منسلک ہے۔ آج کل کے ترقی یافتہ زمانے میں خرید وفروخت اور لین دین میں (internet/online) سسٹم بھی شامل ہے۔ اس لیے اگر کسی کام کو صحیح طریقے پر دیانت داری سے انجام نہ دیا گیا تو یہ تطفّف ہے جو ایک بڑا گناہ ہے۔ حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے بعض اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس تطفیف کو صرف ناپ تول تک ہی محدود نہیں سمجھتے تھے۔ کسی اعرابی شخص کو حضرت عمرؓ نے جلدی جلدی نماز پڑھتے دیکھا تو آپ نے یہ کہہ کر اس کی سرزنش کی کہ تم نے نماز میں تطفیف کی۔ (بحوالہ روح القرآن) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صحیح ناپ تول کا حکم یا ایکٹ زندگی کے ہر شعبے پر میزان کی حیثیت سے لاگو ہوتا ہے۔ بہت سارے موقعوں پر تطفف لفظ کا استعمال کرکے لوگوں کو ان کی خیانت پر ٹوکا گیا ہے۔ اگر کوئی دوکاندار اپنے خریدار (customer) کو خراب (substandard) چیز بہتر (Superfine) چیز کے نام پر یا اونچی قیمت پر بیچ دے تو یہ میزان اور قانون کے خلاف ہے اسے تطفیف کہتے ہیں۔ اشیائے خوردنی میملاوٹ، کام کاج میں لاپروائی عدل و انصاف میں امتیازی سلوک اور امورات کی انجام دہی میں لاپروائی یا خیانت یہ سب تطفیف میں شامل ہے۔ اگر معاشرے کو تطفیف کی لعنت سے دور رکھا جائے تو ایک مثالی معاشرہ اور نظام قائم ہوجائے گا۔

اسلام کی اس اولین ہدایت، میزان اور قانون سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کو اخلاقی قدروں اور حق وانصاف پر قائم رکھنا اسلام کی فطرت اور اسلام کا دستور اور منشور ہے۔یہی وجہ ہے کہ اسلام کو معاشرے میں ظلم اور اخلاقی خرابیاں گوارا نہ ہوئیں۔ حالانکہ اجتماعی زندگی کی کمانڈ ابھی اس کے ہاتھ میں نہ آئی تھی کہ وہ طاقت کے بل بوتے پر شریعت الٰہی کے مطابق نظام کو قائم کرسکتا۔ اس کے باوجود اسلام نے تطفیف یعنی ناپ تول میں کمی کو جُرم قرار دیا۔ اوریہ جرأت مندانہ اقدام اُس وقت کیا گیا جب اس جرم کا ارتکاب کرنے والے معمولی لوگ نہیں تھے بلکہ مکہ کے سردار اور بااقتدار لوگ تھے۔ عام لوگوں پر ان کا نہ صرف اثر و رسوخ غالب تھا بلکہ ذریعہ معاش پر بھی اُن کا تسلط تھا۔ اسلام نے اس لوٹ کھسوٹ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا جبکہ یہ عام لوگ ان استحصالی عناصر کے آگے مجبور و مظلوم تھے جو ان کو سامان زیست کی خریداری میں فریب دہی اور ذخیرہ اندوزی کے ناپاک طریقوں سے لوٹتے تھے اوریہ معاشی لٹیرے ان کے دینی معاملات پر بھی غلبہ رکھتے تھے لیکن اسلام نے ان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس استحصال کے مارے فریب خوردہ عوام کوبیدار کیا اور اسے آسمانی قانون کی طرف متوجہ کیا۔ اسلامی آئین اور قانون کے اس اعلان سے ان حضرات کی آنکھیں کھل جانی چاہیں جو کارل مارکس کمیونسٹ اور اس کےپیروکاروں کی اس بے ہودہ بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ مذہب عوام کی افیون ہے (Religion is the opium of the people) اوریہ ایک جال ہے جو معاشی استحصال کرنے والوں نے غریب عوام کا استحصال (exploitation) کرنے اور فریب دینے کے لیے تیار کیا ہے۔ بہرحال ان تباہ کن حالات میں اسلام نے استحصال کرنے والے طبقے کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ اور معاشرے میں موجود ناانصافی کے اس جُرم کو ختم کیا۔

قریش کے اکابر نے اسلام کے خلاف جو مخالفانہ رویہ اختیار کیا اس کی وجوہات میں یہ احساس بھی شامل تھا کہ اسلام کی دعوت صرف اللہ اور اس کے رسول کے کلمے تک ہی محدود نہیں ہے جس میںبتوں کی پوجا کے بجائے اقامت الصلوٰۃ اور ایک خدا کی بندگی ہے۔ بلکہ وہ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ یہ دعوت اسلامی طرز زندگی کی بنیا دہے جو جاہلیت کی بنیادوں کو مسمار کرکے مبنی بر عدل معاشرے کا قیام چاہتی ہے اور زمینی و انسانی قوانین کے بجائے آسمانی اور ربانی قوانین سے دُنیا کا نظام بدلنا چاہتی ہے اوریہ اسلام کےپیروکاروں کی نہ صرف تصورات اور عقاید کے خلاف بغاوت ہے بلکہ ان کی اجارہ داری، سیاست کاری اور مکاری کے خلاف بھی اعلانِ جنگ ہے۔ اور اس جنگ کی ہار جیت میں ان کی بقا وفنا کا دارومدار ہے۔ اس لیے وہ نہ صرف اپنے عقائد کے دفاع کے لیے، بلکہ اجارہ داری اور سرداری کے بقا کے لیے بھی برسرپیکار تھے۔ کفاریہ بھی جانتے تھے کہ تطفیف صرف ناپ تول تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں بددیانتی یا حق تلفی کا نام تطفیف ہے۔ اس وجہ سے مطففین یعنی خیانت کرنے والےیہ لوگ اسلام کے پاکیزہ اور عادلانہ نظام کے غلبے سے لرزاں اور ہراسان تھے۔

قرآن مجید میں اکثر جگہوں پر ناپ تول میں کمی کرنے کی سخت مذمت کی گئی ہے اور صحیح ناپ تول کی تاکید کی گئی ہے۔ سورہ انعام میں ہے انصاف کے ساتھ صحیح ناپو اور تولو۔ سورہ بنی اسرائیل میں ہے جب ناپو تو پورا ناپو اور صحیح ترازو سے تولو۔ قوم شعیب پر جس جرم کی وجہ سے عذاب نازل ہوا وہ یہ تھا کہ اس قوم کے اندر ناپ تول میں کمی کرنے کا مرض تھا۔ سورہ الرحمٰن میں ارشاد ہے۔ وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَo أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِo اور آسمان کو اس نے بلند کیا اور اس (کائنات) میں میزان قائم کیا۔ تاکہ تم (اے انسانو) میزان میں حد سے تجاوز نہ کرو اور ٹھیک ٹھیک تولو انصاف کے ساتھ اور تولتے وقت گھاٹا نہ دو۔ اس آیت میں اللہ کے میزان سے مراد (اعتدال ہے) یعنی پورا تولنے یا ناپنے کے ساتھ ساتھ زندگی کے ہر شعبے میں اعتدال قائم کریں۔ چونکہ اللہ نے کائنات میں ایک میزان قائم کیا ہے۔ پوری کائنات میں موجود مخلوقات چاند، سورج، ستارے وغیرہ اللہ کے میزان کے مطابق چل رہے ہیں۔ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ۔ اپنے اپنے مدار پر گھوم رہے ہیں۔ اسی طرح انسانی زندگی میں بھی اگر اس طرح کا نظام قائم ہوجائے جس میں ہر کوئی اللہ کے میزان کے مطابق اپنی اپنی ذمہ داری پورا کرے گا تو یہ نظامِ زندگی انسانوں کی خیر خواہی کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ اس لیے ناپ تول کی تطفیف کا اطلاق صرف کم تولنے اور ناپنے پر نہیں بلکہ اس کا اطلاق زندگی کے ہر شعبے پر ہے۔

اکابر مکہ نے اسلامی تحریک کے آفاقی میزان کی جدوجہد کو اپنے لیے خطرہ محسوس کیا۔ اس کے برعکس عام انسانوں نے اس دین کے مزاج کو سمجھ لیا کہ یہ دین تلوار کی طرح عدل وانصاف پر قائم ہے۔ اور انسانوں کی زندگی کو عدل وانصاف پر قائم کرنے کے لیے اُترا ہے۔ یہ کسی ظالم کے ظلم کسی سرکش کی سرکشی اور کسی متکبر کے تکبر کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اور نہ انسانوں کی لوٹ کھسوٹ اور استحصال کو برداشت کرنے کے لیے آمادہ ہے۔ اس لیے ہر ظالم سرکش، متکبر اور استحصال کرنے والا اس دین کے لیے جنگ چھیڑ سکتا ہے۔ اور اس دعوت اور اس کے داعیوں کو ختم کرنے کی کوشش کرے گا۔ لیکن یہ اللہ کی مشیت رہی ہے کہ دین اسلام کو ہر دور میں ایسے افراد مل گئے جنہوں نے اللہ کی میزان اور عدل کو قائم رکھا اور ان شاء اللہ ایسے افراد تا قیامت ملتے رہیں گے جو دین اسلام کو قائم رکھیں گے۔

رسولوں کی رسالت اور آسمانی کتابوں کا مقصد عدل و انصاف قائم کرنا ہے۔ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ وَاَنۡزَلۡنَا مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡمِيۡزَانَ لِيَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ۔

اس آیت سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ انبیا کی دعوت صرف تین نکات توحید رسالت اور آخرت پر ہی نہیں بلکہ اس دعوت کے دو اور نکات ہیں وہ ہیں اخلاقی اقدار اور حقوق العباد۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت ان پانچ نکات پر نمایاں ہے۔

أَلَا يَظُنُّ أُولَٰئِكَ أَنَّهُم مَّبْعُوثُونَ(۴)

کیا انہیں مرنے کے بعد اٹھنے کا خیال نہیں

لِيَوْمٍ عَظِيمٍ(۵)

اس عظیم دن کے لیے

يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ(٦)

جس دن سب لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے

دراصل ان لوگوں کا برائیوں میں ملوث ہونا اس وجہ سے ہے کہ وہ اپنے اعمال کی جوابدہی سے بے خوف ہیں۔ انہیں یقین نہیں کہ ایک عظیم دن آئے گا جبسب انسانوں کو زندہ کرکے اٹھایا جائے گا اور رب العالمین کے سامنے کھڑا کردیا جائے گا۔ اس دن خدا کے سوا ان کا کوئی مولیٰ نہیں ہوگا۔ وہ صرف اللہ کے حضور اپنے فیصلے کے انتظار میں ہوں گے۔ انہیں اب معلوم ہوگا کہ خدا کے سوا ان کا کوئی مددگار نہیں ہے۔ انہیںنئی زندگی کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ جو انسان مرکر مٹی میں مل جاتا ہے وہ دوبارہ زندہ نہیں ہوگا۔ دوبارہ زندہ ہونے کی حقیقت کو یہ لوگ ایک خیال اور Myth سمجھتے تھے۔ اس دُنیا کی زندگی کے علاوہ کوئی اور زندگی نہیں ہے۔ اس لیے موت سے پہلے اس دُنیائی زندگی کا فائدہ اور لطف اٹھانا بہتر ہے۔ چاہے فائدہ اٹھانے کا طریقہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے ایسے لوگ کسی اخلاقی ضابطے کو نہیں مانتے ہیں۔ انہیں بس دنیائی فائدہ مطلوب ہوتا ہے۔ فائدہ غلط طریقے سے پہنچے یا صحیح طریقے سے۔یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ زندگی کے ہر شعبے میں خیانت کرتے ہیں۔ اس لیے انہیں دوبارہ زندہ ہونے اور اپنے اعمال کا جواب دینے کی حقیقت سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ اور ایک دلکش انداز میں ان لوگوں کو آخرت کی یاد دہانی کی جاتی ہے اور ان کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے کہ آخرت کے تصور اور یقین کے بغیر انسان اپنی خواہشات کا اسیر بن جاتا ہے اور وہ اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق جو کچھ چاہتا کرتا ہے چاہے وہ ٹھیک ہو یا غلط۔ اسے صرف اپنے فائدے کی فکر ہوتی ہے۔ انہیں اس بات کا یقین دلایا جاتا ہے کہ تمہیں ایک دن اللہ کے پاس ضرور حاضر ہونا ہے اور ہر چیز اور ہر معاملے کا جواب دینا ہے۔ آخرت پر یقین اور رب العالمین کے پاس جواب دہی کا احساس ہی انسانوں کے لیے رہنمائی پانے اور گناہوں سے بچنے کا ذریعہ ہے۔

كَلَّا إِنَّ كِتَابَ الْفُجَّارِ لَفِي سِجِّينٍ(٧)

یقینا بدکاروں کا نامہ اعمال سجین میں ہے۔

وَمَا أَدْرَاكَ مَا سِجِّينٌ(٨)

تجھے کیا معلوم سجین کیا ہے

كِتَابٌ مَّرْقُومٌ(۹)

یہ لکھی ہوئی کتاب ہے

وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ(۱۰)

اس دن جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہے

کلّا ہرگز نہیں کے الفاظ میں تنبیہ کا لہجہ ہے اور اس لہجہ میں آخرت کا انکار کرنے والوں کو وارننگ دی جاتی ہے اور انہیں ڈانٹ پلائی جاتی ہے کہ آخرت کے انکار سے اور آنکھیں بند کرنے سے آخرت اور قیامت کو ٹالا نہیں جاسکتا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے عملوں کا ریکارڈتیار ہورہا ہے اور اس دفتر میں موجود ہے جسے سجین کہا گیا ہے۔ سجین (prison) ایسا دفتر ہے جہاں تمام مجرمین کے ریکارڈ کو محفوظ کیا جاتا ہے۔ مجرموں کو خبر دی جاتی ہے کہ آپ کے یہ برے اعمال مجرمین کے اس دفتر میں جمع کئے جاتے ہیں۔ اس لیے اپنے اپنے برے اعمال پر نظر ڈالو، اپنے اپنے ضمیر کو بیدار کرو۔ اپنے آپ کا احتساب کرو اور غلطیوں پر نادم ہوکر خدا کی بندگی اختیار کرو۔

کتاب سے مراد نامہ اعمال کا دفتر ہے۔ اس دفتر کی کیفیت کیا ہے ہم اس سے ناواقف ہیں اور واقفیت حاصل کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔ البتہ اس دفتر کی حقیقت پر صرف یقین کرنا ہے اور اس بات پر ایمان رکھنا ہے کہ دنیا میں ہم جو کچھ کرتے ہیں وہ سب کچھ اللہ کے دفتر میں جمع ہورہا ہے۔ منکرین، کافرین اور مشرکین جنہیں فُجار کہا گیا ہے کے اعمال کا ریکارڈ سجین میں محفوظ کیا جاتا ہے۔ یہ قرآن کا اسلوب ہے کہ حقیقت کو سوالیہ انداز میں بیان کیا جائے تاکہ لوگوں کی توجہ حاصل کی جائے اور سجین کی جانکاری اور اس کی ہولناکی بیان کرنے کا مقصد اصلاح کرنا اور آخرت کی جوابدہی کے لیے تیاری کرنا ہے۔

الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ(۱۱)

جو روز جزا کو جھٹلاتے ہیں

وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ(۱۲)

اسے صرف وہی جھٹلاتا ہے جو حد سے زیادہ آگے نکل جانے والا گناہ گار ہوتا ہے

إِذَا تُتْلَى عَلَيْهِ آيَاتُنَا قَالَ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ(۱۳)

جب اس کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو کہہ دیتا کہ یہ اگلوں کے افسانے ہیں

اب قرآن مجید واضح کرتا ہے کہ یہ جھٹلانے والے کس چیز کو جھٹلاتے ہیں جھٹلانے والے کون ہیں اور ان کے جھٹلانے کی وجہ کیا ہے۔

جو لوگ روز جزا کو جھٹلاتے ہیں وہ حدود پار کرتے ہیں۔ لوگوں کے حقوق سلب اور تلف کرنے میں انہیں عار نہیں ہوتی ہے جو ان کے دل میں آئے کر دیتے ہیں۔ جسے مارنا چاہتے ہیں مار ڈالتے ہیں۔ جس کی عزت طاقت کے بل بوتے پر نیلام کرنا چاہتے ہیں کردیتے ہیں۔ طاقت اور اثر و رسوخ کے نشے میں چور یہ مجرمین جس کی عصمت ریزی کرنا چاہتے ہیں، بلا خوف کرسکتے ہیں۔ ان مجرمین کو نہ دنیا میں کسی کا ڈر ہوتا ہے اور نہ آخرت کا خوف۔ دنیا کے قانون سے وہ اس لیے بے خوف ہیں کہ انہیں معلوم ہے کہ ان کی دولت، طاقت، سفارش اور اقتدار کے آگے کوئی ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا ہے۔ ان بے شرم لوگوں کی بے شرمی کی کوئی حد نہیں ہوتی ہے کہ کسی بڑے جرم کے ارتکاب کے بعد بھی انہیں لوگوں کے سامنے آنے میں کوئی دقت نہیں آتی، بلکہ جری بن کر لوگوں کے شانوں پر سوار ہوجاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں انہیں جرائم انجام دینے میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی ہے اور آخرت پر ایمان نہ ہونے کی وجہ سے انہیں آخرت کی فکر بھی نہیں ہوتی ہے۔ اس لیے یہ ایک جنگلی شیر کی طرح اپنا پیٹ بھرنے کے لیے جنگل میں رہنے والے ہر کسی جانور کا شکار کرتے ہیں۔

جب ان لوگوں کے سامنے قرآن کی آیات پڑھی جاتی ہیں تو ان آیات کو یہ لوگ پہلے لوگوں کے افسانے بتاتے ہیں۔ جن لوگوں کو حد سے گزر جانے اور حق تلفی کی بیماری لگ چکی ہے وہ اپنے آپ کو مطمئن رکھنے کے لیے اور دوسروں کو گمراہ کرنے کے لیے قرآن کو اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ، یعنی اگلے لوگوں کے قصے اور افسانے قرار دیتے ہیں۔ چونکہ قرآن میں اگلے لوگوں کے قصے، حالات اور واقعات کے تذکرے عبرت اور نصیحت کے لیے بیان کیے گئے ہیں۔ کافر اور منکر لوگ ان واقعات کا استحصال کرکے لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہ یہ واقعات کچھ نہیں ہیں صرف پہلے لوگوں کے قصے اور افسانے ہیں۔ جنہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود تیار کرکے پیش کرتے ہیں۔

كَلَّا بَلۡ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ مَّا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ(۱۴)

یوں نہیں، بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال کی وجہ سے زنگ چڑھ گیا ہے۔

یہاں منکرین کی سرکشی اور زبان درازی اور ان کے انکار آخرت کی علت بیان کی جاتی ہے کہ دراصل ان کے دلوں پر ان کے بُرے اعمال کا زنگ لگ گیا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے دل بے نور ہوگئے ہیں۔ ان کے گناہوں اور ان کی سیاہ کاری کا پردہ ان کے دلوں پر چڑھ گیا ہے۔ جو دل خدا کی نافرمانی میں ڈٹ جاتا ہے وہ بالآخر بے نور ہوجاتا ہے اور اس پر گناہوں کا زنگ چڑھ جاتا ہے۔ یہ دل اتنا نڈر اور بے خوف بن جاتا ہے کہ اسے نہ خدا کی خدائی نظر آتی ہے اور نہ آخرت کا خیال آتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''بندہ جب گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نکتہ پڑجاتا ہے اگر وہ توبہ کرلیتا ہے تو وہ سیاہی دور کردی جاتی ہے اور اگر توبہ کے بجائے گناہ پر گناہ کئے جاتا ہے تو وہ سیاہی بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ اس کے پورے دل پر چھاجاتی ہے۔ یہی وہ رَین ہے جس کا ذکر قران مجید میں ہے۔ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَى قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ o یہی حال کفار کا ہے جو گناہ پر گناہ کرتے ہیں اور اس طرح ان کے دلوں پر سیاہی چھا جاتی ہے اور یہ سیاہی ایک کالے اژدھے کی شکل اختیار کرلیتی ہے جو ہر اس جاندار کو ڈستا ہے۔ جو کوئی بھی جاندار اس کی گرفت میں آتا ہے اُسے نگل کر ہضم کر لیتا ہے۔ یہی خصلت اس انسان میں پیدا ہوجاتی ہے جو ذکرِ الٰہی اور فکر آخرت سے خالی ہوتا ہے۔

كَلَّا إِنَّهُمْ عَن رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ(١٥)

ہرگز نہیں یہ لوگ اس دن اپنے رب سے اوٹ میں رکھے جائیں گے

ثُمَّ إِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيمِ(١٦)

پھر یہ لوگ بالیقین جہنم میں جھونکے جائیں گے۔

ثُمَّ يُقَالُ هَذَا الَّذِي كُنتُم بِهِ تُكَذِّبُونَ(١٧)

پھر کہہ دیا جائے گا یہی ہے وہ جسے تم جھٹلاتے رہے۔

آخرت کے جھٹلانے والوں کی مذمت کے بعد اب ان کا انجام بیان کیا جاتا ہے۔ چونکہ ان جھٹلانے والوں کے دلوں پر غفلت کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ ان کے دل تاریک ہو چکے ہیں۔ اب یہ دیدار الٰہی سے بھی محروم ہو چکے ہیں۔ قیامت کے دن اللہ اور ان کے درمیان پردہ حائل ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ ان کی کوئی بات نہ سنے گا اور نہ وہ رحم کی اپیل کر سکیں گے کیونکہ اللہ نے ان کے جہنم میں جانے کا فیصلہ کر دیا ہے۔ دُنیا میں ایک بہت بڑا مجرم بھی سزائے موت کے وقت اپنے آپ کو بچانے کے لیے کسی کے تحفظ میں آنا چاہتا ہے یا معافی کی درخواست کرتا ہے۔ یا کسی اتھارٹی کی طرف رجوع کرنا چاہتا ہے جو اسے سزائے موت سے بچا سکے یا وہ اعلیٰ اتھارٹی (higher authority) سے معافی کی درخواست کرتا ہے اور اپنی زندگی کی بھیک مانگتا ہے۔ اسی طرح یہ منکرین بھی کل اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آنے اور معافی کی درخواست کریں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ ان کی درخواست کو مسترد کر دے گا اور اللہ تعالیٰ کے نور کی ایک کرن بھی ان تک نہیں پہنچے گی۔

١٦: پھر یہ لوگ ضرور جہنم میں پڑیں گے۔ یعنی ان لوگوں کو جہنم میں بے یار و مددگار داخل کیا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہ چیز ہے جس کو تم جھٹلاتے تھے۔ اب چکھو اس کا مزہ جو تم نے خدا کی نافرمانی کر کے دنیا میں کمایا ہے اب جہنم سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے اور اس سے بڑھکر ان کے لیے یہ اطلاع ہوگی کہ ان کو جہنم میں ہمیشہ کے لیے رہنا ہے۔ اس پر وہ چیخ و پکار کریں گے لیکن ان کی چیخ و پکار کوئی نہیں سنے گا۔

كَلَّا إِنَّ كِتَابَ الْأَبْرَارِ لَفِي عِلِّيِّينَ(١٨)

ہرگز نہیں، بے شک نیکو کاروں کا نامہ اعمال علیین میں ہے

وَمَا أَدْرَاكَ مَا عِلِّيُّونَ(١٩)

تجھے کیا پتا کہ علیین کیا ہے۔

كِتَابٌ مَّرْقُومٌ(٢٠)

لکھی ہوئی کتاب ہے۔

يَشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُونَ(٢١)

مقرب (فرشتے) اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ(٢٢)

بے شک نیک لوگ نعمتوں میں ہوں گے

عَلَى الْأَرَائِكِ يَنظُرُونَ(٢٣)

سجے ہوئے تختوں پر بیٹھے نظارہ کر رہے ہوں گے۔

تَعْرِفُ فِي وُجُوهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيمِ(٢٤)

تم ان کے چہروں سے ہی نعمتوں کی تری وتازگی (کا اثر) پہچان لوگے۔

يُسْقَوْنَ مِن رَّحِيقٍ مَّخْتُومٍ(٢٥)

یہ لوگ سربہ مہر خالص شراب پلائے جائیں گے۔

خِتَامُهُ مِسْكٌ وَفِي ذَالِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ(٢٦)

جس پر مشک کی مہر ہوگی سبقت کرنے والوں کو اسی میں سبقت کرنی چاہیے۔

وَمِزَاجُهُ مِن تَسْنِيمٍ(٢٧)

اور اس کی آمیزش تسنیم کی ہوگی۔

عَيْناً يَشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُونَ(٢٨)

(یعنی) وہ چشمہ جس کا پانی مقربین پئیں گے

کلّا (ہرگز نہیں) سے کلام کا آغاز گویا قیامت کا انکار کرنے والوں کو انتباہ(warning) ہے کہ تمہارے قیامت کو جھٹلانے سے اللہ کا فیصلہ بدل نہیں سکتا ہے۔ گزشتہ آیات میں بیان ہوا کہ فجار کا نامہ اعمال سجین میں ہے۔ اب ابرار یعنی خدا کے فرمانبردار بندوں کا ذکر ہورہا ہے۔ کہ ان کا نامۂ اعمال علیین میں ہے۔ علیین کا مفہوم بلندی ہے اور سجین کا مفہوم پستی ہے۔ علیین اور سجین دو مختلف جگہیں ہیں۔ علیین کا اونچائی پر واقع ہونے سے اس کی عظمت واضح ہوجاتی ہے۔ اور سجین کا پستی میں ہونے سے اس کی گراوٹ اور ذلالت بیان کرنا مطلوب ہے۔

سجین اور علیین کے متعلق مختلف آرا ہیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی کی رائے ہے کہ سجین کافروں کے روحوں کی جائے قرار ہے اور علیین مومنوں کے ارواح کا مستقر و جائے قرار ہے۔ مولانا شبیر عثمانی کی رائے یہ ہے کہ سجین ایک دفتر ہے جس میں دوزخیوں کے نام درج ہیں اور فرشتے کافروں کے مرنے کے بعد ان کے نام اس دفتر میں داخل کرتے ہیں۔ اور علیین میں مومنوں کے نام ان کے فوت ہونے کے بعد درج کئے جاتے ہیں۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ علیین اور سجین نیکوکاروں اور بدکاروں کے نامۂ اعمال کے دفاتر بھی ہیں اور اقامت گاہیں بھی۔ مولانا امین احسن اصلاحی کی رائے میں سجین وہ دفتر ہے جس میں مجرموں کے اعمال کا سارا ریکارڈ تحریری صورت میں محفوظ کیا جاتا ہے۔ سجین کا معنی قید خانہ ہے۔ اسی معنی کی مناسبت سے سزا کے حقداروں کے ریکارڈ آفس کا نام سجین رکھا گیا ہے۔ اور اسی طرح علیین بھی جنت کے حقداروں کا ریکارڈ آفس ہے گویا علیین اور سجین دفاتر کے نام ہیں۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سجین کی وضاحت میں فرماتے ہیں ''کہ سجن کا معنی قید خانہ ہے۔ سجین کا لفظ اسی سے ماخوذ ہے اس لیے سجین کا معنی جیل یا قیدخانہ ہے۔ لیکن آگے جو اس کی تشریح کی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد وہ رجسٹر ہے جس میں سزا کے مستحق لوگوں کے اعمال نامے درج کئے جارہے ہیں۔'' اسی طرح جنت کے مستحق بلند پایہ لوگوں کے اعمال نامے علیین میں درج کئے جارہے ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ علیین اور سجین دونوں دفاتر بھی ہیں اور روحوں کے رہنے کی جگہیں بھی۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ سجین سے مراد جہنم ہے اور علیین سے مراد جنت ہے۔ خدا کا فیصلہ ہے کہ فجار جو انکار کرنے والے ہیں جہنم میں جائیں گے اور ابرار خدا کے مقرب بندے جنت میں جائیں گے یہ اللہ کا اٹل فیصلہ ہے۔

کِتَابٌ مَّرۡقُوۡمٌ سے مراد ایک لکھی ہوئی کتاب یا ایک دفتر جہاں انسان کا ریکارڈ موجود ہو۔ کراماً کاتبین معزز لکھنے والے ہیں۔ یہ معزز لکھنے والے کس طرح لکھتے ہیں اور کس طرح ریکارڈ بناتے ہیں اور یہ لکھا ہوا دفتر کیا ہے اور علیین اور سجین کے دفاتر میں کس طرح ریکارڈ تیار کیا جاتا ہے۔ لکھنے اور تحریر کرنے کا مطلب کیا ہے۔ اس کے لیے نادیدہ یقین (blind faith) کا ہونا ضروری ہے اور اس حقیقت پر تبصرہ کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ یہ متشابہات میں شامل ہیں۔ تاہم علم جدید کی روشنی میں اس حقیقت کو سمجھنا خلاف عقیدہ نہیں ہے۔ موجودہ دور سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے اس لیے آج کل کے زمانے میں ہر چیز کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے معیار پر پرکھا جا سکتا ہے۔ دور جدید کے آلاتِ ریکارڈ ہمیں ان آیات کا مفہوم زیادہ صاف طور پر سمجھا سکتے ہیں۔

سورہ یٰس میں اس بات کا اشارہ ہے: اَلۡيَوۡمَ نَخۡتِمُ عَلٰٓى اَفۡوَاهِهِمۡ وَتُكَلِّمُنَآ اَيۡدِيۡهِمۡ وَتَشۡهَدُ اَرۡجُلُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ (یٰسن:٦٥) قیامت کے دن ان کے مونہوں کو بند کیا جائے گا اور ان کے ہاتھ بات کریں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے کہ دنیا میں کیا کر رہے تھے۔ اس آیت سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ تحریر کرنے کا مطلب انسان کی حرکات و سکنات محفوظ کرنا ہے۔ اس کے علاوہ سجین اور علیین کو اگر بدکاروں اور نیکو کاروں کے روحوں کے دفاتر اور مسکن مان لیا جائے تو عالم برزخ کی تصدیق ہوتی ہے۔ جہاں تمام نیک لوگوں اور بُرے لوگوں کی روحیں قیامت تک کے لیے جمع کی جاتی ہیں اور جہاں سے جنت کے حقدار جنت کا نظارہ کرتے ہیں اور جہنم میں جانے والے لوگوں کو جہنم کی جھلکیں دکھا کر ذہنی تشدد (mental torture) کیا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

بے شک ابرار نیک لوگ عیش و آرام میں ہوں گے بلند تختوں پر بیٹھے نظارہ کر رہے ہوں گے۔ یعنی اعزاز و اکرام کے ساتھ مشاہدہ کر رہے ہوں گے۔ چونکہ یہ لوگ اونچے اونچے تختوں پر تشریف فرما ہوں گے اس لیے وہ آسانی سے ہر چیز کا نظارہ کر رہے ہوں گے۔ دراصل خدا کے فرمانبردار بندوں کو ایک ممکنہ تصور کے ذریعے بات سمجھائی جاتی ہے کہ دنیا میں جیسے بڑے لوگوں کو عزت و اکرام سے نوازنے کے لیے زمین پر رہتے ہوئے انسان اپنے تصورات اور تجربات کی بنا پر جو کچھ سمجھ سکتا ہے، جنت بالیقین اس سے بلند و برتر شئے ہوگی۔

بلند تختوں پر نظارہ کرنے والے مطمئن اور خوش ہوں گے۔ ان کے چہروں پر خوشی کے آثار ہوں گے یہاں تک کہ ہر دیکھنے والی آنکھ کو ان کے چہروں پر خوشی اور مسرت اور عیش و عشرت کی تازگی دکھائی دے گی۔ انہیں سربہ مہر شراب پلائی جائے گی۔ ایسی خالص اور صاف و شفاف شراب جس میں نہ کوئی ملاوٹ ہوگی نہ بو۔ اس پر مُشک کی مہر لگی ہوئی ہوگی۔ یہ مہر پینے کے وقت توڑ دی جائے گی جس سے ثابت ہوگا کہ شراب بالکل محفوظ حالت میں ہے۔ مُشک کی مہر اہل جنت کی نفاست اور عمدگی کو ظاہر کرتی ہے۔

ان چیزوں کی نزاکت انسان دُنیا میں رہتے ہوئے سمجھ سکتا ہے۔ لیکن عالم آخرت میں انسان کے ذوق اور فہم کا معیار دنیا کے تصور کے بجائے عالم آخرت کے معیار کے مطابق ہوگا۔

وَفِیۡ ذَالِکَ فَلۡیَتَنَافَسِ الۡمُتَنَافِسُوۡن۔ سبقت لینے والوں کو اسی میں سبقت لینی چاہیے

یا جو لوگ دوسروں پر بازی لینا چاہتے ہیں اسی میں بازی لے جانے کی کوشش کریں۔ اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو لوگ دنیا کے مال ودولت اور جاہ و حشمت پر بازی لگانے کی کوشش کرتے ہیں، انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اصل کامیابی آخرت کی کامیابی ہے، اور اصل انعام آخرت کا انعام ہے۔ لہٰذا مسابقت اور مقابلہ (competetion)اس کے لیے کرنا چاہئے۔ تَطَفُف کرکے یعنی ناپ تول میں کمی کرکے جو لوگوں کے مال ناحق کھاتے ہیں جنہیں آخرت کے محاسبہ کی کوئی فکر نہیں بلکہ آخرت کو جھٹلاتے ہیں۔ اور جن کے دلوں پر خدا کی نافرمانیوں سے زنگ چڑھ گیا ہے دُنیا کے حقیر مال ودولت کی ہوس میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش کرتے ہیں اور ہر کوئی ایک دوسرے سے زیادہ کمانے کی فکر میں مگن رہتا ہے۔ اقتدار حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوتے ہیں۔ دنیا کی جاہ و حشمت اور مال دولت کے لیے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی دوڑ میں لگے ہوئے ہیں۔ اس لیے خدا کی نافرمانی اور گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ سب کچھ فنا ہونے والا ہے۔ اس حقیر اور ناپائیدار سازوسامان کے لیے لوگوں کی یہ دوڑ دھوپ مذموم ہے۔ اس انداز کی دوڑ دھوپ صرف آخرت کے لیے مناسب ہے۔ آخرت ہی انسان کی منزل ہے۔ لہٰذا اس منزل کے لیے ہی ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جو لوگ دنیا کے عیش و عشرت اور جاہ و حشمت کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لینے کی کوشش کرتے ہیں ان کو سمجھنا چاہیے یہ ایک حقیر، عارضی اور فانی و بے وقعت سرمایہ کے لیے جدوجہد کررہے ہیں۔ پوری دنیا کی دولت و رونق خدا کے نزدیک مچھر کے پر کے برابر کی وقعت نہیں رکھتی ہے۔ جبکہ آخرت کی فکر میں کمائی ہوئی ذرہ برابر نیکی اس سے بڑھ کر ہے۔ آخرت کے لیے جدوجہد کرنے سے انسان کی روح بلندیوں سے ہمکنار ہوتی ہے۔ اور دنیا پرستی کی جدوجہد میں مشغول روح پستیوں اور اندھیروں میں بھٹکتی رہتی ہے۔

واضح رہے کہ آخرت کی فکر اور اس کی نعمتوں کو حاصل کرنے کی تگ ودو سے ساتھ ہی ساتھ دنیا کی بھی اصلاح ہوتی ہے جبکہ دنیا کے سروسامان کے لیے حد سے زیادہ جدوجہد کرنے سے دنیا ایسی گندگی میں تبدیل ہوجاتی ہے جس میں انسان سانپ بچھو کی طرح ہر ایک کوڈسنے لگتا ہے اور اپنے ہی ہم نوع انسانوں کے خون کا پیاسا بن جاتا ہے۔

یہ بات ذہن میں رہنی چاہیئے کہ قرآن پاک کی ایسی آیات کا مقصد ترک دُنیا اور گوشہ نشینی کی تعلیم دینا نہیں ہے اور دُنیا کے کاموں پر بالکل توجہ نہ دینے سے یہ دُنیا ایک ویرانہ بن جائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں ترک دُنیا حرام ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت دی کہ رہبانیت، ترک دنیا جائز نہیں ہے۔ اسلام کی نظر میں دُنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ اس کھیتی کو تقویٰ کے ساتھ آباد کرنے سے آخرت کی کاشت کی جاتی ہے۔ اسلام کا حکم ہے کہ دُنیا کے ہر معاملے میں ایمانداری اور دیانت داری سے کام لیا جائے کھیتی باڑی ہو یا تجارت، ملازمت ہو یا مزدوری ہر جگہ خلوص اور ایمانداری کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ گوشہ نشینی، دنیا سے نفرت، بے کاری وغیرہ مزاجِ اسلام کے خلاف ہے۔ لیکن تقویٰ اور ایمانداری سے اگر کام کیا جائے تو یہ دُنیا انسان کے لیے موت سے پہلے بہترین مسکن اور موت کے بعد بہترین اور دائمی آرام گاہ بنے گی۔

اس دُنیا میں انسان کی عمر بہت کم ہے لیکن آخرت میں اس کی عمر کی کوئی حد نہیں ہے۔ اس دنیا کا سازوسامان اور مال و دولت آخرت کی نعمتوں کے مقابلے میں ہیچ ہے۔ آخرت کی نعمتیں لازوال اور ابدی ہیں اس لیے دنیاداری اور دنیا پرستی میں محو ہوکر آخرت کی دائمی اور ابدی زندگی سے محروم ہونا بہت بڑی نادانی ہے۔ اس لیے آخرت کی ان نعمتوں کو حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرنا اور سبقت لینا دانائی اور کامیابی ہے۔ اس کے برعکس اس دُنیائے فانی کی دھن ودولت کمانے کے لیے تگ و دو کرنا اور سبقت لینا خلاف عقل اور بہت بڑی نادانی اور ناکامی ہے۔

إِنَّ الَّذِيْنَ أَجْرَمُوا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ آمَنُوا يَضْحَكُوْنَ(۲۹)

گنہگار لوگ ایمان داروں کی ہنسی اڑایا کرتے تھے

وَإِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ(۳۰)

اور ان کے پاس سے گزرتے ہوئے آپس میں آنکھ کے اشارے کرتے تھے۔

وَإِذَا انقَلَبُوٓا إِلَىٰٓ أَهۡلِهِمُ انقَلَبُوا۟ فَكِهِينَ(٣١)

اور جب اپنوں کی طرف لوٹتے تو دل لگیاں کرتے تھے۔

وَإِذَا رَأَوۡهُمۡ قَالُوٓا۟ إِنَّ هَٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّونَ(٣٢)

اور جب انہیں دیکھتے تو کہتے یقینا یہ لوگ گمراہ ہیں۔

وَمَآ أُرۡسِلُوا۟ عَلَيۡهِمۡ حَٰفِظِينَ(٣٣)

یہ ان پر پاسبان بنا کر تو نہیں بھیجے گئے ہیں

فَٱلۡيَوۡمَ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ مِنَ ٱلۡكُفَّارِ يَضۡحَكُونَ(٣٤)

پس آج ایمان والے ان کافروں پر ہنسیں گے

عَلَى ٱلۡأَرَآئِكِ يَنظُرُونَ(٣٥)

تختوں پر بیٹھے دیکھ رہے ہوں گے

هَلۡ ثُوِّبَ ٱلۡكُفَّارُ مَا كَانُوا۟ يَفۡعَلُونَ(٣٦)

کہ اب ان منکروں نے اپنے افعال کا پورا پورا بدلہ پالیا۔

آخرت کی نعمتوں کو پانے کے لیے ابرار یعنی مومنین جو جدوجہد کرتے ان پر یہ فجار کافرین ہنسی مذاق کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آخرت میں اسی طرح یہاں اہل ایمان ان کافروں پر ہنسیں گے اور مذاق کریں گے۔

فرمایا جاتا ہے کہ ان کافروں سے پریشان اور خوف زدہ ہوکر ہمت نہ ہاریں۔ جب یہ کافر مومنوں کے پاس سے گزرتے تھے تو آپس میں آنکھ کے اشارے کرتے تھے اور جب واپس اپنے اہل خانہ کی طرف لوٹتے تھے تو مزے سے لوٹتے تھے۔ اہل ایمان کو دیکھ کر کہا کرتے تھے کہ یہ لوگ دراصل گمراہ ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مومنوں کی نگرانی کے لیے نہیں بھیجا ہے۔ آج اہل ایمان ان کفار پر ہنس رہے ہیں اور ان کی بے کسی کو دیکھ رہے ہیں اور خوش ہیں کہ ان کافروں اور ظالموں کو اپنے کرتوتوں کا بدلہ مل گیا ہے۔

مجرمین جو اہل ایمان پر ہنستے تھے اور ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ اس کی وجہ اہل ایمان کی غربت اور معاشی بدحالی تھی۔ مالی کمزوری کی وجہ سے وہ کافروں کے مذاق اور تشدد کو روک نہیں سکتے تھے۔ اہل ایمان کافروں کے اس ظلم و زیادتی پر صبر کرتے تھے اور اپنی اخلاقی ذمہ داری کا ثبوت دیتے تھے۔

جب یہ کافر لوگ مسلمانوں کے پاس سے گزرتے تھے تو ایک دوسرے کو ان مسلمانوں کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ آنکھ ماری کرتے تھے۔ ہاتھ سے اشارہ کرتے تھے دیکھو ان بے چاروں کی طرف جنہیں گمراہ کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ اپنی بداخلاقی اور بدکرداری کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اتناہی نہیں بلکہ گھر پہنچتے ہی گھر والوں سے ان شرانگیز حرکات کا ذکر کرتے تھے اور لطفاندوز ہوتے تھے۔ جب اہل ایمان کو دیکھتے تو ان کو بہکے ہوئے گمراہ کہتے تھے۔ انہیں مومنوں کو گمراہ کہنے میں کوئی شرم نہیں آتی تھی اور نہ ان کا ضمیر ان زیادتیوں پر ان کی ملامت کرتا تھا۔ حالانکہ ان منکرین حق کو ان پر نگران بناکر نہیں بھیجا گیا تھا۔ انہیں مسلمانوں کے معاملات کا ذمہ دار نہیں بنایا گیا تھا اور نہ یہ ان کے سرپرست بنائے گئے تھے۔ ان کے حالات کا جائزہ لینے کے لیے ان کو مامور نہیں کیا گیا تھا۔ یہ لوگ ایسی حرکات اس لیے کرتے تھے کہ انہیں مسلمانوں کا اللہ پر ایمان لانا پسند نہیں تھا۔ موجودہ زمانے میں بھی ایسے ہی مناظر کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ آج بھی ابرار و نیکوکار لوگوں پر فجار اور خدا بے زار لوگوں کا یہی مؤقف ہے۔ کمزوروں اور لاچاروں سے دُنیا بھر میں یہی سلوک ہورہا ہے۔ اب مومنین کو منکروں کی ان ظالمانہ اور مجرمانہ حرکات پر صبر کرنے کی ہدایت دی جاتی ہے۔ ان سے فرمایا جا رہا ہے کہ اس خیر کے بدلے میں آپ کو جنت کی نعمتوں سے نوازا جائے گا۔ قیامت کے دن یہ فجار خدا کی نافرمانی کی وجہ سے اپنے ٹھکانے، جہنم کا نظارہ کریں گے اور اہل ایمان اس وقت ہنسیں گے اور ان سے کہیں گے! اے کافرو لیا آپ کو اپنے اعمال کا بدلہ مل گیا۔

مشکلات کے اُن حالات میں اہل ایمان کافروں، منکروں اور مشرکوں کے ہاتھوں جن تکالیف اور مظالم کا سامنا کرتے تھے اور ان پر صبر کرتے تھے ان تکالیف، مصائب اور مظالم کو برداشت کرنے کے لیے ان کے پاس صرف ایک ہتھیار تھا کہ انہیں اللہ تعالیٰ اور روز آخرت پر مکمل ایمان تھا۔ انہیں اللہ کے اس وعدے پر پورا یقین تھا کہ انہیں دنیا چھوڑ کر عالم آخرت میں جنت نصیب ہوگی اور اللہ ان سے راضی ہوگا۔

سورۃ الانشقاق

اٰیٰتُہا:25 رکوعھا:1

بسم اللہِ الرَّحمٰن الرَّحیم

إِذَا السَّمَاءُ انشَقَّتْ o وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ o وَإِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ o وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ o وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ o يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيهِ o فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ o فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا o وَيَنقَلِبُ إِلَىٰ أَهْلِهِ مَسْرُورًا o وَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ وَرَاءَ ظَهْرِهِ o فَسَوْفَ يَدْعُو ثُبُورًا o وَيَصْلَىٰ سَعِيرًا o إِنَّهُ كَانَ فِي أَهْلِهِ مَسْرُورًا o إِنَّهُ ظَنَّ أَن لَّن يَحُورَ o بَلَىٰ إِنَّ رَبَّهُ كَانَ بِهِ بَصِيرًا o فَلَا أُقْسِمُ بِالشَّفَقِ o وَاللَّيْلِ وَمَا وَسَقَ o وَالْقَمَرِ إِذَا اتَّسَقَ o لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَن طَبَقٍ o فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ o وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْجُدُونَ o بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُكَذِّبُونَ o وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُوعُونَ o فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ o إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ o

پس منظر

سورہ کا موضوع قیامت اور آخرت ہے۔ پہلی پانچ آیات میں قیامت کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ آسمان کے پھٹ جانے اور زمین ہموار ہوجانے کا تذکرہ ہے۔ زمین اور آسمان دونوں اللہ تعالیٰ کے فرمان کی تعمیل کریں گے۔ ان کے لیے یہی لازم ہے۔

آیات ٦ سے ١٩ میں انسان کے اس کی منطقی منزل (goal) تک بہر صورت پہنچنے کی طرف اشارہ ہے۔ جہاں رب العالمین کے سامنے اسے اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔ مومن لوگ اپنا نامۂ اعمال دائیں ہاتھ سے وصول کریں گے۔ جبکہ کافر لوگوں کو انکا نامۂ اعمال پیٹھ پیچھے بائیں ہاتھ میں تھما دیا جائے گا۔ آخری آیات میں قرآن کی تکذیب کرنے والے کافروں اور اللہ کے نافرمان بندوں کو دردناک عذاب کی خبر سنائی جاتی ہے اور مومنوں کو بے حساب اور نہ ختم ہونے والے اجر کی بشارت دی جاتی ہے۔

إِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ (١)

جب آسمان پھٹ جائے گا

وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ(۲)

اور اپنے رب کے (حکم) کی تعمیل کرے گا اور اسے یہی زیب دیتا ہے

وَإِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ(۳)

اور جب زمین ہموار کردی جائے گی

وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ(۴)

اور جو کچھ اس کے اندر ہے اسے نکال باہر کرکے خالی ہوجائے گی

وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ(۵)

اور اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گی اور اسے (بھی) یہی زیب دیتا ہے

قیامت ایک ہمہ گیر انقلاب کا نام ہے جس میں دنیا تباہ ہوجائے گی۔ اور دوسرا عالم وجود میں آئے گا۔ جہاں رب العالمین تمام انسانوں کے اعمال کا احتساب فرمائیں گے۔ آسمان پھٹ جانے سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ کائینات کے پورے نظام کو بشمول زمین کسی اور نظام کے وجود کے لیے ختم کیا جائے گا۔ زمین کے بارے میں اشارہ ہے کہ زمین اپنے اندر موجود تمام مادے کو باہر پھینک دے گی اور ہموار ہوجائے گی۔ زمین اور آسمان فی الفور (within no time) اللہ کے حکم کی تعمیل کریں گے۔ ان کے لیے یہ لازم ہے اور یہی ان کی زیبائی ہے۔ اور اللہ کے حکم کی تعمیل کے بغیر انہیں کوئی چارہ بھی نہیں ہوگا۔ اس لیے تعمیل کرنے میں وہ کوئی کوتاہی نہیں کریں گے۔ ان کی یہ فرمانبرداری لازم بھی ہے۔

یہاں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ زمین و آسمان اللہ کی مرضی سے قائم ہیں اور وہ اپنے فرائض اچھی طرح سے انجام دے رہے ہیں۔ اس لیے اللہ کے حکم کی تعمیل میں فوراً اپنا وجود مٹادیں گے۔ کائینات کی تمام مخلوقات اللہ کے حکم سے ہی مٹ جائیں گی۔ تکوینی طور پر کائینات کا ذرہ ذرہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے۔ آخری وقت پر نئے نظام کو وجود بخشنے کے لیے ہر ذرہ ختم ہونے کے لیے اللہ کے حکم کی تعمیل کرے گا۔ لیکن انسان، جسے ایک حد تک خود اختیاری سے نوازا گیا ہے، کا حال یہ ہے کہ وہ خدا کی اطاعت اور فرمانبرداری کے بجائے اس کی نافرمانی میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑ دیتا ہے۔ اطاعت تو درکنار وہ بغاوت پر اتر آتا ہے۔ اس لیے انسان اپنے اس طریقۂ کار پر غور کرکے اور قیامت کے منظر کو یاد کرکے رب العالمین کی طرف رجوع کرے۔ کائینات کے اس انقلاب کی تصویر میں زمین و آسمان کے خشوع و خضوع اور اللہ کی عظمت وجلال کا پرتو ہے اور اس میں ان کی اطاعت، فرمانبرداری اور خودسپردگی کا احساس موجود ہے۔

خوشی اور اطاعت سے لبریز اس آسمانی فضا سے انسان کو ندا آتی ہے کہ یہ لامحدود کائینات جس کی حد صرف خدا جانتا ہے، لمحہ بھر انتظار کیے بغیر اللہ رب العالمین کے سامنے سرنڈر کرکے اپنے وجود کو مٹا دے گی۔ لیکن انسان جسے رب العالمین کی بارگاہ میں آخرت میں حیات نو ملے گی، اُسے اللہ کی بارگاہ میں سرنڈر کرنے اور اس کی پناہ میں آنے کی فکر نہیں ہے۔

يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَى رَبِّكَ كَدْحاً فَمُلَاقِيهِ(٦)

اے انسان بے شک تو اپنے پروردگار کی طرف کشان کشان چلا جارہا ہے یہاں تک کہ تو اُس سے ملاقی ہو۔

فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ(٧)

پھر جس کو اس کے دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ دیا جائے گا

فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَاباً يَسِيراً(٨)

تو جلد ہی اُس سے آسان حساب لیا جائے گا

وَيَنقَلِبُ إِلَى أَهْلِهِ مَسْرُوراً(٩)

اور وہ خوش و خرم اپنے لوگوں میں لوٹے گا۔

وَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ وَرَاءَ ظَهْرِهِ(١٠)

رہا وہ شخص جس کا اعمال نامہ اس کے پیٹھ پیچھے پکڑایا جائے گا

فَسَوْفَ يَدْعُو ثُبُوراً(١١)

پس وہ صرف موت مانگے گا۔

وَيَصْلَى سَعِيراً(١٢)

اور دھکتی آگ میں جاپڑے گا۔

إِنَّهُ كَانَ فِي أَهْلِهِ مَسْرُوراً(١٣)

بے شک وہ اپنے گھر والوں میں مگن تھا

إِنَّهُ ظَنَّ أَن لَّن يَحُورَ(۱۴)

اس نے سمجھ رکھا تھا کہ ہرگز پلٹ کر نہیں جانا ہے۔

بَلَى إِنَّ رَبَّهُ كَانَ بِهِ بَصِيرًا(۱۵)

کیوں نہیں (اُسے پلٹنا ہی پڑا)، بے شک اس کا رب اس کے سارے کرتوت دیکھ رہا تھا۔

بے شک انسان چار وناچار اپنے رب کی طرف چلا جارہا ہے۔ زمین و آسمان کی تعمیل حکم کے بعد اب انسان سے فرمایا جارہا ہے کہ چاروناچار اسے خدا کے پاس حاضر ہونا ہے۔ یہ پوری کائنات اور اس میں موجود مخلوقات قیامت کے دن الٹ دئے جائیں گے اور اس کے بعد ایک نیا عالم اور نیا نظام قائم ہوگا۔ لہٰذا اے انسان دنیا میں ہر مشقت اور جدوجہد کے بعد تمہیں یہ دنیا چھوڑنی ہے۔ جتنا بھی مال و دولت اور ناموری (name and fame) تم نے دنیا میں حاصل کی ہو اسے دنیا میں ہی چھوڑنا ہے۔ کائینات کی تمام مخلوقات اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری میں مشغول ہیں۔ کوئی اپنے کام سے غافل نہیں ہے۔ سورج، چاند، ستارے سب خدا کی فرمانبرداری میں مشغول اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ لیکن اے انسان اللہ نے تجھے اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الجِنَّ والاِنس اِلَّا لیعبدون۔ لیکن تو بندگی کا حق ادا نہیں کرتا ہے۔ تو غفلت میں پڑا ہوا ہے تجھے یاد نہیں کہ ایک دن یہ دنیا چھوڑنی ہے۔ اور خواہی نخواہی تجھے ضرور اللہ کے پاس پہنچنا ہے۔ لہٰذا اس دنیا کی غفلت سے بیدار ہو کر اپنے خالق کی بندگی کر۔

اے انسان تیرے لیے دنیا میں جدوجہد لازمی قرار دی گئی ہے۔ تجھے دنیا میں راحت و آرام نہیں مل سکتا کیونکہ دنیا کی یہ جدوجہد تجھے آرام سے بیٹھنے نہیں دے گی۔ تمہارے آرام کی جگہ صرف رب العالمین

کے پاس ہے۔ لیکن یہ آرام اُس خوش نصیب کے لیے ہے جواُس کے پاس اطاعت اور خود سپردگی کے ساتھ آئے گا۔ زمین و آسمان کا ذکر کرکے انسان کے ضمیر کو جھنجھوڑا گیا ہے کہ جب دنیا کا سفر ختم ہوجائے گا اور دنیا کی مشقت اور جدوجہد کے بعد تمہارے رب سے تمہاری ملاقات ہوجائے گی۔ اُس وقت کا استحضار رکھنے میں ہی تمہاری کامیابی ہے۔

جس کو اس کے دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ دیا جائے گا تو اُس سے ضرور آسان حساب لیا جائے گا۔ اور جس کا اعمال نامہ پیٹھ پیچھے پکڑایا جائے گا تو وہ ضرور موت مانگے گا۔ قیامت برپا ہونے کے بعد جب سب لوگ میدان حشر میں جمع کیے جائیں گے اور ہر ایک کو رب العالمین کے سامنے حساب چکانا پڑے گا اس وقت کا منظر پیش کیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ نیک اعمال کرنے والوں کے نامۂ اعمال ان کے دائیں ہاتھ دیئے جائیں گے اور جس بندے کو دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ دیا جائے گا اس کا حساب بھی آسان ہوگا۔ یعنی اس کے حساب لینے میں سختی نہ کی جائے گی۔ آسان حساب یہ ہوگا کہ مومن سے انجانے میں جو چھوٹی چھوٹی غلطیاں ہوئی ہوں گی اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور فضل و کرم سے انہیں معاف فرمادے گا۔ حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت نقل کی گئی ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ''جس کا حساب لیا گیا وہ ہلاک ہوگیا'' میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میری جان آپ پر قربان ہو کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا جس کے دائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال دیا گیا اس کا حساب آسان ہوگا۔ حضرت عائشہؓ کی عرض کا مطلب یہ تھا کہ اس آیت کی رو سے حساب تو مومن کا بھی ہوگا لیکن وہ ہلاکت سے دوچار نہیں ہوگا۔ آپؐ نے وضاحت فرمائی یہ تو پیشی ہے یعنی مومن کے ساتھ معاملہ حساب کا نہ ہوگا بلکہ ایک سرسری پیشی ہوگی۔ مومنین ضرور رب کے سامنے پیش کیے جائیں گے لیکن ان کا حساب آسان ہوگا۔ مگر جس کی پوچھ گچھ ہوئی وہ مارا گیا۔ اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر نمازوں میں یہ دعا پڑھتے تھے اللّٰھم حاسبنی حساباً یَسیراً۔ اے اللہ میرا حساب آسان فرما۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں میں نے جب اس دعا کے بارے میں پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نامۂ اعمال دیکھے گا اور معاف فرمائے گا۔

اب جس مومن کی ہلکی پھلکی غلطیاں اللہ نے معاف فرمادیں اور اس کے دائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال دیا گیا تو وہ خوش نصیب خوشی سے جوم اٹھے گا۔ اور خوش و خرم اپنے لوگوں میں لوٹ آئے گا۔ لوگ وہ ہوں گے جو دائیں ہاتھ میں اپنے نامۂ اعمال حاصل کرکے آرام سے بیٹھے ہوں گے اور جن میں اس کا اہل عیال اور اقارب و رشتہ دار بھی ہوں گے۔

جس کا نامہ اعمال اس کے پیٹھ پیچھے دیا جائے گا وہ بدنصیب شخص خوار و ذلیل ہو کر موت کی تمنا کرے گا۔ وہ اپنی اس نئی زندگی کو اپنے لیے وبال سمجھے گا اور مٹی کے ساتھ ملنا چاہے گا۔ لیکن اس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکے گی۔ اس کو زبردستی جہنم کی آگ میں دھکیل دیا جائے گا جہاں پر وہ ہمیشہ کے لیے جلتا رہے گا۔پیٹھ کے پیچھے نامہ اعمال دینے میں غالباً یہ وجہ ہے کہ یہ گناہ گار خفت کی وجہ سے ہاتھ آگے نہیں بڑھائے گا وہ شرم کے مارے پیچھے رکھے گا اس لیے اس کا نامۂ اعمال پیچھے سے ہی اس کے ہاتھ میں تھما دیا جائے گا۔ سورۃ الحاقہ میں فرمایا گیا ہے جس کا نامہ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا یہاں ارشاد ہوا ہے نامہ اعمال اس کے پیٹھ پیچھے دیا جائے گا۔ اس لیے پیٹھ پیچھے نامہ اعمال دینے سے اس بات کا اندازہ ہے کہ پیٹھ پیچھے اس کے بائیں ہاتھ میں اس کا نامۂ اعمال زبردستی تھمایا جائے گا۔

بہرحال بائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال پانے والا بدبخت اور تباہ حال انسان جو دنیا میں مشقت اٹھا کر اپنے رب کے پاس پہنچ گیا اور وہاں اسے معلوم ہوا کہ اس کی ساری محنت و مشقت خدا کی نافرمانی اور گمراہی کے لیے تھی اور اب اسے اس حقیقت کا ادراک ہوا کہ اس کی یہ ساری محنت اس کے لیے وبال جان بن گئی۔ اب اسے نہ ختم ہونے والا عذاب دیا جائے گا۔ وہ موت کی تمنا کرے گا کیونکہ اس کی ناقص عقل اسے یہی مشورہ دے گی کہ موت سے ہی اسے ابدی عذاب سے چھٹکارا ملے گا۔ اس لیے یہ موت کو بلائے گا۔ لیکن اسے موت نہیں آئے گی۔

جیتے ہیں آرزو میں مرنے کی

موت آتی ہے پر نہیں آتی

دنیا میں ان لوگوں کو ایک بڑی بیماری یہ تھی کہ دھن دولت، شان و شوکت اور حکومت و ثروت کے لیے محنت کرکے، اپنے جسم کی طوانائیاں (energy) اور اپنی صلاحیتیں استعمال کرکے ایک دوسرے پر سبقت لینے کی دوڑ دھوپ اور آرزؤں میں دن رات گزارتے تھے۔ دنیا میں اگر انہیں یہ چیزیں حاصل ہوجاتی تھیں تو فخر اور غرور میں عام اور معصوم لوگوں کا قتل عام کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ دنیا میں ان لوگوں نے ایسا ماحول بنایا تھا جس کی عکاسی اس قول سے ہوتی ہے: ''اس سے بڑی کوئی بیماری نہیں ہے کہ تم موت کو شفا سمجھنے لگو اور موت تمہاری تمنا اور آرزو بن جائے''۔ ایسی ہلاکت سے بڑی کوئی ہلاکت نہیں۔ ایسی بدبختی سے بڑی کوئی بدبختی نہیں۔ موت کی تمنا صرف شہادت پانے کے لیے جائز ہے۔ اس کے علاوہ موت کی تمنا کرنا کفر ہے۔ اس طرح یہ لوگ اب موت کی تمنا کریں گے لیکن ان کو موت نہیں آئے گی۔

بے شک یہ اپنے گھر والوں میں مگھن تھا:

اب بائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال پانے والے کی بدبختی کی وجہ بیان کی جارہی ہے۔ اس کی بدنصیبی کی وجہ یہ فرمائی گئی ہے کہ یہ اللہ سے بے خوف ہوکر اپنی فیملی میں مست موج مستی کررہا تھا اسے اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہونے کی فکر نہ تھی۔ اس نے اپنے اہل و عیال اور بیوی بچوں کو بھی یہی تربیت دی تھی۔ اس نے خدا سے بے خوف ہوکر حلال و حرام اور اچھے اور بُرے میں تمیز کئے بغیر اپنے گھر کو عیش و عشرت کا کلب (club) بنایا تھا۔ ناچ اور گانا اس کی غذا بن چکی تھی۔ نفس کی غلامی میں مبتلا تھا۔ زندہ رہنے کے لیے اس کے پاس ایک ہی نعرہ تھا۔ روٹی کپڑا اور مکان۔ کھاناپینا اور عیش کرنا اس نے زندگی کا مقصد سمجھا تھا۔ اس نے سمجھ رکھا تھا کہ اُسے کبھی بھی خدا کی بارگاہ میں حاضر نہیں ہونا ہے۔ حالانکہ دنیا میں موت کے نظارے دیکھتا تھا اس کے باوجود اسے خیال تک نہ آتا تھا کہ ایک دن مجھے بھی یہ دنیا چھوڑ کر اپنے خالق حقیقی کے پاس حاضر ہونا ہے۔ لیکن افسوس آخرت میں جوابدہی کے وقت اس کے پاس برائیوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

انسان کی اصل بھول یہی ہے کہ وہ جو کرتا ہے سمجھتا ہے کہ اسے کوئی نہیں دیکھتا ہے۔ اسے اس

بات پر یقین نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ اس کی حرکات و سکنات کو دیکھ رہا ہے۔ اور اس کا نامۂ اعمال بھی تیار ہو رہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ انسان آخرت کی جوابدہی سے غافل رہتا ہے۔

غفلت میں پڑے ہوئے لوگوں کو یاد دہانی کی جاتی ہے کہ کل تمہیں اس عیاشی کی زندگی کے بدلے میں ایک اور زندگی ملے گی جس میں آپ کو ایسا عذاب دیا جائے گا کہ ان قہقہوں کے بجائے ہمیشہ کے لیے خون کے آنسو بہانے پڑیں گے۔ اس لیے اے انسان غفلت کی نیند سے بیدار ہوجا اور خدا کی طرف آجا۔ اِرۡجِعِی اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرۡضِیَّۃً٥

فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِالشَّفَقِ(١٦)

پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں شفق کی

وَ الَّیۡلِ وَمَا وَسَقَ(١٧)

اور رات کی اور اس کی جو کچھ وہ سمیٹ لیتی ہے

وَ الۡقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ(١٨)

اور چاند کی جب کہ وہ ماہ کامل کو پہنچتا ہے

لَتَرۡکَبُنَّ طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ(١٩)

تم بھی ضرور ایک حالت سے دوسری حالت پر پہنچو گے۔

کائینات کے تین بڑے مناظر کی قسم اس لیے کھائی گئی ہے کہ انسانی قلوب ان کی طرف متوجہ ہوں تاکہ ان میں خشوع و خضوع اور خوف خدا پیدا ہو۔ سورج ڈوبنے کے بعد رات آتی ہے اور دن کے کام کاج کے بعد لوگ آرام کرنے کے لیے رات میں داخل ہوتے ہیں۔ پھر رات کے آرام کے بعد صبح کو

اٹھتے ہیں اور دوبارہ دن میں داخل ہوکر اپنا کام کاج اور معاش کمانا شروع کردیتے ہیں۔ اس طرح زندگی کا یہ پہیہ گھومتا رہتا ہے۔ یعنی دن اور رات اس کی زندگی میں آتے رہتے ہیں اور پھر وقتِ مقررہ پر اُس کی موت آجاتی ہے۔ جو اس کی دنیائی زندگی کا خاتمہ ہے مگر آخرت کی حاضری کے لیے اس کی نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔

چاند کے گھٹنے اور بڑھنے اور ماہ کامل بننے کا تذکرہ ہے جس طرح چاند افق پر ایک پتلی کمان کی طرح نمودار ہوکر ایک گول گیند (ball) کی شکل اختیار کرلیتا ہے اور پھر گھٹتے ہوئے کھجور کی پرانی شاخ کی طرح پتلی کمان کی شکل اختیار کرکے پھر افق سے نمودار ہوتا ہے۔ یہ چیزیں اس بات کی علانیہ شہادت دے ہی ہیں کہ جس کائینات میں انسان رہتا ہے اس کے مخلوقات کے اندر کہیں ٹھہراؤ نہیں ہے بلکہ درجہ بدرجہ تبدیلی ہے۔ اسی طرح انسان کی زندگی میں ایک تدریج ہے۔ چاند کے گھٹنے اور بڑھنے میں انسانی زندگی کی ترغیب ہے۔ انسان کی ابتدا ماں کے رحم میں پانی کے قطرہ جیسے نطفہ سے ہوتی ہے پھر یہ نطفہ خون کا لوتھڑا بن جاتا ہے۔ پھر ماں کی پیٹ سے بچے کی شکل میں باہر آتا ہے۔ اس کے بعد لڑکپن سے جوانی میں آتا ہے۔ پھر بڑھاپے کی آخری عمر میں داخل ہوجاتا ہے اور پھر موت آتی ہے۔ رات اور دن اور چاند کے گھٹنے اور بڑھنے کی طرح اس کی زندگی میں اتار چڑھاؤ آتے ہیں۔ اس کی زندگی میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ کبھی غم کبھی خوشی کبھی آرام کبھی سختی، کبھی مشکلات کبھی سہولیات، کبھی مصائب کبھی فراغت اور کبھی ہنسی مذاق کبھی رونا دھونا اس طرح کے حالات سے انسان کی زندگی گزر جاتی ہے اور آخر میں موت سے اس کی ملاقات ہوجاتی ہے۔ موت کی اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں لیکن غفلت کی وجہ سے انسان کو موت سے ملاقات کی فکر نہیں ہوتی ہے۔ اس لیے یوم حساب کے لیے زادِ راہ کی فکر نہیں کرتا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف انسان کی توجہ مبذول کرائی جاتی ہے کہ اس زندگی کا سفر ختم ہونے کے بعد نئی زندگی کا آغاز ہوجائے گا جہاں اپنے اعمال کا حساب چکانا پڑے گا۔ کائینات کے ان حسین اور خوشنما مناظر میں انسان کے لیے سبق (lesson) اور اس کے زندگی کی تربیت موجود ہے۔ دلوں کا قرار، ذہنوں کا سکون، آنکھوں کی روشنی اور اللہ کا نور موجود ہے۔ کیوںکہ کائینات کے مناظر انسان کو اللہ کی بندگی کی طرف بلاتے ہیں۔

فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ(۲۰)

پھر ان کو کیا ہوا کہ ایمان نہیں لاتے۔

وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْجُدُونَ(۲۱) (سجدہ)

اور جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو سجدہ نہیں کرتے۔

بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ(۲۲)

بلکہ یہ کفر کرنے والے لوگ جھٹلاتے ہیں

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ(۲۳)

اللہ اس کو خوب جانتا ہے جو انہوں نے اپنے دلوں میں بھر رکھا ہے

فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ(۲۴)

ان کو دردناک عذاب کی بشارت دو

اِلَّا الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ(۲۵)

البتہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک کام کئے ان کے لیے ایسا اجر ہے جو نہ ختم ہونے والا ہے۔

اب آگے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے اس عجیب رویے کا ذکر فرماتے ہیں جو وہ قرآن کے بارے میں اختیار کئے ہوئے ہیں۔ قرآن انہیں سادہ، آسان اور قابل فہم دلائل پیش کرتا ہے۔ زندگی سے منسلک نازک ترین چھوٹے بڑے مسئلے کا حل پیش کرتا ہے۔ کائینات میں موجود تمام مخلوقات کو خدا کے پیدا کردہ قرار دے کر ان مخلوقات کی عبادت کے گمان کو دور کر دیتا ہے۔ اس لیے لوگوں کو قرآن کی عظمت کے سامنے سجدہ میں گرجانا چاہیے اور نزول قرآن کو تسلیم کرنا چاہیے۔

اہل عرب میں یہ روایت تھی کہ جب وہ کسی شخص یا کسی شاعر کے کلام سے مرعوب ہوجاتے تھے تو اس کے سامنے سجدہ ریز ہوجاتے تھے۔ مشہور شاعر لبیدؔ کے قصیدے پر عرب کے شاعروں نے سجدہ کیا تھا۔ مصر کے ساحروں نے بھی جب حضرت موسٰی علیہ السلام کی عظمت اور شان پیغمبری سمجھی تو وہ سجدے میں گر پڑے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی عظمت سے مرعوب ہوکر اس کے بھائیوں اور ماں باپ نے سجدہ تعظیم ادا کیا۔ قرآن کریم اور اس کی فصاحت و بلاغت تمام مفروضہ مسجودوں سے بلند تر اور عظیم ہے۔ اس کی نصایح اس کا نظام اخلاق اور ضابطۂ حیات قابل اعتراف اور قابل احترام ہیں۔ اس لیے قرآن کے سامنے جھک جانا اور سجدہ تعظیم بجا لانا آپ کی سعادت مندی ہے۔ قرآن کے سامنے سجدہ کرنے کا مطلب قرآن کی تعظیم اور اطاعت ہے۔ قرآن کی اطاعت میں انسان کی زندگی کا سدھار ہے۔ لیکن مخالفین کی بدنصیبی یہ ہے کہ وہ قرآن کی دعوت کو قبول کرنے کے بجائے اس کی تعظیم سے اکڑتے ہیں اور مذاق اڑاتے ہیں۔

لیکن اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ ان کے دلوں میں کیا ہے وہ علیم الخبیر ہے۔ وہ ہر چیز کی خبر رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ان منکرین اور مخالفین کے دلوں میں کیا ہے، ان کے ارادے کیا ہیں۔ خدا اور اس کے رسول کے خلاف ان کی سازشیں کس طرح کی ہیں۔ ایمان لانے والوں کے متعلق ان کی کیا رائے ہے۔ ان کے خلاف جو کچھ ان کے دلوں میں ہے اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔ قرآن کے خلاف ان کی مہم جوئی سے بھی اللہ تعالیٰ واقف ہے۔ ان کے سینوں میں قرآن مجید کا جو عناد ہے اسے بھی اللہ خوب جانتا ہے۔ مال و دولت اور جاہ و حشمت کی دوڑ دھوپ میں مشغول یہ لوگ دیوانوں کی طرح دنیا کی محبت میں گرفتار ہیں۔ اس دیوانگی میں یہ لوگ جن چیزوں کو لعل و جواہرات اور ہیرے موتی سمجھتے ہیں آخرت میں یہ سنگ ریزے ثابت ہوں گے۔ جن چیزوں کو یہ دنیا میں سونا سمجھتے ہیں کل آخرت میں وہ مٹی سے کم تر ثابت ہوں گی۔ اور جن کامیابیوں اور کارناموں پر یہ لوگ دُنیا میں فخر کر رہے ہیں اور ان پر تمغے حاصل کر رہے ہیں کل اس کے عوض ان کے سروں پر ضلالت کے تاج پہنائے جائیں گے۔ انہیں معلوم ہوگا کہ انہوں نے کس چیز کا انتخاب کیا اور کس نعمت کو رد کر دیا۔

پس ان کو دردناک عذاب کی بشارت دو۔ البتہ جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کئے ان کے لیے نہ ختم ہونے والا اجر ہے

ان آخری دو آیات میں اپنے خالق حقیقی کو جھٹلانے والے منکرین کو وارننگ دی جاتی ہے کہ آخر انہیں ہمارے پاس پہنچنا ہے اور یہاں پہنچ کر ان کو دردناک عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ کیونکہ دنیا میں انہوں نے جو کچھ بویا اس کی فصل آخرت میں ضرور کاٹیں گے۔ دنیا میں جو برائیاں انہوں نے کی ہیں، جو قتل کئے ہیں، جو بدکاریاں کی ہیں، جو دھوکہ بازیاں، بددیانتیاں اور بداخلاقیاں انہوں نے کیں ان سب برائیوں کا بوجھ آخرت میں ان کے کندھوں پر ڈال دیا جائے گا۔ آخرت میں کوئی کسی کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ ان گمراہ لوگوں کو طنزیہ طور خوش خبری دی جاتی ہے کہ انہیں جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ لیکن ایماندار اور اللہ کے فرمانبردار بندے جنہوں نے قرآن مجید کی دعوت قبول کی جو ہر گھڑی ذکر الٰہی اور فکرِ آخرت میں مشغول ہیں، جرائم اور بدکاریوں سے نہ صرف دور رہتے ہیں بلکہ ان برائیوں کے خلاف برسرپیکار رہتے ہیں، رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لیے قدم بقدم آگے بڑھتے ہیں۔ کسی معصوم کا قتل نہیں کرتے ہیں۔ خدا کے رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں اور قرآن کے سایہ میں زندگی گزارتے ہیں اور خدا کے ہر حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ ان کو رب العالمین کی طرف سے بشارت یعنی خوشخبری دی جاتی ہے کہ آخرت میں انہیں ایسا اجر ملے گا جو ختم نہ ہونے والا ہے۔ یعنی انہیں ہمیشہ کے لیے جنت کی نعمتیں حاسل ہوجائیں گی جو ان کے پاس ہمیشہ رہیں گی۔ کتنے خوش نصیب ہیں یہ لوگ جنہیں رب العالمین اپنی رحمت میں لپیٹ لے گا۔

آیت نمبر ۲۱ پر سجدہ تلاوت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ثابت ہے۔

سورۃ البروج

اٰیٰتُہا:22 رکوعھا:1

بسم اللہِ الرَّحمٰن الرَّحیم

وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوجِo وَالْيَوْمِ الْمَوْعُودِo وَشَاهِدٍ وَمَشْهُودٍo قُتِلَ أَصْحَابُ الْأُخْدُودِo النَّارِ ذَاتِ الْوَقُودِo إِذْ هُمْ

عَلَيْهَا قُعُودٌ o وَهُمْ عَلَىٰ مَا يَفْعَلُونَ بِالْمُؤْمِنِينَ شُهُودٌ o وَمَا نَقَمُوا مِنْهُمْ إِلَّا أَن يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ o الَّذِي لَهُ
مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ o إِنَّ الَّذِينَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوبُوا فَلَهُمْ
عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيقِ o إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۚ
ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيرُ o إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ o إِنَّهُ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيدُ o وَهُوَ الْغَفُورُ الْوَدُودُ o ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ o فَعَّالٌ
لِّمَا يُرِيدُ o هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْجُنُودِ o فِرْعَوْنَ وَثَمُودَ o بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي تَكْذِيبٍ o وَاللَّهُ مِن وَرَائِهِم مُّحِيطٌ o
بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ o فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ o

موضوع و پس منظر

اس سورہ کا موضوع قیامت اور آخرت ہے۔ اس کے کئی مضامین ہیں۔ عقیدہ کی پختگی، ایمان کی مضبوطی، مصائب و مشکلات کا سامنا کرتے وقت صبر کا مظاہرہ کرنا وغیرہ اس سورہ کے اہم مضامین ہیں۔ مخالف حالات (Adverse circumstances) میں ثابت قدم رہنے اور صبر کرنے پر اجر عظیم کی خوشخبری بھی دی گئی ہے۔ سورہ کا ایک اہم موضوع اصحاب الاخدود کا قصہ ہے۔ جس سے مسلمانوں کو تسلّی دینا اور مخالفین و منکرین کو تنبیہ کرنا مقصود ہے۔ مومنین کو مخالفین کے ہاتھوں مصیبت اور تکلیف پہنچنے پر ان کے صبر کرنے کے عوض میں انہیں آخرت میں جنت ملنے کی خوشخبری سنائی گئی ہے اور مخالفین کو تنبیہ کی گئی ہے کہ تم نے اگر مومنین پر ظلم وجبر کرنے سے اپنے ہاتھ نہ روکے تو اللہ کی پکڑ سخت ہے۔ وہ تمہیں عذاب شدید میں پکڑ لے گا۔ جس طرح تم سے پہلے لوگوں کو پکڑ کر عذاب شدید میں مبتلا کردیا گیا۔ اور جس قرآن کا تم انکار کرتے ہو وہ اللہ تعالیٰ کے پاس محفوظ ہے۔ تمہارے چیخنے چلانے سے نہ اس میں کوئی تبدیلی آسکتی ہے اور نہ اسے کوئی نقصان پہنچ سکے گا۔

وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوجِo وَالْيَوْمِ الْمَوْعُودِo وَشَاهِدٍ وَمَشْهُودٍo

اکثر مفسرین کے نزدیک برجوں والے آسمان سے مراد تاروں بھرا آسمان ہے۔ یعنی جو ستارے اور سیارے آسمان میں موجود ہیں وہ آسمان کے بروج یعنی قلعے ہیں۔ بروج سے مراد وہ مداریں (Orbits-paths) بھی ہوسکتے ہیں جن پر یہ ستارے اور سیارے گردش کررہے ہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ذکر ہے۔ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَo ''اور سب اپنے اپنے مدار میں گردش کررہے ہیں''۔ چونکہ کائینات بے حد وسیع ہے جس میں بے شمار ستاروں اور سیاروں کے علاوہ بہت ساری کہکشانیں (Galaxies) موجود ہیں۔ اور یہ سب اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری میں مشغول ہیں۔ اس اتنی بڑی اور وسیع کائینات میں جس کی وسعت اللہ کے بغیر کسی کو معلوم نہیں جس میں ستاروں اور سیاروں کی گنتی کرنا انسان کے لیے ناممکن ہے اس میں برجوں کی کھوج لگانا اور انہیں قلعے یا ستارے وسیارے قرار دینا سورج کو چراغ دکھانے کے برابر ہے۔ البتہ برجوں والے آسمان کی قسم سے انسان کے ذہن میں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور شان و شوکت کی تصویر (Picture) آجاتی ہے اور اس کے دل میں خدا کا خوف طاری ہوجاتا ہے۔ دراصل مناظر کائینات کے ان تذکروں سے انسان کی توجہ خالق کائینات کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے۔ اور غور و فکر کی دعوت دی جاتی ہے کہ اس اتنی بڑی کائینات کے بنانے والے سے انسان کس طرح غافل رہ سکتا ہے۔ جس کی تمام مخلوقات خدا کی فرمانبرداری میں مشغول ہیں۔ خدا کی کائینات میں یہ خدا کا پیدا کردہ انسان جسے اشرف المخلوقات کہا گیا خدا کی فرمانبرداری سے کیسے منہ موڑ سکتا ہے۔

اور اس کی قسم جس کا وعدہ کیا گیا ہے وعدہ کیے ہوئے دن سے مراد روز قیامت ہے۔ جس کے برپا ہونے میں اللہ کا اٹل فیصلہ ہے ۔ مفسرین کے درمیان اس میں زیادہ اختلاف نہیں کہ وہ روز قیامت ہے۔ البتہ شاہداور مشہود یعنی ''دیکھنے والے کی اور دیکھے جانے والے کی'' قسم کے بارے میں مفسرین کے بہت سے اقوال اور آرأ ہیں لیکن جمہور کی رائے یہ ہے کہ دیکھنے والے سے مراد ہر وہ شخص جو قیامت کے دن حاضر ہوگا اور دیکھی جانے والی چیز سے مراد قیامت کا وہ منظر ہے جسے ہر کوئی دیکھے گا اور جہاں ہر چیز عیاں ہوگی۔

قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِo النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِo اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌo وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌo

ہلاک کردئے گئے خندق کھودنے والے:- اب اس واقعہ کا تذکرہ ہورہا ہے جس کے متعلق ان تین چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے۔ ایک برجوں والے آسمان کی۔ دوسری قیامت کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔ تیسری قسم قیامت کے ہولناک مناظر کی اور ساری مخلوق کی جو قیامت کے ان مناظر کو دیکھے گی۔ پہلی چیز اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ جس خدا نے اس کائنات کی تخلیق فرمائی ہے۔ اس کی گرفت سے انسان بچ نہیں سکتا ہے۔ دوسری چیز قیامت سے اس بات کا انکشاف کیا گیا ہے کہ دنیا میں معصوموں پر جو ظلم ہورہا ہے، قتل عام کیا جارہا ہے، انسان سمجھ بیٹھا ہے کہ اسے کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ اسے خبردار کیا جارہا ہے کہ قیامت کے دن ہر مظلوم کی داد رسی ہوگی اور ہر ظالم کو سزا ملے گی۔ تیسری چیز کی قسم اس لیے کھائی گئی ہے تاکہ معلوم ہوجائے کہ جس طرح ان ظالموں نے ان بے بس اہل ایمان کے جلنے کا تماشا دیکھا اور خاموش تماشائی (Mute spectators) بن کر اس جرم عظیم کا نظارہ کیا قیامت کے روز ان ظالموں کا نظارہ اسی طرح یہ حق پرست لوگ کریں گے۔ جب ان ظالموں کو اُس آگ میں جلایا جائے گا۔ جس میں وہ ہمیشہ جلتے رہیں گے۔ اصحاب الاخدود کے متعلق مختلف روایات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں بارہا ایسے واقعات رونما ہوئے ہیں جن میں لوگوں کو زندہ جلایا گیا ہے اور یہ سلسلہ آج بھی نام نہاد تہذیب یافتہ قوموں (So called civilized nations) میں جاری ہے۔ جنگ عظیم دوم (World war-II) اس کی تازہ مثال ہے۔

ہلاک کردئے گئے خندق کھودنے والے:- اکثر علما اس واقعہ کو تاریخی واقعہ قرار دیتے ہیں لیکن چند علما اسے دنیا کے بجائے آخرت کے عذاب سے جوڑتے ہیں۔ ان کے نزدیک اصحاب الاخدود وہ لوگ ہیں جو جہنم کی آگ میں گریں گے اور اہل ایمان ان کا تماشا دیکھیں گے۔ ان کا کہنا ہے کہ اصحاب الاخدود کے متعلق بیان کردہ باتیں قابل اعتبار نہیں ہیں اور نہ قرآن ان کے دنیائی انجام کا ذکر کرتا ہے جن سے اہل مکہ کو عبرت ہوتی۔ (تدبر قرآن)

لیکن قران مجید میں ایسے بہت سے واقعات موجود ہیں جن سے اس طرح کی صورت حال معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً اصحاب الرس۔ ذولقرنین اور اصحاب کہف وغیرہ۔ ان مختلف واقعات میں ایک مشہور واقعہ اس طرح ہے کہ ایک بادشاہ کے پاس ایک ساحر تھا جب وہ بوڑھا ہوگیا تو اس نے بادشاہ کے کہنے پر ایک لڑکے کو سحر سکھانا شروع کردیا۔ ایک دن یہ لڑکا اس بوڑھے ساحر کے پاس جارہا تھا۔ تو راستے میں ایک عیسائی عالم سے اس کی ملاقات ہوئی ۔ اُس عیسائی عالم نے اس لڑکے کو توحید کی تعلیم دی۔ توحید کی اس تعلیم کی برکت سے یہ لڑکا کرامات دکھانے لگا۔ اس نے کئی اندھوں کو بینا کردیا، تو بادشاہ نے پہلے اس راہب کو قتل کر ڈالا اور پھر اس لڑکے کو قتل کرنے کا حکم دیا لیکن لڑکے کو قتل نہ کرسکا۔ لڑکے نے اعلان کردیا کہ اگر بادشاہ مجھے قتل کرنا چاہتا ہے تو مجمع عام میں بِاسْمِ رَبِ الْغُلَام کہہ کر مجھے قتل کرسکتا ہے۔ جب ایسا کیا گیا تو مجمع عام سے صدائے حق گونج اٹھی کہ ہم لڑکے کے رب پر ایمان لے آئے۔ بادشاہ نے جب دیکھا کہ لوگ اس کا دین چھوڑ کر لڑکے کے دین پر ایمان لے آئے تو غصے میں آکر اُس نے گڑھے کھدوائے اور ان میں آگ بھروا کر حکم دیا کہ جو لوگ اس لڑکے کے کہنے پر ایمان لے آئے ان کو آگ کے گھڑوں میں ڈال دیا جائے اور خود اپنے ہم خیال لوگوں کے ساتھ گڑھوں کے کنارے جلتے ہوئے اہل ایمان کا نظارہ کیا۔

اسلامی مورخین کے بیانات کی تصدیق دوسرے تواریخی واقعات سے بھی ہوتی ہے۔ چھٹی صدی عیسوی کی کئی عیسائی تحریر رات میں اصحاب الاخدود کے اس واقعہ کی تفصیلات بیان ہوئی ہیں۔ فِلبی (Philby) نامی ایک مورخ نے اپنے سفرنامے Arabian Highland میں لکھا ہے کہ نجران کے لوگوں میں اب تک وہ جگہ مشہور ہے جہاں اصحاب الاخدود کا واقعہ پیش آیا تھا۔ 340 عیسوی میں یمن پر جب حبشی عیسائیوں کا قبضہ ہوا تو اُس دوران فیمیون (Faymiyun) نامی ایک عیسائی شخص نجران میں داخل ہوا اُس نے وہاں کے لوگوں کو بت پرستی کی برائیاں سمجھائیں اس کی تبلیغ سے اہل نجران عیسائی ہوگئے۔ عرب میں نجران کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یہ ایک تجارتی مرکز بنا تھا۔ زونواس ایک یہودی سردار نے نجران پر حملہ کرکے ہزاروں عیسائیوں کو آگ کے گڑھوں میں بھر کر زندہ جلادیا۔ اس لیے تاریخ میں لوگوں کو آگ کے گڑھوں میں جلانے کے کئی واقعات درج ہیں۔

لڑکے کو بِاسۡمِ رَبِّ الۡغُلام کہکر قتل کرنے کے واقعہ میں ایک نقطہ قابل غور ہے کہ اس لڑکے نے بادشاہ کو اپنی موت کا طریقہ بتا کر اپنے آپ کو موت کے لیے کیوں پیش کیا۔ ایمان والوں کے لیے اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اس میں اللہ کی مشیّت شامل تھی لیکن ظاہری طور پر اگر دیکھا جائے تو دنیا میں بہت سی ایسی مثالیں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک فرد کی موت تحریک کو حیات بخشتی ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے کہ شہید کی موت میں قوم کی حیات ہے۔ بہت سی انقلابی تحریکیں ایسی گزری ہیں جو اس تحریک کے بانی کی موت سے عروج پر پہنچ گئیں۔ حضرت عیسٰی کی ظاہری سزائے موت سے عیسایت کو تقویت ملی۔ عمر مختار کی سزائے موت نے لیبیا میں ان کی قائم کردہ تحریک میں نئی روح پھونک دی اور ان کی شہادت ان کی قوم کی کامیابی کا ذریعہ بن گئی۔ ایسے ہی اشخاص کے متعلق کہا گیا ہے کہ: "He was more dangereous in grave than alive." اس حقیقت کےپیش نظر لڑکے نے اپنی جان قربان کرکے توحید کی تحریک کو زندہ کردیا۔ جب مجمع میں موجود لوگوں نے اعلان کردیا کہ ہم نے اس لڑکے کے رب پر ایمان لایا حالانکہ ان لوگوں کے ایمان لانے کے بعد انہیں بھی زندہ جلایا گیا۔ مگر انہوں نے جانی قربانی دے کر توحید کے پرچم کو لہرایا اور آئندہ توحید پسندوں کے لیے مشعل راہ بن گئے۔

وَمَا نَقَمُوا مِنۡهُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ يُّؤۡمِنُوا بِاللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَمِيۡدِ o

اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی بے گناہی کی گواہی دے رہا ہے جنہیں ناکردہ گناہوں کی پاداش میں قتل کیا گیا۔ انہوں نے ایسا کوئی جرم نہیں کیا تھا جس کی وجہ سے انہیں ایسی سزا دی جاتی۔ ان کی خطا صرف یہ تھی کہ انہوں نے اُس خدا پر ایمان لایا تھا جو عزیز، طاقت ور، سب پر غالب اور سب تعریفوں کا سزاوار ہے۔ اللہ تعالیٰ عزیز ہے قوت والا اسے ظالم کو پکڑنے اور سزا دینے میں دیر نہیں لگتی ہے۔ لیکن وہ حمید اور اپنے آپ محمود ہے۔ وہ کسی کو فی الفور نہیں پکڑتا ہے۔ ظالموں کو ان کے ظلم سے آزماتا ہے اور مظلوم مومنین کو اپنی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ظلم و ستم برداشت کرنے کی آزمائش بھی کرتا ہے۔ وہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔ ظالموں اور نافرمانوں کو جو ڈھیل دی جاتی ہے۔ اس سے ان کا

سدھرنا مطلوب ہوتا ہے۔ مگر ان کے نہ سدھرنے پر اللہ تعالیٰ ان کو ایسے عذاب میں بتلا کرے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور ان ستائے ہوئے بے گناہ مومنوں کو ایسا اجر عطا کرے گا جو دائمی ہوگا۔

الَّذِیۡ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَہِیۡدٌ۝

واقعات کو ظاہری نگاہوں سے دیکھنے والے لرزتے ہیں کہ کیوں ان ایمان والوں نے آگ میں جلنا پسند کیا جب کہ وہ اپنی جان بچانے کے لیے ایمان کو چھوڑ بھی سکتے تھے۔ لیکن ایمان والے اس عظیم حقیقت کو سمجھتے تھے کہ عقیدہ کے بغیر زندگی بے قیمت، بے وزن اور بے مقصد ہے۔ ظالم اور سرکش ان کے جسموں پر غالب تو آسکتے ہیں لیکن ان کی روحوں اور ایمان پر غلبہ نہیں پاسکتے ہیں۔ اللہ پر ایمان لانے کی پاداش میں آگ ان کے جسموں کو جلارہی تھی اور وہ اس کی شدت بھی محسوس کررہے تھے مگر اس حال میں بھی وہ اس بے بہا حقیقت کی اطلاع پارہے تھے کہ ان کا یہ سودا نفع بخش ہے اور یہ قربانی ایمان والوں کے لیے تا قیامت مشعل راہ (Beacon light) ہے کہ ان بے گناہ ایمان والوں کو صرف اس وجہ سے آگ میں ڈالا گیا کیونکہ انہوں نے اللہ پر ایمان لایا تھا اور وہ ثابت قدم رہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ فَتَنُوا الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ ثُمَّ لَمۡ یَتُوۡبُوۡا فَلَہُمۡ عَذَابُ جَہَنَّمَ وَلَہُمۡ عَذَابُ الۡحَرِیۡقِ(۱۰)

اِنَّ الَّذِیۡنَ آمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَہُمۡ جَنّٰتٌ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ ذٰلِکَ الۡفَوۡزُ الۡکَبِیۡرُ(۱۱)

ظالموں کو سزا تجویز کرنے کے بعد اب اللہ تعالیٰ اپنی شانِ کریمی کو بیان فرماتا ہے کہ جن لوگوں نے اہل ایمان مردوں اور عورتوں کو آگ کے گڑھوں میں زندہ جلایا انہوں نے کوئی معمولی جرم تو نہ کیا یہ کام صرف وہی لوگ کرسکتے ہیں جن کے دلوں میں رحم کی کوئی چیز موجود نہیں ہے اور جن کی بے رحم آنکھوں میں انسانوں کے زندہ جلنے اور اس کا نظارہ کرنے کی برداشت ہے۔ حالانکہ یہ بے رحمی حیوانوں میں بھی نہیں پائی گئی ہے۔ ان مناظر سے عام انسانوں کے دل مجروح ضرور ہوتے ہیں اور انتقام گیری کے جذبات ابھر آتے ہیں۔ انسان کی عقل کو صرف ایک راستہ نظر آتا ہے کہ کم سے کم انہیں اسی طرح کی سزا ملنی چاہیے جس طرح کی سزا انہوں نے ان مظلوموں کو دی اور دنیا کا قانون بھی اس حقیقت کا تقاضا کرتا ہے ۔ دنیا کے جرائم کا خاتمہ بھی اس طرح کے قانون لاگو کرنے سے ممکن ہے۔

کیونکہ جرائم کی روک تھام بدلہ لینے سے ہی کی جا سکتی ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں واضح کردیا گیا ہے:
وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ○

اس طرح قاتل کے قتل کرنے میں انسان کی زندگی کی ضمانت ہے۔ لیکن یہ اللہ تعالیٰ کی شان کریمی ہے کہ بڑے سے بڑا جرم کرنے کے بعد بھی انسان اگر توبہ کرے اور اللہ کریم کا دامن پکڑ لے تو اسے معاف کیا جائے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ غفور ورحیم ہے۔ جن ظالموں نے ایمان والوں کو زندہ جلایا ان کے لیے عذاب تجویز کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ثُمَّ لَمۡ يَتُوبُواْ کی شرط لگادی۔ یعنی عذاب ان لوگوں کو ہوگا جو توبہ نہ کریں۔ حسن بصریؒ اسے اللہ تعالیٰ کی شان کریمی قرار دیتے ہیں۔

یہاں پر اس غلط فہمی کو دور کردینا ضروری ہے کہ اللہ کی صفت مغفرت سے کوئی یہ نتیجہ نہ نکالے کہ انسان گناہ پر گناہ کرتا رہے انسانوں کا خون بہاتا رہے اور پھر توبہ پر توبہ کرکے جنت کے دروازے پر دستک دے بلکہ توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ انسان چونکہ بشر ہے اس نے نادانستگی میں اگر کوئی جرم کیا ہو تو اسلام کے دائرے میں آنے کے لیے اگر وہ توبہ کرے پچھلے گناہوں پر پچھتائے اور آئندہ گناہوں سے باز رہنے کا مصمم ارادہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس سے گناہوں کو معاف کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔ رہا اس کا وہ جرم جو اس نے دیدہ ودانستہ کیا ہو اس کے لیے خدائی قانون کے مطابق سزا ضروری ہے تاکہ آئندہ جرائم کی روک تھام کی جائے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو زنا کے الزام میں اقبال جرم کے بعد سنگسار کرادیا یہ سزا اس لیے ضروری تھی کہ اگر مجرم کو چھوٹ ملتی تو جرائم کا خاتمہ ناممکن تھا۔ البتہ جو کوئی برائی کا راستہ ترک کرکے نیکی کا راستہ اختیار کرے اور خدا کی بندگی اور فرمانبرداری میں شامل ہوجائے اس کے لیے مغفرت کے دروازے کھلے ہیں۔ اس کے تمام گزشتہ گناہ معاف کئے جاتے ہیں، قبول اسلام کے وقت بندے کے پچھلے تمام گناہ معاف کیے جاتے ہیں۔

پھر ان لوگوں کے عذاب جہنم کا ذکر ہے جو برے کاموں کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور توبہ سے انکار کرتے ہیں۔ ان کے لیے آخرت میں جہنم کا عذاب ہے اور آگ میں جلنے کی سزا ہے۔ جہنم کے عذاب کے بعد آگ میں جلنے کی سزا کی بات جو کہی گئی اس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ دنیا کی آگ اور جہنم کی آگ میں فرق ہے۔ اس لیے آگ میں جلنے کی سزا کا علاحدہ ذکر کیا گیا ہے۔ دنیا کی آگ کو خدا کی مخلوق جلاتی ہے لیکن جہنم کی آگ کو خالق کائینات جلائے گا اور بھڑکائے گا۔ دنیا کی آگ میں جلنے والے تھوڑی دیر میں جل کر راکھ ہوگئے لیکن اللہ کی جلائی اور بھڑکائی ہوئی آگ میں جو گناہگار مخلوق ڈال دئے جائیں گے وہ اس بھڑکتی ہوئی آگ میں ہمیشہ جلتے رہیں گے۔ جو ایمان لانے والے دنیا کی آگ سے خوفزدہ نہ ہوئے اور ایمان کو نہ چھوڑا انہیں ہمیشہ کے لیے عذاب الٰہی سے نجات مل گئی۔ ان پر جہنم اور اُس کی آگ حرام کردی گئی اور انہیں ایسے باغوں میں داخل کیا جائے گا جہاں وہ ہمیشہ آرام سے رہیں گے۔ اس کے علاوہ دنیا کی آگ اور جہنم کی آگ کا فرق مومنوں نے واضح کردیا۔ دنیا کی آگ میں جل کر انہیں اللہ کی رضا حاصل ہوئی اور انہوں نے جانوں کی قربانی دے کر اللہ کی اطاعت کی مثال قائم کردی۔ جب کہ ان مجرموں نے خدا کی ناراضگی اور جہنم کی آگ خرید لی اور دنیا میں انسانیت کی پستی اور اللہ کی نافرمانی کی مثال قائم کردی۔

بے شک جن لوگوں نے ایمان لایا اور عمل صالح کیے ان کے لیے بہشت کے باغ ہیں۔ یہ ان کی بہت بڑی کامیابی ہے۔ یہ بات اللہ نے طے فرمائی ہے کہ اللہ پر ایمان لانے والے آخرت میں جنتوں میں داخل کیے جائیں گے جو ان کی ابدی آرام گاہ ہوگی۔ یہ ان مومنوں کے نیک کاموں اور اللہ پر ایمان لانے کا معاوضہ ہے۔ جس کو ایک بہت بڑی کامیابی قرار دے دیا گیا ہے۔ انسان کے لیے آخرت کی اس بڑی کامیابی سے بڑھ کر اور کوئی کامیابی نہیں ہے۔ دنیا کی بڑی سے بڑی کامیابی بہرحال عارضی ہے جو انسان کی موت کے ساتھ ہی ختم ہوجاتی ہے لیکن آخرت کی کامیابی دائمی اور ابدی ہے۔ کیونکہ آخرت میں یہ کامیابی ہمیشہ ساتھ دے گی۔

إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ(١٢)

إِنَّهُ هُوَيُبۡدِئُ وَيُعِيدُ(١٣)

بے شک وہی تو پہلی بار پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ پیدا کرے گا

وَهُوَ الۡغَفُورُ الۡوَدُودُ(١٤)

اور وہی بخشنے والا اور بہت محبت کرنے والا ہے

ذُو الۡعَرۡشِ الۡمَجِيدُ(١٥)

عرش کا مالک بڑی عظمت و شان والا ہے

فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ(١٦)

جس (کام) کا ارادہ کرے اس کا کرگزرنے والا ہے

ان آیات میں اللہ تعالیٰ اپنی صفات بیان فرمارہا ہے۔

اللہ کی پہلی صفت یہ ہے کہ اس کی پکڑ بہت سخت اور مضبوط ہے۔ وہ جسے پکڑتا ہے اسے دنیا کی کوئی طاقت چھڑا نہیں سکتی ہے۔

دوسری صفت اللہ تعالیٰ کی یہ ہے کہ وہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے۔ اسی نے انسان کو پہلی بار پیدا کیا اور وہی اسے دوبارہ پیدا کرے گا۔ جن لوگوں کا خیال ہے کہ وہ دنیا میں مر کر ختم ہوجائیں گے اور ان سے کوئی حساب لینے والا نہیں ہے۔ انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ خالق مطلق نے انسان کو پہلی بار بھی پیدا کیا ہے اور وہی اس کے دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے۔

تیسری صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو بخشنے والا اور ان سے محبت کرنے والا ہے۔ جو لوگ اللہ سے مغفرت مانگتے ہیں انہیں مغفرت اور معافی ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سب انسانوں سے محبت کرتا ہے۔ کیونکہ سب کو اسی نے پیدا کیا ہے۔ لیکن سب کے ساتھ محبت کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ہر برے اور اچھے انسان سے محبت کرتا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ صرف اس بندے سے محبت کرتا ہے جو اس سے محبت کرتا ہو۔ البتہ جو لوگ جہالت کی وجہ سے اللہ سے بغاوت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کو ان سے یہ ہمدردی ہے کہ وہ جہنم کی آگ سے بچ جائیں۔ اس لیے اہل ایمان کو ان تک قرآن کا پیغام پہنچانے کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کو پیدا کیا اور انسان کو ان پر ترجیح دی۔ اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق بہت عزیز اور محبوب ہے۔ لیکن جو بندہ اپنے خالق کی بندگی اور اطاعت کرتا اور سب سے زیادہ محبت اللہ سے کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُس سے بہت زیادہ

محبت اور پیار کرتا ہے۔ اور جو انسان اللہ کی بندگی سے غافل ہے وہ اللہ کا ناپسندیدہ بندہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے نفرت کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی چوتھی صفت یہ ہے کہ وہ عرش عظیم کا مالک ہے۔ وہ بڑی عظمت اور بڑی شان والا ہے۔ چونکہ وہ عرش عظیم یعنی پوری کائینات کا مالک ہے۔ اس لیے زمین والوں کو اس کے ہر حکم کی تعمیل کرنی چاہیے اور انہیں اللہ کے ہر فیصلے کو سر خم تسلیم کرنا چاہیے۔ اللہ کے فیصلے برحق ہیں۔ ان کو کوئی چلینج نہیں کرسکتا ہے البتہ اللہ کے فیصلے اللہ کی حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔ مومن اللہ کے فیصلے کو ظاہری صورت میں نہیں دیکھتا ہے۔ وہ ان فیصلوں میں اللہ کی حکمت اور مشیت کا صبر کے ساتھ انتظار کرتا ہے۔ اس کے برعکس کافر اللہ کے فیصلوں کا ظاہر بین ہوتا ہے۔ وہ اپنی ہر مصیبت اور آفت کو ایک ناگہانی بلا سمجھتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ اس کی مصیبت یا خوشی کو خدا کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیے وہ اپنی خوشی اور اپنے کارناموں کو اپنی ذہانت اور قابلیت کا نتیجہ (Achievement) سمجھتا ہے اور اپنی تکلیف یا مصیبت کو قدرتی آفات (Natural disaster) کا نام دیتا ہے۔اس کے خیال سے حادثات اور عنایات میں اللہ کا کوئی عمل دخل نہیں ہے لیکن اللہ عرش والا اور بڑی عظمت اور شان والا ہے۔ نہ کسی کے ماننے سے اس کی عظمت اور شان میں اضافہ ہوتا ہے اور نہ کسی کے انکار سے اس کی قدرت اور شان میں کوئی کمی ہو سکتی ہے۔ وہ ہر آن ایک نئی شان میں ہوتا ہے۔

پانچویں صفت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے۔ وہ حاکم مطلق، مختارِ کل اور آمر مطلق العنان (Dictator) ہے۔ وہ جس کام کا ارادہ فرماتا ہے کر ڈالتا ہے۔ یہ لامحدود کائینات اللہ کی پیدا کردہ ہے اور اس کا نظام بھی وہی چلا رہا ہے۔ اللہ کی پیدا کردہ مخلوق زمین پر اپنی آنکھوں سے اس کائینات کا بہترین نظام (Smooth running) دیکھ رہی ہے کہ اتنے بڑے نظام میں کوئی خلل نہیں۔ کائینات کا ذرہ ذرہ اپنی جگہ اپنی ڈیوٹی دے رہا ہے۔ بے شمار ستارے اور سیارے اپنے اپنے مدار پر چل رہے ہیں۔ جب تک اللہ کی مرضی ہے تب تک یہ نظام کائینات قائم رہے گا۔ انسانوں کو زمین پر زندگی گزارنے کا اختیار ملا ہے لیکن انہیں خدا کی بندگی اور فرمانبرداری کرنا لازم قرار دیا گیا ہے۔ ان کی زندگی پر اللہ تعالیٰ کی گرفت اور پورا کنٹرول ہے۔ ان کی زندگی میں اللہ تعالیٰ کے ارادوں اور مشیت کی مداخلت شامل ہے۔ اس لیے اللہ جو چاہتا ہے اسے کوئی روک نہیں سکتا ہے اور جسے سزا دینا چاہتا ہے، کوئی مزاحمت نہیں کر سکتا ہے۔ لیکن حقیقت میں رحم کا امیدوار وہ ہے جو خدا کی بندگی اور فرمانبرداری کرتا ہے اور سزا کا سزاوار وہی ہے جو اس کی نافرمانی کرتا ہے۔ اس کائینات اور دنیائی زندگی کے ہنگاموں کے پیچھے اللہ تعالیٰ ہی کا ارادہ اور مشیت کارفرما ہے۔ کبھی وہ ارادہ کرتا ہے کہ زمین پر کسی جبار اور گناہگار کو پکڑ کر ہلاک کردے اور کبھی یہ ارادہ کرتا ہے کہ انہیں قیامت تک کے لیے مہلت دے۔ اس کے ارادوں میں مداخلت کا کسی کو اختیار نہیں۔

هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْجُنُودِ(١٧)

بھلا تم کو لشکروں کی خبر پہنچی ہے

فِرْعَوْنَ وَثَمُودَ(١٨)

فرعون اور ثمود کے لشکروں کی

بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي تَكْذِيبٍ(١٩)

لیکن یہ کفر کرنے والے لوگ جھٹلانے میں لگے ہوئے ہیں

وَاللّٰہُ مِن وَرَائِہِم مُّحِیطٌ(۲۰)

حالانکہ اللہ ان کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے

پچھلی قوموں کے تاریخی حوالوں سے استدلال کیا جارہا ہے۔ فرعون اور ثمود کی سرگزشت بیان کی جارہی ہے۔ جن کے پاس بڑی بڑی فوجیں اور قوت موجود تھی۔ اپنی فوجوں کے بل بوتے پر انہوں نے لوگوں پر قہر برسائے تھے۔ ان مغرور قوموں کو دنیا میں خدا کی خدائی کہیں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے ان پر قہر برسایا تو انہیں بھاگنے کا کوئی راستہ نہ ملا۔ فرعون اور اس کی قوم کو سمندر میں ڈبودیا اور خود فرعون کو آنے والی قوموں کے لیے عبرت کا نشان بنایا۔ (اس کی لاش آج بھی مصر کے ایک لاش گھر میں موجود ہے) اور بنی اسرئیل کو ان کے مظالم سے نجات بخشی اور انہیں زمین پر غلبہ اور اقتدار سے نوازا۔ ثمود کا قصہ یہ ہے کہ اللہ نے پوری قوم کو ہلاک کردیا اور حضرت صالحؑ کو جو ان کے پاس اللہ کا پیغام لے کر آئے تھے، مومن ساتھیوں سمیت بچالیا۔ اگرچہ زمین پر انہیں غلبہ حاصل نہ ہوا تاہم خدا کے نافرمان اور ظالم و جابر حکمرانوں سے انہیں نجات مل گئی۔ ان دونوں قصوں سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے منصوبوں اور ارادوںکو جب عمل میں لانا چاہا تو اسے کوئی روکنے والا نہ تھا۔ قرآن اور تاریخ دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک قوم جب عروج پر ہوتی ہے تو پھر اپنی بداعمالیوں کے نتیجے میں زوال اور ہلاکت کی شکار ہوتی ہے اور پھر دوسری قوم اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ قوم ثمود، قوم عاد کی تباہی کے بعد اقتدار میں آئی تھی۔ اسی طرح پھر قوم ثمود کی ہلاکت کے بعد حضرت صالح نے زمین پر اپنے پاؤں جمائے اور خدا کے دین کے مشن کو آگے بڑھایا۔ یہ دنیا کا معمول (Routine) ہے کہ ایک قوم کے گمراہ ہونے اور ظلم و زیادتی میں ملوث ہونے کے بعد دوسری قوم اس پر غالب آجاتی ہے۔ تاکہ دوبارہ امن و انصاف قائم ہو۔ دور حاضر میں بھی قوموں کا یہی حال ہے۔ تمام اقوام مجموعی طور گمراہی کا راستہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ خدا اور خدا کے دین سے بے زار لوگ موج مستیاں کررہے ہیں۔ نزول قرآن کے وقت عرب دنیا کی قومیں اسی طرح کی موج مستی میں مست تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں گزشتہ قوموں کی سرگشت سنائی تاکہ یہ لوگ سدھر جائیں لیکن یہ گزشتہ قوموں کے واقعات کا انتباہ صرف وہاں تک ہی محدود نہیں بلکہ آج بھی جو قومیں خدا سے بے زار اپنی مرضی کی حکومت چلارہی ہیں۔ جس میں ان کی خود غرضی اور من مانی کے بغیر کچھ بھی نہیں دکھائی دیتا ہے۔ اللہ کے ارادے کے منتظر ہیں کہ جب یہ زمین گناہوں سے بھرجائے گی اللہ تعالیٰ ان پر عذاب نازل کرے گا۔ اس وقت وہ کسی کو اپنا مددگار نہ پائیں گے۔

حال میں ایک عالمگیر آفت (Calamity) پیش آئی جس کا ذکر کرنا مناسب ہے تاکہ گزشتہ قوموں کے عذاب کی تاریخ پر روشنی ڈالی جاسکے۔ یہ سانحہ ایک عالمی وبائی بیماری (Viral infection) جسے کرونا (Corona virus disease-2019- COVID-19) سے موسوم کیا گیا۔ یہ وبائی بیماری (Epidemic-Pandemic) چین کے ایک بڑے شہر Wuhan میں نمودار ہوئی اور آناً فاناً پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں اس بیماری کی زد میں آگئیں۔ دنیا کا سپر پاور (Superpower) ہونے کا دعویٰ کرنے والے ملک امریکہ کے سمیت تمام یورپی ترقی یافتہ ممالک پر یہ وبا قہر الٰہی بن کر ٹوٹ پڑا۔ جب یہ بیماری قابو سے باہر ہوگئی اور روک تھام کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو ہر ملک نے لاک ڈاؤن (Lock down) کرکے تمام کام کاج (Activities) اور کاروبار بند کرنے کا حکم جاری کردیا اور لوگوں کو سوشل ڈسٹنسنگ (Socail distancing) اور گھروں میں رہنے کا مشورہ دیا۔ لوگوں کے ہجوموں پر پابندی لگادی گئی۔ یہاں تک کہ مذہبی اجتماعات اور دیگر سماجی مجلسوں پر بھی بندشیں لگادی گئیں۔ تمام مذہبی مقامات پر لوگوں کی بھیڑ کو ممنوع قرار دیا گیا۔ تمام عبادت گاہوں میں اجتماعی عبادت پر پابندی لگ گئی۔ تمام تفریح گاہیں اور کھیل کے میدانوں (Play grounds) کو بند کردیا گیا۔ دوست اپنے دوست کو نہ مل سکتا ہے۔ ہمسایہ ہمسایہ کے گھر جانہیں سکتا۔ ہر طرف خوف کا ماحول چھا گیا۔

اللہ کی پکڑ مضبوط ہے وہ جب کسی قوم کو عذاب میں پکڑتا ہے تو اسے کوئی چھڑا نہیں سکتا اور جب وہ قوموں پر عذاب نازل کردیتا ہے تو اللہ کے سوا کوئی بچانے والا نہیں ہوتا ہے۔ لیکن یہ کافرین و منکرین شب و روز دعوت حق کو جھٹلانے میں مشغول ہیں۔ صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے یوں ان کی زندگی گناہوں کے ارتکاب میں تمام ہوتی ہے۔ انہیں اس بات کا خیال نہیں ہے کہ اللہ انہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ ان منکرین کو اس کی خبر نہیں کہ ان کی حالت ان مچھلیوں سے مختلف نہیں جو مچھلیاں تالاب میں پالی جاتی ہیں کہ اس تالاب کا مالک کسی بھی وقت اگر چاہے تو تالاب کو خشک کرکے سب مچھلیوں کو بے بس کرکے پکڑ لے گا۔ اس طرح ان منکرین سے کہا جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مضبوط گرفت میں ہیں اور ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ ان کی نافرمانی پر کسی بھی وقت اللہ تعالیٰ ارادہ فرماکر ان کو پکڑ سکتے ہیں۔

بَلۡ هُوَ قُرۡآنٌ مَّجِيۡدٌ(۲۱)

یہ قرآن بڑی عظمت اور شان والا ہے

فِىۡ لَوۡحٍ مَّحۡفُوۡظٍ(۲۲)

جو لوح محفوظ میں ہے۔

یہ قرآن مجید ہے۔ مجید کا معنی بلند ترین ہے۔ لہٰذا یہ قرآن بلند پایہ بڑی عظمت اور بڑی شان والا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے ۔ اللہ تعالیٰ کے کلام سے بڑا بلند اور مستحکم کوئی کلام ہو نہیں سکتا ہے۔ انسان کا کلام فلسفے کا ہو، سیاست یا قانون کا ہو عارضی اور بے بنیاد ہے۔ اس لیے انسان کے بنائے ہوئے قوانین، اصلاحات اور احکامات جو انسانی مفادات اور مفروضات پر مبنی ہوتے ہیں زوال پذیر ہوتے ہیں۔ قرآن کو قرآن مجید اس معنی میں فرمایا گیا ہے کہ یہ کلام تمام کمزوریوں سے پاک ہے۔ یہ کلام ہر زمانے میں ہر کلام پر حاوی رہا ہے اور ان شاء اللہ تا قیامت حاوی رہے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کلام کی حفاظت کی ذمہ داری خود لے لی ہے۔یہ قرآن لوح محفوظ میں ہے۔

ہم لوح محفوظ کی حقیقت کو نہیں جانتے ہیں یہ علم غیب سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا علم صرف اللہ کو ہے البتہ ہمیں یقین کرنا چاہیے کہ قرآن ہر لحاظ سے محفوظ ہے۔یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ قرآن کو جس طرح ایک محفوظ کلام قرار دیا گیا ہے ۔ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی یہ انہی الفاظ میں موجود ہے جن الفاظ میں یہ کلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ اس کی تحریر میں کسی ایک لفظ یا حرف میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ جس لفظ یا حرف کو جس طرح لکھا گیا ہے بالکل اسی طرح آج بھی ہمارے پاس لکھا ہوا موجود ہے۔

قرآن مجید کی حفاظت کا مظاہرہ اس حقیقت سے بھی ہوتا ہے کہ یہ قرآن نہ صرف ایک لکھی ہوئی کتاب (Preserved tablet) لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں موجود ہے اور تقریباً ہر مسلمان گھر میں عزت و احترام سے پڑھی جاتی ہے بلکہ یہ قرآن کروڑوں مسلمانوں کی یادداشت میں محفوظ ہے۔ اور مسلمان زبانی اس کی تلاوت کرتے رہتے ہیں۔ اور یہ عمل (Process) جاری ہے اور ان شاء اللہ جاری رہے گا۔ قرآن کے متعلق یہ ایک عینی شہادت ہے کہ قرآن لوحِ محفوظ میں موجود ہے۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو ایک زبردست تحفظ فراہم کیا ہے۔ جسے دنیا کی کوئی طاقت نقصان نہیں پہنچا سکتی ہے۔

فانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے

وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

قرآن مجید کی جس طرح مسلمانوں نے حفاظت کی اس کی مثال دنیا کے کسی اور کلام کی موجود نہیں۔ نزول قرآن کے دوران ہی مسلمانوں نے اس کلام کو اپنے سینوں میں جگہ دی۔ ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملہ (آیت) زبانی یاد کی۔ پھر تحریری شکل میں لاکھوں کروڑوں قرآن کے نسخے دنیا میں موجود ہیں۔ کسی نسخے میں کسی ایک لفظ کا اختلاف نہیں ہے۔ انسانوں کے ذریعے قرآن مجید کی اس طرح کی حفاظت دراصل اللہ تعالیٰ ہی کی حفاظت ہے۔ جو لوحِ محفوظ کا عکس ہے۔

موجودہ زمانے میں معاملے کو سائنس کی روشنی میں اچھی طرح سے سمجھا جاسکتا ہے۔ انسان کی آواز کو اس کی تصویر کے ساتھ ایک الیکٹرانک (Electronic) مشین میں محفوظ کیا جاسکتا ہے۔ جب انسان کے بنائے ہوئے آلات میں آواز کو تصویر کے ساتھ محفوظ کیا جاسکتا ہے اور انسان کے یہ اعجاد کردہ آلات اس کے لیے اللہ کے انعامات ہیں تو پھر اللہ کے لیے قرآن کو محفوظ کرنا کون سی عجیب بات ہے جس پر ایمان لانا مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو لوحِ محفوظ میں محفوظ کرکے اسے اپنی حفاظت میں لے رکھا ہے۔ اور تاریخ نے اسے اپنے اوراق میں محفوظ کرلیا ہے۔ اور اسے لوگوں پر واضح کردیا ہے اور آنے والی نسلوں پر واضح کرتی رہے گی۔

الیکٹرانک مشینوں کی ترقی کے باوجود 'جب کہ ہر بات اور ہر کام کو آواز اور تصویر کے ساتھ محفوظ کیا جاتا ہے اور ضرورت کے وقت اس آواز کو تصویر کے ساتھ سنا اور دیکھا جاسکتا ہے، لاکھوں اور کروڑوں انسان اس قرآن مجید کو اپنے دلوں اور دماغوں میں محفوظ کررہے ہیں اور دنیا میں ایک بڑی تعداد میں حافظ قرآن موجود ہیں۔ اس کے علاوہ قرآن کی توہین کرنے والوں کو روئے زمین پر عاشقان قرآن برداشت نہیں کرسکتے ہیں۔ جیسا کہ سلمان رشدی اور تسلیمہ نصرین مرتدوں کی مثال موجود ہے۔ جنہیں مسلمانوں کے غضب اور نفرت کا شکار ہونا پڑا اور مخالفین قرآن کی آغوش میں پناہ لینی پڑی۔ اور مسلمانوں کے قہر و غضب سے بچنے کے لیے قید تنہائی کی زندگی گزارتے ہیں۔ یہ قرآن مجید کی حفاظت کا زندہ ثبوت ہے۔

سورۃ الطَّارِق مکیۃ

اٰیتُہا:17 رکوعھا:1

بسم اللہِ الرَّحمٰن الرَّحیم

وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِo وَمَا أَدرَاکَ مَا الطَّارِقُo النَّجمُ الثَّاقِبُo إِن کُلُّ نَفسٍ لَّمَّا عَلَیہَا حَافِظٌo فَلیَنظُرِ الإِنسَانُ مِمَّ خُلِقَo خُلِقَ مِن مَّاءٍ دَافِقٍo یَخرُجُ مِن بَینِ الصُّلبِ وَالتَّرَائِبِo إِنَّہُ عَلَیٰ رَجعِہِ لَقَادِرٌo یَومَ تُبلَی السَّرَائِرُo فَمَا لَہُ مِن قُوَّةٍ وَلَا نَاصِرٍo وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجعِo وَالأَرضِ ذَاتِ الصَّدعِo إِنَّہُ لَقَولٌ فَصلٌo وَمَا ہُوَ بِالہَزلِo إِنَّہُم یَکِیدُونَ کَیدًاo وَأَکِیدُ کَیدًاo فَمَہِّلِ الکَافِرِینَ أَمہِلہُم رُوَیدًاo

مضمون

مناظرِ کائینات کی قسم سے لوگوں کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرائی گئی ہے کہ جس طرح یہ کائینات تمام مخلوق، کیڑے مکوڑے، پرندے و چرندے، درندے اور حیوان و انسان سب اپنے خالق کی نگہبانی اور نگرانی میں ہیں۔ ہر کوئی شئے اور ہر کوئی جان اللہ تعالیٰ کی نظر میں ہے۔ اُس نے جس طرح انسان کو نطفے کے ایک قطرہ سے وجود میں لایا۔ اسی طرح مرنے کے بعد اسے دوبارہ زندہ کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ قرآن کی شان میں فرمایا گیا ہے کہ جس طرح بارش سے زمین سرسبز و شاداب ہوتی ہے اسی طرح قرآن کے حقائق سے انسان کی زندگی سرسبز و شاداب یعنی بامعنی زندگی (meaningful life) بن جاتی ہے۔

آخر میں فرمایا گیا ہے کہ قرآن کے خلاف کافروں کی تمام سازشیں اور تدبیریں ناکام ہوجائیں گی اور قرآن کی دعوت ان پر غالب آجائے گی۔

وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ(١)

قسم ہے آسمان کی اور رات کو نمودار ہونے والے کی۔

وَمَا أَدْرَاكَ مَا الطَّارِقُ(٢)

اور تم کیا جانو وہ رات کو نمودار ہونے والا کیا ہے

النَّجْمُ الثَّاقِبُ(٣)

ایک چمکتا ہوا تارا

إِن كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ(٤)

یقینا ہر متنفس پر ایک نگہبان مقرر ہے

سورہ بروج کی طرح اس سورہ میں بھی آسمانی مخلوق کی قسم کھائی گئی ہے۔ کسی امر کا یقین دلانے کے لیے یا کسی بات کی صداقت ثابت کرنے کے لیے قسم کھائی جاتی ہے۔ قرآن کا اسلوب ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی چیز کی دلیل سے پہلے اپنی پیدا کردہ کسی مخلوق کی قسم کھاتا ہے۔ یہاں یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ ہر متنفس پر اللہ تعالیٰ نگران اور نگہبان ہے۔ اس لیے اس حقیقت پر یقین اور غور و فکر کرانے کے لیے قسم کھائی گئی ہے۔

پہلے طارق کی قسم کھائی گئی ہے پھر اگلی آیت میں اس کا مفہوم بیان کیا گیا ہے کہ طارق ایک چمکتا ہوا تارہ ہے۔ اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ ہر متنفس پر ایک نگہبان مقرر ہے۔ اس نگہبان سے مراد خود اللہ تعالیٰ کی ذات مقدس ہے۔

دنیا کی ہر مخلوق چاہے جاندار ہو یا بے جان اللہ کی نگرانی میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانوں کو ایک بے لگام اونٹ کی طرح آزاد نہیں چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ جہاں چاہیں گھومیں پھریں اور جو چاہیں کریں کوئی انہیں دیکھنے والا نہیں ہے اور کوئی انہیں روکنے والا نہیں ہے۔ انسانوں کی اس غلط فہمی کو اس حقیقت سے دور کیا جارہا ہے کہ انسان کی ہر حرکت کو اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے۔ وہ محیط کل ہے چاہے انسان خلوت میں ہو یا جلوت میں وہ ہر جگہ ہر وقت اس کے سارے کاموں (activities) کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔ انسان کو اس حقیقت کا ادراک ہونا چاہیے کہ وہ تنہائی میں بھی تنہا نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کا واجد (وجود میں لانے والا) ہر وقت اس کا ناظر، نگہبان اور نگران ہے۔ اس حقانیت پر ایمان رکھنے والا کبھی گناہ اور اللہ کی نافرمانی کا خیال بھی نہیں کرسکتا ہے۔ جب وہ ہر جگہ خدا کو موجود پاتا ہے تو خوف خدا کی وجہ سے وہ ہر برائی سے باز رہتا ہے۔ اس آیت سے ایک ہیبت ناک احساس ابھرتا ہے کہ جب انسان ہر آنکھ سے پوشیدہ ہوتا ہے تب بھی ایک آنکھ اسے دیکھ رہی ہے اور جب تنہائی میں اسے کوئی نگرانی کرنے والا اور ٹوکنے والا نہیں ہے اس تنہائی میں بھی اللہ کی نظر پردہ چاک کرکے اس تک پہنچ جاتی ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کو حاضر وناظر جانتا ہے۔

کائینات کے مناظر سے اللہ تعالیٰ کی شان و شوکت اور عظمت بیان کی جاتی ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ کی قدرت اتنی بڑی کائینات کو سنبھالے ہوئے ہے اور اس کا ذرہ ذرہ اللہ کی عظمت و شان کی گواہی دیتا ہے اور انسان بھی اللہ کی قدرت کی یہ شان دیکھ رہا ہے وہ رب العالمین کے بارے میں کیسے اس بدگمانی کا شکار ہوسکتا ہے کہ اس کی حرکات وسکنات کو کوئی نہیں دیکھتا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جس دل میں خدا کا خوف ہوتا ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی معرفت کا نور ہوتا ہے۔ خدا سے ڈرنے والا راہ راست پر ہے اور خدا سے بے خوف انسان گمراہی اور غرور میں مبتلا ہے۔

فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ مِمَّ خُلِقَ(۵)

پس انسان ذرا غور کرے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے

خُلِقَ مِن مَّاءٍ دَافِقٍ(٦)

اسے اچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے

يَخْرُجُ مِن بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ(٧)

جو پیٹھ اور پسلیوں کے درمیان میں سے نکلتا ہے

إِنَّهُ عَلَىٰ رَجْعِهِ لَقَادِرٌ(٨)

بے شک اللہ اس کے دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے

آفاق بالا میں اپنی قدرت کی نشانیوں کی طرف متوجہ کرنے کے بعد اب اللہ تعالیٰ انسان کو اپنے وجود (نفس) پر غور کرنے کی دعوت دے رہا ہے کہ انسان اپنی تخلیق پر غور کرے اور خالق کائینات کی کارکردگی کو دیکھ لے اور پھر اپنے ضمیر کی آواز سن لے کہ جس خالق نے یہ کائینات بنائی اُسی نے انسان کو بھی بنایا ہے۔ ذرا اپنی پیدائش پر نظر ڈالئے کہ کس حقیر اُچھلتے پانی کے قطرے سے اسے پیدا کیا گیا ہے جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے بیچ میں سے نکلتا ہے۔ ایک مدت تک انسان کو یہ بات معلوم نہ تھی کہ یہ مادہ تولید (منی) انسان کے کن مقامات میں پیدا ہوتا ہے لیکن جدید علم سائنس کے ذریعہ سے یہ بات انسان کے علم میں آئی کہ مرد کا مادۂ تولید منی (sperm) ریڑھ کی ہڈیوں میں تشکیل پاتا ہے اور عورت کا مادۂ تولید منی (egg) عورت کے سینہ کی بالائی ہڈیوں میں وجود پاتا ہے۔ پھر یہ دونوں مادہ ہائے تولید sperm مرد کا مادۂ تولید اور egg عورت کا مادۂ تولید قرار مکین یعنی عورت کی بچہ دانی (womb) میں مل جاتے ہیں اور ان کے آپس میں ملنے سے انسان کی پیدائش ہوتی ہے۔ قرار حمل سے لے کر پیدائش تک بچے کو مختلف مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ قرار مکین کا ذکر سورہ مرسلات میں ۲۰ اور ۲۱ آیات میں ہے:

أَلَمْ نَخْلُقْكُّم مِّن مَّاءٍ مَّهِينٍo فَجَعَلْنَاهُ فِي قَرَارٍ مَّكِينٍo

کئی مرحلوں سے گزر کر یہ اچھلتا ہوا پانی کا قطرہ انسان ناطق بن جاتا ہے۔ انسان کو پیدائش سے موت تک جن مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے ان سے زیادہ مراحل میں سے اس منی کے قطرہ کو گزرنا پڑتا ہے اور پھر یہ منی کا قطرہ انسانی وجود میں جنم لیتا ہے۔ مرد اور عورت کے ملاپ (intercourse) کے وقت مرد کی منی (sperm) جو رحم مادر میں ٹپکائی جاتی ہے ایک بار کے انزال (منی کا باہر نکلنا Seminal discharge) میں کروڑوں کی تعداد میں خلیے (cells) موجود ہوتے ہیں۔

خلیہ (cell) جانداروں کے جسم کی ایک بنیادی اکائی (unit) ہے۔ مادے کی ان جاندار اکائیوں کے ملنے سے بافتین(tissues) اور پھر بافتین کے ملنے سے اعضا بن جاتے ہیں۔ تمام جانداروں کے اجسام ان خلیوں سے بنتے ہیں۔ (علم حیوانیات) یہ چھوٹی سی مخلوق خلیہ رحم مادر میں استقرار پاتے ہی غذا کی تلاش میں مصروف ہوجاتی ہے۔ اس میں کھانے کی خاصیت پیدا ہوتی ہے۔ رحم مادر کی چار دیواری میں خون سے اس کی غذا تیار ہوجاتی ہے۔ خلیہ کو جب غذا پہنچتی ہے تو وہ ایک نئے عمل کا آغاز کردیتا ہے۔ اس عمل سے بے شمار خلیے پیدا ہو جاتے ہیں۔ پھر یہی خلیے انسان کے پورے جسم کو تعمیر کردیتے ہیں۔ یعنی انسان کو وجود بخشتے ہیں۔ ان خلیوں کے ایک ایک گروپ سے ایک ایک جُز تیار ہونے لگتا ہے۔ مثلاً خلیوں کا ایک گروپ ہڈیوں کا ڈھانچہ تشکیل دیتا ہے۔ اس طرح ہر ایک علٰحدہ گروپ اپنا سفر جاری رکھے ہوئے اعصاب veins شریانیں (artries) ہڈیاں (bones) گوشت پٹھے (flesh) غرض جسم کے ہر ایک جُز کی تعمیر ہوجاتی ہے۔ اور پھر ایک مکمل جسم تعمیر ہوتا ہے۔ جسم کی یہ تعمیر بھی حیران کن ہے۔ ہر چھوٹا سا خلیہ جب سفر شروع کرتا ہے تو اسے اپنا راستہ اور مقام معلوم ہوتا ہے۔ ان خلیوں میں کوئی ایک خلیہ بھی اپنے راستے سے بھٹک نہیں جاتا ہے۔ مثلاً جن خیلوں کے گروپ کے ذمہ آنکھ بنانے کا کام ہے اسے معلوم ہے کہ انسان کی کس جگہ پر اپنا قبضہ جما کر آنکھ بنانا ہے۔ اس طرح سے ہر ایک گروپ علاحدہ طور پر اپنا سفر شروع کرکے اپنے مخصوص مقام پر پہنچتا ہے۔ اللہ کی ذات عظیم کے بغیر کون ہے وہ طاقت جو اس نظام کو اس طرح چلاتا ہے۔ ملحد (atheist) کہے گا کہ ایک قدرتی عمل (natural process) ہے۔ لیکن خدا پر ایمان لانے والا اس قدرتی عمل کو اللہ تعالیٰ کی قدرت کا نظام قرار دیتا ہے۔یہی حقیقت ہے،یہی عقل کا تقاضا ہے۔ اس لیے یہ ایک مصدقہ (authenticated) صداقت (reality) ہے کہ جن خلیوں سے انسان وجود میں آتا ہے ان کا پیدا کرنے والا اور پھر ان سے انسان بنانے والا صرف خالق کائینات ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جس انداز سے انسان کو پیدا کیا کسی کو اس پر اعتراض نہیں ہے۔ پاک اور ناپاک دونوں کا پیدا کرنے والا اللہ ہے لیکن جو انسان گندگی سے دور رہے اور پاکیزگی اختیار کرے وہ اللہ کو محبوب ہے اور جو گندگی اور ناپاکی کو پسند کرے اللہ اس سے دور رہتا ہے۔ اسی طرح ایمان لانے والے اور کفر کرنے والے دونوں کو اللہ تعالیٰ نے ہی پیدا کیا ہے لیکن جو اللہ پر ایمان لاتا ہے اور اس کی بندگی کرتا ہے اللہ اسے اپنا محبوب بندہ قرار دیتا ہے اور جو اپنے خالق کا کفر کرتا ہے اللہ اس سے نفرت کرتا ہے۔ انسان اپنی حیثیت کو پہچان کر اپنے خالق کو پہچان لے اور اسی معبود حقیقی کی عبادت اور فرمابرداری میں زندگی گزارے۔

بے شک اللہ تعالیٰ انسان کو دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اہتمام کے ساتھ ایک نازک طریقے سے پیدا کیا۔ اسے مختلف مرحلوں سے گزارا۔ ہر مرحلے پر اس کی نگہبانی کی۔ ماں کے رحم میں اسے غذا فراہم کرکے نشو ونما دی اور پیدائش کے ساتھ ہی اسے اپنی ماں کا دودھ پینا سکھایا۔ جبلت (instincts) کے ذریعے نو زائیدہ بچے (new born infant) کی رہنمائی کی۔ ایام طفلی (infancy) میں اسے جبلی قوتوں سے مدد کی اور اس دوران ماں کی فطری محبت سے اس کی پرروش کرائی۔ یہاں تک کہ یہ شیر خوار بچہ اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہوگیا جس اللہ نے انسان کو پیدا کرکے اس طرح کی نگرانی کی وہی اللہ اسے موت کے بعد دوبارہ زندہ کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے پہلی بار پیدا کیا اسے دوبارہ پیدا کرنے میں کوئی دِقت نہیں آسکتی ہے۔ اس لیے یہ سوچنا کہ اللہ تعالیٰ انسان کو مرنے کے بعد جب کہ اس کی ہڈیاں مٹی میں مل چکی ہوں، کیسے پیدا کرسکتا ہے خلاف عقل ہے اور یہ سوچ کہ انسان کی پیدائش ایک قدرتی واقع (natural incident) ہے نادانی اور بے سمجھی کے بغیر کچھ نہیں ہے۔

يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ(۹)

جس دن سب چھپی ہوئی باتوں کی جانچ پڑتال ہوگی

فَمَا لَهُ مِن قُوَّةٍ وَلَا نَاصِرٍ(۱۰)

اس دن انسان کے پاس نہ کوئی زور ہوگا اور نہ کوئی مددگار

یہاں یوم الحساب کا ذکر ہورہا ہے۔ جس دن رب العالمین کے سامنے انسانوں کو جوابدہی کے لیے پیش کیا جائے گا زندگی کے سارے راز کھل جائیں گے اور سارے معاملات سامنے آئیں گے۔ دنیا میں انسانوں کے ایسے معاملات ہوں گے جن کو انہوں نے راز میں رکھا تھا، اُس دن وہ سب خدا کے سامنے کھل جائیں گے اور کوئی عمل خفیہ نہیں رہے گا۔

دنیا میں کسی نے قتل کیا تھا، کسی نے بدکاری کی تھی، کسی نے کسی کی حق تلفی کی تھی اور کسی نے ڈاکہ زنی کی تھی اور یہ لوگ اپنے جرائم چھپانے میں کامیاب ہوئے تھے اور یہ جرائم راز میں تھے۔ مظلوموں کو کسی نے انصاف فراہم نہ کیا تھا اور ظالموں کو کوئی سزا نہ ملی تھی۔ خدا کی بارگاہ میں چونکہ دیر ہے اندھیر نہیں۔ اب بارگاہ الٰہی میں دنیا کا اندھیرا روشن ہوجائے گا اور سب معاملات جو چھپائے گئے تھے اللہ کے سامنے پیش کئے جائیں گے۔ اب کسی کے پاس اپنے چھپائے ہوئے معاملے کو چھپانے کی طاقت نہ ہوگی اور وہ راز بھی کھل جائیں گے جو انسانوں کی نیتوں سے تعلق رکھتے تھے۔ جس نے جو کام جس نیت سے کیا ہو وہ نیت بھی اب ظاہر ہوجائے گی۔ کسی نے کوئی نیک کام کیا ہو لیکن اس کے پیچھے اسے اپنے مفاد کے سوا کچھ نہ تھا لیکن لوگوں کو دھوکے میں رکھا تھا خدا کی بارگاہ میں اسے خجالت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ظاہری ہمدردیوں کی آڑ میں دھوکہ دینے والے اس دن بے نقاب ہوجائیں گے۔ خدا جانے کیسے کیسے راز کھل جائیں گے جن سے انسان حیران ہوجائیں گے۔ اس کے علاوہ کسی نے نیک کام کیا ہو اور یہ کام اس کے مرنے کے بعد بھی جاری رہا ہوگا تو اس دن اس کا پورا حساب کیا جائے گا تو اس کے پاس نیکیوں کا خزانہ ہوگا۔ بقول شاعر ؎

فریب یارو ہے روز محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیوں کر

جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستین کا

اس دن ان کے پاس نہ کوئی طاقت ہوگی نہ کوئی مددگار:

قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی عدالت میں انسان بے بس اور بے یارومددگار اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے انتظار میں ہوگا۔ دنیا کی شان و شوکت، مال و دولت، تاج و تخت، حکومت و سیاست، تقریر و تحریر، تہذیب و ثقافت، دست کاری و قلم کاری، علوم و فنون سب کچھ بھول کر انسان رب العالمین کے دربار میں کھڑا ہوگا کوئی سفارش کرنے والا نظر نہ آئے گا۔ اور نہ کہیں سے کوئی مددگار پائے گا۔ اسے اپنے دائیں بائیں کسی کی فکر نہ ہوگی صرف النفسی یعنی اپنی فکر میں محو ہوگا۔

وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ(۱۱)

قسم ہے آسمان کی جو بارش برساتا ہے

وَالْأَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ(۱۲)

اور قسم ہے زمین کی جو پودا اگتے وقت پھٹ جاتی ہے

إِنَّهُ لَقَوْلٌ فَصْلٌ(۱۳)

بے شک کلام الٰہی دوٹوک بات ہے

وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ(۱۴)

اور یہ کلام کوئی ہنسی مذاق نہیں ہے

ان آیات میں قرآن کے دفاع (defencee) میں مضبوط دلائل کے ساتھ دعویٰ پیش کیا گیا ہے کہ یہ قرآن ایک مستحکم اور واضح کلام ہے جو رب العالمین کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔ یہ قول فیصل ہے یعنی فیصلہ کن بات ہے۔ اس کلام میں کوئی خامی اور غلطی نہیں ہے۔ خدا کا یہ کلام قرآن مجید فضول گوئی اور دل لگی کی باتوں سے محفوظ ہے۔ یہ کلام الٰہی سب کلاموں سے بہتر اور بالاتر ہے اور سب کلاموں پر حاوی ہے۔ اس کے اصولوں میں کوئی تضاد اور اختلاف نہیں اور اس کے احکام میں کوئی نقص اور کوتاہی نہیں ہے۔

اب قرآن مجید کی عظمت آفاقی مناظر کی مثالوں سے سمجھائی جاتی ہے۔

آسمان سے پلٹ پلٹ کر بارش برستی ہے اور زمین اس سے سیراب ہوکر سرسبز اور شاداب ہوجاتی ہے۔ پلٹ کر بارش کا برسنا سے دورانِ آب (water cycle) بھی مراد ہوسکتا ہے۔ جس طرح سمندروں کا پانی بھاپ (بادل) بن کر بارش کی صورت میں برستا ہے اور کچھ پانی زمین میں جذب ہوکر اسے سرسبز بنادیتا ہے اور پیڑ، پودے اور فصل پیداوار اگنے میں مددگار بنتا ہے اور باقی ندی نالوں اور دریاؤں کی شکل میں کھیتوں کو سیراب کرتا ہے۔ اور انسان کی ضروریات زندگی بھی پورا کرتا ہے اور پھر سمندر میں پہنچ جاتا ہے۔پھر سورج کی گرمی سے بخارات میں تبدیل ہوکر اپنا عمل دہراتا ہے۔ جس طرح پانی کے بار بار برسنے سے زمین کی سطح پھٹ جاتی ہے اور فصل پیداوار اور پیڑ پودے اُگتے ہیں۔ جو انسانوں کے لیے جسمانی طور زندہ رہنے کا ذریعہ ہے۔ قرآن مجید اسی طرح کا رحمت باران ہے جس سے انسانوں کی روحانی زندگی اصولوں اور اخلاق سے سرسبز اور شاداب ہوتی ہے۔ قرآن کی ہدایات پر عمل کرکے دنیا کے سارے انسان پُرامن اور پر لطف زندگی گزار سکتے ہیں۔ قرآنی تعلیم میں ہی مہذب زندگی کی ضمانت (guarentee) ہے۔یہ کوئی ہنسی مذاق نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ سنجیدہ کلام ہے۔ لیکن اس سے وہی لوگ استفادہ کرتے ہیں جو اس پر ایمان لاتے ہیں اور اس کی ہدایات اور احکام اپنی زندگی پر نافذ کرتے ہیں۔ اس تعلیم کو اپنانے سے انسان کی حیوانیت انسانیت میں تبدیل ہوتی ہے۔ جو لوگ آسمان سے برسنے والی بارش کا صحیح استعمال کرکے اپنے کھیتوں کو سینچ کر اچھی فصل پیداوار حاصل کرتے ہیں انہیں ہی بارش کے پانی کا فائدہ پہنچتا ہے۔ اسی طرح جو لوگ قرآن مجید کی تعلیم کو اپناتے ہیں اس پر عمل کرتے ہیں ان کی زندگی بارونق اور بامعنی ثابت ہوتی ہے اور یہ بارونق اور معزز زندگی تمام انسانوں کے لیے مشعل راہ بن جاتی ہے۔ اچھا کاشت کار وہی ہے جو آسمان سے برسی ہوئی بارش سے فائدہ اٹھا کر اپنی زندگی کے لیے بہترین سروسامان حاصل کرتا ہے اور نادان کاشت کار وہ ہے جو اللہ کی اس نعمت (بارش) سے فائدہ نہ اٹھاتا ہے اور پھر پریشانیوں اور تکالیف سے دوچار ہوجاتا ہے۔ اسی طرح بہترین انسان وہ ہے جو کلام الٰہی سے فائدہ اٹھاکر اپنی زندگی کو بارونق اور بامعنی بناتا ہے اور نادان انسان وہ ہے جو قرآن کی تعلیم کو نظرانداز کرکے اپنی زندگی کو بے معنی اور بے مقصد بنادیتا ہے۔

موسم اچھا پانی وافر مٹی بھی زرخیز

جس نے اپنا کھیت نہ سینچا وہ کیسا دہقان

(اقبالؒ)

إِنَّهُمْ يَكِيدُونَ كَيْداً(١٥)

بے شک یہ لوگ ایک چال چل رہے ہیں

وَأَكِيدُ كَيْداً(١٦)

اور میں بھی ایک چال چل رہا ہوں

فَمَهِّلِ الْكَافِرِينَ أَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا(۱۷)

پس اے نبی ان کافروں کو ان کے حال پر چھوڑدو

سورہ کی ان آخری آیات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یقین دہانی کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو سب کچھ معلوم ہے کہ آپ کے مخالفین آپ کی دعوت کو بدنام کرنے کی مذموم کوشش کررہے ہیں اور اسے ناکام کرنے کے لیے ہر طرح کے داؤپیچ کھیلتے ہیں۔ یہ لوگ ایسی تدبیریں کرتے ہیں جن سے یہ اپنے اس مقصد کو پورا کرنا چاہتے ہیں کہ حق کو ابھرنے نہ دیں اور یہ اپنی پھونکوں سے اسلام کے چراغ کو بجھا دینا چاہتے ہیں۔ اس لیے کہیں مسلمانوں پر تشدد کرتے ہیں تاکہ وہ خوف زدہ ہوکر اللہ کے دین کو چھوڑ دیں اور کہیں لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ نیا دین ہمارے آبائی دین کے خلاف محض ایک پروپگنڈہ ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنا یہ نیا دین پیش کرکے لوگوں پر حکومت کرنا چاہتے ہیں اور جو لوگ ان کی ان بے بنیاد باتوں کو مسترد کرکے دین اسلام سے اپنی دلچسپیاں اور ہمدردیاں برقرار رکھتے تھے ان سے قطعہ تعلق کرتے تھے الغرض جو ان کے بس میں ہوتا تھا وہ کرتے تھے تاکہ اسلام کی دعوت کو روک دیا جائے۔ آئے روز یہ لوگ مسلمانوں کے خلاف کوئی نہ کوئی ایسی تدبیر کرتے تھے جس سے مسلمانوں کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کی طرف سے اطمینان بخشا جاتا ہے کہ مخالفین کی یہ سب چالیں اور حربے ہمارے علم میں ہیں ہم انہیں کامیاب نہیں ہونے دیں گے بلکہ ہم بھی اپنی چال چل رہے ہیں جس کی انہیں خبر نہیں ہے۔ ہم انہیں ڈھیل دے رہے ہیں اور یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان کی یہ سازشیں کامیاب ہورہی ہیں لیکن یہ ایک بڑے دھوکے میں ہیں۔ وہ کبھی اپنی ان سازشوں اور چالوں میں کامیاب نہیں ہوجائیں گے۔ یہ ان کے لیے صرف ایک فریب ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یقین دلایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے وہ خوب جانتا ہے کہ ان

مخالفین میں سے کچھ لوگ اپنے انجام بد کو پہنچ جائیں گے باقی سب لوگ دائرہ اسلام میں شامل ہو کر پوری دنیا میں اسلام کا پیغام پہنچائیں گے اور اس دین کا پرچم لہرائیں گے جو وقت نے ثابت کر دیا۔

سورہ کے آغاز پر پھر نظر دوڑائیں تو واضح ہوتا ہے کہ دراصل انسان سخت مغالطہ کا شکار ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ اُس کو اچھلتے ہوئے منی کے قطرہ سے پیدا کیا گیا اور اب وہی خدا کے خلاف سازشیں کرنے لگا اسے یہ معلوم نہیں ہے کہ جس ذات پاک کے خلاف وہ جارحانہ اور مخالفانہ رویہ اختیار کیا ہوا ہے وہ اس کا خالق یعنی پیدا کرنے والا ہے۔ وہ محیط اور محافظ ہے ہدایت دینے والا اور حالات کا رخ بدل دینے والا ہے۔ موت دینے والا اور دوبارہ زندہ کرنے والا ہے۔ قادر مطلق ہے اور سب پر غالب ہے۔ تو اس کی چالیں اور سازشیں کس طرح کامیاب ہو سکتی ہیں۔ اس حقیقت کے پیش نظر رب العالمین اپنے محبوب پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ترغیب دے رہے ہیں کہ ان کافروں کو سزا دینے میں جلدی نہ کریں۔ آپ انہیں ذرا مہلت دیجئے ان کا فیصلہ ہوچکا ہے۔ یہ بُری طرح ناکام ہوچکے ہیں۔ یہ اب اپنے ترکش سے آخری تیر چلا رہے ہیں۔ ان کی تعمیر کردہ باطل کمزور عمارت اب مسمار ہورہی ہے اور آپ جلدہی باطل عمارت کے اس ملبے کو صاف کرکے حق پرستی اور دین اسلام کی نئی عمارت تعمیر کریں گے۔ یہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کی طرف سے ایک پیار بھرا پیغام آرہا ہے کہ ان لوگوں کو مہلت دیجئے اور ان کی طرف سے مایوس ہوکر ان کو بد دعا نہ دیجئے۔ چونکہ نبیوں کی دعا اللہ کے ہاں فوراً قبول ہوتی ہے جس طرح حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی نافرمان قوم کو بد دعا دی تو وہ غرق آب ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا جارہا ہے کہ انہیں ڈھیل دیجیے انہیں فی الحال اپنے حال پر چھوڑ دیجئے آپ جلد ہی ان کا حال دیکھ لیں گے کہ کھیت کے پھوسرا
(unwanted plant) کی طرح انہیں کھیت سے نکالا جائے گا اور نہ صرف مکہ بلکہ تمام دُنیا کو اسلام کی سرسبز شاداب کھیت میں تبدیل کیا جائے گا واقعی اسلام کی اس سرسبز اور شاداب کھیت کو پوری دنیا نے دیکھ لیا جو آج بھی لہلہاتی ہوئی نظر آرہی ہے۔

سورۃ الاعلیٰ مکیۃ

اٰیٰتُہا:19 رکوعھا:1

بسم اللہِ الرَّحمٰن الرَّحیم

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَىo الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّىٰo وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰo وَالَّذِي أَخْرَجَ الْمَرْعَىٰo فَجَعَلَهُ غُثَاءً أَحْوَىٰo
سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنسَىٰo إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۚ إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفَىٰo وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرَىٰo فَذَكِّرْ إِن نَّفَعَتِ الذِّكْرَىٰo
سَيَذَّكَّرُ مَن يَخْشَىٰo وَيَتَجَنَّبُهَا الْأَشْقَىo الَّذِي يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرَىٰo ثُمَّ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰo قَدْ أَفْلَحَ مَن تَزَكَّىٰo
وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّىٰo بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَاo وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰo إِنَّ هَٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰo صُحُفِ
إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰo

تعارف

اس سورہ کے تین موضوع ہیں:

(۱) توحید (۲) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایات (۳) آخرت کی فکر کرنا

ابتدائی آیات میں اللہ تعالیٰ کے نام کی تسبیح کرنے اور اسے اچھے ناموں سے پکارنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ آپ اس کے نام کی تسبیح کریں جو آپ کا رب یعنی پروردگار مالک اور خالق ہے۔ اُسی نے کائینات کی ہر چیز بنائی اس کا تناسب قائم کیا اور اس کی تقدیر بنائی۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے کہ آپ قرآن کو یاد کرنے کی فکر نہ کریں یہ قرآن آپ کو خود بخود یاد ہوجائے گا اور یہ کہ آپ کا کام تبلیغ کرنا اور لوگوں کو اسلام کی دعوت دینا ہے پس جو نصیحت سننے کے لیے تیار ہو وہ اسلام قبول کرے گا اور جو سننے کے لے آمادہ نہ ہو اس کے لیے آپ پریشان نہ ہوجائیں کیونکہ دعوت وہی لوگ قبول کرتے ہیں جن کے دلوں میں اللہ کا خوف ہوتا ہے۔ آخر میں فرمایا گیا ہے کہ کامیابی صرف ان لوگوں کو ملے گی جو اپنے رب کے نام کا ذکر کریں اور نمازیں ادا کریں گے اور فانی دنیا کے مال ودولت کی فکر کے بجائے آخرت کی فکر کریں جہاں ہمیشہ رہنا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کے صحیفوں میں بھی ایسی ہی ہدایات موجود ہیں لہٰذا آپ کی دعوت کوئی نئی بات نہیں ہے۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْأَعْلَی(۱)

اپنے رب کے نام کی تسبیح کر جو سب سے بلند ہے

الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی(۲)

جس نےپیدا کیا پھر تناسب قائم کیا

وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَہَدٰی(۳)

اور جس نے تقدیر بنائی پھر راہ دکھائی

وَالَّذِیٓ أَخۡرَجَ الۡمَرۡعَىٰ(۴)

اور جس نے چارہ نکالا

فَجَعَلَهُۥ غُثَآءً أَحۡوَىٰ(۵)

پھر اس کو کوڑا سیاہ بنایا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے کہ آپ اپنے رب کو اعلیٰ ناموں سے پکاریں۔ رب کا معنی ہے پروردگار، مالک اور مربّی۔ اعلیٰ کا معنیٰ سب سے برتر، سب سے بالا، سب پر غالب تسبیح کا معنیٰ یاد کرنا، بار بار یاد کرنا، پاکیزگی سے یاد کرنا مطلب یہ ہے کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ اپنے رب کو پاکیزہ ناموں سے یاد کرئیں۔ اور اس کی پاکیزگی بیان کریں اور بار بار اس کا ذکر کرتے رہیں۔ وہ سب سے اوپر سب سے برتر وبالا اور سب پر غالب ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ان ناموں سے یاد کیا جائے جو اس کے لایق ہیں۔ ایسے ناموں کا استعمال نہ کیا جائے جن میں گستاخی یا شرک کی آلائش ہو۔ بہتر یہ ہے کہ ایسے ناموں کا استعمال کیا جائے جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے جو صفاتی نام ہیں انہیں اس طرح استعمال نہ کیا جائے کہ انسان اللہ کی صفات میں شامل ہوجائے مثلا رحمان، رزاق اور غفار کے ناموں سے اگر کسی انسان کو پکارا جائے تو یہ جائز نہیں ہے کیونکہ براہ راست اللہ کے نام سے انسان کو پکارنا شرک ہے۔ اس لیے اللہ کے ناموں کے ساتھ بندہ ہونے کی نسبت بڑھا کر عبدالرحمٰن، عبدالرزاق، عبدالغفار وغیرہ کہہ کر پکارنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اللہ کا نام ادب اور احترام کے ساتھ لیا جانا چاہیے۔ ہنسی مذاق یا کسی ناپاک چیز کے لیے اللہ کا نام نہیں لینا چاہیے اور جہاں پر اندیشہ ہو کہ اللہ کا نام لینے سے کوئی گستاخی پر اتر آئے وہاں بھی اللہ کا نام نہ لیا جائے یا اگر یہ اندیشہ ہو کہ کسی بات پر اللہ کا نام سننے والا غصے میں آجائے تو اس وقت بھی اللہ کا نام لینا جائز نہیں ہے۔ امام مالک سے یہ بات منسوب ہے کہ ان کے پاس اگر کوئی سائل کچھ مانگنے کے لیے آتا تو اگر ان کے پاس دینے کے لیے کچھ موجود نہ ہوتا تو وہ یہ نہ کہتے کہ اللہ آپ کی مدد کرے مجھے دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اس لیے خدا کے واسطے معاف کرو بلکہ کسی اور طرح کی معذرت کرکے جواب دیتے کیونکہ سوال کرنے والا کبھی معذرت کرنے پر ناراض بھی ہوتا ہے اور اس ناراضگی کی وجہ سے اسے اللہ کا نام سننا بھی ناگوار ہوجاتا ہے۔ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدے میں سُبحان ربی الاعلیٰ پڑھنے کا حکم اسی آیت کے نازل ہونے کے بعد دیا ہے اور سورہ واقعہ کی آخری آیت فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّکَ الْعَظِیْمِ کی آیت کے نازل ہونے پر سُبحان ربی العظیم پڑھنے کی ہدایت دی۔

اللہ تعالیٰ نے ہی ہر چیز کو پیدا کیا تناسب قائم کیا اور تقدیر بنائی اور پھر راہ دکھائی۔ اللہ تعالیٰ نے کائینات لی تمام مخلوقات کو پیدا کر کے پھر انہیں اپنے حال پر چھوڑ نہیں دیا بلکہ ہر مخلوق میں تناسب قائم کیا یعنی ان مخلوقات کو موزونیت، موافقت اور مناسبت بخشی۔ ہر مخلوق میں فطری ہم آہنگی ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے پوری کائینات میں توازن اور تناسب قائم کر دیا ہے کائینات کا یہ نظام اس طرح چل رہا ہے کہ ہر کوئی مخلوق اپنے اپنے مناسب طریقے سے کام پر لگا ہوا ہے۔ اس کے بعد خالق کائینات نے ان تمام پیدا کردہ مخلوقات کی تقدیر بنائی اور ہر ایک کو اپنے اپنے راستے پر چلنے کی ہدایت فرمائی۔

قدر کا ترجمہ تقدیر سے کیا گیا ہے۔ تقدیر کا معنی ہے قدرت کا وہ اندازہ یا فطرت جو خدا تعالیٰ نے اپنی پیدا کردہ ہر ایک چیز میں رکھ دیا ہے۔ بعض علما نے منصوبہ (plan) قیمت (value) قسمت (fate) سے اس کا ترجمہ کیا ہے۔

ہدایت کا معنیٰ ہے رہنمائی، رہبری، سیدھا راستہ، راہ دکھانا وغیرہ

اللہ تعالیٰ نے سب مخلوقات کو مناسبت میں پیدا کیا اور ہر مخلوق کے لیے کام کرنے کا منصوبہ بنایا اور ہر ایک کو اپنے اپنے راستے پر لگا دیا۔ چھوٹی شئے سے لے کر بڑی شئے تک ہر ایک میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اپنی ذمہ داری ودیعت کردی اور کام الہام کیا اور پھر ہر ایک کی رہنمائی فرمائی۔ یہ خصوصیت ہر ایک مخلوق میں پائی جاتی ہے زندگی کے ہنگامہ میں خدا کی ہر ایک مخلوق اس حقیقت کی شہادت دے رہی ہے ہر شئے ایک خاص طریقہ سے اپنی منزل مقصود تک پہنچنے میں لگی ہوئی ہے تمام مخلوقات پوری موافقت اور ہم آہنگی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ پرندے جو موسم سرما میں گرم علاقوں کی طرف ہجرت کرتے ہیں۔ جبلت کی مدد سے اپنے وطن لوٹ آتے شہد کی مکھی سبزپتوں اور پھولوں کو چوسنے کے لیے سینکڑوں میل دور جاکر اپنے چھتے پر واپس آجاتی ہے۔ مکھیاں جبلت کی وجہ سے کام کرکے اپنے چھتہ کے اندر مختلف سائز کے کمرے بنادیتی ہیں نسل کشی کرنے والی مکھیوں کے لیے الگ کمرے تیار کیے جاتے ہیں۔ شہد تیار کرنے والی مکھیاں اور حفاظت کرنے والی مکھیاں الگ کمروں میں رہائش پذیر ہوتی ہیں۔ ملکہ کے لیے چھتے میں علٰحدہ رہائشی کمرہ ہوتا ہے جس طرح انسانوں میں ملک کا نظام بادشاہ یا حاکم اعلیٰ چلاتا ہے اسی طرح شہد کی مکھیوں میں اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی جبلت کی وجہ سے اور فطرت کی رہنمائی میں ایک نظامِ حکومت یا گورنمنٹ (government) قائم ہوتی ہے۔ جس میں وہ اپنی ملکہ کی اطاعت کرتی ہیں اور ان کا یہ سارا نظام ان جبلی قوتوں سے چل رہا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے انہیں ودیعت کردیا ہے۔ حیوانات اور پرندوں کو اللہ تعالیٰ نے دور تک کی آواز سننے کی صلاحیت بخشی ہے۔ ایک پرندہ اپنی آواز سے دوسرے پرندے کو دور سے اپنے پاس بلاتا ہے۔ شکار کرنے والے حیوانوں کو تیز بو (smell) بخشی گئی ہے جس کی مدد سے وہ اپنے شکار تک آسانی سے پہنچ سکتے ہیں۔

مچھلی ایک عجیب مخلوق ہے اس کی نشو ونما جب مکمل ہوجاتی ہے تو وہ سمندر میں ہزاروں میل کا سفر طے کرکے انتہائی گہرے پانی میں پہنچ جاتی ہے اور وہاں پہنچ کر انڈے دے کر مرجاتی ہے۔ ان انڈوں سے جو چھوٹے بچے پیدا ہوجاتے ہیں اور جن کے پاس جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا ہے۔ اُن راستوں پر واپس چلے جاتے ہیں جن سے ان کی ماں نے سفر کرکے ان کو گہرے پانی میں جنم دیا تھا۔ اور بالکل اسی جگہ پر پہنچ جاتے ہیں جہاں سے ان کے ماں باپ آئے تھے۔پیڑپودے اس بیج سے وجود میں آتے ہیں جو زمین میں بویا جاتا ہے یا ہوا کے ذریعے کسی جگہ پر زمین کے اندر پہنچ جاتا ہے۔ جہاں سے وہ خاص نگرانی اور حفاظت کے بعدپیڑپودے کی شکل میں نکل آتا ہے۔ میوہ دینے والےپیڑپودوں میں polination کے ذریعے میوہ تیار ہوتا ہے۔ عقاب (eagle) اور کرگس (vulture) دوربین ہوتے ہیں وہ دور سے کسی چیز کو دیکھ کر اپنا شکار بناتے ہیں۔یہ سارے کام جبلت کی وجہ سے جاندار انجام دیتے ہیں۔ البتہ انسان کے اندر یہ قوت جبلت کمزور ہوتی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اسے تمام مخلوقات پر فوقیت بخشی ہے۔ اس لیے وہ اپنے خالق کے دیے ہوئے دماغ سے کمزور جبلتوں کو طاقت ور بنادیتا ہے۔ اس نے اللہ کی دی ہوئی ذہانت سے دوربین (Telescope) اور خوردبین (Microscope) ایجاد کرکے ان مضبوط جبلت رکھنے والے مخلوقات سے آگے قدم بڑھایا۔ جن دور کی چیزوں کو وہ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا ہے ایک طاقتور دوربین کی مدد سے وہ بہت دور کی چیزیں اپنے سامنے دیکھتا ہے۔ آسمان کے تاروں اور ستاروں کی اس نے دوربین کی مدد سے جانکاری حاصل کی۔ ایسے کیڑے مکوڑے یا جراثیم جنہیں کھلی آنکھ سے دیکھا نہیں جاسکتا انہیںخوردبین کی مدد سے دیکھ لیا اور ان پر قابو پالیا۔

لَا الشَّمْسُ يَنبَغِي لَهَا أَن تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ (یٰس:۴۰)

حقیقت یہ ہے کہ کائینات میں موجود ہر مخلوق خدا کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق اپنے راستے پر عمل پیرا ہے۔

اس حقیقت پر غور کرنے سے دہریوں اور ملحدوں کے اس دعوے کو مسترد کیا جاتا ہے کہ تمام جاندار اپنے اندر موجود (قوت جبلت سے ہی رہنمائی حاصل کرتے ہیں اور انسان اپنی عقل کی بنیاد پر ہی چیزوں پر قابو پالیتا ہے۔ اور اُسے کسی غیبی رہنمائی کی ضرورت نہیں ہے۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ اگر جانداروں کی رہنمائی (guidence) ان کے اندر موجود جبلی قوتیں کرتی ہیں تو کائینات کی بے جان مخلوقات کو کون حرکت میں لاتا ہے اور کون ان کو اپنے اپنے راستہ پر چلاتا ہے۔ یہ صرف وہ عظیم ذات ہے جو اس کائینات کا نظام چلارہی ہے اور جس کی ہدایت پر کائینات میں موجود تمام جاندار اور بے جان مخلوقات اپنے اپنے کام میں مشغول اور مصروف ہیں۔ کائینات کا ذرہ ذرہ رب العالمین کے کنٹرول میں ہے اور ذرے ذرے کا خالق، مالک، ناظم اور منتظم وہی ہے ۔ کیا خوب کہا ہے کسی نے ؎

کوئی تو ہے جو نظام ہستی چلا رہا ہے وہی خدا ہے

جس نے زمین سے چارہ نکالا پھر اس کو سیاہ کوڑا بنایا

مرعیٰ کا معنی سبزہ، چارہ، غثا کا معنی کوڑا، سوکھی گھاس، احویٰ کا معنیٰ کالا سیاہ مائیل سبز

اللہ تعالیٰ کا انسانوں پر فضل و کرم ہے کہ اس نے ان کے لیے زمین سے پیڑ پودے اور سبزہ اگایا اور انسانوں اور حیوانوں کے لیے چارہ نکالا۔ یہ پیڑ پودے، سرسبز گھاس اور لہلہاتے ہوئے کھیت انسانوں کے لیے قابل غور ہیں وہ اپنی آنکھوں سے اللہ کی قدرت دیکھ رہے ہیں۔ بہار کے سبزہ زار، شاداب پیڑ پودے اور سرسبز فصلیں ہمیشہ سبز اور تازہ نہیں رہتے ہیں۔ بہار کا یہ سبزہ خزان میں سوکھ جاتا ہے۔ اور یہ سوکھی گھاس سیاہ کوڑا کرکٹ بن کر کچھ تو خاک میں مل جاتی ہے اور باقی ماندہ خس وخاشاک کی صورت میں پانی میں بہہ جاتا ہے۔ اس لیے انسان کو اس غلط فہمی میں نہ رہنا چاہیے کہ اس کی زندگی میں ہمیشہ بہار رہے گی اور خزان سے اسے سابقہ پیش نہ آئے گا جیسا کہ وہ روز مرہ کی زندگی میں دیکھ رہا ہے لیکن بھول جاتا ہے۔ یہاں اس حقیقت پر غور کرنے کی تلقین کی جاتی ہے کہ انسانی زندگی کا نتیجہ اس سے مختلف نہیں۔ انسان بچپن سے جوانی میں آتا ہے پھر بڑھاپے میں پہنچ کر کمزور اور بے سہارا بن جاتا ہے اور آخرکار موت کے مُنہ میں چلا جاتا ہے۔ اس لیے اسے اپنی جوانی اور قوت بازو پر فخر کرنے کے بجائے اس حقیقت پر غور کرنا چاہیے کہ اسے سرسبز اور شاداب پیڑ پودوں اور لہلہاتے کھیتوں اور فصل بیداوار کی طرح دُنیا سے ختم ہونا ہے۔ مگر دوبارہ اُسی خالق کی سرکار میں حاضر ہونا ہے جس نے اسے بیدا کیا ہے۔

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنسَىٰ(٦)

ہم تمہیں پڑھادیں گے پھر تم نہ بھولو گے

إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفَىٰ(٧)

سوائے اُس کے جو اللہ چاہے۔ وہی ظاہر کو بھی جانتا ہے اور اس کو بھی جو پوشیدہ ہے

ایک معتبر روایت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم دوران نزول وحی قرآن کے الفاظ دہرانے کی کوشش کرتے تھے انہیں اندیشہ ہوتا تھا کہ کہیں وہ قرآن کے الفاظ بھول نہ جائیں اس لیے نزول وحی کے دوران ہی انہیں اللہ کی طرف سے اطمینان دلایا گیا کہ وحی کے نازل ہونے کے دوران وہ قرآن کو نہ دہرائیں بلکہ خاموشی اختیار کرکے وحی کو سن لیں ہم تمہیں جو پڑھائیں گے وہ آپ نہیںبھولیں گے۔ اس سے پہلے دو موقعوں پر سورہ طٰہٰ اور سورہ قیامہ میں اس طرح کے واقعات پیش آئے ہیں۔ اس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وحی کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یادداشت میں محفوظ رکھا ہے جس سے اس بات کا کوئی امکان موجود نہ رہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی کسی آیت کو بھول گئے ہوں اس طرح یہ قرآن مجید کے حق میں اللہ کی طرف سے حفاظت کی سند (cerificate) ہے کہ اس قرآن میں کسی ایک لفظ کی تبدیلی کا امکان نہیں ہے۔ اور نہ آج تک کسی نے قرآن کے کسی ایک لفظ کو بدلنے کی جُرأت کی۔ اس کی حفاظت کے بارے میں اللہ نے فرمایا ہے۔ اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَo ''ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔'' اس آیت سے اس حقیقت کی تصدیق ہوتی ہے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی نگرانی، نگہداشت اور حفاظت میں ہے اور اس محافظت کی بدولت قران تعصب (bias) ردوبدل (distortion) اور اختلاف (diversity) کی کمزوریوں سے ہر دور میں محفوظ رہا اور محفوظ رہے گا۔ ان شاء اللہ۔ یہ جو فرمایا گیا ہے کہ اِلّا ماشااللہ سوائے اس کے جو اللہ چاہے یعنی اگر کوئی آیت آپ بھول بھی جائیں گے تو اس میں اللہ کی مشیت اور مرضی شامل ہے۔ اس کے متعلق علما کی ایک رائے یہ ہے کہ اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ کوئی نئی آیت نازل فرمائیں گے جیسا کہ سورہ بقرہ آیت ۱۰۶ ، میں صراحت ہے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ انسان ہیں اس لیے ان سے بھول چوک ہوسکتی ہے مگر اس بھول چوک سے قرآن کے تقدس میں کوئی فرق نہ آئے گا اس کی تائید بخاری کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ صبح کی نماز پڑھاتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی ایک آیت چھوڑ گئے نماز ادا ہونے کے بعد حضرت ابی بن کعب نے پوچھا کیا یہ آیت منسوخ ہوئی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں بلکہ میں اس آیت کو بھول گیا تھا۔ بہرحال نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا جارہا ہے کہ آپ جو نزول وحی کے دوران قرآن یاد کرنے کی کوشش کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر ہے کہ آپ ایسا کیوں کررہے ہیں وہ ظاہر بھی جانتا ہے اور وہ بھی جانتا ہے جو خفیہ ہے دراصل اس سے نبی صلی اللہ علیہ

وسلم کو اس بات کا اطمینان دیا جارہا ہے کہ آپ کو نزول وحی کے دوران قرآن یاد کرنے کی ضرورت نہیں آپ کو قرآن سننا ہے اللہ اسے خود آپ کے دل و دماغ میں جمع کرائے گا اور آپ عمر بھر اسے بھول نہ جائیں گے۔

وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرَى(٨)

ہم تمہیں آسان طریقہ کی سہولت دیں گے

فَذَكِّرْ إِن نَّفَعَتِ الذِّكْرَى(٩)

پس تم نصیحت کرتے رہو اگر نصیحت نفع دے

سَيَذَّكَّرُ مَن يَخْشَى(١٠)

جسے 'اللہ کا' خوف ہے وہ ضرور نصیحت قبول کرے گا

وَيَتَجَنَّبُهَا الْأَشْقَى(١١)

اور جو انتہائی بدبخت ہوگا وہ اس سے گریز کرے گا

الَّذِي يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرَى(١٢)

وہ بدبخت بڑی آگ میں داخل ہوگا

ثُمَّ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَى(١٣)

پھر نہ وہ اس (آگ) میں مرے گا اور نہ زندہ رہے گا

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو کسی مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا ہے۔ قرآن یاد ہونے اور بھول نہ جانے کی یقین دہانی کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک اور یقین دہانی کی جاتی ہے کہ ہم تمہیں آسان اور ہموار راہ کی سہولت بخشیں گے یعنی آپ کو جو دین عطا کیا گیا ہے اس میں کوئی سختی اور تنگی نہیں جس کی بنا پر لوگ اس دین سے انحراف کریں۔ اس میں ایسی سہولیات موجود ہیں کہ خدا کی بندگی کے ساتھ ساتھ پُرامن اور پُرسکون زندگی گزاری جائے۔ یہ ایسا دین ہے جس میں تمام ایسی بدعتوں کا ازالہ کیا گیا ہے جس سے انسانوں کی زندگی مشکل اور مشقت خیز بنائی گئی تھی۔ لوگ دین کی بنیاد پر اپنے آپ کو ایسی مشکلات اور تکالیف میں مبتلا کرتے تھے جن کا ذکر تاریخ میں موجود ہے۔ کہیں پر مرد کے فوت ہونے پر مصیبت کی ماری بیوہ کو آگ کے شعلوں کی نذر کردیا جاتا تو کہیں لوگ راہب بن کر اپنے آپ کو خود اختیار کردہ سختیوں میں مبتلا کرتے تھے۔ کہیں پر کوئی سادھو بھکشو بن کر شادی کرنا حرام سمجھتا تھا۔ کہیں بتوں کو خوش کرنے کے لیے انسانوں کو ذبیح کیا جاتا تھا۔ ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ایسے میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو آسان دین عطا کیا جس میں آسانیاں ہیں دشواریاں نہیں جس پر عمل کرنا آسان ہے۔ جو سراسر نعمت ہے مصیبت نہیں جس میں امن و سکون ہے۔ فتنہ اور فساد نہیں جس میں انسان دوستی ہے انسانوں سے نفرت نہیں اور جس کے اپنانے میں اطمینان ہے بے چینی نہیں، ہمدردی ہے بے رخی نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی زندگی کے تمام معاملات میں آسانی اور سہولت کے آثار پائے جاتے ہیں۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ جب آپؐ کو دو کاموں میں کسی ایک کام کو کرنے کا اختیار دیا جاتا تو آپؐ آسان تر کو اختیار فرماتے ۔ آپ آسان معاملہ کو اختیار فرماتے اور تکلف سے بچتے۔ غرض زندگی کے جملہ امور اور معاملات میں آپؐ نے نرمی اور آسانی کی روش اختیار کی۔ آپؐ کے ارشادات گرامی یہ ہیں:

۱: یہ دین آسان ہے جو شخص دین کو مشکل بنائے وہ شکست کھائے گا (ابوداؤد)

۲: اپنے آپ کو سختیوں میں نہ ڈالو نہیں تو تم پر سختی کی جائے گی۔ (بخاری)

ایک گروہ نے خود کو سختیوں میں ڈالا وہ سختیوں کے حوالے کردیئے گئے۔

۳: لوگوں کے لیے آسانیاں فراہم کرو دشواریاں پیدا نہ کرو۔ (بخاری)

۴: سختی سے سواری کو استعمال کرنے والا نہ سفر طے کرتا ہے او نہ اپنی سواری کو زندہ رہنے دیتا ہے۔ (بخاری)

۵: روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے ۔ آپ نے ان کا نام دریافت کیا انہوں نے اپنا نام حزن (یعنی سخت اور دشوار) بتایا۔ آپ نے فرمایا نہیں تمہارا نام نام سہل یعنی (آسان) ہے۔ (بخاری)

دین میں آسانی ملنے کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج گرامی کو بھی نرمی بخشی گئی تھی ان کا فرمان ہے یہ نیکی کی بات ہے کہ تم اپنے بھائی سے ہنستے ہوئے چہرے کے ساتھ ملو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانیت کے لیے رحمت بن کر آئے ہیں۔ آپؐ انسانوں کے لیے آسانیاں فراہم کرنے کے لیے آئے ہیں اور لوگوں کے کندھوں سے ان بوجھوں کو اُتارنے کے لیے آئے جن کی وجہ سے یہ لوگ سختیوں میں ڈالے گئے تھے۔ جوپیغام اور جو دین آپؐ لائے وہ قران مجید میں اس طرح بیان ہوا ہے۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (سورہ قمر)

ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان بنایا تو کیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا۔

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (سورہ حج)

اس نے تم پر دین میں کوئی تنگی نہ رکھی۔

لَا يُكَلِّفُ اللهُ نَفْساً إِلاَّ وُسْعَهَا (سورہ بقرہ)

اللہ تعالیٰ کسی شخص پر ذمہ داری کا بوجھ اس کی قوت برداشت کے مطابق ہی ڈالتا ہے

مَايُرِيْدُ اللهُ يَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ

اللہ تعالیٰ تم پر دین کے سلسلے میں کوئی تنگی نہیں کرنا چاہتا

یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو دین عطا کیا گیا ہے وہ آسان دین ہے اور انسانی طاقت کی حدود کے اندر ہے۔ یہ لوگوں کو تنگی میں نہیں ڈالتا اور نہ انہیں کسی مشقت میں مبتلا کرتا ہے۔

واضح ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین فطرت کا دین ہے۔ اس میں نہ کوئی کج روی نہ اختلاف اور تنگی ہے نہ سختی۔ یہ دین آسان اور اعتدال کا دین ہے۔ اس دین کے ماننے والوں کو امت وسط کا خطاب ملا ہے۔ اور اس امت وسط کی فطرت کائینات کی فطرت سے ہم آہنگ ہے۔ کائینات کی فطرت کے اندر اللہ کی پیدا کردہ تمام مخلوقات ستارے، سیارے اور دیگر تمام اجرام فلکی ایک توازن کے ساتھ گردش کرر ہے ہیں۔ ان میں کوئی ٹکراؤ اور تصادم نہیں پایا جاتا ہے۔ اور اس طرح یہ ساری مخلوقات اللہ کی بندگی اور فرمانبرداری میں مشغول ہیں۔ اس طرح اللہ نے انسانوں کے لیے دین فطرت بھیجا ہے۔ جس پر عمل کرنا آسان ہے کیوں کہ اس میں نہ کوئی تصادم ہے اور نہ ٹکراؤ۔

حقیقت یہ ہے کہ کائینات کی فطرت، اللہ کےپیغام کی فطرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرت اور امت مسلمہ کی فطرت سب ہم آہنگ ہیں۔ اور خالقِ حکیم کا عطا کردہ دینِ اسلام آسان دین فطرت ہے۔ اس لیے اسے قبول کرنا آسان اور فائدہ مند ہے۔

۹: پس تم نصیحت کرتے رہو اگر نصیحت نفع دے

چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے کہ تبلیغ دین کے معاملے میں اللہ تعالیٰ آپ کو کسی مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا ہے۔ اس کے فوراً بعد فرمایا گیا کہ آپ نصیحت کرتے رہیں اگر نصیحت نفع دے۔ اس کی وضاحت میں بعض علماء نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایاگیا کہ ان لوگوں کے سامنے اسلام کی دعوت پیش نہ کریں جو اس دعوت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ بلکہ آپ ان لوگوں کو نصیحت کریں اور دین کی طرف بلائیں جو اس دین میں شامل ہونے کے لیے تیار ہیں اور نصیحت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ ان کی تعلیم وتربیت پر آپ توجہ کریں اور ان لوگوں کے پیچھے نہ پڑیں جو نصیحت قبول کرنا نہیں چاہتے ہیں۔ اس طرح کی نصیحت سورہ عبس کے آغاز میں بھی گزری ہے۔

آیت سے بعض دیگر علماء نے یہ مراد لی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے کہ آپ نصیحت کرتے رہیں، دین کی دعوت دیتے رہیں اور اپنے مشن کو جاری رکھیں آپ یہ نہ دیکھیں کہ کون ایمان لایا اور کون نہ لایا۔ کون آپ کی دعوت کو قبول کرتا ہے اور کون انکار کرتا ہے۔ آپ ان چیزوں کا خیال کیے بغیر اپنی دعوت اور تبلیغ کا سفر جاری رکھیں۔ امام شوکانیؒ کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نصیحت کرتے رہیں چاہے فائدہ دے یا نہ دے۔ کیونکہ اَنذَار اور تبلیغ دونوں آپ کے لیے مقرر ہیں یعنی آپ راہ حق کی طرف لوگوں کو بلا امتیاز بلائیں۔ یہ مت دیکھیں کہ خدا کے دین کی طرف کون آتا ہے اور کون اس دعوت کو رد کرتا ہے۔ آپ کا کام تو چراغ جلاتے رہنا ہے، راستے میں دوست کا گھر ملے یا دشمن کا۔ چاہے آپ کی دعوت اسے نفع دے یا نہ دے۔ یعنی چاہے وہ آپ کی دعوت قبول کرے یا نہ کرے۔

۱۰: جسے اللہ کا خوف ہے وہ ضرور نصیحت قبول کرے گا۔ ۱۱: اور جو بدبخت ہوگا وہ نصیحت قبول کرنے سے گریز کرے گا۔

۱۲: وہ بدبخت بڑی آگ میں داخل ہوگا۔ ۱۳: پھر نہ وہ اس آگ میں مرے گا نہ زندہ رہے گا۔

جسے اللہ کا خوف ہے وہ ضرور نصیحت قبول کرے گا اور جو بدبخت ہوگا وہ نصیحت قبول کرنے سے گریز کرے گا۔ لیکن جو شخص آپ کی نصیحت کو آپ کی کوشش کے باوجود قبول نہیں کرے گا اسے آپ چھوڑ دیجئے۔ اس کی ذمہ داری آپ پر عائد نہیں ہوتی ہے۔ اسے بہرحال آگ میں جلنا ہے۔ جس میں نہ وہ مرے گا نہ جیئے گا۔ وہ عذاب سے چھٹکارا پانے کے لیے موت کی تمنا کرے گا مگر اسے موت نہ آئے گی بلکہ آگ کے شعلوں میں جلتا رہے گا اور عذاب الٰہی کا مزہ ہمیشہ چکھتا رہے گا۔ یہ سزا ان لوگوں کے لیے ہے جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی نصیحت قبول نہ کریں گے۔ اسلام کی مخالفت میں ڈٹے رہیں اور شرک والحاد پر مرتے دم تک قائم رہیں گے۔ رہے وہ لوگ جو ایمان لائے مگر بُرے اعمال بھی کیے اور اس وجہ سے جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ ان کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ ان کے جلے ہوئے جسم جہنم سے نکالے جائیں گے اور جنت کی نہروں کے کناروں پر ڈالے جائیں گے۔ پھر اہل

جنت سے کہا جائے گا کہ ان پر پانی ڈالو اور اس پانی سے وہ اس طرح جی اٹھیں گے جیسے نباتات پانی پڑنے سے اُگ آتے ہیں۔

قَدۡ أَفۡلَحَ مَن تَزَكَّىٰ(۱۴)

یقینا وہ فلاح پاگیا جس نے خود کو پاک کیا

وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى(۱۵)

اور اپنے رب کا نام لیا اور نماز پڑھی

جنہوں نے اپنے آپ کو برائیوں اور شرک کی آلودگی سے پاک رکھا اور تمام گناہوں سے بچے رہے۔ ان ہی لوگوں نے فلاح پائی۔ انہوں نے اس دنیا میں بھی کامیابی حاصل کی اور آخرت میں بھی یہ لوگ ابدی زندگی پاکر ایک بہت بڑی کامیابی حاصل کریں گے۔

تَزَکّٰی۔ اپنے آپ کو پاک کیا۔ تزکیہ کا معنیٰ ہے پاک کرنا۔ مال و دولت کو پاک کرنے کے لیے جو رقم غریبوں اور محتاجوں کی مدد کے لیے نکالی جاتی ہے اسے زکوٰۃ کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ رقم غریبوں کی مدد کے لیے نکالنے سے مال اور دولت پاک ہوجاتی ہے۔ اسی طرح انسان جب اپنے دل اور دماغ سے کفر وشرک، بداخلاقی، بے ایمانی اور بددیانتی، بدکرداری، بدکلامی کی غلاظت نکال دیتا ہے تو اس کی زندگی پاک ہوجاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لیے اپنی بارگاہ میں رحمت کے دروازے کھول دیتا ہے وہ زندگی کے ہر مرحلے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ جو انسان ایک ناپاک مکھی کی طرح ناپاک چیزوں کو پسند کرتا ہے۔ بارگاہ الٰہی میں اس کی وقعت اس ناپاک مکھی سے زیادہ نہیں جو صرف ناپاکی پر پلتی ہے۔ اور دن بھر اس ناپاکی میں غوطہ خوری کرتی رہتی ہے۔ اس کے برعکس جو شخص پاکی اور حلال خوری پسند کرتا ہے اور اللہ کی پاکی بیان کرتا ہے اپنے آپ کو ناپاک کاموں اور شرک و کفر کی گندگی اور غلاظت سے دور رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا میں مشغول رہتا ہے وہی بندہ اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور وہ اس کی بارگاہ میں مقبول اور مقرب ہے۔ اسی حقیقت کو پانے کے لیے اللہ تعالیٰ ایک وظیفہ - فارمولہ پیش کرتا ہے کہ انسان اپنے خالق مالک و معبود کو ہمیشہ یاد کرتا رہے۔ اس کی بندگی اطاعت اور فرمانبرداری کرتا رہے۔ اللہ کی بندگی کے لیے اللہ نے صلوٰۃ یعنی نماز کو لازم ٹھہرایا۔ پانچ وقت نماز جو مومن پر فرض ہے۔ اسے زندگی بھر ادا کرتا رہے اور اس کے علاوہ سنت نمازوں اور نوافل کی ادائیگی کرتا رہے۔ الغرض جو بندہ اس طرح کی بندگی میں ہر حال میں مشغول رہے وہی اللہ کا پاک اور محبوب بندہ ہے ورنہ زندگی بے بندگی شرمندگی۔

نماز کے دوران بندہ بارہا اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْن یعنی ''اے اللہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں'' کی تسبیح کرتا ہے۔ اس کے سامنے سارے غیر اللّٰہی تصورات کے بت ٹوٹ جاتے ہیں اور غیر اللہ مددگاروں کی عمارتیں مسمار ہوجاتی ہیں اس کے دل ودماغ سے تمام شیطانی وسوسے اور خیالات دور ہوجاتے ہیں اور اس نماز کی برکت سے وہ ہر باطل قوت وطاقت سے تعلق توڑ کر صرف ایک اللہ سے اپنی بندگی کا تعلق جوڑ دیتا ہے اور وہ ہر گمراہی کو چھوڑ کر اللہ کی پناہ میں آتا ہے جو اس کی بہت بڑی اور ہمیشہ رہنے والی کامیابی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جس نے بداخلاقی اور دیگر برائیوں سے اپنے آپ کو پاک کرلیا احکام اسلام کی تابعداری کی نماز کو ٹھیک وقت پر قائم رکھا اور صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی کے لیے نماز ادا کی اس نے نجات اور فلاح پائی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت کی اور فرمایا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے وحدہ لاشریک ہونے کی گواہی دے۔ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرے اور میری رسالت کو مانے اور پانچ وقت کے نمازوں کی پوری حفاظت کرے وہ نجات پاگیا اور کامیاب ہوا۔ (ابن کثیر)

بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا(١٦)

لیکن تم لوگ دنیاوی زندگی کو ترجیح دیتے ہیں

وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَأَبْقَى(١٧)

جب کہ آخرت کی زندگی بہتر اور ہمیشہ رہنے والی ہے

آخرت کی حقیقت سمجھنے کی تلقین کی گئی ہے دنیائی زندگی کو آخرت پر ترجیح دینا ہر برائی اور فتنہ کی بنیاد ہے یہ ایک ایسی حماقت ہے جس کا ارتکاب صاحب بصیرت اور دانش مند انسان نہیں کرسکتا ہے۔ فرمایا گیا: لوگو تم کو فکر بس دنیا اور اس کی راحت و آسائش اور اس کے فائدوں اور لذتوں کی ہے۔ تمہیجو دنیا میں حاصل ہوجاتا ہے تم سمجھتے ہو کہ بس وہی اصل فائدہ ہے اور بس اسی کے لیے تم جدوجہد

کرتے ہو اور جس چیز سے تم دنیا میں محروم ہوجاتے ہیں تم بس اسی چیز کو اپنے لیے نقصان سمجھتے ہیں آخرت کی آپ کو کوئی فکر نہیں ہے۔

اس لیے آپ لوگ اس دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں جو لوگ آخرت پر ایمان لانے کے لیے تیار نہیں ان کے پاس آخرت کو جھٹلانے کے لیے کوئی معقول دلیل نہیں ہے۔ بلکہ یہ صرف اس وجہ سے جھٹلاتے ہیں کہ ان کی نظریں پوری طرح اس دنیائے فانی پر ٹکی ہوئی ہیں۔ انہیں اس دنیا کے مال ودولت اور جاہ و حشمت، افسر شاہی، عہدہ داری، حکومت سازی، تجارت کاروبا، کھیل تماشا اور ناچ نغموں سے بے حد دلچسپی ہے۔ دنیا کی کشمکش اور دنیا طلبی میں یہ اس قدر مشغول ہیں کہ انہیں دنیا کی اس زینت کے بغیر کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ دنیا طلبی کے اس جدوجہد میں یہ لوگ اخلاقی قدروں کو بالائے طاق رکھ کر دھوکہ دہی بے ایمانی بد دیانتی اور قتل غارت کا بازار گرم کردیتے ہیں۔ انہیں زمین سے آسمان تک مال و دولت اور جاہ وہ حشمت کے بغیر کچھ نہیں دکھائی دیتا ہے۔ مگر آخرت کو نظر انداز کرکے ان لوگوں کو یہ فانی دنیا بھی اپنے لیے ہمیشہ رہنے والا سرسبز اور شاداب باغ دکھائی دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مختصر الفاظ میں اس حقیقت کو پیش کرتا ہے کہ اس دنیا کو آپ لوگ آخرت پر ترجیح دیتے ہیں۔ حالانکہ آخرت آپ کے لیے بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔ اور یہ دنیا اور دنیائی زندگی فنا ہونے والی ہے مگر اس حقیقت پر وہی لوگ غور کرتے ہیں جو صاحب عقل ہوتے ہیں۔ قرآن مجید نے اس دنیا کو دھوکے کی ٹٹی قرار دیا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: جس نے دنیا سے محبت کی اس نے اپنی آخرت کو نقصان پہنچایا۔ اے لوگو باقی رہنے والی آخرت کو فنا ہونے والی دنیا پر ترجیح دو۔

لیکن کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اسلام دنیا سے نفرت کرنے کی تعلیم دیتا ہے تاکہ انسان آخرت کی محبت میں ترک دنیا کرکے راہبانہ زندگی اختیار کرے اور اپنے اہل وعیال اور بال بچوں کے لیے وبال جان بنے بلکہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ انسان دنیا میں زندہ رہنے کے لیے کام کاج کرکے دنیائی زندگی کو رونق بخشے اور خدا کی عبادت کرکے اس کی بندگی کا حق ادا کرے۔ دنیائی امور میں دلچسپی رکھ کر اپنے کاروبار اور تجارت کو فروغ دے۔ علم کے میدان میں آگے بڑھے۔ سیاست اور قیادت سے ہاتھ دھو کر نہ بیٹھے، علوم و فنون سے بے خبر نہ رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ دنیا میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ کی بندگی کرنا پیغمبروں کا شیوہ اور مومنوں کی شان ہے۔ آپؐ نے مزید فرمایا دین میں رہبانیت نہیں ہے اور ترک دنیا مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے۔

اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی(۱۸)

بے شک یہ بات پہلے صحیفوں میں لکھی ہوئی ہے

صُحُفِ اِبْرَاهِیْمَ وَمُوْسٰی(۱۹)

ابراہیم اور موسٰی کے صحیفوں میں

سورہ کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ یہ حقائق جن سے آپ کو آگاہ کیا جاتا ہے کوئی نئی اور انوکھی باتیں نہیں ہیں بلکہ یہ باتیں ان صحیفوں میں بھی موجود ہیں جو حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام پر نازل کے گئے ہیں۔یہاں یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ حق ایک ہے۔ عقیدہ ایک ہے اور وہ ہستی بھی ایک ہی ہے جہاں سے یہ عقیدہ آیا ہے اور اُس کے پاس سے جو رسول آئے ان کی معلومات کا منبع (Source of infromation) بھی ایک ہی ہے۔ یعنی سب رسول ایک ہی ذات عظیم سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس لیے ان کے کلام میں کوئی اختلاف اور تضاد نہیں ہے۔ سارے رسولوں کی ایک ہی تعلیم ہے کہ اللہ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں اسی ایک خدا کی عبادت اور بندگی لازم ہے اور ہر کسی کو اسی معبود برحق کے پاس حاضر ہونا ہے۔

سورۃ الغاشیہ مکیۃ

اٰیٰتُہا:26 رکوعھا:1

بسم اللہِ الرَّحمٰن الرَّحیم

هَلْ اَتٰاکَ حَدِیثُ الْغَاشِیَةِo وُجُوهٌ یَوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌo عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌo تَصْلٰی نَارًا حَامِیَةًo تُسْقٰی مِنْ عَیْنٍ آنِیَةٍo لَّیْسَ

لَهُمْ طَعَامٌ إِلَّا مِن ضَرِيعٍ۝ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِي مِن جُوعٍ۝ وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ۝ لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ۝ فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ۝ لَّا تَسْمَعُ فِيهَا لَاغِيَةً۝ فِيهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ۝ فِيهَا سُرُرٌ مَّرْفُوعَةٌ۝ وَأَكْوَابٌ مَّوْضُوعَةٌ۝ وَنَمَارِقُ مَصْفُوفَةٌ۝ وَزَرَابِيُّ مَبْثُوثَةٌ۝ أَفَلَا يَنظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ۝ وَإِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ۝ وَإِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ۝ وَإِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ۝ فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ۝ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ۝ إِلَّا مَن تَوَلَّىٰ وَكَفَرَ۝ فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ۝ إِنَّ إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ۝ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُم۝

پس منظر

نزول وحی کے ابتدائی زمانہ میں اہل مکہ توحید اور آخرت کی حقیقت سے ناواقف تھے۔ اگرچہ ان لوگوں کو خدا کا تصور تھا مگر وہ ایک خدا کی عبادت کرنے کے قائل نہ تھے۔ انہوں نے بہت سارے بت بنا رکھے تھے جن کی وہ پوجا کرتے تھے۔ ان لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ مرنے کے بعد انسان کی زندگی ختم ہوجاتی ہے اور اس کا وجود بھی مٹ جاتا ہے۔ جن بتوں کی یہ لوگ انسانی قوتوں سے بالاتر سمجھ کر عبادت کرتے تھے۔ ان کی خوشی اور ناراضگی پر یہ اپنی زندگیوں کا انحصار کرتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جن سے پتھر کے یہ مجسمے راضی ہیں وہ دنیا میں کامیاب اور خوشحال زندگی گزارتے ہیں اور جن لوگوں سے یہ ناخوش ہیں وہ بے چارے زندگی میں ناکام ہوکر پریشان ہوجاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو توحید اور آخرت سمجھانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اپنے عقیدے کی حمایت میں یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں کسی بھی حد تک جانے کے لیے تیار تھے۔ زندگی اور قیامت وآخرت کی حقیقت سے ناآشنا ان لوگوں کے سامنے قیامت برپا ہونے کی حقیقت پیش کی جاتی ہے تاکہ یہ لوگ اس پر غور کرکے ایمان لے آئیں۔ اس سورت کے آغاز میں آسان مگر نہایت مؤثر الفاظ میں دو جماعتوں کی زندگیوں کا انجام بیان کیا جاتا ہے۔ ایک جماعت وہ ہوگی جس نے خدا، اس کے رسول اور آخرت پر ایمان نہ لایا ہو اس جماعت کے لوگ قیامت کے روز پریشان اور خوفزدہ ہوں گے۔ کیونکہ انہیں معلوم ہوجائے گا کہ انہیں اپنے اعمال بد کے نتیجہ میں جہنم کی دہکتی ہوئی آگ میں ڈال کر عذاب ملنے والا ہے اور اس طرح یہ اپنے انجام کو پہنچیں گے۔

دوسری جماعت وہ ہوگی جس نے اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لایا ہوگا۔ اُن کے چہرے روشن ہوں گے اور وہ مسکرا رہے ہوں گے۔ انہیں معلوم ہوگا کہ انہیں جنت میں داخل کردیا جائے گا جہاں وہ ہمیشہ کے لیے آرام کی زندگی گزاریں گے اور وہ دنیا کی لغو اور فضول باتوں سے نجات پالیں گے۔

منکرین اور اہل ایمان کے اپنے اپنے انجام کے تذکرہ کے بعد اہل مکہ کو اپنے آس پاس موجود نشانیوں پر غور کرنے کی دعوت دی جاتی ہے جن سے انہیں ہر وقت سابقہ پیش آتا ہے۔ یعنی اونٹ کو دیکھیں جسے ان کی زندگی میں کافی اہمیت حاصل تھی۔ آسمان کی طرف دیکھیں کس طرح اسے بلند کیا گیا۔ زمین پر غور کریں کہ کس طرح اسے بچھایا گیا۔ پہاڑوں پر غور کریں کہ کس طرح انہیں زمین پر کھڑا کیا گیا جس خالق نے ان مظاہر کو اپنی قدرت سے بنایا اس خالق اور قادر مطلق کے لیے انسانوں کو دوبارہ زندہ کرنا، جنت و جہنم بنانا اور قیامت برپا کرنا کیسے ناممکن ہے۔

آخر میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب فرمایا جاتا ہے کہ آپ کا کام نصیحت کرنا اور دین کی طرف بلانا ہے یہ لوگ اگر دعوت کو قبول نہ کریں گے تو ان سے حساب لینا ہمارا کام ہے بہرحال انہیں ہمارے پاس حاضر ہونا ہے۔

هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْغَاشِيَةِ(۱)

کیا تمہیں چھا جانے والی آفت (قیامت) کی خبر نہیں ہے

سورہ کا آغاز جہنم کے خوف سے کیا گیا ہے شاید اس لیے کہ جنت حاصل کرنے کا اشتیاق (curiosity) بڑھ جائے۔ منزل کے مسافر کو جب راستے کے خطرات اور مشکلات سے آگاہ کیا جاتا ہے تو وہ اپنی منزل پر پہنچنے کے لیے کوئی دوسرا راستہ تلاش کرلینا ہے۔ اگر اسے راستے کی مشکلات اور خطرات سے آگاہ نہ کیا جائے تو وہ دوسرا راستہ جو خطرے سے خالی ہو اختیار کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔

سورہ اعلیٰ کے آخر میں فرمایا گیا کہ آخرت کی زندگی ہر اعتبار سے بہتر اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔ یہاں سورہ غاشیہ کی ابتدائی آیات میں بُرے لوگوں اور ان کے عذاب کا ذکر ہورہا ہے اور دوسرے حصے کی ابتدائی آیات میں نیک لوگوں کی جزا اور ان کی کامیابیوں کا ذکر کیا جارہا ہے۔

بات کا آغاز سوالیہ جملے سے کیا گیا ہے۔ دراصل اس طرز تخاطُب سے بات کی اہمیت بیان کرنا مقصود ہوتا ہے۔ یوں سننے والا معاملہ جاننے کے لیے ہمہ تن گوش ہوجاتا ہے۔

فرمایا گیا ہے کہ کیا تمہیں چھاجانے والی آفت (قیامت) کی خبر پہنچی ہے!؟ غاشیہ کا معنی ہر طرف سے ڈھانپنے والی۔ قیامت جب چھا جائے گی تو وہ ہر چیز کو ڈھانپ لے گی اس کی ہولناکیاں اور اس کے اثرات اس قدر وسیع اور ہمہ گیر ہوں گے کہ جاندار تو درکنار زمین وآسمان کی کوئی چیز متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے گی۔ ساری کائینات الٹ دی جائے گی ہر طرف انتشار شور وغل اور افراتفری ہوگی۔ یہ ایک ایسی چونکا دینے والی آیت ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راستے میں گزر رہے تھے کہ انہوںنے ایک عورت کی آواز سنی جو هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْغَاشِيَةِ (کیا تمہیں چھا جانے والی قیامت کی خبر پہنچی) کی آیت پڑھ رہی تھی۔ آپ ﷺ چونک اُٹھے اور فرمایا نَعَمْ قَدْ جَآءَنِی ہاں میرے پاس یہ خبر پہنچ چکی ہے۔

وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ(۲)

کتنے ہی چہرے اس دن خوفزدہ ہوں گے

عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ(۳)

سخت مشقت کرنے والے تھکے ماندے ہوں گے

چہروں سے مراد انسان ہیں، کیوں کہ انسان کی شناخت چہرے سے ہوتی ہے اس لیے انسان کے لیے چہرہ کا استعمال کیا جاتا ہے مثلاً کوئی کہتا آج مجھے سو چہرے دیکھنے پڑے یعنی آج مجھے سو لوگوسے ملاقات ہوئی۔

قیامت کے دن جو چہرے خوفزدہ ہوں گے یہ وہ لوگ ہوں گے جن پر تھکاوٹ کے نمایاں آثار موجود ہوں گے ڈرے ہوئے اور سہمے ہوئے ہوں گے۔ کیونکہ اب انہیں معلوم ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس قیامت کے دن سے انہیں ڈراتے تھے اور جس پر یہ یقین کرنے کے بجائے مذاق اڑاتے تھے آج اسی دن سے انہیں سابقہ پڑا۔ اس لیے ان کے چہرے اداس ہوں گے ان کی حالت

تھکے ہوئے مسافروں کی طرح ہوگی۔ دنیا میں رات دن کام کرکے یہ لوگ تھک جاتے تھے لیکن خدا کی بندگی کے لیے انہیں ایک لمحے کی فرصت نہ ملتی تھی۔ اگر کوئی لمحہ فرصت کا مل بھی جاتا تو اس دوران رنگ رلیوں اور شرک وبدعات کی محفلیں سجاتے تھے۔ اپناپیٹ بھرنے کے لیے لوٹ کھسوٹ اور بے ایمانی کا بازار گرم کرتے تھے۔ انہیں اپنے خالق حقیقی اور رب العالمین کا کوئی خوف نہ ہوتا تھا اور نہ اس بات کا یقین ہوتا تھا کہ کسی دن خدا کے سامنے حاضر ہوکر جواب دینا ہے۔یہی درندہ صفت انسان تھکے ماندے چہرے لے کر قیامت کے دن مایوس اور اداس ہوں گے۔ ان کے برے اعمال کی سیاہی ان کے چہروں سے نمایاں ہوگی۔

مفسرین نے عَامِلَۃٌ نَاصِبَۃ (تھکے ماندے چہرے) کے کئی مفہوم بیان کیے ہیں ایک یہ کہ یہ لوگ دنیا میں مشقت کے ساتھ نیک اعمال کرتے رہے مگر شرک و بدعات میں بتلا ہونے کی وجہ سے ان کے تمام اعمال غارت ہوجائیں گے۔ دوسرا یہ کہ یہ لوگ اپنے اعمال بد کا انجام دیکھیں گے تو ان کی مایوسی اور تھکاوٹ اس قدر بڑھ جائے گی کہ دیکھنے والا یوں محسوس کرے گا کہ جیسے ان کی جان ابھی نکل جائے گی۔ تیسرا یہ کہ جہنم کی سزا کے خوف سے ان کے جسم لرزان ہوں گے اور تھکاوت سے چور دکھائی دیں گے۔

حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ بدعتی کا روزہ، نماز، زکوٰۃ، حج عمرہ اور کوئی چھوٹی بڑی نیکی قبول نہیں کرتا ایسا شخص بدعتوں کی وجہ سے اسلام سے اس طرح نکل جاتا ہے جیسے گوندھے ہوئے آٹے سے بال نکل جاتا ہے۔ ایک اور روایت کے مطابق کافر دنیا میں جتنی بھی محنت کرے وہ قیامت کے دن گرد و غبار کی طرح اڑادی جائے گی۔ یہی حال دکھاوا کرنے والے اور خود ساختہ یعنی اپنے بنائے ہوئے طریقوں پر عبادتیں کرنے والوں کا ہوگا۔ خواہ ایک ٹانگ پر کھڑے ہوکر کریں یا الٹا لٹک کر یا سانس بند کرکے کریں یا مشرکین کی طرح مخلوق کی مدد طلب کرکے عبادت کریں مشقتوں کے باوجود قیامت کے دن ذلیل ہوں گے اور اس فضول عبادت کی وجہ سے قیامت کے دن ان کے چہروں پر مایوسی اور تھکاوٹ دکھائی دے گی۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نصرانی اس سورہ کے مصداق ہیں جو غلط تصور دین کی وجہ سے زبردست مشقت اور اپنے آپ کو ایذا دے کر عبادت کرنے کے باوجود جہنم میں جائیں گے۔ ایک روز حضرت عمرؓ ایک خانقاہ کے پاس سے گزرے وہاں جو راہب موجود تھا اسے اپنے پاس بلایا آپ اسے دیکھ کر رو پڑے لوگوں نے رونے کی وجہ پوچھی تو فرمایا اسے دیکھ کر عَامِلَۃٌ نَاصِبَۃٌ آیت یاد آگئی کہ یہ لوگ سختی سے عبادت و ریاضت کرتے ہیں لیکن (خود ساختہ طریقہ کی وجہ سے) آخر جہنم میں جائیں گے۔ (ابن کثیر)

دراصل یہ لوگ اس لیے تھکے ماندے دکھائی دیں گے کیونکہ انہوں نے دنیا میں عبادت کرکے جو مشقت

اٹھائی وہ قیامت کے دن یکسر مسترد ہوگی ان کا وہ سارا عمل چونکہ غلط عقیدے پر قائم تھا اس لیے ان کے عمل کی عمارت اس دن مسمار ہوجائے گی۔

تَصۡلَىٰ نَارًا حَامِيَةً(۴)

وہ دہکتی آگ میں جھلس رہے ہوں گے

تُسۡقَىٰ مِنۡ عَيۡنٍ آنِيَةٍ(۵)

انہیں کھولتے ہوئے چشمے سے پلایا جائے گا

لَّيۡسَ لَهُمۡ طَعَامٌ إِلَّا مِن ضَرِيعٍ(٦)

ان کے کھانے کے لیے ایک خاردار خشک جھاڑی کے سوا کچھ نہ ہوگا

لَا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ(۷)

جو نہ بھوک مٹائے اور نہ موٹا کرے

چونکہ گنہگاروں اور منکرین حق کو معلوم ہوجائے گا کہ ان کا انجام جہنم میں داخل ہونے کے سوا اور کچھ نہیں ہے اس کے انتظار میں ان کے چہرے تھکے ہوئے مایوس نظر آئیں گے۔ مگر جہنم میں جاکر بھی انہیں اپنے حال پر نہیں چھوڑا جائے گا بلکہ انہیں وہاں کھانے پینے کی تڑپ ہوگی، انہیں بھوک اور پیاس ستائے گی مگر کھانے پینے کے لیے انہیں ایسی غذا دی جائے گی جو ان کی سزا میں آگ پر تیل چھڑکنے کا کام کرے گی۔ فرمایا گیا کہ ان جہنمیوں کو پینے کے لیے جہنم کا کھولتا ہوا پانی اور کھانے کے لیے خار دار جھاڑیاں دی جائیں گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ دوزخیوں پر شدید قسم کی بھوک اور پیاس مسلط کی جائے گی جو ان کے لیے آگ کے عذاب سے زیادہ تکلیف دہ (painful) ہوگی۔ آگ کی تپش سے انہیں شدت کی پیاس لگے گی لیکن پینے کے لیے انہیں کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا جسے ان کی پیاس نہیں بُجھے گی۔ جہنمیوں کو جو گرم پانی پلایا جائے گا اس کا درجہ حرارت کیا ہوگا وہ اللہ ہی جانتا ہے جس نے پانی کو پیدا کیا ہے الغرض جہنمیوں کو پیاس لگنے پر ایسا گرم پانی پلایا جائے گا جس سے ان کی پیاس میں تخفیف کے بجائے شدت کا اضافہ ہوگا۔ پانی پلانے کے بعد ان کے خوراک کا ذکر ہے۔ بھوک لگنے پر انہیں کانٹے دار جاڑیوں کا کھانا دیا جائے گا۔ جس سے نہ ان کی بھوک مٹے گی اور نہ موٹے تازے ہوں گے بلکہ یہ ان کے گلے میں اٹک جائے گا جیسے کہ سورہ مزمل میں ارشاد ہوا ہے: وَطَعَاماً ذَا غُصَّةٍ وَعَذَاباً أَلِيْماً یعنی ان مجرموں کو حلق میں پھنسنے والا کھانا اور دردناک عذاب دیا جائے گا۔ جہنمیوں کے خوردونوش اور عذاب کا ذکر قرآن مجید میں کئی جگہ پر کیا گیا ہے۔ مثلاً دوزخیوں کو پیپ پلایا جائے گا۔ (النباء) ان کی آنتوں اور کھالوں کو بار بار بدلا جائے گا۔ (النباء) دوزخیوں کو کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا۔ (انعام) انہیں آگ کا لباس پہنایا جائے گا۔ (الحج) انہیں لوہے کے ہتھوڑوں سے سزا دی جائے گی۔ اہل دوزخ کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا اور انہیں یہ سارے قسم کے عذاب دیے جائیں گے۔ واللہ اعلم۔

وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ(٨)

کتنے ہی چہرے اس دن تر وتازہ ہوں گے

لِسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ(٩)

اپنی کارگزاری پر خوش و خرم ہوں گے

فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ(١٠)

عالی مقام جنت میں ہوں گے

لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً(١١)

وہاں وہ کوئی بے ہودہ بات نہ سنیں گے

فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ(١٢)

اس میں رواں چشمے ہوں گے

فِيهَا سُرُرٌ مَّرْفُوعَةٌ(۱۳)

اس میں اونچی اونچی مسندیں ہوں گی

وَأَكْوَابٌ مَّوْضُوعَةٌ(۱۴)

اور ساغر قرینے سے رکھے ہوں گے

وَنَمَارِقُ مَصْفُوفَةٌ(۱۵)

اور گاؤتکیے قطار اندر قطار ہوں گے

وَزَرَابِيُّ مَبْثُوثَةٌ(۱۶)

اور قالین بچھے ہوئے ہوں گے

آخرت میں منکرین حق کے رسوا کن عذاب کے تذکرہ کے بعد اب اہل ایمان کی کامیابی اور ان کی عزت و احترام کا تذکرہ ہورہا ہے۔ انہیں جب معلوم ہوجائے گا کہ اپنے نیک اعمال سے اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے بعد اللہ کے فضل و کرم سے انہیں جنت نصیب ہوئی تو ان کو بے انتہا خوشی ہوگی۔ خوشی سے ان کے چہرے کھل اٹھیں گے۔ جنت کے انتظار میں ان کے چہرے نور افگن اور نور افشاں ہوں گے۔ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوگی اور ان کے دل سکون و اطمینان کی دولت سے مالامال ہوں گے اور اسی اطمینان اور سکون کے ساتھ انہیں جنت میں داخل کردیا جائے گا۔ انہوں نے دنیا میں دین اسلام کے لیے ہر قسم کی تکلیفیں اور مصیبتیں برداشت کیں۔ اللہ کی عبادت کرنے میں پُر خلوص تھے۔ نمازوں، روزوں، ادائے زکوٰۃ اور اللہ کے جملہ احکام کی تعمیل سے اللہ کا قرب حاصل

کیا یہی چہرے آج مطمئن نظر آرہے ہیں کیوں کہ دنیا میں انہوں نے جو نیک کام کیے تھے انہیں سراہا گیا۔ اللہ کے دین کے لیے ان کی خدمات اس قدر شاندار ہیں کہ دنیا کی کوئی نعمت ان کا معاوضہ نہیں ہو سکتی ۔ اب اللہ تعالیٰ نے انہیں جنت کی نعمت کا معاوضہ عطا کیا جو عظیم اور بڑا معاوضہ ہے۔

اب یہ اہل ایمان عالی مقام جنت میں داخل ہوں گے۔ جہاں وہ کوئی بے ہودہ بات نہ سنیں گے وہاں کسی قسم کی آلودگی اور بے ہودگی نہ پائیں گے۔ جس طرح دنیا میں یہ بے ہودہ اور بے حیا باتوں اور فحش کلامی سے دور رہے اور بے حیائی سے روکنے پر ان کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ آج کے دن ان کو ان بے ہودہ اور لغو باتوں سے نجات ملے گی۔ اگرچہ اہل ایمان کو دنیا میں لغو باتوں سے بچنے کے لیے اور دوسروں کو بچانے کے لیے زبردست مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا تاہم ان کے لیے آج جنت میں داخل ہونے کے بعد اس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہ ہوگی کہ وہ کوئی بے ہودہ، لغو اور فحش بات نہ سنیں گے۔ جس طرح جہنمیوں کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ عذاب ان کی پیاس اور خشک جاڑیوں کی خوراک ہوگا، اُسی طرح اہل جنت کے لیے لغو بات اور فحش کلامی سے نجات سب سے زیادہ آرام دہ نعمت ہوگی۔

جنت میں رواں چشمے اور آبشار ہوں گے۔ اعلیٰ قسم کے تخت اونچی جگہوں پر رکھے ہوئے ہوں گے جن پر جنتی تشریف فرما ہوں گے۔ دعوتِ دین کی راہ میں پیش آئی کلفتوں کے عوض ان کے لیے بڑے بڑے سجے ہوئے تخت ہوں گے جن پر وہ آرام فرما ہوں گے۔ ان کے پاس ساغر اور مشروبات کے پیالے قرینے سے رکھے ہوئے ہوں گے۔ جو دنیا کی بدبودار شراب ترک کرنے کے بدلے میں انہیں پیش کیے جائیں گے۔ ان کے لیے ان تختوں پر قطاروں میں گاؤ تکیے لگے ہوئے ہوں گے اور ان پر نفیس اور عمدہ قسم کے قالین بچھے ہوئے ہوں گے۔

حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے جو کچھ تیار رکھا ہے نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہوگا اور نہ کسی کان نے سنا ہوگا اور نہ کسی بشر کے دل میں خیال آیا ہوگا۔ قران مجید میں مختلف جگہوں پر مختلف انداز میں جنت کی تعریف کی گئی ہے۔

۱) اللہ کے مخلص بندے نعمتوں والی جنت میں ہوں گے اور ایک دوسرے کے سامنے تختوں پر بیٹھے ہوں گے۔ (الصافات)

۲) پرہیزگاروں کے لیے عمدہ مقام ہے اور ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں جن کے دروازے ان کے لیے کھلے ہوں گے اور وہ ان میں تکیے لگا کر بیٹھیں گے۔ (صافات)

۳) جنتی سبز قالینوں پر تکیے لگا کر بیٹھے ہوں گے۔ (الرحمٰن)

۴) ہم ان کے دلوں سے کینہ نکالیں گے اور سب ایک دوسرے کے سامنے تکیوں پر بیٹھے ہوں گے۔ انہیں کوئی تکلیف نہ پہنچے گی اور نہ وہ اس سے نکالے جائیں گے۔ (الحجر)

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے لیے جنت کی جن نعمتوں کا ذکر کیا ہے یہ نعمتیں زمین کی نعمتوں کے مشابہ

ہوں گی۔ اہل ایمان خدا کے فرمانبردار اور نیکوکار بندے ان نعمتوں سے اچھی طرح واقف بھی ہوں گے اس لیے جنت میں حاصل ہونے والی نعمتیں ان کے لیے مبہم نہیں ہوں گی۔ البتہ دنیا کی نعمتوں کے بدلے میں جنت میں جو نعمتیں انہیں عطا کی جائیں گی ان کا مزہ اور ان کی کیفیت اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی نہیں جانتا ہے۔

ان آیات پر آخرت کی سیر ختم ہوجاتی ہے اب کائینات اور اس میں پیدا کیے گئے مخلوقات کی طرف انسان کی توجہ مبذول کرائی جاتی ہے کہ جس خالق نے اس کائینات اور اس کے اندر مخلوقات کو پیدا کیا ہے وہی خالق حقیقی اور قادر مطلق اس کا مدبر اور منتظم بھی ہے۔ اس کائینات کی منصوبہ بندی کے پس پردہ یہ حقیقت ہے کہ اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی ہے۔ اس زمین یعنی دنیا کے علاوہ ایک اور عالم ہے اور دنیا میں انسان کی موت کے انجام کے علاوہ ایک اور انجام ہے جسے آخرت کہتے ہیں۔

أَفَلَا يَنظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ(١٧)

کیا یہ اونٹ کو نہیں دیکھتے ہیں کیسا (عجیب) پیدا کیا گیا؟

وَإِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ(١٨)

اور آسمان کو کس طرح بلند کیا گیا!

وَإِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ(١٩)

اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے ہیں کہ کس انداز سے جمائے گئے!

وَإِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ(٢٠)

اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کس انداز سے بچھائی گئی!؟

ان چار آیات میں قرآن کے اولین مخاطب اہل عرب کو ان حقائق کی طرف متوجہ کرایا جاتا ہے جن سے یہ لوگ اچھی طرح مانوس تھے۔ یہ چار مخلوق اونٹ، آسمان، پہاڑ اور زمین ہیں یہ چاروں مناظر

قدرت انسان کو اللہ تعالیٰ کی قدرت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ ان کی تخلیق سے اس بات کی نشاندہی اور تصدیق ہوتی ہے کہ جس خالق نے ان چیزوں کو پہلی بار پیدا کیا۔ اس کے لیے انسان کو دوبارہ پیدا کرنا کیسے ناممکن ہے۔

کائینات و مخلوقات، نباتات وجمادات کے خالق ومبدی نے اونٹ کوپیدا کیا آسمان کو بلند کیا زمین کو ہموار کیا اور اس پرپہاڑ نصب کیے۔ آسمان زمین اور اس پر جمائے ہوئے پہاڑ اور اونٹ کی تخلیق اللہ کی قدرت کی عظیم اور واضح نشانیاں ہیں۔ آسمانوں کے علم سے انسان ابھی تک پوری طرح واقف نہیں ہے۔ البتہ جو کچھ معلوم ہوا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ آسمانوں کی وسعت انسان کے اندازے سے باہر ہے۔ آسمانوں کے اندر جو ستارے اور سیارے گشت کررہے ہیں اور کہکشان (galaxies) جو آج تک انسان کے علم میں آئی ہیں حیران کن ہیں۔ زمین کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اسے بچھایا گیا ہے علم سائنس کے مطابق زمین گول ہے اور اپنے محور کے اردگرد گھوم رہی ہے۔ اسے فرش کی طرح ہموار کیا گیا ہے۔ اس پر انسانوں کی دنیا ہے اور اسی پر انسانوں کے زندہ رہنے کا چارہ بھی ہے۔ اسی زمین پر نباتات اُگتے ہیں، حیوانات بھی پلتے ہیں اور اسی میں جمادات بھی موجود ہیں اور یہی دنیا انسانوں کے لئے امتحان گاہ کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ اونٹ سے مخاطب قرآن واقف ہیں اس کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی قدرت نمایاں ہے۔ انسان کے جسم میں گرمی کی شدت کے دوران درجہ حرارت کو اعتدال پر رکھنے کے لیے پسینہ آتا ہے جبکہ اونٹ کے جسم میں پسینہ پیدا کرنے والے غدود نہیں ہوتے ہیں پھر بھی شدید گرمی میں اس کا درجہ حرارت اعتدال میں رہتا ہے۔ صحرا میں پانی نہ ملنے کے باوجود خدا کی پیدا کردہ یہ مخلوق کئی کئی دن پیاسا رہ کر بھی چاک وچوبند رہ سکتی ہے۔ پہلے خیال کیا جاتا تھا کہ یہ عجیب جانور پیٹ میں پانی ذخیرہ کرلیتا ہے مگر تحقیق کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس کے معدے کے اندر پانی جمع رکھنے کی کوئی جگہ موجود نہیں۔ پھر قیاس کیا گیا کہ اس کے کوہان (hump) میں موجود اضافی چربی کو یہ پانی میں تبدیل کرلیتا ہے لیکن کیلی فورنیا یونیورسٹی میں ان کا تجربہ کیا گیا۔ تجربے میں جن اونٹوں کو موت کی حد تک پیاسا رکھا گیا ان کے جسموں میں چربی کی مقدار اتنی ہی پائی گئی جو تندرست اور پانی پیے ہوئے اونٹوں میں تھی جس سے معلوم ہوا کہ اونٹ کا جسم ہوا میں موجود ہائیڈروجن اور آکسیجن کو ملا کر پانی بنانے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اس طرح اونٹ کی خلقت آسمان کی بلندی اور زمین کی وسعت اور اس پر توازن برقرار رکھنے کے لیے جمائے ہوئے پہاڑ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''کیا زمین وآسمان کی تخلیق مشکل ہے یا انسان کی پیدائش مگر اکثر لوگ جاہل ہیں'' (سورہ فاطر) یعنی جس اللہ نے زمین اور بے حدوسعت رکھنے والے آسمان اور زمین پر بے شمار چھوٹے بڑے مخلوق اور آسمان میں لاتعداد ستارے اور سیارے اور کہکشان پیدا کیے اس

کے لیے انسانوں کو دوبارہ پیدا کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ انسان اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ زمین پر موجود مخلوقات اپنے اپنے مقررہ وقت پر موت پالیتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''زمین و آسمان کے لیے بھی ایک مقررہ وقت ہے۔'' (الروم) یعنی زمین وآسمان بھی اپنے مقررہ وقت پر فنا ہوجائیں گے۔

آخرت کی باتیں سن کر اگر یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ کیسے ممکن ہے تو انہیں اپنے ارد گرد کی دنیا پر نظر ڈالنی چاہیے اور غور کرنا چاہیے کہ یہ اونٹ کیسے بن گئے، یہ آسمان کیسے بلند ہوگیا، یہ پہاڑ کیسے قائم ہوگئے، یہ زمین کیسے بچھ گئی یہ ساری چیزیں اگر بن گئیں اور آپ کے سامنے موجود ہیں تو قیامت کیوں نہیں آسکتی ہے؟ آخرت میں ایک دوسری دنیا کیوں نہیں بن سکتی ہے دوزخ اور جنت کیوں نہیں ہوسکتے ہیں۔ (تفہیم القرآن)

اونٹ آسمان زمین اور پہاڑوں پر غور وفکر کرنے کے متعلق چند اصحاب فکر کا یہ بھی ماننا ہے کہ اونٹ کی خلقت، پہاڑوں کی جسامت زمین کی وسعت اور آسمانوں کی بلندی کا ذکر فرما کر داعیان دین کو سبق دیا گیا ہے کہ ان کو بھی اپنے آپ میں یہ اوصاف پیدا کرلینے چاہئیں۔ اونٹ کی خلقت میں اشارہ ہے کہ ایک داعی کو اونٹ کی طرح دعوت دین کے لیے بھوک پیاس اور مشقت برداشت کرتے ہوئے اپنے مالک اللہ تعالیٰ کی تابعداری کرنی چاہیے۔ آسمان کی بلندی کا ذکر فرما کر اشارہ کیا گیا ہے کہ داعی کی سوچ اور عزم آسمان کی طرح کی بلند ہونی چاہیے۔ اسے دنیا کے نفع و نقصان سے بالاتر ہوکر دین اسلام کی خدمت، لوگوں کی اصلاح اور فلاح کے لیے لگے رہنا چاہیے۔ زمین کا ذکر کرکے بتلایا گیا ہے کہ داعی میں زمین کے مانند وسعت ہونی چاہیے جس داعی میں اونٹ کا حوصلہ سوچ اور عزم میں آسان کی بلندی اور زمین جیسی وسعت اور صبر پایا جائے یقینا وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہے گا۔

فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ (۲۱)

پس اے نبی نصیحت کرتے رہو، تم بس نصیحت کرنے والے ہو

لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ (۲۲)

تم ان پر کوئی جبر کرنے والے نہیں ہو

إِلَّا مَن تَوَلَّى وَكَفَرَ(٢٣)

لیکن جس نے منہ موڑا اور انکار کیا

فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ(٢٤)

اسے اللہ بہت بڑا عذاب دے گا

إِنَّ إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ(٢٥)

یقینا ان کو ہماری طرف لوٹ آنا ہے

ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ(٢٦)

پھر بے شک ہمارے ہی ذمہ ان سے حساب لینا ہے

عالم آخرت اور کائینات کے ذکر کے بعد اب کلام کا رُخ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھرایا جاتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: کہ اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ لوگوں کو آخرت کے عذاب و ثواب کی یاد دہانی کرائیں اور کائینات کے مناظر اور مخلوقات پر دعوتِ تفکر کے ذریعہ انہیں نصیحت کریں۔ مگر آپ صرف نصیحت اور یاد دہانی کرنے والے ہیں۔ آپ تبلیغ وتذکیر کرتے رہیں اور اسلام ی طرف بلاتے رہیں۔ آپ اس کے لیے مکلف ہیں۔ اس کے لیے آپ کا کام بھی آسان کردیا گیا ہے لیکن آپ ان پر مسلط نہیں کئے گئے ہیں۔ آپ کو ان کے دلوں پر قابو نہیں ہے ان کے دل اللہ کے قابو میں ہیں۔ اس لیے آپ انہیں زبردستی اور مجبوراً راہ راست پر نہیں لاسکتے ہیں۔ قرآن میں اس کا ذکر یوں ہے۔

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ

(اے نبیؐ) بے شک جسے آپ چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے ہیں لیکن اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت فرماتا ہے۔ (القصص:٥٦)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے کہ دین کی دعوت دینے کے لیے آپ کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے لیکن جو لوگ اس دعوت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں آپ ان پر زبردستی کرنے کے مکلف نہیں ہیں۔ آپ انہیں زبردستی اسلام کے دائرے میں لانے کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ آپ کی ذمہ داری یہ ہے کہ آپ ان سے بے نیاز ہوکر دین اسلام کی دعوت کو جاری رکھیں۔ آپ ایمان نہ لانے والوں اور آپ کا مذاق اڑانے والوں کی پرواہ نہ کریں۔ آپ پوری سرگرمی سے دعوت و تبلیغ کا کام کرتے رہیں اور مخالفین کی ریشہ دوانیوسے متاثر نہ ہوں۔

واضح رہے کہ کافروں کی طرف سے اسلام کی دعوت کو رد کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بوجھ سا محسوس کرتے تھے۔ اس بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے ان سے فرمایا گیا ہے کہ آپ دعوت دیں مگر نتائج اللہ تعالیٰ کے سپرد کریں۔ وہ جو چاہے کرے حقیقت یہ ہے کہ ایک داعیٔ حق کی شدید خواہش ہوتی ہے کہ لوگ اس کی دعوت کو قبول کریں اور دعوت کامیاب ہو اس سلسلے میں اسے شدید اصرار و الحاح ہوتا ہے ۔ اس انسانی فطرت کےپیش نظر اللہ تعالیٰ نے داعیٔ حق کی اس شدید خواہش کے دباؤ کو کم کردیا۔ تاکہ وہ اس گرفت سے نکل کر دعوت کے میدان میں پوری یکسوئی کے ساتھ دعوت حق کی ذمہ داریاں ادا کرسکیں چاہے دعوت کی قبولیت کا حال اور انجام کچھ بھی ہو وہ اس فکر میں مبتلا نہ ہوں کہ کون ایمان لایا اور کون انکار کررہا ہے۔ یہ کام اللہ پر چھوڑ دیں وہی انسانوں کے دلوں سے واقف ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمیشہ یہ فکر لاحق ہوتی تھی کہ آپؐ جس کو دعوت دیں وہ قبول کرے۔ اس لیے انکار کرنے پر ان کے دل مبارک کو صدمہ پہنچتا تھا اور وہ رنجیدہ اور افسردہ ہوتے تھے۔ اس لیے انہیں ہدایت دی گئی کہ آپ دعوت دیتے رہیں، دعوت قبول کروانا آپ کا کام نہیں ہے۔ آپ کا کام صرف نصیحت کرنا ہے جو دعوت سے منہ موڑے گا اور انکار کرے گا اسے یونہی نہیں چھوڑا جائے گا بلکہ اسے آخرت میں ایک بہت بڑا عذاب دیا جائے گا۔ کافروں کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ اگرچہ تم سے دعوت حق پر ایمان لانے کے لیے زور زبردستی نہ کی جائے گی مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ تم جو چاہو، کرو اور بے لگام و بے قابو ہوکر دنیا کو جرائم اور برائیوں سے بھرو، بلکہ تمہیں اس نافرمانی اور بے راہ روی پر ایک بہت بڑے عذاب، عذاب اکبر کا سامنا کرنا پڑے گا۔ عذاب اکبر یعنی بہت بڑا عذاب سے مراد جہنم کا عذاب ہے۔ اسے عذاب اکبر اس لیے کہا گیا ہے کہ دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا عذاب بھی جہنم کے عذاب کے برابر نہیں ہوگا۔ حالانکہ دنیا میں کئی نافرمان قوموں پر اللہ کا عذاب آیا لیکن جہنم کا عذاب اس حیثیت سے دنیا کے سب عذابوں سے بڑا اور سخت عذاب ہے کیوں کہ وہ عذاب دائمی ہوگا۔ الا ماشا اللہ۔ آخر میں فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ اس بات سے بے فکر ہیں کہ انہیں کسی کے پاس اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے اور اس غفلت میں یہ اپنی موت کو بھی بھول چکے ہیں انہیں ضرور موت کا مزہ چکھنا ہے اور پھر انہیں ہمارے پاس آنا ہے اور یہاں پہنچ کر انہیں معلوم پڑے گا کہ ان کو حساب دینا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم ان سب کو دوبارہ اٹھائیں گے اور ان سب کا ان کے اعمال کے مطابق حساب لیں گے۔ اس طرح سے ان کو پیدا

کرنے کا ہمارا مقصد پورا ہوگا کیونکہ ہم نے دنیا کو ایک تفریح گاہ اور کھیل کھلاڑیوں کا میدان نہیں بنایا اور نہ دنیا میں رہنے والوں کو ہم نے بلا مقصد پیدا کیا ہے۔ بے شک اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اس بات سے پاک ہے کہ وہ کوئی چیز بلا مقصد پیدا کرے۔ بلکہ اس نے دنیا بنائی اور اس میں انسانوں کوں صرف اس مقصد کے لیے بسایا کہ انہیں اس دنیا میں ان کے اعمال سے آزمائیں ۔ جو انسان نیک اعمال کرکے اپنے خالق کو راضی کرے اسے اس کا معاوضہ جنت میملے گا جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اور جو برے اعمال کرکے اپنے خالق کو ناراض کرے اسے جہنم ملے گی۔ جس میں اسے ہمیشہ کے عذاب میں رہنا پڑے گا۔

سورۃ الفجر مکیۃ

اٰیتُہا:30 رکوعھا:1

بسم اللہِ الرَّحمٰن الرَّحیم

وَالۡفَجۡرِ o وَلَیَالٍ عَشۡرٍ o وَالشَّفۡعِ وَالۡوَتۡرِ o وَاللَّیۡلِ اِذَا یَسۡرِ o ھَلۡ فِیۡ ذٰلِکَ قَسَمٌ لِّذِیۡ حِجۡرٍ o اَلَمۡ تَرَ کَیۡفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِعَادٍ o اِرَمَ ذَاتِ الۡعِمَادِ o الَّتِیۡ لَمۡ یُخۡلَقۡ مِثۡلُھَا فِی الۡبِلَادِ o وَثَمُوۡدَ الَّذِیۡنَ جَابُوا الصَّخۡرَ بِالۡوَادِ o وَفِرۡعَوۡنَ ذِی الۡاَوۡتَادِ o الَّذِیۡنَ طَغَوۡا فِی الۡبِلَادِ o فَاَکۡثَرُوۡا فِیۡھَا الۡفَسَادَ o فَصَبَّ عَلَیۡھِمۡ رَبُّکَ سَوۡطَ عَذَابٍ o اِنَّ رَبَّکَ لَبِالۡمِرۡصَادِ o فَاَمَّا الۡاِنۡسَانُ اِذَا مَا ابۡتَلٰىہُ رَبُّہٗ فَاَکۡرَمَہٗ وَنَعَّمَہٗ فَیَقُوۡلُ رَبِّیۡۤ اَکۡرَمَنِ o وَاَمَّاۤ اِذَا مَا ابۡتَلٰىہُ فَقَدَرَ عَلَیۡہِ رِزۡقَہٗ فَیَقُوۡلُ رَبِّیۡۤ اَھَانَنِ o کَلَّا بَلۡ لَّا تُکۡرِمُوۡنَ الۡیَتِیۡمَ o وَلَا تَحٰٓضُّوۡنَ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ o وَتَاۡکُلُوۡنَ التُّرَاثَ اَکۡلًا لَّمًّا o وَّتُحِبُّوۡنَ الۡمَالَ حُبًّا جَمًّا o کَلَّاۤ اِذَا دُکَّتِ الۡاَرۡضُ دَکًّا دَکًّا o وَّجَآءَ رَبُّکَ وَالۡمَلَکُ صَفًّا صَفًّا o وَجِایۡٓءَ یَوۡمَئِذٍۭ بِجَھَنَّمَ ۙ یَوۡمَئِذٍ یَّتَذَکَّرُ الۡاِنۡسَانُ وَاَنّٰی لَہُ الذِّکۡرٰی o یَقُوۡلُ یٰلَیۡتَنِیۡ قَدَّمۡتُ لِحَیَاتِیۡ o فَیَوۡمَئِذٍ لَّا یُعَذِّبُ عَذَابَہٗۤ اَحَدٌ o وَلَا یُوۡثِقُ وَثَاقَہٗۤ اَحَدٌ o یٰۤاَیَّتُہَا النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّۃُ o ارۡجِعِیۡۤ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرۡضِیَّۃً o فَادۡخُلِیۡ فِیۡ عِبٰدِیۡ o وَادۡخُلِیۡ جَنَّتِیۡ o

پس منظر

سورۃ الفجر میں بھی سورہ غاشیہ کی طرح آخرت کی جزا و سزا کا ذکر ہے جس کا مشرکین مکہ انکار کرتے تھے۔ اس میں بھی مناظر کائینات کا تذکرہ کرکے انسانوں کو آخرت پر یقین لانے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کے حسین و جمیل مظاہر کی قسم کھاکر آخرت میں انسانوں کے پیش ہونے کی دلائل پیش کرتا ہے۔ قدرت کے مناظر کے بعد انسانی تاریخ سے استدلال کیا جارہا ہے۔ عاد، ثمود اور فرعون کے انجام بد کی دلیل دی جاتی ہے کہ کس طرح ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ اور قیامت پر ایمان نہ لانے کی وجہ سے دنیا میں ہی عذاب شدید میں بتلا کردیا۔ سورہ میں انسانی معاشرے کی عام اخلاقی حالت کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ نہ صرف عرب بلکہ پوری دنیا میں انسانی معاشرہ اس قدر بگڑا ہوا تھا کہ اخلاق اور انسانی ہمدردی نام کی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ لوگ دنیا پرستی اور مال ودولت کی تڑپ میں تمام انسانی قدریں بھول چکے تھے۔ یتیموں کی جائیداد ہڑپ کی جاتی تھی۔ غریب ناداروں اور لاچاروں کو پاؤں تلے روندا جاتا تھا۔ انہیں سماج میں کوئی وقعت نہ تھی مال کمانے کی حرص ولالچ میں لوگوں نے پاگل پن اختیار کیا تھا نہ ان کا پیٹ بھر جاتا اور نہ اُن کی پیاس بجھ جاتی تھی۔ دولت مندی کو یہ لوگ انعام سمجھتے تھے اور تنگ دستی کو اپنے لیے سزا اور توہین، یتیموں کا مال کھانے میں انہیں مزہ آتا تھا غریبوں کی ان کو کوئی ہمدردی نہ تھی صرف دنیا کی دولت جاہ حشمت، سرداری اور عیش وعشرت کی محبت میں گرفتار تھے۔ اس لیے انہیں اس حقیقت کی خبر دی جاتی ہے کہ دنیا کی دولت، سرداری و حکمرانی کو چھوڑ کر آپ کو آخرت میں اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے اور ہر چیز کا حساب دینا ہے۔ اُس وقت آپ کو سب کچھ معلوم ہوجائے گا اور اپنے اعمال پر پچھتاؤ گے مگر اس وقت تم لوگوں کو پچھتانے سے کوئی فائدہ نہ پہنچے گا البتہ جن لوگوں نے اطمینان کے ساتھ دین کی دعوت قبول کی ہوگی ان سے اللہ راضی ہوگا اور انہیں جنت میں داخل کیا جائے گا۔

وَالْفَجْرِ(۱)

قسم ہے فجر کی

وَلَيَالٍ عَشْرٍ(۲)

اور دس راتوں کی

وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ(۳)

اور جفت اور طاق کی

وَاللَّيْلِ إِذَا يَسْرِ(۴)

اور رات کی جب وہ رخصت ہوتی ہے

هَلْ فِي ذَٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِي حِجْرٍ(۵)

کیا عقل والوں کے لیے اس میں کوئی قسم ہے

اللہ تعالیٰ نے اس سورہ کی ابتدا چار قسموں سے فرمائی ہے۔ پہلی قسم صبح صادق کی دوسری دس راتوں کی تیسری جفت اور طاق کی اور چوتھی قسم رُخصت ہونے والی رات کی اور پھر فرمایا کہ بے شک ان قسموں کی ایک بہت بڑی اہمیت ہے کیونکہ جن چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے ان میں اللہ کی قدرت کی نشانیاں موجود ہیں اور ایک ایک نشانی میں عقلمندوں کے لیے رب کی پہچان ہے اور اس کے وجود کا ثبوت ہے۔

ان قسموں کے متعلق مفسرین کی مختلف آرا ہیں اور ان آرا میں اختلاف کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان قسموں کی وضاحت نہیں فرمائی ہے اگر ایسا ہوتا تو پھر ان کے مطلب میں کوئی اختلاف نہ ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر کسی نے اپنے اپنے فہم و ادراک کے مطابق ان قسموں کی تفسیر کی۔ سب سے پہلے فجر کی قسم کھائی گئی ہے۔ حضرت ابن عباس کا قول ہے کہ الفجر سے مراد ہر روز کی فجر ہے۔ ایک اور قول کے مطابق اس سے مراد فجر کی نماز ہے۔ یہ بھی ایک قول ہے کہ فجر سے مراد محرم کا پہلا دن کیونکہ محرم کے پہلے دن سے نیا سال شروع ہوتا ہے۔ بہرحال رات کو جب اندھیرا چھا جاتا ہے تو رات میں انسان آرام کر لیتا ہے۔ رات جب پوری ہوجاتی ہے تو انسان نیند سے اُٹھ کر دن میں شامل ہوجاتا ہے جس کا آغاز فجر سے ہوجاتا ہے اور اس طرح انسان کی زندگی میں رات اور دن لگاتار آتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس رات اور دن کے آنے جانے میں انسان کی موت آجاتی ہے۔ جس طرح نیند سے بیدار ہو کر وہ دن کو دیکھتا ہے لیکن حیران نہیں ہوجاتا ہے کیونکہ وہ ہر روز دن اور رات کے چکر کو دیکھتا ہے۔ اسی طرح وہ موت کے بعد رات کی نیند کی طرح بیدار ہو کر قیامت کے دن میں شامل ہوجائے گا۔ اگر دنیا میں اس نے اس دن پر یقین کر کے خدا کی بندگی کی ہوگی تو پھر اس دن اسے کوئی حیرانگی نہ ہوگی۔ اگر اس نے قیامت کا انکار کر کے خدا کی بندگی اور فرمانبرداری سے منہ موڑا ہوگا تو اس دن وہ حیران اور خوفزدہ ہوگا اور اسے زبردست پریشانی کا سامنا کرنا ہوگا۔ یہ دنیا ایک رات کی طرح ہے۔ جس طرح رات کے بعد دن کا ظہور ہوتا ہے اسی طرح انسان کو دنیا میں موت آنے کے بعد قیامت کے دن سے واسطہ پڑے گا۔ جس طرح رات کے ختم ہونے کے لیے فجر کا وقت مقرر ہوتا ہے اور دن اپنے وقت پر نمودار ہوتا ہے۔ اسی طرح قیامت کا وقت مقرر ہے۔ وہ اپنے مقررہ وقت پر برپا ہوجائے گی۔ انسان ہر روز فجر کی تمثیل میں قیامت کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ رات کو سوتے ہیں اور صبح کو اٹھتے ہیں اور دن کو پاتے ہیں۔ اسی طرح ایک دن انسان کو موت آئے گی اور دوبارہ زندہ ہو کر ایک بڑے دن یعنی قیامت کے دن کو پائے گا۔ اس دن سارے انسان اپنے مرقدوں سے آنکھیں ملتے ہوئے اٹھیں گے اور دوڑتے ہوئے اپنے رب کے حضور پیش ہونگے اور گھبرا کر ایک دوسرے سے کہیں گے مَنۡ بَعَثَنَا مِنۡ مَّرۡقَدِنَا کس نے ہمیں ہماری خواب گاہوں سے اٹھایا۔ آواز آئے گی یہ وہی قیامت ہے جس کا رحمان نے وعدہ کیا تھا اور رسولوں کی بات سچ تھی۔

یہ اگر آئین ہستی ہے کہ ہو ہر شام، صبح

مرقدِ انسان کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح

وَلَیَالٍ عَشْرٍ۔ دس راتوں کی قسم

دس راتوں کی ایک سے زاید تفسیریں ہیں۔ ایک کے مطابق دس راتوں سے مراد ذو الحجہ کی دس عظیم راتیں ہیں۔ ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ذی الحجہ کی دس دنوں کی (نفل) عبادت باقی سب دنوں کی (نفل) عبادت سے محبوب تر ہے۔ ان دس دنوں کا روزہ ایک سال کے روزوں کے برابر ہے اور اس کے ایک رات کی عبادت شب قدر کی عبادت کے برابر ہے۔ (ترمذی)

ایک اور قول کے مطابق دس راتوں سے مراد ماہ رمضان کی پہلی دس راتیں ہیں اور دوسرے قول کے مطابق دس راتوں سے مراد آخری دس راتیں ہیں جن میں شب قدر بھی ہے۔ یہ بھی ایک قول ہے کہ دس راتوں سے مراد ماہ محرم کا عشرہ اول (پہلی دس راتیں) ہیں جس کا دسواں دن عاشورہ ہوتا ہے۔ ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رمضان کے بعد افضل روزے ماہ محرم کے روزے ہیں اور فرض نماز کے بعد افضل نماز رات کی نماز (تہجد) ہے۔ تفہیم القرآن میں دس راتوں کی تفسیر اس طرح ہے۔ ''سلسلہ بیان کو نگاہ میں رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد مہینے کی تیس راتوں میں سے ہر دس راتیںہیں۔ پہلی دس راتیں وہ جس میں چاند ایک باریک ناخن کی شکل سے شروع ہو کر ہر رات کو بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ آدھے سے زیادہ روشن ہوجاتا ہے۔ دوسری دس راتیں وہ ہیں جن میں رات کا بڑا حصہ چاند سے روشن رہتا ہے۔ آخری دس راتیں وہ جن میں چاند چھوٹے سے چھوٹا اور رات کا بیشتر حصہ تاریک سے تاریک تر ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ مہینے کے خاتمے پر پوری رات تاریک ہوجاتی ہے۔'' (تفہیم القرآن)

چاند صدیوں سے اپنی اس روش پر قائم ہے اپنی عادت سے ہٹ کر لبھی لمحہ بھر کی غفلت نہیں کرتا ہے۔ پوری اطاعت کے ساتھ اپنے مدار پر چل رہا ہے اور تب تک چلتا رہے گا جب تک اللہ کی مرضی ہو۔ چاند کے دس دس دنوں کے تین مرحلوں کی گردش انسان کی زندگی کی مثال ہے۔ جس طرح چاند پہلے مرحلہ (1st phase) میں ناخن کی طرح ہلال (Crescent) کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ اسی طرح انسان بھی پیدا ہوکر پہلے ایک چھوٹے کمزور بچے کی حیثیت سے وجود میں آتا ہے۔ پھر چاند کی طرح جوانی میں اور اپنی آخری عمر میں پھر سے کمزور شکل اختیار کرلیتا ہے۔ جس طرح چاند آخری مرحلے (stage) پر غائب ہوجاتا ہے۔ اسی طرح انسان بھی موت پاکر چاند کی طرح دنیا سے غائب ہوجاتا ہے۔ چاند ہر مہینے انسانوں کی عبرت کے لیے قدرت کی نشانی کے طور پر اپنے وجود میں تبدیلی لاتا رہتا ہے۔ لیکن آخری مرحلے میں اپنے خاتمہ کے لیے اللہ کے حکم کے انتظار میں ہے۔ انسان بھی اپنی زندگی کے تین مرحلوں بچپن، جوانی اور بڑھاپے سے گزر کر کسی بھی مرحلے میں خدا کے حکم کے مطابق اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے فوت ہوکر آخرت کی طرف چلا جاتا ہے۔ لیکن افسوس وہ اپنی زندگی کے ان مرحلوں اور اپنے انجام کو یکسر بھول جاتا ہے اور اسے تب یاد آتا ہے جب اسے موت آجاتی ہے۔

۳: جفت اور طاق کی قسم

جفت اُس عدد کو کہتے ہیں جو دوبرابر حصوں میں تقسیم ہوتا ہے جیسے 2, 4, 6, 8 اور طاق اس عدد کو کہتے ہیں جو دوبرابر حصوں میں تقسیم نہیں ہوتا ہے جیسے 1, 3, 5, 7, 9 مولانا ابوالاعلیٰؒ کی تفسیریوں ہے ''عمومی حیثیت سے دیکھا جائے تو اس سے مراد کائینات کی تمام چیزیں ہوسکتی ہیں کیونکہ ہر چیز یا تو جوڑا جوڑا ہے یا تنہا چونکہ یہاں بات دن اور رات کی ہورہی ہے اس لیے سلسلہ مضمون کی مناسبت سے جفت اور طاق کا مطلب تغیر ایام (دنوں کی تبدیلی) ہے کہ مہینے کی تاریخیں ایک سے دو اور دو سے تین ہوتی جاتی ہیں اور تغیر ایک نئی کیفیت لے کر آتا ہے'' (تفہیم القرآن)

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

اقبالؒ

اس کائینات میں سکون ناممکن ہے یہاں ہر گھڑی انقلاب اور تغیر ہوتا رہتا ہے۔ اگر اس کائینات میں کسی چیز کو دوام اور پائیداری ہے تو وہ یہی قانون تغیر ہے۔ پس جب تغیر اور انقلاب اس دُنیا کا قانون ہے تو کسی انسان کو اس تغیر یا انقلاب سے خوفزدہ یا غمگین نہ ہونا چاہیے جو اس کی زندگی میں پیدا ہو کیونکہ تغیر اور انقلاب سے کوئی شخص محفوظ نہیں۔ اہل علم کی ایک رائے یہ ہے کہ طاق سے مراد اللہ تعالیٰ کی اپنی ذات ہے اور جفت سے مراد پوری مخلوق ہے جسے اللہ تعالیٰ نے جوڑے جوڑے میں پیدا کیا ہے۔ اسی مضمون کا استعمال روزمرہ زندگی میں انسانوں کی زبان میں ہوتا ہے۔ جیسے دن رات، روشنی اندھیرا، سورج اور چاند، زمین اور آسمان، دھوپ اور چھاؤں، سردی اور گرمی، مذکر اور مونث، نیکی اور بدی اسی طرح تمام جانداروں کو بھی نر اور مادہ کے جوڑوں میں پیدا کیا گیا ہے۔ سائنس کے مطابق جس طرح ہر جاندار میں نر اور مادہ ہوتا ہے اسی طرح بے جان چیزوں میں منفی (negative) اور مثبت (positive) مخالف عنصر پایا جاتا ہے جیسے بجلی سے روشنی پیدا کرنے کے لیے دو مخالف کرنٹ نیوٹرل (neutral) اور فیز (phase) کی ضرورت ہوتی ہے۔

۴: رخصت ہونے والی رات کی قسم

چار قسموں کی ابتدا فجر یعنی صبح سے کی گئی اور اختتام رات کے رخصت ہونے یعنی دوبارہ صبح آنے کی قسم پر کیا گیا ہے۔

اس سے اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ جس طرح ہر دن کے بعد رات آتی ہے اور ہر رات کے بعد دن آتا ہے اور اسی رات دن کے آنے جانے میں انسان کی زندگی گزرجاتی ہے۔ اسی طرح اس بات پر یقین ہونا چاہیے کہ دنیا کی اس طویل رات کے بعد قیامت کی صبح آئے گی اور اس کے طویل دن پر قیامت کی رات کا پردہ چھا جائے گا۔ اب فرمایا جارہا ہے کہ کیا عقل والوں کے لیے اس میں کوئی قسم ہے۔ سوالیہ انداز میں پوچھا گیا ہے کہ کیا اس قسم میں صاحب عقل کے لیے کوئی سبق ہے یعنی یہ قسمیں اس لیے کھائی گئی ہیں کہ قیامت کا آنا اٹل ہے۔ اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اپنی

سچائی کو ثابت کرنے کے لیے کوئی کہتا ہے کہ کیا میں نے سچ نہیں کہا ! کہنے کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ جو کچھ میں نے کہا وہ سچ ہے۔

یہ قسمیں کس مقصد کے لیے کھائی گئی ہیں مولانا سید مودودیؒ اس پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں: ''قسم اس بات پر کھائی گئی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جزا و سزا کی جو خبر دے رہے ہیں وہ برحق ہے۔ یہ سب چیزیں اس حقیقت پر دلالت کررہی ہیں کہ ایک رب قدیر اس کائینات پر فرمانروائی کررہا ہے اور وہ جو کام بھی کررہا ہے بے تکا بے مقصد، بے حکمت اور بے مصلحت نہیں کررہا ہے۔ بلکہ اس کے ہر کام میں صریحاً ایک حکیمانہ منصوبہ کارفرما ہے۔'' (تفہیم القرآن جلد ششم)

مناظر کائینات کے ان حقائق پر غور وفکر کرنے سے کہ کس طرح رات آتی ہے، اس کے ختم ہونے پر سورج نمودار ہوتا ہے اور روشن دن کا اظہار ہوتا ہے، پھر چاند کے گھٹنے اور بڑھنے سے اور دن اور رات کے آنے جانے سے مہینوں اور سالوں کا شمار کیا جاتا ہے اور ان سالوں کے گزر جانے سے صدیاں وجود میں آتی ہیں، کوئی صاحب عقل یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ اتنی بڑی کائینات از خود وجود میں آگئی ہے اور اس کا نظام کسی منتظم اور ناظم کے بغیر خود بخود چل رہا ہے۔

جفت اور طاق کو اگر جوڑے کے معنی میں لیا جائے تو واضح ہوجاتا ہے کہ اس خالق کُل شَیٔ کی کاری گری کتنی عظیم اور شاندار ہے جس نے ہر چیز کو جوڑوں میں پیدا کیا۔ اللہ کی کاری گری سے اس کائنات میں رنگ ہے، پھر بھی اگر خالق کائینات کی اس پُر رونق دنیا میں کوئی شخص یہ کہے کہ اس کو پیدا کرنے والا کوئی نہیں اور نہ آخرت نام کی کوئی چیز ہے تو وہ انسان نہیں حیوان ہے بلکہ حیوان سے بھی بدتر ہے کیونکہ حیوان کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کا کوئی مالک ہے جو اسے پالتا ہے لیکن جس انسان کی سمجھ میں یہ بات نہ آئے کہ اُس کے مالک نے اسے پیدا کیا اور اسے پالتا ہے اور وہی اسے موت دے گا۔ وہی آخرت میں اس کا حساب لے گا۔ وہ حقیقت میں حیوان سے بدتر ہے۔

أَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ(٦)

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آپ کے رب نے عاد کے ساتھ کیا کیا

إِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ(۷)

اونچے ستونوں والے عاد ارم کے ساتھ

الَّتِیْ لَمْ یُخْلَقْ مِثْلُہَا فِی الْبِلَادِ(۸)

جن کے مانند کوئی قوم پیدا نہیں کی گئی تھی۔

وَثَمُودَ الَّذِیْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ(۹)

اور ثمود کے ساتھ جنہوں نے وادیوں اور پہاڑوں کو تراش کر اپنے گھر بنا رکھے تھے۔

وَفِرْعَوْنَ ذِی الْأَوْتَادِ(۱۰)

اور میخوں والے فرعون کے ساتھ

الَّذِیْنَ طَغَوْا فِی الْبِلَادِ(۱۱)

یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے شہروں میں بڑی سرکشی کی

فَأَکْثَرُوا فِیْہَا الْفَسَادَ(۱۲)

اور ان میں بہت فساد برپا کیا

فَصَبَّ عَلَيۡهِمۡ رَبُّكَ سَوۡطَ عَذَابٍ(۱۳)

آخر کار آپ کے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسادیا

إِنَّ رَبَّكَ لَبِٱلۡمِرۡصَادِ(۱۴)

حقیقت یہ ہے کہ آپ کا رب گھات میں ہے۔

اللہ تعالیٰ کی تخلیق اور اس کی قدرت کی نشانیوں کے استدلال کے بعد اب انسانی تاریخ سے استدلال کیا جاتا ہے۔ تاریخ کی چند سرکش قوموں کی گمراہی اور ان کے انجام کا ذکر کیا جارہا ہے کہ یہ ایسی قومیں ہیں جن کی تاریخ سے عرب کے لوگ باخبر تھے۔ سینہ بہ سینہ لوگوں تک ان گمراہ اور عذاب یافتہ قوموں کے حالات پہنچ چکے تھے۔ پچھلی قوموں کے انجام بد سے لوگوں کو واقف کرانا اور تاریخ کی جانکاری دینا بہت اہم ہے کیونکہ جو قومیں اپنی تاریخ سے باخبر نہیں ہوتیں، ان کی گمراہی کی جڑیں زیادہ مضبوط ہوجاتی ہیں۔ جب انہیں ان سے پہلی قوموں کے عذاب کی یاد دلائی جاتی ہے تو انہیں اس گمراہی سے نکالنا آسان ہوجاتا ہے ۔ جن قوموں نے آخرت اور جزا و سزا کی فکر سے بے خوف ہوکر زندگی گزاری اور فسادی بن کر خدا کی نافرمانی کی، ان ہی لوگوں نے دنیا میں اللہ اور اس کے رسولوں کے خلاف بغاوت کی تو اللہ تعالیٰ نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا۔ تاریخ گواہی دیتی ہے کہ جن قوموں نے آخرت کی فکر نہ کی بلکہ صرف اپنے نفس کی پیروی کی ان پر خدا کا قہر نازل ہوا اور وہ عبرت کا نشانہ بن کر رہے۔ ایسی ہی گمراہ اور نافرمان قوموں کی مثالیں پیش کی گئی ہیں کہ ان کی نافرمانی کی وجہ سے ان پر عذاب الٰہی نازل کیا گیا۔ قوم عاد کا ذکر کیا گیا ہے۔ قوم عاد دو ناموں سے مشہور ہیں ایک عاد اولیٰ اور دوسرا عاد اخریٰ یعنی عاد کی پہلی قوم اور دوسری قوم۔ عاد اخریٰ دراصل عاد اولیٰ کے عذاب الٰہی سے ہلاک ہونے کے بعد ابھرے تھے۔ عاد اولیٰ کے لیے حضرت ہود علیہ السلام کو بھیجا گیا تھا۔ انہوں نے اسے جھٹلایا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں عذاب شدید میں پکڑ لیا۔ عاد اولیٰ کو عاد اِرم بھی کہا جاتا تھا کیونکہ وہ

اِرم بن سام بن نوح علیہ السلام کی نسل سے تھے۔ قوم ثمود بھی اسی نسل سے تھی۔ عاد کو ذات العماد کے نام سے بھی پکارا گیا ہے کیونکہ یہ لوگ اونچے ستونوں والی عمارتوں میں رہتے تھے۔

موجودہ جغرافیہ کے مطابق قوم عاد کی رہائش عمان اور حضرموت کے درمیان تھی۔ یہ علاقہ سمندر کے کنارے واقع تھا۔ یہاں ریت کے بڑے بڑے ٹیلے اور بلند بالا پہاڑ تھے۔ یہ لوگ جسمانی اعتبار سے قد کے لمبے جسیم اور قوی تھے۔ دُنیا میں ان کا ثانی نہیں تھا۔ جیسا کہ ان کے متعلق فرمایا گیا ہے: لَمۡ یُخۡلَقۡ مِثۡلَهَا فِی الۡبِلَادِ۝ اس جیسی کوئی قوم پیدا نہیں کی گئی تھی۔

اس قوم کو ذات العِماد یعنی ستونوں والی قوم کہا گیا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قوم نے ستونوں والی بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کی تھیں۔ ان کی زمین نہایت سرسبز تھی جس میں ہر قسم کے باغات اور لہلہاتے کھیت تھے۔ قرآن میں انہیں احقاف والے بھی کہا گیا احقاف ریت کے بڑے بڑے ٹیلوں کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ہود علیہ السلام کو اسی قوم کی طرف بھیجا۔ انہوں نے مدت دراز تک اس قوم کو سمجھایا مگر یہ قوم سمجھنے کے لیے تیار نہ ہوئی اور نافرمانی کی۔ پھر ان پر عذاب نازل ہوا اور انہیں دنیا سے نیست و نابود کردیا گیا صرف عبرت کے لیے ان کی تاریخ باقی رہ گئی۔

سورہ اعراف میں ان کے تکبر اور گھمنڈ کا ذکر کیا گیا ہے فرمایا گیا:

فَاَمَّا عَادٌ فَاسۡتَكۡبَرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ وَقَالُوۡا مَنۡ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً

قرآن مجید میں مختلف سورتوں میں ان کے جرائم کا ذکر کیا گیا ہے۔

۱) انہوں نے خود ساختہ معبود بنا رکھے تھے اور ان کے سامنے اپنی حاجات و مشکلات پیش کرتے تھے۔ (الاعراف)

۲) یہ لوگ اللہ کی آیات کو جھٹلاتے اور دُنیا پر اتراتے تھے۔ (المومنون)

۳) ان کا عقیدہ تھا کہ اس دنیا کے سوا اور کوئی جہاں برپا نہیں ہوگا۔ (المومنون)

اس قوم کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح تباہ کیا اس کا منظر قرآن میں اس طرح ہے:

۱) ان پر سات راتیں اور آٹھ دن زبردست آندھی اور ہوا کے بگولے چلے۔ (الحاقہ)

۲) ان پر گرج چمک اور تیز ہواؤں اور بارش کا طوفان آیا۔ (احقاف)

۳) آندھیوں نے انہیں کھجور کے تنوں کی طرح پٹخ پٹخ کر دے مارا۔ (الحاقہ)

۴) انہیں ریزہ ریزہ کردیا گیا۔ (الذاریات)

۵) یہ لوگ دنیا میں ذلیل و خوار ہوئے اور آخرت میں سخت عذاب میں بتلا ہوں گے۔ (السجدہ)

٦) قوم ہود (عاد) کو نیست و نابود کردیا گیا۔ (اعراف)

قوم ثمود:

یہ لوگ مدینہ اور شام کے درمیان ایک وادی میں رہتے تھے۔ اس وادی سے وادی القُریٰ بھی مراد لیا گیا ہے۔ جہاں انہوں نے پہاڑ اور چٹانوں کو تراش کر خوبصورت محلات تعمیر کئے تھے۔ حضرت صالح علیہ السلام کو ان کی طرف بھیجا گیا تھا اس لیے انہیں قوم صالح بھی کہتے ہیں۔ ان لوگوں نے نبی کو جھٹلایا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں عذاب دے کر ہلاک کردیا۔

قرآن میں ان کے جرائم مختلف سورتوں میں بیان ہوئے ہیں:

۱) قوم صالح (ثمود) اللہ کے ساتھ شرک کرتی تھی۔ (ھود)

۲) ثمود اللہ کو جھوٹا قرار دیتے تھے۔ (الشعراء)

۳) یہ لوگ بہت زیادہ اسراف، تکبر اور زمین میں فساد کرنے والے تھے۔ (الشعراء)

۴) قوم ثمود ہدایت کے بجائے گمراہی کو پسند کرتی تھی۔ (حٰم سجدہ)

۵) انہوں نے اللہ کی نشانی کو جھٹلایا۔ (ہود)

قرآن میں ان کی ہلاکت کا منظر:

۱) قوم ثمود کو تین دن کی مہلت دی گئی۔ (ہود)

۲) قوم ثمود کو صبح کے وقت ہولناک دھماکے نے آلیا اور ان کا مال و اسباب ان کے کچھ کام نہ آئے۔ (الحجر)

۳) ہم نے ان پر ہولناک چیخ نازل کی وہ ایسے ہوگئے جیسے بوسیدہ اور سوکھی ہوئی باڑ ہوتی ہے۔ (القمر)

فرعون اور اس کے ساتھیوں کا انجام:

قوم عاد اور قوم ثمود کی تباہی کے بعد فرعون اور آل فرعون کی تباہی کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ فرعون مصر کے حکمران کا اصل نام نہیں بلکہ اس کا سرکاری لقب تھا۔ قدیم تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یمن کا حکمران تُسبع حبشہ کا نجاشی، روم کا حکمران قیصر اور ایران کا حکمران کسریٰ کہلاتے تھے۔ ہندوستان کے حکمران بھی راجا کہلاتے تھے۔ جس طرح آج کل کے صدارتی نظام میں حکمران پریذیڈنٹ (president) اور پارلیمانی نظام کا حکمران وزیر اعظم (Prime minister) کہلاتا ہے۔ اسی طرح مصر کا بادشاہ سرکاری منصب کے حوالے سے فرعون کہلاتا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جس فرعون سے واسطہ پڑا، اس کا نام قابوس یا رعمیس تھا۔ یہ اپنے آپ کو خدا کا اوتار سمجھتا تھا اور لوگوں کے مزاج اور مشرکانہ عقائد سے فائدہ اٹھا کر اس نے اپنے آپ کو رب اعلیٰ قرار دیا اور دعویٰ کیا کہ زمین و آسمان میں مجھ سے بڑھ کوئی رب نہیں ہے۔ میں سب دیوتاؤں سے بڑا دیوتا ہوں اور سب سے بڑا رب ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی کذب بیانی کا پول کھولنے کے لیے اس کے گھر میں پرورش پانے والے موسیٰ علیہ السلام کو رسول منتخب کیا۔

فرعون کو میخوں والا کہا گیا ہے اس کے متعلق مفسرین نے کئی تفسیریں بیان کی ہیں:

ایک تفسیر یہ ہے کہ وہ اسلحہ کے لحاظ سے طاقتور تھا۔ اوتاد سے مراد اس کی طاقت اور پائیدار حکومت ہے۔ عربی زبان میں طاقت اور پائیداری کے لیے اس طرح کے الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً کسی معزز قوم کے لیے کہا گیا کہ انہوں نے عزت کی میخیں گاڑ دیں۔ یعنی وہ مستحکم اور دوامی عزت کے مالک ہیں۔ ایک اور قول کے مطابق اوتاد سے فوجیں مراد ہیں۔ فوج اپنے ساتھ خیمے رکھتی تھی اور سفر میں جہاں جاتی تھی میخوں کے ذریعے خیمے گاڑتی تھی۔ ایک اور تفسیر یہ ہے کہ فرعون لوگوں کو سزا دینے کے لیے ستون سے باندھ کر میخیں ٹھونک کر ہلاک کرتا تھا۔ جو کوئی شخص خدا پر ایمان لاتا تو اسے میخیں ٹھونک دی جاتی تھیں اور اس طرح ہلاک کیا جاتا تھا۔ آسیہ نام کی خاتوں فرعون کی محبوب ترین بیوی تھی کہا جاتا ہے کہ اس نے اللہ پر خفیہ ایمان لایا تھا۔ جب فرعون کو معلوم ہوا تو اس نے آسیہ سے کہا کہ شاید تجھے بھی موسیٰ کے خدا کا جنون ہے اور تو نے اس پر ایمان لایا۔ آسیہ نے جواب دیا اللہ کی پناہ مجھے جنون نہیں بلکہ میں شہادت دیتی ہوں کہ میرا مالک اور تیرا مالک اور زمین و آسمان کا مالک ایک خدا ہے۔ اسی پر میں نے ایمان لایا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اس پر فرعون غضب ناک ہوا اور اس نے آسیہ کو جان سے مارنے کی دھمکی دی۔ آسیہ کے ماں باپ نے بھی اپنی بیٹی کو سمجھانے کی کوشش کی اور کہا کہ اپنے شوہر کو رب مان کر اس کی ناراضگی اور اس کے غضب سے بچو، مگر آسیہ اپنے رب اعلیٰ کا شریک ٹھہرانے کے لیے تیار نہ ہوئی اور فرعون کو رب ماننے سے انکار کردیا۔ فرعون نے غصے میں آکر اپنی محبوب بیوی کے جسم پر میخیں ٹھونک دیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس عذاب کو سہل بنانے کے لیے اس کے لیے جنت کا دروازہ کھول دیا اس وقت آسیہ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اے اللہ جنت کے اندر اپنے قرب میں میرے لیے مکان بنادے اور فرعون اور اس کی بد اعمالیوں سے مجھے نجات عطا فرمادے۔ دعا قبول ہوئی اللہ نے اس کی روح قبض کرلی اور جنت میں اس کو سکونت عطا فرمادی۔

فرعون گمراہی اور تکبر میں مبتلا رہا تو اس پر عذاب الٰہی کا کوڑا برسا وہ لشکر سمیت پانی میں ڈوب گیا اور اس کی لاش عبرت کے لیے اللہ تعالیٰ نے محفوظ کردی جو آج بھی مصر کے لاش گھر میں موجود ہے۔

یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے شہروں میں بڑی سرکشی کی اور ان میں فسادات برپا کیے آخر کار اللہ تعالیٰ نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا۔ حقیقت میں اللہ تعالیٰ گھات میں ہے۔ قوم عاد، قوم ثمود اور فرعون مغرور اور متکبر قومیں تھیں یہ سب اپنے زمانہ میں مال و دولت اور حکومت میں بے مثال تھیں۔ مگر حکومت کے نشے میں آکر انہوں نے خدا کی نافرمانی کی جب کہ فرعون نے خدا ہونے کا دعویٰ بھی کیا حکمرانی کے نشے میں انہوں نے گھمنڈی اور سرکشی اختیار کی اور زمین پر فساد برپا کیا۔ خدا کی بندگی سے انکار کرکے حدود پھلاند دیئے اور زمین کو فساد سے بھر دیا۔ انہوں نے دنیا کے انسانوں پر جابر بن کر تسلط پایا تھا۔ قرآن مجید نے انہیں میں سے ایک قوم یعنی قومِ عاد کی تصویر کشی اس طرح کی ہے:

وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَo اور تم نے جب کسی پر ہاتھ ڈالا تو جبار بن کر ڈالا۔

یعنی یہ قومیں لوگوں پر ہر طرح کا ظلم و جبر روا رکھتے تھے۔ سرکشی اور ظلم و جبر لازماً فساد کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ اس ظلم و جبر اور سرکشی سے ظالم، جابر اور سرکش خود بھی فساد کا شکار ہوجاتا ہے اور انسانی زندگی کے تمام گوشوں میں بگاڑ پیدا ہوجاتا ہے ۔

یہ ظالم اور سرکش اصحابِ اقتدار اچھی طرح جانتے ہیں کہ صحیح تصورات بلند خیالات، فہم دین، خداپرستی، نیک نیتی اور انسانی ہمدردی ان کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔ اس لیے وہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ان صالح تصورات کو جھوٹے تصورات سے بدل ڈالیں تاکہ ان کا کام آسان ہوجائے۔ اس لیے یہ سرکش حکمران سماجی برائیوں کو فروغ دیتے ہیں اور اس طرح سماج کو برائیوں میں مبتلا کرکے اپنی سرکشی اور ظالمانہ حکمرانی کے لیے ہمدردی (support) حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور لوگوں کو فتنوں اور فسادات میں مشغول رکھتے ہیں۔ اس طرح ایک تیر سے دو شکار ہوتے ہیں۔ عاد، ثمود اور مصر کے فراعنہ ایسی ہی سرکش قومیں تھیں جو لوگوں پر ہر طرح کا ظلم وجبر روا رکھتے تھے۔ ان کے پاس پیغمبر اللہ کا پیغام لے کر آئے لیکن انہوں نے اُنہیں جھٹلایا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں سنبھلنے کی مہلت دے دی لیکن جب وہ ختم ہوگئی تو اُس نے انہیں ان کی ہٹ دھرمی کی پاداش میں پکڑ لیا اور دردناک عذاب دے کر ہلاک کر ڈالا۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ گھات میں ہے

یہ بات معلوم رہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو عذاب دینے کے لیے دنیا ہی کو مقرر نہیں فرمایا ہے اور نہ وہ ہر کسی فرد یا قوم کو دنیا میں ہی پکڑ لیتا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مصلحت یہ ہے کہ دنیا میں انسانوں کو آزمائش میں ڈالا گیا ہے اور انہیں اختیار ہے کہ وہ نیک راہ اختیار کریں یا برائیاں کرتے رہیں۔ اس اختیار کا ناجائز فائدہ اٹھا کر جو گمراہی کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ انہیں اللہ تعالیٰ اگر اپنی مصلحت اور حکمت کے تحت دنیا میں عذاب نہ بھی دے لیکن آخرت میں ان کے لیے جو عذاب تیار کر رکھا گیا ہے اس سے انہیں کوئی نہیں بچا سکتا ہے۔ اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ ایک روز جزا و سزا ظہور میں آئے گا۔ جس کا نام قیامت ہے۔ اس دن لوگوں کو اپنے نیک اعمال کی جزا مل کر رہے گی اور برے اعمال کی سزا بھی ملے گی۔ اس دن سب لوگوں کو معلوم ہوجائے گا کہ یہ دنیا کوئی کھیل تماشا نہیں تھا بلکہ یہ انسانوں کی امتحان گاہ اور آزمائش کا ٹھکانہ تھا۔

ظالم اور سرکش قوموں کے اس عبرت ناک انجام کی خبر اور اللہ تعالیٰ کی گھات میں رہنا اور مجرموں کے اعمال کا ریکارڈ کرنا ان اہل ایمان کی تسلی اور اطمینان کے لیے ہے جو منکرینِ حق کے ظلم و تشدد کا شکار ہوتے ہیں۔ اس خبر سے انہیں سکون اور اطمینان حاصل ہوتا ہے کہ رب العالمین ان ظالموں، فاسدوں کی گھات میں ہے۔ اس کی نظر سے کوئی شئے اوجھل نہیں ہے۔ وہ ان کی نگرانی کر رہا ہے۔ اس کی گرفت سے کوئی نہیں نکل سکتا ہے اور یہ کہ وہ ان سرکشوں، شریروں اور مفسدوں پر نظر رکھے ہوئے ہے جنہیں ان کی سرکشی، شرارت اور جرائم کی سزا ضرور ملے گی۔

فَأَمَّا الْإِنسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَكْرَمَنِ(١٥)

لیکن انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس کا رب اس کی آزمائش کرتا ہے اور اسے عزت اور نعمت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت بخشی ہے۔

وَأَمَّا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ(١٦)

اور جب اس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اس کا رزق اس پر تنگ کرتا ہے تو وہ کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کردیا۔

عاد، ثمود اور فرعون کی سرکشی و فساد اور ان کے انجام بد کے ذکر کے بعد انسان کے دو رخی کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ انسان کو اللہ جب عہدہ و منصب، اقتدار و حکومت اور مال و دولت کی کشادگی سے نوازتا ہے تو اللہ کی نعمتیں پاکر وہ محسوس نہیں کرتا ہے کہ یہ اس کے لیے ایک آزمائش ہے اور ان نعمتوں پر اسے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے اور اس کے احکام اور ہدایات کی پیروی کرکے اس کی بندگی بجا لانی چاہیے۔ مگر یہ خیال کرتا ہے کہ خدا کے نزدیک یہ اس اعزاز و اکرام کا مستحق تھا اور یہ کہ اس نے اپنی قابلیت اور ذہانت سے یہ دولت عہدہ یا حکومت حاصل کی ہے۔ اس میں کسی کی مداخلت نہیں ہے۔ اس نے چاہے تجارت و کاروبار کے ذریعہ مال کمایا ہو یا عہدہ داری اور حصول اقتدار کے ذریعے دولت کا ذخیرہ جمع کیا ہو یا لوٹ کھسوٹ اور جعلسازی سے کی ہو اور شہرت ناموری حاصل کی ہو ان سب چیزوں کو یا تو یہ اپنی قابلیت کا نتیجہ سمجھتا ہے یا خیال کرتا ہے کہ وہ خدا کے نزدیک اعزاز و اکرام کا مستحق ہے اور وہ اپنے آپ کو خدا کا برگزیدہ بندہ سمجھتا ہے لیکن جب اسے مشکلات کی آزمائش میں ڈال دیتا ہے اور اس پر رزق تنگ کردیتا ہے تو اس آزمائش کو یہ اپنے لیے توہین سمجھتا ہے اور اس تنگ دستی کے خلاف یہ احتجاج (protest) کرتا ہے کہ خدا نے مجھے تنگ دستی اور مصائب و مشکلات میں کیوں مبتلا کردیا ہے؟ دراصل یہ انسان کا مادہ پرستانہ نظریہ حیات ہے۔ اس لیے وہ دنیا کے مال و دولت اور جاہ و اقتدار کو سب کچھ سمجھتا ہے ۔یہ چیزیں جب اس کو مل جاتی ہیں تو خوش ہوجاتا ہے اور کہتا ہے کہ خدا نے مجھے عزت دار بنایا ہے اور اگر یہ چیزیں نہ مل جائیں یعنی مال و دولت حاصل نہ ہوئے، سیاست و حکومت پر قبضہ نہ کرسکا تو خدا سے ناراض ہوکر کہتا ہے کہ خدا نے مجھے ذلیل کردیا وہ نہیں سمجھتا ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو کچھ بھی دیا ہے اُسے آزمانے کے لیے دیا ہے۔ یعنی اگر دولت اور طاقت دی تو وہ اس کے لیے آزمائش ہے کہ وہ خدا کا شکر کرتا ہے کہ نہیں اور اللہ کی عطا کی ہوئی اس دولت میں سے کسی غریب محتاج کی مدد کرتا ہے کہ نہیں عہدہ، منصب اور اقتدار حاصل کرکے وہ ظالموں کے خلاف مظلوموں کی حمایت کرتا ہے کہ نہیں اور کیا وہ صحیح معنوں میں خدا کی بندگی اور اس کی فرمانبرداری کرتا ہے کہ نہیں ! اور جب اسے غریبی آتی ہے اور وہ تنگ دستی اور مشکلات کا شکار ہوجاتا ہے تو اس میں بھی اس کے لیے خدا کا امتحان اور خدا کی آزمائش ہوتی ہے کہ وہ صبر و قناعت کے ساتھ ان مشکلات و مصائب کا مقابلہ کرتا ہے یا بے صبری کا مظاہرہ کرکے اللہ تعالیٰ کے خلاف بغاوت پر اتر آتا ہے۔

اس طرح اللہ تعالیٰ ان دونوں طریقوں سے اپنے بندوں کو آزماتا ہے کہ کون خوش حالی اور بد حالی دونوں صورتوں میں خدا سے راضی ہے اور کون ان دونوں صورتوں میں خدا سے ناراض ہوجاتا ہے۔ انسان کے صبر و شکر کی پختگی پر ہی دین کی پختگی کا انحصار ہے۔ مال و دولت اور اقتدار پاکر ہوش و حواس میں رہتے ہوئے خدا کی بندگی بجالانے سے ہی راہ نجات حاصل ہوسکتی ہے۔ اس لیے جو شخص خوشحالی میں خدا کا شکرگزار ہو اور بدحالی میں صابر ہو اسی کو نفس مطمئنہ کی عظیم دولت حاصل ہوجاتی ہے اور وہ ہر حال میں خدا سے راضی اور خدا اس پر راضی ہوتا ہے۔ قرآن کا یہ خطاب اگرچہ مکہ کے جاہل لوگوں سے کیا گیا ہے مگر ایسے لوگ جاہلیت کے ہر دور اور ہر سماج میں پائے جاتے ہیں جو زمین سے بالاتر کسی اور عالم بالا کے نظام سے واقف نہیں ہوتے۔ جو روزی کی فراخی اور تنگی کے معاملہ میں اپنے رب کے متعلق اسی طرح کا خیال رکھتے ہیں۔ لوگوں کی قدر وقیمت کو جانچنے کے لیے ان کے پاس یہی پیمانے ہیں۔ دولت اور جاہ و منصب ہی ان کے نزدیک سب کچھ ہے اس کے علاوہ ان کے پاس کوئی اور پیمانہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ دولت سے شدید محبت رکھتے ہیں اور دولت سے محبت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ حرص و طمع اور بخل کی بیماریوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ قرآن اس معاملہ میں ان کی قلبی کیفیت سے پردہ اٹھاتا ہے اور واضح کرتا ہے کہ رزق کی فراخی اور تنگی کے سلسلے میں خدا کی آزمائش اور امتحان کو نہ سمجھنے کی اصل وجہ یہی حرص و طمع اور بخل کی بیماریاں ہیں۔

كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ(١٧)

ہرگز نہیں ! بلکہ تم یتیم سے عزت کا سلوک نہیں کرتے !

وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَى طَعَامِ الْمِسْكِينِ(١٨)

اور مسکین کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو ترغیب نہیں دیتے ہو !

وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلاً لَّمّاً(١٩)

اور میراث کا سارا مال کھاجاتے ہو!

وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبّاً جَمّاً(۲۰)

اور مال کے ساتھ بہت زیادہ محبت کرتے ہو!

پچھلی آیات میں اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ دنیا کی آسودہ حالی اور بدحالی دونوں اللہ کی طرف سے آزمائش ہیں لیکن نافرمان لوگ خوش حالی میں سرکشی کرتے ہیں اور بد حالی اور تنگ دستی میں خدا سے شکوہ اور ناشکری کرتے ہیں۔ اس کے برعکس مومن اللہ کی نعمت پاکر خوش حالی میں اس کا شکر ادا کرتے ہیں اور تنگی و بدحالی میں صبر کرتے ہیں اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرتے ہیں۔ اب کافروں سے فرمایا جارہا ہے تم لوگ نہ خوش حالی میں غریبوں اور مسکینوں کی مدد کرتے ہو اور نہ یتیموں کے اموال کی حفاظت کرتے ہو بلکہ اس کے برعکس تم لوگ یتیموں کا مال ہڑپ کرلیتے ہو۔ تم ان بیچاروں کی وراثت پر قبضہ جماتے ہو۔ تمہیں بغیر محنت کے جو مال ملتا ہے اسے یتیموں پر خرچ کرنے کے بجائے ان کے مال کو بے دردی سے کھاتے ہو۔ اس میں آپ لوگوں کو کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی۔

رزق کی فراخی خدا کے ہاں معزز و محترم ہونے کی دلیل نہیں ہے اور نہ رزق کی تنگی اس بات کا ثبوت ہے کہ تنگ دست انسان خدا کے ہاں ذلیل و خوار ہے بلکہ حق بات یہ ہے کہ تم خدا کی بخشی ہوئی دولت جاہ واقتدار عزت افزائی کا حق ادا نہیں کرتے ہو۔ تم اس یتیم کی جو باپ کے فوت ہونے کے بعد محافظت اور سرپرستی سے محروم ہوجاتا ہے مدد نہیں کرتے ہو۔ تم غریبوں اور محتاجوں کو کھلانے پلانے کی فکر نہیں کرتے ہو بلکہ تم اس کے برعکس غریبوں کو دکھ دیتے ہو۔ یتیموں کی مروت کرنے کے بجائے ان کا مال چھین لیتے ہو۔ تم ان کی وراثتیں ہڑپ کرلیتے ہو۔ غریبوں، مسکینوں اور یتیموں کی مدد کرنے کے بجائے تم لوگ دنیا کی بدترین لالچ میں مبتلا ہو۔ تمہیں دولت سے بے پناہ محبت اور تمہارے دلوں میں محتاجوں کو کھلانے پلانے اور غریبوں کی مدد کرنے کا کوئی جذبہ موجود نہیں ہے۔ تم دولت کی محبت میں اس قدر گرفتار ہو کہ یتیموں کی میراث کی حفاظت کرنے کے بجائے اُسے اپنی وراثت میں شامل کرلیتے ہو۔

قرآن غریبوں کو کھلانے پلانے اور یتیموں کی مدد کرنے اور ان کی وراثتوں کی حفاظت کرنے کی نہ صرف تاکید کرتا ہے بلکہ اس ذمہ داری کا احساس دلاتا ہے کہ ایک دوسرے کو ان ناداروں کے کھلانے پلانے کی ترغیب دیا کریں اور ایک دوسرے کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کریں کہ ان کی کفالت کرنا مسلمانوں کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ اور یہ اسلام کی ایک اہم ہدایت ہے: وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنَ ''یعنی غریبوں کو کھلانے پلانے کی ایک دوسرے کو ترغیب نہیں دیتے ہیں''۔ کی آیت سے واضح ہوجاتا ہے کہ اسلام صرف اس بات کا تقاضا نہیں کرتا کہ لوگ صرف خود غریبوں اور یتیموں کی اپنے مال سے مدد کریں اور انہیں کھانا کھلائیں بلکہ قرآن اس بات کی تاکید کرتا ہے کہ معاشرہ میں ان غریبوں، مسکینوں اور یتیموں کی مدد کرنے کے لیے ایک دوسرے کو اس بات کی طرف رغبت دلائیں کہ ان کی مدد کرنا، ایک اہم سماجی ذمہ داری ہے۔ معاشرے میں کمیٹیاں تشکیل دی جائیں جو انہیں مدد کرنے اور کرانے کی ذمہ دار ہوں اور لوگوں کو ان یتیموں اور محتاجوں کی مدد کرنے پر اکسائیں۔ اسلامی حکومت کی اہم ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ ان کی مدد کرنے کا خاص خیال رکھے۔ حکمرانوں کی ذمہ داری ہے وہ دیکھیں کہ کوئی غریب بھوکا تو نہیں سویا ہے۔ کسی یتیم کا مال تو کسی نے نہیں کھایا ہے۔ اور کسی کی وراثت ہڑپ نہ کی گئی ہے۔ صحابہ کے دور میں لوگ فجر کی نماز پڑھ کر اپنے گھروں کے چھتوں پر چڑھ کر اعلان کرتے تھے کہ رات کا کوئی بھوکا تو نہیں سویا اگر ایسا ہوا ہو تو اللہ تعالیٰ کے عذاب آنے کا اندیشہ ہے۔

مزید فرمایا گیا ہے کہ مال و دلت سے تم لوگوں کی محبت اس قدر شدید ہے کہ جب کوئی مرجاتا ہے اور اپنے پیچھے معصوم اولاد چھوڑ جاتا ہے تو تم اس کی چھوڑی ہوئی وراثت کو ہڑپ کرلیتے ہو! بجائے اس کے کہ تم کم سن یتیموں کی وراثت کی حفاظت کرتے، تم ان کی وراثت کو ان سے چھین کر اپنی وراثت بناتے ہیں۔ مرنے والا تمہارا عزیز اور قریبی رشتہ دار بھی کیوں نہ ہو لیکن مال و دولت کی لالچ نے تمہیں اتنا اندھا بنا دیا کہ تم اپنے قریبی رشتہ دار کا مال کھانے اور اس کی وراثت کو ہڑپ کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے ہو۔

دور جہالت میں لڑکیوں کو وراثت میں حصہ دار نہیں سمجھا جاتا تھا اور وراثت میں صرف اس بیٹے کو حصہ دار سمجھا جاتا تھا جو کمانے، لڑنے، کنبے کی حفاظت کرنے کے قابل ہوتا۔ مرنے والوں کی وراثت میں حصہ صرف وہ لے سکتا تھا جو طاقت ور اور زور آور ہوتا۔ اس ساری خرابی کی بنیادیہ تھی کہ لوگ مال و دولت سے انتہائی محبت رکھتے تھے۔ انسانیت، شرافت، عدل و انصاف کی سب قدریں انسان کی خود غرضی اور اس کے مال و دولت کی محبت کی گرفتاری کے نیچے دب چکی تھیں۔ ایسے معاشرے کو قرآن نے تنقید کا نشانہ بنایا تاکہ لوگوں کے ذہن میں بیداری آئے اور وہ عدل و انصاف کی نعمت سے سرفراز ہوجائیں۔ اگر آج کے معاشرے میں خصوصاً مسلم معاشرے میں اس قسم کی برائی موجود ہوتو یہ مسلمانوں کے لیے ایک بہت بڑا چلینج ہے۔ اس کا ازالہ صرف قرآن مجید کی طرف متوجہ ہونے سے ہی ہوجائے گا۔

كَلَّا إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا(٢١)

ہرگز نہیں ! جب زمین کوٹ کوٹ کر برابر کردی جائے گی

وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا(٢٢)

اور آپ کا رب جلوہ فرما ہوگا اس حال میں کہ فرشتے قطار اندر قطار کھڑے ہوں گے

وَجِيءَ يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ يَتَذَكَّرُ الْإِنسَانُ وَأَنَّىٰ لَهُ الذِّكْرَىٰ(٢٣)

اور اس دن جہنم سامنے لائی جائے گی اس دن انسان کو سمجھ آئے گا مگر اس وقت اس کے سمجھنے کا کیا فائدہ !

يَقُولُ يَا لَيْتَنِي قَدَّمْتُ لِحَيَاتِي(٢٤)

وہ کہے گا کہ کاش میں نے اس زندگی کے لیے کوئی پیشگی سامان کیا ہوتا۔

ان آیات میں قیامت کا ہولناک منظر بیان ہورہا ہے۔ دنیا اور دنیا کی مال و دلت سے محبت کرنے والوں اور غریبوں، مسکینوں اور محتاجوں کو نظرانداز کرنے والوں کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا جارہا ہے کہ آپ لوگ دنیائی زندگی سے لطف اٹھارہے ہیں اور آخرت سے غافل بے فکر موج مستیاں کررہے ہیں آپ اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ دنیا میں جیتے جی آپ یہ سب کچھ کرتے رہیں اور اس کی کوئی جواب دہی نہیں ہے۔ یہ آپ کی غلط فہمی ہے بلکہ حقیت یہ ہے کہ تمہاری زندگی ختم ہوکر آخرت کی نئی زندگی میں تبدیل ہوجائے گی۔ اس دن زمین پر موجود ہر چیز کو نیست و نابود کردیا جائے گا۔ زمین ہموار کردی جائے گی۔ حشر کا میدان برپا ہوجائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی عدالت قائم ہوجائے گی۔ اب تک پروردگار عالم پس پردہ انسانوں کے معاملات اور حرکات دیکھ رہے تھے لیکن وہ اب ان فرشتوں کی قطاروں میں کھڑے استقبال میں عزیم شان و شوکت کے ساتھ جلوہ گر ہوں گے۔ اس دن جہنم کو حاضر کیا جائے گا۔ جس کا نظارہ لوگ بچشم خود کریں گے۔

آج لوگ آخرت کا انکار کررہے ہیں خدا کی بارگاہ میں حاضر ہونے کی حقیقت کا مذاق اڑارہے ہیں لیکن قیامت کے دن انہیں معلوم ہوجائے گا کہ جس دن کا ہمیں وعدہ دیا گیا تھا وہ دن آخر آہی گیا یعنی جس قیامت کے برپا ہونے سے ہم انکار کرتے تھے وہ قیامت برپا ہوگئی۔ اُس دن یہ لوگ بہت مایوس ہوں گے اور ان کی مایوسی میں اور اضافہ ہوجائے گا جب وہ ایمان لانے کی تمنا کریں گے مگر ان کی یہ خواہش یک لخت مسترد کی جائے گی۔ ہر شخص حسرت اور ندامت میں کہے گا کہ کاش میں نے قیامت پر ایمان لاکر خدا کی فرمانبرداری میں زندگی گزاری ہوتی اور اس دن کے لیے کچھ کمایا ہوتا تو آج اس خوف و دہشت میں مبتلا نہ ہوجاتا۔ مگر اُس دن پچھتانے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ کیونکہ مہلت عمل ختم ہوچکی ہوگی۔ آزمائش کا وقت اختتام کو پہنچا ہوگا۔ اب تو امتحان گاہ سے امتحان دینے والے امیدوار فارغ ہوچکے ہیں۔ اور امتحان کا وقت ختم ہوچکا ہے (Time is over now) اب صرف نتیجے کا سامنا ہے یعنی اعمال کا حساب ہوگا۔ برے اعمال کرنے والوں کو جہنم میں ڈال دیاجائے گا اور نیک اعمال کرنے والوں کو جنتوں میں داخل کیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا اس حال میں آنا کہ فرشتے قطاروں میں کھڑے ہوں گے ایک استعاری (metaphoric) اصطلاح ہے۔ اس حقیقت کو ہم اس زمین میں رہتے ہوئے نہیں سمجھ سکتے ہیں۔ البتہ اس طرز بیان سے اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال اور قیامت کی ہولناکی اور خوف و ڈر کا اظہار کرنا ہے۔ اسی طرح جہنم کے سامنے لائے جانے کا معاملہ بھی استعاری نوعیت کا ہے۔ جہنم کو لوگوں کے سامنے لانے کا مطلب کیا ہے اور جہنمیوں کو اس میں ڈالے جانے کے لیے خود جہنم کے پاس کیوں نہ لے لیا جائے گا، یہ باتیں متشابہات میں سے ہیں۔ ان کا مطلب صرف اللہ کو معلوم ہے اور ان باتوں کی تاویل کو جاننے کے درپے ہونے سے انسان فتنے میں پڑ سکتا ہے۔ البتہ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، بلکہ یہ ایک تمثیلی انداز بیان ہے جس سے یہ تصور دلانا مقصود ہے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کے اقتدار اور اس کے واحد القہار ہونے کے آثار اس طرح ظاہر ہوں گے جیسے دنیا میں کسی بادشاہ کے تمام لشکروں کے ساتھ آنے سے عوام پر رعب طاری ہوتا ہے۔ یہاں دنیا کے بادشاہ کے دربار میں آنے کی مشابہت میں اللہ تعالیٰ کی حاضری ہونے کی تمثیل پیش کی گئی ہے۔ اس قسم کی تشبیہ سے مراد انسانوں کو قیامت کے منظر رب العالمین کے جلال و عظمت کو سمجھانا ہے۔ زمین میں رہنے والوں کو دنیائی اور زمینی مثالوں سے ہی آسانی سے سمجھایا جاسکتا ہے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کو نہ موقعے پر آنے کی ضرورت ہے اور نہ جہنم کو اپنی جگہ سے ہٹانے کی ضرورت ہے۔ حالانکہ جہنم کی تصویر ہمارے ذہن میں آسکتی ہے کیوں کہ آگ سے انسان واقف ہے لیکن اللہ کا لوگوں کے پاس آنا انسانوں کی سمجھ سے بالا تر ہے۔ واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کسی مادی (matter) شکل میں نہیں ہے جسے انسان آنکھوں سے دیکھ سکے۔ بلکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ اپنے وجود کا تعارف اس طرح کراتا ہے: اللہُ نُوۡرُ سَمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِo اللہ آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے۔ یعنی اللہ دنیائی بادشاہ کی طرح جسم نہیں رکھتا ہے جو دنیا کے بادشاہوں کی طرح انسانوں کو دکھائی دے۔ اس لیے اکثر مفسرین نے آیت کے ترجمے میں اللہ کے آنے کے بجائے اللہ کے جلوہ افروز ہونے کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمام کائینات کو بیک وقت اپنی حفاظت اور نظر میں رکھے ہوئے ہیں۔ اس لیے قیامت کے دن وہ ہر طرف جلوہ گر ہوں گے۔ واللہ اعلم۔

فَيَوۡمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗۤ اَحَدٌ(۲۵)

اس دن اللہ جو عذاب دے گا اس جیسا عذاب دینے والا کوئی نہیں ہے

وَلَا يُوثِقُ وَثَاقَهُ أَحَدٌ(٢٦)

اور اللہ جس طرح جکڑے گا ویسا جکڑنے والا کوئی نہیں ہے

دنیا میں انسان کو جس طرح کا عذاب ملتا ہے اس سے وہ اچھی طرح واقف ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ کوئی غیر قانونی کام کرنے پر اسے قید میں رکھا جاتا ہے اور پھر رہا کیا جاتا ہے اور کسی کے قتل کے جرم میں یا تو قید میں ڈالا جاتا ہے یا پھر اگر قتل کے بدلے میں قتل کیا جائے تو اس کی زندگی کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ اور اس کی سزا بھی اسی کے ساتھ ختم ہوجاتی ہے۔ اگر کسی ایک شخص نے ہزاروں قتل کئے ہوں تو اسے صرف ایک بار قتل کیا جاسکتا ہے اگر کسی کو ناقابل برداشت شدید عذاب دیا جاتا ہے تو عذاب کو برداشت نہ کرنے کی صورت میں وہ جان سے ہاتھ دھوبیٹھتا ہے اور عذاب سے نجات پاتا ہے۔ کسی مجرم کو جب پکڑا جاتا ہے تو اس کی زیادہ سے زیادہ سزا یہ ہوتی ہے کہ اسے ہتھکڑیاں پہنا کر جیل بھیج دیا جاتا ہے۔ تو اس عارضی سزا سے اسے کوئی سخت تکلیف نہیں پہنچ جاتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ مجرموں کو جس طرح پکڑے اور جکڑے گا اور باندھے گا انسانی قیدوبند میں ایسی کوئی مثال موجود نہیں۔ خدا کا عذاب اور اس کی قید وبند تمام مخلوقات کے عذاب، قیدوبند اور پکڑ دھکڑ سے شدید تر ہے۔ جس کا اندازہ کرنا انسان کے لیے ناممکن ہے۔یہاں مجرموں کو پکڑنے، جکڑنے اور قید وبند کی مشقت میں ڈالنے کا ذکر عاد، ثمود اور فرعون کے ظلم اور سرکشی کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مومنوں کی ہمت باندھنے کے لئے کیا گیا ہے تاکہ ظلم برداشت کرنے والوں کو اطمینان ہوجائے کہ ان پر ظلم کرنے والوں کواس سے بدتر ناقابل برداشت عذاب دیا جائے گا۔ جو عذاب وہ مومنوں کو دیتے ہیں۔ مومنوں کو اطمینان دیا جاتا ہے کہ یہ لوگ اہل ایمان کو سخت سزائیں دیتے ہیں انہیں ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑتے اور باندھتے ہیں لہٰذا رب العالمین بھی ان تمام ظالم لوگوں کو پابند سلاسل کرے گا ان کو بیڑیوں اور ہتھکڑیوں میں جکڑے گا لیکن کہاں یہ دنیا کی قید وبند اور پکڑ دھکڑ اور کہاں آخرت کی قید وبند اور پکڑ دھکڑ، کہاں دنیا کا عذاب اور کہاں آخرت کا عذاب ! دنیا کے عذاب میں، اگر وہ شدید تر بھی ہو، انسان ایک بار ہلاک ہوجاتا ہے اور عذاب سے آزاد ہوجاتا ہے۔ لیکن قیامت کے عذاب میں ان لوگوں کو کوئی آزادی نہیں ملے گی کیونکہ انہیں اس عذاب میں ہمیشہ مبتلا رہنا ہے۔ دنیا کی سزائیں فانی ہوتی ہیں۔ جو انسان کے مرنے کے ساتھ ہی ختم ہوجاتی ہیں۔ لیکن آخرت کا عذاب دائمی ہے۔ اس عذاب سے چھٹکارا پانے کے لیے انسان موت کی تمنا کرے گا مگر اسے موت نہیں آئے گی۔ وہ جہنم کے آگ میں ہمیشہ کے لیے داخل کئے جائیں گے۔ جہاں وہ نہ مریں گے نہ جئیں گے بلکہ ہمیشہ جلتے رہیں گے۔

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ(۲۷)

اے اطمینان چاہنے والے نفس

ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً(۲۸)

اپنے رب کی طرف لوٹ جا اس حال میں کہ تو راضی اور خوش ہونے والا ہے

فَادْخُلِي فِي عِبَادِي(۲۹)

پس تو میرے بندوں میں شامل ہوجا

وَادْخُلِي جَنَّتِي(۳۰)

اور میری جنت میں داخل ہوجا۔

آیات پندرہ اور سولہ میں کفار کا حال بیان ہوا ہے کہ کس طرح یہ لوگ ذہنی انتشار کے شکار ہیں جب ان کے پاس دولت ہوتی ہے تو اترانے اور فخر کرنے لگتے ہیں۔ جب ان کو تنگی آتی ہے تو مایوس ہوکر اللہ تعالیٰ سے شکایت کرنے لگتے ہیں۔ ان کی زندگی میں اعتدال (balance) نہیں ہوتا ہے اور ان کے دل کبھی مطمئن نہیں ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ہمیشہ یا دولت کے نشے میں اتراتے نظر آتے ہیں یا پھر تنگدستی میں چلاتے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کو نہ خوشحالی میں سکون میسر ہے اور نہ تنگدستی میں ان کے نصیب میں آرام اور صبر ہے۔ علاوہ ازیں یہ کہ ان لوگوں کو مرنے کے وقت موت کے خوف سے بے چینی ہوتی ہے۔

ان کافروں کے مقابلے میں اب مومنوں کا حال بیان کیا جارہا ہے جو پورے اطمینان کے ساتھ اپنے رب پر ایمان لائے اور جنہوں نے انبیاء کے لائے ہوئے دین کو اپنا دین تسلیم کیا ان روحوں کو نفس مطمئنہ کے نام سے پکارا گیا ہے۔ قرآن مجید میں نفس انسانی کی تین حالتیں بیان کی گئی ہیں۔

نفس مطمئنہ (الفجر:۲۷)، نفس لوامہ (القیامہ:۲)، نفس امارہ (یوسف:۵۳)

۱) نفس مطمئنہ وہ نفس ہے جو حکم الٰہی اور راہ راست پر چلتا ہے اور ہر حال میں مطمئن ہوکر خدا کی بندگی کرتا ہے اور نیکیوں پر قائم رہتا ہے۔ یہ نفس بری عادتوں سے مبرا ہوتا ہے اور یہ نفس اچھے اخلاق اور اوصاف حمیدہ سے آراستہ ہوتا ہے۔ انبیاء، صلحا اور اللہ کے برگزیدہ بندوں میں ایسا نفس پایا جاتا ہے۔

۲) شرعی اصطلاح میں ارتکاب گناہ پر اپنے آپ کو سخت ملامت کرنے والے نفس کو نفس لوامہ کہتے ہیں۔ یعنی ایسا نفس انسانی جو اپنے گناہ کا اعتراف کرکے اس پر پچھتائے اور آئندہ گناہوں سے بچنے کی کوشش کرے اور گناہوں سے دور رہے۔

۳) نفس امارہ وہ نفس ہے جو بدی کی طرف رغبت دلاتا ہے بری باتوں کا حکم دیتا ہے جو سرکشی پر آمادہ ہوتا ہے ایسا نفس رکھنے والا انسان ٹھنڈے دل کے ساتھ خود بھی برائیوں میں ملوث رہتا ہے اور دوسروں کو بھی برائیوں اور سرکشی کی طرف بلاتا رہتا ہے۔

نفس لوامہ اور اور نفس امارہ کا ایک دوسرے کے ساتھ مقابلہ رہتا ہے اگر نفس لوامہ نفس امارہ پر قابو پالیتا ہے تو اسے نیک اعمال کی توفیق ملتی ہے اور اگر نفس امارہ نفس لوامہ پر غالب آتا ہے تو انسان برائیوں میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ اس نفس کو شیطانی نفس بھی کہا گیا ہے کیونکہ یہ نفس انسان کو ہمیشہ نیک کاموں سے روکتا ہے اور برے کاموں کا حکم دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نفس مطمئنہ کوپیار بھرے الفاظ میں پکارتا ہے کہ اے نفس مطمئنہ ! اپنے رب کی طرف چل تو اس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی ہے اور میرے بندوں میں شامل ہوکر جنت میں داخل ہوجا۔

نفس مطمئن نے کسی شک و شبہ کے بغیرپورے اطمینان کے ساتھ اللہ وحدہٗ لاشریک کو اپنا رب مان لیا اور انبیاء کے لائے ہوئے دین کو اپنا دین قرار دیا۔ جو بھی حکم اللہ کی طرف سے ملا اسے حق مانا اور اس پر عمل کیا اور جس چیز سے اللہ نے منع کیا اس سے پورے یقین اور اطمینان قلب کے ساتھ بچا رہا۔ مشکلات مصائب اور تکالیف پیش آئے تو انہیں پوری طمانیتِ قلب کے ساتھ برداشت کیا۔ جب دنیا کی دولت نصیب ہوئی تو اللہ کے حکم کے مطابق اس کی زکوٰۃ ادا کرکے غریبوں محتاجوں کی مدد لی۔ مختصرا اللہ تعالیٰ کا یہ بندہ ہر حال میں خدا کے دین پر قائم رہا اور اپنے رب سے راضی اور مطمئن رہا۔ صابر اور شاکر بن کر زندگی گزاری اور ہر حال میں خدا سے راضی اور مطمئن رہا اسے جب موت آئے گی تو روح قبض کرنے والا فرشتہ اسے نفس مطمئنہ کہہ کر اللہ کی طرف بلائے گا۔

قرآن مجید میں ارشاد باری ہے: (جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور اس پر ثابت قدم رہے یقینا ان پر ملائکہ نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ ڈرو مت اور غم مت کرو بلکہ اس جنت کے بارے میں خوش ہوجاؤ جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے ساتھی ہیں اور آخرت میں بھی ساتھی ہوں گے وہاں جو چاہوگے تمہیں ملے گا اور جس چیز کی تمنا کروگے اسے پاؤگے۔ اس رب کی طرف سے یہ مہمان نوازی ہے جو غفور ورحیم ہے۔ (حٰم السجدہ: ۳۰-۳۲)

نہنگ و اژدہا و شیر نر مارا تو کیا مارا

بڑے موزی کو مارا نفس امارہ کو گر مارا

یعنی مگرمچھ اور شیر نر جیسے خونخوار درندے اور بڑے بڑے اژدھوں، سانپوں کو مارنا کوئی بڑا کام نہیں ہے بڑا کام یہ ہے کہ اگر آپ اپنے نفس امارہ کو رام کرلیں یعنی اپنے نفس کو قابو میں رکھیں۔ اپنی خواہشات نفس پر قابو پالیں یہ بڑے بڑے خونخوار جانور کو مارنے سے بھی بڑا کام ہے کہ آپ نے ایک بہت بڑے موزی جانور کو مار ڈالا جو تجھے برائیوں کی طرف اکساتا ہے اور شیطان کے پھندے میں پھنساتا ہے۔

سورۃ البلد مکیۃ

اٰیٰتُہا:20 رکوعھا:1

بسم اللہِ الرَّحمٰن الرَّحیم

لَا أُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِo وَأَنتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِo وَوَالِدٍ وَمَا وَلَدَo لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي كَبَدٍo أَيَحْسَبُ أَن لَّن يَقْدِرَ عَلَيْهِ أَحَدٌo يَقُولُ أَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًاo أَيَحْسَبُ أَن لَّمْ يَرَهُ أَحَدٌo أَلَمْ نَجْعَل لَّهُ عَيْنَيْنِo وَلِسَانًا وَشَفَتَيْنِo وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِo فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَo وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُo فَكُّ رَقَبَةٍo أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍo يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍo أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍo ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِo أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِo وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا هُمْ أَصْحَابُ الْمَشْأَمَةِo عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌo

پس منظر

سورت کا آغاز ایک عظیم قسم سے کیا گیا ہے۔ جس میں انسانی زندگی کی اس عظیم حقیقت کی طرف اشارہ ہے جس سے اہل مکہ واقف تھے۔ انسانی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے اور انسان کی زندگی کا اصل مقصد سمجھایا گیا ہے۔ نیکی اور بدی کے دونوں راستے اس کے سامنے کھول کر رکھ دئے گئے ہیں۔ ان راستوں پر چلنے کے لیے اسے وسائل بھی فراہم کئے گئے ہیں اور یہ اختیار بھی دیا گیا ہے کہ وہ نیکی کا راستہ اختیار کرتا ہے یا بدی کا ! پھر اس حقیقت کو بھی واضح کردیا گیا ہے کہ نیکی کا راستہ اگرچہ مشکل اور کٹھن ہے مگر جو اس راستے پر چل کر زندگی گزارتے ہوئے اپنے خالق و مولیٰ کو راضی کرے گا وہ قیامت کے دن عیش و آرام میں ہوگا اور وہ جنت میں داخل ہوگا۔ اس کے برعکس بدی کا راستہ اختیار کرنے والوں کے لیے آسان اور آرام دہ ہے کیونکہ ایسا آسان راستہ چن کر انہیں نہ خدا کی بندگی کرنی ہے اور نہ انہیں خدا کی راہ میں بکھرے ہوئے کانٹوں کو صاف کرنے کی فکر ہے انہیں یہ فکر بھی نہیں ہے کہ انہوں نے زندگی میں جو مال کمایا وہ حرام ہے یا حلال۔ انسان کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ یہ دُنیا اُس کے لیے آرام گاہ نہیں ہے اور نہ اسے عیش وآرام کی زندگی گزارنے اور مزے اڑانے کے لیے دنیا میں لایا گیا ہے بلکہ یہ دنیا اس کے لیے امتحان گاہ ہے۔ اس کی پیدائش مشقت میں ہوئی ہے اس لیے اسے محنت اور مشقت کے ساتھ زندگی گزارنی ہے اور خدا کی بندگی کرنی ہے۔یہی اس کی زندگی کا مقصد ہے۔ سورہ نجم میں فرمایا گیا ہے۔ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّامَا سَعٰى انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔ اس آیت سے واضح ہوجاتا ہے کہ انسان کے مستقبل کا انحصار اس کی جدوجہد اور محنت و مشقت پر ہے۔ جس طرح ایک طالب علم کے شاندار مستقبل (bright future) کا دارومدار اس کی کوشش اور اس کی محنت و مشقت پر ہے۔

سورہ میں انسان کی بڑائی اور فضیلت کے اس غلط تصور کو بھی دور کیا گیا ہے۔ جس کے نشے میں آکر وہ اپنی بڑائی اور فضیلت کو ظاہر کرنے کے لیے ڈھیروں مال فضول کاموں پر خرچ کرکے اڑادیتا ہے اوراس طرح ان فضول خرچیوں پر فخر کرتا ہے کہتا ہے کہ میں نے ڈھیروں مال اڑادیا۔ اب میرے برابر کوئی نہیں ہے مادّہ زدہ لوگ بھی اسے خوب داد دیتے ہیں اور اس کے بے ہودہ مال اڑانے پر اس کی شہرت اور ناموری کے ڈنکے بجاتے ہیں۔ سورہ کے آخر میں اس مشکل گھاٹی (مشکل راستہ) کی وضاحت کرکے سمجھایا گیا ہے کہ اس راستے سے گزر کر آدمی بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے یعنی آخرت میں بلند مقام حاصل کرنے کا مستحق بن جاتا ہے۔ وہ راستہ یہ ہے کہ آدمی ریاکاری، فخر ونمائش اور دکھاوے کو چھوڑ کر اپنا مال راہ خدا میں خرچ کرے۔ یتیموں، محتاجوں اور مسکینوں کی مدد کرے اور غلاموں کی گردنیں آزاد کرنے پر اپنا مال خرچ کرے اور زندگی کے اس دشوارگزار راستے پر چل کر صبر اور استقامت سے کام لے۔ جن لوگوں نے ایمان لایا اور غریبوں، مسکینوں اور غلاموں کی مدد کی اور ایک دوسرے کو صبر کرنے اور خلق خدا پر رحم کرنے کی تلقین کی وہ لوگ دائیں بازو والے ہیں اور جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات کو ماننے سے انکار کیا اور لوگوں سے بے رحمی کا سلوک کیا اور ان پر ظلم وتشدد کیا ایسے لوگ بائیں بازو والے ہیں۔

دائیں بازو والوں کو اگرچہ دنیا میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور بظاہر وقتاً فوقتاً ناکام بھی دکھائی دیتے ہیں لیکن آخرت میں انہیں آرام ملے گا۔ مصائب و مشکلات سے نجات پائیں گے اور ایک بہت بڑی کامیابی سے ہمکنار ہوں گے کہ جنت میں ہمیشہ کی خوشحالی پائیں گے اور خوبصورت زندگی گزاریں گے۔ رہے بائیں بازو والے اگرچہ وہ دنیا میں کامیاب اور آرام دہ زندگی کا دعویٰ کرتے تھے تاہم آخرت میں وہ ناکام ہوں گے آخرت میں انہیں نار جہنم میں کودنے کے بغیر کوئی چارہ نہ ہوگا جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے اور پچھتائیں گے۔

لَآ أُقۡسِمُ بِهَٰذَا ٱلۡبَلَدِ (١)

نہیں ! میں قسم کھاتا ہوں اس شہر (مکہ) کی

وَأَنتَ حِلٌّ بِهَذَا الْبَلَدِ(۲)

اور تم (اے محمدؐ) اس شہر میں رہتے ہو

وَوَالِدٍ وَمَا وَلَدَ(۳)

اور (قسم ہے) باپ (آدم) کی اور اس کی اولاد کی

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي كَبَدٍ(۴)

بلاشبہ ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا

سورہ کی ابتداء لا (نہیں) اور قسم سے کی گئی ہے جس سے ان لوگوں کی بات کی نفی کی گئی ہے جو قسم کے بعد آنے والی بات کا انکار کرتے تھے۔ آنے والی بات، جس کا یہ لوگ انکار کرتے تھے۔ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک خاص مقصد کے لیے پیدا کیا ہے اور اسے ایک وقت مقررہ کی زندگی عطا کی۔ اس کی زندگی کا خاص مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے خالق کی صحیح اور پوری بندگی کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بے معنی اور بے مقصد پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو خود آمدہ اور خود مختار سمجھ کر اپنے خالق کی عطا کردہ زندگی کو فضولیات اور خرافات میں ضائع کردے اور یہ خیال کرے کہ دنیا کی یہ زندگی اسے کھانے پینے اور مزے اڑانے کے لیے ملی ہے۔ اس لیے کھاؤپیو اور مزے اڑاؤ، کون جانتا ہے کہ کل ہے۔ Eat, drink and enjoy, who knows there is tomorrow. اس لیے مرنے سے پہلے جس طرح جی چاہے عیش کرو مزے اڑاؤ موت کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے۔ جہاں ہم سے باز پرس ہوگی ہمارے اس طرز زندگی پر ٹوکنے والے خوامخواہ ہمیں تنگ کرتے ہیں اور قیامت وآخرت اور جنت و جہنم کے جو سبز باغ یہ ہمیں دکھاتے ہیں یہ سب ایک دھوکہ، پروپگنڈہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ انسان کی اس غلط فہمی کو 'لا' فرماکر مسترد کردیا گیا ہے اور اس کے بعد اس شہر(مکہ) کی قسم کھاکر جس تاریخ کا ذکر کیا گیا اس سے مکہ کے رہنے والے بخوبی واقف تھے کہ ان کا جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی حضرت ہاجرہ اور اپنے شیر خوار بچے حضرت اسماعیل کو مکہ کے اس بے آب و گیاہ سنسان وادی میں اللہ کے حکم کی تعمیل میں چھوڑ گئے پھر اس سنسان جگہ پر اللہ کی شان قدرت سے زمزم کا چشمہ پھوٹ پڑا اور اس طرح ماں اور اس کے شیر خوار بچے کے لیے پانی پینے اور پیاس بجھانے کا انتظام ہوگیا۔ چشمہ پھوٹنے سے نہ صرف پانی کا انتظام ہوگیا بلکہ اس غیر آباد علاقے میں پانی کے اس چشمے کے پھوٹنے میں جو عالم انسانیت کی رہنمائی کے لیے ایک بہت بڑا منصوبہ کارفرما تھا یعنی رب العالمین کی بندگی بجالانے کے مشن کا مرکز وجود میں آگیا جو آج تک جاری ہے اور ان شاء اللہ جاری رہے گا۔

صحرائے عرب میں چونکہ ندی اور نالے موجود نہیں اس لیے پانی کا انحصار زیادہ تر کنوؤں پر تھا۔ ایسے میں جب چند خانہ بدوش لوگ اس جگہ سے گزرے جب ان کی نظر اس چشمے پر پڑی تو انہوں نے وہاں پر ڈیرہ ڈال دیا اور وہاں پر آباد ہوئے۔ پھر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اس غیر آباد جگہ پر اپنے چھوڑے ہوئے عیال (family) کی خبر لینے آئے تو وہاں پر اس وقت ایک چھوٹی سی آبادی قائم ہوچکی تھی اور حضرت اسماعیلؑ اب بلوغت کو پہنچ چکے تھے۔ ان کا نکاح بھی ہوچکا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کے ساتھ اللہ کا گھر تعمیر کیا اور حج کی منادی کی۔ انہوں نے دور دور تک لوگوں کو جمع ہونے کے لیے پکارا۔ لیکن دور دور تک لوگوں کی آبادی بہت کم تھی تاہم جہاں تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آواز پہنچی وہاں سے لوگ آکر حج کے لیے جمع ہوئے۔ پھر دھیرے دھیرے اس چھوٹی سی بستی نے ایک بڑے شہر کی صورت اختیار کرلی جو مکہ مکرمہ کے نام سے آج ہمارے سامنے موجود ہے اور جہاں حج کرنے کے لیے دنیا کے گوشے گوشے سے لوگ آکر لبیک اللّٰھم لبیک کی صدائیں بلند کرتے ہوئے اس گھر بیت اللہ کا طواف کرتے ہیں۔ خدا کا یہ گھر نہ صرف عرب کا مرکز بن گیا بلکہ پوری دنیا کا مرکز اور بیت الحرام قرار پایا۔ اور صدیوں سے بحیثیت دارالحرم اور دارالامان ہے۔ یہ امن کا وہ گھر ہے جہاں ابتدا سے لوگ خدا کی پناہ میں آتے تھے۔ اس گھر کے احاطے میں داخل ہوکر ان کے جھگڑے اور ان کی دشمنیاں ختم ہوجاتی تھیں۔ ان کی جان و مال عزت و آبرو محفوظ ہوجاتی تھی۔ جنگ و جدل اور خونریزی حرام تھی۔ اگر کوئی اپنے باپ کے قاتل کو بھی کعبہ کے حرم میں پاتا تو وہ اس کا بدلہ لینے کے لیے اس پر ہاتھ نہ اٹھاتا تھا۔ یہاں تک کہ درختوں، پرندوں اور اس میں موجود ہر زندہ شئے پر ہاتھ ڈالنا حرام تھا۔ اب اس شہر کی منظر کشی کی جارہی ہے کہ جس شہر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنم لیا اور پرورش پائی اس شہر میں کس طرح آپؐ اور آپ کے ساتھیوں کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ اسی شہر (مکہ) میں رہتے ہو۔ وَأَنتَ حِلٌّ بِهَٰذَا الْبَلَدِ۔ اس آیت کے مختلف ترجمے کئے گئے ہیں اس لیے آیت کی وضاحت میں بھی مفسرین کی مختلف آراء ہیں۔

ایک ترجمہ یہ ہے کہ (اے محمدؐ) تم اس شہر میں رہتے ہو۔ انگریزی ترجمہ :

Oh Muhammad(Peace be upon him) You are the inhabitant of this city (Makah)

دوسرا ترجمہ یہ ہے کہ آپ اس شہر (مکہ) کے باشندہ، شہری (citizen) ہیں ۔

ایک اور ترجمہ یہ ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو اس شہر میں حلال کرلیا گیا ہے۔

جن لوگوں نے یہ ترجمہ کیا ہے کہ آپ کو اس شہر مں حلال کرلیا گیا ہے انہوں نے اس کی تشریح اس طرح کی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے کہ ایک وقت آئے گا جب آپ اس شہر مکہ کو فتح کرلیں گے اور کچھ دیر کے لیے یہاں جنگ کرنا اور دین کے دشمنوں کو قتل کرنا آپ کے لیے حلال ہوجائے گا اور جنہوں نے یہ ترجمہ کیا ہے کہ آپ اس شہر (مکہ) کے باشندہ اور شہری ہیں ان کی اس آیت کی تشریح یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے باشندہ اور شہری ہیں اس لیے آپ کو بھی شہری حقوق حاصل ہیں۔ لیکن حال یہ ہے کہ اس شہر حرم اور بیت الحرام میں تمام انسانوں اور دیگر جانداروں کی جانیں محفوظ ہیں۔ کوئی کسی کی جان لینے یا جانی نقصان پہنچانے کی جرأت نہیں کرسکتا ہے۔ یہاں تک کہ درختوں کو کاٹا نہیں جاسکتا ہے۔ مگر اس شہر حرام میں رہنے والے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے لائے ہوئے دین اسلام کے دشمن ان کے اور ان کے ساتھیوں کے خون کے پیاسے ہیں۔ ان کے خلاف قتل کی سازشیں کرتے ہیں۔ انہیں جان سے مارنے کی دھمکیاں دیتے ہیں۔ ہر قسم کی تکالیف اور مصائب میں مبتلا کردیتے ہیں جس کعبہ کے صحن اور احاطے میں کسی کی طرف بُری نگاہ سے دیکھنا حرام ہے اسی شہر حرام میں رہنے والے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ صرف بدسلوکی کی جاتی ہے بلکہ ان کی جان خطرے میں ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہاں اگرچہ انسانوں کو نقصان پہنچانا، جانوروں کو مارنا اور درختوں کو کاٹنا ان کافروں کے لیے حرام ہے لیکن تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو ستانا اور قتل کی تدبیریں کرنا انہوں نے اپنے اوپر حلال کرلیا ہے اور تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے لیے جینا حرام کردیا ہے اور تمہارے قافیہ حیات کو تنگ کردیا ہے۔ اس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آئی ہے کہ مشرکین مکہ جو کعبہ کے متولین حضرت ابراہیم کی اولاد اور ملت

ابرہیم کے پیرو ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ مسلمانوں کے لیے ظالمانہ مؤقف اختیار کئے ہوئے ہیں۔

وَوَالِدٍ وَمَا وَلَدَه

قسم ہے باپ کی اور اس کی اولاد کی:

باپ سے مراد حضرت آدم علیہ السلام اور اس کی اولاد سے مراد وہ تمام انسان جو دنیا میں پیدا ہوئے اور پیدا ہو رہے ہیں۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ باپ سے مراد حضرت ابرہیم علیہ السلام اور اس کی اولاد سے مراد اس کا بیٹا حضرت اسماعیل علیہ السلام اور اس کی نسل و ذرّیّت ہے، لیکن اکثر مفسرین نے عام طور پر والد سے حضرت آدم علیہ السلام اور وَلَد سے سب اولادِ آدم مراد لیے ہیں۔

بہرحال قرآن کی رو سے اور سائنس کی تحقیق کے مطابق یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ دُنیا کے تمام انسان ایک ہی باپ کی اولاد ہے اس لیے والد اور وَلَد یعنی آدم اور اس کی اولاد سے مراد دنیا کے سارے انسان ہیں جنہیں ایک ہی خدا نے اپنی قدرت سے پیدا کیا ہے انسانوں کو اس حقیقت کی یاد دہانی کی جاتی ہے کہ دنیا میں پائے جانے والے سارے انسان ایک ہی باپ حضرت آدم علیہ السلام کی نسل سے ہیں اور ان کی ہدایت کے لیے حضرت آدم علیہ السلام خود پہلے رسول (خدا کے ایلچی) تھے۔ اس کے بعد رسول آتے رہے اور رسالت کا یہ سلسلہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ختم ہوا اور انہیں خاتم النبین ومرسلین کا اعزاز حاسل ہوا۔ اولاد آدم کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے آخری رسول ہیں۔ لہٰذا اس پر ایمان لاؤ اور خدا کی بندگی میں شامل ہوجاؤ۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنسَانَ فِیْ کَبَدٍ۔ بلاشبہ ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا

شہر مکہ اور اس کے شہری

سورہ کی ابتدا میں جو تین قسمیں کھائی گئی ہیں ان سے تین حقیقتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ پہلی حقیقت یہ ہے کہ شہر مکہ سے پیغمبروں کی تاریخ منسلک ہے۔ دوسری حقیقت یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس شہر مکہ کے معزز شہری ہیں اور پیغمبروں کے سلسلے کی آخری کڑی ہیں۔ تیسری حقیقت یہ ہے کہ سب لوگ ایک ہی انسان حضرت آدم کی اولاد ہے اور ان کی اولاد میں سے اللہ نے جسے چاہا رسول منتخب کیا، ان رسولوں میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری رسول منتخب ہوئے جو آپ میں سے ہیں مگر

آپ لوگ ان پر ایمان لانے کے بجائے انہیں ایذا دے کر تنگ کرتے ہیں جبکہ آپ کو ان پر ایمان لانے میں پہل کرنی چاہیے۔

ان قسموں کے بعد اب انسان اور انسانی زندگی کا مقصد بیان کیا جا رہا ہے کہ اے انسان تجھے ایک بڑی مشقت میں پیدا کیا گیا ہے۔ تمہاری زندگی کا ایک عظیم مقصد ہے۔ اس عظیم مقصد کو حاصل کرنے کے لیے تمہیں محنت اور مشقت کرنی چاہیے اور اللہ کی اطاعت اور بندگی میں زندگی گزارنی چاہیے۔ تمہیں مزے اڑانے، رنگ رلیاں منانے اور نغمہ سرائی کے لیے پیدا نہیں کیا گیا ہے بلکہ تم پر بہت بڑی ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ تم دنیا میں اپنا کام کاج کروگے اپنے لیے رزق کماؤ گے، تجارت اور کاروبار کروگے، تعلیم وتربیت کے میدان میں آگے بڑھو گے، سائنس اور انجینیرنگ میں مہارت حاصل کروگے، اس کے احکام کی پیروی کرو گے، اس کے رسول کی اطاعت اور فرمانبرداری میں پیش پیش رہوگے۔یہی تمہاری زندگی کا اصل مقصد (motive) ہے۔یہ دنیا محنت مشقت کرنے اور سختیاں جھیلنے کی جگہ ہے اور کوئی بھی انسان اس حالت سے گزرے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔ دراصل انسان خدا کی بندگی کرنے کے ساتھ ساتھ مشقت جھیلنے، محنت اور جدوجہد کرنے، حالات کا مقابلہ کرنے اور مصائب و مشکلات برداشت کرنے کے لیے پیدا ہوا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ ایک اور سورہ میں فرماتے ہیں۔ یَا اَیُّھَاالْاِنْسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحاً فَمُلٰقِیْہِ۔ اے انسان تو محنت و مشقت کرتا ہوا اپنے رب کی طرف جارہا ہے۔ پھر تو اس کے حضور حاضر ہوگا۔

ہر انسان کی زندگی ماں کی پیٹ میں نطفہ قرار پانے سے لے کر آخری سانس تک اس بات پر گواہ ہے کہ اس کو قدم قدم پر تکلیف مشقت، محنت اور خطرات کے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔پہلا خلیہ (cell) جو ہی رحم مادر میں قرار پکڑتا ہے اپنے رب کے اِذن سے وہ اپنی زندگی کی پرورش کے لیے تغذیہ کا کام کرتا ہے۔ یعنی غذا حاصل کرنے کی جدوجہد اور محنت و مشقت میں مصروف ہوجاتا ہے۔ محنت اور مشقتوں سے بھری اس کی یہ جدوجہد مسلسل جاری رہتی ہے جب تک رحم مادر سے اس کے باہر آنے کا وقت ہوجاتا ہے۔ اس وقت ماں کو دردزہ بچے کو جنم دینے کی تکلیف اور مصیبت اور بچے کو جنم لینے کی شدید ترین مصیبت سے گزرنا پڑتا ہے۔ کوئی جنین (embriyo) (شکم مادر میں ابتدائی شکل کا بچہ) دنیا کی روشنی اس وقت تک نہیں دیکھ سکتا جب تک کہ وہ دبنے اور ہلنے کے شدید ترین عمل سے دوچار نہ ہو اور پھر نو مہینے کے زمانے میں اسے مختلف مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ پھر تنگ گزرگاہ سے نکلتے وقت اُس کا دم گھٹنے لگتا ہے اور مرتے مرتے بچتا ہے۔

جنم لینے کے ساتھ ہی اس کی زندگی کے شدید، تلخ اور با مشقت مرحلے شروع ہوجاتے ہیں یہ نوزائیدہ اس ہوا میں سانس لینے کی کوشش کرتا ہے جس کے ساتھ اسے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ وہ پہلی بار مُنہ اور پھیپھڑے کھول کر زور زور سے چیختا ہے او اپنی پُر مشقت زندگی کے آغاز کا اعلان کرتا ہے۔ نظام ہاضمہ (digestive system) اور خون کے دورے کے نظام (blood circulatory system) کے تحت اس کی زندگی کا دارومدار اور انحصار ہے۔پیٹ سے فضلہ (feaces) خارج کرنے کے سلسلے میں بھی اسے مشقت اور زحمت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس کے بعد بچے کا ہر قدم (step) اور اس کی ہر حرکت (movement) محنت اور مشقت کی طالب ہوتی ہے۔ بچے کے گھٹنوں کے بل اور پھر آہستہ آہستہ پاؤں پر چلنے کی حرکت پر اگر غور کیا جائے تو اچھی طرح سے محسوس ہوگا کہ اس قدرتی عمل (Natural process) کو انجام دینے میں بچے کو کتنی شدید جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔پیر جمانے، کھڑا ہونے اور قدم اٹھانے کے لیے اسے کتنی مشقت اور سختی اٹھانی پڑتی ہے اور اسے زندگی کے ہر ہر مرحلے پر کس طرح کی محنت اور مشقت سے کام لینا پڑتا ہے۔ پھر جب وہ کام کرنے کے قابل ہوجاتا ہے تو جدوجہد کے راستے الگ الگ ہوجاتے ہیں اور مشقتوں کی نوعیت بھی مختلف ہوجاتی ہے ایک شخص اس لیے دوڑ دھوپ کرتا ہے کہ اسے کھانے کے لیے روٹی پہننے کے لیے کپڑا اور رہنے کے لیے مکان ہو۔ دوسرا شخص اس لیے جدوجہد کرتا ہے کہ اس کی دولت میں اضافہ ہو۔ وہ اپنی زندگی اس فکر میں گزارتا ہے کہ کس طرح اس کی دولت میں ہزاروں کا لاکھوں میں، لاکھوں کا کروڑوں میں اور کروڑوں کا اربوں میں اور اربوں کا کھربوں میں اضافہ ہوجائے۔ ایک اور شخص اقتدار جاہ و منصب اور حکومت کے حصول کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔ ایک اور شخص بھی ہے جو اپنے نفس کی خواہشات کی تسکین کے لیے مصیبتیں اور مشقتیں جھیلتا ہے۔ ایک ایسا شخص بھی ہے جس کی جدوجہد راہ خدا میں ہوتی ہے۔ جو اللہ کے دین کی دعوت کے لیے زحمت و مشقت برداشت کرتا ہے۔ ایک شخص جنت حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرتا ہے اور اس کے لیے مشکلات، مصائب اور تکالیف کا سامنا کرتا ہے جبکہ دوسرا شخص جہنم حاصل کرنے کے لیے محنت و مشقت کرتا ہے الغرض ہر کوئی انسان محنت و مشقت کے ساتھ اپنا راستہ طے کرتا ہوا اپنے رب خالق حقیقی کی بارگاہ میں پہنچ جاتا ہے اور وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوجاتا ہے کہ خدا کے نافرمان بدبخت لوگوں کے لیے شدید ترین مصائب اور

مشقتوں سے گزر کر جہنم میں جانا ہے اور خدا کے فرمانبردار نیک بخت بندوں کو خوش و خرم بڑے اعزاز کے ساتھ عظیم ترین راحت و آرام کے لیے جنت میں داخل ہونا ہے۔

دنیاوی زندگی میں ہر انسان کو محنت اور مشقت سے گزرنا پڑتا ہے۔ لیکن کامیاب انسان وہ ہے جو اپنے رب کی راہ میں جدوجہد کرتا ہے اور اس کی رضا کے لیے مصیبتوں اور مشقتوں سے گزرتا ہے اور جب وہ اس کے پاس پہنچتا ہے تو زندگی کی مشقتوں سے محفوظ ہوکر اس کے سائے میں عظیم ترین راحت سے ہمکنار ہوتا ہے اور بدترین خسارے میں وہ شخص ہے جو دنیا کی زندگی میں مشقتوں اور زحمتوں کے مرحلوں سے گزرتا ہے اور خدا کی نافرمانی میں یہ سب مصائب و مشکلات اور مشقتیں برداشت کرتا ہے تو آخرت میں اسے ان سے زیادہ شدید مصائب اور مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ دنیا میں جو شخص کسی عظیم مقصد کے لیے جدوجہد کرتا ہے وہ اس شخص کی طرح نہیں ہوسکتا ہے جو کسی حقیر مقصد کے لیے تگ و دو کرے۔ جو انسان دنیاوی اغراض و مقاصد اور مادی دلچسپی سے آزاد ہوکر جدوجہد کرتا ہے وہ شخص اس کی طرح نہیں ہوسکتا ہے جو حشرات الارض، کیڑے مکوڑوں کی طرح زمین سے چمٹ کر دلدل میں دھنسنے کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔ جو شخص اللہ کے دین کی دعوت کے لیے اللہ کی راہ میں جان دیتا ہے وہ اس شخص کی مانند نہیں ہوسکتا جو اپنی نفسانی خواہشات کے لیے جان دیتا ہے۔ دونوں جدوجہد کے میدان میں یکسان نہیں ہوسکتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ لَایَسْتَوِیْٓ اَصْحَابُ النَّارِ وَاَصْحَابُ الْجَنَّۃِ اَصْحَابُ الْجَنَّۃِ ھُمُ الْفَآئِزُوْنَo ''اہل دوزخ اور اہل جنت یکساں نہیں ہوسکتے ہیں اہل جنت مراد پانے والے ہیں۔''

أَيَحْسَبُ أَن لَّن يَقْدِرَ عَلَيْهِ أَحَدٌ(٥)

کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اس پر کسی کا بس نہ چلے گا

يَقُولُ أَهْلَكْتُ مَالاً لُّبَداً(٦)

کہتا ہے میں نے ڈھیروں مال اڑادیا

أَيَحْسَبُ أَن لَّمْ يَرَهُ أَحَدٌ(٧)

کیا وہ سمجھتا ہے کہ اسے کسی نے نہیں دیکھا

یعنی یہ انسان جو محنت و مشقت میں پیدا ہوا ہے جو دنیا میں جدوجہد محنت و مشقت اور کشمکش سے کبھی نجات نہیں پاتا ہے وہ اپنی حقیقت کو بھول جاتا ہے اور اُس کے خالق نے اسے جو تھوڑی سی قوت، قدرت، صلاحیت اور زندگی کا سامان بخشا ہے اس سے وہ فریب میں بتلا ہوجاتا ہے۔ وہ ایسا رویہ اختیار کرتا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ اسے اپنے اعمال پر مؤاخذہ اور اپنے رب کے پاس جواب دہی کا خیال نہیں ہے۔ اسے اس بات کا یقین نہیں ہے کہ کوئی ہستی اسے گرفت میں لے کر محاسبہ کرے گی۔ اس بے فکری، لاپرواہی اور بے یقینی کی وجہ سے وہ سرکش اور ظالم ہوجاتا ہے اور جارحیت اختیار کرکے لوگوں کے مال و اسباب لوٹ کر دولت کثیر جمع کرکے ڈھیروں مال برباد کردیتا ہے اور فسق و فجور کی زندگی اختیار کرلیتا ہے۔ اس کے دل میں نہ خدا کا خوف ہوتا ہے اور نہ وہ ان اعمال بد سے باز آنے کی ضروت محسوس کرتا ہے۔ اس انسان کا دل اللہ پر ایمان اور اس کے خوف سے خالی ہوتا ہے۔ جب ایسے شخص کو خدا کی راہ میں خیر کے کاموں کے لیے مال خرچ کرنے کے لیے کہا جاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میں نے ڈھیروں مال اڑادیا اور اس پر فخر کرتا ہے یہ ڈھیروں مال وہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے بجائے فضول کاموں میں اڑادیتا ہے جو کل آخرت میں اس کے کچھ کام نہ آئے گا۔

دراصل انسان، جس کے سر پر موت منڈلاتی رہتی ہے، اس تکبر میں بتلا ہے کہ وہ دنیا میں جو چاہے کر گزرے۔ کوئی غیبی طاقت (invisible power) اسے پکڑنے والی نہیں حالانکہ دنیا میں وہ ہر آن دیکھ رہا ہے کہ اس کی تقدیر پر کسی اور کی حکمرانی قائم ہے جس کے فیصلوں کے آگے وہ بے بس ہے اور اس کی ساری تدبیریں بے کار ہوجاتی ہیں۔ قہر الٰہی کے سامنے وہ بے بس ہے۔ زلزلے کا جھٹکا، ہوا کا طوفان، سمندروں کی طغیانی اسے یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ خدا کی طاقت اور اس کے فیصلوں کے سامنے وہ کس قدر بے بس ہے! ایک غیر متوقع حادثہ یا کوئی مہلک مرض اسے اپاہج و ناکارہ بنا کر رکھ دیتا ہے۔ قانون دان، فلاسفر، نامور، پہلوان اور سیاست کے بڑے کھلاڑی کو آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں میں لا گراتا ہے۔ دولت کے نشے میں بتلا متکبروں اور ہنروفن پر فخر کرنے والوں کو ہیرو سے زیرو بنا دیتا ہے۔ آخر انسان کے دماغ میں کہاں سے یہ ہوا بھر گئی کہ اس پر کسی کا بس نہیں چل سکتا ہے۔ کہتا ہے کہ میں نے ڈھیروں مال اڑا دیا۔ مال خرچ کرنے کے بجائے ڈھیروں مال اڑانے کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کہنے والے کو اپنی مال داری پر کتنا فخر ہے جو ڈھیروں مال وہ خرچ کرتا ہے وہ اس کی جمع کی ہوئی دولت کے مقابلے میں ذرہ برابر وقعت نہیں رکھتا ہے۔ اس لیے مال خرچ کرنے کے بجائے وہ مال اڑانے کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ ایسے لوگوں کا مال خرچ کرنا کسی حقیقی نیک کام کے لیے نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ اپنی دولت مندی کی نمائش اور اپنی بڑھائی کا اظہار کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ قصیدہ گوئی اور شعر وشاعری کی محفلوں پر خرچ کرنا، شادی بیاہ اور غمی کے رسومات میں ہزاروں لوگوں کو دعوت پر بلانا، جوا کھیلنے میں ڈھیروں مال و دولت ہار دینا، دوستوں کو بے اصل تقریبات اور بے ہودہ امور پر کھانا کھلانا، میلوں ٹھیلوں میں جاکر ایک دوسرے سے بڑھ کر شان و شوکت کا مظاہرہ کرنا تقریبات میں بے تحاشا کھانے پکوانا اور دعوت عام دینا یا اپنے ڈھیروں پر کھلا لنگر جاری رکھنا کہ دور دور تک یہ شہرت ہوجائے کہ فلاں رئیس کا دسترخواں بڑا ہے۔ یہ ایسے نمائشی اخراجات تھے جنہیں جاہلیت میں آدمی کی فیاضی اور فراخ دلی کی علامت اور بڑائی کی نشانی سمجھا جاتا تھا ان پر ان کی تعریفوں کے ڈنکے بجتے تھے اور ان کی تعریف میں قصیدے پڑھے جاتے تھے اور ان اخراجات پر فخر جتائے جاتے تھے۔

موجودہ دور بھی اس قسم کی برائیوں سے خالی نہیں ہے لوگوں کا حال زمانہ جاہلیت کے معاشرے سے کسی بھی طرح مختلف نہیں۔ انہیں جب آسانی سے دولت کثیر حاصل ہوجاتی ہے تو اللہ کی امانت کے بجائے وہ اسے اپنی کمائی ہوئی ملکیت سمجھتے ہیں اور اسے اپنی شہرت اور ناموری کے لیے رسوماتِ بد میں اڑادیتے ہیں۔ شادی بیاہ کا معاملہ ہو، دوستی کی تقریب ہو یا تعزیت کا معاملہ ہو، بہت سے لوگ جاہلی دور کے اہل مکہ کی طرح بے تحاشا دولت اڑادیتے ہیں۔ ناچ نغموں اور رنگ رلیوں میں ہزاروں، لاکھوں اور کروڑوں روپے خرچ کردیتے ہیں تاکہ ان کی سرمایہ داری کا چرچا ہوجائے۔ اگر ان فضول اور بے مقصد کاموں پر مال و دولت اڑانا بند کیا جائے اور غیر ضروری مصروفیات اور اخراجات پر بے تحاشا مال اڑانے سے گریز کیا جائے تو پوری دنیا میں نہ کوئی بھوک سے مرے گا اور نہ کوئی فاقہ کشی کا شکار ہوجائے گا۔ دنیا سے غربت کا خاتمہ ہوجائے گا کیونکہ ان سب برائیوں کی وجوہات انسانوں کے مال ودولت سے محبت، شہرت وناموری اور خواہشات نفس ہیں۔ خدا اور اس کے دین سے لاتعلقی اور اس کی نافرمانی تمام برائیوں کی جڑ ہے۔

انسان سمجھ بیٹھا ہے کہ اسے کوئی نہیں دیکھتا ہے۔ یہ انسان کی نادانی ہے کہ وہ خیال کرتا ہے کہ اس کے اعمال کو کوئی دیکھنے والا نہیں ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ اللہ کی نگاہیں اس پر لگی ہوئی ہیں اور وہ جو کچھ خرچ کرتا ہے اور جن کاموں پر خرچ کرتا ہے اور جس نیت اور جن اغراض و مقاصد کے لیے یہ سارے کام انجام دیتا ہے، وہ سب کچھ خدا کی نظر میں ہے اور کوئی باریک سے باریک شئے بھی اُس سے اوجھل نہیں ہے۔ اس فضول خرچی، شہرت طلبی اور فخر وغرور کی خدا کے ہاں کوئی قدر نہیں ہے۔ نادان انسان کو یہ حقیقت معلوم نہیں کہ دنیا میں وہ لوگوں کو دھوکہ دے سکتا ہے خدا کو نہیں۔ خدا کی گرفت مضبوط ہے وہ انسان کو دنیا میں ڈھیل دیتا ہے مگر آخرت میں ذرے ذرے کا حساب لے گا وہاں اس کی گرفت سے کوئی بچ نہیں سکتا۔

أَلَمْ نَجْعَل لَّهُ عَيْنَيْنِ(٨)

کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں عطا نہیں کیں

وَلِسَاناً وَشَفَتَيْنِ(٩)

اور زبان اور دو ہونٹ نہیں دیئے

وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ(١٠)

اور (خیر وشر کے) دونوں راستے نہیں دکھائے

انسان اپنی جسمانی قوت اور جسم کے اعضا پر فخر کرتا ہے کہ دماغ کا استعمال کرکے اور اپنے جسم کے اعضا کی مدد سے اُس نے پوری دنیا کو بدل دیا۔ ہاتھ پاؤں، زبان اور آنکھوں کا استعمال کرکے دنیا کی تمام مشکلات کو آسان کردیا۔ سائنس انجینئرنگ اور ٹیکنالوجی کے میدان میں نمایاں ترقی کی پرانی تاریک (dark) دنیا کو جدید روشن دنیا میں تبدیل کردیا۔ سائنس کی ایجادات سے دنیا میں ایسا انقلاب رونما ہوا جس نے دنیا کو یکسر بدل دیا۔

انسان اپنی قوت وطاقت اور حیران کن ایجادات سے دھوکہ کھا گیا وہ محسوس کرنے لگا کہ یہ سب کچھ میرے دماغ اور میرے ہاتھوں کا کمال ہے وہ اس حقیقت کو بھول گیا کہ یہ خدا ہی ہے جس نے اسے اس قدر طاقت عطا فرمائی اور دنیا کی اس نمایاں اور درخشان ترقی اور تبدیلی کو وہ اپنی محنت اور ذہانت سمجھ کر گمراہی میں مبتلا ہوگیا۔ وہ اس خدا کو بھی بھول گیا جس نے اسے ماں کے پیٹ کی تاریکی سے نکال کر اس روشن دنیا میں لاکھڑا کردیا اور اسے ایسی قوت اور ذہانت بخشی جس کی وجہ سے وہ حیوان سے ممتاز ہوا اور ان پر فوقیت حاصل کی یہ اللہ کی مرضی ہے کہ اس نے انسان کو اشرف المخلوقات بنا کر اسے تمام جانداروں پر فوقیت اور فضیلت عطا فرمائی، ورنہ وہ حیوانوں کی طرح اسی مقام پر کھڑا ہوتا جہاں وہ پیدائش سے لے کر آج تک اسی دماغ اور اسی زبان کے ساتھ موجود ہے جو بوقت پیدائش تھی۔ یہ خدا ہی ہے جس نے انسان کو انسانیت کا اعلیٰ درجہ بخشا اسے حواس (senses) عطا فرمائے جو عالم محسوسات میں اسے ہر طرح کے احساس و ادراک کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں میں انسان کی دو آنکھوں دو ہونٹوں اور زبان کا یہاں تذکرہ کیا گیا ہے۔ جن کی ساخت بہت نازک ہے اور انسان کے لیے بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ دو آنکھوں کی نعمت سے انسان ہر چیز کا نظارہ کرتا ہے دو ہونٹوں اور زبان کی مدد سے اسے نطق (بولنے کی قوت) حاصل ہوئی اور حیوان ناطق کہلایا اور اسے تمام حیوانات پر برتری اور امتیاز حاصل ہوا۔ اگر انسان حقیقت پر غور کرے تو اسے معلوم ہوجائے گا کہ اسے دیگر جانداروں پر برتری اور امتیاز از خود حاصل نہ ہوا بلکہ یہ ذہانت اور قابلیت، جس نے اسے بام عروج پر پہنچایا، اللہ کی عطا کردہ ہے۔ اب اگر وہ اللہ کی ان بخشی ہوئی نعمتوں کا استعمال حیوان کی طرح اپنے نفس تک ہی محدود رکھتا ہے یا ان نعمتوں کا استعمال صرف اپنا پیٹ بھرنے کے لیے کرتا ہے اور ہر چیز کو صرف کھانے پینے کی نظر سے دیکھتا ہے تو حیوانوں پر اسے جو برتری حاصل ہے اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر وہ اللہ کی عطا کردہ ان نعمتوں کو اس کی عنایت سمجھ کر ان کا صحیح استعمال کرے تو اسے ہر طرف وہ نشانات نظر آئیں گے جو اسے ہر معاملے میں حقیقت کا پتہ دیں گے اور صحیح و غلط کا فرق سمجھائیں گے۔ انسان اگر ان دو آنکھوں کا صحیح استعمال کرے تو اسے خدا کی ہر شئے میں خدا کا نور اور خدا کا جلوہ دکھائی دے گا جو اسے مقام محمود تک پہنچا دے گا۔ دو ہونٹوں اور زبان کا اگر صحیح استعمال کرے، ان کو خدا کے ذکر و اذکار میں محو رکھے اور ہمیشہ اس کا شکر ادا کرتا رہے تو وہ اللہ کا شکر گزار، عبادت گزار اللہ کا مقرب بندہ ہونے کا اعزاز حاصل کرسکے گا اور

اس طرح اس کی تخلیق اور اس کی زندگی کا مقصد پورا ہوجائے گا اور اللہ کی بارگاہ میں اسے عزت کا مقام حاصل ہوجائے گا اور آخرت میں سرخ روئی حاصل کرکے جنت میں اعلیٰ مقام پائے گا۔ الغرض دو آنکھیں، دو ہونٹ اور ایک زبان اللہ کے فیضان عظیم ہیں جو انسان کی ہدایت اور رہنمائی میں بہترین معاون ہیں۔ دو آنکھوں کے صحیح استعمال سے کائینات کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے اللہ کی قدرت کے دلائل اور مناظر اور اُس کی نشانیوں کا نظارہ کرکے انسان کے دل کو قرار اور آنکھوں کو ٹھنڈک مل جاتی ہے۔ اگر اس نے ان آنکھوں کا غلط استعمال کیا ان کو نفسانی خواہشات کی تعمیل میں، فحش فلمیں، عریان کاری، ناچ نغمے، گانے ترانے اور دیگر بے حیائی کے پروگرام دیکھنے کے لیے استعمال کیا تو اس کی شرافت (morality) زمین بوس ہوجائے گی اور وہ انسانیت کے اعلیٰ درجے سے گر کر حیوانیت کے درجے پر آجائے گا۔ اس طرح یہ زبان اور ہونٹ انسان کے لیے ایک بہت بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ زبان کے صحیح استعمال سے دنیا میں امن وامان پیدا ہوسکتا ہے اور زبان کے غلط استعمال سے دنیا فتنوں اور فسادات کی آماجگاہ بن سکتی ہے۔ زبان کے ایک صحیح جملے سے انسان جنت میں پہنچ جاتا ہے اور ایک غلط جملے کے استعمال سے وہ جہنم کا مستحق قرار پاتا ہے زبان کی تقاریر سے دنیا میں بڑے بڑے انقلاب آئے۔ خیر کی زبان سے خیر کے کاموں کا انقلاب آیا اور شر کی زبان سے دنیا میں شر پھیلا اور شریروں کے فتنوں اور فسادات میں اضافہ ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا آپ مجھے دو چیزوں کی ضمانت دو میں تمہیں جنت کی ضمانت (guarantee) دیتا ہوں۔ صحابہؓ نے عرض کیا وہ دو چیزیں کیا ہیں۔ آپؐ نے فرمایا وہ دو چیزیں شرمگاہ اور زبان ہیں۔ ایک اور جگہ فرمایا کہ اکثر لوگ اپنی زبانوں کی غلط بیانی اور فحش کلامی کے باعث جہنم کی آگ میں گریں گے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو خیر و شر کی دونوں راہیں دکھائیں اسے محض عقل و فکر کی طاقتیں اور دیکھنے اور بولنے کی صلاحیت عطا کر کے اپنے ہی حال پر چھوڑ نہیں دیا کہ اپنا راستہ خود تلاش کر کے خدا کی فرمانبرداری یا نافرمانی کرے بلکہ اس نے اس کی مکمل رہنمائی کے لیے انسانوں میں سے ہی اپنے کامل بندے چُن لیے جنہوں نے کمالِ اطاعت کے ساتھ اُس کا پیغام لوگوں تک پہنچایا بھی اور خود بھی اس پر عمل پیرا ہوئے۔ یوں اللہ کے ایلچی بن کر ہر پیغمبر نے اپنی قوم کے ہر انسان کے سامنے بھلائی اور برائی یا نیکی اور بدی کے دونوں راستے پیش کئے اور اسے اختیار دیا کہ وہ ان دو راستوں میں کون سا راستہ اختیار کرے لیکن اس بات کی وضاحت اور ترجمانی بھی کی کہ نیکی کا راستہ اختیار کرنے پر وہ جنت میں جائے گا اور بدی کا راستہ اختیار کرنے پر وہ واصلِ جہنم ہوگا۔ یہ بات سورہ دہر میں بھی فرمائی گئی ہے کہ ''ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں اور اس مقصد کے لیے ہم نے اسے سننے والا اور دیکھنے والا بنایا بے شک ہم نے اسے راستہ دکھایا خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا''

انسان کے بدی اور نیکی کا راستہ اختیار کرنے کی مثال اس طرح ہے کہ ایک راہ نما ایک دوراہے پر کھڑا راہ گیروں کو راستے کی رہنمائی کرتا ہے ایک راستہ شہر کی طرف جاتا ہے جہاں انسان رہتے ہیں اور جہاں انسانوں کی پناہ گاہ ہے دوسرا راستہ ایک ویرانے کی طرف جاتا ہے جہاں کوئی انسان نہیں رہتا ہے جو وحشی اور موزی جانوروں کی آماجگاہ ہے جہاں پہنچ کر انسان کی جان کسی بھی صورت میں محفوظ نہیں ہے۔ راہنما دونوں راستوں کا حال بتاتا ہے ویران جگہ کے نقصانات سے خبردار کرتا ہے اور آباد اور محفوظ جگہ کے آرام اور حفاظت سے بھی آگاہ کرتا ہے اور اس کی ترجمانی بھی کرتا ہے اور اس راستے پر چلنے کی تاکید بھی کرتا ہے۔ اب اگر کوئی راہ گیر ویران، خطرے سے پُر اور غیر محفوظ راستہ اختیار کر کے اپنی جان کا دشمن بن جاتا ہے تو اس کی اس حماقت کا ذمہ دار راہ نما نہیں بلکہ اُس راستے پر چلنے والا خود ہے۔

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ(۱۱)

مگر اس نے دشوار گزار گھاٹی سے گزرنے کی ہمت نہ کی

وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ(۱۲)

اور تم کیا جانو وہ دشوار گھاٹی کیا ہے؟

انسان کو دو راہوں سے واقف کرایا گیا ہے ایک راستہ بلندی کی طرف جاتا ہے مگر وہ بہت دشوار گزار ہے دوسرا راستہ پستی کی طرف جاتا ہے لیکن وہ نہایت آسان ہے۔ اب ایک تمثیل سے دشوار راستے کی حقیقت کو سمجھایا گیا ہے۔ عقبہ پہاڑوں پر چڑھنے کے مشکل راستے کو کہتے ہیں۔ یہ راستہ پہاڑوں کے بیچ میں سے گزرتا ہے اور پیچ در پیچ ہے۔ جو راستہ انسان کو اخلاقی اور روحانی بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ اس پر گھاٹی کے دشوار راستے کی طرح چلنا مشکل ہے کہ اس راستے پر چلنے کے لیے انسان کو اپنی نفسانی خواہشات کو لگام دینی پڑتی ہے اور شیطان کی ترغیبات سے لڑکر چلنا پڑتا ہے۔ دوسرا راستہ آسان ہے اس راستے پر چل کر انسان پہاڑوں کی بلندی کے بجائے پستی کی طرف اتر کر آتا ہے۔ اس راستے پر چلنے کے لیے انسان کو زیادہ محنت کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی صرف نفس پر لگی پابندیوں کو ہٹانا ہے۔ اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرنا ہے اور اس طرح وہ گمراہی میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ انسان خود غرض ہے وہ یہی راستہ اختیار کرلیتا ہے جو اسے بلند مقام سے پستی اور گمراہی کے میدان میں پہنچا دیتا ہے۔

یقینا انسان کے لیے خدا کی فرمانبرداری اختیار کرنا اور نیکی کے راستے پر چلنا بہت دشوار ہے۔ یہ اس گھاٹی کی طرح ہے جس میں انسان داخل ہونے کی ہمت نہیں کرتا ہے۔ مگر اس میں داخل ہونے کے لیے وہ لوگ ہمت کرتے ہیں جنہیں اللہ پر اور آخرت پر ایمان ہو اور جو اس کی نافرمانی سے بچنا چاہتے ہیں۔ ایسے راستے پر چلنے والا خدا کی بارگاہ میں بلند رتبہ رکھتا ہے، لیکن جو آزاد زندگی گزارنے والا آدمی ہے وہ آرام کی زندگی گزارنے کے لیے اس دشوار گزار گھاٹی سے بچنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے نفس کا غلام بن جاتا ہے ۔ اس کا نفس جس چیز کی خواہش کرتا ہے وہ اسے پورا کرتا ہے اس طرح اسے حلال و حرام کی کوئی تمیز نہیں ہوتی ہے۔ اس لیے خدا کے نافرمان بندے کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ اس دشوار گزار راستے پر چلنے کے لیے تیار نہیں ہوتا ہے۔ وہ اللہ کی نافرمانی کرکے جہنم کی وادی میں پہنچ جاتا ہے۔

اب اس دشوار گزار راستے کو سوالیہ انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ تم کیا جانو کہ یہ دشوار گزار گھاٹی کیا ہے۔ اس انداز بیان سے معاملے کی سختی اور اہمیت واضح ہوجاتی ہے۔ جس طرح کوئی انسان کسی اہم معاملے کے بارے میں کسی کو خبر دیتا ہے اور اسی طرح کا انداز بیان اختیار کرتا ہے کہ کیا تجھے خبر ہے کہ وہاں کیا کچھ ہوا تو سننے والا معاملہ جاننے کے لیے بے تاب ہوجاتا ہے اور بات سننے کے لیے وہ پوری دلچسپی لیتا ہے۔ یہ دلچسپی اس لیے بڑھادی جاتی ہے کہ انسان اس دشوار گزار گھاٹی میں داخل ہونے کے لیے تیار ہوجائے خواہ اس سلسلے میں اسے کتنی ہی جدوجہد کرنا پڑے اور اس لیے بھی کہ انسان کو مشقت میں پیدا کیا گیا لہٰذا اس کے لیے زندگی میں مشقت کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ اس دشوار گزار گھاٹی کو عبور کرنے میں جو جدوجہد کرے گا اسے اس کا ثمر ضرور ملے گا اور اس مشقت کی راہ میں اسے جو مصیبتیں جھیلنی ہوگی اس کا بدلہ اسے آخرت میں مل جائے گا۔ اس کی یہ جدوجہد آخرت میں رنگ لائے گی۔

فَكُّ رَقَبَةٍ(۱۳)

وہ کسی گردن کو غلامی سے چھڑانا ہے

أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ(۱۴)

یا بھوک کے دن کسی آدمی کو کھانا کھلانا ہے

يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ(۱۵)

کسی یتیم رشتہ دار کو

أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ(۱۶)

یا کسی خاک نشین مسکین کو

ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ آمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ(۱۷)

پھر وہ ان لوگوں میں ہو جو ایمان لائے اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر کی اور رحم کرنے کی وصیت کی

أُولَئِكَ أَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ(۱۸)

اور یہی لوگ دائیں بازو والے ہیں

اب اس دشوار گزار گھاٹی کی وضاحت کی گئی ہے جس میں داخل ہونے کے لیے انسان کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور جن کے حل کرنے سے اسلامی دعوت کو فروغ مل سکتی تھی۔ ان میں غلاموں کو آزاد کرانا، یتیموں اور غریبوں کو کھانا کھلانا ہے۔ ان مسائل کو حل کرنا اسلام کی ترجیح تھی کیونکہ عرب کے سماج میں غلاموں پر انتہائی بے رحمی اور بے دردی سے سلوک کیا جاتا تھا۔ اس لیے ایسی برائیوں کو دور کرنا اگرچہ دشوار گزار گھاٹی کو پار کرنا تھا مگر اس ظلم و جبر کو دور کیے بغیر سماج میں اسلام کی بنیاد نہیں ڈالی جا سکتی تھی اور اسلام کے دعوتی مشن کو کامیابی سے ہمکنار کرنا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن تھا۔

انسان کی اپنی شہرت اور ناموری کے لیے مال اڑانے اور اس پر فخر کرنے کی ضمن میں اللہ تعالیٰ کی وعید آنے کے بعد اب اسے ہدایات دی جارہی ہیں کہ وہ کون سا مال، کس طرح اور کِن لوگوں پر خرچ کرے تاکہ وہ اخلاق کی پستی میں گرنے کے بجائے روحانی بلندیوں کی راہ پر گامزن ہوجائے۔ سب سے پہلے اسے ان نفسانی خواہشات کو کنٹرول کرنا ہے جو اسے برائیوں کی طرف راغب کرتی ہیں۔ اپنے نفس پر قابو کرکے اسے ایک بہت بڑی قربانی دینی ہے۔ وہ قربانی یہ ہے کہ وہ اپنے مال سے کسی غلام کو آزاد کرے یا کسی غریب کی گردن قرض کے بوجھ سے نکالے یا کسی بے کس اور بے وسیلہ آدمی کو تاوان کے بوجھ سے چھڑا لائے یا بھوک کی حالت میں کسی محتاج کو کھانا کھلائے جو غربت اور افلاس میں پڑا ہوا ہو اور کسی یتیم، پڑوسی یا رشتہ دار کی مدد کرے۔ ایسے کام کرنے سے آدامی کی شہرت کے ڈنکے نہیں بجتے ہیں مگر اخلاق کی بلندیوں کی طرف جانے کا راستہ اسی دشوار گزار گھاٹی سے ہوکر گزرتا ہے یعنی ایسے کام مشکل تو ضرور ہیں مگر نجات کا راستہ بھی انہی کاموں کے کرنے میں ہے اور یہی دشوار راستہ جنت کی شاہراہ بھی ہے۔

بہ شہادت گاہ اُلفت میں قدم رکھنا

لوگ آسا سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

ان آیات میں نیکی کے جن کاموں کا ذکر کیا گیا ہے ان کے بڑے فضائل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائے ہیں۔ فکُّ رَقَبَۃٍ (گردن چھڑانے) کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس شخص نے ایک مومن غلام کو آزاد کیا اللہ تعالیٰ اس غلام کے ہر عضو کے بدلے میں آزاد کرنے والے شخص کے ہر عضو کو دوزخ سے بچائے گا۔ ہاتھ کے بدلے میں ہاتھ، پاؤں کے بدلے میں پاؤں اور شرمگاہ کے بدلے میں شرمگاہ۔ (...)اس آیت کی بنا پر حضرت امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا کہ غلام کو آزاد کرنا صدقے سے افضل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر صدقہ پر مقدم رکھا ہے۔ مساکین کی مدد کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسکین اور بیوہ کی مدد کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا ایسا ہے جیسا جہاد فی سبیل اللہ میں دوڑ دھوپ کرنے والا۔ یتیموں کے بارے میں انہوں نے فرمایا کہ میں اور وہ شخص جو کسی یتیم کی کفالت کرے جنت میں اس طرح ہوں گے آپ نے شہادت کی انگلی اور بیچ کی اُنگلی کو اٹھا کر دکھایا۔ آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ مسلمانوں کے گھروں میں بہترین گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم سے نیک سلوک ہو رہا ہو اور بدترین گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم سے برا سلوک ہو رہا ہو۔ اور جس شخص نے کسی یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا اور محض اللہ کی خاطر پھیرا اس یتیم بچے کے ہر بال کے بدلے اُس شخص کے لیے نیکیاں لکھی جائیں گی۔

یہ آیات جن میں غلاموں کو آزاد کرانے اور مسکینوں اور یتیموں کو کھانا کھلانے کی ترغیب کا تذکرہ ہے اس وقت نازل ہوئیں جب اسلام اور مسلمان دشمنوں کے گھیرے میں تھے اور اسلامی شریعت نافذ کرنے والی حکومت ابھی وجود میں نہ آئی تھی۔ غلامی کا رواج باقی دنیا کی طرح جزیرہ عرب میں بھی عام تھا۔ غلاموں پر انتہائی ظلم اور بے رحمی کا سلوک کیا جاتا تھا۔ ان غلاموں میں جب کچھ لوگ ایمان لے آئے تو ان کے ظالم آقاؤں نے ان پر ظلم و تشدد کا بازار اور گرم کردیا۔ انہیں ناقابل برداشت سزائیں دینے لگے اس لیے بات واضح ہوگئی تھی کہ ان مصائب سے انہیں نجات دلانے کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ان کے ظالم آقاؤں سے خرید کر انہیں آزاد کردیا جائے۔ اس طرح سے مسلمانوں نے غلاموں کو آزاد کرانے کی تحریک چلائی۔

حضرت ابو بکرؓ نے حسب عادات اس حکم خداوندی کی تعمیل میں بھی استقامت کے ساتھ آگے بڑھ کر پہل کی محمد بن اسحاق کی روایت ہے کہ پاکیزہ قلب نیک سیرت والے حضرت بلالؓ کو امیہ بن خلف دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں جھلسانے والے سنگ ریزوں پر پٹخ دیتا تھا اور ان کے سینے پر بھاری چٹان رکھ کر کہتا تھا کہ تو اسی طرح یہاں پڑا رہے گا یہاں تک کہ تجھے موت آجائے یا تم محمدؐ کا انکار کروگے اور لات و عزیٰ کی خدائی کو تسلیم کروگے۔ حضرت بلالؓ اس شدید عذاب کی حالت میں کہتے اَحَدٌ۔ اَحَدٌ خدا ایک ہے خدا ایک ہے۔

ایک دن حضرت بلالؓ اسی طرح کی دردناک اذیت میں مبتلا تھے کہ حضرت ابوبکرؓ کا اُدھر سے گزر ہوا۔ انہوں نے یہ المناک منظر دیکھ کر امیہ بن خلف سے کہا کہ اس غریب کے معاملے میں تم خدا سے نہیں ڈرتے ہو؟ آخر کب تک تم اس پر ظلم کرتے رہو گے۔ امیہ نے کہا تم ہی نے تو اسے بگاڑا اور تم ہی اسے چھڑاؤ۔ حضرت ابو بکرؓ نے اپنے ایک سیاہ فام غلام کے بدلے میں حضرت بلالؓ کو اس ظالم سے چھڑایا اور انہیں آزاد کردیا۔ اس طرح حضرت ابوبکرؓ نے بہت سے غلاموں اور باندیوں کو ان کے ظالم آقاؤں سے خرید کر آزاد کرایا۔ ان میں زنیرہ نام کی ایک باندھی تھی۔ جب انہوں نے اسے خرید کر آزاد کردیا تو ان کی آنکھوں کی بینائی چلی گئی قریش نے کہا دیکھو لات وعزیٰ نے زنیرہ کو اندھا کردیا۔ زنیرہ نے جب یہ بات سنی تو کہا ''اللہ کی قسم یہ لوگ جھوٹ کہتے ہیں لات و عزیٰ نہ کسی کو نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ نفع''۔ شان کریمی نے جوش مارا ان الفاظ کے کہنے کے فوراً بعد ہی اللہ کے فضل کرم سے زنیرہ کی بینائی واپس آگئی۔ انہوں نے ایک اور باندی کو آزاد کرایا جسے حضرت عمرؓ قبول اسلام سے پہلے اس طرح مارتے تھے کہ اسے مار کر جب وہ تھک جاتے تھے تو رک کر کہتے تھے کہ میں تمہیں مارنے سے اس لیے رک گیا کہ میں تھک گیا ہوں ورنہ تجھے اور مارتا۔ حضرت ابوبکرؓ نے جب اس بے کس باندی کا یہ حال دیکھا تو اسے خرید کر آزاد کردیا۔ حضرت ابوبکرؓ ان مظلوم و بے کس غلاموں کو اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے آزاد کرکے اس دشوار گزار گھاٹی سے گزر رہے تھے۔ ایک دن ان کے والد ابو قحافہ نے ان سے کہا کہ بیٹے تم کمزور غلاموں اور باندھیوں کو خرید کر آزاد کرتے ہو۔ اگر تمہیں ایسا ہی کرنا ہے تو مضبوط اور توانا غلاموں کو آزاد کرلو جو تمہاری محافظت کریں اور تمہاری حمایت میں اٹھ کھڑے ہوں۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا۔ اباجان! میں جو کچھ کرتا ہوں صرف خدا کی رضا کے لیے کرتا ہوں۔

اس دشوار گزار گھاٹی میں داخل ہونے کے لیے ایک اور حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ فاقہ کشی میں بتلا یتیموں، مسکینوں اور محتاجوں کو کھانا کھلایا جائے تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔ جو کوئی شخص بھی قرآن پاک کا مطالعہ کرے گا وہ یہ دیکھے گا کہ اس کتاب مقدس میں جہاں بھی عمل صالح کے اجر اور اس کی جزائے خیر کا ذکر کیا گیا ہے وہاں لازماً اس کے ساتھ ایمان کی شرط لگی ہوئی ہے۔ عمل بلا ایمان کو خدا کے ہاں کہیں بھی مقبول قرار نہیں دیا گیا ہے اور نہ اس پر کسی اجر وثواب کی امید دلائی گئی ہے۔

اس مقام پر یہ اہم نقطہ بھی نگاہ میں رہنا چاہیے کہ آیت میں یہ نہیں فرمایا گیا ہے کہ ''پھر وہ ایمان لایا'' بلکہ یہ فرمایا گیا کہ ''پھر وہ ان لوگوں میں شامل ہوا جو ایمان لائے'' اس کے معنی یہ ہیں کہ محض ایک فرد کی حیثیت سے اپنی جگہ ایمان لاکر رہ جانا مطلوب نہیں بلکہ مطلوب یہ ہے کہ ہر ایمان لانے والا ان دوسرے لوگوں کے ساتھ مل جائے جو ایمان لائے ہیں تاکہ اس سے اہل ایمان کی جماعت بنے، ایک مومن معاشرہ وجود میں آئے اور اجتماعی طور پر ان بھلائیوں کو قائم کیا جائے جن کے قائم کرنے سے برائیوں کو مٹایا جاسکے گا یہی ایمان کا تقاضا ہے۔

ایسے ہی مومن معاشرے کے افراد کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کریں اور مرحمت (مہربانی) مَوَاسات (دل دہی) مؤاخات (بھائی چارہ) موافقت (اتفاق) مؤانَسَت (باہمی پیار و محبت) مُوالات (باہمی اتحاد) کی تاکید کریں۔ مومن معاشرے میں ان دو خصوصیات صبر کی تلقین اور مرحمت کی تاکید کی بہت بڑی اہمیت ہے جہاں تک صبر کا تعلق ہے قرآن مجید میں اس لفظ کو ایک وسیع مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے مومن کی پوری زندگی صبر پر منحصر ہے۔ ایمان لانے کے ساتھ ہی مومن کے صبر کا امتحان شروع ہوجاتا ہے۔ خدا کی عبادت کرنے اور اس کے احکام کی اطاعت کرنے میں صبر کی بے حد ضرورت ہے۔ خدا کی حرام کی ہوئی چیزوں سے بچنا صبر کے بغیر ممکن نہیں۔ برائیوں کو چھوڑنے کے لیے اور نیک کام کرنے کے لیے صبر کی انتہائی ضرورت ہے۔ نفس امارہ انسان کو ہر وقت گناہوں کی ترغیب دیتا رہتا ہے، اس کا مقابلہ کرنے کے لیے صبر ایک بہترین ہتھیار ہے۔ خدا کے قانون کی پیروی کرنے سے جو نقصانات مصائب و مشکلات اور تکالیف انسان کو پہنچتے ہیں ان پر صبر کی بدولت ہی قابو پایا جاسکتا ہے۔ ایمان کی راہ اختیار کرتے ہی انسان کو اپنی نفسانی خواہشات سے لے کر دُنیا کی بہت ساری شیطانی مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اللہ پر ایمان لانے والے کو اللہ کی لگام ہوتی ہے اسے اللہ کی مرضی کے مطابق ہر وقت پوری قوت اور اعتماد کے ساتھ اس کے حکم کی تعمیل کرنی ہے ذرہ برابر نافرمانی سے اس کے ایمان کو نقصان پہنچ سکتا ہے اس لیے ایمان کا راستہ اختیار کرنا آسان نہیں بلکہ اس راہ پر چلنے اور چلتے رہنے کے لیے مومن کو بہت ساری سختیاں جھیلنی پڑتی ہیں۔ اس کے برعکس ایمان سے خالی شخص بے لگام ہوکر اپنی مرضی کا راستہ اختیار کرلیتا ہے اور اپنے نفس کی غلامی میں اپنی مرضی کے مطابق نیکی اور برائی کے تصور سے خالی دماغ جو چاہتا ہے کرلیتا ہے۔ اس لیے اس کی زندگی آرام دہ اور مزے دار ہوتی ہے۔ لیکن مومن اللہ تعالیٰ کے قانون اور اس کے احکام کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اسے اپنے مرضی کے خلاف اللہ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنی ہے مگر ایسا کرنے سے ہی وہ آخرت کی آرام دہ زندگی کا مستحق قرار پاتا ہے اور جب وہ جنت میں پہنچ جائے گا تو اس میں ہمیشہ رہنے والی زندگی پاکر اللہ کی عطا کردہ اس نعمت سے اتنا خوش ہوجائے گا کہ اس کی خوشی کی کوئی حد نہ ہوگی۔ ایک دوسرے پر صبر کی تلقین کے بعد لوگوں پر رحم کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ مومنوں کی ذمہ داری ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ رحیمانہ اور شفیقانہ سلوک کرنے کے ساتھ ساتھ عالم انسانیت کے لیے رحیم اور شفیق ہونے کا مظاہرہ کریں

اور اس کی تعلیم دیں۔یہی اہل ایمان کے معاشرے کی امتیازی شان ہے۔ اہل ایمان کا معاشرہ بے رحم، سنگ دل اور ظالم نہیں ہوسکتا ہے بلکہ انسانیت کے لیے رحیم وشفیق، ہمدرد اور غمخوار معاشرہ ہوتا ہے۔ فرد کی حیثیت سے بھی ایک مومن اللہ کی شان رحیمی اور شان کریمی کی نشانی اور جماعت کی حیثیت سے بھی مومنوں کی جماعت خدا کے رسول رَحْمَۃٌ لِّلْعَالَمِیْن کی نمائندہ ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں پر رحم کرنے کی تعلیم دی اور اس پر عمل کرنے کی تاکید فرمائی۔ انہوں نے فرمایا اللہ اس شخص پر رحم نہیں کرتا جو انسانوں پر رحم نہیں کرتا۔ رحم کرنے والوں پر رحمان رحم کرتا ہے۔ تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔ وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو ہمارے چھوٹے پر رحم نہ کھائے اور ہمارے بڑے کی توقیر نہ کرے۔ تم مومنوں کو آپس کے رحم، محبت اور ہمدردی کے معاملہ میں ایک جسم کی طرح پاؤ گے کہ اگر ایک عضو میں کوئی تکلیف ہو تو سارا جسم اس کی خاطر تکلیف میں مبتلا ہوجاتا ہے۔

جو لوگ قرآن مجید کی بیان کردہ اس دشوار گزار گھاٹی کو پار کرتے ہیں وہ اَصحَابُ الیَمِیْن دائیں بازو والے کہلائے گئے ہیں۔ یعنی وہ سعادت مند اور نیک بخت لوگ ہیں۔ یہ دائیں بازو والے خدا کے ایسے مقرب بندے ہیں جو اپنی زندگی کا ہر لمحہ اور ہر لحظہ خدا کی فرمانبرداری میں گزارتے ہیں اور صبر و سکون کے ساتھ خدا کی بندگی میں مشغول رہتے ہیں۔ لوگوں سے نیک سلوک کرتے ہیں۔ غریبوں محتاجوں، مسکینوں اور یتیموں کی مدد کرتے ہیں یہی لوگ اَصحَابُ الْجَنَّۃ جنت میں جانے والے لوگ ہیں۔

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوا بِآیَاتِنَا ھُمْ أَصْحَابُ الْمَشْأَمَۃِ(۱۹)

اور جنہوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کیا وہ بائیں بازو والے ہیں

عَلَیْھِمْ نَارٌ مُؤْصَدَۃٌ(۲۰)

ان پر آگ چھائی ہوئی ہوگی

دائیں بازو والے کے بعد بائیں بازو والے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جو لوگ اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں اور اپنے نفس کی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں۔ خدا کی بندگی سے منہ موڑتے ہیں۔ غریبوں، مسکینوں اور یتیموں کی مدد کرنے کے بجائے ان کے مال و اسباب ہڑپ کرلیتے ہیں بائیں بازو والے لوگ ہیں یہی لوگ جہنم میں جانے والے لوگ ہیں۔ ان بدبخت لوگوں پر قیامت کے دن آگ چھائی ہوئی ہوگی۔
قرآن مجید نے خوش قسمت جنت میں جانے والے لوگوں کو اصحاب الیمین یعنی دائیں بازو والے قرار دیا ہے کیونکہ قیامت کے دن ان کے نامۂ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں دئے جائیں گے اور بدقسمت جہنم میں جانے والوں کو اصحاب شمال یعنی بائیں بازو والے قرار دیا کیونکہ قیامت کے دن ان مجرموں کے نامۂ اعمال ان کے بائیں ہاتھ میں تھما دیے جائیں گے۔

سُوْرَۃُ الشَّمْس مکیّۃ

اٰیٰتُہا:15 رکوعھا:1

بسم اللہِ الرَّحمٰن الرَّحیم

وَالشَّمسِ وَضُحٰھاo وَالقَمَرِ اِذَا تَلٰھاo وَالنَّھَارِ اِذَا جَلّٰھاo وَاللَّیلِ اِذَا یَغشٰھاo وَالسَّمَاءِ وَمَا بَنٰھاo وَالاَرضِ وَمَا طَحٰھاo وَنَفسٍ وَمَا سَوّٰھاo فَاَلھَمَھَا فُجُورَھَا وَتَقوٰھاo قَدَ اَفلَحَ مَن زَکّٰھاo وَقَدَ خَابَ مَن دَسّٰھاo کَذَّبَت ثَمُودُ بِطَغوٰھاo اِذِ انبَعَثَ اَشقٰھاo فَقَالَ لَھُم رَسُولُ اللہِ نَاقَۃَ اللہِ وَسُقیٰھاo فَکَذَّبُوہُ فَعَقَرُوھَا فَدَمدَمَ عَلَیھِم رَبُّھُم بِذَنبِھِم فَسَوّٰھاo وَلَا یَخَافُ عُقبٰھاo

پس منظر:

نیکی اور بدی کا فرق اس سورہ کا مرکزی موضوع ہے یہ سورہ ایک ایسے نغمے کی مانند ہے جس کا قافیہ اور سُر ہم آہنگ ہے۔ اس ہم ساز اور ہم آہنگ نغمے میں حقیقت کبریٰ کا دل لبھانے والا ایک ایسا لہجہ (tone) ہے جو انسانی نفس کی حقیقت اُس کی فطری قابلیت و صلاحیت اور اس کی ذاتی ذمہ داری کی نغمہ سرائی کرتا ہے۔

یہ سورہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ سورج اور چاند رات اور دن اور زمین و آسمان ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد ہیں، انسان اگر غور کرے تو اسے آسانی سے یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ نیکی اور بدی یکساں نہیں اور نہ ان کے نتائج یکساں ہوسکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو با رونق جسم کے ساتھ جنم دیا اور اسے حواس (senses) دماغی قوت، معاملہ فہمی اور سمجھ داری عطا فرمائی اُسے نیکی اور بدی، بھلے اور بُرے، خیر اور شر، ظلم اور انصاف، محبت اور نفرت اور رحم و کرم اور قہر و غضب میں فرق کرنے کی تمیز بخشی۔ انسان کو عقل سلیم عطا کی گئی تاکہ وہ ہر چیز کی حقیقت کی تہہ تک پہنچ سکے۔ عقل سلیم کے باعث اسے بھلے اور بُرے میں تمیز کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اس امتیازی خصوصیت کے پیش نظر اگر وہ نیک اور بھلے کاموں کو سرانجام دیتے ہوئے اپنے نفس کو پاک کرے تو فلاح پائے گا اور اگر وہ بھلائی کے کاموں کو ترک کرکے اپنے ذہن و ضمیر کو پامال کرے تو ناکام و نامراد ہوگا۔ سورہ کے دوسرے حصے میں رسالت کی اہمیت سمجھائی گئی ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو بھلائی اور برائی میں فرق کرنے کا الہامی علم بخشا ہے وہ بجائے خود انسان کی ضرورت کے لیے کافی نہیں ہے اس لیے اسے اس انسانی علم کی یاد دہانی کے لیے رسولوں کی ضرورت لازمی تھی۔ اس کے پیش نظر رسول، خدا کے پیغام کے ساتھ انسانوں کے پاس بھیجے گئے تاکہ انسان اس الہامی علم کو نظر انداز کرکے غلط طریقوں سے زندگی کے فیصلے نہ کریں۔ اس سلسلے میں قوم ثمود کی تاریخی مثال پیش کی گئی کہ حضرت صالح علیہ السلام قوم ثمود کی طرف بھیجے گئے تھے مگر یہ قوم اپنے نفس کی برائیوں میں غرق ہوکر اتنی سرکش ہوگئی تھی کہ اس نے پیغمبر کو جھٹلایا اس قوم کے لوگوں کو جب اونٹنی کی شکل میں مُنہ مانگا معجزہ پیش کیا گیا تو انہوں نے ایک سربراہ کی رہنمائی میں اس اونٹنی کو قتل کردیا۔ نافرمانی اور شرارت کے باعث اس قوم کو تباہ و برباد کردیا گیا۔

قوم ثمود سے مکہ کے لوگ واقف تھے اس لیے اس قوم کی سزا کی مثال پیش کی گئی تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرنے والی قریش کی قوم عذاب الٰہی سے ڈر کر ان پر ایمان لے آئے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی تو اس وقت قریش کی حالت قوم ثمود سے مختلف نہ تھی۔ اس لیے قوم ثمود کے اس قصے کو پیش کیا گیا۔

وَالشَّمۡسِ وَضُحَاهَا(١)

قسم ہے سورج کی اور اس کی دھوپ کی

وَالْقَمَرِ إِذَا تَلَاهَا(۲)

قسم ہے چاند کی جب وہ سورج کے پیچھے آتا ہے

وَالنَّهَارِ إِذَا جَلَّاهَا(۳)

قسم ہے دن کی جب وہ سورج کو نمایاں کردیتا ہے

وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَاهَا(۴)

قسم ہے رات کی جب وہ سورج کو چھپالیتی ہے

اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے کائینات میں موجود جن مخلوقات اور مناظر کی قسم کھائی ہے، انسانی زندگی میں ان کی زبردست اہمیت (importance) افادیت اور قدر و منزلت ہے۔ مناظر کائینات پر غور و فکر کے لیے انسانوں کی توجہ ان کی طرف مبذول کرائی گئی ہے کیونکہ کائینات کے یہ مناظر ایک خاموش زبان ہیں جو کسی آواز کے بغیر وجود باری تعالیٰ اور خالق کائینات کی گواہی دے رہی ہے اور حقائق و صداقت کی نشاندہی کرکے وجود باری تعالیٰ کی ترجمانی کررہی ہے۔ یہ مناظر کائینات قلب انسانی پر اثرانداز اور ایمان بخش ثابت ہورہے ہیں بشرطیکہ انسان ان کی طرف متوجہ ہوکر ان پر غور کرے۔

قرآن مجید انسانی قلوب کو متوجہ کرنے کی خاطر جہاں گزشتہ اقوام کے احوال کو بیان کرتا ہے، وہیں آفاق و انفُس میں جلوہ گر نشانیوں اور مناظر پر دعوتِ فکر بھی دیتا ہے۔ یہ کبھی بلاواسطہ متوجہ کرنے کا انداز اختیار کرتا ہے اور کبھی بالواسطہ اشارات سے کام لیتا ہے۔ کائینات کی مخلوقات اور مناظر کی

قسموں کو حقائق کا فریم ورک (frame work) بنایا گیا ہے پارہ عم میں کثرت سے اس طرح کے اشارات اور انداز پائے جاتے ہیں تاکہ انسانی قلوب خالق کائینات رب العالمین کی طرف متوجہ ہوں کوئی سورہ ایسی نہیں جو دل کو بیدار اور دماغ کو سوچنے پر مجبور نہ کرتی ہو اور کائینات کی طرف قلب انسانی کو متوجہ نہ کرتی ہو اس سورہ میں جن چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے وہ ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ان کے نتائج یکساں نہیں ہیں۔ سورج اور چاند، دن اور رات، آسمان اور زمین ایک دوسرے کے متضاد جوڑے ہیں جن سے انسان واقف ہے جس طرح یہ جوڑے ایک دوسرے کے مخالف اور متضاد ہیں اسی طرح نیکی اور بدی، انسانوں کے نیک اور برے اعمال ایک دوسرے کے مخالف اور متضاد ہیں۔

قسم ہے سورج کی اور اس کی روشنی اور دھوپ کی

ضحٰی سے سورج کی روشنی اور حرارت دونوں مراد ہیں۔ اس کا ایک معنیٰ چاشت کا وقت بھی ہے کیونکہ اس وقت سورج بلند ہوتا ہے اور اس کی روشنی بھی تیز ہوتی ہے موسم سرما میں یہ وقت خوشگوار ہوتا ہے اور گرما میں بھی معتدل ہوتا ہے یہ وقت دوپہر کی سخت گرمی سے پہلے کا وقت ہوتا ہے اس وقت سورج سب سے زیادہ حسین اور نمایاں ہوتا ہے۔

چاند کی قسم جو سورج کے پیچھے آتا ہے سورج کی روشنی میں دن بھر کی مصروفیات کے بعد انسان رات کے پردے میں داخل ہوتا ہے۔ دن بھر کی تھکاوٹ کے بعد اسے آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے آرام کے لیے چاند نمودار ہونے سے رات شروع ہوتی ہے۔ انسان دن کی سخت گرمی کے بجائے ٹھنڈی رات میں چاندنی کی دھیمی دھیمی روشنی سے محظوظ ہوتا ہے۔ چاندنی رات میں اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ چاند کے نور میں تیر رہا ہے اور خوب سیراب ہوکر خدا کی خوشبو اور اس کا جلوہ پا رہا ہے۔ نہ سورج چاند کی حدود میں مداخلت کرتا ہے اور نہ چاند اپنے وقت سے پہلے نمودار ہوتا ہے اس حقیقت کو سورہ یٰسٓ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے لَا الشَّمۡسُ یَنۡۢبَغِیۡ لَہَاۤ اَنۡ تُدۡرِکَ الۡقَمَرَ وَلَا الَّیۡلُ سَابِقُ النَّہَارِ ؕ وَکُلٌّ فِیۡ فَلَکٍ یَّسۡبَحُوۡنَ o (نہ سورج کے بس میں ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن پر سبکت لے سکتی ہے سب اپنے اپنے مدار میں گردش کر رہے ہیں)

قسم ہے دن کی جب وہ سورج کو نمایاں کردیتا ہے اور رات کی جب وہ سورج کو چھپا لیتی ہے۔

دن اور رات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے قرآن اس مختصر اشارے سے انسان کے ذہن کو بیدار کرتا ہے اور اسے اللہ کی واضح نشانیوں کی طرف غور وفکر کرنے کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ دن کی مشغولیات اور مصروفیات سے فارغ ہوکر انسان رات کی آرام گاہ میں داخل ہوجاتا ہے۔ دن کی شدید گرمی اور کام کی مشغولیات سے تھکے ماندے انسان کو رات میں آرام نصیب ہوتا ہے اگر اللہ نے رات کا انتظام نہ کیا ہوتا تو انسان رات دن کام کرنے سے گریز نہ کرتا کیونکہ اس کے نفس میں ایسی خصوصیات پائی جاتی ہے جو اسے ہمیشہ مقابلہ آرائی (competition) میں مشغول رکھتی ہے جس کی وجہ سے انسان کو لمحہ بھر آرام کرنے کی فرصت نہ ملتی لیکن اس پر اللہ کا احسان ہے کہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے رات کا انتظام کیا، جس میں داخل ہوکر انسان آرام کرکے اپنی تھکاوٹ دور کرسکتا ہے اور سکون حاصل کرسکتا ہے۔ رات ایک ایسا پردہ ہے جو ہر چیز کو ڈھانکتا اور چھپاتا ہے۔ رات کا منظر نفس انسانی پر بہت اثرانداز ہوتا ہے۔ دن اور رات کی گردش میں اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کی ہم آہنگی اور باہمی سازگاری سے ان کی بقا برقرار ہے۔ اگر یہ تعمیل ارشاد کے بجائے سرکشی کا رویہ اختیار کریں۔ ایک دوسرے سے آگے پیچھے آنے کی حرکت کریں تو یہ ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر تباہ ہوجائیں گے اور یہ کہ دن اور رات متضاد ہیں پھر بھی ان میں اختلاف کی صورت نظر نہیں آتی کیونکہ ان کے اختلاف کے باوجود خالق کائینات نے ان میں توافق اور توازن رکھا ہے اس لیے ان میں سے کوئی بھی ان حدود کی خلاف ورزی نہیں کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مقرر کر رکھی ہیں۔ ان قسموں کے ذریعے انسان کو اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جس طرح آفاقی مخلوق اللہ کے مقرر کردہ قانون کی پابند ہے اسی طرح تم بھی ان قوانین کی پابندی اور پاسداری کرو جو اللہ نے آپ کے لیے وضع کردیے ہیں۔ جس طرح اللہ کے مقرر کردہ قانون کی خلاف ورزی سے اَجرامِ سماوی تباہ ہوسکتے ہیں اسی طرح اللہ کے مقرر کردہ قانون کو توڑنے اور حدود کو پھاندنے سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب الیم کا نازل ہونا اٹل ہے۔

وَالسَّمَاءَ وَمَا بَنَاهَا(۵)

قسم ہے آسمان کی اور اس کے بنانے والے کی

وَالْأَرْضِ وَمَا طَحَاهَا(٦)

قسم ہے زمین کی اور اس کے پھیلانے والے کی

وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا(٧)

قسم ہے نفس انسانی کی اور اسے ہموار کرنے والے کی

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا(٨)

پھر اس پر بدی اور پرہیزگاری الہام کردی

آسمان کے بنانے والے اور زمین کو بچھانے والے کی قسم کھائی گئی ہے۔ آسمان اور زمین کے قسموں سے اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کی کاری گری کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ آسمان ایک گنبد کی طرح ہمارے اوپر سایہ کیے ہوئے ہے ۔ اس کے اندر کروڑوں ستارے اور سیّارے بکھرے ہوئے ہیں جو اپنے اپنے مدار میں گردش کررہے ہیں۔ آسمان کی حقیقت سے انسان آج تک پوری طرح واقف نہیں ہے۔ یہ ایک لامحدود اور وسیع مخلوق ہے جس کی وسعت اللہ کے بغیر کسی کو معلوم نہیں ہے۔ آج تک اس کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے صرف ایک اندازہ ہے حقیقت صرف اللہ کو معلوم ہے موجودہ زمانے کے سائنسی علوم کے مطابق آسمان کوئی ٹھوس چیز نہیں ہے یہ ایک لامحدود ایریا ہے جس میں گیس وغیرہ پایا جاتا ہے اور سائنس دانوں کے ایک اندازے کے مطابق آسمان میں موجود تمام اجرام فلکی ان ہی گیسوں سے بنے ہوئے ہیں۔ کائینات میں ایک ایسا نظام ہے جس میں یہ سارے اجرام فلکی ایک دوسرے کی کشش سے پیدا ہوئے ہیں اور ہر ایک کے لیے اپنا اپنا راستہ مقرر ہے اور ہر ایک اپنے اپنے راستے پر چل رہا ہے۔ کچھ ایسے ستارے بھی ہیں جو ایک ہی مخصوص جگہ پر رکے ہوئے ہیں اور سائنس کے مطابق سیاروں کو اپنی روشنی نہیں ہے بلکہ یہ سورج سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔ یہ سیّارے جن میںہماری زمین بھی شامل ہے، اپنے اپنے مدار (orbit) یعنی گردش کے راستے پر تیر رہے ہیں۔ کائینات کی ان مخلوقات کی حقیقت کیا ہے یہ صرف اللہ کو معلوم ہے لیکن اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا ہے کہ ان مخلوقات کو کوئی قرار وثبات نہیں یعنی یہ ہمیشہ باقی رہنے والی مخلوقات نہیں ہیں۔ ان تمام چیزوں کے بارے میں جو بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کا ہاتھ کائینات کی اس عظیم تعمیر کو بکھیرنے سے روکے ہوئے ہے۔

قرآن اس بات کی گواہی دیتا ہے

اِنَّ اللّٰہَ یُمۡسِکُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ اَنۡ تَزُوۡلَا ۚ وَلَئِنۡ زَالَتَاۤ اِنۡ اَمۡسَکَہُمَا مِنۡ اَحَدٍ مِّنۡۢ بَعۡدِہٖ (سورہ فاطر: ۴۱)

بے شک اللہ ہی آسمانوں اور زمین کو ٹل جانے سے روکے ہوئے ہے۔ اگر وہ ٹل جائیں تو اللہ کے بغیر انہیں کوئی نہیں روک سکتا ہے۔

یہ ہے وہ واحد یقینی علم جو اللہ نے انسان کو دیا ہے باقی سب علوم نظریات اور افکار پر مبنی ہیں جس پر حتمی طور یقین کرنا صحیح نہیں ہے۔

آسمان کو قائم کرنے کی قسم کے بعد زمین کے بچھانے کی قسم ہے یعنی زمین کو اللہ نے فرش کی طرح بچھایا اور ہموار کردیا۔ یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ زمین کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایسی خصوصیات رکھی ہیں جن پر تمام جانداروں کی زندگی کا دارومدار ہے۔ اس نے زمین پر آکسیجن، نائٹروجن اور دیگر قسم کی گیسیں (gases) پیدا کی ہیں اس نے زمین کو ہوا سے بھردیا ان چیزوں کی بدولت زمین میں رہنے والے جانداروں کا زندہ رہنا ممکن ہے۔ زمین پر پانی کے دریا بہتے ہیں اور بڑے بڑے سمندر موجود ہیں سمندروں کے پانی سے بخارات اٹھتے ہیں جو پانی برساتے ہیںیہ پانی انسانوں اور دیگر تمام جانداروں اور پیڑپودوں کے لیے زندہ رہنے کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح زمین پر جانداروں کے زندہ رہنے کے لیے پانی کا انتظام کیا اور سورج کی گرمی سے جانداروں کی زندگی کو فروغ بخشا یہ ایک حیران کن نظام ہے اس آفاقی نظام پر اگر انسان ٹھنڈے دل سے غور کرے تو اس کے لیے اپنے خالق کو پہنچاننے میں کوئی مشکل پیش نہ آئے گی، اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کے درمیان توازن (balance) اور مناسبت قائم کر رکھی ہے۔ کائینات میں اس کےپیدا کردہ نظام اور اس کے منصوبوں اورتدابیر سے ہی زمین پر جانداروں کی زندگی قائم ہے۔ اگر ان خصوصیات میں سے ایک بھی خصوصیت موجودنہ ہوتی تو زمین پر زندگی کا وجودنہ ہوتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالْأَرْضَ بَعْدَ ذَٰلِكَ دَحَاهَا o أَخْرَجَ مِنْهَا مَاءَ هَا وَمَرْعَاهَا o

(النازعات:۳۰، ۳۱)

(اور زمین کو اس نے بچھایا اوراس کے اندر سے اس کا پانی اور چارہ نکالا۔) یہ زمین کی سب سے بڑی خصوصیات میں سے ہے جسے اللہ نے زمین کے اندرپیدا کردیا۔ اس لیے زمین کی ان خصوصیات کی طرف جن پر زندگی کا دارمدار ہے، انسان کو غور وفکر کرنے کی یاد دہانی کی جاتی ہے۔

نفس انسانی کی قسم

یہ آیات سورہ بَلَدُ کی آیت وَهَدَيْنٰهُ نَجْدَيْنِ ہم نے اسے دو بلند راہیں دکھلائیں اور سورہ دہر کی آیت إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيْلَ إِمَّا شَاكِراً وَإِمَّا كَفُوراً۔ ہم نے اسے راہ دکھائی اب چاہے وہ شکرگزار بنے یا ناشکرا بنے، کے ساتھ ملکر انسان کی نفسیات کے نظریہ کو واضح کرتی ہیں۔ ان آیات کا ربط سورہ مدثر کی آیت(۳۸) سے بھی ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ۔ ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے میں رہن (ذمہ دار اور جواب دہ) ہے اور یہ آیت سورہ رعد کی اس آیت سے بھی مربوط ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

إِنَّ اللهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ۔

ان آیات سے پوری طرح واضح ہوجاتا ہے کہ انسان کو دوہری فطرت کا وجود بخشا گیا ہے۔ اسے اللہ نے خیر و شر اور ہدایت وگمراہی کی دونوں صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ وہ خیر وشر میں تمیز کرنے پر قادر ہے۔ خیر و شر کے دونوں پہلووں پر اسے یکساں قدرت حاصل ہے اور اسی قدرت کو اللہ نے الہام سے تعبیر کیا ہے۔

نفس انسانی کو ہموار کرنے سے مراد یہ ہے کہ انسان کو ایسا جسم عطا کیا گیا جو انسانی زندگی بسر کرنے کے لیے موزون ترین ہے۔ انسان کو کام کرنے اور چلنے کے لیے ہاتھ پاؤں دیئے دیکھنے کے لیے آنکھیں، سننے کے لیے کان، کھانے کے لیے مُنہ، غذا چبانے کے لیے دانت اور بولنے کے لیے زبان جیسے بہترین اعضا عطا کئے اور ان سب کو کنٹرول کرنے کے لیے اسے ایک بہت بڑی نعمت دماغ سے نواز گیا اسے عقل بخشی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دی جس کی وجہ سے اسے تمام حیوانوں پر برتری حاصل ہوئی۔ اسے قوت تعقّل وتفکر، قوت استدلال، قوت حافظہ، قوت تمیز، قوت فیصلہ، قوت ارادی اور دیگر بہت ساری ذہنی قوتیں عطا کیں جن کی بدولت وہ دنیا میں باصلاحیت وقابل کار، ہوشیار اور ہونہار ترین مخلوق بنا اور ان خصوصیات کی بدولت وہ تمام مخلوقات پر حاوی ہوگیا اور اشرف المخلوقات ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ ہموار کرنے کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ اسے پیدائشی اور جبلی طور پر غلط کار یا نیکوکار نہیں بنایا گیا بلکہ اسے راست اور سیدھی فطرت میں پیدا کیا گیا اس کی ساخت میں کوئی فطری کج روی نہیں رکھی گئی یعنی وہ صحیح راہ اختیار کرنا چاہے تو کرسکتا ہے اور غلط راہ اختیار کرنا چاہیے تو کرسکتا ہے۔

سورہ روم میں اس کی پیدائش کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

فِطۡرَتَ اللّٰہِ الَّتِیۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیۡہَا۔ (آیت:۳۰) قائم ہوجاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اس بات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں یوں فرمایا ہے کہ کوئی بچہ ایسا نہیں ہے جو فطرت کے سوا کسی اور چیز پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اُسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنادیتے ہیں۔

پھر اس پر بدی اور پرہیزگاری الہام کردی گئی

انسان کی پوشیدہ فطری صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر عقل و فہم کی ایک ایسی قوت رکھی ہے جو اسے عمل کرنے میں راہنمائی کرتی ہے۔ عمل کرنے کی ذمہ داری اور جوابدہی کا دارومدار اسی قوت پر ہے جس شخص نے نفس کا تزکیہ کرنے کے لیے اس قوت کا استعمال کیا وہ کامیاب ہوا اور جس نے عقل کی اس قوت کو برائیوں میں مبتلا ہونے کے لیے استعمال کیا وہ نامراد اور ناکام ہوا۔

کسی تصور یا کسی خیال کا غیر ارادی طور پر انسان کے دل و دماغ میں اتر جانے کو اصطلاحی معنی میں الہام کہتے ہیں۔ ہر انسان کے لاشعور میں اللہ تعالیٰ نے یہ تصورات اور خیالات ودیعت کردیے ہیں کہ اچھائی کیا ہے اور برائی کیا ہے اور اچھے اخلاق و اعمال اور برے اخلاق و اعمال یکساں نہیں ہوتے ہیں۔ فجور یعنی بدکرداری ایک حیوانی صفت ہے اور تقویٰ یعنی برائیوں سے اجتناب ایک ملکوتی صفت ہے۔ یہ تصورات انسان کی فطرت میں موجود ہیں اور اس کے خالق نے برے اور بھلے کی تمیز پیدائیشی طور پر اس کو عطا کردی ہے۔ سورہ قیامہ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ انسان کے اندر نفس لوامہ موجود ہے جسے آج کی اصطلاح میں ضمیر کہتے ہیں۔ جو برائی کرنے پر اسے ملامت کرتا ہے اور ہر انسان خواہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے مگر وہ اپنے آپ کو خوب جانتا ہے۔

یہ فطری الہام اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق پر اس کی حیثیت اور نوعیت کے لحاظ سے ودیعت کیا ہے۔ جیسا کہ سورہ طٰہٰ میں ارشاد ہوا۔ الَّذِیٓ أَعۡطَىٰ كُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَهُۥ ثُمَّ هَدَىٰ۔ جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت عطا کی پھر راہ دکھائی۔ مثلاً حیوانات کی ہر نوع (species) کو اس کی ضروریات کے مطابق الہامی علم دیا گیا جس کی بنا پر مچھلی کو اپنے آپ تیرنا، پرندے کو اڑنا، شہد کی مکھی کو چھتہ بنانا اور چڑیا کو گھونسلا بنانا آتا ہے۔ انسان کو بھی الگ الگ قسم کے الہامی علوم دیئے گئے ہیں۔ انسان کا بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو الہامی علم کی مدد سے وہ پیدا ہوتے ہی ماں کے تھن میں منہ لگا کر دودھ چوستا ہے۔ دودھ چوسنے کا یہ فن بچے کو کسی نے نہیں سکھایا ہے بلکہ یہ فن اللہ تعالیٰ نے اسے الہام کردیا ہے۔ اس کے علاوہ انسان کے وجود میں ایک اخلاقی قوت بھی ہے۔ جس سے اللہ تعالیٰ نے اسے خیر و شر کا امتیاز الہامی طور پر عطا کیا ہے۔ یہ امتیاز ایک عالمگیر حقیقت ہے جس کی بنا پر دنیا میں کبھی کوئی انسانی معاشرہ خیر و شر کے تصورات سے خالی نہیں رہا ہے اور نہ کوئی ایسا معاشرہ تاریخ میں کبھی پایا گیا جس کے نظام نے بھلائی اور برائی، جزا اور سزا کی کوئی نہ کوئی صورت اختیار نہ کی ہو۔ اس چیز کا ہر زمانے میں پایا جانا اس کا فطری اور الہامی ہونے کا ثبوت ہے۔

قَدۡ أَفۡلَحَ مَن زَكَّىٰهَا(۹)

یقینا فلاح پاگیا وہ جس نے نفس کو پاک کیا

وَقَدۡ خَابَ مَن دَسَّىٰهَا(۱۰)

اور یقینا نامراد ہوگیا وہ جس نے اسے خاک میں ملادیا

یہاں انسان کے بارے میں قرآن کا نقطۂ نظر انتہائی اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ یہ نقطۂ نظر انسان کی قدر و قیمت کو بلند کرتا ہے اور واضح کرتا ہے کہ انسان اللہ کی طرف سے مقرر کردہ بھلائی اور برائی کے راستوں میں جو راہ بھی اختیار کرے گا اس کی ذمہ داری اس پر آئے گی اس نقطۂ نظر سے

اسے انتخاب و اختیار کی آزادی حاصل ہے اور یہ آزادی اللہ تعالیٰ کی مشیت کے فریم ورک (frame work) کے اندر ہے جس کی مرضی ہے کہ انسان جس راہ کو پسند کرے اس راہ کو اختیار کرنے کی اسے آزادی ہے اور یہی اختیار کی آزادی انسان کے وجود کو بزرگ مقام عطا کرتی ہے اور اس نقطہ نظر سے انسانی وجود کو اس کائینات میں بلند مرتبہ حاصل ہے جو یقینا اس مخلوق کے شایان شان ہے جس میں اللہ نے اپنی روح پھونکی اور جسے دنیا کی تمام مخلوقات پر فضیلت و برتری بخشی۔

اب اس حقیقت پر غور کریں جس پر درج بالا قسمیں کھائی گئی ہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام چیزیں آپس میں متضاد ہیں جن کی قسم کھائی گئی۔ قران مجید میں اللہ تعالیٰ کا قاعدہ یہ ہے کہ جن حقائق کو وہ انسان کے ذہن نشین کرانا چاہتا ہے ان کی شہادت میں وہ سامنے کی چند ایسی نمایاں چیزوں کو پیش کرتا ہے جو ہر آدمی کو اپنے اردگرد کی دنیا میں یا خود اپنے وجود میں نظر آتی ہیں۔ اس قاعدے کے مطابق یہاں دو چیزوں کو ایک دوسرے کے مقابلے میں پیش کیا گیا ہے جو ایک دوسرے کے متضاد ہیں اس لیے ان کے آثار اور نتائج بھی یکساں نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد ہیں۔ آیت ۱ ، تا ٦ ، کے مضامین پر ایک بار پھر نظر دوڑادیں تو بات بالکل واضح ہوجاتی ہے۔ ان آفاقی شہادتوں کو پیش کرنے کے بعد انسانی نفس کی حقیقت کو واضح کردیا گیا ہے اس کے اعضا ہموار کرکے اور اسے ذہنی قوتیں عطا کرکے اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر بھلائی اور برائی دونوں کے رجحانات رکھ دئے ہیں جو ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ واضح رہے کہ کچھ لوگوں نے اپنے بنائے ہوئے بے اصل فلسفوں کی بنا پر خیر و شر کے اپنے معیار تجویز کرلئے ہیں۔ مثلاً کوئی کہتا ہے کہ کوئی چیز اچھی یا بری نہیں یہ صرف انسان کی سوچ ہے جو کوئی چیز بری مانی جاتی ہے اور کوئی چیز اچھی مانی جاتی ہے۔

(.Nothing is good or bad thinking makes it so)

لیکن اس کے باوجود انسان اچھی چیز کو قابل قدر سمجھتا ہے اور اس کی تعریف کرتا ہے اور اس کے برعکس بری چیز کو وہ قابل مذمت سمجھتا ہے اور اسے سزا کی مستحق قرار دیتا ہے۔ تزکیہ کے معنی ہیں پاک کرنا، نیکیوں کی طرف ابھارنا اور نشوونما دینا یعنی جو اپنے نفس کو برائیوں سے پاک کرے، اس کو تقویٰ کی بلندی پر لے جائے، اس کے اندر بھلائیوں کو نشو ونما دے اور برائیوں کو دور کرے وہ فلاح پائے گا۔ یعنی وہ کامیاب ہوجائے گا اس کے برعکس جو شخص اپنے نفس کے اندر پائے جانے والے نیکی کے رجحانات اور جذبات کو نشو ونما دینے کے بجائے دبادے گا اور اپنے نفس کو برائیوں کی طرف لے جائے گا اور برائیوں کو اس پر غالب کردے گا اور تقویٰ یعنی بھلائیوں کا رجحان اس کے نیچے اس طرح چھُپ کر رہ جائیں گے جیسے ایک لاش کو قبر میں چھپایا جاتا ہے۔ ایسا شخص ناکام اور نامراد ہوگا۔ یہاں یہ بنیادی بات واضح رہے کہ بندہ تقویٰ اور تزکیہ کی صرف خواہش کرسکتا ہے مگر اس کا حاصل ہونا اللہ کی توفیق پر منحصر ہے۔ اسی طرح اللہ کسی نفس کو زبردستی برائیوں میں مبتلا نہیں کرتا بلکہ جب بندہ خود برائیوں کی طرف متوجہ اور مبتلا ہوجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے تقویٰ اور تزکیہ کی توفیق سے محروم کردیتا ہے اور اسے اپنے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔ پھر اگر وہ اپنے نفس کو شیطان کے حوالے کردیتا ہے تو اس کے لیے وہ خود ذمہ دار ہے اور اس کا معاملہ اس کے اپنے ہاتھ میں ہے البتہ مشیت الٰہی کے فریم ورک کے اندر ہی وہ پرہیزگاری اور تقویٰ کے احساسات اور جذبات کو نشو ونما دے سکتا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر انسان کو ہمیشہ یہ خیال رہ سکتا ہے کہ اس کا معاملہ خدا کے اس منصوبہ کے تحت خود اس کے رویہ کے ذریعہ ہی پایہ تکمیل کو پہنچے گا اور اسے اس آیت کی مدعا پورا کرنے کی توفیق مل سکے گی۔ خدائے واحد بزرگ و برتر فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَایُغَیِّرُ مَابِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْ امَابِاَنْفُسِہِمْ۔ ''بلا شبہ اللہ کسی گروہ کے سلسلے میں اپنی روش نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنے بارے میں اپنی روش نہ بدلے'' اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے کہ انسان خدا کی ہدایت اور اس کے پیمانوں کا محتاج ہے۔ ان ہدایات اور پیمانوں کو اپنانے کے بعد ہی وہ اس بات پر یقین کرسکتا ہے کہ اس کی خواہشاتِ نفس اس کو دھوکہ نہ دے سکیں گی اور نہ وہ ان کے پھندے میں آسکے گا اور نہ وہ ان لوگوں میں شامل ہوجائے گا جو اپنی خواہشات کو اپنا خدا بناتے ہیں۔ بلکہ وہ خدا کے قریب آسکے گا اور اس کی بتائی ہوئی راہ پر گامزن ہوگا اور گمراہیوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے کے بجائے نور ہدایت سے روشنی حاصل کرے گا۔

اب ایک تاریخی حقیقت کی نظیر پیش کی جاتی ہے جس میں واضح کردیا گیا ہے کہ فجور و تقویٰ کا یہ علم جو انسان پر الہام کردیا گیا ہے اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ ہر شخص خود ہی اس الہامی علم سے مکمل ہدایت حاصل کرسکے بلکہ اس غرض کے لیے اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے سے انبیاء علیہم السلام کو ہدایت دی جس میں وضاحت کی گئی ہے کہ فجور کا اطلاق کن کن چیزوں پر ہوتا ہے جن سے انسان کو بچنا چاہیے اور تقویٰ کیا ہے اور وہ کیسے حاصل ہوسکتا ہے۔ اگر انسان وحی کے ذریعے سے آنے والی اس واضح ہدایت کو قبول نہ کرے تو نہ وہ فجور سے بچ سکتا ہے اور نہ تقویٰ کا راستہ پاسکتا ہے۔ نفس کو فجور یعنی برائیوں سے پاک کرنے اور تقویٰ حاصل کرنے کا نتیجہ فلاح یعنی کامیابی ہے اور اس کے پاک اور اچھے رُجحانات کو دبا کر فجور یعنی برائیوں میں غرق کردینے کا نتیجہ نامرادی، ہلاکت اور بربادی ہے۔

اسی بات کو سمجھانے کے لیے قوم ثمود کی ایک تاریخی مثال پیش کی گئی ہے جس سے اہل مکہ واقف تھے۔ اس قوم نے اپنے نفس کو خاک میں ملادیا تھا اور ہدایت الٰہی سے محروم ہوچکے تھے۔ انہوں نے خدا کی نافرمانی اور اعمال بد سے اپنے نفس کو آلودہ کردیا تھا۔ ان کے پاس جب خدا کا رسول خدا کا پیغام لے کر آیا تو انہوں نے اسے جھٹلایا۔

كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوَاهَا(١١)

ثمود نے اپنی سرکشی کی بنیاد پر جھٹلایا

إِذِ انبَعَثَ أَشْقَاهَا(١٢)

جب بپھر کر اٹھا ان کا سب سے بڑا بدبخت شخص

فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللَّهِ نَاقَةَ اللَّهِ وَسُقْيَاهَا(١٣)

تو اللہ کے رسول نے ان سے کہا کہ خبردار رہنا اللہ کی اونٹنی اور اس کی پانی کی باری سے

فَكَذَّبُوهُ فَعَقَرُوهَا فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُم بِذَنبِهِمْ فَسَوَّاهَا(۱۴)

مگر انہوں نے اللہ کے رسول کو جھٹلایا اور اونٹنی کو ہلاک کردیا۔ آخر کار ان کے رب نے ان کے گناہوں کی پاداش میں ان پر تباہی وبربادی نازل کردی اور ان سب کو ہلاک کرکے برابر کردیا۔

وَلَا يَخَافُ عُقْبَاهَا(۱۵)

اور اسے (اللہ) کو اس کے برے نتیجہ کا کوئی خوف نہیں ہے۔

حضرت صالح علیہ السلام کو قوم ثمود کی ہدایت کے لیے بھیجا گیا تھا لیکن یہ لوگ سرکشی کی وجہ سے ان برائیوں کو چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے جن میں وہ بتلا تھے اور نہ وہ حضرت صالحؑ کی دعوت قبول کرنے کے لیے آمادہ ہوئے جس کے لیے انہیں ان لوگوں کے پاس بھیجا گیا تھا۔ قوم ثمود اور اس کے نبی حضرت صالح علیہ السلام کا قصہ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر آچکا ہے یہاں جس بات کا خصوصیت سے تذکرہ ہے وہ یہ ہے کہ ثمود نے اپنی سرکشی کے باعث اپنے نبی کو جھٹلایا۔ دوسرے مقامات پر اس کی تفصیل یہ بتائی گئی ہے کہ ثمود کے لوگوں نے حضرت صالح کو چلینج (challange) دیا تھا کہ اگر تم سچے ہو تو اپنے آپ کو نبی ثابت کرنے کے لیے معجزہ کے طور پر کوئی نشانی پیش کرو۔ اس پر حضرت صالحؑ نے ایک اونٹنی کو معجزے کے طور پر ان کے سامنے حاضر کردیا اور ان سے کہا کہ اونٹنی اللہ کی نشانی ہے یہ جہاں چاہیے چرتی پھرے گی اور ایک دن آپ کے کنویں کا سارا پانی اس کے لیے مخصوص ہوگا اور دوسرا دن تم سب کے لیے اور تمہارے جانوروں کے لیے رہے گا۔ اگر تم نے اس اونٹنی کو ہاتھ لگایا تو یاد رکھو کہ تم پر سخت عذاب نازل ہوجائے گا پھر انہوں نے ایک سرکش اور شریر سردار کی رہنمائی میں اس اونٹنی کو مار ڈالا۔ اونٹنی کو مارنے والا اگرچہ ایک بدبخت انسان تھا لیکن پوری قوم پر اس کی ذمہ داری عائد ہوئی اور فرمایا گیا کہ اس قوم نے اونٹنی کو مار ڈالا۔ یہ اس لیے فرمایا گیا ہے کیونکہ پوری قوم اس اونٹنی کو ہلاک کرنے میں ملوث (involve) تھی۔ اسلام کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں احکام الٰہی کی تعمیل کرنا اور ان احکام کے مخالفوں کا سامنا کرنا پوری قوم کی اجتماعی ذمہ داری ہے اگرچہ آخرت کی زندگی میں ہر فرد اپنی سزا یا جزا کے لیے خود ذمہ دار ہے اور کوئی کسی کا بوجھ نہ اٹھائے گا: لَاتَزِرُوَازِرَةٌ وِزۡرَ اُخۡرٰی۔ لیکن ایک دوسرے کو نصیحت کرنا، ایک دوسرے کی کفالت کرنا، نیکی پر ایک دوسرے کو ابھارنا، ظلم و ستم اور سرکشی کو روکنا ہر شخص کی ذمہ داری ہے اور اس ذمہ داری کو ترک کرنا ایک بہت بڑا گناہ ہے۔ اس لیے قوم ثمود کے ہر فرد کی ذمہ داری تھی کہ اس بدبخت شخص کو روکنا لیکن ایسا نہ ہوا اس لیے یہ سب لوگ اس جرم عظیم میں ملوث قرار پائے اور پوری قوم کو خاک میں ملادیا گیا۔ جب پوری قوم اس طرح کی گمراہی میں بتلا ہوچکی تھی تب عذاب الٰہی اور دست قدرت نمودار ہوا اور اس سرکش قوم کو عذاب اَلیم میں پکڑ لیا۔

آخر کار ان کے رب نے ان کے گناہوں کے پاداش میں انہیں سخت عذاب دیا اور ان سب کو ملیا میٹ کر کے برابر کر دیا۔

سورہ اعراف میں فرمایا گیا ہے کہ اونٹنی کے مارنے کے بعد ثمود کے لوگوں نے حضرت صالحؑ سے کہا کہ اب لے آؤ وہ عذاب جس سے تم ہمیں ڈراتے تھے اور سورہ ہود میں فرمایا گیا ہے کہ حضرت صالحؑ نے ان سے کہا تین دن اپنے گھروں میں مزے کرو اس کے بعد عذاب آجائے گا اور یہ ایسی تنبیہ ہے جو جھوٹی ثابت نہ ہوگی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قوم ثمود کے لوگوں میں گمراہی نے جڑیں اتنی مضبوط کر دی تھیں کہ انہوں نے رسول کی طرف سے عذاب آنے کی خبر کو جرأت مندانہ اور متکبرانہ انداز میں جھٹلا کر مسترد کر دیا۔ اور رسول سے مذاق کیا کہ کب آئے گا وہ عذاب جس سے آپ ہمیں ڈراتے ہیں۔ اِس سے اُس قوم کی سرکشی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کس طرح وہ عذاب الٰہی سے بے خوف اور نڈر تھے۔ آخر کار اللہ کے عذاب نے انہیں پکڑ لیا اور ان سب کو اس طرح ملیا میٹ کر دیا کہ ان کی اونچی اونچی عمارتیں زمین بوس کر کے برابر اور ہموار کر دی گئیں۔

اللہ کو اس کے برے نتائج کا کوئی خوف نہیں

اللہ تعالیٰ خوف سے پاک و برتر ہے وہ ذات مقدس کسی سے کیا ڈرے گی اور کسی سے کیا خوف کھائے گی جس ذات عظیم نے ان تمام ڈرانے والوں اور خوف دلانے والوں کو پیدا کیا ہے جو اس خالق برحق کے رحم و کرم پر سانسیں لے رہے ہیں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ دنیا کے باشاہوں اور حکمرانوں کی طرح نہیں ہے کہ وہ کسی قوم کے خلاف یا کسی فرد کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کے وقت یہ سوچنے پر مجبور ہو کہ اس اقدام کے نتائج کیا ہوں گے۔ اللہ کا اقتدار سب سے بالا ہے اور سب اس کی حکومت میں اس بادشاہ سے اپنی جان کی بھیک مانگ رہے ہیں جس نے انہیں پیدا کیا ہے۔ اس لیے اس خالق حقیقی کو کوئی اندیشہ نہ تھا کہ ثمود کی حامی کوئی طاقت بدلہ لینے کے لیے آئے گی۔

سُوۡرَۃُ الَیۡل مکیۃ

اٰیتُہا:21 رکوعھا:1

بسم اللہِ الرَّحمٰن الرَّحیم

وَاللَّیلِ إِذَا یَغْشَیٰo وَالنَّہَارِ إِذَا تَجَلَّیٰo وَمَا خَلَقَ الذَّکَرَ وَالْأُنثَیٰo إِنَّ سَعْیَکُمْ لَشَتَّیٰo فَأَمَّا مَنْ أَعْطَیٰ وَاتَّقَیٰo وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَیٰo فَسَنُیَسِّرُہُ لِلْیُسْرَیٰo وَأَمَّا مَن بَخِلَ وَاسْتَغْنَیٰo وَکَذَّبَ بِالْحُسْنَیٰo فَسَنُیَسِّرُہُ لِلْعُسْرَیٰo وَمَا یُغْنِي عَنْہُ مَالُہُ إِذَا تَرَدَّیٰo إِنَّ عَلَیْنَا لَلْہُدَیٰo وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَۃَ وَالْأُولَیٰo فَأَنذَرْتُکُمْ نَارًا تَلَظَّیٰo لَا یَصْلَاہَا إِلَّا الْأَشْقَیo الَّذِي کَذَّبَ وَتَوَلَّیٰo وَسَیُجَنَّبُہَا الْأَتْقَیo الَّذِي یُؤْتِي مَالَہُ یَتَزَکَّیٰo وَمَا لِأَحَدٍ عِندَہُ مِن نِّعْمَۃٍ تُجْزَیٰo إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْہِ رَبِّہِ الْأَعْلَیٰo وَلَسَوْفَ یَرْضَیٰo

پس منظر:

یہ سورہ مظاہر کائینات کی روشنی میں انسانی عمل کے جزا و سزا کی حقیقت واضح کرتا ہے۔ یہ سورہ سورہ شمس کے مشابہ ہے اور یہ دونوں سورتیں ایک دوسری کی تفسیر محسوس ہوتی ہیں کیونکہ تقریباً ایک ہی بات دونوں سورتوں میں الگ الگ طریقے سے سمجھائی گئی ہے۔ سورہ کا موضوع انسان کی دو مختلف راہیں اور ان مختلف راہوں پر چلنے کا الگ الگ انجام ہے۔ ان دو راستوں میں ایک راستہ ہدایت کا ہے جس پر چلنے کا انجام آخرت کی کامیابی ہے اور دوسرا راستہ گمراہی کا راستہ ہے جس کے اختیار کرنے سے انسان آخرت میں تباہی اور بربادی کا شکار ہوتا ہے۔ سورہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں بتایا گیا ہے کہ انسان دنیا میں جو کام کررہا ہے وہ اصولاً اُسی طرح مختلف ہیں جس طرح دن اور رات اور نر اور مادہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

راہ ہدایت پر چلنے والوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اللہ پر ایمان لاتے ہیں۔ اس کے احکام کی پوری طرح تعمیل کرتے ہیں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اور پرہیزگاری کی زندگی اختیار کرتے ہیں اور بھلائی کا کام کرتے ہیں۔ اس کے برعکس گمراہی کا راستہ اختیار کرنے والوں کا طرز عمل یہ ہے کہ وہ اللہ پر ایمان نہیں لاتے ہیں اس کی نافرمانی کرتے ہیں۔ اس سے نہیں ڈرتے ہیں، بے راہ روی کی زندگی اختیار کرتے ہیں اور بھلائی کا کام کرنے کے بجائے فتنہ و فساد برپا کرتے ہیں۔ مسکینوں اور محتاجوں کی مدد کرنے کے بجائے ان کا مال ہڑپ کرتے ہیں۔ خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے میں بخل کرتے ہیں۔ انہیں اللہ کی رضا یا ناراضگی کی کوئی پرواہ نہیں ہے اور یہ لوگ ہر قسم کی بھلائی سے منہ موڑتے ہیں۔ جن مظاہر قدرت کی قسم کھائی گئی ہے وہ ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد ہیں۔ اسی طرح لوگوں کے اعمال کے نتائج مختلف اور متضاد ہیں۔ ایمان والوں اور عمل صالح کرنے والوں کے طرز عمل کا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی زندگی کے راستوں کو آسان بنادیتا ہے۔ دشوار گزار راستہ ہونے کے باوجود ان کے لیے یہ راستہ آسان بن جاتا ہے جس پر چل کر یہ مومنین خوشی محسوس کرتے ہیں کیونکہ یہ ان کے لیے سلامتی کا راستہ ہے جس قدر یہ اس راستے پر آگے بڑھتے ہیں اس قدر ان کی قدر و منزلت بڑھ جاتی ہے اور ان کے لیے راستہ ہموار، آسان اور روشن ہوجاتا ہے اور ان کے دل اسلام کی نعمت پاکر نور الٰہی سے منور ہوجاتے ہیں۔

گمراہی اختیار کرنے والوں کے طرز عمل کا نتیجہ یہ ہے کہ آہستہ آہستہ ان کے دلوں میں اسلام کی نعمت سے محروم ہونے کی وجہ سے نور الٰہی بجھ جاتا ہے۔ بھلائی کا ہر کام انہیں اجنبی معلوم ہوتا ہے اور برائیوں کی طرف ان کا میلان بڑھ جاتا ہے اور وہ ہر قسم کا بد سے بدتر کام کرنے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں۔ اس طرح وہ ہلاکت کے گڑھے میں گھر جاتے ہیں۔ سورہ میں یہ واضح کردیا گیا ہے کہ دنیا میں انسان کے مختلف طرز عمل کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اس پر احسان کیا ہے کہ اسے صحیح راستے سے باخبر کرنے کے لیے اس کے پاس رسول بھیجے ہیں اور اسے اختیار دیا ہے کہ وہ اللہ کا راستہ اختیار کرتا ہے یا اپنی نفسانی خواہشات کا اتباع کرکے راہ حق سے فرار ہوکر گمراہی کا راستہ اختیار کرتا ہے۔

سورہ کے آخر میں اللہ تعالیٰ لوگوں کو خبردار کرتا ہے کہ جو شخص راہ خدا کو جھٹلائے گا اسے جہنم کی آگ میں دھکیلا جائے گا اور جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائے گا، خدا کی راہ میں مال خرچ کرے گا اور خدا کی بندگی میں مصروف رہے گا ایسے شخص سے اللہ راضی ہوگا اور اسے اپنی نعمتوں سے اس قدر نوازے گا کہ اس کی خوشی اور شادمانی کی حد نہ ہوگی۔

وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَى(١)

قسم ہے رات کی جب کہ وہ چھا جائے

وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلَّى(٢)

اور دن کی جب کہ وہ روشن ہو

وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَى(٣)

اور اس ذات کی جس نے نر اور مادہ پیدا کئے

إِنَّ سَعۡيَكُمۡ لَشَتَّىٰ(۴)

بے شک تمہاری کوششیں مختلف قسم کی ہیں

چونکہ قرآن کریم میں قسمیں بالعموم دلیل اور گواہ کے طور پر آئی ہیں۔ اس سورہ میں بھی تین قسمیں کھائی گئی ہیں۔ ان تین قسموں کے بعد اُس مضمون کو بیان کیا گیا ہے جس کے لیے یہ قسمیں کھائی گئی ہیں کہ انسانوں کی کوششیں مختلف قسم کی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ جس طرح دن اور رات اور نر اور مادہ، مختلف اور متضاد ہیں یعنی ان کے کام اور ان کے اثرات مختلف ہیں اسی طرح دنیا میں انسانوں کی کوششیں مختلف قسم اور مختلف نوعیت کی ہیں۔

رات زمین پر چھاجاتی ہے اور اپنی تاریکی سے اسے چھپالیتی ہے اسی طرح دن روشن ہوجاتا ہے اور اس کی روشنی سے ہر چیز روشن اور ظاہر ہوجاتی ہے۔ یہ ایک دوسرے کی ضد ہیں، خصوصیات میں ایک دوسرے کے برعکس اور آثار ونتائج میں ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے نہ صرف نوع انسانی کو بلکہ تمام انواع کو دو مقابل جنسوں میں پیدا کیا ہے۔

رات کے چھا جانے کی اور دن کے روشن ہوجانے کی قسم کی اہمیت

رات اور دن خدا تعالیٰ کی دو عام اور کھلی نشانیاں ہیں جو انسان کے دل میں ایک خاص کشش رکھتی ہیں اور یہ نشانیاں ان حقائق کی طرف راہنمائی کرتی ہیں جو کائینات کے اندر موجود بے شمار مخلوقات سے منسوب ہیں۔ دن اور رات کی گردش اور ان کی روشنی اور اندھیرے پر اگر انسان غور کرے تو وہ اچھی طرح سے محسوس کرسکے گا کہ دن اور رات کی یہ گردش اور ان کی روشنی اور اندھیرا کائینات کے بارے میں گفتگو کررہے ہیں اور وہ ان مظاہر کے بارے میں باتیں کررہے ہیں جو انسان کے اختیار سے باہر ہیں۔ پھر وہ اس طاقت کی طرف بھی راہنمائی کررہے ہیں جو اس کائینات کے پیچھے ان مخلوقات کو حرکت دے کر اس طرح گردش کراتی ہے جس طرح ایک پہیہ کسی طاقت کے ذریعہ گردش کرتا ہے۔ رات اور دن کی یہ گردش بتاتی ہے کہ کائینات میں ہر دم تغیر و تبدل ہے۔یہاں کسی بھی چیز کو ایک لمحے کے لیے قرار و ثبات نہیں ہے۔ تو انسان اس حقیقت کو کس طرح بھول جاتا ہے کہ اسے ایک لمحے کے لیے زندہ رہنے کی گارنٹی نہیں ہے مگر وہ دنیا کے عیش وآرام سے اس طرح دل لگاتا ہے کہ وہ اپنی موت کو بھی بھول جاتا ہے۔ رات اور دن کے آنے اور جانے پر انسان کو غوروفکر کرنے کی دعوت دی جاتی ہے کہ ایک چھپی ہوئی طاقت ہے جو زمین کی گردش سے دن اور رات وجود میں لاتا ہے اور یہ دن اور رات کی گردش اس حقیقت سے پردہ اٹھاتی ہے کہ جس طاقت (force) نے گردش لیل و نہار کو وجود بخشا ہے وہی طاقت انسانوں کی زندگی کو گردش میں لاتا ہے۔ اس نے انسانوں کوپیدا کرکے فضول زندگی گزارنے کے لیے نہیں چھوڑا ہے اور نہ ہی انہیں بے مقصدپیدا کیا ہے۔ منکرین خدا اور دنیا کو گمراہ کرنے والے مادیت اور مادہ پرستی کے علمبردار اس حقیقت کی مخالفت میں اپنی thesis دے کر حقیقت سے توجہ ہٹانے کی کوشش کے باوجود حقیقت پر غور و فکر کرنے والوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں کیونکہ غور و فکر کرنے والے اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے مجبور ہیں کہ جس خالق نے اس کائینات کوپیدا کیا ہے اور جس کے اختیار میں کائینات کا ذرہ ذرہ ہے اور جو اس کائینات کا منتظم اور مُنصَرِم ہے وہی اس کا مدبّراور مدیر ہے اور جس کی گرفت سے کوئی شئے اور کوئی مخلوق بچ نہیں سکتی ہے۔

اس ذات کی قسم جس نے نر اور مادہ پیدا کئے

دن اور رات کی قسم کے بعد نر اور مادہ کے تخلیق کار یعنی خود ذات باری کی قسم ہے۔ انسانوں اور دیگر دودھ پلانے والے جانوروں کا ذریعہ پیدائش نر اور مادے کا میل ملاپ اور اختلاط ہے۔ نر (male) کا ٹپکا ہوا نطفہ مادہ (female) کے رحم کے اندر استقرار پاتا ہے جب نر کا sperm (مادہ تولید) مادہ کے egg (مادہ تولید) کے ساتھ مل جاتا ہے تو کوئی بچہ نر اور کوئی مادہ کی صورت میں پیدا ہوتا ہے۔ نر اور مادہ کے مادہ تولید کو کون اکھٹا کرتا ہے اور کس طرح کوئی بچہ نر اور کوئی مادہ کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ کس نے ان دونوں مادوں کو ہم آہنگ کیا اور پھر مزید توالُد وتناسل (اولاد پیدا ہونے اور نسل چلانے) کا یہ ذریعہ قائم کیا۔ انسان ذرا غور کرے کہ کس نے پیدائش اور تناسل کے اس اتنے بڑے نظام کو قائم کیا۔ کیا یہ سب کچھ اتفاق ہے۔ ہرگز نہیں کیونکہ اتفاقاً اتنا بڑا نظام قائم ہونا محال ہے۔ اس لیے غور وفکر کرنے کے بعد کوئی صورت نظر نہیں آتی سوائے اس کے کہ نر اور مادہ کی تخلیق کے سلسلے میں ایک منتظم اور مدّبر ہستی کو تسلیم کیا جائے جو حکمت اور ایک پلان کے تحت یہ سب کچھ کر رہی ہے۔ اس لیے اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے کہ یہ کائینات اتفاقاً آپ سے آپ ظہور پذیر نہیں ہوئی بلکہ اس کا ایک خالق ہے وہی جو رب العالمین ہے اور جو فرماتا ہے کہ وَاللہُ خَلَقَ کلَّ دَآبَّۃٍ الخ (التوبہ:۴۵) ''اور اللہ نے ہی پیدا کیا ہر جاندار کو'' اور جس کی خبر دینے کے لیے رسول آئے جنہوں نے انسانوں کو اس حقیقت سے آگاہ اور روشناس کردیا۔

ملحدوں کو آتش توحید سے گرمادیا منکروں کو روشناس حق تعالیٰ کردیا

پھر یہ نر اور مادہ (opposite sex) یعنی جنسی اختلاف انسانوں اور دودھ پلانے والے دوسرے جانوروں تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ تمام زندہ چیزوں میں بشمول نباتات پایا جاتا ہے۔ نر اور مادہ کے جوڑے کے بغیر کسی جاندار، انسان یا حیوان کا پیدا ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ اس کائینات میں صرف ایک ہستی ہے جو واحد اور منفرد ہے اور جو اپنے آپ ہمیشہ سے موجود ہے جس کا کوئی جوڑا نہیں وہ خالق کل شَیئٍ جو تمام چیزوں کو پیدا کرنے والی اللہ سبحان و تعالیٰ کی ذات احدی ہے جس کے مثل کوئی نہیں ہے۔

بے شک تمہاری کوششیں مختلف قسم کی ہیں

یہی وہ حقیقت ہے جس پر رات اور دن، نر اور مادہ کی تخلیق کی قسم کھائی گئی ہے یعنی جس طرح رات اور دن، نر اور مادہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور ان کے نتائج ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ اسی طرح لوگ جن راستوں پر چلنے اور جن مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ بھی اپنی نوعیت کے لحاظ سے مختلف اور نتائج کے لحاظ سے متضاد ہیں۔ انسانوں کی یہ مختلف نوعیت کی کوششیں دو گروپوں میں تقسیم ہوتی ہیں۔ انسان دنیا میں اپنے اختیار سے اپنا راستہ اختیار کرتا ہے کیونکہ اللہ نے اسے نیکی اور بدی کے دونوں راستے دکھائے اور پھر اس اس کی پسند کے مطابق ہی اسے اپنا راستہ چننے کا اختیار بخشا۔ یعنی اسے اپنا کیریر (career) بنانے یا بگاڑنے کی آزادی بخشی ہے۔ ایک آدمی خدا کا راستہ چن لیتا ہے وہ اس راہ پر چلنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے اور اس راہ کے لیے ہر قسم کی تکلیف اٹھاتا ہے اس راہ پر چلنے کے لیے وہ اپنی زندگی کو داؤ پر لگا کر ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور اس راہ میں پیش آنے والی ہر تکلیف اور ہر مصیبت کو صبر کے ساتھ برداشت کرنے کی زحمت اٹھاتا ہے چونکہ اس طرح کا راستہ اختیار کرنے کے لیے اسے اکثر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اسے جانی اور مالی نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔ لیکن وہ یہ سب کچھ اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے برداشت کرتا ہے اس لیے اس کے چہرے پر کبھی ناراضگی یا پریشانی کے آثار دکھائی نہیں دیتے ہیں وہ اس صراطِ مستقیم پر چلنے کے لیے ہمیشہ مطمئن، خوش اور راضی ہوتا ہے اور اللہ اس سے راضی ہوتا ہے۔ خدا کے فرمانبردار بندے نیکی کا راستہ اختیار کر کے ایک ہی قسم کی نیکی کرنے میں نہیں لگ جاتے ہیں۔ اور نہ ہی انہیں ایسا کرنے کے لیے کہا گیا ہے بلکہ جہاں کہیں وہ جس قسم کا بھی نیک کام دیکھتے ہیں اسے بحسن و خوبی انجام دیتے ہیں۔ اس طرح سے خدا کے ان فرمانبردار بندوں کی کوششیں بھی مختلف ہو سکتی ہیں۔ ان کی راہیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ ان کے طریقے مختلف ہو سکتے ہیں، ان کے جذبات مختلف ہو سکتے ہیں لیکن ان کا راستہ خدا کا دکھایا ہوا راستہ ہوتا ہے اور ان کا طریقہ کار نبیؐ کے طریقہ کار پر مبنی ہوتا ہے۔

دوسرا آدمی اپنی نفسانی خواہشات کا راستہ اختیار کر لیتا ہے۔ اور اس پر چلنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے، اسے اگر کبھی تکلیف پہنچتی ہے تو بے صبری کا مظاہرہ کرکے اس تکلیف کو اپنی زندگی اور اپنی عزت کے خلاف سمجھتا ہے۔ وہ اس تکلیف کو کسی بھی صورت میں خدا کی آزمائش نہیں سمجھتا ہے وہ تکلیف پہنچنے پر ناراض ہوکر خدا سے بغاوت کرتا ہے۔ مصیبت کے وقت وہ اپنی زندگی سے بھی ناراض ہوتا ہے چونکہ وہ گمراہی کے راستے پر ہوتا ہے اس لیے وہ صبر کی نعمت سے محروم رہتا ہے اور خوش خلقی کی خوبی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ اسے ہمیشہ میٹھا میٹھا کھانے اور چھاؤں میں رہنے کی عادت ہوتی ہے اور کھٹا تیکھا کھانے اور دھوپ میں رہنے کی تکلیف برداشت کرنے کی اسے عادت نہیں ہوتی ہے۔ اس لیے جب کبھی اسے تکلیف پہنچتی ہے تو وہ سیخ پا ہوجاتا ہے۔

خدا کے فرمانبرداروں کی طرح خدا کے ان نافرمانوں کے راستے بھی مختلف ہوتے ہیں۔ ان کے طریقے بھی مختلف ہوتے ہیں لیکن مومنوں کی طرح ان کا راستہ خدا کا دکھایا ہوا راستہ نہیں ہوتا ہے اور نہ ان کے کاموں میں نبی کا بتایا ہوا طریقہ ہوتا ہے اس لیے ان کے کاموں میں کوئی ایک اصول اور ایک ہی طریقہ کار نہیں ہوتا ہے وہ خدا کی مرضی کے برعکس اپنی مرضی سے کام کرتے ہیں یہ لوگ اپنے نفس کی پیروی کرتے ہیں اور شیطان کے بتائے ہوئے مختلف راستوں پر چلتے ہیں، اس لیے فرمایا گیا کہ انسانوں کی کوششیں مختلف نوعیت کی ہوتی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے: لوگ جب صبح کرتے ہیں تو ان کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ کچھ لوگ اپنے نفس کو خرید کر اسے آزاد کردیتے ہیں اور کچھ لوگ اپنے نفس کو فروخت کرکے اسے ہلاک کردیتے ہیں۔

فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ (٥)

جس نے (اللہ کی راہ میں) مال دیا اور نافرمانی سے بچتا رہا

وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ (٦)

اور بھلائی کو سچ مانا

فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى(۷)

ہم اسے آسان راستے کے لیے سہولت دیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص راہ خدا میں اپنا مال خرچ کرتا ہے، خدا سے ڈرتا ہے اور اس کی نافرمانی سے بچتا رہتا ہے، اچھے عقیدے کی تصدیق کرتا ہے اور راہ خدا کو اختیار کرتا ہے۔ اپنے نفس کے تزکیہ اور اپنی ہدایت و تربیت کے سلسلے میں وہ سب کچھ کر گزرتا ہے جو اس کے بس میں ہوتا ہے اور پھر اپنی منزل کو پاکر خدا کی عطا کردہ توفیق اور اپنے مستقل ارادوں کے طفیل خدا کی نصرت کا مستحق ہوجاتا ہے۔ خدا کی فرمانبرداری، اس کی توفیق اور اس کی مدد کے بغیر انسان کے لیے نیکی کا راستہ پانا دشوار ہے اور گربندے کو اللہ کی رحمت شامل حال نہ ہو تو اللہ کی نصرت حاصل کرنا بھی محال ہے۔ اللہ کی راہ میں مال دے کر اللہ کو راضی کرنا ایک قسم کی کوشش ہے اور اس قسم کی کوشش میں تمام خوبیوں کا ذخیرہ انسان کو درکار ہے۔ ایک یہ کہ انسان زر پرستی میں بتلا نہ ہو بلکہ کھلے دل سے اپنا مال جو اللہ نے اسے دیا ہو، نیکی اور بھلائی کے کاموں اور اللہ کے بندوں کے حقوق ادا کرنے اور غریبوں اور محتاجوں کی مدد کرنے میں صرف کرے۔ دوسرا یہ کہ اس کے دل میں خدا کا خوف ہو اور زندگی کے ہر شعبے میں اُن کاموں سے پرہیز کرے جن کے کرنے سے خدا ناراض ہوتا ہے اور ان کاموں کے کرنے میں پہل کرے جن کے کرنے سے اللہ تعالیٰ راضی ہو۔ تیسرا یہ کہ وہ بھلائی کو اپنائے اور برائیوں سے دور رہے، اپنے عقیدے اخلاق اور اپنے اعمال کو درست کرے۔ شرک اور کفر کو چھوڑ کر توحید، آخرت اور رسالت کو برحق مانے اللہ کے عطا کردہ خیر و صلاح اور بھلائیوں کے نظام کو تسلیم کرے اور ایک محکم و مستحکم نظم کے ساتھ منسلک رہے۔ انسان کے نیک اعمال کی ان کوششوں کے بعد اللہ تعالیٰ انسان کو آسان راستے کے لیے سہولت دینے کا وعدہ فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جسے آسان دین پر چلنے کے لیے سہولت عطا کرے وہ اپنی منزل تک پہنچ گیا۔ اس نے سہولت نرمی اور سکون کے ساتھ منزل مقصود کو پالیا اور یہ منزل مقصود اسے زمین پر رہتے ہوئے اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری ہی میں حاصل ہو سکتی ہے۔ ایسے نیک بندے کی زندگی میں آسانی پیدا کی جاتی ہے اور اسے اپنے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے سہولت اور آسانی دی جاتی ہے۔

آسان راستہ سے مراد وہ راستہ ہے جو انسان کی فطرت اور اس کے خالق کی مرضی کے مطابق ہے۔ جس نے زمین کو ہموار کردیا ہے جس پر انسان اپنے ضمیر اور ذہن کی قوتوں کا استعمال کرکے چلتا ہے اور اس راستے پر چل کر اسے قدم قدم پر مزاحمت اور کشمکش سے سابقہ پیش آتا ہے جس سے گزر کر ہی وہ رب العالمین کی بارگاہ میں قدر و منزلت پاتا ہے اور ایک صالح معاشرہ میں بھی اسے قدر و منزلت کا مقام حاصل ہوجاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو آدمی اپنا مال خلق خدا کی بھلائی کے لیے استعمال کررہا ہو، جو ہر ایک سے نیک سلوک کر رہا ہو، جس کی زندگی جرائم اور گناہوں سے تاحدِ امکان محفوظ ہو، جو اپنے معاملات میں کھرا اور راست باز ہو، جو کسی کے ساتھ بے ایمانی بدعہدی اور بے وفائی نہ کرے، جو خیانت اور ظلم و زیادتی نہ کرے، جو ہر شخص کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آئے اور کسی کو اس کی سیرت اور کردار پر انگلی اٹھانے کا موقع نہ ملے ایسا شخص چاہے کسی بگڑے ہوئے معاشرے میں رہتا ہو بہرحال اس کی قدر کی جاتی ہے اور ہر ایک کی نگاہ میں اس کی توقیر قائم ہوجاتی ہے۔ اس کا روشن ضمیر اسے اطمینان بخشتا ہے جس سے اس کے دل کو سکون ملتا ہے معاشرے میں اسے وہ مقام رتبہ اور وقار ملتا ہے جو کسی بدکردار اور گمراہ شخص کو کبھی بھی حاصل نہیں ہوسکتا اگرچہ وہ سماج اور سوسائٹی میں دولت اور اقتدار کی وجہ سے مشہور اور مقبول ہو۔

یہی بات سورہ نحل میں فرمائی گئی ہے

جو شخص نیک عمل کرے خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور ہو وہ مومن اسے ہم اچھی زندگی بسر کرائیں گے۔ آیت نمبر ۹۷...یہ وہ راستہ ہے جس میں دنیا سے لے کر آخرت تک انسان کے لیے خوشی اور راحت ہے اور یہ ایسی دولت ہے جو انسان کے مرنے کے ساتھ ختم نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ آخرت کی ابدی زندگی میں اس کے ساتھ رہے گی۔

اس آسان اور سہل راستے پر چلنے کے عوض اللہ تعالیٰ کے انعامات کی خوش خبری پاکر انسان خود فیصلہ کرتا ہے کہ یہی راستہ میرے لائق ہے وہ اسی راستے کو پسند کرتا ہے اور برائی کے راستے کو مسترد کرتا ہے اور عملاً مالی قربانی دے کر تقویٰ کی زندگی اختیار کرکے یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ اپنے قول وفعل میں سچا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لیے زندگی گزارنے کا یہ مشکل راستہ سہل اور آسان بنادیتا ہے۔ اس کے لیے پھر گناہ کرنا مشکل اور نیکی کرنا آسان ہوجاتا ہے یعنی اس کے دل میں گناہوں سے نفرت اور نیکیوں سے محبت ہوجاتی ہے۔ اگر اس کے پاس مال حرام آئے تو وہ اسے نفع نہیں بلکہ آگ کا انگارہ سمجھتا ہے۔ بدکاری کا موقع اگر ملے تو اسے گناہ کبیرہ سمجھ کر اُس سے دور بھاگتا ہے۔ اس پر نماز گراں نہیں ہوتی ہے بلکہ نماز کے بغیر اسے چین نہیں ملتا ، زکوٰۃ دینا اس کے لیے بارگراں نہیں ہوتا بلکہ وہ زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد ہی اپنا مال پاک سمجھتا ہے۔ الغرض اسے ہر قدم پر اس آسان راستے پر چلنے کی توفیق وتائید ملتی ہے۔

یہاں اس بات کی وضاحت کرنا ضروری ہے کہ سورہ بلد میں اس راستے کو دشوار گزار گھاٹی کہا گیا ہے۔ لیکن یہاں اسے آسان راستہ قرار دیا گیا ہے۔ بظاہر ان دونوں باتوں مین تضاد معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس راہ کو اختیار کرنے سے پہلے آدمی کو یہ دشوار گزار گھاٹی محسوس ہوتی ہے کیونکہ اس دشور گزار گھاٹی کے راستے پر چلنے کے لیے اسے اپنی نفسانی خواہشوں، لوگوں کے معاملات اور شیطان کے حربوں سے لڑنا پڑتا ہے اس لیے یہ دشوار گزار اور خوفناک راستہ دکھائی دیتا ہے لیکن جب انسان برائیوں کو چھوڑ کر بھلائی کے کام کرنے کا عزم کرلیتا ہے تو اس دشوار گزار راستے پر چلنا اس کے لیے آسان ہوجاتا ہے۔ اگرچہ دوسروں کو یہ راستہ دشوار گزار دکھائی دیتا ہے۔ یہ دراصل اللہ تعالیٰ کی سنتِ ثابتہ ہے کہ جو انسان اس کی رضا جوئی کا راستہ اختیار کرے، وہ اُسے حالات کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑتا ہے، بلکہ اپنی تائید و توثیق سے نواز کر ان کے لیے دین کی مشکل راہوں پر چلنا آسان بنا دیتا ہے یہ بات سورہ عنکبوت کی آیت میں مبرہن کی گئی ہے: وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ۝ (آیت:٦٩) ''اور جو لوگ ہمارے لیے جدوجہد کریں ہم انہیں اپنے راستوں کی راہنمائی کرتے ہیں۔ یقینا اللہ تعالیٰ کی حمایت نیکوکاروں کو شامل رہتی ہے''۔

وَأَمَّا مَن بَخِلَ وَاسْتَغْنَىٰ(٨)

اور جس نے بخل کیا اور اپنے رب سے لاپرواہی کی

وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَىٰ(٩)

اور بھلائی کو جھٹلایا

فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلۡعُسۡرٰی(۱۰)

اسے ہم سخت راستے کے لیے سہولت دیں گے

وَمَا یُغۡنِیۡ عَنۡهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰی(۱۱)

اور اس کا مال اس کے کچھ کام نہ آئے گا جب وہ دوزخ کے گھڑے میں گرے گا

یہاں انسان کے دوسرے کردار کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ بخل کرتا ہے وہ اپنے مال سے غریبوں، مسکینوں اور محتاجوں کی مدد نہیںکرتا ہے بلکہ کنجوسی کرکے مال جمع کرتا ہے پھر یا تو دکھاوے کے لیے رنگ رلیوں اور فضول کاموں پر اپنا یہ کمایا ہوا مال اڑاتا ہے یا ایک ایک پیسہ جمع کرکے ذخیرہ اندوزی کرتا ہے۔

بخل سے مراد محض وہ بخل نہیں ہے کہ آدمی روپیہ جوڑ جوڑ کر رکھے اور اسے نہ اپنے اوپر خرچ کرے اور نہ اپنے بال بچوں پر بلکہ یہاں بخل سے مراد راہ خدا میں مال صرف نہ کرنا ہے۔ اس لحاظ سے وہ شخص بھی بخیل ہے جو اپنی ذات پر، اپنے عیش و آرام پر اور اپنی تفریحوں پر دل کھول کر مال لٹاتا مگر کسی نیک کام کے لیے اور غریبوں کی مدد کے لیے وہ اپنی جیب سے ایک پیسہ بھی نہیں نکالتا اور اگر نکالتا بھی ہے تو اس غرض سے کہ اس کے بدلے میں اسے شہرت، ناموری یا کوئی ذاتی فائدہ حاصل ہوجائے۔

لاپرواہی سے مرادیہ ہے کہ آدمی صرف دنیا کے مادی فائدوں کے لیے مال خرچ کرے اور خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے لاپرواہی برتے۔ بھلائی کو جھٹلانے سے یہ مراد ہے کہ وہ تمام ایسے کاموں کو نظر انداز کرے جو اسے اللہ کی راہ میں راضی کرنے کے لیے کرنے تھے یعنی غریبوں، محتاجوں اور مسکینوں کو کھانا کھلاتا، یتیموں اور بے کسوں کے لیے مال خرچ کرنا اور دیگر بہت قسم کی بھلائی کے کام کرنا اس کی

ذمہ داری تھی لیکن یہ ان سب کاموں سے دست بردار ہوجاتا ہے اس لیے اسے خدا کی راہ میں بھلائی کا کام کرنے کا منکر قرار دیا گیا۔

جو شخص بخل کرکے اپنا مال بچالیتا ہے اور اللہ اور اس کی ہدایت سے بے رخی اور بے پرواہی اختیار کرلیتا ہے اور اللہ کے دین اور اس کی دعوت کو جھٹلاتا ہے اور اپنے آپ کو فساد اور بگاڑ کے رذیل مقام پر پہنچا دیتا ہے وہ اس بات کا مستحق ہوجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شئے کو اس کے لیے دشوار بنادے اس لیے وہ اسے دشوار گزار راستے پر چلنے کی سہولت دیتا ہے اور اسے ہر دشواری کو اختیار کرنے کی توفیق دیتا ہے۔ اس طرح یہ دشوار راستہ اختیار کرنے والا انسان راہ حق اور ہدایت سے دور سے دور تر چلاجاتا ہے اور شقاوت اور بدبختی کی دشوار گزار راہ پر چڑھتا چلا جاتا ہے اگرچہ وہ یہی خیال کرتا ہے کہ وہ ترقی اور کامیابی کی راہ پر گامزن ہے۔ اس راستے کو سخت اس لیے کہا گیا ہے کہ اس پر چلنے والا اگرچہ مادی فائدوں اور ظاہری کامیابیوں کی لالچ میں اس راستہ پر چلاجاتا ہے تاہم اسے اس راہ پر چلتے ہوئے ہر وقت اپنی فطرت سے اور خالق کائینات کے بنائے ہوئے قوانین سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ صداقت، دیانت، امانت، شرافت اور عفت و عصمت کی اخلاقی حدود کو توڑکر جب وہ ہر طرح سے اپنی خواہشات کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور جب وہ دوسروں کے حقوق اور انکی عزتوں پر دست درازیاں کرتا ہے تو وہ لوگوں کی نگاہوں میں گِر جاتا ہے۔ اگر وہ مال دار، طاقتور اور بااثر بھی ہو اور عوام اس کے زور کے آگے دب بھی جائے تاہم کسی کے دل میں اس کے لیے خیر خواہی، عزت اور محبت کا کوئی جذبہ نہیں ہوتا ہے۔

سخت راستے پر چلنے کی سہولت دینے کی حقیقت یہ ہے کہ گمراہی کا راستہ اختیار کرنے والے سے بھلائی کے راستے پر چلنے کی توفیق چھین لی جاتی ہے اور برائی کے دروازے اس کے لیے کھول دئے جاتے ہیں۔ اس کے لیے اس راستے پر چلنے کے اسباب اور وسائل پیدکئے جاتے ہیں۔ اس لیے بدی کا کام کرنا اس کے لیے آسان ہوجاتا ہے اور نیکی کا کام کرنا اس کے لیے بہت مشکل ہوجاتا ہے۔ اس کیفیت کو قرآن میں یوں بیان فرمایا گیا ہے ''جسے اللہ ہدایت بخشنے کا ارادہ فرماتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے گمراہی میں ڈالنے کا ارادہ فرماتا ہے اس کے سینے کو تنگ کردیتا ہے'' (سورہ انعام:) ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے ''بے شک نماز ایک مشکل کام ہے مگر فرمانبردار بندوں کے لیے نہیں'' (البقرۃ:) منافقین کے لیے فرمایا گیا ہے ''وہ نماز کی طرف اگر آتے بھی ہیں تو کسمساتے ہوئے آتے ہیں۔ اور راہ خدا میں اگر خرچ کرتے ہیںتو بادل ناخواستہ خرچ کرتے ہیں'' (سورۃ النساء:) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گمراہی کا راستہ اختیار کرنے والوں کے لیے خدا کی راہنمائی اور ہدایت کا راستہ مشکل دکھائی دیتا ہے اور دنیا طلبی، دنیا داری اور گمراہی کا راستہ انہیں بہت آسان دکھائی دیتا ہے جس پر چل کر وہ اپنی زندگی کو برباد کردیتے ہیں چونکہ گمراہی کا راستہ اختیار کرنے والے اس راستے کو اپنی مرضی سے اختیار کرلیتے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ انہیں اس راستے پر ہی گامزن رہنے کی توفیق بخشتا ہے اور ان کے لیے اس راستے کو ہموار اور آسان بنادیتا ہے۔

مال اکارت ہونا: ارشاد ہوتا ہے کہ جب وہ شخص دوزخ کے گھڑے میں پھینکا جائے گا تو (اُسے معلوم چلے پڑے گا) کہ اس کا مال اس کے کسی کام نہ آسکا۔ اسے زعمِ باطل تھا کہ مال و اسباب جس طرح آج اس کی وجاہت کو بڑھاتے ہیں، کل بھی میری بڑھائی کا ذریعہ بنیں گے۔ مگر کل وہ حسرت سے صرف یہ چیخیں مارے گا کہ: مَا أَغْنَىٰ عَنِّيْ مَالِيَهْo هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطَانِيَهْo (ہائے میرا مال میرے کسی کام نہ آسکا۔ میرا اقتدار بھی ختم ہوگیا)۔ (الحاقۃ:۲۸،۲۹)

اب اگلی آیات میں اس حقیقت کو واضح کردیا گیا ہے کہ کوئی شخص یا گروہ جس بھی انجام سے دوچار ہوگا وہ مبنی بر عدل ہوگا۔ یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر ہدایت واضح کردی تھی اور انہیں آخرت کی جزا اور سزا سے آگاہ کردیا تھا۔

إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَى(١٢)

بے شک راہ دکھانا ہمارے ذمہ ہے

وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُولَى(١٣)

اور بے شک آخرت اور دنیا کے مالک ہم ہی ہیں

فَأَنذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظَّى(١٤)

پس میں نے تمہیں بھڑکتی ہوئی آگ سے خبردار کردیا ہے

لَا یَصۡلَاهَاۤ اِلَّا الۡاَشۡقَی(۱۵)

نہیں جھلسے گا اس میں سوائے وہ جو انتہائی بدبخت ہے

الَّذِیۡ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی(۱۶)

جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا

بندوں پر اللہ کی رحمت اور فضل وکرم ہے کہ اُس نے اپنے اوپر ذمہ داری لی کہ وہ دنیا میں انسانوں کو بے خبر نہ چھوڑے بلکہ ان پر ہدایت کو واضح فرمائے اور پھر اُس نے اپنے رسولوں کے ذریعے اپنے پیغامات و احکامات کو انسانوں پر کھول کھول کر بیان کروائے، تاکہ کوئی شخص یہ دلیل پیش نہ کرسکے کہ اسے معلوم نہ تھا کہ حق کا راستہ کون تھا اور باطل کا کون؟ اُس نے واضح کردیا ہے کہ نیکی کیا ہے اور بدی کیا ہے، حلال کیا ہے اور حرام کیا ہے کون سا راستہ اختیار کرکے کامیاب ہوگا اور کون سی راہ چلنے سے وہ ناکام ونامراد ہوگا۔

بے شک آخرت اور دنیا کے مالک ہم ہیں

یہاں ایک ایسی حقیقت بیان کی گئی ہے جس کی گرفت میں سارے انسان ہیں اور جس سے بچ کر وہ کہیں نہیں جاسکتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا فرمان کہ وہی دنیا اور آخرت دونوں کا مالک ہے۔ جو شخص اللہ سے بھاگ کر کہیں دور رہنا چاہتا ہے وہ اس کی قدرت سے بھاگ کر کہیں نہیں جاسکتا ہے کیونکہ دنیا اور آخرت دونوں میں خدا کی ہی حکمرانی ہے اور دونوں جہان اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ انسان کو وارننگ دی جاتی ہے کہ خواہ وہ اللہ کی بتلائی ہوئی راہ پر چلے یا گمراہی کا راستہ اختیار کرے۔ مگر اس کی

نافرمانی یا فرمانبرداری سے اللہ کی قدرت اور حکومت میں کوئی فرق نہیں پڑسکتا ہے نہ اس کے ماننے سے اس کی خدائی میں اضافہ ہوگا اور نہ انکار کرنے سے کوئی کمی ہو سکتی ہے البتہ دنیا چاہو گے تو وہ بھی ہم ہی سے تمہیں ملے گی، آخرت کی بھلائی چاہو گے تو وہ بھی ہمارے ہی اختیار میں ہے۔یہی بات سورہ آل عمران میں بھی فرمائی گئی ہے۔ کہ جو شخص ثواب دنیا کے ارادہ سے کام کرے گا اس کو ہم دنیا میں ہی دیں گے اور جو ثواب آخرت کے ارادہ سے کام کرے گا اس کو ہم آخرت میں دیں گے۔
(آیت:۱۴۵) سورہ شوریٰ میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے ۔ جو آخرت کی کھیتی چاہتا ہے اس کی کھیتی کو ہم بڑھاتے ہیں اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہے اسے دنیا میں ہی دیتے ہیں مگر آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ (آیت:۴۰)

پھر اللہ تعالیٰ اُس بھڑکتی ہوئی جہنم کی آگ سے خبردار کرتا ہے جو منکروں اور گمراہوں کے لیے تیار رکھی گئی ہے۔ اس آگ میں نہیں ڈالا جائے گا مگر اُس کو جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی تعلیمات کو جھٹلا دے اور اطاعت کی راہ سے منہ پھیر لے۔ ایسا شخص نہایت بدبخت ہے ۔ اس سے بڑھ کر بدبختی کیا ہو سکتی ہے کہ اس کے پاس رسول کی تعلیم پہنچی مگر اس نے انکار کیا اور تکبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی راہ لی !

وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى (١٧)

اور پرہیزگار (اس بھڑکتی ہوئی) آگ سے بچا لیا جائے گا

الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى(١٨)

جو پاکیزہ ہونے کی خاطر اپنا مال دیتا ہے

وَمَا لِأَحَدٍ عِندَهُ مِن نِّعْمَةٍ تُجْزَى(١٩)

جس کا کسی پر بدلے کا احسان نہ ہو

إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَى(٢٠)

وہ محض اپنے رب اعلیٰ کی رضا کے لیے دیتا ہے

وَلَسَوْفَ يَرْضَى (٢١)

اور وہ عنقریب خوش ہوجائے گا۔

اب پہلے کردار کے مقابلے میں دوسرے کردار کا ذکر فرمایا جارہا ہے۔ ایک ایسے شخص کا کردار، جو نہ صرف ایمان لاتا ہے بلکہ انتہائی خلوص کے ساتھ کسی ریاکاری اور نمائش کے بغیر راہ خدا میں صرف اس لیے مال خرچ کرتا ہے کہ وہ اللہ کی رضا چاہتا ہے اور اللہ کا نیک اور پاکیزہ بندہ بننا چاہتا ہے۔ ایسے شخص کو جہنم کے عذاب سے نجات ملے گی جو اس کے لیے بڑی کامیابی ہوگی۔

اور وہ عنقریب خوش ہوجائے گا

اپنی کامیابی کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانبردار بندہ آخرت میں خوش ہوجائے گا۔ اپنے نیک عملوں کے بدلے میں جنت کی نعمت پاکر اس کی خوشی اور شادمانی کی کوئی حد نہ ہوگی۔ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى کا ترجمہ یہ بھی کیا گیا ہے کہ اللہ اس شخص سے ضرور خوش ہوگا۔ اس آیت کے یہ دونوں مفہوم ہوسکتے ہیں۔

بہرحال خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے والے پر آخرت میں اللہ تعالیٰ خوش ہوگا اور بندہ بھی اپنی کامیابی پر بہت خوش ہوگا۔ دنیا میں وہ اپنے رب سے خوش تھا، اپنی تقدیر سے خوش تھا، اپنے دین سے خوش تھا۔ وہ خوشحالی، مصیبت، امیری، غریبی، آسانی، تنگدستی ہر حال میں خدا سے خوش تھا۔ وہ ہمیشہ خدا کے احکام کی تعمیل میں خوش اور راضی ہوتا تھا۔ وہ بے چینی اور اضطراب میں مبتلا نہیں ہوتا تھا۔ اس کا دل خدا کی بندگی کرنے سے تنگ نہیں آتا تھا اور وہ خدا کی ہر آزمائش میں پورا اترتا تھا۔ وہ اللہ کی طرف سے ڈالی گئی ذمہ داریوں کو بوجھ نہیں سمجھتا تھا بلکہ انہیں خوش اسلوبی سے نبھاتا تھا۔ اب آخرت میں اسے ان اعمال صالح کے بدلے میں ایک ایسی خوشی نصیب میں آگئی جس کی وجہ سے دُنیا کے ہر غم اور فکر سے اس نے نجات پائی اور اس کا دل ہمیشہ اس خوشی سے مسرور و مطمئن ہوگا۔

سُوْرَۃُ الضُّحٰی مکیۃ

اٰیٰتُہا:11 رکوعھا:1

بسم اللہِ الرَّحمٰن الرَّحیم

وَالضُّحَىٰ ۝ وَاللَّيْلِ إِذَا سَجَىٰ ۝ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلَىٰ ۝ وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ ۝ وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ ۝ أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ ۝ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ ۝ وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ ۝ فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝ وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝

پس منظر:

روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ عرصے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا سلسلہ رک گیا تھا جس سے آپؐ سخت پریشان ہوگئے تھے۔ آپ کو بار بار یہ اندیشہ ہوتا تھا کہ شاید مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہے جس پر میرا رب مجھ سے ناراض ہوگیا ہے۔ اس لیے اس نے مجھے چھوڑدیا ہے۔ اور

اسی وجہ سے وحی کا نزول بھی بند کیا گیا۔ اس پر یہ سورۃ نازل ہوئی جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان دلایا گیا کہ اللہ آپ سے ناراض نہیں ہے اور نہ کسی ناراضگی کی وجہ سے وحی کو روک دیا گیا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے آپ کو تھوڑا سا وقت کا وقفہ دیا تھا جس میں اللہ کی مصلحت کارفرما تھی نہ کہ کوئی ناراضگی۔

اگرچہ یہ سورۃ خالصۃً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے لیے نازل فرمائی گئی ہے اور اس میں آپؐ کے لیے تسلی اور راحت کا سامان ہے تاہم آپ کو تسلی دینے کے ساتھ ساتھ آپ کے سچے پیروؤں، ساتھیوں اور دین کے داعیوں کے لیے ہمیشہ کے لیے تسلی اور بشارت کا پیغام (message) ہے جنہیں ہر زمانے میں پیغام الٰہی کی تبلیغ و تدریس میں انتہائی مشکلات و مصائب کا سامنا کرنا پڑے، انہیں یقین دہانی کی جاتی ہے کہ مشکلات تو انہیں ضرور پیش آئیں گی لیکن اللہ اپنے ان دین دار اور دین کے ہمدرد بندوں کو اپنے حال پر چھوڑنے والا نہیں ہے۔ جس طرح روشن دن کے بعد رات آتی ہے اور یہ نہ سمجھا جاتا ہے کہ بس اندھیرا ہے بلکہ رات اس امید کے ساتھ آتی ہے کہ کل پھر سورج نکلے گا اور روز روشن وجود میں آئے گا اسی طرح ان مومنین کو سختیوں اور تکالیف سے آزما کر رب العالمین کی طرف سے آرام کی امید دلائی جاتی ہے اور اس دنیا کو چھوڑنے کے بعد آخرت میں ہمیشہ کے لیے آرام کی زندگی بسر کرنے کی یقین دہانی کی جاتی ہے۔ اس سورہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خوشخبری بھی دی گئی ہے کہ دعوت اسلامی کے ابتدائی دور میں جن شدید مشکلات کا آپ کو سابقہ پیش آرہا ہے یہ چند دنوں کی بات ہے آپ کے لیے ہر آنے والا دور گزرے ہوئے دور سے بہتر ہوگا۔ عنقریب اللہ تعالیٰ آپ کو اس قدر خیر و برکت سے نوازیں گے کہ آپ خوش ہوجائیں گے۔ یہ پیش گوئی بعد میں حرف بہ حرف پوری ہوگئی جب آپؐ کو چند سالوں کے اندر ہی حیرت انگیز کامیابی حاصل ہوگئی۔

سورہ میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بے انتہا محبت اور قربت کی نمایاں جھلک ہے اور اپنے بندوں سے پیار و محبت، ہمدردی اور شفقت کا اظہار ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے فرماتے ہیںکہ آپ کو یہ پریشانی کیوں کر لاحق ہوگئی کہ ہم نے تمہیں چھوڑ دیا ہے اور ہم تم سے ناراض ہوگئے ہیں۔ ہم تو آپ کے روزِپیدائش سے مسلسل آپ پر مہربانیاں کرتے چلے آرہے ہیں۔ آپ یتیم پیدا ہوئے تھے ہم نے آپ کی پرورش کا بہترین انتظام کردیا، آپ ناواقف راہ تھے ہم نے آپ کو راستہ دکھایا۔ آپ نادار تھے ہم نے آپ کو مالدار بنایا۔ ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ابتدا سے ہمارے منظور نظر ہیں اور ہمارا فضل و کرم مستقل طور پر آپ کے شامل حال ہے۔ اس لیے آپ اطمینان رکھیں کہ آپ اکیلے نہیں ہیں بلکہ ہمارا فضل آپ کے ساتھ ہے۔ دراصل اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دلاسا دے رہے ہیں کہ آپ کے رب نے آپ کو نہیں چھوڑا ہے بلکہ کسی مصلحت اور مقصد کےپیش نظر آپ کی طرف آنے والی وحی عارضی طور پر معطل کردی گئی اس میں اللہ کی مشیت کارفرما تھی۔

وَالضُّحَىٰ(۱)

قسم ہے روز روشن کی

وَاللَّيْلِ إِذَا سَجَىٰ(۲)

اور رات کی جب کہ وہ سکون کے ساتھ چھا جائے

مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلَىٰ(۳)

(اے محمدؐ) تمہارے رب نے نہ تم کو چھوڑا ہے اور نہ وہ (تم سے) ناراض ہوا

وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ(۴)

یقینا تمہارے لیے بعد کا دور پہلے دور سے بہتر ہوگا

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى(۵)

اور عنقریب تمہارا رب تمہیں اتنا عطا کرے گا کہ تم خوش ہوجاؤ گے۔

قسم ہے روز روشن کی اور رات کی کی جب وہ سکون کے ساتھ چھا جائے

اللہ تعالیٰ دو مظاہر کائینات روز روشن (دن) اور چھا جانے والی پر سکون رات کی قسم کھاتا ہے۔ یہ دن اور رات کی تبدیلی انسانی زندگی میں ایک اہم رول ادا کرتی ہے۔ دن میں انسان اپنی مصروفیات میں مشغول ہو کر لمحہ بھر کی فرصت نہیں پاتا ہے۔ انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ نے عشق کی حد تک دنیا کی محبت ڈال دی ہے اور اس میں دنیا کی بے حد رغبت پیدا کردی ہے لیکن ساتھ ہی اس میں یہ شعور بھی رکھا ہے کہ وہ دنیا میں رہ کر اس کی دھن و دولت کی خواہش میں اپنے خالق حقیقی کو فراموش نہ کر ڈالے بلکہ دنیاداری کے ساتھ ساتھ رضائے الٰہی بھی حاصل کرلے۔ بہرحال دونوں صورتوں یعنی دنیاداری اور رضائے الٰہی کو حاصل کرنے کے لیے اس کے لیے یہ دنیا کام کرنے کا کارخانہ ہے۔ دنیا کی بہترین کمائی کے لیے وہ ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتا ہے۔ دن بھر کام کرنے کے بعد جب رات طاری ہوجاتی ہے تو وہ رات کے اس پرامن اور پر سکون ماحول میں آرام پاتا ہے اگر اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے رات کا انتظام نہ کیا ہوتا تو شاید وہ اس کارخانہ دنیا میں اس طرح محو رہتا کہ وہ اپنے آرام کے لیے سوچ بھی نہ سکتا جسکی وجہ سے اس کی صحت بگڑ جانے کا پورا خطرہ رہتا اور اس کی زندگی وبال جان بن جاتی۔ جس طرح رات کے آنے سے انسان کی زندگی میں کوئی خلل نہیں پڑتا ہے بلکہ وہ رات میں آرام پاکر دن کی تھکان دور کرلیتا ہے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کچھ عرصہ کے لیے وحی روک دی گئی تاکہ آپؐ پر جو ذمہ داری کا بوجھ ہے وہ ہلکا ہوجائے اور تھوڑی دیر کے لیے آرام فرما کر جسمانی اور ذہنی تھکاوٹ (physical and mental exertion) دور کرکے دوبارہ اپنے مشن پر کاربند ہوجائیں۔

جیسا کہ تمہیدی اقتباس میں عرض کیا گیا کہ روایات کے مطابق مدت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول بند رہا۔ وحی کے بند رہنے کی مدت میں مختلف روایات ہیں جو ۱۲، ۱۵، ۲۵ اور ۴۰ دن کی مدت پر مشتمل ہیں بہرحال وحی بند ہونے کا زمانہ اگرچہ مختصر ہی تھا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ زمانہ اتنا طویل تھا کہ آپ اس پر بہت غمگین ہو رہے تھے۔ اب مخالفین بھی وحی رک جانے پر طعنہ دیتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو نئی سورت نازل ہوتی تھی آپ فوراً اسے لوگوں کو سناتے تھے۔ جب کچھ مدت تک آپ نے کوئی نئی وحی نہیں سنائی تو مخالفین نے سمجھ لیا کہ وہ سرچشمہ ہی بند ہوگیا جہاں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی آتی تھی۔ یہاں تک کہ مشرکین نے یہ کہنا شروع کردیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے رب نے چھوڑ دیا ہے۔ ابو لہب کی بیوی اُم جمیل جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چچی بھی تھی نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے شیطان نے چھوڑ دیا ہے۔ کئی روز تک جبریل کے نہ آنے سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم بہت پریشان ہوگئے۔ مشرکین کہنے لگے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا رب محمدؐ سے ناراض ہوگیا ہے اور اس نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ اس صورت حال میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم شدید رنج و غم میں بتلا ہوگئے اور ایسا ہونا عقل کے خلاف بھی نہیں ہے کیونکہ کفر و ایمان کے درمیان جنگ چھڑ جانے کے بعد وہ منبع ہی جب بظاہر رک گیا جو کفر و ایمان کی کشمکش میں بنیادی قوت کی حیثیت رکھتا تھا، جس کی بدولت دنیا سے اندھیرا دور کیا جاسکتا۔ آپ کو بار بار یہ اندیشہ ہوتا تھا کہ کہیں مجھ سے کوئی ایسی غلطی نہ ہوگئی ہو جس سے میرا رب مجھ سے ناراض ہوگیا اور اس نے مجھے اب اس حق و باطل کی لڑائی میں تنہا چھوڑ دیا ہو۔

(اے محمدؐ) تمہارے رب نے نہ تم کو چھوڑا ہے اور نہ وہ (تم سے) ناراض ہوا

ایسے حالات میں یہ آیات نازل ہوئیں، ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی کہ آپ کا رب آپ سے ناراض نہیں ہے۔ دن کی روشنی اور رات کے سکون کی قسم کھاکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے کہ تمہارے رب نے نہ تمہیں چھوڑدیا ہے اور نہ تم سے ناراض ہوا بلکہ بات یہ ہے کہ جس طرح دن کا روشن ہونا اور پھر رات کی تاریکی کا چھاجانا اس لیے نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ دن کے وقت لوگوں سے خوش اور رات کے وقت ان سے ناراض ہوجاتا ہے بلکہ یہ دونوں حالتیں ایک عظیم حکمت اور مصلحت کے تحت طاری ہوتی ہیں اسی طرح آپ پر بھی جو وحی بھیجی گئی اور پھر کچھ عرصہ کے لیے اسے روک دیا گیا، یہ ایک عظیم حکمت اور مصلحت کے تحت کیا گیا ہے۔ اس کا اس بات سے تعلق نہیں کہ جب آپ کا رب آپ سے راضی ہے تو وحی بھیجتا ہے اور جب وہ آپ سے ناراض ہوتا ہے تو وحی روک دیتا ہے اور نہ آپ کے رب نے آپ کو چھوڑ دیا ہے جیسا کہ آپ کے مخالفین کا گمان ہے، بلکہ وحی رکنے میں اللہ کی مصلحت یہ ہے کہ جس طرح دن کی روشنی اگر مسلسل آدمی پر طاری رہے تو وہ اسے تھکادے گی اس لیے ایک خاص وقت تک دن کے روشن رہنے کے بعد رات کا آنا ضروری ہے تاکہ اس میں انسان کو سکون مل سکے اور وہ جسم کو آرام دے کر اسے دوبارہ کام کرنے کے لائق بنادے، اسی طرح اگر آپ پر لگاتار وحی نازل ہوتی رہے گی تو تمہارے اعصاب اسے برداشت نہ کرسکتے ہیں۔ اسی لیے آپ پر وحی مناسب وقت پر آرام سے نازل ہوتی رہے گی تاکہ آپ پر زیادہ بھاری بوجھ نہ پڑ جائے۔ وقتاً فوقتاً نزول وحی کا سلسلہ رک جانے میں اللہ تعالیٰ کی یہ مصلحت ہے کہ وحی کے نزول سے جو آپ پر بار پڑتا ہے اسے کم کردیا جائے، گویا وحی کا نازل ہونا دن کی روشنی کی طرح ہے اور اس کا رک جانا رات کے آرام کی مانندیہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا جاتا ہے کہ آئندہ بھی اگر کبھی وحی رک جائے گی تو اس میں اللہ کی مصلحت ہوگی کوئی ناراضگی نہیں ہوگی۔ اوریہ کہ آگے بھی اللہ کی مرضی کے مطابق اس کے مقرر کردہ وقت پر ہی وحی نازل ہوتی رہے گی۔ ان آیات میں دن اور رات کی قسموں پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں کہ ''جس طرح اس دنیا میں سورج کی روشنی اور حرارت بھی ضروری ہے اور رات کی تاریکی اور سکون بھی ضروری ہے اسی طرح انسان کی روحانی و اخلاقی تربیت کے لیے عُسر اور یُسر یعنی نرمی اور سختی اور فقر و غنایعنی امیری اور غریبی کی آزمائش بھی ضروری ہے۔ انہی کے ذریعے اللہ تعالیٰ جیسا کہ سورہ فجر میں صراحت فرمائی گئی، اپنے بندے کے صبر

یا شکر کا امتحان کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس وقت اگر تم مخالفوں کی مخالفت، اعوان و انصار کی قلت اور اسباب و وسائل کی کمی سے دوچار ہو یا آسمانی و روحانی کمک کی جتنی ضرورت محسوس کر رہے ہو اتنی تمہیں نہیں پہنچ رہی ہے تو اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہے کہ کہ اب تمہارے رب نے تمہیں چھوڑ دیا ہے یا تم سے بے زار ہوگیا ہے بلکہ یہ تمہاری تربیت کے لیے تمہارا امتحان ہے تاکہ تم اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لیے اچھی طرح تیار ہوجاؤ گے۔'' (تدبر القرآن: تفسیر سورۂ ضحی)

وحی رکنے کی یہ حکمت بھی بتائی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں حصول وحی کا ذوق وشوق پید ہوجائے چونکہ ان پر حقیقت واضح ہوچکی تھی کہ آپ کو نبی بنادیا گیا ہے اور آپ کو یقین ہوگیا تھا کہ آپ پر وحی کا سلسلہ جاری رہے گا لیکن ان میں اشتیاق (curiosity) بڑھانے کے لیے مختصر وقت کے لیے وحی کو روک دیا گیا تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں وحی سننے اور حاصل کرنے کی جو خواہش اور تڑپ ہے اس میں مزید اضافہ کیا جائے۔

یقینا تمارے لیے بعد کا دور پہلے دور سے بہتر ہوگا

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یقین دلایا جارہا ہے کہ آپ کا آنے والا دور گزشتہ دور سے زیادہ بہتر ہوگا اور وہ دن دور نہیں جب اللہ تعالیٰ اپنے محبوب پیغمبر کو اتنا عطا کرے گا کہ وہ خوش ہوجائیں گے یہ یقین دہانی اور خوشخبری اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان حالات میں دی جب کہ صرف چند لوگ آپ کے ساتھ تھے ساری قوم آپ کی مخالفت کررہی تھی۔ بظاہر کامیابی کے آثار دور دور تک کہیں نظر نہ آتے تھے، اسلام کی شمع کو بجھا دینے کے لیے ہر طرف سے طوفان اٹھ رہے تھے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ اپنے نبیؐ سے فرماتے ہیں کہ ابتدائی دور کی مشکلات سے آپ پریشان نہ ہوں ہر آنے والا دور آپ کے گزرے ہوئے دور سے بہتر ہوگا۔ آپ کی قوت، آپ کی عزت اور آپ کی قدو ومنزلت اور شان و شوکت بڑھتی چلی جائے گی اور آپ ہر میدان میں کامیاب رہیں گے اور پھر آپ کی یہ کامیابی صرف دنیا تک ہی محدود نہ رہے گی بلکہ آخرت میں جو مرتبہ آپ کو ملے گا وہ دنیا کے مرتبے سے نہایت بڑھ کر ہوگا۔ ابن عباس کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میرے سامنے وہ تمام فتوحات پیش کی گئیں جو میرے بعد میری امت کو حاصل ہونے والی ہیں اس پر مجھے بڑی خوشی ہوئی تب اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا کہ آخرت تمہارے لیے دنیا سے بھی بہتر ہے''۔

نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی سے اس بات کا حوالہ ملتا ہے کہ دنیا کی بڑی کامیابی اور خوشی آخرت کی کامیابی اور خوشی کے مقابلے میں ہیچ ہے۔ کیونکہ آخرت کی کامیابی ہمیشہ کی کامیابی ہے جو کبھی ختم نہ ہوجائے گی جبکہ دنیا کی زینت و رونق اور خوشی و کامیابی چار دن کی چاندنی ہے جو بہت جلد ختم ہوجاتی ہے اور اس لیے بے اعتبار ہے۔ انسان کو ہمیشہ اس حقیقت سے باخبر رہنا چاہیے کہ وہ اس بے اعتبار رونق و زینت اور عارضی کامیابی کی خوشی میں گرفتار نہ ہوجائے بلکہ آخرت کی ابدی کامیابی اور خوشی حاصل کرنے کی جدوجہد کرے اگرچہ اس کے لیے مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑے گا۔ اللہ کی راہ میں ان مشکلات کا سامنا کرنے میں ہی اس کے لیے آخرت میں ہمیشہ رہنے والی زندگی کی ضمانت ہے۔

عنقریب تمہارا رب تمہیں اتنا عطا کرے گا کہ تم خوش ہوجاؤ گے

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا جارہا ہے کہ اگرچہ اللہ کی طرف سے عطا کرنے میں بظاہر دیر لگے گی لیکن وہ وقت دور نہیں ہے کہ جب آپ پر آپ کے رب کی طرف سے عطا و بخشش کی وہ بارش ہوگی جس سے آپ خوش ہوجائیں گے۔ یہ وعدہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں اس طرح پورا ہوا کہ سارا عرب جنوب سے لے کر شمال میں سلطنت روم اور سلطنت فارس تک اور مشرق میں خلیج فارس سے لے کر مغرب میں بحر احمر تک آپ کے زیر نگین ہوگیا اور عرب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ سرزمین ایک قانون اور ایک ضابطہ کی تابع ہوگئی۔ اور اس عظیم اسلامی طاقت سے جو کوئی بھی طاقت ٹکرائی وہ پاش پاش ہوکر رہ گئی کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پورا ملک عرب گونج اٹھا۔ اس اسلامی تحریک میں مشرکین اور اہل کتاب جو اپنے جھوٹے کلمے کو سربلند رکھنے اور اپنے باطل جھنڈے کو اونچا رکھنے کے لیے آخری دم تک ایڑی چوٹی کا زور لگا چکے تھے، شامل ہوگئے۔ لوگ نہ صرف اسلامی تحریک کی طاقت وقوت کے سامنے اطاعت کے لیے جھک گئے بلکہ ان کے دل بھی کلمہ حق سے مُسخر ہوگئے اور ان کے عقائد اخلاق اور اعمال میں ایک عظیم انقلاب برپا ہوگیا ایک ایسا انقلاب جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔

اسلام کی یہ عظیم الشان تحریک پوری طاقت کے ساتھ ایشیاء، افریقہ اور یورپ کے ایک بڑے حصے پر چھا گئی اور دنیا کے گوشے گوشے میں اس کے اثرات پھیل گئے۔ یہ سب کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کے اس وعدے کے مطابق دنیا میں مل گیا جو وعدہ اس وقت دیا گیا جب آپ ؐ بظاہر مشکلات میں گھیرے ہوئے تھے اور جس کامیابی اور پزیرائی کا وعدہ انہیں آخرت کے لیے دیا گیا ہے وہ اللہ کے پاس ان کے لیے موجود (reserved) ہے جس کا کوئی انسان ابھی تصور بھی نہیں کر سکتا ہے۔

أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ(٦)

کیا اس نے تم کو یتیم نہیں پایا پھر ٹھکانا فراہم کیا

وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ(٧)

اور تمہیں ناواقف راہ پایا پھر تمہیں ہدایت کا راستہ دکھایا

وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ(٨)

اور تمہیں تنگ دست پایا پھر مال دار کردیا

کیا اس نے تم کو یتیم نہیں پایا پھر ٹھکانا فراہم کیا

ان آیات میں اللہ رب العالمین اپنے محبوب پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیار و محبت اور ہمدردی کے ایک لطیف لہجہ (tone) میں مخاطب ہو کر گفتگو فرماتے ہیں جو اتنا پر لطف اور پر سکون ہے کہ سننے والوں کے دل کی تاروں میں عشق کے مضراب سے دردمندی کا ایک ایسا ساز بجنے لگتا ہے جو ایک

خوش لحن نغمہ بن کر دلوں کو گرماتا ہے اور روحوں کو تڑپاتا ہے۔

پیار بھری آواز میں نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا جارہا ہے کہ آپ اپنے گزشتہ دور پر نظر ڈالئے، کیا تمہارے رب نے تمہیں چھوڑا! یا وہ کبھی تم سے ناراض ہوا؟ اس نے آپ کو اس وقت بھی بے یارومددگار نہیں چھوڑا جب آپ بچپن میں یتیم ہوگئے اس وقت بھی اُس نے آپ کی کفالت کی۔ آپ راہ حق کی تلاش میں تھے۔ اُس نے آپ کو راہ حق دکھائی اُس نے آپ کو نادار پایا تو آپ کو مال دار بنایا یعنی اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں چھوڑ دینے اور تم سے ناراض ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ ہم تو اس وقت سے تم پر مہربان ہیں جب تم یتیم پیدا ہوئے تھے۔

چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی بطن مادر ہی میں تھے جب آپ کے والد ماجد کا انتقال ہوگیا۔ اس لیے آپ دنیا میں یتیم کی حیثیت سے تشریف لائے مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک دن بھی بے سہارا نہ چھوڑا۔ چھ (٦) سال کی عمر تک والدہ ماجدہ نے آپ کی پرورش کی جب والدہ ماجدہ بھی فوت ہوئی تو آٹھ (٨) سال کی عمر تک اپ کے جد امجد عبدالمطلب نے آپ کو والہانہ محبت سے پالا۔ جب اُن کا بھی انتقال ہوگیا تو آپ کے حقیقی چاچا ابو طالب نے آپ کی کفالت اپنے ذمہ لی اور آپ کے ساتھ ایسی محبت کا برتاؤ کیا جو اپنے باپ کے برتاؤ سے کسی بھی طرح کم نہ تھا اور نبوت کے بعد جب ساری قوم آپ کی دشمن ہوگئی تو اس وقت وہی چچا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت اور حفاظت میں دس سال تک سینہ سپر ہوکر ڈٹے رہے۔

اور تمہیں ناواقف راہ پایا پھر تمہیں ہدایت کا راستہ دکھایا

اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب آپ کے رب نے آپ کو ناواقف راہ پایا یعنی آپ دین حق کی تلاش میں تھے اور آپ کو صحیح راستہ معلوم نہ تھا جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے: مَا كُنتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ ۔ (شوریٰ:۵۲) ''آپ نہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور نہ ایمان کی تمہیں کوئی خبر تھی۔'' مطلب یہ کہ اُس جاہلی معاشرے میں آپؐ حیران و ششدر تھے اور اُن حقائق و علوم سے بے خبر تھے جن سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت عطا کرکے آگاہ کردیا۔ یہ اسی کی طرف اشارہ ہے کہ جب اللہ نے آپ کو راہ حق کی تلاش میں پایا تو آپ کو اس نے راہ ہدایت دکھائی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات جو تاریخ میں موجود ہیں سے یہ حقیقت واضح (crystal clear) ہے کہ آپ کبھی بھی بت پرستی، شرک و الحاد اور دہریت کی غلاظت میں مبتلا نہیں ہوئے ہیں۔ آپ بچپن سے ہی ان گندگیوں سے دور تھے اور نہ اس بات کا کہیں کوئی ثبوت ہے کہ آپ جاہلیت کے رسوم اور غلط طور طریقوں میں کبھی ملوث ہوئے ہیں جن میں آپ کی قوم مبتلا تھی۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کسی گمراہی میں مبتلا نہیں تھے جس سے اللہ تعالیٰ نے انہیں ہدایت بخش کر نکالا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آپؐ راہ حق سے ناواقف تھے جس کی تلاش میں آپ تڑپ رہے تھے اسی راہ حق کی طرف اللہ کا اشارہ ہے کہ آپ حق کی تلاش میں تھے ہم نے آپ کو حق سے آشنا کردیا۔ الغرض نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا احساس دلایا جارہا ہے کہ آپ دور جاہلیت میں پروان چڑھے جو دور اضطراب تھا اور باطل تصورات پر مبنی، غلط راستوں اور غلط طریقوں پر چلنے والوں کا دور تھا۔ آپ کی روح پاک ان سے مطمئن نہ تھی آپ کوئی واضح اور اطمینان بخش راستہ نہیں پارہے تھے۔ ایک طرف مشرکین کی جاہلانہ سوسائیٹی (society) اور ان کی بُت پرستی سے آپ کو پوری نفرت تھی دوسری طرف آپؐ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے پیروؤں سے، جنہوں نے اپنے دین میں تحریف کردی تھی اور حق سے برگشتہ و منحرف ہوکر خود گمراہی کا راستہ اختیار کئے ہوئے تھے، سے بھی متفق نہ تھے۔ ان پیچیدہ حالات میں اللہ تعالیٰ نے آپ پر وحی نازل فرمائی اور آپ کو حق کا وہ راستہ دکھایا جس کی آپ کو شدت سے تلاش تھی اور جسے پاکر آپ کا رابطہ خدا سے قائم ہوگیا۔ اس طرح حق کی تلاش میں مختلف گھاٹیوں میں بھٹکتے پھرنے سے صاف بچاکر آپ کو ہدایت سے سرفراز فرمایا۔ یہ آپ پر اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا احسان ہے کہ آپ کو اضطراب، بے چینی، پریشانی اور تکالیف سے نجات مل گئی اور آپ راہ راست پر قائم ہوگئے۔

اور تمہیں تنگ دست پایا پھر مالدار کردیا

فرمایا جارہا ہے کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ چونکہ یتیم پیدا ہوئے تھے آپ تنگ دست اور نادار تھے اللہ تعالیٰ نے آپ کو مالدار کردیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے آپ کے والد ماجد نے میراث میں صرف ایک اونٹنی اور ایک لونڈی چھوڑی تھی اس طرح آپ کی زندگی کی ابتدا مسکینی اور ناداری سے ہوئی تھی پھر ایک وقت آیا کہ اللہ کی مہربانی سے قریش کی سب سے زیادہ مالدار خاتون حضرت خدیجہؓ نے آپ سے شادی کرلی اور آپ نے ان کی تجارت اور کاروبار کو سنبھال لیا اس طرح آپ خود بھی مالدار ہوئے اور محض بیوی کے مال پر انحصار نہ رہا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم کو فقر وفاقہ اور مفلسی سے نجات ملی اور انہیں اتنی دولت عطا کی گئی کہ آس پاس کے لوگوں کی دولت کی طرف انہیں نظریں اٹھانے کی ضرورت نہ رہی اور مالدار مشرکین مکہ ان کو غربت کی نگاہوں سے دیکھنے کی جرأت نہ کرسکتے اور مفلس و نادار ہونے کا طعنہ نہ دے سکتے تھے۔

فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ (۹)

لہٰذا یتیم پر سختی نہ کرو

وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ (۱۰)

اور سائل کو نہ جھڑکو

وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (۱۲)

اور اپنے رب کی نعمت کا اظہار کرو

گزشتہ تین آیات کے مضامین کی مناسبت سے اللہ تعالیٰ آپؐ کو ہدایت فرماتے ہیں کہ چونکہ اُس نے آپ کو یتیمی کی حالت میں ٹھکانا بخشا، حیرانی اور پریشانی کی حالت میں ہدایت سے نوازا، تنگ دستی کی حالت میں غنی کیا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے احسانات کا شکرانہ ادا کرنے کے لیے لازمی ہے کہ آپ یتیموں کی سرپرستی کریں سائیلوں کی ضروریات پوری کریں اور اللہ تعالیٰ کے احسانات اور نعمتوں کا خوب ذکر کریں۔ ان احسانات اور نعمتوں میں سب سے بڑا احسان اور نعمت یہ ہے کہ اس نے آپ کو دین کی ہدایت بخشی ہے لہٰذا ان ہدایات کو لوگوں تک پہنچادیں اور لوگوں سے بیان کریں۔

یتیم پر سختی نہ کرو

یتیم کی عزت کرنے کا حکم، اس کو دبانے اور دل شکستہ و ذلیل کرنے کی ممانعت اور سائل کی ضروریات نرمی اور عزتِ نفس کے ساتھ پوری کرنے کی ہدایات مکہ کی اس جاہل سوسائیٹی کی اصلاح کے لیے دی گئی ہیں جو انسانی حقوق کی منکر، غریبوں یتیموں اور محتاجوں کو دبانے کی خوگر تھی۔ جو زرپرستی، حرام خوری اور مال ودولت سے بے انتہا محبت کرنے والی تھی وہ معاشرہ اُن کمزوروں کا حق ادا کرنے کے لیے تیار نہ تھا جو اپنے حقوق کی محافظت اپنے زور بازو سے نہ کرسکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی شریعت کے ذریعے اس سماج کی اصلاح فرمائی اور اسے حق گوئی، عدل و انصاف اور حدوداللہ کی محافظت کا علمبردار بنایا۔ جو سماج اب تک لوگوں کے حقوق چھینتا تھا وہی سماج اب ان کے حقوق کا محافظ بن گیا۔ جو اللہ کے حدود کو پھاندنے ولا سماج تھا وہ اب حدوداللہ کا پاسبان بن گیا۔ جو یتیموں کا مال کھاتا تھا وہ اب ان کا والی بن گیا۔

اور سائل کو نہ جھڑکو

آگے فرمایا گیا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سائل کو نہ جھڑکو یعنی اگر سائل آپ کے پاس آئے تو اس سے نرمی کے ساتھ پیش آؤ۔ سائل کو کئی معنوں میں لیا گیا ہے ایک یہ کہ اگر کوئی حاجتمند مدد مانگنے کے لیے آئے تو اگر مدد کرسکتے ہو تو اس کی مدد کیجئے۔ اس معنی کے لحاظ سے یہ ہدایت اللہ تعالیٰ کے اس احسان کے بدلے میں ہے جو احسان اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اس وقت کیا جب آپ نادار تھے تو آپ کو مالدار کیا۔ اس لیے جب کوئی نادار یا محتاج آپ کے پاس مدد طلب کرنے کے لیے آئے تو جتنا ہوسکے اس کی مدد کی جائے۔

اگر سائل کو دین کا کوئی مسئلہ یا حکم دریافت کرنے والے کے معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص خواہ کتنا ہی جاہل اور گنوار ہو اور کتنے ہی نامعقول اور غیر شائستہ طریقے سے سوال کرے یا اس کے ذہن میں کوئی الجھن ہو بہرحال نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے کہ شفقت سے اسے جواب دیں اور بد مزاج لوگوں کی طرح جھڑک کر اسے دور نہ کردیں۔ اس معنی کے لحاظ سے یہ ارشاد اللہ تعالیٰ کے اس احسان کے جواب میں ہے کہ آپ ناواقف راہ تھے یعنی آپ کو خدا کا راستہ معلوم نہ تھا پھر آپ کو اللہ نے راہ دکھائی بعض مفسرین نے اسی معنی اور رائے کو ترجیح دی ہے۔ ان آیات کے نازل ہونے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی بھر کسی سائل کو خالی ہاتھ نہ لٹایا۔ اگر آپ کے پاس دینے کے لیے کچھ ہوتا تو دے دیتے اور اگر آپ کے پاس کچھ نہ ہوتا فرماتے کہ میرے نام پر قرض لو، میں ادا کروں گا یہی وجہ ہے کہ جب فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا تو آپ کی خدمت میں ڈھیروں مال پہنچ گیا لیکن آپ کے کاشانے کا حال یہ رہا:

بس ایک مشکیزہ، اک چٹائی

ذرا سا جَو ایک چارپائی

بدن پر کپڑے واجبی سے

نہ خوش لباسی، نہ خوش قبائی

یہی ہے کل کائینات جس کی

گِنی نہ جائیں صفات جس کی

وہی تو سلطانِ بحر و بر ہے

مِرا پیمبرؐ عظیم تر ہے

ایک مرتبہ بحرین سے کئی ہزار درہم مال غنیمت کے طور پر آئے آپ نے نماز فجر کے بعد اس مال غنیمت کو لوگوں میں بانٹنا شروع کیا اور ظہر تک ایک درہم بھی باقی نہ رہا اسی دوران اتفاقاً ایک سائل آگیا اور اس نے کچھ درہم مانگے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹھنڈے دل سے فرمایا کہ اب مال غنیمت میں سے کچھ باقی نہ رہا البتہ آپ میرے نام پر کسی سے کچھ درہم ادھار لو اور اس سے کہو کہ میں (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) بذات خود ادا کروں گا۔

اسی طرح جب بھی کوئی شخص دین کا کوئی مسئلہ یا حکم دریافت کرنے کے لیے آیا خواہ وہ کتنا ہی جاہل اور غیر شائستہ تھا نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیار اور شفقت سے اسے سمجھانے کی کوشش کی اور کبھی ترش روی میں جواب نہ دیا۔ اگر کسی نے کبھی شرارت یا غصے میں بات کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ حتیٰ کہ ایک بدو نے آپ کے سامنے مسجد میں پیشاب کیا۔ جب صحابہ نے آپ کو ڈانٹنا شروع کیا تو آپ نے اسے ڈانٹنے کے بجائے سمجھایا کہ یہ مسجد نماز پڑھنے کی جگہ ہے یہاں پیشاب کرنا جائز نہیں ہے، پھر آپؐ نے خود اس پیشاب پر پانی انڈیل کر اُسے بہادیا۔ اس سلوک کو دیکھ کر بدو نے آپ سے کہا کہ میں نے آپ سے بڑھ کر کوئی شفیق معلم اور مربی نہیں دیکھا ہے۔

اور اپنے رب کی نعمت کا اظہار کرو

اب اللہ کے احسانات اور نعمتوں کے بارے میں ہدایت دی جارہی ہے کہ اہل ایمان اپنے محسن رب ذوالجلال کی نعمتوں کا شکر ادا کریں جس کی تکمیل اس بات سے ہوتی ہے کہ اس کے بندوں سے حسن سلوک اور نیکی کا رویہ اختیار کیا جائے یہ اپنے محسن خالق حقیقی کا شکرا دا کرنے کا بہترین طریقہ اور اس لی نعمتوں کا ذکر کرنے کی بہترین صورت ہے۔

جس نعمت کا اظہار کرنے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے وہ کوئی ایک ہی نعمت نہیہے بلکہ اس سے مراد گوناگوں نعمتیں ہیں جو اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائی ہیں۔ ان نعمتوں سے مراد وہ نعمتیں ہیں جو اس سورہ کے نزول کے وقت تک اللہ تعالیٰ نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائی تھیں اور وہ نعمتیں بھی جو بعد میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ان وعدوں کے مطابق آپ کو عطا فرمائیں جو وعدے اس سورہ میں کئے گئے تھے۔ نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا کہ ہر اس نعمت کا ذکر اور اظہار کرو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو عطا کی گئی ہیں۔

نعمتوں کا ذکر اور اظہار مختلف صورتوں میں ہو سکتا ہے۔ مجموعی طور پر تمام نعمتوں کے اظہار کی صورت یہ ہے کہ زبان سے اللہ کا شکر ادا کیا جائے اور اس بات کا اقرار کیا جائے کہ جو نعمتیں مجھے حاصل ہوئی ہیں یہ سب اللہ کا فضل و احسان ہے میرے ذاتی کمال کا نتیجہ نہیں ہے۔ نبوت کی نعمت کا اظہار اس طریقہ سے ہو سکتا ہے کہ دعوت و تبلیغ کا حق ادا کیا جائے۔ قرآن کی نعمت کے اظہار کرنے کی صورت یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک قرآن کا پیغام پہنچایا جائے۔ ہدایت کی نعمت کا اظہار اس طرح ہو سکتا ہے کہ اللہ کی بھٹکی ہوئی مخلوق کو سیدھا راستہ بتایا جائے اور اس کام میں جو بھی مشکلات پیش آئیں انہیں صبر کے ساتھ برداشت کیا جائے۔ یتیمی میں اللہ تعالیٰ نے آپ پر دستگیری کا جو احسان کیا ہے اس کا اظہار اس طرح کیا جائے کہ یتیموں کے ساتھ احسان کا سلوک کیا جائے۔ نادار سے مالدار بنانے کا اللہ نے جو احسان آپ پر کیا اس کا اظہار اس طرح کہ اللہ کے محتاج بندوں کی مدد کی جائے۔ الغرض یہ ایک بہت بڑی جامع ہدایت تھی جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات و احسانات بیان کرنے کے بعد اس مختصر فقرے میں اپنے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمادی۔

سُوْرَۃُ اَلَمْ نَشْرَحْ مکیۃ

اٰیٰتُہا:8 رکوعھا:1

بسم اللہِ الرَّحمٰن الرَّحیم

أَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَo وَوَضَعْنَا عَنکَ وِزْرَکَo الَّذِي أَنقَضَ ظَہْرَکَo وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَo فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًاo إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًاo فَإِذَا فَرَغْتَ فَانصَبْo وَإِلَیٰ رَبِّکَ فَارْغَبo

پس منظر:

سورہ الضحیٰ کی طرح اس سورہ میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر خدا کی مہربانی، رحمت، شفقت

اور محبت کی جھلک نمایاں ہے اس میں بھی خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر خدا کے لطف وکرم اور سرپرستی کی یقین دہانی ہے۔

اس سورہ میں گزشتہ سورۃ میں گنے گئے احسانات کے بعد اُن احسانات کا ذکر کیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اس وقت نازل فرمادئیے جب نبوت کے ابتدائی دور میں ہی آپؐ اپنے آپ کو کارنبوت کی ذمہ داری کے بوجھ تلے دبے ہوئے محسوس کرتے تھے اس دباؤ کو دور کرنے کی خاطر ان سے فرمایا گیا کہ اللہ نے تمہاری مدد فرمائی اور تمہارا شرح صدر فرمایا یعنی تمہارا سینہ اسلام کے لیے کھول دیا اور آپ پر سے وہ بوجھ اتاردیا جو شدید غور وفکر (acute meditation and contemplation) سے آپ کی کمر توڑے ڈال رہا تھا اور آپ کا ذکر ہمیشہ کے لیے بلند کردیا۔

نبوت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان حالات سے کبھی سابقہ نہ پڑا تھا جن سے انہیں نبوت کے بعد دعوت اسلامی کا آغاز کرتے ہی یکایک پڑا۔ یہ خود آپ کی زندگی میں ایک عظیم انقلاب تھا جس کا اندازہ آپ کو نبوت سے پہلے نہ تھا جوں ہی آپ نے اسلام کی تبلیغ شروع کردی تو دیکھتے دیکھتے وہی معاشرہ آپ کا دشمن ہوگیا۔ جس معاشرے میں آپ نبوت سے پہلے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ جو رشتے دار، دوست، قبیلے کے لوگ اور ہمسایہ نبوت سے پہلے آپ کی بے انتہا عزت کرتے تھے وہی لوگ اب آپ کو ستانے لگے آپ پر آوازے کسے جانے لگے، قدم قدم پر آپ کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اگرچہ بعد میں انہیں ان حالات کا مقابلہ کرنے کی عادت پڑگئی لیکن نبوت کے ابتدائی دور میں ایسے حالات آپ کے لیے نہایت دل شکن تھے اس لیے آپ کو تسلی اور اطمینان دینے کے لیے پہلے سورہ وضحی اور اس کے بعد سورہ اَلَمۡ نَشۡرَح پے درپے نازل کئے گئے۔

اس سورہ میں اللہ تعالیٰ سب سے پہلے آپ کی تسلی کے لیے آپ سے فرماتے ہیں کہ ہم نے آپ کو تین بڑی نعمتیں عطا کیں، جن کی موجودگی میں آپ دل شکستہ نہ ہوں۔ ایک شرح صدر کی۔ دوسری آپ کے اوپر سے وہ بوجھ اتاردینے کی جو نبوت سے پہلے آپ کی کمر توڑے جارہا تھا۔ تیسری رفع ذکر کی۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطمینان دلاتے ہیں کہ مشکلات کے اس دور کے بعد فراخی و آسانی کا دور بھی آئے گا۔

آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دی جارہی ہے کہ ان سختیوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت آپ کے اندر صرف اس چیز سے پیدا ہوگی کہ آپ اپنے مشاغل سے فارغ ہوکر عبادت اور ریاضت میں لگ جائیں اور ہر چیز سے بے نیاز ہوکر صرف اپنے رب سے رابطہ قائم کریں۔

سورۃ کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس دعوت کے ذمہ دار ٹھہرائیے گئے تھے اس دعوت کے خلاف سازشوں کا ایک خوف ناک جھال پھیلا ہوا تھا جس سے آپ لی روح مقدس بے قراری اور اضطراب میں مبتلا تھی۔ دشمنوں کی سازش سے محفوظ رہنے اور اپنے

مشن کو آگے بڑھانے کی فکر سے آپ کا سینہ مبارک بوجھل اور دل مبارک مغموم تھا۔ ان ہی حالات میں شرین زبان اور محبت بھری گفتگو میں یہ آیات نازل ہوئیں۔

أَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ(۱)

اے نبیؐ! کیا ہم نے تمہاری خاطر تمہارا سینہ نہیں کھول دیا؟

وَوَضَعْنَا عَنکَ وِزْرَکَ(۳)

اور آپ پر سے وہ بھاری بوجھ اتار دیا

الَّذِیْ أَنقَضَ ظَهْرَکَ(۳)

جو تمہاری کمر توڑے ڈال رہا تھا

وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ(۴)

اور تمہاری خاطر تمہارے ذکر کا آوازہ بلند کردیا

کیا ہم نے تمہارے لیے تمہارا سینہ نہیں کھول دیا؟

سینہ کھول دینے کا مطلب یہ ہے کہ نبیؐ کے سینہ مبارک کو اللہ نے اپنے نور سے منور کردیا جس سے ان کا دل مبارک فراخ اور کشادہ ہوگیا سورہ انعام آیت ۱۲۵ میں فرمایا گیا ہے:

فَمَن یُرِدِ اللہُ أَن یَہْدِیَہُ یَشْرَحْ صَدْرَہُ لِلإِسْلاَمِo پس جس شخص کو اللہ تعالیٰ ہدایت بخشنے کا ارادہ فرماتا ہے اُس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔

یہاں شرح صدر سے مراد ہر قسم کے ذہنی خلجان اور تردّد سے پاک ہوکر اس بات پر پوری طرح سے مطمئن ہوجانا کہ اسلام کا راستہ ہی برحق ہے اور وہی عقائد، وہی اصول اخلاق اور تہذیب اور وہی احکام وہدایات صحیح ہیں جو اسلام پیش کرتا ہے۔

سورہ شعرأ آیت:۱۲-۱۳ میں فرمایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ نے نبوت کے منصب پر مامور کردیا اور فرعون اور اس کی سلطنت سے ٹکر لینے کا حکم دیا تو انہوں نے عرض کیا:

رَبِّ إِنِّیٓ أَخَافُ أَن یُکَذِّبُونِo وَیَضِیقُ صَدْرِیْ

اے میرے رب میں ڈرتا ہوں کہ وہ لوگ مجھے جھٹلادیں گے اور میرا سینہ تنگ ہورہا ہے

اور سورہ طٰہٰ کی آیات ۲۵-۲۶ میں بیان کیا گیا ہے کہ اس موقع پر حضرت موسٰی نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگی

رَبِّ اشۡرَحۡ لِیۡ صَدۡرِیۡ o وَیَسِّرۡ لِیۡۤ اَمۡرِیۡ o

یہاں سینے کی تنگی سے مراد یہ ہے کہ حضرت موسٰی نبوت جیسے کار عظیم کا بار اٹھانے اور تن تنہا کفر کی ایک جابر و قاہر طاقت سے ٹکر لینے کی ہمت نہ کرتے تھے اس لیے ان کا سینہ تنگ ہو رہا تھا یعنی وہ اس کام کو اپنے لیے نہایت مشکل سمجھتے تھے اس لیے انہوں نے شرح صدر کی دعا کی۔ شرح صدر (سینہ کھولنے) سے مراد یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کا حوصلہ بلند ہو جائے اور ایک بڑی مہم پر جانے میں اور سخت ترین کام کو انجام دینے میں ان کا دل تنگ نہ ہو جائے اور نبوت کی عظیم ذمہ داریاں سنبھالنے کی ان میں ہمت پیدا ہو جائے اور اس سخت کام کو انجام دینے میں وہ خوف محسوس نہ کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ مبارک کھول دینے سے یہ دونوں معنی مراد ہیں پہلے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہے کہ نبوت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین عرب، یہود و نصاریٰ اور مجوس سب کے مذہبوں سے بے زار تھے اور انہیں غلط سمجھتے تھے۔ وہ عرب کے بعض توحید کا دعویٰ کرنے والوں سے بھی مطمئن نہ تھے کیونکہ ان کا دعویٰ اور عقیدہ مبہم تھا اور اس میں ہدایت کی کوئی دلیل موجود نہ تھی چونکہ آپ کو خود یہ معلوم نہ تھا کہ راہ ہدایت کیا ہے اس لیے آپ ذہنی خلجان میں مبتلا تھے نبوت عطا کر کے اللہ تعالیٰ نے آپ کے اس خلجان کو دور کر دیا اور آپ نے ہدایت کا راستہ پایا جس سے آپ کو اطمینان قلب حاصل ہو گیا۔

دوسرے معنی کے لحاظ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت خدشات تھے کہ لوگ میری نبوت کا انکار کریں گے اور مجھے تکلیف دینے کے درپے رہیں گے۔ اس لیے ان کا دل مبارک بھی تنگ ہو رہا تھا اور ان پر نبوت کی ذمہ داری کا بوجھ پڑا ہوا تھا اس سے آپ غمگین اور پریشان تھے۔ اس لیے ان سے فرمایا گیا کہ ہم نے آپ کا شرح صدر کیا یعنی آپ کا سینۂ مبارک آپ کے عظیم کام کے لیے وسیع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ حوصلہ اور ہمت بخشی جو اس منصب عظیم کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے درکار تھی۔ آپ کو وہ علم عطا کیا گیا جو آپ کے سوا کسی انسان کے پاس نہ تھا۔ آپ کو وہ حکمت عطا کی گئی جو بڑے سے بڑے بگاڑ کو دور کرنے کی اہلیت رکھتی تھی اور یوں آپ اس قابل ہو گئے کہ جاہلیت کے معاشرے میں کسی ظاہری سروسامان اور مادّی طاقت کے بغیر اسلام کے علمبردار بن گئے اور بڑے بڑے طوفانوں سے مقابلہ کرنے سے نہ ہچکچائے اور خدا کی راہ میں جو تکلیفیں اور مصیبتیں پیش آگئیں ان کو صبر کے ساتھ برداشت کیا اور کوئی طاقت آپ کو اپنے موقف سے ہٹا نہ سکی۔ شرح صدر کی یہ بیش بہا دولت جب اللہ نے آپ کو عطا کر دی تو آپ نے تمام مشکلات پر قابو پا لیا۔

بعض مفسرین شرح صدر کو شق صدر کے معنی میں لیتے ہیں اور اپنی دلیل کے حق میں روایات پیش کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دو مرتبہ شق صدر کیا گیا یعنی ان کا سینہ چیر لیا گیا۔ ایک مرتبہ بچپن میں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف چار سال کی تھی۔ حضرت جبریل علیہ السلام آئے اور انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل چیر لیا اور اس سے وہ شیطانی حصہ نکال دیا جو ہر انسان کے اندر موجود ہوتا ہے۔ جسے مومن ہمیشہ قابو میں رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر اسے دھو کر بند کر دیا۔ دوسری مرتبہ معراج کے موقع پر جبریل امین نے آپ کا سینہ مبارک چاک کر کے دل نکالا اور اسے آب زمزم سے دھو کر ایمان و حکمت سے بھر کر اپنی جگہ رکھ دیا۔

اگرچہ شق صدر یعنی سینہ چیر کر دل کو آپ زمزم سے دھو کر صاف کرنے کی روایت حدیث سے ثابت ہے تاہم قرآن سے اسے ثابت کرنے کی کوشش ٹھیک نہیں ہے کیونکہ عربی زبان کے لحاظ سے شرح صدر کو سینہ چیرنے اور دل کو نکال کر صاف کرنے کے معنی میں نہیں لیا جا سکتا ہے۔ علامہ آلوسی نے روح المعانی کی تفسیر میں محققین کے حوالے سے شرح صدر - سینہ کھولنے کو شقِ صدر - دل چیرنے پر محمول کرنے کو حقیقت کے برخلاف قرار دیا ہے۔ اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خیرالبشر یعنی انسانوں میں بہترین انسان تھے۔ جب ایک عام انسان بشریت کے ناطے گناہوں سے اجتناب کر کے خدا کی پناہ میں آجاتا ہے اور راہ ہدایت پا کر خدا کا نیک اور برگزیدہ بندہ ہونے کا اعزاز حاصل کرتا ہے تو نبی جو لوگوں کو خدا کی بندگی کرنے اور گناہوں سے بچنے کی ہدایت لے کر آئے ہیں۔ بشریت کے ناطے اپنے آپ کو گناہوں سے کیوں نہیں بچا سکتے ہیں۔ ان کا سینہ چاک کرنے اور دل نکال کر زمزم کے پانی سے دھونے اور دوبارہ سینے میں رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔

نبی اگرچہ معصوم ہوتے ہیں وہ اس طرح کا کوئی گناہ نہیں کرسکتے ہیں جس طرح کا گناہ ایک عام آدمی سے سرزد ہوسکتا ہے لیکن بشر ہونے کے ناطے نبیوں کی بھی خواہشات اور ضروریات ہوتی ہیں اور ان خواہشات کو قابو میں رکھنے کی بنا پر ہی نبیوں کو معصوم قرار دیا گیا ہے۔ اگر نبیوں کو خواہشات اور دنیائی امور اور معاملات کے جذبات سے پاک کردیا جاتا تو وہ انسانوں کے بجائے فرشتوں میں شمار ہوتے اور ان کی آزمائشیں بے معنی اور بے مقصد رہ جاتیں بشریت کے ناطے ہی حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے نکالا گیا اور پھر جب اس نے توبہ کی تو اسے جنت سے نکال کر زمین پر بشر اول کی حیثیت سے لایا گیا۔ بشر ہونے کی وجہ سے ہی حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی کی پیٹ میں ڈالا گیا اور پھر جب اس کی توبہ قبول ہوئی تو اسے مچھلی کے پیٹ سے نکال کر دوبارہ نبوت سے نوازا گیا۔

ان واقعات کے پیش نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب یہ واقعہ کہ ان کا سینہ مبارک چیر لیا گیا اور ان کا دل مبارک نکال کر صاف کرکے دوبارہ سینے میں بھر دیا گیا اور سینہ مبارک کو سی لیا گیا اور روایت کے مطابق حضرت انسؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے میں سلائی کے نشان دیکھ لیے تھے۔ ایک غیر منطقی (illogical) اور غیر معقول (irrational) واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عملاً سینہ چیرنے اور دل نکالنے کی سرجری کی ضرورت نہیں تھی۔ انسان کو سرجری کی ضرورت اسی وقت پیش آتی ہے جب اسے کوئی بیماری لاحق ہویا اس کے کسی عضو میں کوئی خرابی ہو تو اس تکلیف کو دور کرنے کی خاطر اس عضو کی سرجری کے ذریعہ سے یا تو صاف کیا جاتا ہے یا شدید انفکشن (infection) ہونے کی وجہ سے اپنی جگہ سے ہٹایا جاتا ہے۔ یا عضو کو نکال کر کسی اور جسم میں منتقل (transplant) کیا جاتا ہے۔ اس حقیقت کی روشنی میں علامہ آلوسی نے سرجری کے اس عمل کو غیر مناسب اور غیر معقول قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجر کے قول کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شق صدر (سینہ چیرنا) خرق عادت واقعات (انوکھے واقعات) میں ایک واقعہ ہے اسے تسلیم کرنے میں کوئی حرج نہیں اور اس کی تاویل کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ معجزات میں شامل ہے اور معجزات کا ظاہر کرنا اللہ تعالیٰ کے لیے محال نہیں ہے۔

اگرچہ اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ خرق عادت واقعات (انوکھے واقعات) اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہی ظہور پذیر ہوتے ہیں تاہم اس حقیقت کو تسلیم کرنا ضروری ہے کہ کسی روایت کی قبولیت کا انحصار روایت کی سند ارو معیار پر ہوتا ہے اس لیے بلا سند اور غیر معیار روایت یا واقعہ سے اتفاق کرنا صحیح نہیہے۔ شق صدر کے روایت کی سند کمزور اور غیر معتبر ہے اس لیے اس روایت پر انحصار اور اعتبار کرنا ضروری نہیں۔

اور آپ پر سے وہ بھاری بوجھ اتار دیا، جو تمہاری کمر توڑے ڈال رہا تھا

مطلب یہ ہے کہ آپ ذمہ داری کے جس بوجھ کے تلے دبے ہوئے تھے اسے ہم نے آپ کے کندھوں سے اتار دیا ہم نے تمہارے لیے دعوت حق کو آسان بنادیا اوریہ کہ ہماری توفیق سے لوگ آپ کی دعوت قبول کریں گے۔

آیت میں وِزر کا معنی بھاری بوجھ ہے۔یہ ان پریشانیوں کا بوجھ تھا جو اپنی قوم کی جہالت کو دیکھ کر آپؐ کی حساس طبعیت پر پڑا تھا۔ آپ جس سماج میں زندگی گزار رہے تھے اس سماج میں بت پرستی عام تھی شرک، رسوم بد اور توہم پرستی کا بازار گرم تھا، بداخلاقی اور بے حیائی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی، معاشرہ ظلم و جبر اور فساد سے بھرا ہوا تھا۔ طاقتوروں اور زور آوروں کے سامنے کمزور لوگ بے بس تھے۔ لڑکیوں کو زندہ دفنایا جارہا تھا۔ قبیلے ایک دوسرے کے خلاف سالہاسال انتقامی لڑائیوں میں مصروف رہتے تھے۔ کسی کی جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ نہ تھی۔یہ حالت دیکھ کر آپؐ بے حد پریشان ہورہے تھے کیونکہ اس بگاڑ اور بے راہ روی کو دور کرنے کی آپ کو کوئی صورت نظر نہ آرہی تھی۔ اسی فکر اور پریشانی کا بھاری بوجھ آپؐ کو تکلیف دے رہا تھا جو آپؐ کے لیے کمر توڑ تکلیف تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ہدایت کا راستہ دکھا کر آپ کے اوپر سے یہ بوجھ اتار دیا اور نبوت کے منصب پر سرفراز ہوتے ہی آپ کو معلوم ہوگیا کہ توحید، آخرت اور رسالت پر ایمان ہی وہ چابی ہے جس سے حیاتِ بشر پر چڑھے فساد کے ہر تالے کو کھولا جاسکتا ہے اور زندگی کے ہر پہلو(field) میں اسی اعتماد کی بدولت آپ کا راستہ صاف ہوگیا اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور اس کی راہنمائی سے آپ کے ذہن کا سارا

بوجھ ہلکا ہوگیا۔ آپ کے تمام کام آسان ہوگئے۔

ہم نے تمہاری خاطر تمہارا ذکر بلند کردیا

اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندے اور محبوب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پیار و محبت کی گفتگو (conversation) کر رہا ہے کہ ہم نے آپ کا درجہ اور مرتبہ بہت بلند کیا اور آپ کا ذکر اس طرح بلند کیا کہ صدیاں گزر جائیں گی اور قوموں کے بعد قومیں آتی رہیں گی لیکن آپ کا ذکر ہر دور اور ہر قوم میں بلند رہے گا اور اربوں کی تعداد میں لوگ آپ کا نام مبارک محبت کے ساتھ لیتے رہیں گے۔ رفعِ ذکر کا یہ اعلان رب العالمین نے اس زمانہ میں فرمایا جب کوئی شخص یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جس فرد واحد کے ساتھ چند لوگ ہیں، جن کی پہچان صرف شہر مکہ تک محدود ہے، اُس کا آوازہ (ذکر) دُنیا بھر میں ناموری کے ساتھ بلند ہوگا ! لیکن جس رب العالمین نے ان حالات میں اپنے رسول کو یہ خوشخبری سنائی اسی نے اس وعدہ کو پورا کیا۔ سب سے پہلے رفعِ ذکر کا یہ کام اُس نے خود آپ کے دشمنوں سے کروایا۔ حج کے موقعہ پر جب تمام عرب سے لوگ مکہ میں جمع ہوجاتے تھے تو مشرکین کے وفود حاجیوں کے ایک ایک ڈھیرے پر جاتے اور انہیں خبردار کرتے کہ یہاں محمدؐ نامی شخص لوگوں پر ایسا جادو کرتا ہے کہ باپ اور بیٹے، بھائی اور بھائی اور شوہر اور بیوی میں جدائی ہوجاتی ہے۔ اس لیے اس شخص سے دور رہنا۔ جو لوگ کاروبار یا کسی اور کام کے سلسلے میں مکہ آتے تھے یہ احمق اُن سے بھی یہی باتیں کہتے تھے اس طرح وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بدنام کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب کے گوشے گوشے میں آپ کا نام پہنچ گیا اور اس طرح دشمنوں نے آپ کو مکہ کے گوشہ گمنامی سے نکال کر عرب کے تمام قبائل سے متعارف کرادیا۔ یوں لوگوں میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے اور ان سے بات کرنے کا تجسس (curiosity) اور اشتیاق (zeal) پیدا ہوا اور ہر وہ شخص جس کے کانوں تک دشمنوں کی یہ اطلاع پہنچ جاتی کوشش کرتا تھا کہ محمدؐ سے ملاقات ہو پھر جب یہ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ جاتے تو انہیں آپ کے اخلاق اور آپ کی سیرت و کردار کا حال معلوم ہوتا اور قرآن سن کر انہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا علم ہوتا تھا۔ یوں جس چیز کو محمدؐ کے دشمن جادو کہتے تھے اس سے متاثر ہوکر لوگ محمدؐ اور ان کی تعلیم پر ایمان لاتے تھے اور یہی لوگ دشمنوں کی اس بدنامی کے حربہ کو نیک نامی میں بدلنے کا کام کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ہجرت کے زمانے تک عرب قبائل میں شاید ہی ایسا کوئی قبیلہ رہ گیا ہو جس تک اسلام کی دعوت نہ پہنچ گئی ہو اور جس میں کسی نہ کسی شخص یا کنبے (family) نے اسلام قبول نہ کرلیا ہو۔ یہ نبی کے رفعِ ذکر کا پہلا مرحلہ تھا جسے نبی کے دشمنوں نے خود پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا۔

ہجرت کے بعد رفعِ ذکر کی تحریک دشمنوں کے ذریعہ سے دوسرے مرحلے میں داخل ہوگئی۔ جس میں ایک طرف منافقین، یہود اور مشرکین عرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بدنام کرنے کی مہم چلا رہے تھے اور دوسری طرف مدینہ کی اسلامی ریاست خداپرستی، تقویٰ حسن اخلاق، عدل وانصاف، انسانی مساوات اور رواداری، مالداروں کی فیاضی، غریبوں کی امداد، عہدوپیماں کی پاسداری اور معاملات میں راست بازی کا وہ عملی نمونہ پیش کررہی تھی جو دلوں کو فتح کرتا جارہا تھا۔ دشمنوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس بڑھتے ہوئے اثر کو جنگ کے ذریعے مٹانے کی کوشش کی مگر آپ کی قیادت میں اہل ایمان نے نظم و ضبط، شجاعت ودلیری، موت سے بے خوفی اور شہادت کی تمنا، خوش اخلاقی اور خوش گفتاری، سچائی دیانت و امانت اور اخلاقی حقوق کی پابندی سے برتری حاصل کرکے سارے عرب میں اپنا لوہا منوایا۔ دس سال کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر اس طرح بلند ہوا کہ وہی ملکِ عرب جس میں آپ کو بدنام کرنے کے لیے مخالفین نے سارا زور لگادیا تھا اُس کا گوشہ گوشہ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدً رَّسُوْلُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صدا سے گونج اٹھا۔

اس کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رفعِ ذکر کی تحریک تیسرے مرحلے میں داخل ہوگئی جس کا آغاز خلافت راشدہ کے دور سے ہوا جب آپ کا نام مبارک تمام روئے زمین پر بلند ہونا شروع ہوگیا۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے اور ان شاء اللہ قیامت تک جاری رہے گا۔ دنیا بھر میں ہر جگہ مسلمانوں کے ذریعہ سے پانچ مرتبہ اذان میں بلند آواز میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اعلان ہوتا ہے نماز میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجا جاتا ہے۔ جمعہ کے خطبوں میں آپ کا ذکر خیر کیا جاتا ہے۔ سال کے بارہ مہینوں میں ہر دن اور دن کے چوبیس(۲۴) گھنٹوں میں ہر وقت روئے زمین پر کسی نہ کسی جگہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہورہا ہے۔ یہ قرآن کی صداقت کا ایک کھلا ثبوت ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رفعِ ذکر اس شان و شوکت سے اور اتنے بڑے پیمانے پر ہورہا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب میرا ذکر کیا جائے گا تو میرے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بھی کیا جائے گا۔ تاریخ شہادت دے رہی ہے کہ یہ بات حرف بہ حرف پوری ہوئی۔

جب آیت وَرَفَعۡنَا لَکَ ذِکۡرَکَ نازل ہوئی اس وقت کوئی شخص اس بات کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ اس شان و شوکت سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بلند ہوگا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح حیات پر جتنی کتابیں مسلمانوں اور غیر مسلموں نے لکھی ہیں دنیا کے کسی نبی اور کسی نامور ہستی کے بارے میں اتنی کتابیں نہیں لکھی گئی ہیں اور جتنا بلند مقام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بخشا گیا تاریخ میں ایسا مقام کسی کو حاصل نہ ہوسکا۔ جن لوگوں نے آپ کی نبوت کو تسلیم نہ کیا انہوں نے بھی آپ کو دنیا کا سب سے بڑا قابل احترام اور عظیم الشان انسان قرار دیا۔

"The Hundred" نامی کتاب کے مصنف نے دُنیا کی ایک سو قابل اثر شخصیات (influenctial personalities) کے حالات و کوائف پر مشتمل ایک وقیع دستاویز مرتب کی۔ عیسائی ہونے کے باوجود کتاب کے مصنف نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سرفہرست یعنی پہلے نمبر پر رکھا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کی سب سے زیادہ بااثر (influential) شخصیت تھی جنہوں نے دنیا کے سب سے زیادہ لوگوں کو متاثر کیا اور ان کی زندگی میں تبدیلی لائی اور جن کی سب سے زیادہ تعریف کی گئی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ماننے والوں اور نہ ماننے والوں سب کی زبان سے اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کروا کر انہیں دنیا کا روشن ستارہ بنادیا۔ اس طرح دنیا کے تمام غیر متعصب (un-biased) لوگوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت قبول کرلی اور ان کے تدبر، حسن اخلاق، انسان دوستی اور دیانت داری و امانت داری کی تعریف کرکے خود اپنا نام زندہ رکھوایا۔ 2018ء میں ہندوستان کی ایک ملی کانفرنس میں منعقدہ مشاعرہ میں ایک ہندو مذہبی گرو شری آچاریہ پرمود کرشن(Shri Acharya Pramod Krishnan) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ایک نظم پڑھی جس میں انہوں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بے حد تعریف کی نظم پیش خدمت ہے:

نبی کے بن نظاروں کا نظارہ ہو نہیں سکتا

مجھے اپنا کہو چاہے مجھے تم غیر کہہ دینا

نہیں ہے جو محمدؐ کا ہمارا ہو نہیں سکتا

میرے سینے کی دھڑکن ہے

میری آنکھوں کے تارے ہیں

سہارا بے سہاروں کا خدا کے وہ دلارے ہیں

سمجھ کر تم فقط اپنا انہیں تقسیم نہ کرنا

نبی جتنے تمہارے ہیں ہیں نبی اتنے ہمارے ہیں

سبق تم نے محبت کا ہر اک انساں کو سکھلایا

مقدس راستہ دے کر دین دنیا میں پھیلایا

تم ہی ساگر تم ہی دریا تم ہی کشتی تم ہی ملاح رسول اللہ رسول اللہ

(Shri Acharya Promod Krishnan)

اب یہ خیال بھی اپنی جگہ درست ہے کہ جب یہ غیر مسلم لوگ خدا اور اس کے رسول پر ایمان نہیں لاتے ہیں تو ان کی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف ان کے نام سے پیدائش کے وقت سے ہی شروع کی گئی۔ محمد کا معنیٰ تعریف کیا گیا اور وہ جس کی تعریف کی جائے۔ دراصل یہ اللہ تعالیٰ کا منشا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف ہو۔ لہٰذا الٰہی حکم ہوا کہ ان کے نام کی تعریف میں اضافہ کیا جائے اور دنیا کے لوگوں سے بھی بلا لحاظ ملت و مذہب تعریف کروائی جائے اور اس طرح ان کی شان بڑھادی جائے اللہ کے اسی منشا کے مطابق ہر کوئی چاہے مسلم ہو یا غیر مسلم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کرتا ہے اور ان کا نام عزت سے لیتا ہے۔ واللہ اعلم۔

وہ جس کا ذکر ہوتا ہے زمین اور آسمانوں میں

فرشتوں کی دعاؤں میں مؤذن کی اذانوں میں

فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا(۵)

پس حقیقت یہ ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے

إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا(٦)

بے شک تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے

فَإِذَا فَرَغْتَ فَانصَبْ(۷)

لہٰذا جب تم فارغ ہو تو عبادت میں لگ جاؤ

وَإِلَى رَبِّكَ فَارْغَبْ(۸)

اور اپنے رب ہی کی طرف راغب ہوجاؤ

پس حقیقت یہ ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے

آیت کو دو بار دہرانے سے حقیقت پر تاکید کا اظہار ہوتا ہے اس تکرار اور تاکید سے اس بات کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نبیؐ بہت زیادہ تنگی، دشواری اور مشقت سے دوچار تھے اس لیے انہیں اطمینان دلایا جارہا ہے کہ آپ کی اس تنگی اور دشواری کے بعد آپ کے لیے فراخی بھی ہوگی یعنی آپ کی مشکلات اور سختیوں کو دور کیا جائے گا اس طرح بات کو دو بار دہرایا گیا ہے تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پوری طرح تسلی دے دی جائے کہ جن سخت حالات سے آپ اس وقت گزر رہے ہیں یہ زیادہ دیر تک رہنے والے نہیں ہیں بلکہ ان کے بعد قریب ہی میں اچھے حالات آنے والے ہیں۔ بظاہر یہ بات تناقِص یعنی خلاف حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی ہو کیونکہ یہ دونوں چیزیں بیک وقت جمع نہیں ہوتیں مگر تنگی کے بعد فراخی کہنے کے بجائے تنگی کے ساتھ فراخی کے الفاظ اس معنی میں استعمال کئے گئے ہیں کہ فراخی کا دور اس قدر قریب ہے کہ گویا وہ اس کے ساتھ ہی چلا آرہا ہے۔ (تفہیم القرآن)

لیکن مولانا امین احسن اصلاحی اس کی تشریح اس کے برعکس کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں (یہ تکرار محض تاکید کے لیے نہیں، جیسا کہ عام طور پر لوگوں نے سمجھا ہے بلکہ اس سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ 'عُسر اور یُسر' دونوں اس دنیا میں لازم وملزوم ہیں ایک گھاٹی کسی نے پار کرلی تو یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ بس اب کسی نئی گھاٹی سے اس کو سابقہ پیش نہیں آنا ہے بلکہ دوسری اور تیسری گھاٹی بھی آسکتی ہے! چاہیے کہ ان کو عبور کرنے کا حوصلہ بھی رکھے۔ زندگی مسلسل جدوجہد سے عبارت ہے۔) (تدبرِ قرآن)

آیت میں اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْراً کے تکرار سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ ایک عُسر (مشکل) کے لیے دو یُسر (دو آسانیوں) کا وعدہ ہے اور مراد بھی خاص دو کا عدد نہیں بلکہ متعدد ہونا مراد ہے یعنی ایک عُسر (مشکل) جو آپ کو پیش آئے گی اس کے ساتھ بہت سی آسانیاں آپ کو دی جائیں گی۔ (معارف القرآن)

حضرت حسن بصری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَنْ یَغْلِبَ عُسْرٌ یُسْرَیْنِ۔ ایک عسر دو یسروں یعنی ایک مشکل دو آسانیوں پر غالب نہیں آسکتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جو کام لوگوں کو مشکل اور ناممکن نظر آتے تھے وہ کام نہ صرف نبیؐ کے لیے بلکہ صحابہؓ اور تمام اہل اسلام کے لیے آسان ہوگئے۔

لہٰذا جب تم فارغ ہو تو عبادت میں لگ جاؤ

اور اپنے ہی رب کی طرف راغب ہوجاؤ

اللہ تعالیٰ اپنے محبوب پیغمبر کو مخاطب کرکے دراصل تمام اہل ایمان کو ہدایت دے رہے ہیں کہ زندگی کی مشغولیات اور مصروفیات سے فراغت پاکر پوری یکسوئی اور دل لگی سے اپنے رب کی عبادت میں مشغول ہوجاؤ۔ یہی تمہارا زادِ راہ اور توشہ آخرت ہے۔

فارغ ہونے سے مراد اپنے مشغلوں اور کام سے فارغ ہونا ہے۔ خواہ وہ دعوت وتبلیغ کے مشاغل و

مصروفیات ہوں یا تعلیم و تربیت کے، یا ذاتی اور دنیوی کاموں کی مشغولیات ہوں یعنی جب تمام دنیاوی کاموں اور مصروفیات سے آپ فارغ ہوجاؤ گے تو ہر طرف سے توجہ ہٹا کر اپنے رب کی طرف عبادت و ریاضت کے لیے متوجہ ہوجاؤ۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے امت کو یہ تعلیم دی جارہی ہے کہ تمہاری زندگی محنت و مشقت سے بھری پڑی ہے اس لیے آپ اس محنت و مشقت کے کام سے فارغ ہونے کے بعد اطمینان اور اشتیاق سے خدا کی عبادت کرنے میں لگ جاؤ کیونکہ فضول بیٹھنا مومن کی شان نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ مومنوں کا بے کار بیٹھنا ایک ناپسندیدہ طریقہ ہے۔ خدا اپنے نیک بندوں کی صفات میں فرماتے ہیں: وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا (الفرقان:٦٤) (وہ لوگ اپنے رب کے حضور سجدے اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں) اللہ تعالیٰ نے نبیؐ کو جو حکم دیا ہے کہ آپ دنیا کی مشغولیات اور مصروفیات اور اُمور سے فارغ ہوکر اللہ کی عبادت میں مشغول ہوجاؤ اور نیک لوگوں کی یہ صفت بیان فرمائی کہ یہ لوگ اپنے رب کے حضور سجدے اور قیام میں راتیں گزرتے ہیں اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دنیا کی یہ مشغولیات اور مصروفیات بے مقصد اور فضول ہیں۔ خدا کے بندے چاہے حکومت کے ایوانوں میں ہوں یا عدالت کی کچہریوں میں ہوں۔ دفتر میں کام کرنے والے ہوں یا بازاروں میں تجارت کرنے والے ہوں۔ مزدوری کرنے والے ہوں یا افسر لوگ ہوں، فرمانروا ہوں یا زیر فرمان، سب خدا کی نظروں میں ہیں۔ دنیائی اموریں تقویٰ شعاری دین داری کی علامت ہے ہی، تاہم فراغت کے لمحات میں اللہ کے حضور قیام و سجود سونے کو کُندن بنانے کا قرآنی نسخہ(Formula) ہے۔

سُوْرَۃُ التِّیْن مکیۃ

اٰیٰتُہا:8 رکوعھا:1

بسم اللہِ الرَّحمٰن الرَّحیم

وَالتِّينِ وَالزَّيْتُونِ o وَطُورِ سِينِينَ o وَهٰذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ o لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ o ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ o إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ o فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّينِ o أَلَيْسَ اللهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِينَ o

پس منظر:

یہ سورہ انسانی فطرت کی وہ حقیقت بیان کرتی ہے جس پر اللہ نے اسے پیدا کیا ہے اور جو ایمان سے ہم آہنگ ہے۔ انسان ایمان کی فطرت سے انسانیت کے اعلیٰ درجہ تک پہنچ جاتا ہے لیکن جب انسان اپنی فطرت سے ہٹ کر ایمان کی راہ راست سے روگردانی کرتا ہے تو وہ پستیوں میں گرجاتا ہے اور اپنی وقعت اور قدر کھو دیتا ہے۔ وہ انسانیت کے معیار سے اترکر حیوانیت اختیار کرلیتا ہے اور اپنی عزت و آبرو خاک میں ملا دیتا ہے اور وہ انسانیت پر ایک بدنما داغ کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک اس سورہ کا مرکزی موضوع آخرت کی جزا و سزا ہے۔ راہ حق اختیار کرنے والے خدا کے فرمانبردار بندے آخرت میں بہترین جزا پائیں گے اور منکرین حق نافرمان سخت ترین سزا سے دوچار ہوگے۔

سورہ میں جن چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے بعض مفسرین کے مطابق یہ چیزیں تین مقامات سے تعلق رکھتی ہی جن مقامات پر جلیل القدر پیغمبر پیدا ہوئے۔

انجیر اور زیتون سے مراد شام کی سرزمین ہے جہاں ان چیزوں کی پیداوار کثرت سے ہوتی ہے۔ جہاں پر حضرت عیسٰی پیدا ہوئے اور جس سرزمین پر بہت سارے پیغمبروں نے جنم لیا ہے۔ طور سینین پر حضرت موسٰی علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے اور نبوت پائی۔ بلد امین سے مراد شہر مکہ جسے حضرت ابراہیم اور ان کے فرزند حضرت اسماعیل نے آباد کیا اور جہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے اور نبوت کے منصب پر فائز ہوئے۔ مکہ کو بلد امین یعنی امن والا شہر اس لیے کہا گیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے امن کا شہر بنادینے کے لیے اللہ سے دعا کی تھی۔ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا آمِناً (بقرہ:۱۲٦) ''اے میرے رب اس جگہ کو امن والا شہر بنادے''

انبیا کے مقامات کی قسم کھانے کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو ایک بہترین ساخت پر پیدا کیا گیا ہے اور ان انسانوں میں سے ہی وہ لوگ بھی پیدا ہوئے جنہیں نبوت عطا کی گئی۔

انسانوں کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو بہترین ساخت پر پیدا ہونے کے باوجود برائیوں کی طرف مائل ہوتے ہیں اور اخلاقی پستی میں گرجاتے ہیں۔ دوسرے وہ جو ایمان لاتے ہیں اور ہدایت کا راستہ اختیار کرلیتے ہیں اور بلند مقام پر پہنچ کر اللہ کی بہترین ساخت کو برقرار رکھتے ہیں۔

آخر میں فرمایا گیا ہے کہ دنیا میں حکم چلانے والوں کو چاہیے کہ وہ انصاف کریں اور یہ نہ بھول جائیں کہ اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم ہے وہ اَحْكَمُ الْحَاكِمِيْن یعنی سب سے زیادہ انصاف کرنے والا ہے۔

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ(۱)

قسم ہے انجیر کی اور زیتون کی

وَطُورِ سِيۡنِيۡنَ(۲)

اور طور سینین کی قسم

وَهٰذَا الۡبَلَدِ الۡاَمِيۡنِ(۳)

اور اس امن والے شہر کی قسم

قسم ہے انجیر کی اور زیتون کی

انجیر اور زیتون کی تفسیر میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ کئی مفسرین کی رائے میں انجیر سے مراد یہی انجیر ہے جسے لوگ کھاتے ہی اور زیتون سے مراد یہی زیتون ہے جس سے تیل نکالا جاتا ہے۔ ان کی رائے میں انجیر اور زیتون کے خاص فوائد ہیں اس لیے ان کی خوبیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کی قسم کھائی ہے۔

لیکن انجیر اور زیتون جیسے دو کھانے کی چیزوں کو دو مقامات، طور سینین اور امن والے شہر (مکہ) سے کوئی مناسبت دکھائی نہیں دیتی ہے اس لیے اگر انجیر اور زیتون کو ان مقامات کے معنی میں لیا جائے جہاں یہ وافر مقدار میں پیدا ہوتے ہیں تو پھر انجیر کا مطلب دمشق ہے کیونکہ انجیر دمشق میں ہی زیادہ پیدا ہوتا ہے اور زیتون کا مطلب بیت المقدس کا علاقہ ہے کیوں کہ زیتون کی پیداوار اسی علاقہ میں کثرت سے ہوتی ہے۔ اسی لحاظ سے چار چیزوں کے قسموں کی نسبت ان چار مقامات سے ہے جہاں جلیل القدر پیغمبروں نے جنم لیا ہے۔ تین اور زیتون کے متعلق یہ بھی بتایا گیا ہے کہ تین سے مراد حضرت نوح علیہ السلام کی وہ مسجد جو انہوں نے جودی پہاڑی پر بنائی تھی۔ جس پہاڑ پر طوفان کے دوران ان کی کشتی پار لگ گئی تھی اور زیتون سے مراد بیت المقدس ہے۔ لیکن تین اور زیتون کو بالواسطہ (indirectly) دمشق اور بیت المقدس کے ناموں سے جوڑنا عرب کے لوگوں کے لیے تسلیم کرنا مشکل ہے کیونکہ قرآن کے مخاطب عرب کے لوگوں میں یہ بات معروف نہ تھی کہ تین اور زیتون دمشق اور بیت المقدس جیسے مقامات کے نام ہیں۔ البتہ اہل عرب کسی علاقے میں کثرت سے پیدا ہونے والے پھل کے نام سے اس علاقے کو موسوم کرتے تھے۔ اس حیثیت سے تین سے مراد انجیر کے پھل کا علاقہ شام اور زیتون سے مراد زیتون کی پیداوار کا علاقہ فلسطین ہوسکتے ہیں کیونکہ اس زمانے میں عرب میں یہی علاقے انجیر اور زیتون کی پیداوار کے لیے مشہور تھے۔

زیتون کے بارے میں ایک قول یہ بھی ہے کہ زیتون سے مراد زیتون کی وہ ٹہنی جو اُس کبوتر نے ساتھ لائی تھی جسے حضرت نوح علیہ السلام نے طوفان کا اندازہ لگانے کے لیے بھیجا تھا۔ کبوتر جب زیتون کی ٹہنی لے کر آیا تو معلوم ہوا کہ طوفان رک گیا ہے اور سیلاب کا پانی اتر گیا ہے اور زمین پر دوبارہ رویدگی شروع ہوگئی ہے لیکن یہ ایک اسرائیلی روایت ہے جس کے صحیح ہونے کا پورا اعتبار اور اعتماد نہیں۔

ایک اور رائے کے مطابق تین اور زیتون سے مراد صرف وہ انجیر اور زیتون ہے جس سے لوگ واقف ہیں اور کھانے میں استعمال ہوتے ہیں اس کے علاوہ ان کے الفاظ میں کسی اور چیز کی طرف اشارہ نہیں ہے بلکہ قرآن میں ان کے کھانے کی چیزوں کی طرف ہی اشارہ ہے۔

وَشَجَرَةً تَخۡرُجُ مِن طُورِ سَيۡنَآءَ تَنۢبُتُ بِالدُّهۡنِ وَصِبۡغٍ لِّلۡأٰكِلِيۡنَ۝ (المومنون:۲۰)

بہرحال یہ وہ مقامات ہیں جہاں اکثر پیغمبروں نے جنم لیا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے بہترین ساخت میں پیدا کیا اور جنہوں نے اپنی بہترین ساخت کو بہترین انداز میں خدا کے دین کی تبلیغ واقامت سے برقرار رکھا۔

طور سینین کی قسم اور اس امن والے شہر کی قسم

طور سینین کا دوسرا نام طور سینا بھی ہے خود قرآن میں اس کے لیے طور سینا کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ یہ وہی پہاڑی ہے جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کا اعزاز پایا۔

بَلَدِالۡاَمِیۡنِ۔ امن والے شہر سے مراد شہر مکہ ہے جو اللہ کا محترم گھر ہے طور سینا اور امن والے شہر (مکہ) دونوں مقامات کا تعلق انسانوں کی دینی زندگی سے ہے طور سینا اہل ایمان کے نزدیک ایک مقدس مقام ہے کیونکہ اس مقام پر حضرت موسیٰ علیہ السلام خدا تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں حضرت موسٰی علیہ السلام اپنے ساتھیوں کے اصرار پر چند ساتھیوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا دیدار کرنے کے لیے آئے تھے اور اللہ تعالیٰ کے جلوہ گر ہونے سے ان کے تمام ساتھی راکھ ہوگئے جنہیں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی استدعا اور عاجزی پر دوبارہ زندہ کردیا۔ تاریخ میں یہ ایک بہت مشہور واقعہ ہے جس سے اکثر لوگ واقف ہیں۔

امن والا شہر (مکہ) وہ مقام ہے جو ساری دنیا میں ایک مقدس مقام کی حیثیت سے مشہور ہے یہ وہ مقام ہے جہاں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے شیر خوار بچے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اپنی ماں کے ساتھ چھوڑ دیا تھا اور اس جگہ پر اللہ تعالیٰ نے ایک چشمہ نکال کر ماں بیٹے کے لیے پانی کا انتظام کیا جو زمزم کے نام سے مشہور ہے پھر اسی جگہ پر حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے اللہ کے حکم سے کعبہ تعمیر کیا۔ اس طرح مکہ کے نام سے ایک شہر آباد ہوا جس کو قرآن نے پرامن شہر کے نام سے موسوم کیا جہاں کعبہ شریف کا طواف کرنے کے لیے دنیا کے کونے کونے سے لوگ

آتے ہیں اور حج کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب یہ دعا مانگی - اے میرے رب اس شہر (مکہ) کو پرامن شہر بنادے ان کی یہ دعا قبول ہوئی اور اس دعا کی برکت سے یہ شہر ہزاروں سال سے امن کا گہوارا بنا ہوا ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِيٓ أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ(۴)

بے شک ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا

ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ(۵)

پھر اسے نیچوں سے نیچ کردیا

إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ(٦)

سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے۔ ان کے لیے نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔

بے شک ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا

یہاں وہ حقیقت بیان کی گئی ہے جس پر انجیر اور زیتون کے علاقے یعنی شام و فلسطین اور کوہ طور اور مکہ کے پرامن شہر کی قسم کھائی گئی ہے۔ آیات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو خصوصی عنایت سے نوازا ہے۔ کہ اس نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا بہترین ساخت پر پیدا کئے جانے کا مطلب یہ ہے کہ اسے ایسا اعلیٰ درجہ کا جسم عطا کیا جو دوسری کسی مخلوق کو نہیں دیا گیا۔ اُسے فہم و عقل اور ہنر کی وہ قابلیتیں اور صلاحیتیں بخشی گئیں جو کسی دوسری مخلوق کو نہیں دی گئی ہیں۔ ان صلاحتیوں اور قابلیتوں کی بنا پر اسے اشرف المخلوقات کا نام دیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس شئے اور جس مخلوق کو پیدا کیا، حسن خوبی کے ساتھ ہی پیدا کیا۔ لیکن انسان پر اللہ کا خصوصی فضل ہے کہ اسے دوسری مخلوقات کے مقابلے میں ایک علاحدہ نمونہ (pattern-design) میں پیدا کیا گیا دوسری مخلوقات کے برعکس اس کے جسم کے اعضا ایک خاص انداز میں بنائے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ مخلوقات خاص طور پر حیوانات کو اس طرح بنایا گیا ہے کہ وہ چار ٹانگوں پر چل کر منہ کے بل زمین سے اپنی غذا حاصل کرتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اسی ساخت میں پیدا کیا ہے۔ لیکن انسان کو اس طرح کی ساخت (configuration) میں پیدا کیا گیا ہے کہ وہ اپنی دو ٹانگوں پر کھڑا ہو کر دو ہاتھوں سے کام کرتا ہے اس کے ہاتھوں کی بناوٹ اس طرح کی گئی ہے کہ وہ ان ہاتھوں سے کوئی بھی کام آسانی سے کر سکتا ہے یہ ہے انسان کی جسمانی ساخت لیکن جب ہم انسان کی دماغی قوتوں اور جسمانی صلاحیتوں (mental potency and physical capability) کا معائنہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت اچھی طرح سے سامنے آتی ہے کہ انسان کی ساخت یا بناوٹ (construction) اللہ تعالیٰ کی حکیمانہ اور بہترین تشکیل ہے۔ اس کی اِنہی دماغی قوتوں اور جسمانی صلاحیتوں کی بنیاد پر اسے تمام مخلوقات پر ترجیح دی گئی ہے۔ حیوان اپنی پیدائش کے ہزاروں یا لاکھوں سال بعد بھی دماغی قوتوں اور جسمانی صلاحیتوں کے لحاظ سے جوں کا توں ہے۔ لیکن انسان نے پیدائش کے وقت سے لے کر آج

تک دماغی قوتوں اور صلاحیتوں کا استعمال کرکے جو ترقی کی وہ حیران کن ہے مگر یہ سب کچھ اس اللہ کے فضل و کرم سے حاصل ہوا جس نے اسے احسن تقویم (بہترین وضع) میں پیدا کیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں انسان کی خصوصی شان ہے اور اللہ کی کائینات میں اسے ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اس حیثیت سے اس کی تخلیق بہتر انداز میں کی گئی ہے اور اس کی جسمانی و ذہنی ساخت دونوں کو باقی جانداروں کی بناوٹ پر اعلیٰ درجے کی برتری عطا کی گئی۔ جس کی وجہ سے وہ سب مخلوقات سے بہتر ہے اور اسے خدا کی بندگی اور اس کی فرمانبرداری کا ذمہ دار بنایا گیا ہے۔

انسان کو بہترین وضع میں پیدا کرکے روحانی وجود بخشا گیا ہے اور اس کا یہ روحانی وجود جب نقطۂ عروج پر پہنچ جاتا ہے تو اس کی یہ بہترین ساخت برقرار رہ جاتی ہے اور وہ بارگاہ الٰہی میں مقبولیت حاصل کرتا ہے۔ مگر جب انسان کے روحانی وجود میں زوال آجاتا ہے تو وہ اپنی فطرت سلیم سے روگردانی کرتا ہے اور ایمان کی راہ راست سے منحرف ہوجاتا ہے اس کا روحانی وجود پستی میں گرجاتا ہے اس طرح وہ اپنی روحانی اساس سے ہاتھ دھوبیٹھتا ہے۔ انسان کی روحانی خصوصیات کی بنا پر ہی انسان بلندیوں تک پہنچ جاتا ہے جہاں تک فرشتوں کی بھی رسائی نہیں ہوتی ہے۔ معراج کا واقعہ اس حقیقت کی گواہی پیش کرتا ہے کہ جب جبریل علیہ السلام ایک مقام پر پہنچ کر رک گئے تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو ایک انسان تھے جبریل کو وہیں چھوڑ کر اس بلند مقام تک پہنچ گئے جہاں انہیں اللہ تعالیٰ کی ملاقات نصیب ہوئی۔

پھر اسے (انسان کو) نیچوں سے نیچا کردیا

بعض مفسرین کے مطابق یہ اشارہ ہے انسان کے ارذل عمر (بہت زیادہ عمر) کی طرف ہے جس میں جوانی اور قوت کے بعد بڑھاپا اور ضعف آجاتا ہے اور انسان کی عقل اور ذہن بچے کی طرح ہوجاتے ہیں۔ بعض نے اس سے کردار کا وہ کمینہ پن لیا ہے جس میں بتلا ہوکر انسان انتہائی پست اور ذلیل حرکتیں کرتا ہے۔ بعض نے اس سے ذلت ورسوائی کا وہ عذاب مراد لیا ہے جو جہنم میں کافروں کے لیے ہے۔ یعنی انسان اللہ اور رسول کی اطاعت سے انحراف کرکے اپنے آپ کو احسن تقویم کے بلند رتبہ اور اعزاز سے گراکر اسفل سافلین جہنم میں ڈالدیتا ہے۔ بہرحال انسان میں خیر و شر کے دونوں پہلو موجود ہوتے ہیں اور اللہ نے اسے پورا اختیار دیا ہے کہ وہ شر کا پہلو اختیار کرے یا خیر کا۔ جس طرح انسان اپنے دماغ کی قوتوں اور جسمانی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر خیر کا راستہ اختیار کرلیتا ہے اور اللہ کا مقبول بندہ قرار پاتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنی صلاحیتوں کا استعمال کرکے شر کا راستہ اختیار کرلیتا ہے جس کی وجہ سے وہ اتنی گہری پستیوں میں گرجاتا ہے کہ کوئی مخلوق گراوٹ کے اس درجہ تک نہیں پہنچ جاتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اسے نیچوں سے نیچ کردیتا ہے یعنی برائیوں میں بتلا کردیتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا فیصلہ کرنے کا اختیار دے رکھا ہے اس لیے جب وہ اپنی مرضی سے پستی میں اترتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اسے پستی میں گرنے سے نہیں روکتا ہے اور نہ اسے اس پستی میں سے نکلنے کے لیے کوئی زور زبردستی کرتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے اختیار کا ناجائز فائدہ اٹھاکر پستی میں گرجاتا ہے۔ پستی کی اس حالت پر پہنچنے کے بعد وہ حیوان سے بدتر ہوجاتا ہے کیونکہ حیوان ہر حال میں اپنی فطرت پر رہتے ہیں جب کہ انسان جس کی تخلیق احسن تقویم (بہترین ساخت) میں ہوئی ہے اپنے رب کا انکار کرکے اپنے نفس کی خواہشات کے پھندے میں پھنس کر اتنی پستی میں گرجاتا ہے کہ وہ حیوان سے بدتر بن جاتا ہے۔ اسے خدا کی بارگاہ میں جوابدہی کا کوئی احساس نہیں رہتا ہے۔

الغرض بہترین ساخت پرپیدا کیا گیا انسان جب اپنی طاقت اور صلاحیتوں کو برائیوں میں استعمال کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے برائیوں کی ہی توفیق دیتا ہے اور پستی میں گراتے گراتے اسے اس حدتک گرادیتا ہے کہ کوئی مخلوق اس حدتک نہ پہنچ جاتی ہے۔ اس بات کا معاشرے کے اندر کثرت سے مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ لالچ، طمع، حُب دُنیا، خود غرضی، شہوت پرستی، نشہ بازی، کمینہ پن، بد اخلاقی، ظلم و جبر، ڈاکہ ذنی، لوٹ کھسوٹ، چور بازاری، قتل و غارت اور خون ریزی جیسی خصلتوں میں جو لوگ غرق ہوجاتے ہیں وہ اخلاقی حیثیت سے پستی کے گڑھے کی نچلی والی تہہ میں گرجاتے ہیں۔ مثلاً جب ایک قوم دوسری قوم کی دشمنی میں اندھی ہوجاتی ہے تو درندگی میں تمام درندوں سے آگے بڑھتی ہے۔ درندہ تو اپنی غذا کے لیے کسی ایک جانور کا شکار کرتا ہے قتل عام نہیں کرتا لیکن انسان اپنے ہم جنس لوگوں کا قتل عام کرتا ہے۔ درندہ اپنے شکار کے لے صرف اپنے پنجوں اور دانتوں سے کام لیتا ہے۔ لیکن احسن تقویم، پر پیدا ہونے والا انسان اپنی عقل سے بنائے ہوئے مہلک ہتھیاروں جیسے بندوق، توپ، ٹینک، میزائل، ایٹم بم، ہائیڈروجن بم اور دیگر بے شمار ہتھیاروں سے پوری بستی کو تباہ و برباد کردیتا ہے۔ درندہ صرف اپنے شکار کو ہلاک کرکے اپنی بھوک مٹا دیتا ہے۔ وہ اپنی جنس کے جانور کو نہیں مارتا ہے اور نہ اسے اپنےپیٹ کا چارہ سمجھتا ہے لیکن انسان جب خدا سے بے خوف ہوجاتا ہے اور گناہوں کے ارتکاب میں بے لگام ہوجاتا ہے تو وہ ایسا درندہ بن جاتا ہے کہ اپنی ہی جنس اور اپنے جیسے انسانوں کا قتل عام کردیتا ہے۔ وہ اپنے جیسے انسانوں کو پوچھ گچھ (interrogation) کے نام پر اذیت دینے کے لیے ایسے طریقے اختیار کرتا ہے جن سے شیطان بھی شرماتا ہے۔یہ کمینہ پن کی اس انتہا کو پہنچ جاتا ہے کہ ایک عورت کو کئی درندہ صفت مرد بیک وقت اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں اور اس کی عصمت کے پھول کو بے دردی کے ساتھ مَسل لیتے ہیں۔ باپ بیٹے اور بھائی کے سامنے عورت کی عصمت دری کرتے ہیں ماں باپ کے سامنے ان کے بچوں کو قتل کردیتے ہیں۔ انسانوں کو زندہ جلاتے ہیں دنیا کا کوئی وحشی سے وحشی ترجانور بھی ایسی حرکت نہیں کرسکتا ہے۔ انسانوں کا انسانوں پر یہ وحشیانہ سلوک اور ظلم و جبر کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے بلکہ دنیا میں ہر جگہ لوگ اپنی آنکھوں سے اس ظلم وجبر اور قتل و غارت کا نظارہ کرتے ہیں اور انسان انسانوں کی اس بربریت پر رونے دھونے اور چیخ وپکار کے علاوہ کچھ نہیں کرسکتے ! ۔ انسانی حقوق تنظیم کے علمبردار بھی بے بس تماشائی بن کر یا تو خاموش رہتے ہیں یا پھر رسمی طور زبانی ہمدردی میں مگرمچھ کے آنسو بہادیتے ہیں۔

دوسری صفات کا بھی انسان کا یہی حال ہے جس بُرے کام کی طرف وہ رخ کرتا ہے اسے برائی کی انتہا تک پہنچا دیتا ہے یہاں تک کہ اپنے مذہب کو بھی وہ اتنا گرادیتا ہے کہ درختوں، جانوروں اور پتھروں کی پوجا کے علاوہ وہ انسان کے جنسی اعضا کی پوجا کرکے انسانیت، اخلاقیات اور شرم و حیا کی دھجیاں اڑا دیتا ہے۔ دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیے زنا کاری کو کار ثواب سمجھتا ہے اور جن ہستیوں کی پوجا کرتا ہے ان کے ساتھ ایسے گندھے قصے منسوب کرتا ہے جو انسانوں کے لیے باعث شرم ہیں۔ ایسے انسان غلط فطرت پر چل کر پستیوں میں گرتے رہتے ہیں ان کی انسانیت ختم ہوجاتی اور یہ گناہوں کے پیکر بن جاتے ہیں، ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔

سوائے ان کے جنہوں نے ایمان لایا

اور عمل صالح کئے ان کے لیے نہ ختم ہونے والا اجر ہے

اب ایمان لانے والوں اور عمل صالح کرنے والوں کی بات ہورہی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی صحیح فطرت پر رہتے ہیں جو ایمان اور عمل صالح سے اپنی بہترین ساخت کی تکمیل کرتے ہیں اور نیکیوں کی اس حد تک پہنچ جاتے ہیں جو انسانی زندگی کی منزل و مقصود کی حد ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انہیں آخرت کی کامیابی حاصل ہوتی ہے اور یہ لوگ بدلے میں ایسا اجر پاتے ہیں جو ان کے لیے کبھی ختم نہ ہوجائے گا یہ ان ایمان لانے والوں اور عمل صالح کرنے والوں کی دائمی کامیابی ہے۔ ان کا انجام جنت کی نعمتوں سے بھری زندگی ہے یہی ان کی زندگی کا مقصد ہوتا ہے اور یہی ان کا مقدر بن جاتا ہے۔ یہ نیکیوں کے پیکر بن جاتے ہیں اور ان کا ٹھکانا جنت ہے۔

اس آیت سے انسانی زندگی میں ایمان اور عمل صالح کی قدر و قیمت واضح ہوجاتی ہے کہ یہی دو چیزیں انسان کو بلند مقام اور بلند مرتبہ پر پہنچا دیتی ہیں۔ یہی وہ رسی ہے جو انسانی فطرت اور انسانوں کے جذبات کو ان کے خالق سے مربوط کرتی ہے۔ یہی وہ نور ہے جس کی روشنی میں انسان بلندیوں کی راہ طے کرتا ہوا جنت میں ابدی زندگی اور دائمی اعزاز پانے والوں کے مقام تک پہنچ جاتا ہے۔ جب

ایمان اور عمل صالح کی رسی ٹوٹ جاتی ہے اور خدا کے نور کی روشنی بجھ جاتی ہے تو اس کا یقینی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان پستیوں میں گرتا چلا جاتا ہے۔یہاں تک کہ گرتے گرتے اس کی انسانیت ختم ہوجاتی ہے اور اس کے انسانی وجود میں خالص مٹی رہ جاتی ہے تب وہ جہنم میں پہنچ جاتا ہے اور پتھروں کے ساتھ جہنم کا ایندھن بن جاتا ہے یہی اس کا دائمی ٹھکانا ہے۔

فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ(۷)

پس (اے نبی) اس کے بعد جزا وسزا کے معاملہ میں تم کو کون جھٹلا سکتا ہے۔

أَلَيْسَ اللّٰهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِيْنَ(۸)

کیا اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے؟

اس کے بعد آپ کو جزا وسزا کے معاملہ میں کون جھٹلا سکتا ہے

حقیقت سامنے آنے کے بعد اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نِدا آتی ہے کہ اے انسان جب حقیقت تمہارے سامنے آگئی ہے اور تجھے معلوم ہوچکا ہے کہ انسانی زندگی میں ایمان اور اعمال صالح کی قدر و قیمت کیا ہے اور یہ بھی تم کو معلوم ہوا کہ جو لوگ ایمان نہیں لاتے اور اللہ کے نور سے راہنمائی حاصل نہیں کرتے اور اللہ کی مضبوط رسی کو نہیں پکڑتے ہیں اُن کا انجام کیا ہے تو پھر تمہارے پاس دین کو جھٹلانے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟ تو کیوں اللہ کا راستہ چھوڑ کر باطل اور شیطان کا راستہ اختیار کرکے اپنے آپ کو برباد کردیتا ہے۔ جب یہ بات اعلانیہ انسانی معاشرے میں نظر آتی ہے کہ بہترین ساخت پرپیدا کئے گئے انسانوں میں سے ایک گروہ اخلاقی پستی کے گڑھے میں گرنے سے بچا رہتا ہے اور اپنی بہترین ساخت پر قائم رہ کر جنت کا حقدار بن جاتا ہے۔ تو اس کے بعد جزا وسزا کو جھٹلانے کا تمہارے پاس کیا جواز ہے کیا عقل یہ مانتی ہے کہ بُرے اعمال کرنے والوں اور نیک اعمال کرنے والوں کا یکساں انجام ہو۔ کیا انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ برائیاں کرنے والوں کو کوئی سزا نہ دی جائے اور برائیوں سے بچنے والوں اور پاکیزہ زندگی اختیار کرنے والوں کو کوئی جزا نہ مل جائے۔ یہی بات قرآن مجید میں اس طرح فرمائی گئی ہے۔ ''کیا ہم فرمانبرداروں کو مجرموں کی طرح کردیں تمہیں کیا ہوگیا تم کیسے حکم لگاتے ہو۔'' (سورہ قلم:۳۵-۳۶)

کیا اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ دنیا کے سب حاکموں سے بڑا حاکم اور سب انصاف کرنے والوں سے زیادہ انصاف کرنے والا ہے۔ جب دنیا کے حاکموں سے تو تم لوگ یہ توقع رکھتے ہو کہ وہ تمہارے ساتھ انصاف کریں، مجرموں کو سزا دیں اور اچھے کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کریں تو خدا کے متعلق تم نے یہ غلط خیال کیوں رکھا ہے کہ وہ انصاف نہیں کرے گا وہ تو سب حاکموں سے بڑا حاکم ہے۔ کیا تمہارا خیال یہ ہے کہ بڑا حاکم ہونے کے باوجود وہ کوئی انصاف نہ کرے گا، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ برے اور بھلے کو یکسان کردے گا کیا اس احکم الحاکمین سے تم یہ توقع رکھتے ہو کہ دنیا میں نیک عمل کرنے والے اور بُرا عمل کرنے والے دونوں مرکر خاک ہوجائیں گے نہ کسی کو نیکیوں کی جزا ملے گی اور نہ کسی کو برائیوں کی سزا ملے گی۔ کوئی انصاف کرنے والا نہیں ہے۔ حالانکہ انسان کے ضمیر میں یہ بات موجود ہے کہ ظلم کرنے والے کو سزا ملنی چاہیے اور انصاف کرنے والے کو جزا ملنی چاہیے۔ انسان کو خیال رہنا چاہیے کہ اسے موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونا ہے اور احکم الحاکمین کے سامنے جواب دینا ہے جہاں ہر کسی کو انصاف ملے گا۔

سُوْرَۃُ الْعَلَقِ مکیۃ

اٰیٰتُہا:19 رکوعھا:1

بسم اللہِ الرَّحمٰنِ الرَّحیم

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِي خَلَقَo خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍo اقْرَأْ وَرَبُّکَ الْأَکْرَمُo الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِo عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْo کَلَّا إِنَّ الْإِنسَانَ لَیَطْغَیٰo أَن رَّآہُ اسْتَغْنَیٰo إِنَّ إِلَیٰ رَبِّکَ الرُّجْعَیٰo أَرَأَیْتَ الَّذِي یَنْہَیٰo عَبْدًا إِذَا صَلَّیٰo أَرَأَیْتَ إِن کَانَ عَلَی الْہُدَیٰo أَوْ أَمَرَ بِالتَّقْوَیٰo أَرَأَیْتَ إِن کَذَّبَ وَتَوَلَّیٰo أَلَمْ یَعْلَم بِأَنَّ اللہَ یَرَیٰo کَلَّا لَئِن لَّمْ یَنتَہِ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِیَۃِo نَاصِیَۃٍ کَاذِبَۃٍ خَاطِئَۃٍo فَلْیَدْعُ نَادِیَہُo سَنَدْعُ الزَّبَانِیَۃَo کَلَّا لَا تُطِعْہُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِب ۩ o

پس منظر:

اس سورہ کی ابتدائی پانچ آیات پر علمائے امت کی اکثریت کا اتفاق ہے کہ یہ سب سے پہلی وحی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ سورہ کا باقی حصہ اس وقت نازل ہوا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرم شریف میں نماز پڑھنی شروع کردی اور ابو جہل نے دھمکیاں دے کر آپؐ کو روکنے کی کوشش کی۔ محدثین نے حضرت عائشہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ وحی آنے سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سچے خواب دیکھنے لگے تھے۔ ان کا خواب ایسا ہوتا تھا کہ جیسے آپ دن کی روشنی میں دیکھ رہے تھے۔ پھر آپ تنہائی پسند ہوگئے اور خلوت نشینی اختیار کرلی اور غار حرا کی تنہائیوں میں کئی کئی شب و روز عبادت کرنے لگے۔ اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو عبادت کا طریقہ نہیں بتایا گیا تھا۔ اس لیے وہ اپنے طریقے پر خدا کی عبادت کرتے تھے۔ سیرت نبوی اور تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ نبوت سے پہلے انہوں نے کبھی بھی کسی بت کو نہ پوجا اور نہ اللہ کے بغیر کسی کے سامنے سجدہ کیا اور نہ کسی غیر اللہ کی عبادت کی۔ کھانے پینے کا سامان ختم ہونے پر آپ گھر واپس آتے تھے اور مزید چند روز کے لیے خورد ونوش کا سامان لے کر واپس تشریف لے جاتے تھے۔ ایک روز جب آپ غار حرا میں تھے تو اچانک فرشتہ آپ کے پاس آیا اور کہا پڑھو۔ آپ نے فرمایا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے خود فرمایا کہ فرشتہ میرے پاس آیا اور کہا پڑھو میں نے کہا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ فرشتے نے مجھے پکڑ کر بھینچا یہاں تک کہ میری قوتِ برداشت جواب دینے لگی پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور پھر کہا پڑھو میں نے کہا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں فرشتے نے تیسری بار مجھے بھینچا یہاں تک کہ میری قوت برداشت جواب دینے لگی پھر اس نے مجھے چھوڑدیا اور کہا۔ اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ o پڑھو اپنے رب کا نام لے کر جس نےپیدا کیا ۔ اس طرح سورہ علق کی ابتدائی پانچ آیات پڑھا کر فرشتہ غائب ہوگیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کانپتے ہوئے خدیجہؓ کے پاس آئے اور گھبراہٹ میں کہا۔ مجھے اڑھاؤ مجھے اڑھاؤ۔ چنانچہ آپ پر چادر اڑھادی گئی جب آپ کی گھبراہٹ دور ہوگئی تو آپ نے فرمایا ''اے خدیجہؓ یہ مجھے کیا ہوگیا'' پھر آپ نے سارا قصہ سنایا اور کہا مجھے اپنی جان کا ڈر ہے۔ خدیجہؓ نے کہا ہرگز نہیں آپ کی جان کو کوئی خطرہ نہیں ہے آپ خوش ہوجائیے۔ خدا کی قسم خدا آپ کو ہرگز بے یارومددگار نہیں چھوڑے گا۔ آپ تو صلہ رحمی کرتے ہیں۔ ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔ رشتہ داروں سے نیک سلوک کرتے ہیں اور لوگوں کی امانتیں ادا کرتے ہیں۔ پھر حضرت خدیجہؓ آپ کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ ورقہ بن

نوفل زمانہ جاہلیت میں عیسائی ہوگئے تھے اور عربی اور عبرانی میں انجیل لکھتے تھے۔ اس وقت وہ بوڑھے اور نابینا تھے۔ حضرت خدیجہؓ نے ان سے کہا بھائی ذرا اپنے بھتیجے کا حال سنئے کہ وہ کیا بتا رہے ہیں۔ ورقہ نے کہا بھتیجے کہو کہ تمہیں کیا نظر آیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ نظر آیا تھا وہ انہوں نے بیان کردیا۔ ورقہ نے کہا یہ وہی ناموس (وحی لانے والا فرشتہ) ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا۔ کاش میں جوان ہوتا اور اس وقت تک زندہ ہوتا جب آپ کی قوم آپ کو وطن سے نکال دے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا سچ مچ میری قوم مجھے وطن سے نکال دے گی۔ ورقہ نے کہا ہاں وحی کی جو تعلیم لے کر تم آئے ہو اس طرح کی تعلیم جو بھی لے کر آیا لوگ اس کے دشمن ہوگئے۔ اگر میں نے تمہارا زمانہ پایا تو میں تمہاری مدد ضرور کروں گا مگر زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ ورقہ بن نوفل کا انتقال ہوگیا۔

ابن جریر طبریؒ کے حوالے سے ایک اور روایت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے منسوب ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب میں سو رہا تھا تو حضرت جبریل میرے پاس ایک کتاب لے کر آئے اور مجھ سے کہا پڑھو۔ میں نے کہا میں نہیں پڑھ سکتا ہوں تو انہوں نے مجھے بھینچا یہاں تک کہ میں نے خیال کیا کہ میری موت آگئی۔ پھر انہوں نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھو میں نے کہا کیا پڑھوں؟ یہ میں نے اس لیے کہا کہ فرشتہ مجھے دوبارہ اس طرح نہ بھینچے جس طرح اس نے پہلے مجھے بھینچا تھا۔ فرشتے نے کہا اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ o پڑھو اللہ کے نام سے جس نے پیدا کیا اور اس نے عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ تک کی پانچ آیات پڑھ لیں تو میں نے ان ایات کو پڑھ لیا اس کے بعد وہ مجھے چھوڑ کر چلے گئے اور میں اپنی نیند سے بیدار ہوگیا میں نے ایسا محسوس کیا گویا انہوں نے میرے دل میں ایک کتاب لکھ دی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ کی مخلوق میں مجھے سب سے زیادہ نفرت شاعر اور مجنون سے تھی۔ میں نے سوچا کہ قریش کے لوگ میرے بارے میں یہ چرچا کریں گے کہ میں شاعر یا مجنون ہوں۔ میں اسے برداشت نہ کرسکتا تھا اس لیے میں نے ارادہ کیا کہ کسی اونچے پہاڑ پر چڑھ جاؤں اور وہاں سے اپنے آپ کو گرا کر خودکشی کرلوں اور اس طرح میں اس مصیبت سے نجات اور راحت پالوں۔ میں جب اس اردے سے نکلا تو میں نے آسمان سے ایک آواز سنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم اللہ کے رسول ہو اور میں جبریل ہوں میں نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا تو نظر آیا کہ جبریل ایک آدمی کی صورت میں آسمان کے افق میں کھڑے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ تم خدا کے رسول ہو اور میں جبریل ہوں اسی اثنا میں جبریل غائب ہوگئے اور میں اپنے گھر والوں کے پاس آگیا۔

ان دو روایات میں بظاہر تضاد نظر آتا ہے لیکن غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کوئی تضاد نہیں ہے صرف الفاظ کی ہیر پھیر ہے۔

عبداللہ بن زبیرؓ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی نازل ہوئی وہ اس وقت نیند میں تھے جب کہ حضرت عائشہؓ سے منسوب روایت میں نیند کا کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بہ ہوش و حواس فرشتے کا کلام سن رہے تھے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر کی روایت میں اس واقعہ کے بعد نبی ﷺ کا پہاڑ پر چڑھ کر اپنے آپ کو گرانے اور ہلاک کرنے کی بات کہی گئی ہے لیکن حضرت عائشہؓ کی روایت میں ایسی کوئی بات نہیں ہے البتہ وحی رُکنے کے بارے میں نبی ﷺ کے متعلق ایسی بات کہی گئی ہے۔ جب نبی ﷺ نبوت کا دعویٰ کر چکے تھے اور اس بات پر تنقید بھی ہوئی ہے کہ نبی کے لیے خودکشی کا اقدام کرنا مناسب نہیں کیونکہ خودکشی حرام ہے اور نبیوں کی شان کے خلاف ہے اگر عبداللہ بن زبیرؓ کی روایت پر غور کیا جائے تو اس بات کی تصحیح ہوجاتی ہے کیونکہ یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت کہی تھی جب ان پر پہلی بار وحی نازل ہوئی تھی اور انہیں ابھی یہ معلوم نہ تھا کہ وہ پیغمبر منتخب ہوئے ہیں۔ اس لیے اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت ایسا کچھ سوچا ہوگا تو یہ گھبراہٹ کا نتیجہ ہوسکتا تھا۔ جو گھبراہٹ انہیں فرشتے کے اچانک نمودار ہونے سے ہوئی تھی اور جو گھبراہٹ کسی بھی عام انسان کو ایسا قدم اٹھانے پر آمادہ کرسکتی تھی کیونکہ انہیں ابھی معلوم نہ تھا کہ اللہ نے انہیں اپنا رسول چن لیا ہے ورنہ نبوت کے منصب پر فائز ہوکر نبی خودکشی کے بارے میں سوچ بھی نہ سکتے تھے۔ (واللہ اعلم)

جب پہلی بار فرشتہ وحی لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا تو اس وقت ان پر کیا گزری اور ان کی کیفیت کیا تھی یہ صورت حال صرف اللہ کو معلوم ہے جس نے اپنے بندے پر وحی نازل کی اور اللہ کا وہ بندہ جانتا ہے جس پر وحی نازل کی گئی۔ البتہ اس واقعہ کے متعلق ہم تک روایتوں کے زریعے جو معلومات (information) پہنچی ہیں ان سب کا تجزیہ کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ ایک لمحہ پہلے تک بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حقیقت سے واقف نہ تھے کہ آپ نبی منتخب ہونے والے ہیں۔ فرشتے کا اس طرح اچانک ظاہر ہونا آپ کے لیے ایک غیر معمولی حادثہ تھا اور آپ پر اس کا اثر وہی ہوا جو کسی بے خبر انسان پر ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نبوت کا دعویٰ کرنے کے بعد مکہ کے لوگوں نے آپ پر جتنے بھی اعتراضات کیے ان میں کوئی اعتراض ایسا نہ تھا کہ ہم تو پہلے ہی محسوس کر رہے تھے کہ آپ نبوت کا دعویٰ کرنے والے ہیں کیونکہ آپ کافی عرصہ سے نبی بننے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

ایک اور بات بھی سامنے آتی ہے کہ نبوت سے پہلے آپ کی زندگی اتنی پاکیزہ تھی اور آپ کا کردار اتنا بلند تھا کہ حضرت خدیجہ جو اس واقعہ کے وقت پندرہ سال سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریک حیات تھیں، اور یہ بات بدیہات میں سے ہے کہ بیوی سے شوہر کی کوئی کمزوری چھپی نہیں رہتی یہ ایک دوسرے کے ہمراز ہوتے ہیں ان کا ایک دوسرے سے تعلق جسم اور لباس کی طرح ہوتا ہے، نے غار حرا میں پیش آنے والا واقعہ بلا تأمل تسلیم کر لیا کیونکہ انہیں اپنے شوہر کے کردار پر ذرہ برابر شک نہیں تھا۔ اسی طرح ورقہ بن نوفل جو مکہ کے ایک بزرگ اور عمر رسیدہ شخص تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رشتہ دار ہونے کی بنا پر بچپن سے جانتے تھے نے بھی جب واقعہ سنا تو فوراً کہہ دیا کہ وہ وہی ناموس- پیغام لانے والا فرشتہ ہے جو حضرت موسیٰ اور دیگر پیغمبروں کے پاس وحی لے کر آتا تھا۔ کیونکہ ان کے نزدیک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک بلند پایہ انسان تھے جو نبوت کے منصب پر فائز ہونے کے قابل اور حقدار تھے۔

سورہ کے دوسرے حصہ میں ابو جہل کی بے وقوفیوں اور بے ہودگیوں کا ذکر ہے جو اس نے اس وقت شروع کر دیتھی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علانیہ تبلیغ کا آغاز کر دیا اور حرم میں نماز ادا کرنی شروع کر دی۔ ابو جہل کی جاہلیت بھڑک اٹھی اور اس نے آپ کو ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا۔ بہر حال اس سورہ میں نزول وحی کا جو واقعہ پیش آیا وہ عالم انسانیت کے لیے ایک ایسا عظیم واقعہ قرار پایا ہے جس کی عظمت کا احاطہ کرنا انسانوں کے لیے مشکل ہے اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر ایک بہت بڑا احسان کیا کہ اس نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان لوگوں کی طرف بھیجا جن کی انسانیت ختم ہو چکی تھی اور جن میں اللہ رب العالمین کی بندگی کا کوئی تصور بھی نہ تھا۔ صرف بے جان چیزوں کی پوجا کرتے تھے۔ بدکاریوں اور خر مستیوں میں مشغول تھے انہیں اپنے اعمال کی جوابدہی کا کوئی احساس نہ تھا۔ دنیا میں کھانے پینے اور موج مستی کرنے کے علاوہ انہیں کوئی فکر نہ تھی۔ عالم انسانیت تباہ و برباد ہو چکی تھی۔ دور دور تک کہیں روشنی کی کرن نظر نہیں آتی تھی ایسے میں اللہ کی رحمت جوش میں آگئی اور اس نے عالم انسانی کو اپنے فضل و کرم سے نوازا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا آخری نبی بنا کر دنیا کے انسانوں کی ہدایت کے لیے بھیجا جس کی نبوت کے سایہ میں انسانیت دوبارہ پھلنے پھولنے لگی۔

نزول وحی سے تاریخ کا رخ اس طرح بدلا کہ نہ اس سے پہلے اس طرح کبھی بدلا تھا اور نہ اس طرح بدلے گا۔ راہ حق کے نشانات زمین میں اس طرح نمایاں اور بلند ہو کر قائم ہو گئے کہ نہ زمانہ انہیں مٹا سکتا ہے اور نہ واقعات و حوادث۔

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ(١)

پڑھو (اے نبی) اپنے رب کا نام لے کر جس نے پیدا کیا

خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ(٢)

جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا

اِقۡرَاۡ وَرَبُّکَ الۡاَکۡرَمُ(۳)

پڑھو اور تمہارا رب بڑا ہی کریم ہے

الَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ(۴)

جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا

عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ یَعۡلَمۡ(۵)

جس نے انسان کو وہ علم سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا

پڑھو اے نبی اپنے رب کا نام لے کر جس نےپیدا کیا

جیسا کہ تعارفی اقتباس میں بیان ہوا کہ سورہ علق کی ابتدائی پانچ آیات پہلی وحی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اس وقت نازل ہوئیں جب وہ غار حرا میں مصروف عبادت تھے۔ فرشتے نے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا پڑھو تو نبی نے جواب دیا مَا اَنَا بِقَارِیٍٔ۔ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اس کے متعلق مختلف رویات ہیں۔

بعض اہل علم کا ماننا ہے کہ اِقۡرَاۡ کا لفظ صرف اپنے پڑھنے کے مفہوم میں نہیں آتا ہے بلکہ پڑھ کر سنانے کے معنی میں بھی آتا ہے جیسا کہ سورہ بنی اسرائیل آیت:۴۵ میں ارشاد ہے: وَاِذَا قَرَتَ الۡقُرۡآن۔ جب آپ لوگوں کو قرآن پڑھ کر سناتے ہیں۔یہاں قِرَات کا معنی پڑھ کر سنانا ہے۔ چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کا حفظ تھا وہ قرآن پڑھ کر سناتے تھے اور انہوںنے تاحیات مسلمانوں کو زبانی قرآن پڑھ کر نماز پڑھائی اس لیے اَقرَاۡ کا مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اے نبی قرآن پڑھو اور یاد کرکے لوگوں کو زبانی سناؤ جو قرآن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل سے سن کر حفظ کرلیا تھا اسی کو پڑھ کر لوگوں کو سنانے کی بات ہے اس لیے فرشتے کی زبان سے جو لفظ اقرا ادا ہوا اس کا مطلب یہ تھا کہ اے نبی قرآن سن کر پڑھو اور اسے اپنے دماغ میں محفوظ کرلو۔ اقرا کا یہ مفہوم ہے۔ واللہ اعلم۔

سورہ علق کی پہلی آیت مضمون کے اعتبار سے وسیع اور بلیغ ہے۔ اس مختصر سی آیت میں بیک وقت تین بڑے مضامین کو سمویا گیا ہے۔ پہلا مضمون اِقرَا ہے یعنی اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پڑھیے یہ وحی کا پہلا لفظ ہے اس میں قرآن کی تعلیم کا اشارہ ہے کہ یہ کتاب دنیا کے تمام انسانوں تک پہنچ جائے گی۔ اس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغمبر منتخب ہونے کا بھی اعلان ہے اور اس بات کا بھی حوالہ ہے کہ اب دنیا کے خود ساختہ ادیان اور مذاہب کا زوال آئے گا اور خدا کا دین تمام دینوں پر غالب آجائے گا اور دنیا میں غفلت کا چھایا ہوا اندھیرا چھٹ جائے گا۔ دوسرا مضمون لفظ رب ہے جس کے نام سے پڑھنے کا حکم ہے۔ اس لفظ سے رب العالمین کا تعارف کرایا گیا ہے اور اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ یہ بہت سارے معبود جو آپ لوگوں نے بنائے ہیں جن کو آپ بتوں کی صورت میں پوجتے ہیں بے بنیاد ہیں تمہیں اب ایک خدا کی عبادت کرنی ہے ان بتوں کو توڑنا ہے جن کو آپ نے معبود بنایا ہے۔ تیسرا مضمون پیدائش ہے یعنی اب تمہیں اس رب العالمین کی عبادت کرنی ہے جس نے تمام مخلوقات کو پیدا کیا جس نے ان چیزوں کو بھی پیدا کیا ہے جن کو تم نے معبود بنا رکھا ہے۔ وہ آپ کا رب اور رب العالمین ہے۔ اس رب العالمین نے آپ میں سے ایک بہترین انسان کو نبوت کے لیے چن لیا ہے جس کے ذریعہ سے آپ تک اس رب العالمین کا پیغام پہنچے گا جس نے آپ کو پیدا کیا اور جو اکیلا اس کائینات کا خالق اور مالک ہے۔

جس نے انسانوں کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا

اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات پر ترجیح دے کر انسان کا ذکر فرمایا کیونکہ انسان ہی اس کائینات کی روح رواں اور مطلوبہ شئے ہے۔ اسی کے لیے نبی بھیجے گئے اور اسی کے لیے وحی نازل کی گئی اور اسی کو تمام مخلوقات پر ترجیح دے کر زمین کی زینت بنادیا گیا۔ لیکن اس انسان کی تنگ نظری اور نادانی کا حال یہ ہے کہ وہ اپنی حیثیت کو بھول کر غیر اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہوجاتا ہے وہ خدا کی پیدا کردہ مخلوقات کی پوجا کرکے خدا کا شریک ٹھہراتا ہے اس آیت میں اسے اپنی تخلیق کے مادہ پر غور کرنے کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ دیکھ لے کہ اسے کس حقیر مادہ منویہ (sperm) سے پیدا کیا گیا ہے لیکن اس حقیر مادے سے پیدا کرکے اسے بلند ترین صفات سے نوازا گیا ہے۔ علق چمٹے ہوئے کو کہتے ہیں۔ اس کا معنی لٹکا ہوا بھی ہے۔ علق جونک (leach) کو بھی کہتے ہیں۔ علق کا معنی خون کا لوتھڑا بھی ہے۔ اس طرح علق وہ خون کا لوتھڑا ہے جو جونک جیسی شئے (leach like substance) کی طرح معلق - لٹکی ہوئی ہوتی ہے جو اصل میں خون کی وہ پھٹکی ہے جو منی سے بن کر انسانی وضع کی پہلی صورت اور پہلا مرحلہ ہے۔ یعنی نطفہ قرار پانے کے بعد ابتدا میں جمے ہوئے خون کا لوتھڑا سا ہوتا ہے پھر وہ گوشت کی ایک بوٹی میں تبدیل ہوتا ہے پھر آگے چل کر گوشت کی یہ بوٹی انسانی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ یہ اس انسان کی طرف اشارہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ایک حقیر قطرہ سے پیدا کرکے پیکر حسن بنادیا پھر یہ پیکر حُسن اللہ تعالیٰ کے خلاف بغاوت پر اتر آتا ہے اور سرکشی کرتا ہے جسے حقیر چیز سے پیدا کرکے اللہ نے بلند مقام پر پہنچادیا۔ آیت میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو اللہ ایک حقیر قطرے کو ایک حسین شکل بخشتا ہے اس کے لیے ناممکن نہیں ہے کہ وہ ایک امی کو علم بخش کر عالم بنادے۔

پڑھو اور تمہارا رب بڑا ہی کریم ہے۔ جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا

انسان پر اللہ تعالیٰ کا انتہائی کرم ہے کہ حقیر ترین مادّہ سے ابتدا کرکے اس نے اس کو صاحب علم بنایا جس علم کی وجہ سے وہ تمام مخلوقات میں ایک بہترین مخلوق بن گیا اور نہ صرف صاحب علم بنایا بلکہ اسے قلم کا ہنر عطا کرکے لکھنے کا فن سکھایا جو اس کی ترقی اور نسل در نسل علم کے ذریعہ کا تحفظ بن گیا۔ اگر الہامی طور پر انسان کو قلم اور کتابت کا یہ فن عطا نہ کیا جاتا تو انسان کا علم اتنی ترقی نہ کرتا اور نہ یہ علم ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوجاتا جس کے بغیر انسان کی یہ ترقی ناممکن تھی جس پر اسے ناز ہے۔ زبان کی بہ نسبت قلم کے ذریعہ سے ہی تعلیم عام ہوگئی۔ اس لیے یہ حقیقت ہے کہ علم کا سب سے وسیع ذریعہ قلم ہے۔ کیونکہ جو علم انسان کے ذہن میں ہوتا ہے یا اس کے حفظ میں ہوتا ہے وہ انسان کی موت کے بعد انسان کے ساتھ ہی چلا جاتا ہے۔ لیکن جو علم قلم کے ذریعے سے کتابت میں محفوظ ہوتا ہے اس کا فائدہ انسانوں کو صدیوں تک پہنچتا رہتا ہے۔ قلم کی بدولت ہی تمام علوم اور پچھلی قوموں کی تاریخیں محفوظ ہیں۔ حتیٰ کہ آسمانی کتابوں کا محفوظ ہونے کا ذریعہ بھی قلم ہی ہے۔ ان حقائق پر غور کرنے کے بعد قلم کی اہمیت محتاج بیان نہیں رہتی، قلم کی اس اہمیت اور افادیت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کے ساتھ قلم کا بھی ذکر کیا۔

اللہ تعالیٰ نے قلم کی قدر و قیمت کو جانتے ہوئے نزول وحی کے آغاز ہی میں قلم کا ذکر کیا۔ حالانکہ حامل وحی نبی صلی اللہ علیہ وسلم صاحب قلم نہ تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے قلم کی اہمیت کو واضح کردیا کیونکہ وہ علیم و خبیر ہے۔ اس لیے اس اہمیت کے تئیں انسان کے مستقبل (future) میں قلم کی ضرورت سے انسانوں کو واقف کردیا۔ جس کی بدولت ہی ہمارے پاس قرآن مجید حرف بہ حرف موجود ہے۔

موجودہ زمانے میں لکھنے پڑھنے کے لیے اگرچہ زیادہ تر کمپیوٹر جیسے الیکٹرانک آلات (electronic gadgets) کا استعمال کیا جاتا ہے تاہم قلم کی اہمیت بدستور موجود ہے کیونکہ ایسے آلات (gadget) قلم کا ہی قائم مقام (substitute) ہیں۔ ان آلات کی مدد سے تعلیم و تعلّم اور لکھائی، پڑھائی میں بہت آسانی پیدا ہوگئی۔

کمپیوٹر بھی لکھنے کا آلہ ہے اور آج کل کے زمانے میں اس کی اہمیت کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں اس کی اہمیت عیاں ہے یہ قلم کا وہ متبادل آلہ ہے جس کی بدولت لکھنے پڑھنے کے میدان میں ایک زبردست انقلاب رونما ہوا اور آج کل یہ آلہ لکھنے پڑھنے کا ایک ایسا ذریعہ ہے جو علمی اور تجارتی دنیا پر راج کر رہا ہے فارسی میں ایک معروف شعر ہے:

قلم گفتہ کہ من شاہِ جہانم

قلم کش را بہ جنت می رسانم

ترجمہ: قلم کہتا ہے کہ میں دنیا کا بادشاہ ہوں کیونکہ میں قلم چلانے والے کو جنت میں پہنچا دیتا ہوں۔

جس نے انسان کو وہ علم سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا

یعنی انسان کو جو کچھ علم حاصل ہوا ہے وہ اسے اللہ تعالیٰ کی دین ہے۔ جس وقت جو علم اللہ تعالیٰ نے انسان کو دینا چاہا تو اسے دے دیا۔ یقینا علم کا سرچشمہ اللہ ہی ہے انسان نے جو کچھ علم حاصل کیا اسی سرچشمہ سے حاصل کیا اور آگے بھی وہ جو کچھ حاصل کرے گا اسی سرچشمہ سے حاصل کرے گا۔ انسانی زندگی کے جو راز و اسرار انسان پر منکشف ہوئے اسی سرچشمہ سے ہوئے ہیں۔ خدا کے علم کے بغیر علم کا کوئی سرچشمہ نہیں ہے۔ اس لیے انسان کی زندگی کا ہر معاملہ ہر قدم اور ہر عمل اللہ کی مدد کا محتاج ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان نے جو بھی دانش حاصل کی ہے وہ اللہ کا ہی عطا کردہ علم ہے لیکن انسان اسے اپنی ذہنی صلاحیتوں کا نتیجہ سمجھتا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کا اعلان ہے کہ وہ بڑا کریم ہے اس نے قلم کے ذریعے انسان کو علم سکھایا اور اسے وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔

اس آیت کریمہ میں انسان کی اس غلط فہمی کو دور کیا گیا ہے کہ جو علم اس نے حاصل کیا وہ اس کی ذہانت (intellegence) اور تحقیق (research) کا کمال اور ذاتی محنت کا نتیجہ ہے۔ لیکن وہ اس حقیقت پر نظر نہیں ڈالتا ہے کہ جب وہ اس دنیا میں آیا وہ اکیلا تھا۔ خوف اور بھوک کے علاوہ اسے کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اللہ تعالیٰ اس کو علم سے نوازتا رہا لیکن اس نے اپنی عقل اور ذہانت کو علم کا سرچشمہ سمجھا اس لیے اس نے پیغمبروں کے لائے ہوئے علم کو رد کرنا شروع کردیا اور اسے اپنی عقل کے ترازو میں تولنے لگا۔ اسے یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ یہ علمی حواس بھی اس کو اللہ نے ہی دیئے ہیں اور عقل سے بھی اسی نے نوازا ہے۔ انسان نے جتنی ایجادات (inventions) اور دریافتیں (discoveries) عمل میں لائی، ان کے دروازے اللہ تعالیٰ نے ہی اس کے لیے کھول دیئے اور سائنس کے میدان میں اس نے جتنی ترقی کی اس کا سراغ بھی اُسے اللہ نے ہی دیا۔ نیوٹن نے کتنی بار سیب کو درخت سے گرتا دیکھا ہوگا لیکن اسے تب تک کبھی یہ خیال نہ آیا کہ یہ سیب زمین کی طرف کیوں آتا ہے اوپر آسمان کی طرف کیوں نہیں جاتا ہے جب تک اللہ نے اس کا شعور نہ دیا جس سے اس نے اس بات کا انکشاف کیا کہ زمین کی کشش (gravitation) سے یہ سیب زمین پر گرتا ہے۔

آئنس ٹائن (Einstein) ایک عام اور اوسط درجے کا طالب علم تھا۔ لیکن جب اللہ نے اسے ریاضی اور فزیکس (Mathematics- Physics) کے علوم سے روشناس کیا تو اس نے نظریۂ اضافت (Theory of Relativity) پیش کیا جس سے سائنسی میدان میں انقلاب برپا ہوا۔ الغرض یہ سب علوم جو انسان کو حاصل ہوجاتے ہیں ان کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

یہاں تک وحی کی ابتدائی آیات ہیں جو غار حرا میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئیں جن سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کے فرستادہ جبریل علیہ السلام سے تعارف ہوا اور انہیں نزول وحی کا پہلا تجربہ ہوا۔

كَلَّا إِنَّ الْإِنسَانَ لَيَطْغَىٰ(٦)

ہرگز نہیں ! انسان سرکشی کرتا ہے

أَن رَّآهُ اسْتَغْنَىٰ(۷)

اس بناپر کہ وہ خود کو بے نیاز دیکھتا ہے

إِنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الرُّجْعَىٰ(۸)

بے شک تیرے ہی رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے

ہرگز نہیں انسان سرکشی کرتا ہے، اس بنا پر کہ وہ خود کو بے نیاز سمجھتا ہے

یعنی ایسا کبھی نہیں ہونا چاہیے کہ جس انسان پر خدائے کریم نے اتنا بڑا احسان کیا ہو کہ اسے علم وہنر سے نوازا وہ سرکش ہوجائے اور اللہ کی نافرمانی اور اس کے رسول کی تکذیب کرے حالانکہ جس ہستی نے اسے پیدا کیا اور سب کچھ دے کر آسودہ اور غنی بنایا اس پر انعامات اور احسانات کی بارش کی۔ اسے علم سے نوازا۔ اس ہستی کا شکر ادا نہ کرے اور ان نعمتوں کے سرچشمہ کو نہ پہچانے۔ اللہ نے اس پر علم اور رزق کا فیضان کیا اس کے برعکس وہ نادان سرکشی اور نافرمانی کی روش اپناتا ہے، باغی اور متکبر بنتا ہے حالانکہ اسے اپنے محسن رب کو پہچاننا تھا اور اس کا شکر ادا کرنا چاہیے تھا لیکن وہ سرکش ہوجاتا ہے یہ سرکشی اور نافرمانی وہ اس لیے کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز سمجھتا ہے۔ اپنے آپ کو خدا کی بندگی سے آزاد اور بری خیال کرتا ہے۔ اس لیے ایک بے لگام اونٹ کی طرح جس کھیت میں جانا چاہتا ہے چلا جاتا ہے۔ وہ اپنے خالق کو یکسر بھول جاتا ہے اور اس صورت میں اپنے آپ کو بے نیاز اور بے پرواہ سمجھتا ہے۔

بے شک تیرے رب ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے

یعنی انسان دنیا میں جو کچھ بھی کرے جتنی بھی سرکشی کرے آخر کار اسے اللہ کے پاس ہی جانا ہے پھر اسے معلوم ہوجائے گا کہ سرکشی کا انجام کیا ہوتا ہے اور یہ کہ خدا کے سوا اور کوئی جائے پناہ اور ٹھکانا نہیں ہے۔

نیک ہو یا بد، فرمانبردار ہو یا نافرمان، اہل حق ہو یا اہل باطل، خیر پسند ہو یا شر پسند، غنی ہو یا محتاج سب کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ یہ سرکش اور باغی انسان بھاگ کر آخر کہاں جائے گا۔

أَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهَى (٩)

بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جو منع کرتا ہے

عَبداً إِذَا صَلَّى(١٠)

ایک بندے کو جب کہ وہ نماز پڑھتا ہے

أَرَأَيتَ إِن كَانَ عَلَى الْهُدَى(١١)

بھلا دیکھو اگر وہ (بندہ) راہ راست پر ہو

أَوْ أَمَرَ بِالتَّقْوَى(١٢)

یا پرہیزگاری کی تلقین کرتا ہو

أَرَأَيتَ إِن كَذَّبَ وَتَوَلَّى(١٣)

تمہارا کیا خیال ہے اگر یہ منع کرنے والا جھٹلاتا ہو اور مُنہ موڑتا ہو

أَلَمْ يَعْلَمْ بِأَنَّ اللهَ يَرَى(١٤)

کیا وہ نہیں جانتا ہے کہ بے شک اللہ دیکھ رہا ہے

بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جو منع کرتا ہے، ایک بندے کو جب کہ وہ نماز پڑھتا ہے

نماز سے منع کرنے کا اشارہ ابو جہل کی طرف ہے جو کھلم کھلا نبی ﷺ کی مخالفت پر اتر آیا تھا اور جسے نبی ﷺ کی حرم کعبہ میں نماز پڑھنی سخت ناگوار تھی۔ اسی کے متعلق فرمایا جارہا ہے کہ ذرا اس کمینے کو دیکھ لو جو خدا کے نیک بندے کو نماز پڑھنے سے روک دیتا ہے۔ بظاہر یہاں ہر انصاف پسند شخص مخاطب ہے جسے اس شخص کی بُری حرکت کی طرف متوجہ کیا جارہا ہے جو خدا کے ایک نیک اور برگزیدہ بندے کو نماز پڑھنے سے منع کرتا ہے۔ بندے سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ قرآن میں مختلف جگہوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بندہ فرما کر کیا گیا ہے۔ مثلاً

سُبۡحَانَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَی (بنی اسرائیل:۱)

پاک ہے وہ جو لے گیا اپنے بندے کو ایک رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصٰی کی طرف

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِہِ الۡکِتٰبَ(سورہ کہف:۱)

تعریف ہے اس خدا کے لیے جس نے اپنے بندے پر کتاب نازل کی

وَّاَنَّہٗ لَمَّا قَامَ عَبۡدُ اللّٰہِ یَدۡعُوۡہُ کَادُوۡا یَکُوۡنُوۡنَ عَلَیۡہِ لِبَدًا(سورہ جن:۱۹)

اور یہ کہ جب اللہ کا بندہ اس کو پکارنے کے لیے کھڑا ہوا تو لوگ اس پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار ہوگئے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بندے کے نام سے پکارنا اللہ کی محمد سے محبت کا اظہار ہے اور ابو جہل کی اس حرکت کا ذکر کرنا کہ وہ اللہ کے پیارے بندے کو نماز پڑھنے سے منع کرتا ہے۔ اس کمینہ سے نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ یہ آپؐ کے لیے سب سے بڑا اعزاز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محبت بھرے الفاظ میں آپ کو اپنا بندہ کہہ کر آپ کا ذکر کیا، جس کی سرفرازی میں اقبالؒ نے کہا:

عبد دیگر عبدہُ چیزے دِگر

یعنی عبد اور عبدہُ یا عبدہٖ میں ایک بہت بڑا فرق ہے۔ عبد یعنی عبادت کرنے والا یا غلامی کرنے والا اپنی مرضی کے مطابق ہزاروں کی عبادت اور غلامی کرسکتا ہے۔ دنیا میں ایسے بے شمار لوگ ہیں جو بے جان چیزوں کی پوجا کرکے عبادت کرتے ہیں۔ بتوں اور انسانوں کو پوجتے ہیں قبروں پر سجدہ کرتے ہیں، انسانوں کی غلامی کرتے ہیں اور ان سے اس طرح اپنی حاجات اور مشکلات کا حل ڈھونڈتے ہیں جس طرح اللہ سے اپنی مرادیں پوری کرنے کے لیے التجا کی جاتی ہے۔ لیکن جو عبدہُ ہوتا ہے وہ نہ تو کسی کی غلامی کرتا ہے اور نہ اللہ کے بغیر کسی کے سامنے جھکتا ہے اور نہ قبروں پر جاکر قبر پرستش کرتا ہے اور نہ درگاہوں پر جاکر اپنی مشکلات دور کرنے کی التجا کرتا ہے۔ وہ اللہ کا خالص اور مخلص بندہ ہوتا ہے مشکلات میں ہو تو اللہ کو ہی پکارتا ہے۔ سہولت اور آسانی ہو تو بھی اللہ کے ذکر میں مشغول رہتا ہے۔

بھلا دیکھو اگر وہ (بندہ) راہ راست پر ہو، یا پرہیزگاری کی تلقین کرتا ہو

گزشتہ آیت میں جس شخص (نماز سے منع کرنے والے) کی احمقانہ حرکت پر اظہار نفرت کیا گیا ہے جس کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرائی گئی اسی کے حوالے سے بات کو آگے بڑھا کر فرمایا جارہا ہے کہ جس شخص نے یہ حرکت کی اور جو لوگ اس حرکت کو دیکھ رہے تھے انہیں اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ آخر وہ نماز پڑھنے والا شخص خدا کا نیک بندہ راہ ہدایت پر ہے اور تبلیغ و دعوت کے ذریعے لوگوں کو تقویٰ کی راہ دکھاتا ہے اسے نماز پڑھنے سے روکنے میں کیا جواز ہے۔

تمہارا کیا خیال ہے اگر یہ منع کرنے والا جھٹلاتا ہو اور منہ موڑتا ہو

کیا وہ نہیں جانتا کہ اللہ دیکھ رہا ہے

عقل و ہوش رکھنے والے بلا تعصب اور غیر جانبدار آدمی کو اس حقیقت پر غور کرنے کی دعوت دی جاتی ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرنے والے کو سجدہ کرنے سے روکتا ہے اور دعوت حق کی تکذیب

کرتا ہے اس کا انجام برا ہے وہ جہنم کا ایندھن بن جائے گا۔ کیونکہ ایسا شخص ایک عظیم انسان کو خدا کی بندگی سے روکتا ہے جبکہ یہ روکنے والا شخص خود اللہ تعالیٰ کو جھٹلاتا ہے اور اس کی اطاعت و بندگی سے منہ موڑتا ہے۔ سورۃ الیل میں ایسے ہی شخص کے لیے فرمایا گیا ہے۔ لَا یَصۡلٰىهَاۤ اِلَّا الۡاَشۡقَىo الَّذِیۡ كَذَّبَ وَتَوَلّٰىo جہنم میں وہی بدبخت داخل ہوجائے گا جس نے جھٹلایا اور منہ موڑا

اس آیت میں واضح ہے جو شخص اللہ کی عبادت کرنے سے روکے اس کا ٹھکانہ جہنم ہے ایسے شخص کو معلوم ہونا چاہیے کہ اسے اللہ خوب جانتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر وقت ہر ایک انسان کی حرکات و سکنات دیکھ رہا ہے اور وہ ہر کسی کے عمل کو جانتا ہے۔

اب ایک ذی عقل انسان کو اس حقیقت کی طرف توجہ دینے کی تلقین کی جاتی ہے کہ اگر ایک بندہ راہ راست پر لوگوں کو خدا سے ڈرنے اور برے کاموں سے دور رہنے کی تعلیم دیتا ہے اور دوسرا بندہ حق کو جھٹلاتا ہے ایک خدا کی عبادت کرنے کے بجائے بے جان چیزوں بتوں کی پوجا کرتا ہے اور راہ حق پر چلنے والوں کو روکتا ہے، تو کیا اس طرح کے انسانوں کا طرز عمل ٹھیک ہے یا اس انسان کا طرز عمل ٹھیک ہے جو راہ راست پر ہے اور لوگوں کو خدا سے ڈرنے اس کی عبادت کرنے اور برائیوں سے دور رہنے کی تعلیم دیتا ہے۔

اب اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا جارہا ہے کہ اگر اس شخص کو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بندے کو بھی دیکھ رہا ہے جو حق کا راستہ اختیار کرلیتا ہے اور نیک کام کرتا ہے اور اس کو بھی دیکھ رہا ہے جو حق کو جھٹلاتا ہے اور اللہ کی روگردانی کرتا ہے تو وہ راہ خدا اختیار کرلیتا ہے اور خدا کی بندگی میں شامل ہوجاتا چونکہ اللہ تعالیٰ ظالم کے ظلم اور مظلوم کی مظلومی کو دیکھتا ہے اس لیے اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ ظالم کو سزا دے گا اور مظلوم کی داد رسی کرے گا۔

كَلَّا لَئِن لَّمْ يَنتَهِ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ(١٥)

ہرگز نہیں اگر وہ باز نہ آیا تو ہم اسے پیشانی کے بل گھسیٹیں گے

نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ(١٦)

اُس پیشانی کے بل جو جھوٹی اور خطا کار ہے

ہرگز نہیں اگر وہ باز نہ آیا تو ہم اسے پیشانی کے بل گھسیٹیں گے۔

اس پیشانی کے بل جو جھوٹی اور خطاکار ہے

ہرگز نہیں سے مراد یہ ہے کہ یہ شخص جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دھمکی دیتا ہے کہ اگر وہ کعبہ میں نماز پڑھتے دکھائی دیئے تو وہ انہیں روکے گا اور ان کی گردن کو پاؤں سے دبائے گا۔ ہرگز نہیں ایسا نہیں ہوسکتا ہے۔ اللہ اور اس کے رسول کے دشمن کو یہ معلوم نہیں ہے کہ اس دھمکی دینے والے کی گردن پر خدا کا عذاب سوار ہوچکا ہے۔ جو جلدی ہی نہ صرف اُس کی گردن دبائے گا بلکہ اس کی گردن کاٹ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں ڈالدے گا۔ اور معرکہ بدر میں موجود صحابہ نے اس کا نظارہ کیا۔

فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ(۱۷)

پس بلا لے وہ اپنے حامیوں کی ٹولی کو

سَنَدۡعُ الزَّبَانِيَةَ(۱۸)

ہم بھی بلالیں گے عذاب کے فرشتوں کو

كَلَّا لَا تُطِعۡهُ وَاسۡجُدۡ وَاقۡتَرِبۡ(۱۹)

ہرگز نہیں، اس کی بات نہ مانو اور سجدہ کرو اپنے (رب کو) اور (اس کا) قرب حاصل کرو۔

پس بلالے وہ اپنے حامیوںکی ٹولی کو، ہم بھی بلالیں گے عذاب کے فرشتوں کو

بعض روایات میں آتا ہے کہ ابتدائی حصہ کی پانچ آیات کو چھوڑ کر بقیہ سورہ ابوجہل کے متعلق نازل ہوا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد حرام میں مقام ابراہیم کے پاس نماز ادا کررہے تھے کہ ابو جہل ادھر سے گزرا اس نے آپؐ سے کہا، اے محمدؐ! کیا میں نے تمہیں ایسی حرکت کرنے (نماز پڑھنے سے) منع نہیں کیا تھا اور اسی کے ساتھ آپ کو دھمکی بھی دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسے سختی سے جواب دیا اور ایک روایت کے مطابق آپؐ نے اس کا گلا پکڑ لیا اور کہا اَوۡلیٰ لَکَ اَوۡلیٰ۔ ہلاکت ہو تمہارے لیے، ہلاکت۔ ابو جہل نے کہا اے محمدؐ تم مجھے کس بات کی دھمکی دے رہے ہو۔ خدا کی قسم اس وادی میں میرے حامی و ناصر یعنی میری حمایت کرنے والے اور مدد کرنے والے بہت زیادہ ہیں۔ اس پر آیت نازل ہوئی۔ وہ اپنے حامیوں کی ٹولی کو بلالے اور ہم فرشتوں کو بلالیں گے۔ ابن عباس نے فرمایا ہے کہ اگر ابو جہل اپنے حامیوں کو بلاتا تو عذاب کے فرشتے اسے اسی دم پکڑ لیتے۔ مفسرین کا خیال ہے کہ آیت کی دھمکی صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت اور ابوجہل کی تذلیل اور مخالفت ہی میں نہیں بلکہ آیت کی دھمکی ہر اس شخص کی حمایت می ہے جو خدا کا فرمانبردار، عبادت گزار اور اس کے دین کا داعی ہو۔ اور ہر اس سرکش اور باغی کی مخالفت اور تذلیل میں ہے جو

نماز سے روکتا ہے اور خدا کی عبادت کرنے والوں کو روکتا ہے اور اپنی طاقت پر گھمنڈ کرتا ہے۔ نبی کو روکنے والا صرف ابو جہل ہی نہیں تھا بلکہ دوسرے غنڈے بھی تھے۔ غنڈے صرف نبی کی نمازو میں ہی مزاحمت نہیں کرتے تھے بلکہ اللہ کے دوسرے بندوں کے ساتھ بھی اسی طرح کی بدتمیزیاں کرتے تھے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو مخاطب کرکے اپنے بندوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور دین کے دشمنوں کو باز رہنے کی دھمکی بھی دیتا ہے۔ خدائے واحد القہار کی یہ دھمکی ابو جہل جیسے دشمنان دین کی مخالفین میں آج بھی موجود ہے جو دین اسلام اور اس کے حامیوں کو ایذا دیتے ہیں اور ان مومنوں کی حمایت میں ہے جو دین اسلام کی خدمت کرتے ہیں۔ اور اس کے لیے سرکٹانے کے لیے تیا رہیں۔

ہرگز نہیں اس کی بات نہ مانو اور سجدہ کرو اور اس کا قرب حاصل کرو

ہرگز نہیں سے یہاں مراد یہ ہے کہ خدا کے دشمنوں کے دباؤ میں ہرگز مت آؤ ان کا کہنا مت مانو اور اپنے رب کے حضور سجدہ کرکے یعنی نماز پڑھ کر اپنے رب کے قریب آکر اس کی بندگی اور اس کی عبادت کرو اوراس کی فرمانبرداری کرکے اس کی ناراضگی سے بچ کر رہو۔ بے خوف نماز پڑھتے رہو اور اس نماز کے ذریعے اپنے رب کا قرب حاصل کرو۔ حضر ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ سب سے زیادہ اپنے رب کے قریب اس وقت ہوتا ہے جب وہ سجدے میں ہوتا ہے۔

یَا أَیُّہَا الَّذِیْنَ آمَنُوْآ اسْتَعِیْنُوْآ بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاۃِ إِنَّ اللہَ مَعَ الصَّابِرِیْنَo (بقرہ:۱۵۳)

اے ایمان والو صبر اور نماز کے ذریعے مدد مانگو۔ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

ایمان والوں سے کہا گیا ہے کہ جب مشکلات میں ہوں تو ان مشکلات سے نکلنے کے لیے آپ کو صبر کرنے اور نماز پڑھنے کی ضرورت ہے کیونکہ ان دو چیزوں سے ہی آپ ان مشکلات سے نجات پاسکتے ہیں اور خدا کی رضا حاصل کرسکتے ہیں۔ لیکن صبر انسان کو نماز پڑھنے سے ہی حاصل ہوسکتا ہے اس لیے اہل ایمان کو سجدہ کرنے یعنی نماز پڑھنے کی تلقین کی گئی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ انہیں ان مشکلات میں صبر کی نعمت سے نوازیں گے اور صبر و نماز کی عہدہ برائی اور بجاآوری سے ہی آپ بہ فضل خدا ان مشکلات سے نکلنے میں کامیاب ہوجائیں گے ورنہ نماز کے بغیر دعا اور آرزو صدا بصحرا ہے۔

ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ آیت پڑھتے تھے تو سجدہ تلاوت فرماتے تھے۔ جو اس حدیث کی تعمیل میں آج بھی برقرار ہے۔

سُوْرَۃُ الْقَدْر مکیۃ

اٰیتُہا:5 رکوعھا:1

بسم اللہِ الرَّحمٰن الرَّحیم

إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ o وَمَا أَدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ o لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ o تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِم مِّن كُلِّ أَمْرٍ o سَلَامٌ هِيَ حَتَّىٰ مَطْلَعِ الْفَجْرِ o

پس منظر:

سورہ علق کی ابتدائی پانچ آیات پہلی وحی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی ہے اس وحی کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ یہ وحی لَیۡلَۃُ الۡقَدۡرِ یا شب قدر یعنی متبرک اور قدر و منزلت والی رات میں ایک معزز اور معتبر فرشتے کے ذریعے ان تک پہنچائی گئی ہے۔ مراد یہ کہ شب قدر میں نزول قرآن کا آغاز ہوا اس لیے اس رات کو قدر و منزلت والی رات کے نام سے یاد فرمایا گیا۔ یہ رمضان کے مہینے کی ایک رات ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ شَہۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡہِ الۡقُرۡاٰن (البقرہ:۱۸۵) رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔ سورہ دخان میں اس رات کے متعلق فرمایا گیا ۔ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰہُ فِیۡ لَیۡلَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ (آیت:۳) ''ہم نے اسے ایک برکت والی رات میں نازل کیا''۔

اکثر مفسرین کے مطابق اس سورہ کا موضوع لوگوں کو قرآن کی قدو قیمت سے آگاہ کرنا ہے جو لوگ قرآن کی مخالفت کرتے تھے انہیں متنبہ کیا جاتا ہے جس قرآن کو وہ اپنے اوپر مصیبت سمجھتے تھے وہ قرآن جس رات میں نازل ہوا ہے۔ وہ خیر و برکت کی حیثیت سے ہزار رات یا ہزاروں راتوں سے بہتر ہے۔ کیونکہ اس رات میں قرآن مجید یعنی اللہ کا آخری پیغام نازل ہوا تاکہ انسان اپنی زندگی کا مطلب و مقصد سمجھ سکیں، اپنے خالق کو پہچان لیں اور اس کی بندگی کرکے عبادت میں مشغول ہوجائیں اس قرآن مجید کے ذریعے دنیا والوں کو خبردار کیا گیا کہ وہ مرکر مٹی کے ساتھ ملکر فنا نہیں ہوجاتے ہیں بلکہ انہیں دوبارہ زندہ کرکے اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کیا جائے گا۔ جہاں ان کے عملوں کا حساب لیا جائے گا پھر نیک عمل کرنے والوں کو جنت کی زندگی عطا کی جائے گی اور برے اعمال کرنے والوں کو جہنم میں ڈال کر سخت عذاب دیا جائے گا۔ یہی انسان کی زندگی کا راز ہے اور یہی اس کے دنیا میں آنے کا مقصد ہے۔ شب قدر اسی احساس کی ترجمانی اور یاد دہانی ہے۔

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰہُ فِیۡ لَیۡلَۃِ الۡقَدۡرِ(۱)

بے شک ہم نے اس (قرآن) کو شب قدر میں نازل کیا ہے

وَمَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا لَیۡلَۃُ الۡقَدۡرِ(۲)

تم کیا جانو شب قدر کیا ہے؟

لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ(۳)

شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے

تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِم مِّن كُلِّ أَمْرٍ(۴)

فرشتے اور روح اس رات میں اپنے رب کے اِذن سے ہر حکم لے کر اُترتے ہیں

سَلَامٌ هِيَ حَتَّىٰ مَطْلَعِ الْفَجْرِ(۵)

یہ رات طلوع فجر تک سراسر سلامتی ہے

بے شک ہم نے اس قرآن کو شب قدر میں نازل کیا ہے

القدر کے دو مطالب بیان کیے گیے ہیں ایک یہ کہ القدر کا معنی تقدیر ہے یعنی شب قدر (تقدیروں) کی رات ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے قدر کا مطلب یہ ہے کہ اس رات میں اللہ تعالیٰ تقدیر کے فیصلے فرشتوں کے سپرد کر دیتے ہیں جو اُس کے حکم کے مطابق انہیں نافذ کردیتے ہیں۔ اس کی تائید سورہ دُخان کی اس آیت سے ہوتی ہے۔ فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ۔ (اس رات ہر معاملے کا حکیمانہ فیصلہ صادر کیا جاتا ہے) قدر کا دوسرا معنی عظمت اور قدر و منزلت ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے شب قدر سے ایک عظیم رات مراد ہے، جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ کیونکہ اس رات میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر بہت بڑا احسان کیا کہ انہیں قرآن مجید کی عظیم نعمت سے نوازا۔ یہ قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات پر نازل ہوا جنہوں نے اس امانت کو حرف بہ حرف لوگوں تک پہنچادیا۔ شب قدر اسی نزول قرآن کی یاد دہانی ہے۔

شب قدر ماہ رمضان کی کون سی رات ہے اس بارے میں اختلاف ہے امت کی ایک بڑی اکثریت، جن میں حضرت عبادہ بن صامت، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت ابوبکرہ، حضرت عائشہؓ اور عبداللہ بن عمرؓ شامل ہیں یہ رائے رکھتی ہے کہ ماہ رمضان کی آخری دس راتوں میں ایک طاق رات شب قدر ہے۔ لیکن سلف کی ایک بڑی تعداد جن میں ابی بن کعب، حضرت ابو ذر، حضرت معاویہ وغیرہ شامل ہیں کے مطابق شب قدر ستائیسویں رات ہے کسی ایک رات کا تعین شاید اس لیے نہیں کیا گیا کہ شب قدر کی فضیلت کا فیض اٹھانے کے لیے زیادہ سے زیادہ راتو میں اللہ کی عبادت کی جائے۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اس رات کو اس نشانی سے پہچانا جاسکتا ہے کہ اس رات تھوڑی یا زیادہ بارش ضرور ہوتی ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس رات کی نشاندہی کی گئی تو اس رات بارش ہوئی تھی لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ اگر بارش ہوئی بھی تو وہ محض اتفاق تھا۔ اگر یہ اتفاق نہ ہوتا تو پھر ہر قدر کی رات میں بارش ہوتی لیکن نہ نبی کے دور میں اور نہ آپ کے بعد شب قدر میں ایسا ہوا ہے۔

بعض لوگ شب قدر کے متعلق سوچتے ہیں کہ دنیا کے ہر حصے میں رات اور دن یکسان نہیں ہوتے ہیں کسی جگہ پر دن ہوتا ہے تو کسی اور جگہ پر اس وقت رات ہوتی ہے اس لیے جب مکہ میں رات ہوگی تو کسی اور جگہ پر دن ہوگا جب مکہ میں شب قدر ہوگی تو دنیا کے بہت سے مقامات پر رات کے بجائے جب دن ہوگا تو وہاں شب قدر نہیں ہو سکتی ہے۔ اس بارے میں بہت سے تجزیے ہیں لیکن سب سے زیادہ مستحکم رائے ہے کہ ہر کسی مقام پر وہاں کے رات طاری ہونے کے حساب سے آخری عشرہ کی پانچ طاق راتوں میں سے ایک رات یا ستائیسویں رات شب قدر قرار پائے گی۔

تم کیا جانو شب قدر کیا ہے

اس آیت میں جس چیز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس پر غور کیا جائے تو یہ بات اچھی طرح سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ اشارہ اس رات کی طرف ہے جس میں قرآن مجید نازل کیا گیا ہے، جس رات میں تمام امور کا فیصلہ ہوتا ہے۔ انسانوں کی تقدیروں اور قسمتوں کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ افراد سے بڑھ کر قوموں، نسلوں اور حکومتوں کی قسمتوں کا فیصلہ ہوتا ہے مگر اس سب سے بڑھ کر اس رات کی خیر و برکت یہ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر عظیم رحم فرمادیا کہ اپنے احکام و ہدایات کی کتاب قرآن مجید نازل کی جو انسانوں اور انسانیت پر ایک سب سے بڑا احسان ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس احسان کی یاد میں شب قدر ایمان اور احتساب کے ساتھ منائی جاتی ہے اگر اسے جشن نزول قرآن کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ مَنْ قَامَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ اِيْمَاناً وَّ اِحْتِسَاباً غُفِرَلَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ۔ جس کسی نے شب قدر میں ایمان اور احتساب کی حالت میں قیام کیا، اس کے پچھلے گناہ معاف کردئے جائیں گے ایمان دراصل اس شعور کا نام ہے جو قرآن اپنے قاری کے اندر پیدا کرتا ہے اور احتساب کا مطلب یہ ہے کہ عبادت صرف اللہ کے لیے اور اخلاص کے ساتھ کی جائے۔ شب قدر کی عظمت یہ ہے کہ اس رات میں نزول قرآن مجید کی ابتدا ہوئی اسی رات میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی تصدیق ہوئی یعنی اس خیر و برکت کی متبرک اور محترم رات میں نوع انسانی پر اللہ کی رحمت

نازل ہوئی اسی پر اپنے ایمان کو تازہ کرنا اور اس عمل کا احتساب کرنا ہے۔

شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے

ہزار مہینے ۸۳ سال ۴ ماہ کا عرصہ ہے لیکن ہزار مہینوں سے ۸۳ سال ۴ ماہ کا عرصہ مراد نہیں ہے بلکہ اس سے مراد عرصہ دراز ہے کیونکہ اہل عرب ایک بہت غیر معیّنہ تعداد کا تصور دلانے کے لیے ہزار کے لفظ کا استعمال کرتے تھے اس لیے ہزار مہینوں کا مطلب یہ ہے کہ اس رات میں خیر و بھلائی کا جو کام ہوا وہ انسانی تاریخ میں کبھی نہیں ہوا ہے اور نہ آگے خیر و بھلائی کا کوئی ایسا واقعہ پیش آئے گا کیونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبین کی حیثیت سے بھیجے گئے ہیں اور وحی کا سلسلہ تاقیامت بند ہوچکا ہے اس لیے انسانی تاریخ میں نہ کوئی ایسا واقعہ پیش آنے والا ہے اور نہ کوئی ایسی رات آنے والی ہے جس کی قدر ومنزلت نزول وحی کی رات کی طرح ہو جس میں کائینات کے راز کھل گئے اور نوع انسانی قرآن کی بدولت اللہ رب العالمین کے وجود سے متعارف ہوئی اس لیے یہ کہنا حق بجانب ہے کہ تاقیامت جتنے مہینے گزر جائیں گے شب قدر ان سب مہینوں سے بہتر ہے اور اس کی عظمت و اہمیت قیامت تک کے دنوں مہینوں اور سالوں پر حاوی رہے گی۔

فرشتے اور روح اس رات میں اپنے رب کے اذن سے ہر حکم لے کر آتے ہیں

روح سے مراد روح الامین یعنی حضرت جبریل علیہ السلام ہیں جو دوسرے ملائیکہ کے ساتھ اللہ کے اذن سے زمین پر معاملات اور دیگر امور کو نافذ کرنے کے لیے اترتے ہیں۔ حضرت جبریل کا ذکر فرشتوں سے الگ کیا گیا ہے یہ اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے وحی لانے کا شرف بخشا ہے اور یہ وہ فرشتہ ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک وحی حرف بہ حرف پہنچائی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ وحی یعنی قرآن لوگوں تک لفظ بہ لفظ مِن و عن پہنچا دیا۔ فرشتوں اور حامل وحی حضرت جبریل کا شب قدر میں زمین پر اُترنا اللہ تعالیٰ کے اس پیغام کی یاد دہانی ہے جس کو انہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کردیا۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''کہ لَیلَۃ القدر میں جبریل فرشتوں کے ہجوم کے ساتھ زمین پر اترتے ہیں اور فرشتوں کا یہ ہجوم ہر اس بندے کے لیے دعائے مغفرت اور رحمت کی التجا کرتا ہے جو کھڑے ہوئے یا بیٹھے ہوئے اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہوتا ہے'' فرشتوں کا یہ ہجوم از خود نہیں اترتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی اجازت سے اترتا ہے اور جہاں کہیں خدا کے یہ بھیجے ہوئے فرشتے کسی بندے کو ذکر خدا کرتے ہوئے دیکھتے ہیں اس کے لیے مغفرت کی دعائیں مانگتے ہیں۔

یہ رات شام سے صبح تک سلامتی اور خیر وبرکت کی رات ہے

یہ رات فتنوں اور فسادات سے پاک ہے اس رات میں خدا کی عبادت کرنے والوں کو سکون قلب حاصل ہوجاتا ہے اس رات میں توبہ کے دروازے کھلے ہوتے ہیں بندوں کی دعائیں قبول کی جاتی ہیں اور ان کی مرادیں پوری کی جاتی ہیں۔ اس رات میں شیاطین پر پابندی لگادی جاتی ہے وہ اس رات میں بندوں کی عبادت اور ذکر و ازکار میں خلل نہیں ڈالتے ہیں البتہ جس شخص کو اپنا نفس فتنے وفسادات، شرانگیزی یا کسی اور برائی کے لیے اکسائے اسے زبردستی روکا نہیں جاتا ہے کیونکہ کوئی عمل زبردستی روکنا انسان کے اختیارات اور آزادی میں مداخلت ہے۔ بہرحال اس رات میں اللہ کا بندہ گناہوں سے پاک ہوکر اللہ کی رحمت اور مغفرت لے کر لوٹ آتا ہے اس سے بڑھ کر خدا کے اس بندے کے لیے کوئی بڑی خوشی نہیں ہوسکتی ہے۔

سُوْرَۃُ الْبَیِّنَہ

اٰیاتُھا:8 رُکُوعُھا:1

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لَمۡ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنۡ أَهۡلِ الۡكِتَابِ وَالۡمُشۡرِكِينَ مُنفَكِّينَ حَتَّىٰ تَأۡتِيَهُمُ الۡبَيِّنَةُ o رَسُولٌ مِّنَ اللهِ يَتۡلُو صُحُفًا مُّطَهَّرَةً o فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ o وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا الۡكِتَابَ إِلَّا مِن بَعۡدِ مَا جَاءَتۡهُمُ الۡبَيِّنَةُ o وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعۡبُدُوا اللهَ مُخۡلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤۡتُوا الزَّكَاةَ ۚ وَذَٰلِكَ دِينُ الۡقَيِّمَةِ o إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنۡ أَهۡلِ الۡكِتَابِ وَالۡمُشۡرِكِينَ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ أُولَٰئِكَ هُمۡ شَرُّ الۡبَرِيَّةِ o إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ هُمۡ خَيۡرُ الۡبَرِيَّةِ o جَزَاؤُهُمۡ عِندَ رَبِّهِمۡ جَنَّاتُ عَدۡنٍ تَجۡرِي مِن تَحۡتِهَا الۡأَنۡهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ رَّضِيَ اللهُ عَنۡهُمۡ وَرَضُوا عَنۡهُ ۚ ذَٰلِكَ لِمَنۡ خَشِيَ رَبَّهُ o

پس منظر:

قرآن مجید کی ترتیب میں اس سورہ کو سورہ علق اور سورہ قدر کے بعد رکھا گیا ہے۔ یہ ترتیب معنی خیز ہے۔ سورہ علق کی ابتدائی پانچ آیات سے وحی کا آغاز ہوا۔ سورہ قدر میں اعلان فرمایا گیا ہے کہ قرآن مجید قدر کی رات میں نازل ہوا اس لیے شب قدر ایک عظیم رات ہے۔ یہ رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے اب اس سورہ البینہ میں سب سے پہلے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری کتاب قرآن مجید کے ساتھ بھیجنے کی ضرورت بیان کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اس لیے ضروری تھی کہ اہل کتاب اور مشرکین گمراہی اور اختلاف کی جس حد تک پہنچ چکے تھے اُن کو اس سے باز لایا جائے اور اس گمراہی سے ان کا نکلنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بغیر ناممکن تھا۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے تک پوری دنیا شرک و کفر کی لعنت میں بتلا تھی حالانکہ ان کی بعثت سے پہلے بھی رسول آتے رہے اور رسولوں کو لوگ مانتے تھے۔ دنیا میں مختلف مذاہب موجود تھے کچھ لوگ منکر خدا اور منکر مذہب بھی تھے لیکن جو لوگ مذہب اور خدا کو مانتے تھے وہ شرک کی بیماری میں بری طرح سے بتلا ہو چکے تھے۔ دین میں غُلو اور بگاڑ آچکا تھا۔ اہل کتاب نے کتب آسمانی میں تحریف کرکے ان کو بے معنی بنا کے رکھدیا تھا۔ ایک طرف مذہب کے نام اہل کتاب لوگوں کا استحصال کرتے تھے دوسری طرف مشرکوں اور ملحدوں نے شرک و الحاد کا راگ الاپ کر دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اہل کتاب مختلف فرقوں میں بٹ چکے تھے ان کے دو بڑے فرقے یہود اور نصاریٰ (عیسائی) وجود میں آچکے تھے۔ یہ دونوں فرقے اگرچہ ایک خدا کو مانتے تھے لیکن عملی طور پر انہوں نے اپنی خواہشات کے مطابق توحید پر شرک کا رنگ چڑھا دیا تھا۔ اہل یہود نے عُزیر کو خدا کا بیٹا بنایا تھا اور عیسائی حضرت عیسٰی کو خدا کا بیٹا مانتے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اسے خدا کے مقام تک پہنچا دیا تھا۔ ان ناموافق حالات (Adverse circumstances) میں صحیح راستہ اختیار کرنا انتہائی مشکل تھا اور توحید کو ڈھونڈنا ناممکن تھا۔ اس لیے ان حالات سے نکلنے کے لیے ایک رسول بھیج دیا گیا جس نے دین کو اصلی روپ میں پیش کیا اور اسے باطل کی ان تمام آمیزشوں سے پاک کر دیا جن سے پچھلی کتب آسمانی کو آلودہ کردیا گیا تھا اور جس نے وہ دین لایا جو صحیح تعلیمات پر مشتمل ہے۔

اس سورہ میں اہل کتاب کے متعلق فرمایا گیا کہ یہ لوگ اس لیے گمراہ نہیں ہوئے کہ ان کے پاس کوئی رسول خدا کا پیغام لے کر نہ آیا تھا بلکہ یہ اس لیے گمراہ ہوگئے ہیں کہ انہوں نے رسولوں کے لائے ہوئے دین میں غُلو کیا اور ان کے پاس اللہ کا جو پیغام پہنچا تھا اس کو اپنی نفسانی خواہشات کے تابع بنا کر مسخ کردیا اور اللہ کے دین کو اپنی مرضی کا دین بنایا۔ اس لیے یہ لوگ گمراہی کے خود ذمہ دار ہیں۔

سورہ میں اعلان ہوا ہے کہ اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے جو پیغام پہنچایا جارہا ہے اس سے اُس باطل رنگ اور آلودگی کو ہٹانا مطلوب و مقصود ہے جو دین حق پر ان نام نہاد مذہب والوں نے چڑھا دیا ہے۔ دین حق کو اب اس آلودگی سے صاف کرنا اور بچانا بے حد ضروری ہے۔ اگر یہ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے پیغام کو بھی جھٹلائیں گے تو وہ مزید گمراہی میں مبتلا ہوجائیں گے۔ انہیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اللہ کی طرف سے جو بھی انبیاء کرام آئے انہوں نے اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا تھا کہ سب طریقوں کو چھوڑ کر اور یکسو ہو کر صرف ایک اللہ کی بندگی اختیار کی جائے، نماز قائم کی جائے اور زکوٰۃ ادا کی جائے یہی دین قیمہ یعنی صحیح اور راست دین ہے۔

سورہ کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ اس رسول کو ماننے سے انکار کریں گے چاہے اہل کتاب ہوں یا مشرکین، وہ بدترین خلائق ہیں۔ ان کی سزا جہنم ہے۔ جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے اور جو لوگ ایمان لاکر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کو اختیار کریں گے اور عمل صالح کرکے خدائے بزرگ و برتر سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کریں گے وہ بہترین خلائق ہیں ان کی جزا یہ ہے کہ وہ ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔ ان کے لیے سب سے بڑا خوشی کا پیغام یہ ہے کہ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔

لَمۡ يَكُنِ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ مِنۡ أَهۡلِ ٱلۡكِتَٰبِ وَٱلۡمُشۡرِكِينَ مُنفَكِّينَ حَتَّىٰ تَأۡتِيَهُمُ ٱلۡبَيِّنَةُ (١)

جو لوگ اہل کتاب اور مشرکوں میں سے کافر تھے وہ ہرگز (اپنے کفر سے) باز آنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے پاس روشن دلیل نہ آجائے

رَسُولٌ مِّنَ اللہِ یَتۡلُو صُحُفاً مُّطَہَّرَۃً(۲)

یعنی اللہ کی طرف سے ایک رسول، پاک صحیفے پڑھ کر سنائے

فِیۡہَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ(۳)

جن میں راست تحریریں لکھی ہوئی ہوں۔

دنیا کو ایک نئی رسالت کی اشد ضرورت تھی کیونکہ دنیا کا گوشہ گوشہ فساد عام کی زد میں آچکا تھا۔ ان فسادات کے خاتمہ کے لیے ایک نئے نظام اور نئی تحریک کی بے حد ضرورت تھی۔ لوگوں کے عقیدوں میں کفر رچ بس گیا تھا۔ ایک طرف اہل کتاب نے خدائی تعلیمات اور خدا کے دین میں جان بوجھ کر تحریفات کردی تھیں دوسری طرف جزیرۂ عرب اور اس کے متصل علاقوں میں لوگ کفر و شرک میں لت پت تھے جس سے چھٹکارا پانا ایک ایسے رسول کے بغیر ناممکن تھا جو حق و باطل کے درمیان فرق کرنے کا فیصلہ کُن مقام رکھتا ہو اس لیے اللہ کی طرف سے ایک رسول کو بھیجنے کی ضرورت تھی جو پاکیزہ صحیفے پڑھ کر سنائے ایسے صحیفے جو شرک و کفر کی باتوں سے پاک ہوں۔ انسانوں کی اُن تحریفات اور لغو کی آمیزش سے پاک ہوں جن میں تمام مذہبی کتابیں لت پت تھیں نزول قرآن تک سب مذہبی کتابوں کا یہی حال تھا۔

ان حالات کےپیش نظر اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت عین وقت پر ظہور پذیر ہوئی اور قرآن مجید مسائلِ حیات کے شافی حل کے ساتھ بروقت نازل ہوا۔ جس کی بدولت کفر وشرک اور خود ساختہ دین داری کے سارے فتنے ختم ہوگئے۔ دین اسلام روشن ہوگیا۔ خدا کی صحیح پہچان ہوگئی اور نوع انسانی وحی کے نور سے منور ہوگئی۔ ظہور اسلام سے پہلے دنیا کی حالت کیا تھی۔ مذاہب کس طرح کی رسہ کشی میں اختلافات اور انتشار میں مبتلا تھے اور نوع انسانی محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسے رسول کے آنے کی کس درجہ محتاج تھی، اس پر مولانا سید ابوالحسن ندوی اس طرح رقمطراز ہیں:

واقعہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے پہلے تک بڑے بڑے مذاہب بچوں کے کھلونے بن چکے تھے ان کی صورت مسخ ہوگئی تھی اور وہ اپنی حقیقت اور اثر و رسوخ (influence) کھو چکے تھے جن پیغمبروں نے ان مذاہب کو پیش کیا تھا اگر وہ کسی طرح دنیا میں آکر اپنے لائے ہوئے مذہبوں کو دیکھ لیتے تو وہ انہیں ہرگز پہچان نہ پاتے۔ خود غرضی بے راہ روی اور اخلاقی گراوٹ کے نتیجہ میں تمام قومیں اپنے اپنے مسائل میں ہی الجھ کر رہ گئی تھیں یہ قومیں اندر سے کھوکھلی ہوچکی تھیں ان کے پاس نہ دینی ہدایات تھیں اور نہ نظام حکومت کے لیے مستحکم اصول۔

قرآن نے ان اہل کتاب اور مشرکین کی مختلف مقامات پر نشاندہی کی ہے

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللهِ وَقَالَتْ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللهِ (سورہ توبہ:۳۰)

یہود نے کہا عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائیوں نے کہا مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَى عَلَىٰ شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارَى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَىٰ شَيْءٍ (البقرہ:۱۱۳)

یہود کہتے ہیں نصرانی کسی (صحیح) راہ پر نہیں ہیں اور نصرانی کہتے ہیں کہ یہودی کسی (صحیح) راہ پر نہیں ہیں۔

الغرض ساتویں صدی عیسوی کی پہلی دہائی تک روئے زمین پر کوئی قوم ایسی نظر نہ آتی تھی جو صالح کہی جا سکتی اور نہ کوئی ایسی سوسائٹی تھی جو شرافت اور اخلاق کی اعلیٰ قدروں کی حامل ہوتی اور نہ کوئی ایسی حکومت تھی جس کی بنیاد عدل و انصاف پر ہوتی اور نہ کوئی ایسا صحیح دین تھا جو انبیائے کرام کی طرف صحیح نسبت رکھتا تھا!!

اس بنا پر نوع انسانی پر خدائے تعالیٰ نے نظر کرم فرمائی کہ اپنے پاس سے ایک رسول بھیجا جس نے پاکیزہ صحیفے سنائے جن میں صحیح اور محکم تعلیمات ہیں اور یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ اہل کتاب اور مشرکین جس گمراہی میں مبتلا تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بغیر انہیں اس گمراہی سے کوئی نکال نہیں سکتا تھا اور نہ ان کے بغیر انہیں کوئی راہ راست پر لا سکتا تھا اور نہ انہیں کوئی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر شر و فساد سے بچا سکتا تھا۔

جو لوگ اہل کتاب اور مشرکوں میں سے کافر تھے وہ ہرگز (اپنے کفر سے) باز آنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے پاس روشن دلیل نہ آجائے

اگرچہ کفر میں اہل کتاب اور مشرکین دونوں مشترک ہیں تاہم انہیں الگ الگ ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ اہل کتاب سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے پاس انبیاء کی لائی ہوئی کتابیں موجود تھیں اگرچہ ان میں تحریف اور تبدیلی کی گئی تھی اور وہ اصلی شکل میں موجود نہ تھیں۔ پھر بھی یہ لوگ خدا کے نبیوں اور ان کی کتابوں پر ایمان رکھتے تھے۔

مشرکین سے وہ لوگ مراد ہیں جو نبیوں کو نہیں مانتے تھے اور نہ ان کی لائی ہوئی کتابوں کو مانتے تھے قرآن مجید میں اگرچہ اہل کتاب کے کفر اور شرک کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً عیسائیوں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ بالیقین کفر کیا ان لوگوں نے جو کہتے ہیں کہ اللہ تین خداؤں میں کا ایک ہے(المائدہ:۷۳) اور جو حضرت عیسیٰ کو خدا کہتے ہیں۔ (مائدہ:۱۷) وہ حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں (توبہ:۳۰) اور یہود کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ وہ عُزَیر کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں (توبہ:۳۰) لیکن اس کے باوجود قرآن میں اُن کے لیے مشرک کی اصطلاح استعمال نہیں کی گئی ہے بلکہ ان کا ذکر اہل کتاب سے کیا گیا کیونکہ یہ لوگ توحید کے دین کو مانتے تھے اور پھر شرک بھی کرتے تھے جس طرح موجودہ زمانے میں کچھ لوگ مسلمان ہوتے ہوئے شرک میں بتلا ہوجاتے ہیں لیکن مشرک نہیں کہلائے جاتے ہیں کیونکہ وہ اصل میں اسلام کو ہی اپنا دین تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے برعکس غیر توحیدی اور غیر اہل کتاب کے لیے مشرک کا لفظ بطور اصطلاح استعمال کیا گیا ہے اور انہیں مشرکین یعنی شرک کرنے والوں کے نام سے پکارا گیا ہے کیونکہ ان کے دین کی بنیاد ہی شرک پر ہے اور وہ توحید کے منکر ہیں۔ ان دونوں گرہوں کے درمیان یہ فرق صرف اصطلاحی نہیں بلکہ شرعی بھی ہے۔ مثلاً اہل کتاب کا ذبیحہ مسلمانوں کے لیے حلال کیا گیا ہے بشرطیکہ وہ اللہ کا نام لے کر حلال جانور کو صحیح طریقے سے ذبح کریں۔ اور ان کی عورتوں سے مسلمانوں کو نکاح کی اجازت ہے اس کے برعکس مشرکین کا نہ ذبیحہ حلال ہے اور نہ ان کی عورتوں سے نکاح حلال ہے سوائے ان نام نہاد مسلمانوں کے جو دین اسلام کو اپنے اغراض و مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں اور قرآن کی تعلیم سے بے خبر ہیں اور سیکولرازم (secularism) کے نام پر اسے ذاتی معاملہ (personal matter) اور ایسا غیر ضروری مسئلہ سمجھتے ہیں جسے قرآن کے ساتھ نعوذ باللہ کوئی واسطہ نہیں یہ لوگ اس لیے مشرکوں سے نکاح کرتے ہیں کیونکہ ان کی نظروں میں ازدواجی رشتے کو دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

لفر کرنے والے کو کافر کہتے ہیں فقہ کی اصطلاح میں کفر کا معنیٰ اللہ کے وجود سے انکار اور شرع اسلامی سے گریز۔ یہ اسلام کی ضد، بے دینی اور گمراہی ہے اس طرح کافر سے مراد منکر دین، اسلام سے خارج، خدا کا منکر۔ آیت میں کفر کا لفظ مختلف معنوں میں استعمال کیا گیا ہے مثلاً کوئی اس معنی میں کافر تھا کہ وہ سرے سے اللہ کو ہی نہیں مانتا تھا۔ کوئی اللہ کو مانتا تھا مگر اسے واحد معبود نہ مانتا تھا بلکہ خدا لی ذات یا صفات یا اس کے اختیارات میں کسی نہ کسی طرح دوسروں کو شریک ٹھہرا کر اُن کی عبادت کرکے شرک کرتا تھا۔ کوئی خدا کو مانتا تھا مگر اس کے نبیوں کو نہ مانتا تھا کوئی ایک نبی کو مانتا اور دوسرے کا انکار کرتا تھا، کوئی خدا کو مانتا تھا مگر آخرت کا انکار کرتا تھا اس طرح مختلف قسم کے کفر تھے جن میں لوگ بتلا تھے۔ یہ جو فرمایا گیا ہے کہ ''اہل کتاب اور مشرکین میں سے جو لوگ کافر تھے'' اس کا مطلب یہ نہیں کہ دونوں گروہوں میں سے جس گروہ کے لوگ کافر تھے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب اور مشرکوں میں سے جو کافر تھے۔ وہ باز آنے والے نہ تھے جب تک ان کے پاس روشن دلیل نہ آجائے یعنی ان دونوں گرہوں میں کفر کرنے والے شامل تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس کفر کی حالت سے نکلنے کی کوئی صورت نہ تھی سوائے اس کے کہ ایک روشن دلیل ان کے سامنے پیش کی جاتی جو انہیں اس کفر و شرک کی غلاظت سے پاک کردیتی۔ اس روشن دلیل کے آنے کے بعد جو لوگ کفر و شرک پر قائم رہیں گے ان کی ذمہ داری ان ہی پر عائد ہوتی ہے اس کفر وشرک کی گندگی میں پھنسے رہنے کے بعد وہ خدا سے شکایت نہیں کرسکتے ہیں کہ انہیں صحیح دین اور توحید کا راستہ معلوم نہ تھا اس لیے وہ گمراہ ہوگئے۔ جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ ''اے اہل کتاب ! تمہارے پاس ہمارا رسول حقیت واضح کرنے کے لیے رسولوں کا سلسلہ ایک مدت تک بند رہنے کے بعد آگیا ہے تاکہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمارے پاس کوئی بشارت دینے والا اور کوئی خبردار کرنے والا نہ آیا'' (سورہ مائدہ:۱۹)

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے پہلے اہل کتاب کے پاس البینہ یعنی واضح تعلیمات کی صورت میں دین آگیا تھا جس میں رد وبدل کیا گیا، اب البینہ کی صورت میں اللہ کے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح دین لاکر دین مبین کو زندہ کردیا جو پچھلے رسولوں میں مشترک تھا۔ اب حق کی راہ واضح ہوگئی اور اس دین مبین پر ایمان لانے والوں اور انکار کرنے والوں دونوں کا انجام بھی واضح ہوگیا ہے۔

اللہ کی طرف سے ایک رسول آئے جو پاک صحیفے پڑھ کر سنائے

صُحُفاً مُطَہَرَۃً پاک صحیفوں سے مراد قرآن مجید ہے۔ صحیفوں کا لغوی معنی لکھے ہوئے اوراق ہیں لیکن قرآن کی اصطلاح میں صحیفے وہ نسخے ہیں جو کتابوں کی صورت میں انبیاء علیہ السلام پر نازل کی گئی ہیں۔ یہ ایسے صحیفے ہوتے ہیں جن میں کسی قسم کی گمراہی اور بد اخلاقی کی آمیزش نہیں ہوتی ہے۔ جب قرآن مجید کا بائیبل اور دوسرے مذاہب کی کتابوں سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کتابوں میں صحیح باتوں کے ساتھ ساتھ کتنی ہی ایسی فضول باتیں لکھی گئی ہیں جو حق و صداقت اور عقل سلیم کے خلاف اور اخلاقی اعتبار سے گری ہوئی ہیں دراصل ان کتابوں کو مسخ (distort) کیا گیا ہے اور اس بگاڑ (distortion) سے ان کا حلیہ ہی بدل گیا ہے۔ اس کے برعکس قرآن مجید دنیا میں صرف ایک ایسی آسمانی کتاب موجود ہے جس میں کسی بھی قسم کی تحریف نہیں ہوئی ہے اس کے نزول سے اب تک چودہ سو سال گزر گئے ہیں لیکن اس کے ایک لفظ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ مثلاً سورہ توبہ کے آغاز میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بسم اللہ الرحمان الرحیم نہیں لکھوایا۔ آج تک کوئی کاتب یا ادارہ یہ جرأت نہ کرسکا کہ سورۂ توبہ کے آغاز میں بسم اللہ لکھے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید خدا کی نازل کردہ کتاب ہے اس کی حفاظت بھی وہ خود ہی فرماتے ہیں۔ لہذا اس میں رد وبدل (distrotion) کا کوئی سوال ہی نہیں۔ اسی لیے قرآن مجید کو صُحُفاً مُطَہَرۃ کہا گیا ہے۔

جس میں راست اور درست تحریریں لکھی ہوئی ہوں

کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ سے مراد قرآن کی وہ راست اور درست تحریریں ہیں جو ان کتابوں کی تصدیق کرتی ہیں جن کی تحریف (distortion) کی گئی تھی۔

قَیِّمَہ سے مراد صحیح اور محکم موضوعات بھی ہیں کیونکہ کتاب کا اطلاق موضوع پر بھی ہوتا ہے مثلاً کِتاب الطہارت۔ کتاب الصلوٰۃ جس طرح فقہ کی کتابوں میں موضوع کو کتاب کے نام سے لکھا گیا ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے کتاب کی شکل میں جسے قرآن کا نام دیا گیا ہے وہ ایسے صحیفے ہیںجن کے موضوعات صاف پاک اور مُدّلَّل ہیں جن میں صاف ستھرے انداز میں عبادت کے اصول و احکام، اعلیٰ درجے کے پاکیزہ اخلاق اور کامیاب انسانی زندگی کی تعلیم ہے اور قول و فعل کی مطابقت و موافقت اور دعوت حق پر انتہائی جرأت مندی کے ساتھ ثابت قدم رہنے کی ہدایات ہیں۔ یہ وہ احکام ہیں جن سے دنیا میں عدل و انصاف قائم ہوگیا اور دنیا کی ظلمات اور اندھیرے کافور ہوگئے۔

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ(۴)

جن لوگوں کو کتاب بخشی گئی تھی اُن میں واضح دلیل آنے کے بعد ہی تفرقہ رونما ہوا

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَاءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ(۵)

حالانکہ ان سب کو یہی حکم دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں اطاعت کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے (ہر طرف سے) یکسو ہوکر۔ اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں یہی ہے صحیح اور محکم دین

جن لوگوں کو کتاب بخشی گئی تھی ان میں واضح دلیل آنے کے بعد ہی تفرقہ رونما ہوا

قرآن مجید نازل ہونے سے پہلے اہل کتاب جو گمراہیوں میں بھٹک کر بے شمار فرقوں میں بٹ گئے تھے اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اُن کی راہنمائی کے لیے کوئی ہدایت اور کوئی روشن دلیل نہیں آئی تھی بلکہ یہ لوگ اللہ کی طرف سے راہنمائی آنے کے باوجود گمراہ ہوگئے تھے۔ اس لیے یہ اپنی گمراہی اور اپنے اختلافات کے خود ذمہ دار ہیں۔ اب اُن کے صحیفے ملاوٹ سے پاک نہیں رہے اور ان کی کتابیں مسخ ہوگئیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کا تفرقہ ختم کرنے کے لیے اپنا رسول بھیجا جس نے راست اور درست

تعلیمات پر مشتمل پاک صحیفے پیش کر کے ان پر حجت تمام کر دی تا کہ وہ اپنے اختلافات دور کر کے راست اور درست تعلیمات پر مبنی اس کتاب پر ایمان لائیں اور اس کے لانے والے کو بحیثیت رسول تسلیم کریں۔ ورنہ انکار کرنے پر اور اپنے اس تفرقہ پر قائم رہنے کی وجہ سے وہ اپنی تباہی کے خود ذمہ دار ہوں گے اور اللہ کے مقابلے میں وہ کوئی حجت پیش نہ کر سکیں گے۔

اہل کتاب کا پہلا تفرقہ وہ ہے جو حضرت عیسٰی علیہ السلام کی بعثت سے قبل یہود کے مختلف گروہوں کے درمیان رونما ہوا، جب وہ مختلف فرقوں میں بٹ گئے اور ان کے کئی فرقے ہوئے ۔

(۱) صدوقی (۲) آسی (۳) غالی (غلو کرنے والے) (۴) سامری (گوسالہ پرست) ان میں ہر فرقہ کی الگ الگ سمت (direction) تھی۔

دوسرا تفرقہ وہ ہے جو یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان رونما ہوا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام بنی اسرائیل ہی کے ایک نبی تھے اور تورات کی تصدیق کرنے والے تھے اور اس کی پیش گوئیوں کے عین مطابق آئے تھے، یہودیوں اور عیسائیوں کا اختلاف شدید نفرت اور عداوت میں بدل گیا تھا۔ ان دونوں گروہوں کی باہمی خون ریزی اور جنگ وجدال کے تاریخی واقعات پڑھ کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

چھٹی صدی کے آخر میں یہودیوں اور عیسائیوں کے باہمی اختلافات اور منافرت کی حدیہ تھی کہ وہ ایک دوسرے کو ذلیل کرنے اور انتقام لینے میں کوئی کسر باقی نہ رکھتے تھے۔ ایک دوسرے کے قتل عام میں کوئی عار محسوس نہ کرتے تھے۔ 610ء میں یہودیوں نے انطاکیہ میں عیسائیوں کے خلاف بلوہ کیا۔ عیسائی شہنشاہ فوقس (Phacas) نے یہودیوں کی سرکوبی کے لیے مشہور فوجی افسر بنوسس (Bonosus) کو بھیجا جس نے پوری طاقت کے ساتھ ہزاروں یہودیوں کا قتل عام کیا بہت سے لوگوں کو دریا برد کردیا اور سینکڑوں کو زندہ جلاکر بربریت کا مظاہرہ کیا اس طرح اس نے پوری یہودی آبادی کا خاتمہ کردیا۔

عیسائیوں سے بدلہ لینے کے لیے ایران کے فرمانروا کسریٰ نے شام اور مصر پر فوج کشی کی پہلے اس کی فوج نے بیت المقدس فلسطین اور شام کے گرجاؤں کو مسمار کرکے عیسائیوں کا قتل عام کردیا۔ پھر وہ عیسائیوں کی تلاش میں مصر آیا وہاں بھی عیسائیوں کی ایک بہت بڑی تعداد کا قتل عام کرکے ان کا انتقام لیا۔ اس کے بعد یہودیوں نے صورؔ کے شہروں میں بغاوت کردی اور شہر کے گرجاؤں کو مسمار کردیا اس پر عیسائیوں نے کثیر تعداد میں جمع ہوکر یہودیوں پر حملہ کیا۔ یہودیوں کو شکست ہوئی اور ان کی بڑی تعداد مقتول ہوئی۔ یہود صور سے بھاگ کر بیت المقدس پہنچ گئے اور ہرقل بادشاہ کی اجازت سے وہاں پناہ لی۔ ادھر ہرقل نے قسطنطنیہ اور روم کو فتح کرلیا اور وہ روم کا فرمانروا ہوا جب وہ بیت المقدس پہنچا تو عیسائیوں نے اسے بتایا کہ کس طرح یہودیوں نے ایرانیوں کے ساتھ ملکر عیسائیوں پر حملہ کرکے ان کا قتل عام کیا اور گرجاؤں کو مسمار کردیا اس لیے ان سے انتقام لیا جائے لیکن ہرقل نے ہی یہودیوں کو پناہ دے دی تھی اس لیے اس نے معذرت کی پھر پادریوں اور پوپوںنے فتویٰ جاری کیا کہ ہرقل نے بے خبری میں ان یہودیوں کو بیت المقدس میں پناہ لینے کی اجازت دی تھی اس لیے ہرقل کے قسم کا کفارہ ادا کرکے ان پناہ گزین یہودیوں کا قتل عام کرنا جائز ہے۔ اس کے بعد ان پناہ گزین یہودیوں پر یوں حملہ کیا گیا کہ انہیں نیست و نابود کردیا گیا اس کے بعد مصر اور شام پر بھی حملہ ہوا جہاں کسی یہودی کو زندہ نہ چھوڑا گیا سوائے ان کے جو بھاگ کر کہیں چھپ گئے۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود و نصاریٰ کی فوجیں کس طرح ایک دوسرے کو ختم کرنے کے درپے تھیں۔

پھر خود عیسائیوں میں اختلافات پیدا ہوئے۔ شروع میں یہ اختلافات عقائد کی بنیاد پر تھے لیکن بعد میں ان اختلافات نے جنگ کی شکل اختیار کرلی اور یہ لوگ ایسے متحارب گروہوں میں بٹ گئے جو ایک دوسرے کے خلاف شدید نفرت اور عداوت رکھتے تھے اور جنگ وجدال میں سرگرم رہتے تھے ان اختلافات کی بنا پر ان لوگوں نے ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے کی مہم چلادی انہوں نے نظریہ تثلیث (theory of trinity)پیش کیا جس میں بتایا گیا کہ خدا عیسٰی اور مریم تینوں ملکر خدا ہیں نعوذ باللہ۔ قرآن اس کے متعلق فرماتا ہے

* یقینا ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا کہ اللہ تو بس مسیح بن مریم ہے (مایدہ:۷۲)

*یقینا وہ لوگ کافر ہیں جنہوں نے کہا اللہ تین کا تیسرا ہے۔ (مایدہ:۷۳)

* اور اس بات کو یاد کرو کہ اللہ عیسیٰ ابن مریم سے کہے گا کہ کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا خدا مانو (مایدہ:۱۱٦)

عیسائیت کو دو عقیدوں میں بانٹا گیا تھا۔ ایک عقیدے کا یہ اختلاف (روم اور شام کے) ملکانی (Malkites) اور (مصر کے) منوفیشی (Monophysites) فرقوں کے درمیان رونما ہوا تھا۔ ملکانی عیسائیوں کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ کی فطرت الوہی (خدائی) اور بشری (انسانی) دو اجزا سے مرکب ہے جب کہ منوفیشی کا یہ عقیدہ تھا کہ حضری عیسٰی کی ایک فطرت ہے وہ الوہی ہے لیکن بشری فطرت اس الوہی فطرت میں اس طرح فنا ہوگئی جس طرح سرکے کا ایک قطرہ (a drop of vineger) سمندر میں پڑ کر غائب ہوجاتا ہے۔ یہ اختلاف دونوں فرقوں کے درمیان بڑھ کر چھٹی اور ساتویں صدی میں یہودیوں اور عیسائیوں کے اختلاف کی طرح جنگی شکل اختیار کرگیا۔

شہنشاہ ہرقل نے ایرانیوں پر 628ء میں فتح پانے کے بعد عیسائیو کے ان اختلافات کو ختم کرنے اور ان میں مصالحت کرنے کی کوشش کی۔ مصالحت اس بات پر ہوئی کہ لوگ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی فطرت اور الوہیت وغیرہ پر بحث کرنے سے گریز کریں وہ ایک فطرت رکھتے تھے یا دو یہ بحث چھوڑ دی جائے اور تثلیث کے مسئلے پر بحث کرنے سے بھی پرہیز کیا جائے۔

حالانکہ ان سب کو یہی حکم دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں اطاعت کو اس کے لیے خالص کرتے ہوئے، یکسو ہوکر اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں یہی صحیح اور محکم دین ہے

یہاں وہ امور بیان کئے گئے ہیں جو خدا کے دین کی اساس ہیں یعنی خدائے لاشریک کی بندگی کرنا اور دین کو اسی کے لیے خالص کرنا، اطاعت صرف اسی کی کرنا، شرک سے کنارہ کشی کرنا، نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا یہی صحیح اور محکم دین ہے۔ جس کو لے کر تمام رسول آئے اور جو تمام رسولوں میں مشترک ہے جس میں کوئی ابہام اور تضاد نہیں، کوئی پیچیدگی نہیں اور کوئی تفرقہ اور اختلاف نہیں۔

یہی دین اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں او راسی دین کی تعلیم اہل کتاب کو ان کے پاس آنے والے نبیوں نے دی تھی۔ ان باطل عقیدوں اور فاسد عملوں میں سے کسی چیز کا انہیں حکم نہیں دیا گیا تھا جنہیں انہوں نے اختیار کر کے مختلف مذاہب بنا ڈالے۔ صحیح اور درست دین ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ خالص اللہ کی بندگی کی جائے اُس کے ساتھ کسی اور کی بندگی نہ کی جائے، ہر طرف سے رخ پھیر کر انسان صرف ایک اللہ کا پرستار اور تابع فرمان بن جائے۔ نماز قائم کی جائے اور زکوٰۃ ادا کی جائے۔ یہی صحیح اور درست دین ہے اور یہی دین کی بنیاد ہے اور یہی چیزیں مسلمان کو کافر سے الگ کر دیتی ہیں۔

إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدِيْنَ فِيْهَا أُولَئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ(٦)

اہل کتاب اور مشرکین میں سے جن لوگوں نے کفر کیا وہ یقینا جہنم کی آگ میں جائیں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے یہ لوگ بدترین خلائق ہیں۔

إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ(٧)

جو لوگ ایمان لے آئے اور جنہوں نے نیک عمل کئے وہ یقینا بہترین خلائق ہیں

جَزَاؤُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِيْنَ فِيْهَا أَبَداً رَّضِيَ اللهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ذَلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهُ(٨)

اُن کی جزا اُن کے رب کے ہاں دائمی قیام کی جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ یہ کچھ ہے اُس شخص کے لیے جس نے اپنے رب کا خوف کیا۔

اہل کتاب اور مشرکین میں جن لوگوں نے کفر کیا وہ یقینا جہنم کی آگ میں جائیں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے یہ لوگ بدترین خلائق ہیں

محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری رسول ہیں اور جو دین وہ لائے ہیں وہ اللہ کا آخری پیغام ہے آپ سے پہلے پے درپے رسول اللہ کا پیغام لے کر آئے لیکن اب اللہ کی مشیت سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری رسول کی حیثیت سے ایک جامع اور کامل دین اسلام کے ساتھ مبعوث کیا گیا تاکہ دنیا میں پیدا ہوئے تمام دینی اختلافات کا خاتمہ کیا جائے جن کی وجہ سے پچھلے انبیاء کے لائے ہوئے دین کی شبیہہ (image) خراب ہوچکی تھی اور اس آخری نبی کے ذریعے دین حق کو تمام ادیان پر غالب کردیا جائے۔

هُوَالَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ وَلَوۡ کَرِهَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ۝

وہی (اللہ ہے) جس نے اپنا رسول ہدیات اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے سب ادیان پر غالب کردے خواہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔

یہ ایک قطعی حکم ہے جس میں بحث و مباحثہ کی ضرورت نہیں ہے کہ جن لوگوں نے کفر کیا اور آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لایا خواہ وہ اہل کتاب ہوں یا مشرکین وہ لوگ یقینا جہنم کی آگ میں جائیں گے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اگرچہ انہوں نے دنیا میں اعمال صالح بھی کئے ہوں کیونکہ جس عمل میں خدا اور اس کے آخری رسول پر ایمان نہ ہو وہ عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں قابل قبول نہیں ہے۔ آج کے دور میں اس طرح کے بہت سے لوگ ہیں جو اسلام اور آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لانے کے باوجود خیراتی ادارے یا یتیم ٹرسٹ چلاکر لوگوں کی خدمت کرتے ہیں اس عمل سے کئی مسلمان بھی متاثر ہیں لیکن قرآن کی رو سے ان کا ایسا عمل قبول نہیں ہے کیونکہ انہیں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان نہیں ہے اللہ اور اس کے آخری رسول پر جن لوگوں کو ایمان نہیں ہے نیک اعمال کرنے کے باوجود وہ لوگ جہنم میں جائیں گے جہاں وہ ہمیشہ جلتے رہیں گے اور اللہ تعالیٰ اعلان فرماتا ہے کہ ایسے لوگ بدترین خلائق ہیں۔

جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے وہ یقینا بہترین خلائق ہیں

یہ حکم بھی قطعی ہے اور اس میں بھی بحث و مباحثہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ کسی مسلمان گھر میں پیدا ہونے سے یا صرف زبان سے کلمہ شہادت پڑھنے سے کوئی شخص جنت میں داخل نہیں ہوجائے گا اور نہ کوئی مدعی اسلام صرف زبانی دعویٰ کرنے پر جنت حاصل کرسکتا ہے جنت حاصل کرنے کے لیے اللہ اور اس کے آخری رسول پر زبانی اقرار کے ساتھ دل کی گہرائیوں سے ایمان لانے اور نیک و صالح عمل کرنے کی ضرورت ہے ان دو چیزوں یعنی زبان سے ایمان لانے اور دل کی عمیق گہرائیوں سے تصدیق کرنے کے بغیر کسی کے لیے جنت کا داخلہ تو درکنار اسے جنت کی بو بھی نہیں آسکتی ہے۔

اس لیے جن لوگوں نے اللہ اور اس کے آخری رسول پر ایمان لایا اور عمل صالح کئے وہ بہترین لوگ ہیں ایسے لوگ یقینا جنت میں جائیں گے کیونکہ ایسے لوگوں نے ایمان کی بنیاد پر نیک اعمال کئے ہیں اللہ کی نظروں میں یہ بہترین خلائق ہیں۔ کیونکہ ایمان لانے کے بعد اچھے اخلاق اور عمل صالح کے ساتھ اللہ

لی شریعت کو اس کی زمین پر نافذ کرنا اور انسانوں کے درمیان خدا کے قانون کے تحت فیصلے کرنا سب سے اہم اور بڑا کام ہے اس لیے ایسے لوگوں کو بہترین خلائق کہا گیا ہے۔

اُن کی جزا (ایمان لانے والوں کی) ان کے رب کے ہاں دائمی قیام کی جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے یہ کچھ ہے اس شخص کے لیے جس نے اپنے رب کا خوف کیا:

جن لوگوں نے ایمان لایا اور نیک اعمال کیے ان کے لیے ان اعمال کے نتیجے کا اعلان کیا جاتا ہے۔ انہیں کامیاب قرار دے کر جنت کے اُس ٹھکانے کی بشارت دی جاتی ہے جہاں وہ دُنیا کی مشکلات اور ہنگاموں سے نجات پاکر ہمیشہ کا سکون پائیں گے۔ یعنی ان کی رہائش کے لیے ہمیشہ رہنے والی جنتیں ہیں۔ ان کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ نہریں بھی کبھی ختم نہ ہوں گی سب سے بڑھ کر نعمت ان جنتیوں کے لیے یہ ہوگی کہ اللہ ان سے راضی ہوگا اور وہ اللہ سے راضی ہوں گے۔ اللہ کی یہ رضا ان کے لیے ہر نعمت سے اعلیٰ تر نعمت ہوگی۔ اللہ کی رضا حاصل کرنے سے ہی انسانی قلب کو سکون ملتا ہے۔ لیکن خدابیزار بندوں کو کیسے سمجھایا جائے جو جنت کو انسان کے لیے تسلی اور دلجوئی (appeaement) سمجھتے ہیں۔

یہ سب کچھ اُس شخص کے لیے ہے جس نے اپنے رب کا خوف کیا

یعنی جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں ان کے لیے جنت کی یہ نعمتیں ہیں سورہ کی اس آخری آیت میں ایک تاکیدی فرمان ہے کہ جنت حاصل کرنے کا دارومدار خشیت الٰہی پر ہے۔ خدا کا خوف ہی ہر نیک کام کا محرک بنتا ہے اور خوف خدا ہی بے راہ روی اور نافرمانی سے انسان کو بچاتا ہے۔ خدا کا خوف کرنے سے ہی بندے کو خدا سے تعلق رہتا ہے اور یہ تعلق خدا اور بندے کے درمیان تمام حجابات ہٹادیتا ہے اور اسے خدائے واحد القہار کے حضور بے حجاب کھڑا کردیتا ہے یہی خوف خدا اور تعلق باللہ عبادت اور عمل کو ریاکاری اور شرک سے محفوظ رکھتا ہے۔ جو شخص سچ مچ اپنے رب سے ڈرتا ہے وہ کبھی گوارا نہیں کرسکتا ہے کہ اس کے دل میں کسی بھی عمل کے سلسلے میں غیر خدا کا گزر ہو وہ جانتا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہر اس عمل اور عبادت کو رد کردیتا ہے جس میں بندہ اپنی حاجات اور مرادیں پوری کرنے کے لیے کسی اور سے التجا کرتا ہے خدا ہر قسم کے شرک سے بے نیاز اور پاک ہے کوئی بھی

عمل جو خالصتاً اللہ کے لیے ہو اللہ اسے قبول فرماتا ہے اور وہ عمل جس میں شرک کی آمیزش ہو اسے قبول نہیں فرماتا ہے۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں سب شریکوں سے بڑھ کر شرک سے بے نیاز ہوں۔ جو شخص ایسا عمل کرتا جس میں وہ میرے ساتھ دوسرے کو شریک کرتا ہے تو میں اسے اس کے شریک کے لیے چھوڑ دیتا ہوں وہ اسی شخص کا ہے جس کے لیے اس نے عمل کیا۔ (صحیح مسلم)

جس دل میں خوف خدا ہے اس دل میں شیطان نہیں رہتا ہے

جو دل خدا کے خوف سے خالی ہے وہ شیطان کا گھر ہے

جن سعدت مندوں کو یہ شرف حاصل ہوتا ہے کہ ان کے دل خوف خدا سے لرزتے رہتے ہیں وہ کبھی ایسا کام نہیں کرتے ہیں جن سے ان کا رب ان سے ناراض ہوجائے سوائے اس کے کہ بھولے سے کوئی لغزش ہوجائے اور اس پر تب تک استغفار کرتے رہتے ہیں جب تک ان کی دعا اللہ کے ہاں قبول نہ ہوتی۔

اس دل پہ خدا کی رحمت ہو جس دل کی یہ حالت ہوتی ہے

اک بار خطا ہوجاتی ہے سو بار ندامت ہوتی ہے

سورۃُ الزِّالزَال

اٰیٰتُھا:8 رکوعتہا:1

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا o وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا o وَقَالَ الْإِنسَانُ مَا لَهَا o يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا o بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا o يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ o فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ o وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ o

تعارف:

اس سورہ کا موضوع و مضمون یہ ہے کہ موت کے بعد انسان کی دوسری زندگی شروع ہوجائے گی جس کا آغاز وقوع قیامت سے ہوگا۔ قیامت آنے سے زمین سمیت سب کچھ فنا ہوجائے گا پھر دوبارہ انسانوں کو خدا کی بارگاہ میں حاضر کیا جائے گا اس دن زمین کو زلزلے سے ہلادیا جائے گا انسان حیران ہوں گے کہ زمین کو یہ کیا ہورہا ہے اور یہ کیا ماجرا ہے یہ زمین جس پر انسان نے بے فکری کے ساتھ زندگی گزاری اور طرح طرح کے اعمال کیے اور کبھی اس کے وہم گمان میں یہ بات نہ آئی کہ اسے ایک دن دوبارہ زندہ ہونا ہے اور خدا کے سامنے ہر چیز کا جواب دینا ہے اور یہ زمین جو اس کی آماجگاہ ہے ایک روز زلزلے سے پھٹ جائے گی اور اپنے اندر کا سارا مادہ باہر پھینک دے گی اور اس نے زمین پر جو کام کئے ہیں وہ ظاہر تھے یا چھپے ہوئے وہ سب کام اس کے سامنے پیش کئے جائیں گے اس کے چھپے ہوئے سب راز ظاہر ہوجائیں گے زمین اس کے متعلق بیان دے گی کہ کس وقت کہاں اس نے کون سا کام کیا۔ اس دن زمین کے گوشے گوشے سے لوگ اپنی ان جگہوں سے جہاں ان کی لاشیں سڑ چکی تھیں اور صرف سڑا ہوا مادہ موجود تھا دوبارہ زندہ ہوکر محشر میں جمع ہوجائیں گے۔ سائنس کے علم کے مطابق کوئی چیز فنا نہیں ہوجاتی ہے۔ بلکہ اس کا مادہ موجود رہتا ہے اسی مادہ سے اللہ کے حکم سے زندہ ہوکر ہر کوئی اپنی اس جگہ سے نکل آئے گا جہاں اس کی لاش پڑی سڑ چکی تھی۔ لوگوں کو اپنے اعمال دکھائے جائیں گے زمین انسانوں کے سب راز اگلے گی یہاں تک ذرہ برابر نیکی یا بدی بھی ایسی نہ رہ جائے گی جو سامنے نہ آئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اس روز انسان کا ہر چھوٹا اور بڑا گناہ سامنے لایا جائے گا۔

إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا(١)

جب زمین اپنی پوری شدت کے ساتھ ہلا ڈالی جائے گی

وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا(٢)

اور زمین اپنے اندر کے سارے بوجھ نکال باہر کرے گی

وَقَالَ الْإِنسَانُ مَا لَهَا(٣)

اور انسان کہے گا کہ یہ اسے کیا ہورہا ہے

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا(٤)

اس روز وہ (زمین) اپنے (اوپر سے گزرے ہوئے) حالات بیان کرے گی

بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا(٥)

کیونکہ تیرے رب نے اسے (زمین کو ایسا کرنے کا) حکم دیا ہوگا۔

جب زمین اپنی پوری شدت کے ساتھ ہلا ڈالی جائے گی

یہ آیت ایسا منظر پیش کرتی ہے کہ پڑھنے والے اور سننے والے کو اگر قیامت اور یوم حشر کا خوف ہو تو اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زمین کی ہر شئے بُری طرح سے ہل رہی ہے اور اس کے قدم ڈگمگا رہے ہیں۔ زلزلے کی یہ کیفیت خوف خدا رکھنے والے دل کو تمام چیزوں سے بے رغبت کردیتی ہے اور دنیا کی خواہشات سے اس کی توجہ ہٹا دیتی ہے۔

بعض مفسرین نے اس زلزلے سے مراد پہلا زلزلہ لیا ہے جس سے قیامت کے پہلے مرحلے کا آغاز ہوگا یعنی جب پہلی بار صور پھونک دیا جائے گا جس سے ساری مخلوق ہلاک ہوجائے گی اور دنیا کا نظام درہم برہم ہوجائے گا لیکن بعض مفسرین اس سے مراد وہ زلزلہ لیتے ہیں جس سے قیامت کا دوسرا مرحلہ شروع ہوگا یعنی جب اگلے پچھلے سب انسان ایک بار ہلاک ہونے کے بعد دوبارہ زندہ ہوکر اٹھیں گے۔
روایات سے ثابت ہے کہ پہلے صور پھونکنے پر سب لوگوں کو ہلاک کیا جائے گا، دنیا کا نظام ختم کیا جائے گا پھر کچھ مدت کے بعد دوسری بار صور پھونکا جائے گا جس سے سب مرے ہوئے لوگ دوبارہ زندہ ہوکر محشر میں حاضر کردئے جائیں گے۔

اور زمین اپنے اندر کے سارے بوجھ نکال باہر کرے گی

چونکہ پہلے زلزلے میں سب لوگ ہلاک ہوجائیں گے اور دوسری بار صور پھونکنے پر مرے ہوئے سب لوگ دوبارہ زندہ کردیے جائیں گے اسی دوسرے زلزلے کا یہ ذکر ہے کہ جب زمین پھٹ جائے گی اور اپنے اندر کا سب کچھ باہر نکال دے گی اس کے پیٹ کے اندر جو کچھ بھی ہوگا وہ باہر آئے گا۔ معدنیات و حشرات وغیرہ جنہیں زمین عرصہ دراز سے اپنے اندر سمائے ہوئے تھی، باہر پھینک دے گی۔ سونا چاندی اور ہر قسم کی دولت جو زمین کے اندر ہے باہر آئے گی اور انسان دیکھے گا کہ یہی وہ دولت ہے جس پر وہ مرتا تھا یا کسی کو مارتا تھا۔ اسی کی خاطر دنیا میں وہ فتنے فساد اور قتل عام کرتا تھا اسی کی خاطر اس نے حق داروں کے حقوق مارے چوریاں کیں ڈاکے ڈالے، جنگیں لڑیں اور قوموں کو تباہ کر ڈالا۔ آج یہ سب چیزیں اس کے سامنے ہیں لیکن ان کی کوئی وقعت نہیں دنیا میں جو شخص ان چیزوں کو محبوب رکھتا تھا اور ان کے لیے قتل عام سے گریز نہیں کرتا تھا آج وہ ان کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرے گا۔ آج وہ سب کچھ اس کے لیے کوئی وقعت نہیں رکھتا ہے اور نہ یہ اس کے کام آئے گا بلکہ یہ اس کے عذاب کا سامان بنے گا۔ اسی طرح دنیا میں انسان کے کچھ ایسے راز ہوتے ہیں جنہیں وہ اظہار نہیں کرنا چاہتا ہے اور ایسے بھی انسان ہیں جو بظاہر نیک اور لوگوں کے ہمدرد معلوم ہوتے ہیں، لیکن اندر سے وہ کمینہ خصلت کے لوگ ہوتے ہیں۔ اپنا مطلب حاصل کرنے کے لیے وہ اپنی اندرونی خصلت ظاہر نہیں کرتے ہیں۔ اس طرح کے بے شمار راز ہوں گے جو دنیا میں ظاہر نہیں ہوئے لیکن زمین جب زلزلے سے پھٹ جائے گی تو یہ تمام راز افشا ہوجائیں گے۔ اس طرح کا مضمون سورہ انشقاق کی آیت:۴ میں بھی بیان ہوا ہے:

وَاَلۡقَتۡ مَا فِیۡهَا وَتَخَلَّتۡ۔

اور جو کچھ اس (زمین) کے اندر ہے اسے باہر پھینک کر خالی ہوجائے گی۔

یعنی مرے ہوئے انسان زمین کے اندر جہاں جس شکل میں اور جس حالت میں پڑے ہوئے ہوں گے اُن سب کو وہ نکال باہر کردے گی اور ان کے تمام بکھرے ہوئے اجزا جمع ہوکر از سر نو اُسی شکل و صورت میں زندہ ہوجائیں گے جس شکل میں وہ زمین پر زندگی گزارتے تھے۔

اور انسان کہے گا کہ یہ اسے کیا ہو رہا ہے

جب زمیں زلزلے سے پھٹ جائے گی اور اپنے اندر کا سارا مادہ باہر پھینک دے گی تو اس وقت انسان خوف زدہ اور حیرت زدہ ہوکر کہے گا کہ اسے یہ کیا ہورہا ہے کیونکہ اس نے ایسا واقعہ کبھی نہیں دیکھا ہوگا اس لیے اس کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ زمین کو یہ کیا ہورہا ہے کہ اپنے اندر کی ساری چیزیں باہر پھینک رہی ہے۔ دنیا میں رہتے ہوئے اس نے زلزلے دیکھے تھے آتش فشاں پہاڑوں کا پھٹنا بھی اسے معلوم تھا لیکن آج کا یہ زلزلہ جس نوعیت کا ہوگا، انسان اسے سمجھ نہیں پائے گا یہ ایک ایسا زلزلہ ہوگا جس سے انسان کو کبھی سابقہ پیش نہ آیا ہوگا۔ دوبارہ زندہ ہوکر اور ہوش میں آکر ہر شخص پریشان ہوگا اور ہر ایک کی زبان پر یہی کلمہ ہوگا کہ آخر یہ کیا ہورہا ہے؟! کیا کریں اور کہاں بھاگ جائیں؟ لیکن لوگ نہ کہیںبھاگ سکیں گے اور نہ کچھ کرسکیں گے سوائے افسوس اور رونے دھونے کے۔ ہر طرف سے رونے دھونے اور آہ و زاری کی آوازیں سنائی دیں گی سب منکرین خدااور مشرکین خوفزدہ اور پریشان ہوں گے لیکن اہل ایمان پر یہ خوف اور حیرانی وپریشانی طاری نہ ہوگی کیونکہ جو کچھ ہو رہا ہے سب ان کے عقیدہ اور یقین کے مطابق ہورہا ہوگا۔ اس کی تائید سورہ یٰسن کی آیت نمبر52 سے ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ یہ منکرین آخرت میں دوبارہ زندہ ہونے کے وقت کہیں گے کہ ہم کو کس نے زندہ کیا۔

قَالُوْا یٰوَیْلَنَا مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ھٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْن۔

وہ گھبرا کر کہیں گے ہائے ہماری بدبختی کس نے ہمیں ہماری خواب گاہوں سے اٹھاکھڑا کیا؟ جواب آئے گا ارے یہ تو وہی ہے جس کا رحمٰن نے وعدہ کیا تھا ور رسولوں نے سچ فرمایا تھا۔ اگرچہ یہ معلوم نہیں ہے کہ یہ جواب کون دیں گے تاہم قرینہ خود بتارہا ہے کہ یہ جواب اہل ایمان کی طرف سے ہی ہوگا کیونکہ اہل ایمان اس وقت خوف زدہ نہیں ہوں گے۔

اس روز زمین اپنے اوپر گزرے ہوئے حالات بیان کرے گی

اس روز زمین سارے حالات اور واقعات بتادے گی اور جو کچھ اس پر گزرتا رہا وہ سب کچھ بیان کرے گی وہ اپنی ساری خبریں سنائے گی۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھ کر صحابہ سے پوچھا کہ جانتے ہو اس کے وہ حالات کیا ہوں گے صحابہ نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کو زیادہ علم ہے فرمایا وہ حالات یہ ہیں کہ زمین ہر بندے اور ہر بندی کے بارے میں اس عمل کی گواہی دے گی جو اس کی پیٹھ پر اس نے کیا ہوگا وہ کہے گی کہ اس نے فلاں فلاں کام کیا۔ یہ ہیں وہ حالات جو زمین بیان کرے گی۔ (مُسند احمد)

ایک اور روایت کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لوگو! زمین سے بچ کر رہنا کیونکہ یہ تمہاری جڑ بنیاد ہے یعنی یہ خیال رکھنا کہ اس پر عمل کرنے والا کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کے عمل کی یہ خبر نہ دے خواہ عمل اچھا ہو یا برا۔

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز زمین ہر اس عمل کو لے آئے گی جو اس کی پیٹھ پر کیا گیا ہو پھر آپ نے یہی آیت تلاوت فرمائی۔

حضرت علیؓ کی سیرت میں لکھا ہے کہ جب آپ بیت المال کا سب روپیہ حقداروں میں تقسیم کرتے تھے اور خزانہ خالی ہوجاتا تھا تو دو رکعت نماز پڑھ کر فرماتے تھے کہ (اے خزانہ) تجھے گواہی دینی ہوگی کہ میں نے تجھے حق کے ساتھ بھردیا اور حق کے ساتھ خالی کردیا۔

زمین قیامت کے دن اپنے اوپر گزرے ہوئے حالات اور واقعات کیسے بیان کرے گی قدیم لوگوں کے لیے یہ ایک بہت بڑی حیران کن بات تھی کہ آخر زمین کیسے بولنے لگے گی جبکہ یہ بے جان ہے۔ اس میں قوت گفتار ہے اور نہ قوت بینائی و سماعت لیکن سائنس نے جو ایجادات کی ہیں ان کے مطابق ان باتوں پر یقین کرنا آسان ہوگیا ہے۔ سینما، لاوڈ سپیکر، ریڈیو، ٹیلی فون، ٹیلی ویژن، ٹیپ ریکارڈر، کمپیوٹر اور دوسری الکٹرانک ایجادات (electronic inventions) سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ زمین ایسے حالات اور واقعات بیان کرے گی۔ انسان اپنی زبان سے جو کچھ بولتا ہے تو ریڈیائی لہروں میں یہ آواز ثبت ہوجاتی ہے تو پھر ریڈیائی آلات کے ذریعے اس آواز کو دنیا کے کونے کونے تک پہنچایا جاسکتا ہے اتنا ہی نہیں بلکہ آواز کے ساتھ ساتھ انسان کی تصویر محفوظ ہوکر کسی بھی جگہ دیکھی جاسکتی ہے۔ موجودہ زمانے میں ایلکٹرانک میڈیا (electronic media) نے کمپیوٹر کے ذریعے ایک ایسا انقلاب برپا کیا ہے جو حیرت انگیز ہے۔ انسان کی آواز تصویر کے ساتھ ہر جگہ پہنچائی جاسکتی ہے انسان کے تمام کام اور سارے معاملات آواز اور تصویر کے ساتھ محفوظ کئے جاتے ہیں۔ ایک بار آواز یا تصویر ریکارڈ لی گئی تو جس وقت چاہیے انسان اس ریکارڈنگ کو دوبارہ سن سکتا ہے اور اس کی تصویر بھی دیکھ سکتا ہے۔ تو یہ بات کیسے ناممکن ہے کہ قیامت کے دن ہر کسی کو اپنے عمل کی آواز سنائی دے گی اور تصویر بھی دکھائی دے گی۔ انسان اپنے کانوں سے اپنی آواز سن لے گا اور پہچان لے گا کہ یہ اس کی اپنی آواز ہے پھر انسان نے زمین پر جہاں جس حالت میں بھی کوئی کام کیا ہوگا اس کی ایک ایک حرکت کا عکس اس کے گردوپیش کی تمام چیزوں پر پڑا ہوگا اور اس کی تصویر ان پر نقش ہوچکی ہوگی یا بالکل اندھیرے میں بھی اس نے کوئی فعل کیا ہو تو خدا کی خدائی میں ایسی شعائیں موجود ہیں جن کے لیے اندھیرا اور اجالا کوئی معنی نہیں رکھتا ہے۔ وہ ہر حالت میں اس کی تصویر لے سکتی ہے۔ یہ ساری تصویریں قیامت کے روز ایک متحرک فلم کی طرح انسان کے سامنے آجائیں گی اور یہ دکھادیں گی کہ وہ زندگی بھر کس وقت کہاں کیا کچھ کرتا رہا ہے۔

رب نے اسے (زمین کو) ایسا کرنے کا حکم دیا ہوگا

زمین خود بخود اپنے حالات بیان نہیں کرے گی بلکہ اسے ایسا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کا حکم ہوگا۔ جس طرح اللہ کے حکم سے انسان کے سارے اعضا بولیں گے اسی طرح زمین بھی اس کے حکم سے اپنے اندر کا سب کچھ خارج کردے گی اور بولنا شروع کردے گی۔ سورہ انشقاق میں زمین کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ۔ اور وہ اپنے رب کے حکم کی تعمیل میں یہ سب کچھ کررہی ہے اور قیامت کے روز کوئی بھی شئے اطاعت سے غافل نہیں ہوسکتی ہے اور نہ زمین اطاعت میں کوتاہی کرسکتی ہے کیونکہ کسی بھی مخلوق کو ایسا کرنے کا اختیار نہ ہوگا تو انسان کی کیا مجال کہ وہ اس دن نافرمانی کی کوئی حرکت کرسکے۔ اسے حشر کے دن کسی کی طرف اللہ کے اِذن کے بغیر آنکھ اٹھانے کی جرأت نہ ہوگی اسے صرف اپنے آپ کی فکر ہوگی کہ کس طرح عذاب سے نجات پالوں اسے بھاگنے کا نہ کوئی راستہ ملے گا اور نہ ایسی حرکت کرنے کی جرأت کرسکے گا۔ وہ صرف نفسی نفسی کے عالم میں مشغول ہوگا۔ البتہ جس شخص نے اس دن کا خوف کیا ہو اور خدا کی بندگی نیت خلوص کے ساتھ کی ہو ایسا انسان اس دن کے خوف اور دہشت سے محفوظ رہے گا اسے جنت کی خوشبو تازہ دم رکھے گی۔

يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ(٦)

اُس دن لوگ گروہ درگروہ پلٹیں گے تاکہ انہیں ان کے اعمال دکھائے جائیں گے

فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ(٧)

تو جس نے ذرّہ برابر بھی نیکی کی ہوگی تو وہ اُسے دیکھے گا۔

وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ(٨)

اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا

اُس دن لوگ گروہ در گروہ پلٹیں گے تاکہ انہیں اُن کے اعمال دکھائے جائیں گے

یہ آیت قیامت کا ایسا منظر پیش کرتی ہے جسے بیان کرنا مشکل ہے اگر انسان تھوڑی دیر کے لیے دنیائی خیالات کو چھوڑ کر اس منظر پر غور کرے تو اسے محسوس ہوگا کہ یہ منظر کتنا انتہائی شدید اور دہشت ناک ہے کہ لوگ تو اس مقام پر جارہے ہیں جہاں ان کے سامنے ان کے اعمال پیش ہوں گے تاکہ وہ ان کو دیکھ لیں اور پھر اپنے ان عمال کی جزا و سزا سے دوچار ہوں۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ انسان اپنے برے اعمال کا سامنا کرنے سے گریز کرتا ہے کیونکہ وہ اپنے برے اعمال کو سرعام دیکھنا نہیں چاہتا، چاہے وہ کیسا ہی غلط کار کیوں نہ ہو اسے اپنا ضمیر اپنے برے کاموں کو سرعام ملاحظہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا ہے اس لیے وہ اپنے شرمناک کام سے فرار ہونے کی کوشش کرتا ہے تاکہ لوگ اس کے سامنے اسے لعنت ملامت نہ کرسکیں۔ پھر اس انسان کا کیا حال ہوگا جب وہ سب انسانوں کے سامنے اپنے برے اعمال کو دیکھے گا اور جب وہ جلیل القدر عظیم الشان جبار اور قہار خدا کی عدالت میں کھڑے ہوکر گناہوں کی شرمندگی محسوس کررہا ہوگا۔

لوگ جب جمع ہونے کے لیے پلٹیں گے تو اس کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں ایک یہ کہ ہر ایک اکیلا ہی آئے گا کیونکہ اس روز جتھے اور پارٹیاں سب بکھر جائیں گی یہ بات سورہ انعام میں اس طرح فرمائی گئی ہے ''اللہ تعالیٰ اس دن لوگوں سے فرمائے گا کہ لو اب تم تن تنہا ہمارے سامنے حاضر ہوگئے جیسا میں نے پہلی مرتبہ تمہیں پیدا کیا تھا۔(آیت:۹۴) سورہ مریم میں فرمایا گیا کہ اکیلا ہمارے پاس آئے گا (آیت:۸۰) ان میں سے ہر ایک قیامت کے روز اللہ کے حضور اکیلا حاضر ہوگا۔ (آیت:۹۵) دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ وہ تمام لوگ جو تاقیامت جگہ جگہ مرچکے تھے زمین کے گوشے گوشے سے گروہ در گروہ چلے آرہے ہوں گے جیسا کہ سورہ النبا میں فرمای گیا ہے: يَوْمَ يُنفَخُ فِي الصُّورِ فَتَأْتُونَ أَفْوَاجاً۔ اس دن جب صور پھونکا جائے گا تو تم فوج درفوج آؤ گے۔

بظاہر دونوں صورتوں میں تضاد ہے لیکن پوری طرح غور کرنے پر حقیقت سامنے آتی ہے کہ فرداً فرداً چلنے والے تمام لوگ بڑے بڑے گروہوں کی صورت اختیار کرکے اللہ کے حضور جمع ہونے کے لیے دوڑ پڑیں گے ہوسکتا ہے اس وقت لوگ زندہ ہوکر فوج درفوج اپنے خالق کے پاس آجائیں گے اور جب انہیں اللہ کے حضور جواب دہی کے لیے بلایا جائے گا تو اس وقت وہ فرداً فرداً بلائے جائیں گے اور وہ تنہاتنہا فرد واحد کی حیثیت سے حاضر ہوں گے ان کا نہ کوئی ساتھی ہوگا، نہ کوئی سفارش کرنے والا اور نہ کوئی حمایت کرنے والا ہوگا۔ اس لیے دونوں صورتوں میں لوگوں کے اللہ کی طرف پلٹنے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ (واللہ اعلم بالصّواب)

ایک تفسیر کے مطابق جب لوگ گروہ درگروہ اپنے خالق کی طرف پلٹیں گے تو نیک نیکوں کے، نمازی نمازیوں کے، غازی غازیوں کے اور شہید شہیدوں کے گروہ میں شامل ہوں گے۔ اسی طرح چور چوروں کے گروہ میں، گنہگار گنہگاروں کے، قاتل قاتلوں کے گروہ میں خدائے ذوالجلال کی طرف آئیں گے۔ یہ گروہ ایک دور کے یا ایک زمانہ کے نہیں ہوں گے بلکہ ابتدائے آفرینش سے لے کر وقوع قیامت تک کے سب مرے اور سڑے ہوئے لوگ دوبارہ زندہ ہوکر زمین کے گوشے گوشے سے حاضر ہوجائیں گے اور سب لوگ اپنے اپنے اعمال کو دیکھ لیں گے۔ نیک عمل کرنے والے اپنے نیک اعمال دیکھ لیں گے اور برے عمل کرنے والے اپنے بُرے اعمال دیکھ لیں گے۔ جو کچھ زمین پر گزرا ہوگا وہ سب کچھ سامنے آئے گا اور سب لوگ دیکھ لیں گے کہ حق کے لیے کام کرنے والوں نے کیا کچھ کیا ہے اور باطل کی حمایت کرنے والوں نے کیا کیا حرکتیں کیں۔ اسی طرح ہدایت کی طرف بلانے والوں اور گمراہی پھیلانے والوں کی تصویریں اور گفتگوئیں لوگ اپنے کانوں سے سن لیں گے اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ دونوں طرف تحریروں اور تقریروں کی ریکارڈنگ کیسٹ (cassette) کی طرح ظاہر (display) کرکے سب لوگوں کو سنائی اور دکھائی جائے گی۔ حق پرستوں پر باطل پرستوں کے مظالم اور دونوں گروہوں کے درمیان برپا ہوئے معرکوں کے سارے مناظر میدان حشر کے حاضرین اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے پردوں میں چھپ کر کیا ہوا سب نمایاں ہوکر سامنے آئے گا۔

یہاں لٹی تھی کسی کی عصمت وہاں گرا تھا لہو کسی کا

یہاں جلائے گئے تھے انسان ہر ایک شئے کا حساب ہوگا

جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا

اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا

ذرۂ خیر اور ذرۂ شر کی یہ دو آیات چونکا دینے والی ہیں کہ نیک اعمال اور برے اعمال کا ایک ایک ذرہ قیامت کے دن انسان کو دکھایا جائے گا اس حقیقت پر غور کرنے سے انسان دم بخود ہوجاتا ہے اور ایک ایمان والا فوراً اس دن کے حساب اور جوابدہی کی تیاری میں مشغول ہوجاتا ہے لیکن ان دو آیات پر سرسری نظر ڈالنے والوں کو فائدہ نہیں پہنچے گا۔

ذَرَّہ کی حقیقت - قدیم مفسرین کے مطابق ذرہ خاک کا وہ ذرہ ہے جو سورج کی روشنی میں چمکتا ہے یعنی چھوٹی سی چھوٹی شئے کو ذرہ کہتے ہیں۔ ایٹم (atom) کو عربی میں ذرہ کہتے ہیں۔ خاک کا ذرہ تو ننگی آنکھ سے نظر آجاتا ہے لیکن یہ ذرہ (atom) بڑی سے بڑی خوردبین (microscope) سے بھی نظر نہیں آتا۔ اُسے سائنس دانوں نے صرف ذہن میں سما رکھا ہے کسی بھی سائنس دان نے نہ اسے اپنی آنکھ سے دیکھا نہ خوردبین سے، انہوں نے صرف اس کے آثار دیکھے یعنی ان کے دماغ میں ایٹم صرف ایک عکس (image) ہے اور خیر و شر کا یہی ایک ذرہ (atom) قیامت کے روز جب انسان کے سامنے لایا جائے گا تو یہ انسان خدا کی مرضی سے اسے دیکھ لے گا اور پھر اللہ کی عدالت سے اس کی جزا یا سزا پائے گا۔

کسی بھی عمل کو چھوٹا سمجھ کر نظرانداز نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ذرہ برابر نیکی بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں ایک اپنا مقام رکھتی ہے اور ذرہ برابر بدی بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے پاس ذرہ برابر نیکی اور ذرہ برابر بدی دونوں محفوظ ہوجاتی ہیں اس لیے انسان کو ذرہ برابر نیکی کا بھی خیال رکھنا چاہیے اور ذرہ برابر بدی سے بھی دور رہنا چاہیے۔ جس طرح ایٹم (atom) یعنی ذرات سے ملکر ایٹم بم تیار کیا جاتا ہے جس سے دنیا میں انسانوں کی تباہی کی جاتی ہے۔ اسی طرح بدی کا ایک ایک ذرہ جمع ہوکر قیامت کے دن انسان کی تباہی کا باعث بن سکتا ہے اور نیکی کا ایک ایک ذرہ جمع ہوکر اس کی نجات کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک اعرابی بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ مجھے نصیحت فرمائیے آپؐ نے یہی آیات پڑھ کر سنائیں۔ اعرابی نے کہا اے خدا کے رسولؐ آپ کے رب کی قسم مجھے اب اس سے زیادہ نصیحت کی ضرورت نہیں رہی اور جب یہ اعرابی رخصت لے کر واپس جانے لگا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ یہ شخص کامیاب ہوکر جارہا ہے کیونکہ اس نے ایک چھوٹی بات کی نصیحت کو پوری زندگی کی تبدیلی کا ذریعہ بنالیا۔ بظاہر یہ ایک چھوٹی سی بات ہے مگر جو شخص اس پر عمل کرے گا اس کی پوری زندگی بدل جائے گی اور وہ نیکیاں کماکر آخرت میں کامیاب ہوجائے گا اور برائیوں سے بچ کر اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچائے گا۔

جو شخص چھوٹی سے چھوٹی نیکی کی طرف دھیان دیتا ہے وہ بڑی بڑی نیکیوں تک پہنچ کر جنت کا وارث بن جاتا ہے اور جو شخص لاپرواہی سے چھوٹے چھوٹے گناہوں کا مرتکب ہوجاتا ہے وہ پھر بڑے بڑے گناہوں کا بھی ارتکاب کرکے اپنے آپ کو جہنم میں پہنچا دیتا ہے۔ نیکیوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص حلال کمائی سے ایک کھجور صدقہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے قبول کرکے بڑھا دیتا ہے یہاں تک وہ پہاڑ کے برابر ہوجاتا ہے۔ مومن کے متعلق انہوں نے فرمایا کہ مومن وہ ہے جو چھوٹے سے چھوٹے گناہ کو یوں سمجھتا ہے کہ جیسے اس کے اوپر پہاڑ گرگیا اور منافق وہ ہے جو بڑے سے بڑے گناہ کو بھی یوں محسوس کرتا ہے کہ جیسے اس پر مکھی بیٹھی اور اڑ گئی۔ تاہم اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہے کہ اعمال کی قبولیت کے لیے ایمان کا ہونا ضروری ہے جس طرح نماز کے لیے وضو کرنا ضروری ہے اور وضو کے بغیر نماز قابل قبول نہیں ہے اسی طرح ایمان کے بغیر کوئی بھی نیک عمل اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول نہیں ہوسکتا ہے اس بنا پر کافر اور مشرک قیامت کے دن اپنی نیکیوں کا اجر نہیں پائیں گے کیونکہ ہر نیک عمل کے لیے ایمان کا ہونا لازمی ہے۔ بدی کی سزا بدی کے برابر دی جائے گی لیکن نیکی کی جزا کئی گنا زیادہ ہوگی اور نیکیوں کی قبولیت کا دارومدار انسان کی نیت اور ایمان پر ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ اللہ تعالیٰ مومن پر ظلم نہیں کرتا ہے دنیا میں اس کی نیکیوں کے بدلے میں وہ اسے رزق دیتا ہے اور آخرت میں اسے ان نیکیوں کی جزا دے گا۔ اور کافر کو دنیا میں اس کی بھلائیوں کا بدلہ چکا دیا جاتا ہے لیکن قیامت کے دن اس کے حساب میں کوئی نیکی نہ ہوگی (ابن جریر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کافر اور مشرک کی نیکیاں اسے جہنم کے عذاب سے تو نہیں بچا سکتی ہیں البتہ جہنم میں اسے وہ سخت سزا نہ دی جائے گی جو ظالم فاسق اور بدکار کافروں اور مشرکوں کو دی جائے گی۔ انہوں نے فرمایا کہ حاتمِ طائی کو اس کی سخاوت کی وجہ سے ہلکا عذاب دیا جائے گا۔

الغرض انسان کو اس اہم حقیقت سے خبردار کیا جاتا ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی نیکی میں بھی اپنا ایک وزن ہوتا ہے اور چھوٹی سے چھوٹی بدی میں بھی خرابی اور نقصان ہوتا ہے اس لیے چھوٹی نیکی کو چھوٹا سمجھ کر چھوڑنے سے انسان کو گھاٹا ہوتا ہے کیونکہ یہ نیکیوں میں اضافہ کردیتی ہے۔ قطرہ قطرہ می شود دریا۔ پانی کے ایک ایک قطرے سے دریا بنتا ہے اور آخرت میں انسان ایک ایک نیکی کا محتاج ہوگا وہ چھوٹی ہو یا بڑی۔ اسی طرح چھوٹی سے چھوٹی بدی کو بھی معمولی سمجھ کر یوہی نظر انداز نہیں کردینا چاہیے کیونکہ یہ چھوٹے چھوٹے گناہ ایک غافل انسان کے لیے ایک انبار بنادیتے ہیں۔ اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی ہے کہ چھوٹی نیکی اور چھوٹی بدی کو چھوٹا ثواب اور چھوٹا گناہ سمجھ کر نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ یعنی چھوٹی نیکی کو اس لیے نہیں چھوڑنا چاہیے کہ آپ کو اس کی ضرورت نہیںاور چھوٹے گناہ کو بھی اس لیے نہیں کرنا چاہیے کہ اس سے آپ کو کوئی بڑا نقصان نہیں پہنچ جائے گا۔

آپؐ نے فرمایا نیکی کرکے دوزخ کی آگ سے بچو خواہ کھجور کا ٹکڑا دینے کی نیکی ہو اور اچھی بات کہنے کی نیکی ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان بھی ہے کہ کسی بھی نیک کام کو حقیر نہ سمجھو چاہے وہ کسی پانی مانگنے والے کے برتن میں ایک ڈول (بالٹی) ڈال دینا ہو اور یہ بھی نیکی ہے کہ تم اپنے کسی بھائی سے خندہ پیشانی سے ملو۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''اے مسلمان عورتو! کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کے ہاں کوئی چیز بھیجنے کو حقیر نہ سمجھے چاہیے وہ بکری کا کُھر ہی کیونہ ہو (مُسند احمد) حضرت عائشہؓ سے روایت منسوب ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے۔ اے عائشہ اُن گناہوں سے بچ کر رہنا جن کو چھوٹا سمجھا جاتا ہے کیونکہ اللہ کے ہاں ان کی پُرسش ہوگی۔ عبداللہ بن مسعود کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خبردار چھوٹے گناہوں سے بچ کر رہنا کیونکہ وہ آدمی پر جمع ہوجائیں گے یہاں تک کہ اسے ہلاک کردیں گے۔

سُوْرَۃُ الْعٰدِیٰت

آیاتُہا: 11 رُکُوعُھا: 1

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

وَالْعَادِيَاتِ ضَبْحًا ۝ فَالْمُورِيَاتِ قَدْحًا ۝ فَالْمُغِيرَاتِ صُبْحًا ۝ فَأَثَرْنَ بِهِ نَقْعًا ۝ فَوَسَطْنَ بِهِ جَمْعًا ۝ إِنَّ الْإِنسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ ۝ وَإِنَّهُ عَلَىٰ ذَٰلِكَ لَشَهِيدٌ ۝ وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ ۝ ۞ أَفَلَا يَعْلَمُ إِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُورِ ۝ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُورِ ۝ إِنَّ رَبَّهُم بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيرٌ ۝

پس منظر:

سورہ کی ابتدائی پانچ آیات میں فوج کشی کی زبردست ہلچل کا منظر دکھائی دیتا ہے کہ شاید کسی فوجی کیمپ پر حملہ کی تیاری ہو رہی ہے۔ لیکن چھٹی آیت پر پہنچ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہلچل کسی دشمن کے کیمپ (camp) پر حملہ کرنے کی نہیں بلکہ یہ غفلت میں پڑے ہوئے خدا کے اس ناشکرے انسان کو خدا کی ناشکری، قیامت اور آخرت سے غافل رہنے اور دنیا کے مال و دولت سے انتہائی محبت کرنے کی بیماری سے آگاہ کردیا گیا ہے۔یہی وہ بیماری ہے جس کی وجہ سے انسان خدا کی یاد اور اس کی بندگی سے غافل ہوجاتا ہے۔ سورہ آشوبِ محشر اور سریع التاثیر ہے یعنی اس میں محشر کا ہنگامہ ہے اور ایسی تاثیر ہے جو دلوں میں تیزی سے اترتی ہے۔

سورہ میں لوگوں کو سمجھایا گیا ہے کہ انسان خدا، آخرت اور دین سے جب غافل ہوجاتا ہے تو وہ اخلاقی پستی میں گرجاتا ہے۔ لوگوں کو اس بات سے خبردار کیا گیا ہے کہ آخرت میں ان کے ظاہری افعال کے ساتھ ساتھ ان کے دلوں میں چھپے ہوئے اسرار کی جانچ پڑتال ہوگی۔ اس مقصد کے لیے عرب میں پھیلی ہوئی اس عام بدامنی، خوف وہراس اور افراتفری کو دلیل کے طور پرپیش کیا گیا ہے جس سے سارا ملک تنگ آچکا تھا۔ ہر طرف خونریزی اور غارت گری برپا تھی قبیلوں کا ایک دوسرے پر چھاپہ مارنا اور حملہ کرنا عام تھا کوئی بھی شخص رات کو آرام سے سو نہیں سکتا تھا۔ رات بھر اسے یہ خوف رہتا تھا کہ رات کو یا رات کے آخری پہر میں چھاپہ پڑے گا۔ پورے عرب کی صورت حال ایسی ہی تھی اور حملہ آوروں کے خوف سے ان کی نیند اڑ جاتی تھی ان حالات میں لوگ پریشان اور پراگندہ رہتے تھے اگرچہ حملہ آور لوٹ مار کرکے خوش ہوجاتے تھے اور لٹنے والے اس لوٹ مار پر ماتم کرتے تھے۔ تاہم جب لوٹ مار کرنے والوں کی شامت آجاتی تھی تو وہ خود دوسرے حملہ آوروں کے ہاتھوں لٹ جاتے تھے اور اس وقت وہ اُن حملہ آوروں اور لٹیروں پر لعنت ملامت کرتے تھے اور اپنے لوٹ مار اور غارت گری پر ماتم کرتے تھے۔ اس لوٹ مار کی ہلچل نے پورے عرب میں تباہی مچادی تھی ہر طرف بے بسی، بے قراری اور بے چینی پھیلی ہوئی تھی لوگ اس فکر میں تھے کہ کب یہ بے چینی اور بے راہ روی ختم ہوجائے اور غارت گری اور لوٹ مار کا بازار بند ہوجائے۔ تاکہ وہ اس مصیبت سے چھٹکارا پالیں۔ عرب دنیا کی اس صورت حال کی طرف اشارہ کرکے یہ بتایا گیا ہے کہ موت کے بعد دوسری زندگی اور خدا کے حضور جوابدہی سے بے خوف ہوکر انسان اپنے رب کا ناشکرا ہوگیا ہے۔ وہ خدا کی دی ہوئی قوتوںکو ظلم و ستم اور غارت گری کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ وہ مال و دولت کی محبت میں اندھا ہوکر ہر طریقے سے مال و دولت حاصل کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے، خواہ وہ کیسا ہی ناپاک اور ناجائز طریقہ ہو۔ اس کی یہ حالت اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ وہ اپنے رب کی عطا کی ہوئی قوتوں کا غلط استعمال کرکے اس کی ناشکری کررہا ہے وہ ایسی حرکت ہرگزنہ کرتا اگر اسے اس بات پر یقین ہوتا کہ قبروں سے دوبارہ زندہ ہوکر اٹھنا ہے اور خدا کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے۔

وَالْعَادِيَاتِ ضَبْحًا(۱)

قسم ہے اُن سرپٹ دوڑنے والے ہانپتے (گھوڑوں) کی

فَالْمُورِيَاتِ قَدْحاً(۲)

جو اپنی ٹاپوں سے چنگاریاں جھاڑتے ہیں ء

فَالْمُغِيرَاتِ صُبْحًا(۳)

پھر صبح سویرے چھاپہ مارتے ہیں

فَأَثَرْنَ بِهِ نَقْعًا(۴)

پھر اس موقع پر گردو غبار اڑاتے ہیں

فَوَسَطْنَ بِهِ جَمْعًا(۵)

پھر اسی حالت میں مجمع کے اندر گھستے ہیں

قسم ہے اُن سرپٹ دوڑنے والے ہانپتے (گھوڑوں) کی

جو اپنی ٹاپوں سے چنگاریاں جھاڑتے ہیں

آیت میں واضح نہیں کیا گیا ہے کہ ان سرپٹ دوڑنے والوں سے کون مراد ہیں اس لیے ان کے بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ یہ سرپٹ دوڑنے والے گھوڑے ہیں جن کی قسم کھائی گئی ہے۔ بعض کے نزدیک یہ اونٹ ہیں۔ جب کہ محدثین کی ایک جماعت ان سے فرشتے مراد لیتے ہیں لیکن آیات پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ اشارہ گھوڑوں کی طرف ہے کیونکہ اونٹ کی نسبت گھوڑا ہی سرپٹ دوڑ لگا کر گرد اڑاتا ہے اور اپنے ٹاپوں سے چنگاریاں نکالتا ہے۔ جب اُن کے آہنی سُم ریگستانوں میں چھوٹے چھوٹے پتھروں سے ٹکرائے جاتے ہیں تو ان سے شرارے نظر آتے ہیں۔

پھر صبح سویرے چھاپہ مارتے ہیں

اہل عرب کا قاعدہ تھا کہ جب کسی بستی پر انہیچھاپہ مارنا ہوتا تو رات کے اندھیرے میں چل کر جاتے اور اس بستی کے نزدیک ڈیرہ ڈالتے جہاں چھاپہ مارنا ہوتا تھا پھر ہلکی روشنی میں لُو لگنے سے پہلے چھاپہ مارتے تھے جب لوگ نیند سے اٹھنے کی تیاریوں میں لگے ہوتے۔ تو ان پر اچانک حملہ کیا جاتا تھا اور ان بے چاروں کو سنبھلنے کا یا بھاگنے کا کوئی موقع نہیں دیا جاتا۔ یہ لوگ اچانک چھاپہ پڑنے پر حواس باختہ ہوجاتے اور اس طرح نہ مقابلہ کرسکتے تھے اور نہ راہ فرار اختیار کرسکتے تھے۔

پھر اس موقع پر گردغبار اڑاتے ہیں، پھر اسی حالت میں کسی مجمع کے اندر جا گھستے

حملہ آوروں کا یہ حملہ اتنا تیز ہوتا تھا کہ ان کے گھوڑوں کی تیز رفتاری سے گردو غبار کا طوفان اٹھتا تھا اس خوف و دہشت کے ماحول کا بھرپور فائدہ اٹھا کر یہ حملہ آور غارت گری میں کامیاب ہوتے اور معصوم لوگوں پر قابو پاکر ان کا قتل عام کردیتے۔ اگر کسی کی جان بچ جاتی تو اسے قیدی بنا کر غلام یا لونڈی بنادیتے۔ ان وحشی اور خونخوار لوگوں کے حملے میں اگر کوئی چھوٹا بچہ زندہ بچ جاتا تو ظالم حملہ آور اسے ساتھ لینے کی زحمت نہیں اٹھاتے تھے بلکہ اسے بھیڑ بکری کی طرح ذبح کر ڈالتے تھے اور اس طرح ان مظلوموں کے خون سے انسانیت اور انسانوں کی تاریخ رقم کردیتے تھے۔ یہ تھی عرب دنیا کی وہ مشرکانہ زندگی جس میں وہ سرمست ومدہوش تھے۔

إِنَّ الْإِنسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ(٦)

بے شک انسان اپنے رب کا بڑا ہی ناشکرا ہے

وَإِنَّهُ عَلَىٰ ذَٰلِكَ لَشَهِيدٌ(٧)

اور بے شک وہ خود اس حقیقت پر گواہ ہے

وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ(٨)

اور یقیناوہ مال و دولت کی محبت میں بُری طرح مبتلا ہے۔

بے شک انسان اپنے رب کا ناشکرا ہے

یہاں اس مضمون کی طرف اشارہ ہے جس پر اُن گھوڑوں کی قسم کھائی گئی ہے جو رات کو پھنکارے مارتے اور چنگاریاں جھاڑتے ہوئے سرپٹ دوڑتے ہیں اور صبح سویرے گرد و غبار اڑاکر بستی میں داخل ہوجاتے ہیں اور کسی مجمع میں گھس جاتے ہیں اور لوٹ مار کرتے ہیں۔ اکثر مفسرین نے ان گھوڑوں سے غازیوں کے گھوڑے مراد لیے ہیں اور جن مجمعوں میں وہ جا گھستے ہیں ان سے انہوںنے کفار کے مجمے مراد لیے ہیں لیکن یہ بات غیر منطقی (illogical) معلوم ہوتی ہے کیونکہ قسم دراصل اس بات پر کھائی گئی ہے کہ انسان اپنے رب کا بڑا ہی ناشکرا ہے ظاہر ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ میں غازیوں کے گھوڑوں کی دھوڑ دھوپ اور پھر کفار کے کسی مجمعے یا لشکر پر ان کا ٹوٹ پڑنا اس امر پر کوئی دلالت نہیں کرتا کہ انسان اپنے رب کا ناشکرا ہے اور نہ یہ آیات کہ انسان اپنی اس ناشکری پر خود گواہ ہے اور وہ مال و دولت کی محبت میں گرفتار ہے، اُن لوگوں پر چسپاں ہوتے ہیں جو خدا کی راہ میں جہاد کرنے کے لیے نکلتے ہیں۔ اس لیے سورہ کی ابتدائی پانچ آیات کی قسموں کا زیادہ صحیح اور مناسب مفہوم یہی ہوسکتا ہے کہ ان کا اشارہ اس خونریزی اور غارت گری کی طرف ہے جو عرب میں اس وقت برپا تھی۔ جاہلیت کے زمانے میں عرب کے لوگوں کے لیے رات ایک خوفناک چیز ہوتی تھی جس میں ہر قبیلے اور بستی کے لوگ یہ خطرہ محسوس کرتے تھے کہ نہ معلوم کون سا دشمن ان پر چڑھائی کرنے کے لیے آرہا ہو اور دن کی روشنی نمودار ہونے پر وہ اطمینان کا سانس لیتے تھے کہ رات خیریت سے گزر گئی۔ رات کے اس خوف و ہراس کا اندازہ اُس قوم کے لوگ اچھی طرح سے کرسکتے ہیں جو کسی قوم کی جارحیت میں غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہوں۔ کہ جب اس قوم کے لوگ اس جارحانہ اور غاصبانہ تسلط اور قبضے کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں اور اپنی آزادی کا اعلان کرتے ہیں تو یہ جارح اور غاصب قابض حکمران لوگوں کی آواز دبانے کے لیے کریک ڈاون (crackdown) کرکے رات کے وقت چھاپہ مارتے ہیں اور لوگوں کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو سلوک عرب کے یہ چھاپہ مار حملہ آور کرتے تھے۔ غیر قوموں کے زیر انتظام یہ مظلوم لوگ اسی طرح کی رات گزارتے ہیں اور خوف و خطر کی اس گھڑی کے انتظار میں رہتے ہیں کہ نہ جانے کب صبح ہوتے ہی بستی پر چھاپہ پڑے اور لوگوں کو گھروں سے نکال کر زدوکوب کیا جائے یہ مظلوم لوگ ہر وقت اس فکر میں رہتے ہیں کہ کب انہیں اس ظلم و جبر اور غاصبانہ قبضے سے نجات ملے گی۔

قبیلوں کی ایک دوسرے پر چھاپہ ماری محض انتقامی لڑائیوں کے لیے نہیں ہوتی تھی بلکہ یہ لڑائیاں اور چھاپے ایک دوسرے کی دولت لوٹنے کے لیے ہوتے تھے، چھاپوں میں مویشی ہانک لیے جاتے تھے، عورتوں اور مردوں کو غلام بنیا جاتا تھا ظلم اور غارت گری کی یہ کاروائی زیادہ تر گھوڑوں پر سوار ہوکر ہی کی جاتی تھی اس لیے اللہ تعالیٰ ان کاروائیوں کو دلیل کے طور پر پیش کررہا ہے کہ انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔ یعنی جس طاقت کو وہ جنگ وجدل اور غارت گری میں استعمال کررہاہے وہ اللہ تعالیٰ نے اسے اس لیے نہیں بخشی تھی کہ اس سے ظلم وجبر کا کام لیا جائے پس یہ ایک بہت بڑی ناشکری ہے کہ اللہ کے دیئے ہوئے ان وسائل اور طاقتوں کو فسادات اور لوٹ مار میں استعمال کیا جائے جو اللہ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے۔ بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ ان قسموں سے مراد اہل عرب کے وہ وفادار، فداکار اور جان نثار گھوڑے ہیں جو اپنے مالک کی اطاعت میں ایسی تیز رفتاری، جانثاری اور خدمت گزاری کی حق ادائی کرتے ہیں۔ وہ بے خوف و خطر دشمن کی صفوں میں گھس جاتے ہیں اور انہیں تہس نہس کردیتے ہیں گھوڑوں کی اپنے مالک کے لے ان وفاداریوں اور جان نثاریوں اور فداکاریوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ گھوڑے اپنے مالک کی وفاداری اور فرمانبرداری کرتے ہیں لیکن انسان خدا کا ناشکرا ہے۔ خدا نے اسے اپنی بندگی کے لیےپیدا کیا اسے رزق عطا کیا اور اس کے زندہ رہنے کے لیے ہر قسم کا سازوسامان دیا لیکن ردِ عمل میں وہ خدا کا ناشکرا ہے۔ وہ خدا کے دین کے لیے کسی طرح کی وفادری اور فداکاری کا مظاہرہ نہیں کرتا۔ اپنے مالک اور خالق کی بندگی اور فرمانبرداری کرنے کی کوئی فکر نہیں ہے۔یہاں یہ بات سمجھائی جاتی ہے کہ جن مالکوں کی اطاعت میں یہ گھوڑے جان کی بازی لگاتے ہیں وہ اپنے ان مالکوں کی مخلوق نہیں ہے انہیں اپنے مالک کی طرف سے صرف دانہ پانی اور بھوسہ ملتا ہے اور وہ اس کے بدلے میں اپنے مالکوں کی تابعداری میں اپنی جان کی بازی لگا کر اس طرح سرپٹ دوڑتے ہیں کہ ان کے سموں سے چنگاریاں نکلتی ہیں۔ وہ اپنے مالک کے لیے سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں اس کے برعکس انسان اپنے اللہ کی مخلوق ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس پر وہ عنایات کی ہیں جو کسی اور مخلوق پر نہیں کیں اسے اپنی نعمتوں سے نوازا اور تمام دیگر مخلوقات کو اس کے تابع فرمان بنادیا۔ لیکن اس کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے رب کے ساتھ اوروں کو شریک کرتا ہے۔ وہ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کا بھرپور فائدہ تو اٹھاتا ہے لیکن اللہ کا حق ادا کرنے کی زحمت نہیں اٹھاتا ہے۔ وہ اللہ کی بندگی اور فرمانبرداری سے جی چراتا ہے۔ وہ اپنے جیسے انسانوں کی

اطاعت کرتا ہے لیکن اللہ کی اطاعت کرنے سے ہچکچاتا ہے اور انکار بھی کرتا ہے۔ اس نے اطاعت کرنے اور بندگی کرنے کے بے شمار آستانے بنا رکھے ہیں اور اپنے ذاتی مفادات کے لیے باطل قوتوں کے بہت سارے بت بنا رکھے ہیں جن کی پوجا کرنے میں وہ کوئی کسر باقی نہیں رکھتا ہے۔

یہ بات بھی قابل اعتناء ہے کہ جس طرح لوگوں کو تیز رفتار گھوڑوں پر سوار حملہ آوروں کا ڈر رہتا ہے اور اس فکر میں رہتے ہیں کہ کس طرح ان حملہ آوروں سے اپنے آپ کو بچایا جاسکے گا۔ اسی طرح انہیں یہ فکر ہونی چاہیے کہ یہ دنیا ایک عارضی ٹھکانہ ہے اور یہ ہماری زندگی عارضی ہے۔ جب انسان اس عارضی زندگی کو محفوظ رکھنے کے لیے اور خوف و ہراس اور لوٹ مار اور قتل غارت سے بچنے کے لیے تدبیریں کرتے ہیں اور اس فکر میں رہتے ہیں کہ کس طرح لوٹ مار اور قتل غارت کے ان حملوں کے خطرات سے اپنے آپ کو بچایا جاسکے۔ اس طرح کی فکر ان خطرات اور عذاب کے لیے ہونی چاہیے جو عذاب اور تکلیف اللہ کی نافرمانی پر آخرت میں دیا جائے گا اور جہاں اللہ کی نافرمانی کرنے والوں کو رسوا کیا جائے گا۔

اور بے شک وہ خود اس حقیقت پر گواہ ہے

انسان اگر خود اپنا احتساب کرے تو اس کا وجود، اس کا طور طریقہ اور اس کی بود وباش خود اس بات کی گواہی دے گی کہ وہ اپنے رب کا ناشکرا ہے۔ کیونکہ اس کا ضمیر اس کے اعمال پر گواہ ہے اور وہ اپنے اعمال کو اچھی طرح سے جانتا ہے بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو علانیہ خدا کا شکر کرنے کے بجائے کفر کرتے ہیں۔ کئی لوگ ایسے بھی ہیں جو خدا کو سرے سے مانتے ہی نہیں تو ان لوگوں سے شکران نعمت کی امید کیسے کی جاسکتی ہے۔ انسان خود اپنے سارے معاملات سے باخبر ہے اسے معلوم ہے کہ وہ صحیح افعال انجام دیتا ہے یا غلط، حالانکہ صحیح اور نیک کام کرنے میں اسے اطمینان حاصل ہوتا ہے اور برے کام کرنے پر اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا ہے۔ مگر برائی پر برائی کرنے کی پاداش میں اس کے دل پر سیاہی چڑھ جاتی اور اسے برائیوں کا زنگ لگ جاتا ہے۔ اور پھر وہ آنکھیں بند کرکے خدا کی نافرمانی کرتا اور برائی پر برائی کرتا رہتا ہے اور برائیوں اور نیکیوں کا الگ الگ نتیجہ جاننے کے باوجود وہ خدا کی نافرمانی کرنے سے گریز نہیں کرتا اور اپنے نفس کی ہر جائز اور ناجائز خواہش کو پورا کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔

اور بے شک وہ مال و دولت کی محبت میں بری طرح مبتلا ہے

خیر کا لفظ یہاں بھلائی کے بجائے مال و دولت کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے جس طرح سورہ بقرہ میں آیت:۱۸۰ میں خیر کو مال کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِن تَرَكَ خَيْرًا۔ جب تم میں سے کسی کو موت کا وقت آئے اور وہ اپنے پیچھے مال چھوڑ رہا ہو۔ اس آیت میں خیر کا لفظ مال کے لیے استعمال ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان پر جو خیر کیا ہے یعنی اسے مال و دولت عطا کی وہ اس خیر کے بدلے میں خدا کی نافرمانی کرتا ہے مال و دولت کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے، نہ مالدار ہونے پر خدا کا شکر ادا کرتا ہے اور نہ اپنے مال سے غریبوں کی مدد کرتا ہے اسے اپنے مال و دولت سے اتنی محبت ہوتی ہے کہ وہ رات دن اس فکر میں رہتا ہے کہ کہاں کس طرح ، کس ذریعے سے وہ مال و دولت حاصل کرے یہ دیکھے بغیر کہ ذرائع حلال ہیں یا حرام وہ دولت کمانے کے لیے رشوت خوری کرتا ہے۔ لوگوں سے بے ایمانی کرکے دھوکہ دہی سے دولت جمع کرتا ہے۔ لوٹ کھسوٹ کرنے میں اسے کوئی کراہت محسوس نہیں ہوتی ہے اور نہ ایسا کرنے میں اسے کسی کا خوف اور ڈر ہوتا ہے وہ ہر بُرے اور بھلے کام کو اپنے لیے جائز قرار دیتا ہے۔ اگر اسے آخرت پر ایمان ہوتا اور جزا و سزا اور جنت و جہنم پر یقین کرتا تو وہ مالِ حرام کمانے کی کوشش نہ کرتا اور نہ اس دنیا کے مال و دولت کی محبت میں یوں مبتلا ہوتا۔ اس کی نافرمانی اور ناشکری کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ مال و دولت کی محبت میں گرفتار ہے۔ اس لیے اسے خدا کی فرمانبرداری کی کوئی فکر نہیں ہے اور نہ اسے یہ خیال ہے کہ مال جائز طریقوں سے کمانا ہے، وہ اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتا ہے اور نہ غریبوں اور محتاجوں پر خرچ کرتا ہے۔ مگر بے حیائی اور فضول کاموں پر وہ بے دریغ و دولت اڑاتا ہے۔

أَفَلَا يَعْلَمُ إِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُورِ(۹)

کیا وہ اس وقت کو نہیں جانتا جب وہ سب کچھ نکالا جائے گا جو قبروں میں مدفون ہے

وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُورِ(۱۰)

اور وہ بھید ظاہر کئے جائیں گے جو سینوں میں ہیں

إِنَّ رَبَّهُم بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيرٌ(١١)

یقینا ان کا رب اس دن ان سے خوب باخبر ہوگا

کیا وہ اس وقت کو نہیں جانتا جب وہ سب کچھ نکالا جائے گا جو قبروں میں مدفون ہے

انسان کو اس دن سے خبردار کیا گیا ہے جب اسے قبر سے نکال دیا جائے گا۔ قبر کا مطلب صرف وہ قبر نہیں ہے جو زمین کھود کر بنائی گئی ہو جس میں انسان کو دفنایا گیا ہو بلکہ قبر سے مراد ہر وہ جگہ ہے جہاں سے انسان کو اس کے باقیاتِ جسم سے دوبارہ زندہ کرکے حاضر کردیا جائے گا۔ جیسا کہ سورہ یٰسٓ میں ذکر ہے۔ قَالُوْا یٰوَیْلَنَا مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا (یہ لوگ گھبرا کر کہیں گے کہ ہائے ہماری بدبختی ! ہمیں اپنے آرام گاہوں سے کس نے اٹھا کھڑا کیا) (یٰس:۲۵)۔ سائنس نے اس حقیقت کا اعتراف کردیا ہے کہ مادہ فنا نہ ہونے والی شئے ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہر ایک مرے ہوئے اور سڑے ہوئے انسان کو اس کے مادے سے دوبارہ زندہ کرکے میدان حشر میں حاضر کردیا جائے گا۔

اور جو بھید سینوں میں ہیں ظاہر کردئے جائیں گے

جب تمام انسانوں کو دوبارہ وجود میں لایا جائے گا اور پھر انہیں اپنے اپنے مرکدوں سے اٹھا کر میدان حشر میں جمع کردیا جائے گا تو اس وقت ہر ایک انسان کے سینے سے اس کا راز نکالا جائے گا یعنی ہر ایک انسان کے دل کی جانچ اس طرح ہوگی جس طرح آج کل کے زمانے میں ایکسرے (X-Ray) وغیرہ کے ذریعے انسانوں کے اندرونی اعضا کی تصویریں سامنے لائی جاتی ہیں یا وہ چیزیں دیکھی جاسکتی ہیں جو انسان کی نظر سے اوجھل (invisible) ہوتی ہیں۔ اس کے بعد انسان کے ہر عمل کا حساب لیا جائے گا۔ یعنی دلوں میں جو راز، نیتیں اغراض و مقاصد، خیالات و افکار جو دنیا میں غیر سرئی (invisible) رہتے ہیں، وہ سب کھول کر رکھدیئے جائیں گے اور ان کی جانچ پڑتال کرکے اچھائی کو الگ اور برائی کو الگ کردیا جائے گا یعنی عملوں کی کانٹ چھانٹ ہوگی اور فیصلہ صرف ظاہری عملوں پر نہیں ہوگا بلکہ دلوں میں چھپے ہوئے رازوں کو بھی نکال کر دیکھا جائے گا کہ جو کام انسان نے کیے ہوں وہ اس نے کس نیت سے اور کس غرض سے کئے ہیں۔

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ اصلی اور مکمل انصاف خدا کی عدالت کے سوا کہیں نہیں ملتا ہے حالانکہ دنیا کے لادینی قوانین بھی اصولی حیثیت سے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ کسی شخص کو اس کے ظاہری فعل کی بنا پر سزا نہ دی جائے بلکہ یہ بھی دیکھا جائے کہ اس نے کس ارادے سے وہ کام کیا ہے لیکن دنیا کی کسی بھی عدالت کے پاس وہ ذرائع نہیں ہیں جن سے وہ نیت کی ٹھیک ٹھیک تحقیق کرسکے۔ کیونکہ سائنس کی شاندار ایجادات کے باوجود ابھی تک انسان اس قابل نہیں ہوگیا ہے کہ وہ انسانوں کے چھپے ہوئے راز جان سکے اگرچہ سی سی کیمرہ کی ایجاد سے انسانوں کی حرکات و سکنات (movement action) کسی بھی جگہ دیکھی جاسکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ طارق میں فرمایا ہے ۔ یَوۡمَ تُبۡلَی السَّرَآئِرُ o (جس دن سب چھپی ہوئی باتیں ظاہر ہوگی۔ آیت :۹) یعنی انسانوں کے سب پوشیدہ راز قیامت کے دن اللہ کے پاس کھل جائیں گے ۔ اِلّا یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے منشا کے مطابق انسانوں کو دنیا میں دلوں کے راز جاننے کی صلاحیت عطا کرے۔

قیامت کے روز ان رازوں کو کھول کر علانیہ سامنے رکھدیا جائے گا اور کھلی عدالت میں جانچ پڑتال کرکے یہ دیکھا جائے گا کہ ان میں خیر کیا تھا اور شر کیا تھا۔ اس کے ساتھ یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کے اعمال کی کیسٹ جو کراماً کاتبین پیش کریں گے، انسان کے سامنے ڈال دینے کا حکم فرمادیں گے۔ عصری زبان میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کی سرعام آڈیو ویجول (Audio-visual) کے طور پر انسان کے اعمال کو دیکھا جائے گا اور انسان بھی اپنے عملوں کا مشاہدہ کرے گا۔ (واللہ اعلم الصواب)

یقینا اُن کا رب اس دن ان سے خوب باخبر ہوگا

اللہ تعالیٰ ہر ایک انسان کے اعمال کو جانتا ہے اسے معلوم ہے کہ انسان نے کہاں کون سا کام کیا اور اس کے کام کرنے میں اس کی کیا نیت تھی۔ لیکن اس کے باوجود انسان کے ظاہر اور چھپے ہوئے اعمال ظاہر کردئے جائیں گے تاکہ انسان کا کوئی بھی معاملہ پوشیدہ نہ رہے اور اسے شکایت کا موقعہ نہ مل جائے۔ نیکیاں کرنے والوں کی سرعام حوصلہ افزائی کی جائے گی اور برے اعمال کرنے والوں کی

سرعام ملامت کی جائے گی۔

اس آیت میں نیک لوگوں کے لیے اللہ کے پاس عزت و آبرو کا پیغام ہے اور برے لوگوں کے لیے اس کے حضور رسوائی کی وعید ہے اب یہ انسان کے اختیار میں ہے کہ وہ نیکیاں کرکے وہاں عزت کا مقام پانا چاہتا ہے یا اللہ کی نافرانی کرکے اللہ کے دربار میں رسوا ہونا چاہتا ہے۔

سورۃُ القارعَۃ

آیاتُھا: 11 رُکوعُھَا:1

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

الْقَارِعَةُo مَا الْقَارِعَةُo وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْقَارِعَةُo يَوْمَ يَكُونُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِo وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنفُوشِo فَأَمَّا مَن ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُo فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍo وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُo فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌo وَمَا أَدْرَاكَ مَا هِيَهْo نَارٌ حَامِيَةٌo

تعارف:

جس طرح اَلْحاقَہ، الطَّامَۃ، الصَّاخَّۃ، اَلْغَاشِیَہ، اَلسَّاعَۃ، اَلْوَاقِعَۃ وغیرہ قیامت کے نام ہیں اسی طرح القارعۃ بھی قیامت کا ایک نام ہے۔ قیامت کا یہ حادثہ دلوں پر ضرب لگانے والا حادثہ ہے۔ پوری سورت القارعۃ کے بیان پر مشتمل ہے لہٰذا یہ سورت مکمل طور پر قیامت کا منظر پیش کرتی ہے۔

سورت کا موضوع قیامت اور آخرت ہے سب سے پہلے لوگوں کو قیامت کے اس واقعہ سے اس طرح چونکایا گیا ہے کہ انہیں اس عظیم حادثہ کا تعارف کرانے کے لیے پوچھا جاتا ہے کہ کیا ہے وہ عظیم حادثہ، تم کیا جانو وہ عظیم حادثہ کیا ہے ان سوالات سے سننے والوں کو اس ہولناک واقعہ کے پیش آنے کی خبر سننے کے لیے تیار کیا جاتا ہے پھر اس واقعہ یعنی قیامت کا نقشہ پیش کیا جاتا ہے کہ قیامت اس طرح پیش آئے گی کہ لوگ گھبراہٹ کے عالم میں اس طرح ہوں گے جس طرح روشنی پر آنے والے پروانے بکھرے ہوئے ہوتے ہیں اور پہاڑوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ دھنکے ہوئے رنگین اون کے گالوں کی طرح ہوا میں اڑتے دکھائی دیں گے۔ اللہ کی عدالت میں انسانوں کے اعمال کا فیصلہ ہوگا۔ فیصلہ یہ ہوگا کہ جس کے اعمال باوزن ہوں گے انہیں عیش و عشرت کی دلپسند زندگی حاصل ہوگی اور جن کے اعمال بے وزن ہوں گے ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔

الْقَارِعَةُ(۱)

وہ عظیم حادثہ

مَا الْقَارِعَةُ(۲)

کیا ہے وہ عظیم حادثہ

وَمَا أَدْرَاکَ مَا الْقَارِعَةُ(۳)

اور تم کیا جانو وہ عظیم حادثہ کیا ہے

وہ عظیم حادثہ، کیا ہے وہ عظیم حادثہ، اور تم کیا جانو وہ عظیم حادثہ کیا ہے

سوال کا آغاز ایک عظیم حادثہ سے کی وارننگ سے ہوتا ہے۔ لگتا ہے کہ کوئی دھماکہ ہونے والا ہے جس سے ایک دہشت ناک فضاپیدا ہوگئی ہے اور اس فضا کو برقرار رکھنے کے لیے ایک زبردست حادثے کی خبر دی جاتی ہے کہ وہ عظیم حادثہ ہے۔ پھر سوال کرکے حادثے کی ہولناکی اور دہشت کو ابھارا جاتا ہے جب کسی معاملے کے متعلق سوال کیا جاتا ہے کہ تجھے معلوم ہے وہاں کیسا حادثہ پیش آیا تو سننے والے پر خوف طاری ہوجاتا ہے اور وہ بے تابی اور بے قراری سے معلوم کرنا چاہتا ہے کہ کہاں کس طرح کا حادثہ پیش آیا ہے۔ جب کہنے والا کہتا ہے کہ تمہیں کیا خبر ہے کہ وہ حادثہ کتنا خوف ناک ہے تو معاملے میں مزید دلچسپی (interest) اور تجسس (curiosity) بڑھ جاتا ہے اسی طرح قیامت کے حادثے کی خبر کو دو تین بار دہرانے کا یہ مقصد ہے کہ اس کے خوف سے لوگ اللہ رب العالمین کی بندگی اور اطاعت کی طرف متوجہ ہوجائیں اور غفلت سے بیدار ہوکر آخرت کی فکر میں لگ جائیں۔ عربی زبان میں قارعہ کا لفظ ہولناک حادثے اور بڑی آفت کے لیے بولا جاتا ہے۔ مثلاً قَرَعَتْھُمُ الْقَارعہ یعنی فلاں قبیلے یا قوم کے لوگوں پر سخت آفت آگئی ہے۔ قرآن مجید میں قارعہ لفظ کئی جگہوں پر آفت کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ رعد میں ہے: یَزَالُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا تُصِیْبُھُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَۃٌ۔ جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان پر ان کے کرتوتوں کی وجہ سے کوئی نہ کوئی آفت نازل ہوتی رہتی ہے۔) (رعد:۱۳)

لیکن اس سورہ میں قارعہ کا لفظ قیامت کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ قارعہ کا لفظی معنی زور سے کھٹکھٹانے والی بھی ہے اس معنی کے لحاظ سے قارعہ وہ حادثہ ہے جو اچانک دروازہ کھٹکھٹانے والے کی طرح انسانوں کے دل و دماغ کے دروازوں کو کھٹکھٹائے گا جس طرح کسی گھر کا دروازہ جب اچانک زور زور سے کھٹکھٹایا جاتا ہے تو گھر والے گھبراکر معاملہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح قیامت جب اپنے آنے کی صدا دے گی اور لوگوں کے کانوں کو کھٹکھٹائے گی تو لوگ فوراً خوف زدہ ہوکر حرکت میں آئیں گے اور اس حادثہ کی طرف متوجہ ہوجائیں گے جو انہیں قیامت کی خبر لے کر آیا ہوگا۔

یَوْمَ یَکُوْنُ النَّاسُ کَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ(۴)

وہ دن جب لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح ہوں گے

وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنفُوشِ(۵)

اور پہاڑ دھنکی ہوئی رنگین اون کی طرح ہوں گے

وہ دن جب لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح ہوں گے،

اور پہاڑ دھنکی ہوئی اون کی طرح ہوں گے

یہ وقوع قیامت کا پہلا منظر ہے اس پر غور کرنے سے انسانی دل او رانسان کے اعضا کانپنے لگتے ہیں۔ انسان کو محسوس ہوتا ہے کہ زمین کی تمام چیزیں جن کو وہ تھامے ہوئے ہے اور جو اس کے اختیار میں ہیں، ہوا میں غباروں کی طرح اڑرہی ہیں اور وہ خود پروانے کی طرح ہوا میں اِدھر اُدھر (randomly) اڑرہا ہے اور اسے پہاڑ بھی دھنے ہوئے اون کی طرح اڑتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ ان آیات پر غور کرنے سے انسان کے ذہن میں قیامت کی پوری تصویر آجاتی ہے کہ جب وہ عظیم حادثہ برپا ہوگا جس کے نتیجے میں دنیا کا سارا نظام درہم برہم ہوجائے گا، اس وقت لوگ گھبراہٹ کی حالت میں اس طرح بھاگے بھاگے پھریں گے جیسے روشنی پر آنے والے پروانے ہر طرف پراگندہ اور منتشر ہوکر اڑتے پھرتے ہیں یا ان پتنگوں کی طرح اڑتے ہوئے ہوں گے جو برسات کے موسم میں جھُنڈوں میں ادھر اُدھر اڑتے ہوئے نظر آتے ہیں اور پہاڑ بھی رنگ برنگ کے دھنکے ہوئے اون کے ٹکڑوں کی طرح ہوا میں تیرتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ پہاڑوں کو رنگ برنگ کے اون کے ٹکڑوں سے اس لیے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ ان کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ الغرض اس دن ایسی افراتفری ہوگی کہ انسان اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھیں گے۔ کوئی کسی کے پاس آنے کی جرأت نہ کرے گا اور نہ کسی کو کسی کے ساتھ بات کرنے کا یارا ہوگا اور نہ کوئی کسی کی مدد کرسکے گا ہر کوئی اپنے ہی حال پر پریشان ہوگا اور ہر کسی کو اپنی فکر ہوگی کہ کیا کروں کہاں جاؤں اور کس سے ملوں وہاں نہ باپ بیٹے کا اور نہ بیٹا باپ کا ہوگا بھائی بھائی سے بھاگے گا کوئی کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔

فَأَمَّا مَن ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ(٦)

پھر جس کے اعمال باوزن ہوں گے

فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ(٧)

وہ دل پسند عیش میں ہوگا

وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ(٨)

اور وہ شخص جس کے اعمال بے وزن ہوں

فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ(٩)

اس کا ٹھکانہ گہری کھائی ہوگی

وَمَا أَدْرَاكَ مَا هِيَهْ(١٠)

اور تم کیا جانو وہ کیا ہے؟

نَارٌ حَامِيَةٌ(١١)

وہ بھڑکتی ہوئی آگ ہے

پھر جس کے اعمال باوزن ہوں گے، وہ دلپسند عیش میں ہوگا

اور وہ شخص جس کے اعمال بے وزن ہوں ، اس کا ٹھکانہ گہر گھڑا ہوگا

اور تم کیا جانو وہ کیا ہے؟، وہ بھڑکتی ہوئی آگ ہے

موازین موزون کی جمع بھی ہے اور میزان کی جمع بھی ہے۔ اگر اسے موزون کی جمع قرار دیا جائے تو پھر موازین سے مراد وہ اعمال ہیں جن کا اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں وزن ہے اور اگر اسے میزان کی جمع مانا جائے گا تو پھر موازین سے مراد وہ اعمال ہیں جن کو ترازو کے پلڑوں میں تولا جائے اور جس کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوگا وہ کامیاب ہوگا اور جس کے عملوں کا پلڑا ہلکا ہوگا وہ ناکام ہوگا۔

عربی زبان کے لحاظ سے موازین کے معنی وزن دار بھی ہیں اور موزون بھی اس لیے موازین کو خواہ موزون کے معنی میں لیا جائے یا تولنے کے معنی میں، مدعا اور مطلب ایک ہی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں فیصلہ اس بنیاد پر ہوگا کہ آدمی جو پونجی لے کر آیا ہے وہ وزنی ہے یا بے وزن یا اس کی نیکیوں کا وزن اُس کی برائیوں سے زیادہ ہے یا کم۔

یہ مضمون قرآن مجید میں مختلف مقامات پر آیا ہے جہاں اس مسئلے کا مطلب پوری طرح سے واضح ہوجاتا ہے۔ سورہ اعراف میں ہے... اور وزن اس روز حق کا ہوگا پھر جن کے پلڑے بھاری ہوں گے وہی فلاح پائیں گے اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے وہ خسارے میں ہوں گے۔ (آیات:۸،۹)

سورہ کہف میں ارشاد ہوا ہے... اے نبیؐ! ان لوگوں سے کہو کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ ناکام ونامراد لوگ کون ہیں؟ وہ کہ دنیا کی زندگی میں جن کی ساری جدوجہد راہ راست سے بھٹکی رہی اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ سب کچھ ٹھیک کررہے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیات کو ماننے سے انکار کیا ار اس کے حضورپیش ہونے کا یقین نہ کیا اس لیے ان کے سارے اعمال ضائع ہوگئے۔ قیامت کے روز ہم انہیں کوئی وزن نہ دیں گے (آیات:۱۰۴، ۱۰۵)

سورہ انبیاء میں فرمایا گیا ہے... قیامت کے روز ہم ٹھیک ٹھیک تولنے والی ترازو رکھدیں گے پھر کسی شخص پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا جس نے رائی کے دانے کے برابر کچھ کیا ہوگا وہ ہم لے آئیں گے اور حساب لگانے کے لیے ہم کافی ہیں۔ (آیت:۴۷)

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حق سے انکار کرنا اور کفر کا راستہ اختیار کرنا بجائے خود اتنی بڑی برائی ہے کہ وہ برائیوں کے پلڑے کو لازماً جھکا دے گی اور یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ کافر کا کوئی نیک عمل اللہ تعالیٰ کے پاس قابل قبول نہیں ہے۔ اس لیے اس کی کوئی بھی نیکی بھلائی کے پلڑے میں نہیں ڈالدی جائے گی جس سے اس کی نیکی کا پلڑا جھک سکے۔ البتہ مومن کے پلڑے میں ایمان کا وزن بھی ہوگا اور اس کے ساتھ ان نیکیوں کا وزن بھی ہوگا جو اس نے دنیا میں کی ہوں۔ دوسری طرف اس کی بدیاں بدیوں کے پلڑے میں رکھ دی جائیں گی پھر دیکھا جائے گا کہ کون سا پلڑا جھکا ہوا ہے نیکی کا یا بدی کا۔

عام طور پر لوگوں میں یہ تصور پایا جاتا ہے کہ آخرت میں نیکیاں ایک پلڑے میں رکھی جائیں گی اور برائیاں دوسرے پلڑے میں پھر اگر نیکیوں کا پلڑا وزنی ہو تو جنت ملے گی اور اگر برائیوں کا پلڑا وزنی ہو تو جہنم ملے گا۔ لیکن اس آیت اور دوسری آیات میں یہ تصور نہیں پایا جاتا ہے کہ کوئی ٹھوس ترازو ہو جس میں اعمال کو تولا جائے گا بلکہ اعمال کو ان کی نیت اور خلوص کے اعتبار سے دیکھا جائے گا اور اسی اعتبار سے ان کا وزن بھی ہوگا۔

سید قطب شہید فرماتے ہیں کہ ان آیات میں انسانی اعمال کے خدا کی نگاہ میں باوزن اور بے وزن ہونے کا ذکر ہے جیسا کہ قرآن نے صراحت کی ہے کہ اعمال کے وزن کا تعلق ایمان سے ہے اور اعمال کی بے وزنی کا تعلق کفر و شرک سے ہے۔ قرآن مجید میں مختلف جگہوں پر فرمایا گیا ہے کہ برے عملوں کا کوئی وزن نہ ہوگا اس لیے بہت سے مترجمین اور مفسرین نے موازین کو قدر و قیمت کے معنی میں ہی لیا ہے۔ یعنی جن کے اعمال میں جتنا زیادہ خلوص اور تقویٰ ہو ان کے اعمال اتنے ہی وزن دار اور باوقار ہوں گے اور جن کے اعمال میں اخلاص نہ ہو یعنی یہ اعمال خدا کو راضی اور خوش کرنے کے بجائے دیگر مقاصد کے لیے کیے گئے ہوں تو ایسے اعمال کا کوئی وزن نہ ہوگا۔ ایسے لوگوں کے اعمال ضائع ہوں گے۔

سورۃ التکاثُر

آیتھا:8 رکوعھا:1

بسم االلہ الرّحمٰن الرّحیم

أَلۡهَاكُمُ التَّكَاثُرُo حَتَّىٰ زُرۡتُمُ الۡمَقَابِرَo كَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُونَo ثُمَّ كَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُونَo كَلَّا لَوۡ تَعۡلَمُونَ عِلۡمَ الۡيَقِينِo
لَتَرَوُنَّ الۡجَحِيمَo ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيۡنَ الۡيَقِينِo ثُمَّ لَتُسۡأَلُنَّ يَوۡمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِo

تعارف:

اس سورہ میں غفلت میں پڑے ہوئے لوگوں کے لیے ایک پیغام ہے کہ اے غافلو! بے پروا اور مدہوش لوگو! تم جو مال و دولت اور دنیاوی سازوسامان کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے میں لگے ہوئے ہو، تم دھوکے میں ہو اور اس انجام سے بے خبر ہو جو قریب آلگا ہے۔ اے لوگو! تمہیں جن چیزوں کی زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی ہوس ہے اور جن پر تم ایک دوسرے پر فخر کرتے ہو ان چیزوں کو چھوڑ کر تم ایک ایسے کھڈ میں گرنے جارہے ہو جہاں نہ یہ دنیوی ہوس کام آئے گی اور نہ یہ ایک دوسرے پر فخر کرنا کام آئے گا۔ جاگو! آنکھیں کھولو دیکھ لو اور غور کرلو کہ تم کہاں سے آئے ہو اور کہاں جانے والے ہو۔ تم روز دیکھتے ہو کہ جو کوئی دنیا میں آیا ہے اسے موت کے بعد مٹی کے اندر دفنایا جاتا ہے یا کسی اور ذریعہ سے اپنے انجام کو پہنچایا جاتا ہے۔ یاد رکھو کہ تمہیں دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور اس مقام پر پہنچایا جائے گا جہاں دنیا کا یہ مال و دولت، جاہ و حشمت، چمک دھمک، زیب و زینت اور ایک دوسرے پر برتری اور بالادستی حاصل کرنے کی جدوجہد تمہیں کچھ کام نہ آئے گی وہاں صرف آپ کو دنیا میں کئے ہوئے اپنے نیک اعمال کام آئیں گے۔ دنیا کا یہ مال اور جاہ و حشمت آپ کو کچھ کام نہ آئے گا۔ آپ کو معلوم ہوجائے گا جس مال کو آپ نے جان کی بازی لگاکر اور خدا کی نافرمانی کرکے جمع کیا تھا۔ آج آپ کا جانی دشمن بن گیا ہے اور آپ کو جہنم میں پہنچانے کا ذریعہ بنے گا۔

سورہ میں لوگوں کو اس دنیا پرستی کے انجام سے خبردار کیا گیا ہے جس کی وجہ سے وہ مرتے دم تک زیادہ سے زیادہ مال و دولت اور دنیاوی فائدے اور لذتیں اور جاہ و حشمت حاصل کرنے اور اس میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش میں مگن رہتے ہیں اور انہیں کسی چیز کی طرف ہوش نہیں رہتا ہے۔ اس گمراہی اور غفلت میں مبتلا ہونے اور اس کے برے انجام پر متنبہ کرنے کے بعد انہیں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ نعمتیں جنہیں تم بے فکری کے ساتھ سمیٹ رہے ہو محض نعمتیں نہیں بلکہ تمہاری آزمائش کا سامان بھی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نعمت کے بارے میں روز نُشور پر پوچھا جائے گا اور آپ کو ذرے ذرے کا جواب دینا ہوگا۔

أَلْهَاكُمُ التَّكَاثُرُ(۱)

تم لوگوں کو ایک دوسرے سے بڑھ کر زیادہ سے زیادہ دنیا حاصل کرنے کی ہوس نے غفلت میں ڈال رکھا ہے

حَتَّى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ(۲)

یہاں تک کہ تم قبر تک پہنچ جاتے ہو

اَلھٰکُمُ لفظ لَہوٰ سے بنا ہے لَہو کے معنیٰ کھیل کود، شغل بازی اور غافل کرنے والی چیز کے ہیں۔ تکاثُر کا مطلب یہ ہے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ مال و دولت اور زندگی کے سازوسامان حاصل کرنے کی کوشش میں مست اور مدہوش ہیں اور ان چیزوں کے حصول کے لیے ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں اور مال و دولت، ساز وسامان اور جاہ و حشمت پر فخر جتاتے ہیں۔ پس اَلھٰکُمُ التَّکَاثُر کا مطلب یہ ہے کہ اس تکاثر یعنی مال و دولت جمع کرنے کی دوڑ دھوپ نے لوگوں کو آخرت سے غافل کردیا ہے۔ تکاثر کے معنی محدود نہیں ہیں بلکہ بہت وسیع ہیں۔ دنیا کے تمام فائدے اور منافع، عیش و عشرت کے سامان، دولت واقتدار حاصل کرنے کے زیادہ سے زیادہ وسائل حاصل کرنے کی جدوجہد اور ان چیزوں کو حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش، ان کی کثرت پر فخر جتانا سب اس کے معنی میں شامل ہیں اور لوگ اس تکاثر کے مخاطب ہیں یعنی زیادہ سے زیادہ دنیا حاصل کرنے کی فکر میں فرداً فرداً اور قومی حیثیت سے بھی لگے رہے ہیں۔ اور اس طرح لوگ ہر حیثیت میں غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ وہ خدا سے غافل ہیں آخرت سے غافل ہیں۔ اخلاقی ذمہ داریوں سے غافل ہیں۔ حق داروں کے حقوق ادا کرنے سے غافل ہیں۔ برائیوں کو روکنے کی ذمہ داریوں سے غافل ہیں۔ انہیں اپنی زندگی کے معیار (standard) بنانے کی فکر ہے مگر انہیں اس بات کی کوئی فکر نہیں ہے کہ انسانیت کا معیار گر رہا ہے۔ انہیں زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کی فکر ہے مگر اس بات کی کوئی پرواہ نہیں ہے کہ یہ دولت کن ذرائع سے حاصل ہوئی ہے حلال ذرائع سے یا حرام ذریعوں سے انہیں حلال و حرام کی کوئی تمیز نہیہے۔ انہیں صرف دنیاوی عیش و عشرت لہو لعب، کھیل کود، سیر تماشا اور ہنسی مذاق سے زیادہ دلچسپی ہے۔ اس ہوس ناکی میں غرق ہوکر یہ لوگ اس بات سے بالکل غافل ہیں کہ اس روش کا انجام کیا ہے۔ انہیں مجموعی طور زیادہ سے زیادہ طاقت حاصل کرنے اور زیادہ سے زیادہ فوجیں بنانے اور ہتھیار بنانے کی فکر ہے۔ ان معاملات میں یہ لوگ ایک دوسرے پر برتری حاصل کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ انہیں اس بات کا خیال نہیں ہے کہ یہ سب کچھ خدا کی زمین کو ظلم سے بھر دینے اور انسانیت کو تباہ و برباد کردینے کا سروسامان ہے۔ غرض تکاثر کی بے شمار صورتیں ہیں جنھوں نے اشخاص اور اقوام، سب کو اپنے اندر ایسا مشغول رکھا ہے کہ انہیں دنیا اور اس کے فائدوں اور لذتوں کے علاوہ کسی چیز کا ہوش نہیں ہے۔ مال و دولت کی کثرت، دنیا کے سازوسامان کی حرص آدمی کو پھنسائے رکھتی ہے۔ یہ نہ اسے رب کی یاد آنے دیتی ہے اور نہ آخرت کی

فکر کرنے دیتی ہے۔ اسے شب و روز بس یہی دھن لگی رہتی ہے کہ جس طرح بن پڑے مال ودولت لی بہتات ہو، پھر یہ کہ میرا کنبہ اور میرا جتھا سب کنبوں اور جتھوں پر غالب رہے۔ میری اولاد دوسروں کی اولاد سے زیادہ بہتر ہو۔ میری جاہ و حشمت دوسروں پر چھائی رہے۔ میری حکومت اور میرا اقتدار سب پر قائم رہے۔ میری بالادستی سب پر قائم رہے اور زیادہ سے زیادہ لوگ میری تعریف کرنے میں لگے رہیں۔ ان ہی چیزوں میں مشغول رہ کر انسان اپنے اوقات ضائع کردیتا ہے۔یہاں تک کہ اسے موت آجاتی ہے اور قبر میں پہنچ جاتا ہے اور قبر میں پہنچ کر ہی اسے پتہ لگتا ہے کہ وہ سخت غفلت اور بھول میں پڑا ہوا تھا اور یہ دنیا محض چند روز کی چہل پہل تھی۔ اور موت کے بعد ہی اسے یاد آتا ہے کہ دنیا کا سب سازوسامان اور مال ودولت ہیچ اور وبال جان ہیں۔

موجودہ دور میں کثرت سے مال و دولت حاصل کرنے کی کوشش میں لوگ سرگرمی سے معروف ہیں۔ اور ایک دوسرے پر فخر جتانے میں کوئی کسر نہ چھوڑتے ہیں۔ ان مصروفیات اور مشغولیات نے آج کے انسان کو پریشان کر رکھا ہے۔ ہر کوئی چاہتا ہے کہ میرے پاس دوسروں کی نسبت مال و دولت کی فراوانی ہو کیونکہ وہ مال و دولت اور شہرت کو ہی اپنی عزت کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ جس طرح نزول قرآن کے وقت عربوں کی زندگی میں کثرت مال اور کثرت اولاد کی زبردست اہمیت تھی اور ان ہی دو چیزوں کے بل بوتے پر یہ لوگ اپنی سرداری کا دعویٰ کرتے تھے اور اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتے تھے اور یہی ان کے اثر ورسوخ (influence) کا ذریعہ تھا۔ اسی طرح آج کل کے لوگ مال ودولت جاہ و حشمت اور اقتدار کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں تاکہ سماج میں ان کا اثر ورسوخ بڑھ جائے اور عام لوگوں کو اپنے اثر ورسوخ کے ذریعے ماتحتی کی زندگی گزارنے پر مجبور کرسکیں۔یہی وجوہات ہیں کہ لوگ مال حرام کمانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے ہیں اور روز بروز زندگی کے معیار کے ساتھ ساتھ مال حاصل کرنے کی خواہش بھی بڑھتی جارہی ہے۔ قرآن نے اسے تکاثر کا نام دے کر لوگوں کو خبردار کردیا اور انہیں غفلت کی نیند سے بیدار کردیا۔ کیونکہ تکاثر کی اس دھن نے نہ صرف انسان کو زندگی کے مقصد سے غافل کردیا اور اسے اخلاقی پابندیوں اور ذمہ داریوں سے بے تعلق کردیا بلکہ مال و دولت کی ہوس میں رہ کر وہ تمام فرائض اور ذمہ داریوں کو بھول گیا یہاں تک انسان خدا پرستش کے بجائے معیار زندگی کی پرستش کرنے لگا حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ دنیا سے بے رغبت ہوجا، اللہ تجھ سے پیار کرے گا اور جو کچھ لوگوں کے پاس ہے اس سے بے نیاز ہوجا، لوگوں کے دلوں میں اللہ تیرا احترام پیدا کرے گا لیکن دنیا میں مال و دولت حاصل کرنے کی دوڑ دھوپ اور مال ودولت پر فخر جتانے میں مصروف رہ کر انسان آخرت سے غافل رہ جاتا ہے یہاں تک کہ وہ قبر میں پہنچ جاتا ہے اس حقیقت کو اکبر الہ آبادی یوں بیان کرتے ہیں :

کیا کہیں احباب کیا کار نمایاں کرگئے

بی اے کیا نوکر ہوئے پینشن ملی اور مرگئے

كَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُونَ(۳)

ہرگز نہیں، تمہیں عنقریب معلوم ہوجائے گا

ثُمَّ كَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُونَ(۴)

پھر سن لو! تمہیں عنقریب معلوم ہوجائے گا

انسان کو تاکید کرکے سمجھایا جارہا ہے کہ اے انسان تمہیں یہ غلط فہمی ہے کہ یہ مال ودولت کی کثرت اور اس میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانا ہی ترقی اور کامیابی ہے حالانکہ یہ چیزیں ہرگز ترقی اور کامیابی کے راز نہیں ہیں تمہیں عنقریب اس کا برا انجام معلوم ہوجائے گا اور تم جان لوگے کہ یہ کتنی بڑی غلطی تھی جس میں میں عمر بھر مبتلا رہا۔

بات کو اثرانداز بنانے اور جذبات کو ابھارنے کے لیے آیت کو دوبار دہرایا گیا ہے جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ تمہارا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ مال و دولت، جدید تعلیم سے آراستہ حسن وجمال والے اولاد اور حکومت و اقتدار تک رسائی ہی کام آنے والی چیزیں ہیں ہرگز نہیں تم کو جلد ہی معلوم ہوجائے گا کہ یہ فنا ہونے والی چیزیں تمہیں کچھ کام نہ آئیں گی اور یہ چیزیں فخر و غرور کے لائق نہیں ہیں۔ دوبارہ غور کرلو کہ آخرت ایسی چیز نہیں ہے جس سے انکار کیا جائے یا غفلت برتی جائے آگے چل کر تمہیں معلوم ہوجائے گا کہ اصل اور آرام وسکون کی زندگی آخرت کی زندگی ہے اور دنیا کی زندگی اس کے مقابلہ میں ایک خواب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ حقیقت کا تھوڑا بہت راز بعض انسانوں پر دنیا میں کھل جاتا ہے لیکن قبر میں پہنچ کر اور اس کے بعد حشر کے دن سب پر پوری طرح یہ راز کھل جائے گا اسے معلوم ہوجائے گا کہ اس نے دنیا میں مال ودولت حاصل کرنے کے لیے ہر کوئی طریقہ اپنا لیا۔ اسے اب سمجھ میں آئے گا کہ

یہ مال ودولتِ دُنیا، یہ رشتہ وپیوند

بتان وہم وگمان لااِلٰہ الااللہ

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ(۵)

دیکھو! اگر تمہیں یقینی علم کی حیثیت سے (اس روش) کا انجام معلوم ہوتا تو تم ہرگز ایسا نہ کرتے

لَتَرَوُنَّ الۡجَحِيۡمَ(٦)

جان لو تم ضرور جہنم کو دیکھو گے

ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيۡنَ الۡيَقِيۡنِ(٧)

پھر تم ضرور اسے یقین کی آنکھ سے دیکھو گے

ثُمَّ لَتُسۡـَٔلُنَّ يَوۡمَئِذٍ عَنِ النَّعِيۡمِ(٨)

پھر ضرور اس دن تم سے ان نعمتوں کے بارے میں باز پرس ہوگی

دیکھو اگر تمہیں یقینی علم کی حیثیت سے اس روِش کا انجام معلوم ہوتا

تو تم ہرگز ایسا نہ کرتے:

یعنی اگر خدا کے بندے اپنی زندگی کی حقیقت کو یقین کے ساتھ جان لیتے تو وہ دنیا کے حقیر مفادات کے لیے ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے اور سبقت لینے کی بیماری میں مبتلا نہ ہوتے۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے مخاطب ہے کہ تم لوگوں نے مال ودولت کی کثرت، حکومت وعہدہ داری، عیش و عشرت، کھیل تماشے اور ناچ نغموں کو زندگی کا اصل ہدف بنایا اس لیے تم قیامت اور آخرت کے جزا و سزا کو بھول گئے ہو اور تم کو نہ ان حقائق پر یقین رہ گیا اور نہ ان پر غور کرنے کی زحمت گوارا کرتے ہو۔ روزانہ کے اموات اور حادثات دیکھنے کے باوجود تم کو اپنے طرز عمل پر نظرثانی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اس لی وجہ یہ ہے کہ تمہیں یقین نہیں آرہا ہے کہ کبھی قیامت برپا ہوگی اور اس دنیا اور دنیوی زندگی کا خاتمہ ہوجائے گا جس کے نتیجہ میں زندگی کا ایک دوسرا عالم، یعنی آخرت وجود میں آئے گی جہاں تمہیں ہر عمل کا حساب دینا ہوگا۔ اگر تمہیں ان باتوں پر یقین آتا تو تمہارے دلوں اور تمہاری آنکھوں کے سیاہ پردے چاک ہوجاتے اور تم غفلت کی نیند سے بیدار ہوجاتے کیونکہ یقین ہی وہ سرمایہ ہے جو انسان کو حقیقت کے بام عروج پر پہنچا دیتا ہے۔

یقین افراد کا سرمایۂ تعمیر ملت ہے

یہی قوت ہے جو صورت گر تقدیر ملت ہے

جان لو تم ضرور جہنم کو دیکھو گے، پھر تم ضرور اسے یقین کی آنکھ سے دیکھو گے:

یعنی اس غفلت، بے یقینی اور انکار آخرت کا نتیجہ دوزخ ہے جو تم کو ضرور دیکھنا پڑے گا۔ اس کے شعلے وقتاً فوقتاً تم کو برزخ میں بھی نظر آئیں گے اور آخرت میں پوری طرح دیکھ کر تم کو عین الیقین ہوجائے گا مطلب یہ ہے کہ تم اقرار کرو یا انکار حقیقت یہ ہے کہ تم جہنم کو ایک نہ ایک دن اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے۔ کافر اور مومن دونوں اسے بچشم خود دیکھ لیں گے۔ لیکن دونوں کے دیکھنے میں ایک بڑا فرق ہوگا۔ کافر لوگ اسے اپنے گھر اور ٹھکانے کی حیثیت سے دیکھیں گے اور ان کا ظن و گمان یقین میں بدل جائے گا کہ انہیں اب ہمیشہ کے لیے اسی گھر میں ٹھہرنا ہے۔ مومن بھی اپنے ٹھکانے جنت کو پہچان لیں گے اور ان کے ایمان اور یقین میں اضافہ ہوجائے گا۔ لیکن وہ بھی سرسری طور جہنم کو دیکھ لیں گے ۔ وہ اپنے اپنے عملوں کے درجوں کے لحاظ سے اسے دیکھیں گے کچھ تو بجلی کی طرح گزرجائیں گے کچھ آواز کی رفتار کی طرح اور کچھ پرندے کی پرواز کی طرح گزر جائیں گے ۔ اس طرح دونوں مومن اور کافر کو جہنم دکھایا جائے گا لیکن دونوں کے دیکھنے میں فرق ہوگا۔

پھر ضرور اس دن تم سے ان نعمتوں کے بارے میں باز پرس ہوگی

قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی نعمتوں کے بارے میں مومن اور کافر کی جوابدہی ہوگی۔ ہر ایک سے سوال کیا جائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں بندوں کو دی ہیں ان کے بارے میں مومن اور کافر سب کو جواب دینا ہوگا۔ یعنی جن لوگوں نے کفران نعمت نہیں کیا بلکہ شکرگزار بن کر رہے اور جن لوگوں نے اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا نہ کیا بلکہ ان کو اپنے ہاتھ کی کمائی سمجھا اور ان کا حق ادا نہ کیا دونوں کو خدا کی بارگاہ میں ان نعمتوں کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ پوچھا جائے گا کہ تم نے ان نعمتوں کو حلال ذریعوں سے کمایا اور پھر خدا کا شکر ادا کیا یا ان نعمتوں کو حرام ذریعوں سے حاصل کیا اور پھر خدا کا ناشکرا بن کر بیٹھا۔ کیا خدا کی دی ہوئی ان نعمتوں میں سے سائل اور محروم کا حق ادا کیا یا نہیں۔ ان سب کے بارے میں تم سے جواب طلب کیا جائے گا۔

حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے ہم نے آپؐ کو تر وتازہ کھجوریں کھلائیں اور ٹھنڈا پانی پلایا اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ ان نعمتوں میں سے ہیں جن کے بارے میں تم سے سوال کیا جائے گا۔

حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے ہمراہ ابن التہیا کے نخلستان میں تشریف لے گئے انہوں نے کھجوروں کا ایک خوشہ پیش کردیا۔ حضورؐ نے فرمایا تم نے کھجوریں توڑ کر کیوں نہیں لائیں؟ انہوں نے عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ حضرات خود چھانٹ چھانٹ کر کھجوریں تناول فرمائیں۔ چنانچہ انہوں نے کھجوریں کھائیں اور ٹھنڈا پانی پیا تو فارغ ہونے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے یہ ان نعمتوں میں سے ہے جن کے بارے میں تمہیں قیامت کے روز جواب دہی کرنی ہوگی۔ ان احادیث سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ سوال صرف کافروں سے ہی نہیں کیا جائے گا بلکہ مومنوں سے بھی کیا جائے گا اور یہ کہ خدا نے اپنے بندوں کو جو نعمتیں عطا کیں وہ لامحدود ہیں ان کا شمار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ قرآن میں اس کا ذکر ہے:

وَاِنۡ تَعُدُّوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ لَا تُحۡصُوۡھَا۔ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گنو تو تم اُن کا پورا شمار نہیں کرسکتے۔ (ابراہیم:۳۴)

ان نعمتوں میں کچھ نعمتیں وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ نے براہ راست انسان کو عطا فرمائی ہیں اور کچھ نعمتیں وہ ہیں جو انسان کو کسب کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہیں۔ ان دونوں صورتوں میں حاصل ہونے والی نعمتوں کے متعلق اس کو جواب دہی کرنی پڑے گی کہ اس نے ان کو کن طریقوں سے حاصل کیا اور کن راستوں پر خرچ کیا اور اسے یہ بھی بتانا پڑے گا کہ آیا اس نے ان نعمتوں کا شکر ادا کیا یا یہ سمجھا تھا کہ یہ سب کچھ اسے اپنی محنت سے مل گیا اور اسے شکر کرنے کی کیا ضرورت تھی یا یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ اسے یہ نعمتیں کسی اور کی وساطت سے حاصل ہوئی ہیں جسے اُس نے اپنا معبود ٹھہرایا تھا اور ان کا شکر ادا کیا تھا یا منکر خدا بن کر خدا کی تمام نعمتوں کو اپنی محنت کی پیداوار سمجھ کر خدا کا ناشکرا بن گیا۔

اس سورہ میں نعمتوں کے سلسلے میں جس باز پرس کا ذکر ہے بہت سی صحیح احادیث میں اس کی تفصیل مذکور ہے اس میں سے ایک مختصر مگر جامع حدیث وہ ہے جسے امام ترمذیؒ نے صحیح سند سے روایت کیا ہے:

اُس کی عمر کے بارے میں کہ اُسے کس مقصد میں فنا کیا۔ اُس کے علم کے بارے میں کہ کس حد تک اُس پر عمل کیا۔ اُس کے مال کے بارے میں کہ کہاں اسے کمایا اور کہاں اُسے خرچ کیا۔ اور اس کے بدن کے بارے میں کہ اُسے کس مقصد میں لگا کر فرسودہ کیا۔

سُوْرَۃُ الْعَصْرِ

آیاتُھا: 3 رُکُوعُھَا: 1

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

وَالْعَصْرِ o اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ o اِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ o

پس منظر:

روایت میں یہ ہے کہ جب حضرت ابو بکرؓ نے اسلام قبول کیا تو اس کے دوست نے ان سے کہا کہ تمہاری قابلیت اور دانشمندی کی داد پوری قوم دیتی ہے اور تجارت اور کاروبار میں تمہارے برابر کوئی نہیں ہے پھر بھی آپ نے محمدؐ کا دین قبول کیا اور اس کے خدا کی عبادت کرنے لگے اور اپنے آپ کو خسارے میں ڈال کر اپنا نقصان کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا کہ جو شخص حق کو قبول کرتا ہے اور اس پر ثابت قدم رہتا ہے اور صبر کی تلقین کرتا ہے وہ ہرگز خسارے میں نہیں ہے۔ اس پر یہ سورت نازل ہوئی اور حضرت ابوبکرؓ کے قول صِدق کی تصدیق ہو گئی۔ لیکن سورہ کو وسیع نظر سے دیکھا جائے اور قلب سلیم سے پرکھا جائے تو یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ تین آیات پر مشتمل یہ چھوٹی سی سورت انسانی زندگی کا کامل نظام اور روشن دستور پیش کرتی ہے جس میں ایمان، عمل صالح، حق کی پہچان اور صبر کی تلقین کی ایک عظیم اور جامع حقیقت واضح ترین صورت میں بیان کی گئی ہے۔ ان چند چھوٹے جملوں میں جس کامل اسلامی دستور دُنیا اور نظام حیات کا ذکر ہے اس کے سوا جتنے بھی نظام اور دستور

دنیا میں موجود ہیں ان سب میں انسان کے لیے نقصان، خسارہ اور تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ پس یہ سورت جامع اور مختصر کلام کا بے نظیر نمونہ ہے۔ اس کے اندر چند جچے تُلے الفاظ میں معنی کی ایک دنیا بھر گئی ہے۔ اس سورہ میں دوٹوک الفاظ میں انسان کی فلاح کا راستہ اور اس کی تباہی وبربادی کا راستہ بتادیا گیا ہے۔ اس سورہ کے متعلق امام شافعی نے کہا ہے کہ اگر لوگ اس سورہ پر غور کریں تو یہی ان کی ہدایت کے لیے کافی ہے۔ روایت کے مطابق جب دو آدمی ایک دوسرے سے ملتے تو اس وقت تک جدا نہ ہوتے جب تک ایک دوسرے کو سورہ عصر نہ سناتے ۔ (طبرانی)

وَالۡعَصۡرِ(۱)

قسم ہے زمانے کی

اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ(۲)

یقینا انسان خسارے میں ہے

اِلَّا الَّذِیۡنَ آمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ(۳)

سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔

قسم ہے زمانے کی

بعض مفسرین نے عصر کی قسم سے وہ زمانہ مراد لیا ہے جس میں ایک انسان اپنی عمر کو پورا کرتا ہے۔ بعض نے اس سے نماز عصر مراد لیا ہے اور وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ نماز عصر کا وقت کاروباری دنیا میں خاص مشغولیت کا وقت ہے جس میں نماز ادا کرنے میں غفلت ہو سکتی ہے اس لیے اس نقطۂ نظر سے نماز عصر کا وقت نہایت فضیلت کا وقت ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی قسم کھائی ہے ایک اور تفسیر کے مطابق یہ محمدؐ کے زمانے کی قسم ہے جس زمانے میں دین اسلام روشن ہوا اور خدا کی وحدانیت کی پہچان ہوئی۔ سورہ میں زمانے کی قسم کھائی گئی ہے کہ انسان خسارے میں ہے اور اس خسارے سے صرف وہ لوگ بچے ہوئے ہیں جن کے اندر چار صفتیں پائی جاتی ہیں:

(۱) ایمان (۲) عمل صالح (۳) ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرنا (۴) اور صبر کی تلقین کرنا

ان چار صفات پر غور کرنے سے پہلے اس بات پر غور کرنا ضروری ہے کہ اس سورہ میں انسان کو مخاطب کرکے فرمایا گیا ہے کہ انسان خسارے میں ہے لیکن یہاں صرف ایک انسان کا ذکر نہیں ہے بلکہ جنسِ انسان کا تذکرہ ہے۔ یعنی دنیا کے تمام انسان خسارے میں ہیں سوائے اُن کے جن میں وہ چار صفتیں موجود ہوں جن کا ذکر سورہ کی آیت نمبر تین میں ہے۔ زمانہ کی قسم اس لیے کھائی گئی ہے کیونکہ زمانہ اس حقیقت پر گواہ ہے کہ انسان بڑے خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جن میں یہ چار صفات موجود ہوں۔ ایمان، عمل صالح، حق کی تلقین اور صبر کی تاکید۔

انسان کی زندگی ازمنہ ثلاثہ یعنی تین زمانوں پر مشتمل ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل اس لیے یہاں بھی زمانہ سے تینوں زمانے مراد ہیں۔ ایک وہ زمانہ ہے جو گزرا ہوا ہے یعنی جس کے لوگ موجود نہیں ہیں۔ وہ ماضی میں چلے گئے ہیں۔ دوسرا وہ زمانہ ہے جو موجودہ لوگوں کا زمانہ ہے یعنی زمانہ حال جس میں لوگ اپنی سرگرمیوں میں مشغول ہوتے ہیں۔ تیسرا ان لوگوں کا زمانہ ہے جو دنیا میں آنے والے ہوتے ہیں اور دنیا کی زندگی کے سفر میں شامل ہوجاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان تینوزمانوں کی قسم کھائی ہے۔ زمانہ حال میں لوگ امتحان دینے والے امیدواروں کی طرح ہوتے ہیں جن کو امتحان دینے کے لیے ایک مقررہ وقت دیا جاتا ہے تاکہ وہ اس دوران پڑھائی کرکے امتحان میں کامیاب ہوجائیں اور جو امیدوار پوری محنت سے صحیح پڑھائی کرکے امتحان میں شامل ہوجاتے ہیں وہ کامیاب ہوجاتے ہیں اور ان کی صحیح پڑھائی اور صحیح طریقہ کار اور محنت و مشقت رنگ لاتی ہے۔ اس کے برعکس جو امیدوار امتحان کے لیے دئے گئے مقررہ وقت کا صحیح استعمال نہیں کرتے ہیں اور لاپرواہی کرکے پڑھائی کی طرف دھیان نہیں دیتے ہیں وہ امتحان میں ناکام ہوجاتے او رپھر اپنی ناکامی کے نتیجہ پر پچھتاتے ہیں اور اس طرح وہ خسارے میں پڑ جاتے ہیں۔یہی حال دنیا میں آنے والے انسانوں کا ہے جو لوگ عمل کرنے کے لیے دیئے گئے وقت کا صحیح استعمال کرتے ہیں، وہی لوگ کامیاب ہوجاتے ہیں اور وہی نیک اعمال کرنے والے اللہ کے ہاں بلند مرتبہ پاتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ آرام طلبی میں مبتلا ہوکر اپنی ذمہ داری او رنیک اعمال سے مُنہ موڑتے ہیں خدا کی بندگی سے غافل ہوجاتے ہیں اور اس کی نافرمانی کرتے ہیں وہ دوسری زندگی کے معاملے میں ناکام ہوجاتے ہیں۔ وقت جس تیز رفتاری کے ساتھ گزر رہا ہے اس کا اندازہ روشنی کی رفتار سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک سکنڈ میں روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کا فاصلہ طے کرتی ہے اگر ہم وقت کے گزرنے کی تیز رفتاری پر غور کریں گے تو ہمیں خود بخود احساس ہوجائے گا کہ زندگی کے لمحات کتنے اہم ہیں جب وقت کے ایک سیکنڈ میں روشنی اتنا لمبا سفر کرتی ہے تو وقت کے اس رفتار کے لحاظ سے نیک انسان ایک سیکنڈ میں نیکیوں کے میدان میں کتنا آگے بڑھ سکتا ہے اور برائی کرنے والا اپنی برائیوں میں کتنا اضافہ کرتا ہے۔

لہٰذا غفلت میں پڑے ہوئے لوگوں کو اس بات کا احساس دلایا جارہا ہے کہ تم اگر یونہی غفلت میں پڑے رہو گے اور تیزی کے ساتھ گزرنے والے لمحات کی قدر نہ کروگے تو تمہیں پتہ بھی نہ لگ جائے گا کہ پھر کب موت نے تم لوگوں کو اپنے ٹھکانے پر پہنچا دیا ! اس وقت تمہیں سوچنے اور پچھتانے کا کوئی موقع نہ ہوگا سوائے اس کے کہ تم لوگ اپنے آپ کو عالم برزخ میں پاؤگے اور پھر پورے جسم کے ساتھ قیامت کے روز بارگاہ الٰہی میں حاضر کردئے جاؤ گے اور اپنے اعمال کی جزا و سزا پاؤ گے۔

امام رازی کا قول ہے کہ میں نے سورہ عصر کا مطلب ایک برف فروش سے سمجھا جو بازار میں اونچی آواز میں لوگوں کو پکار رہا تھا کہ رحم کرو مجھ پر میری برف خریدو لو، میری برف تیزی سے گھل رہی ہے رحم کرو مجھ پر میری برف خرید لو۔ اُس کی بات سن کر مجھے سورہ عصر کی یہ آیت یاد آئی۔ وَالۡعَصۡرِ o اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍo زمانے کی قسم بے شک انسان خسارے میں ہے میں نے سمجھا کہ زمانہ انسان کے ہاتھ سے اس طرح بھاگ رہا ہے جس طرح اس یخ فروش کا یخ تیزی سے پگل رہا ہے اگر پگھلنے سے پہلے اس کا یخ استعمال نہ کیا گیا تو یہ اس طرح ہاتھ سے چلا جائے گا جس طرح زمانہ انسان کے ہاتھ سے تیز رفتاری سے چلا جاتا ہے۔

یقینا انسان خسارے میں ہے

گزرتے ہوئے زمانے کی قسم کھا کر جو بات اس سورہ میں کہی گئی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ تیز رفتار زمانہ اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ انسان اگر وقت کی تیز رفتاری کے ساتھ چل کر خدا کی بندگی پر قائم نہ رہے تو وہ خسارہ میں پڑجائے گا۔ خسارے سے مراد تجارت کا خسارہ یا کوئی دوسری صورت کا مادی خسارہ نہیں ہے بلکہ اس سے مراد اُس تجارت کا خسارہ ہے جس کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔ یعنی خدا کی بندگی اور اس کی فرمانبرداری۔ لیکن یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ آخرت کی کامیابی کا انحصار بھی بسا اوقات دنیا کی کامیابی پر ہے، جب انسان دنیوی کاموں میں اپنے خالق کی نگرانی میں ایمان داری سے اپنے فرائض انجام دے اور اس کی بندگی اور فرمانبرداری کرے تو یہ دنیا میں اس کی بڑی

کامیابی ہے اسی میں اس کے لیے آخرت کی کامیابی کا راز ہے کیونکہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے جو کچھ انسان دنیا میں کمائے وہی آخرت میں کام آئے گا۔

جیسا کہ عرض کیا جاچکا کہ انسان کی کامیابی اور خسارے سے کسی ایک انسان کی کامیابی اور خسارہ مراد نہیں ہے بلکہ اس سے سب انسانوں کی کامیابی اور خسارہ مراد ہے۔ اس کا اطلاق افراد، گروہوں، قوموں اور پوری نوع انسانی پر یکسان ہے۔ اگلی آیت میں انسان کی جو چار صفتیں بیان کی گئی ہیں جن کی بدولت انسان خسارے سے بچے گا، اس کے لیے صیغہ واحد کے بجائے جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔

سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے

قران مجید نے جو دعویٰ کیا ہے کہ دنیا کے سارے انسان خسارے میں ہیں سوائے ان لوگوں کے جن میں یہ چار صفات ہیں۔ ایمان، عمل صالح، حق کی نصیحت کرنا، صبر کی تلقین کرنا۔ ان صفات میں پہلی صفت ایمان ہے جو دین کی بنیاد ہے۔ ایمان محض زبانی اقرار کا نام نہیں ہے بلکہ ایمان سچے دل سے یقین کے ساتھ اللہ، اس کے رسول اور اس کی لائی ہوئی ہدایت دین اسلام کو تسلیم کرنے کا نام ہے۔ سورہ 'حجرات' میں سچے دل سے ایمان لانے کا ذکر ہے۔ ''مومن تو حقیقت میں وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور شک میں نہ پڑے'' (الحجرات:۱۵) سورہ النسا میں فرمایا گیا ہے ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر'' یہاں ایمان لانے کے بعد واضح کردیا گیا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ جس کا مطلب یہ ہے کہ زبانی اقرار سے ایمان لانا ہی ایمان نہیں ہے بلکہ ایمان وہ ہے جس کا زبان سے اقرار کیا جائے اور دل سے اس کی تصدیق کی جائے اور اس حقیقت پر بھی ایمان لایا جائے کہ رسول، اللہ کی طرف سے ہدایت لے کر آئے ہیں۔

قرآن و حدیث کی روشنی میں جن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے اور جن سے مومن کو آخرت میں پذیرائی حاصل ہوگی اور جنت کا وارث بنے گا وہ اس طرح ہیں۔

(۱) اللہ کو ایک خدا کی حیثیت سے ماننا کہ اس کی خدائی میں کوئی شریک نہیں ہے وہی عبادت، اطاعت

اور پرستش کے لائق ہے۔ وہی انسانوں کی تقدیر بنانے والا اور بگاڑنے والا ہے وہی ہے جس سے دعا مانگی جائے وہی دعاؤں کو قبول کرتا ہے اور اسی پر زندگی کے ہر معاملہ میں توکل کرنا چاہیے جس چیز سے اُس نے منع کیا ہو اس سے دور رہنا چاہیے اور جس چیز کا اس نے کرنے کا حکم دیا ہو اس کی تعمیل کرنی چاہیے۔ خدا پر ایمان لانے کی تصویر کشی مولانا حالیؒ نے اس طرح کی ہے۔ ؎

کہ ہے ذات واحد عبادت کے لائق

زبان اور دل کی شہادت کے لائق

اسی کے ہیں فرمان اطاعت کے لائق

اسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق

لگاؤ تو لَو اپنی اُس سے لگاؤ

جھکاؤ تو سر اس کے آگے جھکاؤ

اسی پر ہمیشہ بھروسہ کرو تم

اسی کے سدا عشق کا دم بھرو تم

اسی کے غضب سے ڈرو گر ڈرو تم

اسی کی طلب میں مرو جب مرو تم

مبرا ہے شرکت سے اس کی خدائی

نہیں اس کے آگے کسی کی بڑائی

(۲) رسول کو اس حیثیت سے ماننا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا ھادی اور رہنما ہے۔ جس چیز کی رسول نے تعلیم دی وہ اللہ کی طرف سے ہے جو برحق اور واجب التسلیم ہے۔ قرآن کو مُنزَّل من اللہ ماننا اور اللہ کی آخری کتاب کی حیثیت سے تسلیم کرنا۔

(۳) آخرت کو اس حیثیت سے ماننا کہ موت زندگی کا خاتمہ نہیں ہے، بلکہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنا ہے اور اپنے اعمال کا حساب دینا ہے اور جو لوگ نیک قرار پائیں گے انہیں اپنے نیک اعمال کی جزا ملے گی اور غلط کاروں کو ان کی بدیوں کی سزا دی جائے گی۔

ایمان ایک ایسا طرز فکر ہے جو انسان کے لیے ایک محرک اور متحرک منزل متعین کرتا ہے۔ اسی لیے قرآن ہر اس عمل کو بے وقعت اور بے قیمت قرار دیتا ہے جس کی بنیاد ایمان پر نہ ہو۔ یعنی عمل کا تعلق ایمان سے ہے اگر عمل کو ایمان سے الگ کردیا جائے تو اس عمل کا کوئی وزن نہیں کیونکہ ایمان سے ہی عمل کو وجود ملتا ہے اور اسے وہ منزل حاصل ہوتی ہے جو انسان کی زندگی میں رنگ لاتی ہے۔ ایمان بجائے خود ایک متحرک حقیقت ہے جو نہی یہ حقیقت دل میں پیوست ہوتی ہے تو بذات خود عمل صالح کی صورت نمودار ہوتی ہے۔

اعمال صالحہ ایمان کے بعد دوسری صفت ہے جو انسان کو خسارے سے بچاتی ہے۔ اعمال صالحہ کے بغیر ایمان نامکمل ہے اور اس کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ اس کے بغیر انسان اس گاڑی کی طرح ہے جسے چلنے کے لیے ایندھن نہیں ہے اور وہ بے کار رکی پڑی ہے۔ قرآن کی رُو سے کوئی بھی عمل اس وقت تک عمل صالح نہیں بن سکتا ہے اور نہ وہ اللہ تعالیٰ کو قبول ہے جب تک اس عمل میں ایمان نہ ہو۔ یعنی جب تک وہ عمل اللہ کی ہدایت اور رسول کی پیروی میں نہ ہو اس لیے قرآن مجید میں جگہ جگہ عمل صالحہ سے پہلے ایمان کا ذکر آیا ہے اور ایمان وہی معتبر ہے جس کا ثبوت انسان اپنے عمل سے پیش کرے ورنہ ایمان بغیر عملِ صالح محض ایک دعویٰ ہے۔

حق اور صبر کی تلقین

ایمان لانے والوں کو عمل صالحہ کے بعد حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کو حق پر چلنے کی نصیحت کریں اور مشکلات میں صبر سے کام لیں انہیں مسلم معاشرے میں رہ کر ایک دوسرے کی ہمدردی اور فکر ہونی چاہیے کہ اسلام کی دعوت معاشرے کے ہر فرد تک کس طرح پہنچائیں ۔ مسلم معاشرے میں ایک دوسرے کی مشکلیں حل کرنا ہر فرد کی ذمہ داری ہے راہ ہدیٰ اور دین اسلام پر چل کر جو بھی تکلیفیں پہنچیں ان پر ایک دوسرے کو صبر کرنے کی تلقین کریں۔ مسلم معاشرے کے سب افراد پر ذمہ داری عائید ہوتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کریں۔

حق باطل کی ضد ہے صحیح و سچی، عدل و انصاف اور حقیقت پر مبنی بات کو حق کہتے ہیں خواہ یہ بات عقیدہ و ایمان سے تعلق رکھتی ہو یا دنیا کے معاملات سے، بہرحال حق بات کی ایک دوسرے کو نصیحت کرنا مسلمانوں کی اہم ذمہ داری ہے۔ اسی طرح ان حقوق کو ادا کرنے کی ذمہ داری بھی مومنوں پر ڈالدی گئی ہے۔ جن میں خدا کے حقوق، بندوں کے حقوق اور ان کے اپنے نفسوں کے حقوق شامل ہیں۔ ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان کا یہ معاشرہ ایسا بے حس نہ ہوکہ اس میں باطل سر اٹھا رہا ہو اور حق کے خلاف کام ہورہا ہے مگر لوگ خاموشی سے تماشا دیکھ رہے ہوں۔ بلکہ معاشرے میں دین کی تبلیغ اور تلقین جاری وساری رہے کہ جب اور جہاں بھی باطل سر اٹھائے کلمہ حق کہنے والے اس کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوں اور معاشرے کا ہر فرد صرف بذات خود حق پرستی، عدل و انصاف اور حقوق کی پاسداری پر قائم رہنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ دوسروں کو بھی اس طرز عمل پر چلنے کی نصیحت کرے۔ یہ وہ خوبی ہے جو معاشرے کو اخلاقی زوال اور بحران سے بچانے کی ضامن ہے اگر یہ روح کسی معاشرے میں موجود نہ ہو تو وہ خسارے سے بچ نہیں سکتا ہے اوراس خسارے میں وہ لوگ بھی مبتلا ہوجاتے ہیں جو اپنی جگہ حق پر قائم ہوتے ہیں۔ مگر اپنے معاشرے میں حق و باطل کی کشمکش میں خاموش تماشائی رہتے ہیں۔ یہی بات سورہ مائدہ میں فرمائی گئی ہے۔ کہ بنی اسرائیل کے سرپھروں پر حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ کی زبان سے لعنت کی گئی اور اس لعنت کی وجہ یہ تھی کہ ان کے معاشرے میں گناہوں اور زیادتیوں کا ارتکاب عام ہورہا تھا اور لوگوں نے ایک دوسرے کو برے افعال سے روکنا چھوڑ دیا تھا۔ (آیات:۷۸- ۷۹) سورہ اعراف میں فرمایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے جب کھلم کھلا سَبت کے احکام کی خلاف ورزی کرکے مچھلیاں پکڑنی شروع کردیں تو ان پر عذاب نازل کردیا گیا اور اس عذاب سے صرف وہی لوگ بچائے گئے جو اس گُناہ سے روکنے کی کوشش کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یعنی نیکیوں کا حکم دینا اور بدیوں سے روکنا امت مسلمہ کا فریضہ قرار دیا ہے۔ (آل عمران:۱۱۰) اور اس امت کو بہترین امت قرار دیا جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دے۔ (آل عمران: ۱۰۴)

اہل ایمان اور ان کے معاشرے کو خسارے سے بچانے کے لیے حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کو لازمی شرط قرار دیا گیا ہے جب معاشرے کے افراد ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہیں گے تو معاشرے کو بگڑنے کا کوئی اندیشہ نہیں رہتا ہے اس لیے مومنوں سے کہا گیا ہے کہ حق کی پیروی اور اس کی حمایت میں جو مشکلات پیش آتی ہیں اور جن تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک دوسرے کو ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتے رہیں اور مسلم معاشرے کا ہر فرد دوسرے کی ہمت باندھتا رہے۔

تواصی بالحق اور تواصی بالصبر امت مسلمہ کا پرچم ہے اسی سے امت کا تشخص اور باہمی ربط برقرار رہتا ہے۔ اسی پرچم کے زیر سایہ ایمان باللہ اور عمل صالح کی تحریک چلائی جاسکتی ہے اور اسی پرچم کو اونچا کرنے سے مسلمانوں کو امتیازی خصوصیت حاصل ہوجاتی ہے اور اسی کے سایہ میں نوع انسانی کو ایمان اور عمل صالح کی دعوت دی جاسکتی ہے اور حق و صبر کے لیے باہمی تلقین وتاکید ہی ملت کی امانت کا بار اٹھانے میں معاون و مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔ حق و صبر کی تحریک سے دلوں میںیہ احساس ابھرتا ہے کہ سب کی منزل ایک ہے سب کی سمت سفر ایک ہے سب ایک دوسرے پر اعتماد اور بھروسہ کرتے ہیں۔ سب ایک دوسرے کو حق پر استقامت کا زاد راہ فراہم کرتے ہیں یہ سب چیزیں امت مسلمہ یعنی مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہیں اور اس کے بغیر اسلام زندہ نہیں رہ سکتا ہے۔ مسلمانوں میں حق و صبر کی یہ تحریک موجود نہ ہوتو پھر وہ خسران اور نقصان میں ہیں۔

سُوۡرَةُ الۡهُمَزَة

آیٰتُھَا:9 رکوعُھَا:1

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

وَيۡلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِۨ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ يَحۡسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخۡلَدَهُ كَلَّاۖ لَيُنۢبَذَنَّ فِي الۡحُطَمَةِ وَمَا أَدۡرَاكَ مَا

الْحُطَمَةُ o نَارُ اللهِ الْمُوقَدَةُ o الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ o إِنَّهَا عَلَيْهِم مُّؤْصَدَةٌ o فِي عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ o

تعارف:

اس سورہ میں چند ایسی اخلاقی برائیوں کی مذمت کی گئی ہے جو عرب کے معاشرے کے مالدار طبقے میں خصوصاً پائی جاتی تھیں۔ سورہ میں معاشرے کے ان حالات کی عکاسی کی گئی ہے جن سے ابتدائی دور میں دعوت حق دوچار تھی۔ حالانکہ لوگ جانتے تھے کہ ان کے معاشرے میں بہت سی برائیاں موجود ہیں لیکن کوئی بھی شخص ان برائیوں کے خلاف لب کشائی کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔

چونکہ اس طرح کے حالات ہر سماج میں ہوتے ہیں جہاں مالدار لوگ غریبوں، مسکینوں اور پسماندہ طبقات کو نیچی نظروں سے دیکھتے ہیں اور اپنے مال و دولت کے نشے میں مدہوش ہوکر ان کو اکثر ستاتے رہتے ہیں۔ سرمایہ داری کے نشے میں چُور یہ لوگ دین پسند اور آخرت کا خوف رکھنے والوں کو بے وقوف اور نادان بے وقعت اور حقیر سمجھتے ہیں۔ ان حالات کے پیش نظر ان کمینہ خصلت لوگوں کو عار دلانے کے لیے یہاں ایک کمینے بد خصلت اور کم ظرف انسان کی تصویر کھینچی گئی ہے کہ ایسے انسان کو جب دولت ملتی ہے تو وہ اس پر مار خزانہ بن کر بیٹھ جاتا ہے اور خیال کرنے لگتا ہے کہ زندگی میں دولت ہی سب سے زیادہ قدو و قیمت کی چیز ہے جس کے سامنے اخلاق، تہذیب، ہمدردی، مروت، انسان دوستی، محبت و شفقت، خدا شناسی، شرم و حیا، پاکیزگی سب بے وقعت اور بے معنی ہیں اس لیے یہ لوگوں کی بے عزتی کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ دولت ایک ایسی دیوی ہے جو سب کچھ کر سکتی ہے وہ دولت کا پجاری بن جاتا ہے اس کا اٹھنا، بیٹھنا، کام کرنا، رشتہ جوڑنا، کلام کرنا اور عزت و احترام کرنا سب کچھ دولت کے پیش نظر ہوتا ہے۔ خدا کی بندگی، آخرت، جنت جہنم، قیامت اور حساب و کتاب یہ سب کچھ اس کے نزدیک پرانے قصے اور کہانیاں ہوتی ہیں وہ صرف دولت گن گن کر رکھتا ہے۔ اس پر فخر کرتا ہے اور اس کی محبت میں گرفتار ہوتا ہے اس وجہ سے اس کے وجود میں ایک خبیث ذہنیت نشو ونما پاتی ہے اور اسے انسانوں سے کوئی ہمدردی نہیںہوتی ہے اور نہ وہ کسی کی عزت کرتا ہے وہ صرف لوگوں کو طعن دیتا ہے اور ان کی برائیاں بیان کرنے کا خوگر ہوتا ہے۔ سورہ میں تمام نوع انسانی کو متنبہ کیا گیا ہے کہ جو لوگ اس طرح کی حرکت اور کام میں ملوث ہیں اگر وہ باز نہ آئیں تو ان کو آخرت میں جہنم کی آگ میں جھونک دیا جائے گا۔

وَيۡلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ(۱)

تباہی ہے اس شخص کے لیے جو (منہ درمنہ) طعنے دینے اور (پیٹھ پیچھے) برائیاں کرنے کا خوگر ہے

الَّذِىۡ جَمَعَ مَالاً وَعَدَّدَهٗ(۲)

جو مال جمع کرتا ہے اور اسے گن گن کر رکھتا ہے

يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ(٣)

وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا

كَلَّا لَيُنبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ(٤)

ہرگز نہیں وہ حُطمہ میں پھینک دیا جائے گا

وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَةُ(٥)

اور تم کیا جانو وہ حطمہ کیا ہے

نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ(٦)

اللہ کی دہکائی ہوئی آگ

الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ(٧)

جو دلوں تک پہنچ جائے گی

إِنَّهَا عَلَيْهِم مُّؤْصَدَةٌ(٨)

بے شک وہ ان پر ڈھانک کر بند کی جائے گی

فِیۡ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ(۹)

اونچے اونچے ستونوں میں

تباہی ہے اُس شخص کے لیے جو(منہ درمنہ) طعنے دینے اور (پیٹھ پیچھے) برائیاں کرنے کا خوگر ہے

بعض مترجمین کے نزدیک ھُمزہ اور لمزہ ہم معنی ہیں لیکن بعض ان دو الفاظ میں فرق کرتے ہیں کہ ہمزہ کا معنی روبرو برائی کرنا اور لمزہ کا معنی پیٹھ پیچھے غیبت کرنا ہے۔ بعض یہ کہتے ہیں ہمزہ آنکھوں اور ہاتھوں سے برائی کے مفہوم (sense) میں اشارہ کرنے کو کہتے ہیں اور لمزہ زبان سے فقرے بازی کرکے کسی کی برائی کرنے کو کہتے ہیں۔ چونکہ یہاں دونوں لفظ ایک ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔ اس لیے کئی معنی مراد ہوسکتے ہیں یعنی اس شخص کی عادت یہ ہے کہ وہ دوسروں کی تذلیل و تحقیر کرتا ہے اور کسی کی طرف آنکھوں سے اشارہ کرکے اس کی برائی کرتا ہے کسی کے نسب پر طعن کرتا ہے، کسی کی طرف انگلی اٹھاکر اس کی ذات میں نقص نکالتا ہے کسی کی غربت وفاقہ کشی کی طرف اشارہ کرکے اس کو ذلیل کرنے کی کوشش کرتا ہے یا کسی کو کمزور اور ناتوان دیکھ کر اس کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ کسی پر منہ درمنہ چوٹیں لگاتا ہے کسی کی پیٹھ پیچھے برائیاں بیان کرتا ہے۔ کہیں چغلیاں کھاکر دوستوں کو لڑواتا ہے اور کہیں اپنے مفاد کے لیے بھائیوں میں پھوٹ ڈلواتا ہے۔ لوگوں کو برے ناموں اور برے القاب سے پکارتا ہے۔ ان پر طنز کرتا ہے اور عیب نکالتا ہے۔ اس طرح کی بہت سی حرکتیں مالدار انسان اپنے سرمایہ کے بل بوتے پر کرتا ہے اسے کبھی یہ خیال بھی نہیں آتا ہے کہ اس دنیا میں کوئی چیز رہنے والی نہیں ہے یہاں صرف اللہ کا نام اور اس کی شان باقی رہنے والی ہے یہ مال و دولت، امیری غریبی، حکومت و حشمت، رعب داب اور ظلم و ستم اور دنیا کی ہر ایک چیز فنا ہوجائے گی جیسا کہ اللہ کا وعدہ ہے کُلُّ مَنۡ عَلَیۡهَا فَانٍ وَّیَبۡقٰی وَجۡهُ رَبِّکَ ذوالجَلَال وَالۡاِکۡرَامِ۔ ہر کوئی چیز فنا ہونے والی ہے اور صرف تیرے رب ذوالجلال کی ذات کریم ہی باقی رہنے والی ہے۔ اس کے بعد ہر ایک انسان کو اللہ

تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے اور اعمال کا حساب دینا ہے وہاں عملوں کی قیمت ہے اور مال ودولت کی کوئی قیمت نہیں ہے سوائے ان کے جنہوں نے مال ودولت کو خدا کی راہ میں صرف کیا ہو۔ اس کی زکوٰۃ ادا کی ہو اور اس مال ودولت کے نشے میں مخمور نہ رہے ہوں۔

نہ دنیا سے نہ دولت سے نہ گھر آباد کرنے سے

تسلی دل کو ملتی ہے خدا کو یاد کرنے سے

جو مال جمع کرتا ہے اور اسے گن گن کر رکھتا ہے

اس آیت میں ان مالدار لوگوں کی اخلاقی خرابیوں کی اصل وجہ بیان کی گئی ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ گن گن کر جمع کئے ہوئے مال و دولت کی وجہ سے ہی یہ لوگ مال کے نشے میں آکر لوگوں کی تذلیل اور حقارت کرتے ہیں۔ یہ مغرور لوگ خدا کی راہ میں ایک روپیہ بھی خرچ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے ہیں مال کو حقیقی طاقت سمجھ کر اس کی محبت میں اس طرح ڈوبے رہتے ہیں کہ انہیں سوائے دولت کے کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا ہے جن لوگوں کے پاس مال و دولت نہیں ہے اور تہی دامن ہیں ان کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا

سورہ شعرا میں اس برائی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ''کیا تم ہر بلندی پر بیکار یادگاریں تعمیر کرتے رہو گے اور شاندار محل تعمیر کرتے رہو گے گویا تمہیں ہمیشہ یہیں رہنا ہے''

جو لوگ زندگی میں مال و دولت کو ایمان اور نیک اعمال پر ترجیح دیتے ہیں وہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے سامنے رسوا ہوجائیں گے۔ دنیا میں بہت ساری بڑی بڑی قومیں گزر چکی ہیں جنہوں نے مال ودولت اور جاہ و حشمت کو ترجیح دے کر بڑی بڑی یادگاریں محلات وغیرہ تعمیر کیں آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے کہ زیادہ تر لوگ مال و دولت اور جاہ و حشمت کو اللہ کے دین پر ترجیح دیتے ہیں اور خدا کے فرمان اور احکام کو بھول جاتے ہیں اور اس نشے میں خونریزی کرکے دنیا کو تباہ وبرباد کردیتے ہیں۔

یہ دولت مند لوگ گمان کرتے ہیں کہ ان کی زندگی اور ان کے مال و دولت کو دوام حاصل ہے جو انہیں ہمیشہ ساتھ دے گا۔ مال و دولت میں مست ومدہوش یہ لوگ خیال نہیں کرتے ہیں کہ اس مال کو آخر دُنیا میں ہی چھوڑنا ہے اور یہاں سے خالی ہاتھ جانا ہے اور پھر اس مال و دولت کا حساب دینا ہے جسے جمع کرکے مال و دولت کی محبت میں انسان ایسا دھوکہ کھاجاتا ہے کہ اسے زندگی بھر موت کبھی یاد نہیں

آتی ہے حالانکہ وہ ہر روز دھوکہ کھاجاتا ہے کہ اسے زندگی بھر موت کبھی یاد نہیں آتی ہے حالانکہ وہ ہر روز دنیا میں انسانوں کے جنازے اٹھتے دیکھتا ہے لیکن اپنی موت کو بھول جاتا ہے۔

جہاں میں ہیں عبرت کے ہر سو نمونے

مگر تجھ کو اندھا کیا رنگ و بو نے

ہرگز نہیں وہ حُطَمَہ میں پھینک دیا جائے گا

جو انسان اپنا مال گن گن کر رکھتا ہے اور اسے اپنی موت بھی یاد نہیں آتی ہے بلکہ وہ صرف لوگوں کو طعنے دینے اور طنز کرنے میں مشغول رہتا ہے اور اسے یہ خیال نہیں آتا ہے کہ یہ جمع کیا ہوا مال دنیا میں ہی چھوڑ کر اُسے وہاں جانا ہے جہاں حُطَمَہ اس کا انتظار کر رہی ہے۔ حطمہ ایک جہنم کا نام ہے۔ اس جہنم میں ڈال کر خدا کے نافرمان بندے کو چکنا چور کر دیا جائے گا۔

لَيُنبَذَنَّ کا معنی پھینک دینا ہے لیکن اس میں کسی چیز کو بے وقعت اور حقیر سمجھ کر پھینک دینے کا مفہوم ہے چونکہ یہ شخص ہر کمزور نادار انسان کو حقیر سمجھتا تھا اس لیے اسے حقیر اور بے وقعت چیز سمجھ کر حقارت کے ساتھ جہنم میں پھنک دیا جائے گا۔

اور تم کیا جانو وہ حطمہ کیا ہے؟ اللہ کی دہکائی ہوئی آگ

جس جہنم میں اس شخص کو ڈال دیا جائے گا اس کے متعلق اللہ تعالی فرماتا ہے کہ تمہیں معلوم نہیں ہے کہ وہ حطمہ یعنی چکنا چور کرنے والی جگہ کیا ہے۔ پھر خود جواب ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ اللہ کی خوب بھڑکائی ہوئی آگ ہے۔ جہنم کی آگ کو اللہ کیآگ کہا گیا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جس آگ کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کرے، وہ کتنی ہولناک اور خوف ناک ہوگی۔

جو (آگ) ان کے دلوں تک پہنچ جائے گی

یہ آگ ان گناہ گاروں کے دلوں تک پہنچ جائے گی۔ دلوں تک اس آگ کے پہنچ جانے کا ایک مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ دل ہی انسان کے شعور، ادراک، جذبات و خواہشات، عقائد و افکار اور نیتوں اور ارادوں کا مقام اور مرکز ہے۔ اس لیے اس آگ کو ایسے برے خیالات اور خواہشات رکھنے والے دلوں تک پہنچا دیا جائے گا۔ ایک اور مطلب یہ ہے کہ یہ آگ دنیا کی آگ کی طرح اندھی نہیں ہوگی جو بلا امتیاز ہر جہنمی کے دل پر ظاہر ہوگی بلکہ صرف اس خاص جرم کا ارتکاب کرنے والے کے دل تک پہنچ جائے گی اور ہر ایسے مجرم کو اس کے گناہوں کے پیمانے کے مطابق عذاب دے گی یعنی جس کے دل

میں جتنی خرابی ہوگی اسے اتنا ہی عذاب دیا جائے گا۔

بے شک وہ (آگ) ان پر ڈھانک کر بندھ کی جائے گی

اونچے اونچے ستونوں سے (ان کو باندھ دیا جائے گا)

جب ان مجرموں کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا تو اوپر سے جہنم کو بند کیا جائے گا اور کوئی سوراخ بھی کھلا نہ ہوگا۔ جہنم کے دروازوں کو بند کرکے ان مجرموں کو آگ کے ستونوں سے باندھا جائے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مال و دولت پر فخر کرنا اور لوگوں کو ان کی غربت اور خستہ حالی پر طعنے دینا اور انہیں حقیر سمجھنا کتنا بڑا جرم ہے۔ اس جرم کا اندازہ سزا اور عذاب کی اس تصویر کشی سے کیا جاسکتا ہے جو یہاں کھینچی گئی ہے۔

پست ذہن اور دولت پر فخر کرنے والے انسان کی جس شدت کے ساتھ مذمت کی گئی اس پر اگر انسان غور کرے گا تو اسے حقیقت سمجھ میں آجاتی ہے کہ مال و دولت پر فخر اور غرور کرنا اور لوگوں کو ذلیل نظر سے دیکھنا کتنا بڑا جرم ہے۔

سُوۡرَةُ الۡفِيۡل

اٰیاتُھا :5 رکوعھا:1

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

أَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصۡحَابِ الۡفِيلِ o أَلَمۡ يَجۡعَلۡ كَيۡدَهُمۡ فِي تَضۡلِيلٍ o وَأَرۡسَلَ عَلَيۡهِمۡ طَيۡرًا أَبَابِيلَ o تَرۡمِيهِم بِحِجَارَةٍ مِّن سِجِّيلٍ o فَجَعَلَهُمۡ كَعَصۡفٍ مَّأۡكُولٍ o

پس منظر:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے پہلے عرب کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ بہت مشہور ہے واقعہ کی تفصیل اس طرح ہے کہ جب یمن پر حبشیوں کا قبضہ ہوگیا۔ حبشی لشکر کی قیادت اور کمانڈ ابرہہ نامی ایک شخص کے ہاتھ میں تھی۔ جسے بعد میں یمن کا گورنر مقرر کیا گیا۔ رفتہ رفتہ اس نے یمن پر پورا کنٹرول

(control) حاصل کیا اور اپنی خود مختاری کا اعلان کردیا۔ اگرچہ اس نے شاہ حبش کی بالادستی تسلیم کرلی تھی لیکن یہ برائے نام تھی کیونکہ اس نے یمن پر پوری طرح سے اپنا اقتدار قائم کردیا تھا۔

ابرہہ کو یونانی تاریخ میں ابرمس (Abramas) اور سریانی میں ابرہم (Abraham) کہتے ہیں۔یمن پر پوری طرح قبضہ کرنے اور اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کے بعد ابرہہ نے یمن کے دارالسلطنت میں ایک بہت بڑا کلیسا (church) تعمیر کروایا جو عرب کی تاریخ میں اَلقَلِیس (Ekklesia) کے نام سے مشہور ہوا۔ اُس نے مشاہدہ کیا کہ عرب دنیا میں کعبے کو غیر معمولی اہمیت اور شہرت حاصل ہے یہاں لوگ حج کے لیے دور دراز علاقوں سے آکر جمع ہوجاتے ہیں۔ اس نے پکا ارداہ کرلیا کہ اس اہمیت اور شہرت کو اپنے تعمیر کردہ کلیسا کی طرف موڑ لے جس سے کعبے کی اہمیت ختم ہوجائے گی اور یہ نیا تعمیر شدہ کلیسا پورے عرب کا مرکز بن جائے گا۔

اپنے اس ناپاک ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے 570ء میں ابرہہ ایک لشکر جرار لے کر خانہ کعبہ کو ڈھانے کے لیے مکہ کی طرف روانہ ہوا اس کی لشکر کشی کی خبر پورے عرب میں پھیل گئی۔ چونکہ ابرہہ کے اقتدار اور اس کی لشکر کا چرچا اور رعب وداب پورے عرب پر چھایا ہوا تھا۔ اس لیے اس کا مقابلہ کرنے کی کسی نے ہمت نہ کی۔ محمد بن اسحاق کی روایت ہے کہ ابرہہ نے قریش کے بہت سے مویشی لوٹ لئے جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب کے دوسو اونٹ بھی تھے اس نے اہل مکہ کو پیغام دیا کہ میں تم سے لڑنے نہیں آیا ہوں اگر تم نہ لڑو گے تو تم سے کوئی جنگ نہ ہوگی اور تمہاری جان و مال محفوظ رہیں گے اور یہ بھی بتایا کہ اہل مکہ اگر بات کرنا چاہیں تو ان سے بات چیت ہوگی۔ اہل مکہ کے پاس جب یہ خبر پہنچی تو انہوں نے سردار عبدالمطلب کو سفارت کاری کے لیے ابرہہ کے پاس بھیج دیا ابرہہ عبدالمطلب کی شخصیت دیکھ کر بہت متاثر ہوا اور اپنے تخت سے اتر کر ان کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ پھر پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ عبدالمطلب نے کہا کہ ہمارے جو اونٹ پکڑ لئے گئے ہیں وہ ہمیں واپس کردئے جائیں۔ ابرہہ نے کہا کہ آپ کو دیکھ کر تو میں بہت متاثر ہوا تھا مگر آپ کی اس بات نے آپ کو میری نظر سے گرادیا کہ آپ اپنے اونٹوں کا مطالبہ کر رہے ہیں اور وہ گھر جسے تم لوگ خدا کا گھر سمجھتے ہیں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہتے ہیں۔ عبدالمطلب نے کہا میں تو صرف اپنے اونٹوں کا مالک ہوں اور ان ہی کے بارے میں درخواست کررہا ہوں رہا خدا کا گھر اس کی حفاظت اس کا رب خود کرے گا۔ یہ جواب سن کر ابرہہ نے قریش کے سب اونٹ واپس کردیئے۔

ابن عباسؓ کی روایت اس سے مختلف ہے اس میں اونٹوں کے مطالبے کا کوئی ذکر نہیں ہے اس روایت کے مطابق ابرہہ جب حدود حرم کے قریب پہنچا تو عبدالمطلب خود اس کے پاس گئے اور اس کے لشکر سمیت آنے کا مقصد دریافت کیا اور کہا کہ اگر آپ ہم سے کسی چیز کا مطالبہ کرتے ہیں تو ہم آپ کے پاس پہنچا دیں گے۔ ابرہہ نے کہا کہ میں آپ کے اس امن کے گھر کو ڈھانے کے لیے آیا ہوں۔ عبدالمطلب نے کہا یہ اللہ کا گھر ہے آج تک اللہ نے کسی کو اپنے اس گھر پر مسلط ہونے نہیں دیا اور نہ کسی نے اس گھر کو نقصان پہنچانے کی جرأت کی۔ ابرہہ نے کہا کہ ہم اسے منہدم کرکے ہی واپس لوٹیں گے۔ عبدالمطلب نےپیش کش کی کہ جو کچھ آپ چاہیں ہم سے لے لیں مگر خدا کے اس گھر کو نقصان مت پہنچائیں لیکن ابرہہ نے انکار کردیا اور اپنے لشکر کو آگے بڑھنے کا حکم دے دیا۔ اگرچہ ان دونوں روایتوں میں تھوڑا سا اختلاف ہے لیکن اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ مکہ اور اس کے آس پاس کے رہنے والوں نے ابرہہ سے لڑنے کی ہمت نہ کی اور نہ انہوں نے کوئی مزاحمت کی۔

ابرہہ سے واپس آکر عبدالمطلب نے قریش والوں سے کہا کہ اپنے بال بچوں کو لے کر پہاڑوں میں چلے جائیں تاکہ ان کا قتل عام نہ ہوجائے اور پھر چند سرداروں کے ساتھ حرم پاک میں حاضر ہوا اور کعبے کا کنڈا پکڑ کر انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگیں کہ وہ اپنے گھر اور اس کے خادموں کی حفاظت فرمائے۔ اس وقت کعبہ میں تین سو ساٹھ بت موجود تھے مگر یہ لوگ اس نازک وقت پر ان سب کو بھول گئے اور صرف اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا۔ انہوں نے دعا کی کہ اے اللہ ہر کوئی بندہ اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے آپ بھی اپنے گھر کی حفاظت فرما۔ ابن جریر نے عبدالمطلب کی یہ دعا اس طرح نقل کی ہے: ''اے میرے رب تیرے سوا میں اُن کے مقابلے میں کسی سے امید نہیں رکھتا ہوں۔ اے میرے رب اپنے حرم کی حفاظت کر'' یہ دعائیں مانگ کر عبدالمطلب اور اس کے ساتھی اپنے اہل وعیال کو لے کر پہاڑوں میں چلے گئے۔ دوسرے دن ابرہہ مکہ میں داخل ہونے کے لیے آگے بڑھا اسی دوران پرندوں کے جھنڈ اپنی چونچوں اور پنجوں میں کنکریاں لئے ہوئے آئے اور ابرہہ کی لشکر پر برسادیں۔ جس پر بھی کوئی کنکری گرجاتی اس کی جلد پھٹ جاتی اور گوشت گرجاتا اور خون پانی کی طرح بہنے لگتا اور ہڈیاں نکل آئیں! خود ابرہہ کے ساتھ بھی یہی حال ہوا۔ اس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہوکر گر رہا تھا افراتفری میں ان لوگوں نے یمن کی طرف بھاگنا شروع کردیا۔ اس بھگدڑ میں یہ لوگ جگہ جگہ گر گر کر مرگئے کچھ موقعہ پر ہی مرگئے اور کچھ بھاگتے ہوئے راستے میں مرگئے۔ ابرہہ بلادِ خَشْعَمْ کے مقام پر راستے میں ہلاک ہوگیا۔ یہ واقعہ مُزْدَلِفَہ اور منیٰ کے درمیان مَحسّر کی وادی میں پیش آیا۔ ابو داؤد کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مُزدَلِفَہ سے منیٰ کی طرف چل رہے تھے تو مُحَسِّر کی وادی میں پہنچ کر آپ نے رفتار تیز کردی کیونکہ اصحاب لفیل کا واقعہ اسی جگہ پیش آیا تھا اس لیے سنت یہی ہے کہ آدمی اس وادی سے جلدی سے گزر جائے۔

حضرت زُبیرؓ بن عوام کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس واقعہ کے بعد قریش نے دس سال تک اللہ وحدہٗ لاشریک کے سوا کسی کی عبادت نہ کی۔ جس سال یہ واقعہ پیش آیا اہل عرب اسے عام الفیل (ہاتھیوں کا سال) کہتے ہیں اور اسی سال ۱۲ ربیع الاول محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت مبارکہ ہوئی اور یہ واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے پچاس(۵۰) دن پہلے پیش آیا۔ عرب کی تاریخ گواہ ہے کہ تمام اہل عرب اس بات کے قائل تھے کہ ابرہہ کے اس حملے سے کعبے کی حفاظت کسی دیوی دیوتا نے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے کی تھی اور قریش کے سرداروں نے صرف اللہ سے ہی مدد کے لیے دعائیں مانگیں تھیں اور چند سال تک قریش کے لوگ اس واقعہ سے اس قدر متاثر رہے کہ انہوں نے اللہ کے سوا کسی کی پرستش نہ کی۔

سورہ میں (ہاتھی والوں) اصحاب الفیل کی وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ یہ حملہ آور کون تھے اور کہاں سے آئے تھے۔ بلکہ حملہ آوروں کو صرف اصحاب الفیل کے نام سے پکارا گیا اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس سورہ کے نازل ہونے کے وقت بہت سارے لوگ اس واقعہ سے اچھی طرح واقف تھے اس لیے حملہ آوروں کو اصحاب الفیل کہہ کر اکتفا کیا گیا۔ یہ صرف واقعہ کی یاد دہانی تھی تاکہ عرب کے لوگ اس بات پر غور کریں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس چیز کی طرف دعوت دے رہے ہیں وہ دعوت یہی ہے کہ جس طرح اصحاب الفیل کے موقعہ پر لوگوں نے تمام معبودوں کو چھوڑ کر صرف اللہ وحدہ لاشریک کو پکارا اور اسی سے مدد مانگی اور صرف اسی کی عبادت کی اسی طرح کی دعوت ان کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے ہیں اور اگر وہ زبردستی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو دبانے کی کوشش کریں گے تو جس خدا نے اصحاب الفیل کا تہس نہس کیا اسی طرح یہ لوگ اللہ کے غضب میں گرفتار ہو کر تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ (واللہ اعلم)

أَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصۡحَٰبِ ٱلۡفِيلِ(۱)

کیا تم نے نہیں دیکھا تمہارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا

أَلَمۡ يَجۡعَلۡ كَيۡدَهُمۡ فِي تَضۡلِيلٍ(٢)

کیا اُس نے اُن کی تدبیر کو برباد نہیں کیا

وَأَرۡسَلَ عَلَيۡهِمۡ طَيۡرًا أَبَابِيلَ(٣)

اور اُن پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیج دئے

تَرۡمِيهِم بِحِجَارَةٍ مِّن سِجِّيلٍ(٤)

جو ان پر مٹی اور پتھر کی کنکریاں مار رہے تھے

فَجَعَلَهُمۡ كَعَصۡفٍ مَّأۡكُولٍ(٥)

پس انہیں کھائے ہوئے بھوسے کی طرح کردیا

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا

آیت کا خطاب بظاہر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے مگر اصل مخاطب مکہ کے لوگ ہیں جو اصحاب الفیل کے واقعہ سے اچھی طرح واقف تھے۔ قران مجید میں کئی مقامات پر اَلَمۡ تَرَ (کیا تم نے نہیں دیکھا) کے الفاظ استعمال ہوئے جس سے مراد یہ ہے کہ ''کیا تم نے غور کیا؟'' اور یہ تاریخ ہر قاری کے لیے دعوتِ فکر ہے۔ یہاں ''کیا تم نے نہیں دیکھا'' کے الفاظ اس لیے استعمال کئے گئے ہیں کہ عرب میں ایسے بہت سے لوگ موجود تھے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے اصحاب الفیل کی تباہی کا واقعہ دیکھا تھا کیونکہ نزول قرآن تک اس واقعے کو ہوئے صرف چالیس پنتالیس سال کا عرصہ گزرا تھا۔ اس لیے یہ واقعہ لوگوں کے لیے آنکھوں دیکھے واقعہ کی طرح یقینی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سورہ میں تفصیل نہیں دی گئی ہے کہ یہ حملہ آور ہاتھی والے کون تھے اور ان کی تدبیر کیا تھی۔ یہ باتیں عرب کے سب لوگوں کو معلوم تھیں۔

کیا اُس نے اُن کی تدبیر کو برباد نہیں کردیا

ابرہہ کی کعبہ کو ڈھانے کی تدبیر کچھ خفیہ بھی تھی اور کچھ ظاہر بھی۔ ظاہری تدبیر تھی کہ وہ علی الاعلان ساٹھ ہزار کا لشکر لے کر کعبہ کو گرانے کے لیے نکلا اور اس کی خفیہ تدبیر یہ تھی کہ اُس نے صنعا کے مقام پر جو کلیسا بنوایا تھا وہ چاہتا تھا کہ پورے عرب سے آکر لوگ اس کا طواف کریں اور کعبہ کو بھول جائیں۔ اپنے اس مذموم ارادے کو پورا کرنے کے لیے اس نے ایک اور بہت بڑی سازش کے تحت اپنے کلیسا کو آگ لگوادی اور انتقام لینے کے بہانے سے مکہ پر چڑھائی کردی تاکہ کعبہ کو گرا کر پورے عرب کے لوگوں کی توجہ صنعا کے مقام پر بنائے ہوئے کلیسا کی طرف مبذول کرائی جائے یہ اس کی خفیہ سازش اور تدبیر تھی۔ اس خفیہ تدبیر کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس نے ظاہری تدبیر کرکے ساٹھ ہزار کے لشکر کے ساتھ مکہ پر دھاوا بول دیا۔ اس تدبیر کو کَید یعنی سازش اور ناپاک ارادے کی چال فرمایا گیا ہے۔ تدبیر خفیہ تھی یا ظاہر دونوں صورتوں میں ابرہہ عرب دنیا سے کعبے کا نام مٹانا چاہتا تھا اور اپنے بنائے ہوئے کلیسا کو کعبے کا متبادل پیش کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی سازش کو ناکام بنادیا اور اس کے کلیسا اور خود اس کی کمینہ خصلت ذات کو دنیا سے مٹا دیا اور اپنے گھر کعبہ کو ہمیشہ کے لیے برقرار رکھا جس کا طواف کرنے کے لیے دنیا بھر سے لوگ آتے ہیں اور ان شاء اللہ تا قیامت

آتے رہیں گے۔

اور ان پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیج دیئے

اردو زبان میں ابابیل ایک خاص پرندے کو کہتے ہیں جس سے لوگ بخوبی واقف ہیں اس لیے اردو زبان بولنے والے اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ ابرھہ کی فوج پر ابابیلیں بھیجی گئی تھیں لیکن عربی زبان میں ابابیل کا معنی بہت سے متفرق گروہ ہیں۔پرندے مختلف گروہوں میں مختلف سمتوں سے آئے اور ابرہہ کی لشکر پر کنکریاں برسادیں۔ سعید بن جُبَیر اور عِکرمہ کہتے ہیں کہ اس طرح کے پرندے نہ پہلے کبھی دیکھے گئے تھے نہ بعد میں دیکھے گئے۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ان کی چونچیں پرندوں جیسی تھیں اور پنجے کتوں جیسے۔ راویوں کا بیان ہے کہ ہر پرندے کی چونچ میں ایک ایک اور پنجوں میں دو دو کنکر تھے اور مکہ کے بعض لوگوں کے پاس یہ کنکر ایک مدت تک موجود تھے۔ ابن عباس کی روایت سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ پرندے اگرچہ دنیا میں موجود پرندوں کی طرح تھے لیکن ان کو اللہ تعالیٰ نے خصوصی طور بھیجا تھا اور ان کی ساخت اس نے اس طرح بنائی تھی کہ ان میں آتشیں پتھر پھینکنے کی صلاحیت موجود تھی تاکہ آتشی بموں کی طرح دشمن کے لشکر پر گرادیں۔

جو ان پر مٹی اور پتھر کی کنکریاں مار رہے تھے

پس انہیں کھائے ہوئے بھوسے کی طرح کردیا

سجیل ایک ایسا لفظ ہے جو فارسی کے دو لفظوں سنگ(پتھر) اور گِل (مٹی) کا مرکب اور مُرعب ہے یعنی یہ فارسی زبان کے دو لفظوں سے بنا ہے اور عربی زبان میں داخل ہوا ہے۔ اس لفظ سے مراد وہ پتھر ہے جو مٹی کے گارے سے بنا ہوا ہو اور پک کر سخت ہوگیا ہو۔ سورہ حجر آیت:۷۴ میں فرمایا یا ہے کہ قوم لوط پر سجیل کی قسم کے پتھر برسائے گئے تھے اور سورہ ذاریات میں آیت:۳۳ میں فرمایا گیا ہے کہ وہ حِجَارَةً مِّن طِينٍ یعنی مٹی کے گارے سے بنے ہوئے پتھر تھے بہرکیف پرندوں کی چونچوں اور پنجوں میں جو پتھر تھے وہ بظاہر پکی ہوئی مٹی کے پتھر تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان میں ایسی طاقت پیدا کردی تھی کہ وہ طاقتور بندوق کی گولی یا آتشیں بم کی طرح اپنا کام کرگئے اور ابرہہ کے لشکر کو کھائے ہوئے بھوسے کی طرح کردیا۔ عَصف کا معنی اس چھلکے کے ہیں جو غلے کے دانوں پر ہوتا ہے جسے نکال کر پھینک دیا جاتا ہے جسے جانور کھاتے ہیں اور چبا چبا کر بھس بنادیتے ہیں۔ چبانے کے دوران کچھ حصہ منہ سے گرتا

بھی ہے جس کو پاؤں تلے روندا بھی جاتا ہے۔ ابرہہ کے لشکر کا یہی حال ہوا۔ ان کے جسموں سے اسی طرح گوشت گرتا تھا جس طرح جانور اپنے منہ سے چباتے ہوئے کچھ حصہ گرادیتے ہیں۔

مولانا حمید الدین فراہی کہتے ہیں کہ پتھر پھینکنے والے اہل عرب تھے نہ کہ پرندے۔ یہ پرندے اس لیے آئے تھے کہ اصحاب الفیل کی لاشوں کو کھاجائیں۔ ان کے کہنے کے مطابق اہل مکہ اور آس پاس کے لوگوں نے پتھر پھینک کر یہ جنگ جیت لی اور ابرہہ اور اس کی لشکر کو زخمی اور قتل کرکے لاشوں کے ڈھیر بنادئے۔ لیکن اگر ان کی بات صحیح مان لی جائے تو آیات کی ترتیب اس طرح ہوتی۔ تم ان کو پتھر پھینک رہے تھے ۔ تو اللہ نے ان کو کھائے ہوئے بھس کی طرح کردیا۔ پھر اللہ نے ان کو کھانے کے لیے جھنڈ کے جھنڈ پرندے بھیج دیے۔ لیکن قرآن کی ترتیب یہ ہے کہ اللہ نے ان پر جھنڈ کے جھنڈ پرندے بھیج دئے جو ان پر پتھر پھینک رہے تھے اور ان کا یہ حال کردیا جیسے جانوروں کا کھایا ہوا بھوسہ۔ اس ترتیب کے لحاظ سے مکے والوں کے پتھر پھینکنا خارج از امکان اور حقیقت سے دور ہے۔ شیخ محمد عبدہ اس سورہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ لشکر میں چیچک اور کھسرہ کی وبا پھیل گئی اور عرب میں یہ پہلی وبا تھی جو اس طرح پھیل گئی اور اس وبا نے ابرہہ کے لشکر کے جسموں پر وہ اثرات ڈالے جو نَادِرُالوقوع ہیں۔ اس وبا سے ان لوگوں کے جسم کا گوشت کٹ کٹ کر گرنے لگا اور لشکر اور اس کے قائد میں خوف وہراس پھیل گیا اور وہ افراتفری کے عالم میں بھاگنے لگے ابرہہ بھی اس کی زد میں آگیا اس کا گوشت بھی ٹکڑے ٹکڑے ہوکر گرتا رہا یہاں تک کہ وہ صنعا کے مقام پر جہاں اُس نے طواف کے لیے کلیسا بنایا تھا پہنچ کر مرگیا اور اس کی موت دنیا کے لیے عبرت بن کر رہ گئی۔ ان کا اعتقاد اس بات پر ہے کہ پرندے مکھی یا مچھروں کی جنس سے تھے جو جراثیم (germs) اٹھائے پھرتے ہیں اور سنگریزے اس زہریلی خشک مٹی کے تھے جسے ہوائیں اڑاتی ہیں جو ان جانوروں یعنی مکھیوں اور مچھروں کی ٹانگوں میں چمٹ جاتی ہیں۔ یہ مچھر اور مکھیاں جب کسی بدن پر بیٹھتی ہیں تو یہ زہریلی مٹی ان کے مساموں میں داخل ہوجاتی ہے اور اس سے ایسے پھوڑے اور زخم پیدا ہوجاتے ہیں جن سے بدن خراب ہوجاتا ہے اور گوشت خراب ہوکر گرنے لگتا ہے یہ مکھی اور مچھر ایسے پرندے ہیجو اللہ تعالیٰ کے عظیم لشکر کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ بہت سے ایسے انسانوں کو ہلاک کردیتا ہے جنہیں وہ ہلاک کرنا چاہتا ہے اور آج کل کے سائنسی تحقیق نے جن جراثیم کو دریافت کیا ہے وہ اتنے باریک ہیں کہ خوردبین (microscope) کے بغیر انہیں دیکھا نہیں جاسکتا ہے۔ یہ اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ انسانی جسم کے ایک بال پر کروڑوں کی تعداد میں سماسکتے ہیں اور انسانوں کو دکھائی نہیں دیتے ہیں۔ خدا کے نافرمانوں اور سرکش بندوں کو سزا دینے کے لیے ایسے جراثیم کا

استعمال میں لانا خارج از امکان نہیں ہے ضروری نہیں ہے کہ طیر اڑنے والے پرندوں کی شکل میں ہوں اور جراثیم کی شکل میں نہ ہوں اور نہ یہ ماننے میں کوئی اعتراض ہو سکتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ جرثومی مخلوق کا لشکر ہو۔ کائینات میں جتنی بھی قوتیں ہیں سب خدا کی قوت کے تابع ہیں۔ خدا نے اس سرکش انسان کی سرکوبی کے لیے، جو اس کے گھر کو ڈھانے آیا تھا، اپنے وہ پرندے بھیجے جو مکھیوں اور مچھروں کی صورت میں تھے۔ جنہوں نے بیماریوں کے جراثیم لشکر میں پھیلائے یا یہ خود جراثیم کا لشکر تھا جس نے وبائی شکل اختیار کر کے خدا کے گھر کے دشمن کا خاتمہ کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے جس طرح چاہا خود اپنے گھر کی حفاظت کی اور جو اس کے گھر کو تباہ کرنے کے لیے آئے تھے انہیں تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔

لیکن یہ صرف مستشرقین (orientalists) اور ان سے متاثرہ مسلمانوں کی فلسفیانہ تجزیات اور تاویلات ہیں۔ ایسی ہی ایک تجزیہ اور تاویل سر سید احمد خان صاحب نے فرعون کے لشکر کے سمندر میں ڈوب کر مرنے کی وضاحت میں کی ہے۔ کہ جب حضرت موسیٰ اپنے لوگوں کے ساتھ سمندر کے کنارے پر پہنچے تو عین اسی وقت مدوجزر (tides) شروع ہوگئے جس کی وجہ سے پانی سمندر کے کناروں پر آگیا اور بیچ میں راستہ کھل گیا اور حضرت موسیٰ اور اس کے ساتھیوں نے سمندر پار کرلیا لیکن جب فرعون کی فوج فرعون کے ساتھ موسیٰ کو پیچھا کرنے کے لیے اسی راستہ سے سمندر میں اتر گئے تو اسی دوران مدوجزر ختم ہوگئے سمندر کے کناروں سے پانی واپس آگیا اور فرعون لشکر سمیت سمندر میں ڈوب گیا۔ سید صاحب عقلی دلیل سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ فرعون کا پانی میں ڈوبنا کوئی معجزہ نہیں بلکہ یہ مدوجزر کا اتفاق تھا۔

یہ لوگ ابرہہ کے اونٹ کے حرم کعبہ سے باہر بیٹھ جانے اور کعبہ کی طرف آگے بڑھنے سے انکار کرنے کو اتفاق سمجھتے ہیں نہ کہ کوئی خارق عادت چیز یا معجزہ اسی طرح پرندوں کے آنے اور ان کی سنگباری کو بھی یہ لوگ خارج از امکان قرار دیتے ہیں۔ یہ لوگ طیراً یعنی پرندوں سے مکھیاں اور مچھر مراد لیتے ہیں جنہوں نے جراثیموں کو اٹھا کر وبائی بیماری پھیلادی جس کی وجہ سے ابرہہ کا لشکر تباہ ہوگیا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی قدرت اور تدبیر میں کوئی بھی چیز ناممکن نہیں ہے چاہیے وہ خارق عادت معجزہ ہو یا قانون قدرت کے مطابق ہو اس لیے یہ بات ناممکن نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ مخصوص پرندے بھیج دیے جو چونچوں اور پنجوں میں پتھر لیے ہوئے تھے اور لشکریوں کے جسم پر گرادئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اس گھر کو محفوظ رکھنا چاہتا تھا تاکہ یہ نوعِ انسانی کے امن کے مقام کی حیثیت سے برقرار رہے اور اسلام کے مرکز کی حیثیت سے قائم رہے اور کوئی جابر حکومت اس پر غالب نہ آجائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کو ایک ایسی کھلی نشانی کی شکل دے دی جس سے ہر قوم اور ہر دور کے لوگ عبرت حاصل کرسکیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے معجزے سے اپنے گھر کو بچالیا اور اس معجزے کو آنے والی نسلوں کے لیے ایک ایسے تاریخی واقعہ کی حیثیت سے زندہ رکھا کہ کہ کوئی بھی شخص کعبہ کو بری نظر سے دیکھنے کی جرأت نہ کرسکے گا اور نہ کسی نے آج تک ایسی حرکت کرنے کی ہمت کی ہے۔

طیراً ابابیل کا واقعہ بہت سے حقائق کی طرف ہماری راہنمائی کرتا ہے اور اس واقعہ سے عبرت کے بہت سے پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ کعبہ اللہ تعالیٰ کا گھر ہے۔ اس نے نہیں چاہا کہ وہ اپنے گھر کو مشرکین کے حوالے کردے۔ اگرچہ اس وقت کعبے کا انتظام مشرکین کے ہاتھوں میں ہی تھا لیکن چونکہ اس واقعہ کے کچھ دن بعد ہی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہونے والے تھے۔ جن کے ہاتھوں کعبہ میں رکھے ہوئے بتوں کا صفایا کرنا اللہ کو منظور تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے کعبہ کی حفاظت خود فرمائی۔ اس کے بچانے میں نہ مشرکین کا عمل دخل رہا اور نہ حملہ آوروں کی سازش کامیاب ہوئی اور نہ کعبہ کو کوئی نقصان پہنچا۔ اللہ تعالیٰ نے خارق عادت طریقے سے اپنے گھر کو صحیح سلامت رکھا اور مشرکین کے بجائے پرندوں کو حملہ آوروں پر مسلط کردیا۔ جنہوں نے دشمن کے لشکر کو بھگا بھگا کر ہلاک کر ڈالا اور حملہ آوروں کی یہ ہلاکت معروف سنت الٰہی کے تحت نہیں بلکہ معجزے کی صورت میں ہوئی کیونکہ اگر مشرکین کے ہاتھوں حملہ آوروں کو شکست ہوتی اور کعبہ محفوظ ہوجاتا تو شرک کو فروغ مل جاتا اور اسے نئی قوت حاصل ہوجاتی اور مشرکین مکہ کو اپنی کامیابی پر ناز کرنے کا موقعہ مل جاتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ تھی کہ مشرکین اس مصیبت کے وقت تمام بتوں کو بھول گئے اور انہوں نے صرف خدائے وحدہٗ لاشریک کی طرف رجوع کرکے تاریخ رقم کردی۔ اس طرح مشرکین کبھی یہ دعویٰ نہ کرسکے کہ انہوں نے کعبہ کو بتوں کی مدد سے یا اپنی طاقت کے بل بوتے پر بچالیا۔ بلکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگ مانگ کر خود اس بات کا ثبوت فراہم کیا کہ اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے اگرچہ بعد میں ان لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کٹھن کاوشوں سے اسلام قبول کرلیا اور ابتدا میں صرف ان لوگوں نے اسلام قبول کیا جو اس واقعہ سے واقف اور متاثر تھے اور جنہیں معلوم تھا کہ کعبہ کو بت اور بتوں کی پوجا کرنے والے مشرکین نہ بچا سکے بلکہ کعبہ کو خود کعبہ کے مالک رب العالمین نے بچا لیا۔

اللہ کے محترم گھر کی حفاظت میں قدرت الٰہی کی مداخلت کا تقاضا یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کے بعد قریش اور عرب کے لوگ اللہ کا دین قبول کرنے میں پیش قدمی کریں اور ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کی کوشش کریں اور بت پرستی کو آسانی سے ختم کردیں اس واقعہ سے اس حقیقت کی یاد دہانی بھی کرنی تھی کہ جس خدا نے کعبہ کو دشمنوں سے بچالیا اسی رب پر لوگوں کو ایمان لانے کی دعوت دی جاتی ہے اور انہیں یاد دلایا جاتا ہے کہ جس طرح آپ نے اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے بتوں کو خطرے کے وقت نظر انداز کردیا اور صرف اللہ کی طرف رجوع کیا اسی طرح آج آپ سے کہا جاتا ہے کہ ان بتوں کو یکسر مسترد کرکے خدائے بزرگ و برتر کی طرف رجوع کرکے اسلام قبول کریں۔

اس واقعہ سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابرہہ کے لشکر کو یہ موقعہ نہیں دیا کہ وہ اس کے گھر کو منہدم کریں جب کہ وہ اہل کتاب تھے اور اس گھر کی رکھوالی کرنے والے متولین، مجاور اور منتظمین مشرک تھے اور انسانی عقل یہی تقاضا کرتی ہے کہ کعبہ میں جو بت پرستی اور فحاشی ہورہی تھی اس سے بہتر یہی تھا کہ اللہ کے اس گھر کو اہل کتاب کے کنٹرول میں دیا جاتا تاکہ بت پرستی اور دیگر مشرکانہ افعال کو فروغ نہ ملتا اور مکہ کی سرزمین شرک و الحاد کی گندگی سے پاک ہوجاتی لیکن اللہ تعالیٰ جو بھی فیصلہ کرتا ہے اس میں اس کی حکمت کارفرما ہوتی ہے اہل کتاب کو کعبہ پر قبضہ کرنے سے روکنے اور مشرکین کے قبضہ کو برقرار رکھنے میں جو حکمت محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ خدا کا یہ گھر ارباب اقتدار کے تسلط سے آزاد اور سازشیں کرنے والوں کی سازشوں اور مکر وفریب سے محفوظ رہے اور مکہ کی سرزمین کی آزادی برقرار رہے تاکہ عقیدہ اسلام پوری آزادی سے پروان چڑھ سکے۔ جس پر نہ کسی فرمانروا کا کنٹرول ہو نہ کسی جابر کا جبر اور نہ اس دین پر کسی اور اقتدار کی حکمرانی ہو جو دین تمام ادیان اور پوری نوع انسانی پر کنٹرول کرنے والا اور فرمان جاری کرنے والا تھا اور جو اس واقعہ کے چند سال بعد ہی رونما ہوا جس نے تمام نوع انسانی کی قیادت سنبھال لی جو اس لیے نہیں آیا کہ دنیا میں ڈکٹیٹر شپ قائم کرلے اور لوگوں کو اپنا غلام بنالے بلکہ اس لیے آیا کہ دنیا کے تمام لوگوں تک اللہ کا دین پہنچ جائے اور پوری دنیا میں اللہ کا دین پھیل جائے اور تمام دینوں پر غالب آجائے۔

مستشرقین (Orientalists) اور عقلیت پسند (Rationalists) کہتے ہیں کہ جب ابرہہ نے کعبہ مسمار کرنے کے لیے حملہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی فوج پر طیراً ابابیل یعنی پرندے مسلط کرکے کعبہ کو بچا لیا لیکن جب یزید کی حکمرانی میں کعبہ پر منجنیق (Catapult)، اُس وقت کے توپوں سے حملے کرکے اس کی دیواریں گرادیں تو اُس وقت اللہ کی بھیجی ہوئی فوج غائب کیوں رہی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ابرہہ نے خانہ کعبہ کو تباہ کرنے کی نیت سے حملہ کردیا تھا جب کہ یزیدی حکومت اور عبداللہ بن زبیرؓ کے درمیان اختلافی جنگ تھی جس میں یزید کو عبداللہ بن زبیر ہلاک کرنے کا مقصد تھا نہ کہ کعبہ کو گرانے کا اور اس سیاسی اختلاف میں اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ جس طرح حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کا اختلاف ان کے صوابدیدہ پر جاری رہا۔ یزید نے عبداللہ بن زبیر کی بیت نہ کرنے کو بغاوت سمجھا تھا اور اس بغاوت کی سرکوبی کے بعد اس نے کعبہ کو از سر نو تعمیر کروایا۔ واللہ اعلم۔

واضح رہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں طرف کے لوگ جہاد کی نیت سے جنگ لڑ رہے تھے۔ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہٗ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان ہونے والے ظاہری نزاع کا اصل سبب حضرت عثمانؓ کے قاتلین سے قصاص لینے کا معاملہ تھا۔ حضرت علیؓ خلافت کی باگ ڈور سنبھالنے اور خلافت کو مضبوط کرنے کے بعد قصاص لینا چاہتے تھے۔ کیونکہ وہ فوری قصاص لینے کو خلافت اسلامیہ کے لیے نقصان دہ تصور کررہے تھے جبکہ حضرت معاویہؓ کا کہنا یہ تھا کہ اگر فوری قصاص نہ لیا گیا تو لوگ بقیہ صحابہ و اکابرین امت پر دست درازی کرنے کے سلسلے میں جری ہوجائیں گے۔ اس اجتہادی اختلاف کی بنا پر معاملہ آگے بڑھتا گیا اور نوبت جنگ پر جا پہنچی تھی مگر اس جنگ کی بنا پر دونوں اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں سے کسی ایک پر طعن و تشیع کرنا شرعاً جائز نہیں اور آخرت میں وبال کا باعث ہے۔

اصحاب الفیل کے واقعہ سے واضح ہونے والی اس حقیقت کے باوجود مسلمان صلیبی (عیسائی) اور صہیونی (یہودی) طاقتوں کی ناپاک تدبیروں اور مکر وفریب سے بے خوف بیٹھے ہیں۔ انہیں یہ خیال نہیں ہے کہ اپنی زہریلی پالیسیوں کے پردہ دار اسلام دشمن موقعہ کی تلاش میں ہیں کہ کب اور کس طرح کعبہ کی سرزمین پر ان کا تسلط قائم ہوجائے اور وہ اپنے ناپاک ارادوں کی پردہ داری میں اپنی کمینہ تدابیر کو عملی جامہ پہنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے ہیں۔ اگرچہ یہ لوگ فی الحال ہمدردی جتاکر عرب کے مسلمانوں کی دولت پر قبضہ جمائے ہوئے ہیں۔ اور ان کو اپنے مشوروں سے نوازتے رہتے ہیں لیکن اپنی خفیہ پالیسی کے تحت یہ لوگ اس انتظار میں ہیں کہ کب عربوں کے تیل کے ذخیرے مکمل طور پر ان کے قبضے اور قابو میں آجائیں۔ لہٰذا اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ امت مسلمہ پر خدا کے گھر اور دین اسلام کی حفاظت کرنے کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے۔ اس لیے انہیں خدا کے گھر کعبہ شریف اور دین اسلام کی حفاظت کے لیے ہمہ تن، ہمہ جہت اور ہمہ وقت مستعد رہتے ہوئے اعلان کرنا چاہئے کہ:

دنیا کے بت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا

ہم اُس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا

سُوْرَۃُ الْقُرَیش

اٰیٰتُھا:4 رُکُوْعُھَا:1

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

لِإِيلَافِ قُرَيْشٍo إِيلَافِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِo فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَٰذَا الْبَيْتِo الَّذِي أَطْعَمَهُم مِّن جُوعٍ وَآمَنَهُم مِّنْ خَوْفٍo

پس منظر:

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بیوی حضرت ہاجرہ اور اپنے شیر خوار بچے کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت اُس وادیٔ غیر ذی زرع ، (بے آب و گیاہ میدان) میں چھوڑدیا جہاں اب شہر مکہ اور کعبہ موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس جگہ چشمہ جاری کرکے ان کے لیے پانی کا انتظام کردیا۔ اور اس کے بعد انکی دیکھ بال اور پرورش کا انتظام اس طرح کیا کہ وہاں سے جرہم نامی ایک قوم کا قافلہ گزر رہا تھا۔ انہوں نے جب اس جگہ پرندوں کو پرواز کرتے دیکھا تو پتا لگانے پر معلوم ہوا کہ یہاں ایک چشمہ پھوٹ پڑا ہے جس کے اوپر پرندے پرواز کر رہے ہیں۔ قافلہ کے لوگوں نے وہاں جاکر ڈیرہ ڈال دیا اور وہاں سکونت اختیار کی رفتہ رفتہ یہ لوگ اس چشمہ کے پاس مستقل طور رہائش پذیر ہوئے اور حضرت ہاجرہ سے اجازت طلب کرکے اس چشمہ کا پانی استعمال کرنے لگے اس طرح بچے نے اس قبیلہ میں پرورش پائی اور بالغ ہوکر اسی قبیلے کی لڑکی سے نکاح کرلیا۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ دونوں باپ بیٹے مل کر اس جگہ پر کعبے کی تعمیر کرو تاکہ لوگ خدا کے اس گھر کا حج و طواف کے لیے آئیں۔

جب بیت اللہ کی تعمیر مکمل ہوئی تو حضرت ابراہیم نے اللہ سے دعا کی:

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا الْبَلَدَ آمِناً وَاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ أَن نَّعْبُدَ الأَصْنَامَ o (ابراہیم:۳۵)

حضرت ابراہیم کی دعا قبول ہوئی لوگ کعبہ کی طرف اس طرح متوجہ ہوئے کہ پورے عرب سے لوگ لعبہ کے مشتاق ہوئے اور اس کی زیارت کرنے اور نماز قائم کرنے کے لیے آئے۔ جس جگہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی بیوی اور شیر خوار بچے کو چھوڑا تھا اللہ تعالیٰ نے اس بے آب و گیاہ وادی کو اس قدر اہمیت بخشی کہ ان کی تجارت بین الاقوامی شہرت کی حامل بن گئی۔ واقعۂ فیل کے باعث جزیرہ عرب کے تمام لوگوں کی نظر میں بیت اللہ کے وقار اور اس کی حرمت میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا اور اس گھر کے متولّین و مجاورین یعنی (قریش) کا مرتبہ اتنا بلند ہوگیا کہ وہ جہاں جاتے عزت و احترام کے ساتھ ان کا استقبال کیا جاتا تھا۔ اس صورت حال کے باعث قریش کو یہ ہمت ہوئی کہ انہوں نے دو عظیم شاہ راہوں کی تجارت کے لیے بنیاد ڈالی۔ ایک جنوب میں یمن تک اور دوسری شمال میں شام تک یوں یہ لوگ موسم سرما میں یمن کی طرف سفر کرتے تھے اور موسم گرما میں شام کی طرف۔ ان کی یہ تجارت عرب تک ہی محدود نہ تھی بلکہ ہندوستان اور دوسرے مشرقی ممالک تک خشکی اور سمندری راستوں سے ان کے تجارتی قافلے روان دوان رہتے تھے۔ اس سورہ میں اللہ تعالیٰ انہیں یہ احسانات یاد دلاتے ہوئے عار دلاتا ہے کہ ایک طرف کعبۃ اللہ، جس کی بنیاد توحید پر ڈالی گئی ہے، کی مجاوری کو لے کر خصوصی فوائد کو سمیٹ رہے ہو اور دوسری طرف اللہ کے ساتھ دوسرے معبودوں کی پرستش کررہے ہو! آپ کو شرم آنی چاہیے کیونکہ اللہ ہی تو اس گھر کا رب ہے جس کے آس پاس آپ امن اور خوشحالی کے ساتھ رہتے ہو۔ اسی کے نام سے حفظ و امان کے ساتھ سفر کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ قریشی قبیلوں کو پکار کر فرماتا ہے کہ تم لوگوں کو جاڑے اور گرمی کے سفر سے لگاؤ ہے۔ تم سفروں سے مانوس ہوگئے ہیں۔ تجارت کی وجہ سے تم لوگ بڑے مالدار بن گئے ہیں اور اس کعبے کی بدولت ہی تم لوگوں کو ایسی شہرت اور عزت حاصل ہوئی ہے لہذا تمہیں اس گھر کے رب کی بندگی کرنی چاہیے جس کی خیر و برکت سے تم کو امن و امان حاصل ہوا اور جس کی وجہ سے تم سفر کے عادی ہوگئے اور تمہیں تجارتی فوائد حاصل ہوئے ہیں۔

لِاِیۡلٰفِ قُرَیۡشٍ (۱)

اللہ نے قریش کو مانوس کردیا

إِيلَٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ(۲)

یعنی سردیوں اور گرمیوں میں ان کو تجارتی سفروں سے مانوس کردیا

فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَٰذَا الْبَيْتِ(۳)

اس لیے اُن کو چاہیے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں

الَّذِي أَطْعَمَهُم مِّن جُوعٍ وَآمَنَهُم مِّنْ خَوْفٍ(۴)

جس نے انہیں بھوک میں کھانا دیا اور خوف میں امن بخشا

اللہ نے قریش کو مانوس کردیا

آیت کا مطلب یہ ہے کہ قریش کا رویہ بڑا ہی قابل تعجب ہے کہ اللہ ہی کے فضل سے وہ منتشر ہونے کے بعد جمع ہوئے اور اُن تجارتی سفروں سے مانوس ہوئے جو ان کی خوشحالی کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں اور اب وہ اللہ کی بندگی سے روگردانی کرتے ہیں۔ عرب کی تاریخ بتارہی ہے کہ قریش کا قبیلہ حجاز میں منتشر تھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جد اعلیٰ قُصَّی نے اس قبیلے کو مکہ میں جمع کیا اسی وجہ سے قُصَّی کو مُجْمِعَ (جمع کرنے والے) کا لقب دیا گیا ہے۔ اُس نے اپنے مجمع اقارب کو کعبہ کے احاطے میں بسایا اور کعبہ کو اپنی تحویل اور سپردگی میں لے کر اس کے متولی بن گئے۔

اس شخص نے اپنے اعلیٰ درجہ کے تدبر سے مکہ میں ایک شہری ریاست قائم کی اور ہر طرف سے آنے والے حاجیوں کی خدمت کا بہترین انتظام ہاتھ میں لیا جس کی وجہ سے عرب کے تمام قبیلوں میں قریش کا اثر و رسوخ بڑھ گیا۔ قُصَّی کے بعد مکہ کی ریاست اس کے دو بیٹوں عبد مناف اور عبدالدّار کے درمیان منصبوں کے لحاظ سے تقسیم ہوگئی عبد مناف کو زیادہ مقبول اور نامور ہونے کی وجہ سے عرب میں زیادہ پذیرائی حاصل ہوئی اس لیے کعبہ کے نظم و نسق اور انتظامیہ میں اسی کا زیادہ بڑا کردار (role) رہا۔ بعد میں کعبے کا نظم و نسق (administration) پوری طرح اسی خاندان کے ہاتھ آگیا۔ عبدمناف کے چار بیٹے تھے۔ ہاشم، عبد شمس، مُطَلِب اور نوفَل۔ ان چار بیٹوں میں ہاشم یعنی عبدالمُطلب کے والد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا نے بین الاقوامی تجارت میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا یہ تجارت عرب کے راستے بلاد مشرق اور شام و مصر کے درمیان ہوتی تھی۔ اس زمانے میں ایران کی ساسانی حکومت بین الاقوامی تجارت پر اپنا قبضہ جمائی ہوئی تھی۔ چونکہ تجارت کے راستے میں جو قبیلے حائل تھے وہ خادمانِ بیت اللہ کی حیثیت سے قریش والوں کا بہت احترام کرتے تھے کیونکہ حج کے زمانے میں قریش ان حاجیوں کی خدمت کرتے تھے اس لیے راستے میں آنے والے قبیلے اپنے آپ کو قریش کے احسان مند سمجھتے تھے اور اس وجہ سے قریش کے قافلوں کو ان لوگوں سے کوئی خطرہ نہ رہتا تھا۔ راستے میں آنے والے قبیلے ان سے راہ داری ٹیکس (toll tax) بھی نہیں لیتے تھے۔ جو دوسرے قافلوں سے لیا جاتا تھا۔ ہاشم نے اپنے تینوں بھائیوں کو تجارت کی اس سکیم میں شامل کردیا۔ اس لیے یہ تینوں بھائی تاجران عرب کے نام سے مشہور ہوگئے۔ کئی مورخین قریش سے راہ داری ٹیکس نہ لینے اور انہیں تحفظ دینے کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ ہاشم نے ایک بہت بڑی حکمت عملی (strategy) کے تحت راستے کے آس پاس رہنے والوں سے ایک معاہدہ (treaty) کیا تھا جس میں طے ہوا تھا کہ تجارتی راستوں کے آس پاس رہنے والے لوگ قریش پر کوئی حملہ نہ کریں۔ اس کے بدلے میں قریش کے تجارتی قافلے ان کو کچھ ضروری سامان فراہم کریں گے اور اس معاہدے کے تحت یہ قبیلے نہ صرف انہیں محفوظ راہ داری (safe passage) دیتے تھے بلکہ انہیں سفر کی راہنمائی بھی کرتے تھے۔ اس طرح قریش کے تجارتی قافلے ڈاکوؤں کے حملوں سے بھی محفوظ رہتے تھے۔ اسی تجارت کی وجہ سے اردگرد کے قبیلوں اور ریاستوں سے اُن کے گہرے تعلقات قائم ہوئے اور ان میں

ایک دوسرے کی ہمدردی پیدا ہوئی جس سے ان کے درمیان پیار و محبت اور الفت کا ماحول پیدا ہوگیا۔ اسی بنا پر قریش کو اَصحاب الاِیلاف یعنی ''الفت پیدا کرنے والے'' کہا جاتا تھا۔

اس محفوظ (safe) کاروبار کی وجہ سے قریش کے تجارتی تعلقات شام، مصر، عراق، ایران، یمن اور حبشی ممالک کے ساتھ قائم ہوگئے اور عرب کا کوئی قبیلہ ان کے ہم پلہ نہ رہا۔ مال و دولت کے اعتبار سے بھی قریش کو عرب کے قبیلوں پر برتری حاصل ہوگئی تھی اور یوں مکہ جزیرہ عرب کا سب سے زیادہ اہم تجارتی مرکز بن گیا۔ ان تجارتی تعلقات کا انہیں ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ عراق سے قریش جو رسم الخط لے کر آئے وہی بعد میں قرآن مجید کو تحریر کرنے میں استعمال ہوا اور عرب کے کسی قبیلے میں اتنے پڑھے لکھے لوگ نہ تھے جتنے قریش میں تھے۔ اسی بنیاد پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پہلے عرب کی سرداری قبیلہ حمیر کو حاصل تھی پھر اللہ تعالیٰ نے وہ ان سے سلب کرکے قریش کو دے دی اور یہ کہ قریش لوگوں کے لیڈر ہیں''

قریش کی تجارت اور ترقی عروج پر تھی کہ مکہ پر ابرہہ نے حملہ کردیا اگر ابرہہ مکہ فتح کرنے اور کعبے کو ڈھانے میں کامیاب ہوجاتا تو پورے عرب میں قریش سمیت کعبہ کی شہرت اور دھوم ختم ہوجاتی اور عرب کے لوگوں میں بیت اللہ سے متعلق مضبوط عقیدہ متزلزل ہوجاتا اور قریش کو اس گھر کے خادم ہونے کی حیثیت سے جو احترام پورے ملک میں حاصل تھا وہ بھی ختم ہوجاتا۔ اسی طرح بے روک ٹوک تجارت بھی ختم ہوجاتی اور قریش اُسی خستہ حالی میں مبتلا ہوجاتے جس میں وہ قُصَیِ بن کلاب سے پہلے مبتلا تھے۔ ان کا شیرازہ بکھر جاتا اور اُن کی مذہبی دھاک بھی مٹ جاتی۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے پرندوں کے لشکر کی سنگ باری سے دشمن کے پورے لشکر کو ابرہہ سمیت ہلاک کرکے اپنی قدرت کا معجزہ دکھایا تو کعبہ کے بیت اللہ ہونے پر اہل عرب کا ایمان پہلے سے زیادہ مضبوط ہوگیا اور عرب سے باہر کے ملکوں پر بھی اس معجزے سے قریش کا رعب داب قائم ہوگیا۔ اس طرح عربوں کو یقین ہوگیا کہ ان پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہے اور یوں قریش بلادِعرب کے ساتھ ساتھ دیگر ملکوں کے ساتھ بھی بے خوف تجارت کرتے رہے۔ ان سے کوئی بھی شخص چھیڑنے کی جرأت نہ کرتا تھا بلکہ ان کو ہر طرف سے جانی اور مالی تحفظ ملتا تھا۔ اس لیے ان کے تجارتی سفر امن و اطمینان سے جاری رہتے تھے۔ اس سورہ میں قریش سے یہی بات کہی جاتی ہے کہ جب تم خود خدا کے اس گھر خانہ کعبہ کو بتوں کے بجائے اللہ کا گھر مانتے ہو اور جب تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی تمہیں اس گھر کے طفیل یہ امن عطا کیا، تمہاری تجارت کو فروغ بخشا اور تمہیں فاقہ کشی سے نجات دے کر خوشحالی عطا کی تو پھر تمہیں اُسی خدائے برتر و بزرگ کی عبادت کرنی چاہیے۔ لِاِیْلٰفِ قُرَیْش میں اسی جانب اشارہ ہے کہ قریش کا رویہ تعجب انگیز ہے کہ اللہ کے فضل کی بدولت ہی وہ منتشر ہونے کے بعد جمع ہوئے اور ان تجارتی سفروں سے مانوس ہوئے جو ان کی خوشحالی کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ کس قدر تعجب کی بات ہے کہ وہ اللہ کی روگردانی کرتے ہیں جس نے ان کو کعبہ کے پاس جمع ہونے اور اس کے متولی بننے کا موقعہ عطا کیا! یہ اللہ کے فضل اور اس کے احسان کو بھول گئے ہیں اور خدا کی بندگی اور پرستش میں بتوں کو شریک کر رہے ہیں۔

یعنی سردیوں اور گرمیوں میں ان کو تجارتی سفروں سے مانوس کردیا

چونکہ گرمی کے زمانے میں قریش کے تجارتی سفر شام و فلسطین کی طرف ہوتے تھے۔ سردی کے زمانے میں وہ عرب کے جنوبی علاقوں مثلاً یمن وغیرہ کی طرف جاتے تھے۔ اس طرح یہ لوگ سردی اور گرمی کے دونوں موسموں میںاپنی تجارت کو سال بھر جاری رکھتے تھے یہ ان پر اللہ کا احسان تھا کہ ان کو سردی اور گرمی کے دونوں موسموں کی تجارت سے الفت ہوگئی تھی۔

لہٰذا ان کو چاہیے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں

اس گھر سے مراد خانہ کعبہ ہے جس کے رب کی عبادت کرنے کے لیے فرمایا جارہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ قریش کو یہ نعمت اسی گھر یعنی خانہ کعبہ کی بدولت حاصل ہوئی ہے اور ان کو یہ بھی معلوم کہ 360بت جو انہوں نے کعبہ میں رکھے ہیں جن کی وہ پوجا کررہے ہیں وہ کعبہ کے رب نہیں بلکہ کعبے کا رب صرف وہ اللہ تعالیٰ ہے جس نے اس کو دشمن کے حملے سے بچالیا۔ اسی سے انہوں نے ابرہہ کے خلاف مدد مانگی تھی یہی گھر ہے جس کی پناہ میں آنے سے پہلے وہ عرب میں منتشر تھے اور ان کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ مگر جب وہ مکہ میں اس گھر کے گرد جمع ہوئے اور اس کی خدمت انجام دینے لگے تو یہ سارے عرب میں محترم اور معزز ہوگئے اور ہر طرف ان کے تجارتی قافلے بے خوف و خطر آنے جانے لگے۔ اس لیے انہیں چاہیے کہ اس گھر یعنی کعبہ کے خدا ہی کی عبادت کریں۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ جس خدا نے ان لوگوں کو یہ عزت بخشی ہے اگر اس پر اور اس کے رسول پر یہ ایمان نہ لائیں گے تو وہ وقت دور نہ ہوگا جب وہ ابرہہ کے لشکر کی طرح تباہ وبرباد ہوجائیں گے۔

جس نے انہیں بھوک میں کھانا دیا اور خوف میں امن وامان دیا

یہاں اشارہ ہے کہ قریش منتشر تھے انہیں رزق نہیں ملتا تھا وہ بھوکے مر رہے تھے پھر جب وہ کعبہ کے پاس رہنے لگے تو ان کے لیے رزق کے دروازے کھل گئے اور ان کے حق میں حضرت ابرہیم علیہ السلام کی وہ دعا حرف بہ حرف پوری ہوئی جو انہوں نے اسمٰعیلؑ کی ذریّت کے حق میں کی تھی جس کو انہوں نے بے آب و گیاہ وادی میں بسایا تھا:

جس خوف و ڈر سے عرب کی سرزمین میں کوئی بھی آدمی محفوظ نہ تھا اُس سے صرف قریش محفوظ تھے۔ اُس وقت عرب کا حال یہ تھا کہ پورے ملک میں کوئی بستی ایسی نہ تھی جس کے لوگ راتوں کو چین سے سو سکتے کیونکہ ان کو ہر وقت یہ ڈر لگا رہا تھا کہ نہ معلوم کب کوئی حملہ آور ان پر چھاپہ مار کر ان کو تخت وتاراج کرے گا ! کوئی بھی شخص قبیلے کی حدود سے باہر نکلنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ لیکن قریش مکہ میں بالکل محفوظ تھے۔ انہیں کسی دشمن کے حملے کا خطرہ نہ تھا ان کے قافلے ملک کے ہر حصے میں بلا خوف وخطر آتے جاتے تھے۔ قافلے سے اگر کوئی آدمی چھُٹ جاتا تو معلوم ہونے پر کہ چھٹا ہوا آدمی خادمان حرم (قریش) سے تعلق رکھتا ہے تو اس کے ساتھ چھیڑنے کی کوئی شخص جرأت نہ کرسکتا تھا۔ قریش کا کوئی اکیلا شخص اگر کہیں سے گزر رہا ہوتا تو کوئی اس کی پوچھ گچھ کرتا تو اس کے لیے حَرَمِی یا اَنَا مِن حَرَمِ اللہ کہنا کافی تھا یہ سنتے ہی اٹھے ہوئے ہاتھ رک جاتے اس طرح قریش کو اللہ نے لوٹ مار اور خوف و ڈر سے محفوظ رکھا تھا۔

سُوۡرَةُ الۡمَاعُوۡنِ

آیٰتُھا: 7 رکوعھا: 1

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

أَرَأَيۡتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ○ فَذٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الۡيَتِيمَ○ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الۡمِسۡكِينِ○ فَوَيۡلٌ لِّلۡمُصَلِّينَ○ الَّذِينَ هُمۡ عَن صَلَاتِهِمۡ سَاهُونَ○ الَّذِينَ هُمۡ يُرَاءُونَ○ وَيَمۡنَعُونَ الۡمَاعُونَ○

تعارف:

اس سورہ میں ایک ایسی عظیم حقیقت کو ظاہر کردیا گیا ہے جس کے اظہار کے بغیر ایمان و کفر یک جان و دوقالب کی صورت اختیار کرلیتے۔ یعنی اسلام کے پردہ میں کفر بھی اپنا کام کرتا چلا جاتا لیکن اللہ

ذوالجلال نے اپنے معتبر کلام میں ایک حکیمانہ انداز میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ ایمان اور کفر ایک ہی جگہ سما نہیں سکتے ہیں بلکہ یہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یہ دو ایسے کردار (characters) ہیں جن کا رول بھی الگ الگ ہے اور نتیجہ بھی علاحدہ علاحدہ۔ ایک کا انجام حصول جنت ہے اور دوسرے کا انجام دخول جہنم ہے۔ آخرت پر یقین کرنا اور نہ کرنا ایک ایسا فارمولہ ہے جس کے ذریعے حق و باطل کے دونوں راستے الگ الگ ہوجاتے ہیں۔ جو آخرت پر یقین رکھتا ہے اُس کا مقام جنت ہے اور جو آخرت کا منکر ہو اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

آخرت کو مانے بغیر ایک انسان کا ایمان نامکمل اور بے سود ہے۔ آخرت پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا ہے اور اس سے اس کے سارے اعمال کا حساب لیا جائے گا جس شخص کو آخرت کے حساب اور جواب دہی پر ایمان اور یقین نہ ہو تو وہ کوئی نیک اور احسن کام انجام نہیں دے سکتا ہے۔ جس شخص کو اس بات پر ایمان نہ ہو کہ مرنے کے بعد اللہ کے پاس حاضر ہونا ہے جو اس کے ہر کام کا جائزہ لے گا اور اس کے اعمال کا حساب لے گا تو وہ کسی بھی نیک کام کرنے کو ضروری نہیں سمجھے گا اور اگر مجبوراً اسے ایسا کوئی کام کرنا بھی پڑے گا تو اس میں کوئی خلوص نہ ہوگا۔

یہ سورۃ ان حالات میں نازل ہوئی ہے جب اہل اسلام کو ایک قوت حاصل ہوچکی تھی تو بہت سے لوگ ایسے تھے جو ابھی ایمان لانے کے لیے تیار نہ تھے۔ اس لیے وہ مصلحۃً ایمان لاتے تھے اور مجبوراً مسجد میں آکر مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہوکر دکھاوے کی نماز پڑھتے تھے تاکہ انہیں مسلمانوں میں شمار کیا جائے۔ حالانکہ وہ سچے دل سے ایمان نہیں لاتے تھے اور نہ ان کو قیامت اور آخرت پر کسی طرح کا یقین تھا۔ اس سورہ میں اسی حقیقت کو واضح کردیا گیا ہے کہ آخرت پر ایمان نہ لانا انسان کے اندر کس کس قسم کی برائیاں پیدا کردیتا ہے۔ آخرت کو جھٹلانے والے لوگ یتیموں کو دھکے دینے اور مسکینوں کو ستانے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے ہیں۔ اور نہ غریبوں مسکینوں اور محتاجوں کو کھانا دینے کی ترغیب دیتے ہیں اور نہ ان کی مدد کرتے ہیں بلکہ ان کا حق چھین لیتے ہیں۔ ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ یہ یتیموں کے مال کی حفاظت کرنے کے بجائے اُسے ہڑپ کرلیتے ہیں۔ غریبوں، مسکینوں اور محتاجوں کی مدد کرنے کے بجائے ان کا استحصال کرتے ہیں۔ ایسے لوگ منافقین ہیں جو بظاہر مسلمان ہیں مگر اصل میں انہوں نے اسلام قبول نہیں کیا۔ ان منافقوں کا یہ طرز عمل بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو ذہن نشین کرایا جائے کہ اس کے اندر ایک مضبوط اور پاکیزہ کردار آخرت کے عقیدہ کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتا ہے۔ اس لیے ایمان کے بعد آخرت پر کامل یقین ہونا ضروری ہے یعنی ایمان اور آخرت پر یقین لازم وملزوم ہیں۔ زبان سے مسلمان ہونے کا دعویٰ کرنا کافی نہیں ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مسلمان ہونے کے بعد دین کے اصولوں اور احکام پر عمل کرنا اور نماز، روزہ اور دوسرے دینی شعائر و عبادات کو ادا کرنا مسلمان کی پہچان ہے۔ لیکن اس پہچان کی ایک بنیاد ہے جو سچا مسلمان اور مومن ہونے کی تصدیق کرتی ہے وہ ہے آخرت اور جزا و سزا پر ایمان و ایقان۔ ایمان کی یہ حقیقت جب دل میں جاگزیں ہوجاتی ہے تو عمل صالح فوراً حرکت میں آجاتا ہے۔ اگر ایمان لانے اور مسلمان ہونے کی پہچان کے بعد بھی عمل صالح کی حرکت پیدا نہ ہو تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ایمان کی حقیقت اس میں موجود نہیں ہے اور اس کا ایمان بے بنیاد ہے۔

أَرَأَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ(۱)

بھلا تم نے اُس شخص کو دیکھا جو آخرت کی جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے

فَذَالِكَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ(۲)

یہ وہی شخص ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے

وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْكِیْنِ(۳)

اور مسکین کو کھانا دینے کی ترغیب نہیں دیتا ہے

فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ(۴)

پس تباہی ہے اُن نمازیوں کے لیے

الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ(۵)

جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں

الَّذِيْنَ هُمْ يُرَاؤُوْنَ(٦)

جو ریاکاری کرتے ہیں

وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ(۷)

اور معمولی چیزیں (لوگوں کو) دینے سے گریز کرتے ہیں

بھلا تم نے اُس شخص کو دیکھا جو آخرت کی جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے

بظاہر خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن اصل میں ہر ایک آدمی کو مخاطب کرکے غور وفکر کی دعوت دی جاتی ہے اور سوالیہ انداز میں پوچھ کر دراصل اس بات کو سمجھانا مطلوب ہے کہ جو لوگ آخرت کو جھٹلاتے ہیں اور جنہیں اُخروی جزا و سزا پر یقین نہیں، وہی لوگ یتیموں کا مال ہڑپ کرتے ہیں اور انہیں دھکے مار مار کر اپنے پاس سے بھگاتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں مسکینوں کو مدد کرنے اور انہیں کھانا دینے کے لیے لوگوں کو اکسانے اور آمادہ کرنے کی کوئی فکر نہیں ہے اور نہ وہ خود ان بھوکے مسکینوں کے لیے کھانے پینے کا کوئی انتظام کرتے ہیں۔

آیت میں لفظ 'دین' استعمال کیا گیا ہے بعض علما کے نزدیک دین سے مراد یوم دین یعنی قیامت کا دن

ہے جب کہ بعض کے نزدیک دین سے مراد دین اسلام ہے اور بعض کے نزدیک بیک وقت دونوں معنی یعنی دینِ اسلام اور آخرت کی جزا و سزا مراد ہیں کیونکہ یتیموں کا مال کھانے والا نہ دین کو مانتا ہے نہ آخرت کو اور نہ وہ جزا و سزا کو مانتا ہے۔ آیت میں یہ جو فرمایا گیا ہے کہ ''تم نے دیکھا اس شخص کو''، اس سے صرف دیکھنا مراد نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ کیا تم نے اس شخص کے کردار پر غور کیا ہے جو آخرت کو جھٹلاتا ہے اور اس وجہ سے یتیموں کو دھکے دیتا ہے۔ واضح ہوا کہ جو لوگ یتیموں پر رحم نہیں کرتے ہیں بلکہ ان کا مال ہڑپ کرتے ہیں اور جب وہ ان کے پاس اپنا ہی حق مانگنے کے لیے آتے ہیں تو نہ صرف مال واپس کرنے سے انکار کرتے ہیں بلکہ انہیں دھکے دے کر اپنے پاس سے ہٹاتے ہیں، اصل میں اُن کو قیامت کے برپا ہونے اور آخرت کی جزا و سزا پر یقین نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے یہ لوگ ایسی گھناونی حرکت کرتے ہیں کہ بے دریغ یتیموں کا مال کھاتے ہیں۔

اس آیت کی تفسیر میں ایک فکر انگیز واقعہ شان نزول کے طور پر پیش کیا گیا ہے کہ ابو جہل ایک یتیم کا وصی تھا۔ یتیم کے باپ نے اُس کے پاس اپنے نابالغ اور نا فہم بچے کا مال امانت کے طور پر رکھا تھا۔ ایک روز یہ یتیم بچہ ابو جہل کے پاس اپنا مال مانگنے کے لیے آیا وہ اس حالت میں تھا کہ اس کے بدن پر پوری طرح کپڑے بھی نہ تھے مگر ظالم ابو جہل نے یتیم کو مال دینے سے انکار کیا اور اسے دھکے دے کر اپنے پاس سے بھگادیا۔ یتیم لڑکا قریش کے سرداروں کے پاس ابو جہل کی شکایت لے کر گیا۔ قریش کے سرداروں نے از راہ شرارت لڑکے سے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاکر شکایت کرو۔ وہ ابو جہل سے تیرا مال دلوادے گا۔ لڑکا بے چارہ ناواقف تھا کہ ابو جہل کا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تعلق ہے اور ان بدبختوں نے اس کے پاس جانے کا کیوں مشورہ دیا۔ وہ ان کی مکروہ چال کو نہ سمجھ سکا اور سیدھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا اور اپنا حال بیان کیا۔ یہ ماجرا سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے اور اسے ساتھ لے کر ابو جہل کے پاس پہنچے ابو جہل نے آپؐ کو دیکھ کر آپؐ کا استقبال کیا اور آپؐ نے جب اسے لڑکے کا مال واپس کرنے کے لیے کہا تو اُس نے فوراً اس کا مال لاکر اسے واپس کردیا۔ قریش کے سردار اس انتظار میں تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو جہل کے درمیان جھگڑا ہوجائے اور ہم محمدؐ کا خوب مذاق اڑائیں گے، لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ ابو جہل نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کہنے پر یتیم بچے کا مال واپس کردیا تو وہ حیران ہوکر ابو جہل کے پاس آئے اور طعنہ دے کر کہا کہ تم نے اپنا دین چھوڑا ہے کیونکہ تم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کہنے پر یتیم کو اپنا مال واپس کردیا۔ اس نے قسم کھاکر کہا کہ میں نے اپنا دین نہیں چھوڑا، لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے دائیں اور بائیں ایک ایک حربہ (جنگی ہتھیار) ہے اور مجھے لگا کہ اگر میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کے خلاف ذرا بھی حرکت کی تو یہ حربے میرے سینے کے اندر گھس جائیں گے۔

اس واقعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عرب کے ''معزز'' لوگ اور قبیلوں کے بڑے بڑے سردار کس طرح یتیموں کی بے قدری کرتے اور ان کا حق ہڑپ کرلیتے تھے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح ہوجاتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کس بلند اخلاق کے مالک تھے اور ان کے بلند اخلاق کی تاثیر اور رعب کی وجہ سے قریش آپؐ کو جادوگر بھی کہتے تھے۔ حالانکہ اس اخلاقی رعب کی وجہ سے ابوجہل نے فوراً یتیم بچے کو اپنا مال واپس کردیا اور اسی اخلاقی قوت نے حربوں کی شکل اختیار کرکے اسے مرعوب کیا اور محمدؐ کے سامنے بے بس کردیا۔

اور مسکین کو کھانا دینے کی ترغیب نہیں دیتا ہے

جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے ہیں اور یتیموں کے مال کی حفاظت کرنے کے بجائے ان کا مال ہڑپ کرلیتے ہیں ان لوگوں سے مسکینوں پر مال خرچ کرنے کی کس طرح کی توقع کی جاسکتی ہے۔ یہ لوگ جب یتیموں کا مال ہڑپ کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے ہیں تو یہ لٹیرے ان کی کیا خاک مدد کرسکتے ہیں۔

آیت میں فرمایا گیا ہے کہ وہ مسکین کو کھانا دینے کی ترغیب نہیں دیتا ہے یا اسے کھانا کھانے پر نہیں اُکساتا ہے اس سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ جو کھانا مسکین کو دیا جاتا ہے وہ اس کا حق ہوتا ہے اس لیے کھانا دینے والا کوئی بخشش نہیں دے رہا ہے۔ بلکہ وہ مسکین کا وہ حق ادا کر رہا ہے جو اس کے پاس بطور امانت ہوتا ہے۔ جس طرح کسی یتیم کا مال کسی وصی کے پاس ہوتا ہے اور جب وہ یتیم کو اپنا مال واپس کرتا ہے تو جیسے وہ اس کا حق ادا کرتا ہے، اسی طرح مال دار کے مال میں مسکین کا حق ہوتا ہے جسے ادا کرنا مالدار کی ذمہ داری ہے۔ یہی بات سورہ ذاریات آیت:۱۹ میں فرمائی گئی ہے:

وَفِیۡۤ اَمۡوَالِہِمۡ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ...

مسلم معاشرے کے ہر ایک شخص کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو مساکین کی مدد کرنے پر ہر وقت آمادہ رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے گھر والوں اور دوسرے لوگوں کو بھی اکسائے تاکہ معاشرے میں جو غریب اور محتاج لوگ بھوکے مر رہے ہوں ان کو بھوک مری سے بچایا جاسکے اور جو غربت کی وجہ سے فاقہ کشی کے شکار ہوں ان کی مدد کی جائے۔ مسلم معاشرے میں غریبوں کی مدد کرنا اور انہیں فاقہ کشی سے نجات دلانا حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے اگر مسلم حکومت قائم نہ ہو تو پھر مسلم معاشرہ میں مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ غریبوں، مسکینوں اور ناداروں کی مالی معاونت میں اپنا رول ادا کریں۔

پس تباہی ہے اُن نمازیوں کے لیے جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں

ان نمازیوں کے لیے تباہی کا اعلان ہے جو نماز پڑھتے ہیں لیکن نماز کا مقصد نہیں سمجھتے ہیں یہ لوگ ظاہری طور نماز پڑھتے ہیں لیکن اصل میں ان کی نماز اللہ کے لیے نہیں بلکہ دکھاوے کے لیے ہوتی ہے۔ اس لیے نماز ادا کرنے کے باوجود یہ لوگ نماز سے غافل ہوتے ہیں اور انہیں ان نمازوں سے تباہی اور بربادی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ یہ لوگ اپنی نمازوں سے اس طرح غافل ہوتے ہیں کہ نماز پڑھنے یا نہ پڑھنے سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا ہے کیونکہ ان کی نگاہ میں نماز کی کوئی اہمیت نہیں ہے نماز پڑھنا یا نہ پڑھنا، دونوں صورتیں ان کے لیے یکسان ہیں اس لیے یہ لوگ کبھی نماز پڑھتے ہیں اور کبھی نہیں پڑھتے جب کبھی انہیں لوگوں کو دکھانے کے لیے نماز پڑھنے کی مجبوری ہوتی ہے تو اس وقت یہ نماز پڑھتے ہیں ورنہ نماز پڑھنے کی یہ لوگ ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے ہیں۔ اس لیے نماز کو ٹالتے رہتے ہیں اور جب نماز کا وقت قریب آجاتا ہے تو اٹھ کر بادل ناخواستہ مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہوکر دکھاوے کے لیے نماز کی رسم ادا کرتے ہیں یا نماز کا وقت ٹال کر اٹھتے ہیں اور دو چار ٹھونگیں مارلیتے ہیں یا نماز کے لیے اس طرح اٹھتے ہیں کہ جیسے کوئی مصیبت ان پر نازل ہوگئی ہے۔ یہ نماز پڑھتے ہوئے لباس سے کھیلتے ہیں لمبی جمائیاں لیتے ہیں۔ انہیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ نماز پڑھ رہے ہیں اور نہ انہیں یہ خیال ہوتا ہے کہ انہوں نے کیا پڑھا ہے یوں نہ ان کا قیام ٹھیک ہوتا ہے اور نہ رکوع و سجود بس کسی نہ کسی طرح نماز ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ مومن جب نماز میں ہوتا ہے تو اس طرح قرار پاتا ہے جیسے پانی میں مچھلی۔ آخرت پر ایمان نہ ہونے کی یہ بھی ایک علامت ہے جو ان لوگوں میں پائی جاتی ہے جو نماز سے غافل رہتے ہیں یا اگر پڑھتے ہیں تو رکوع سجود اور دعاؤں کی طرف دھیان نہیں دیتے ہیں یا اس لیے پڑھتے ہیں کہ لوگوں کو دکھانے کی کوئی مجبوری ہو دراصل ان لوگوں کے نماز پڑھنے کا یہ طرز عمل اس وجہ سے ہوتا ہے کہ وہ نماز پڑھنے پر کسی جزا کے قائل نہیں ہوتے ہیں اور نماز نہ پڑھنے پر کسی سزا کے قائل نہیں ہوتے ہیں۔

انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ فِی صَلَاتِھِمْ سَاھُوْن کے بجائے عَنْ صَلَاتِھِمْ سَاھُوْن فرمایا گیا ہے۔ فی صَلَاتِھِمْ سَاھُوْن کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ اپنی نماز میں بھولتے ہیں لیکن نماز کے دوران بھول جانا باعث وعید نہیں اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تلافی کے لیے سجدہ سہو کا طریقہ مقرر فرمایا ہے۔ عن صلاتِھِمْ کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی نماز سے غافل ہیں یعنی ان کی نظروں میں نماز کی کوئی اہمیت نہیں ہے اس لیے یہ منافقوں کی نماز ہے جو کسی مجبوری کے تحت مسلمانوں کے صفوں میں گھس کر بے دلی سے دکھاوے کے لیے پڑھتے ہیں اور اس طرح یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ انہوں نے ایمان لایا ہے اور مسلمان ہوگئے ہیں۔

غفلت کی نماز کے تین زُمرے ہیں وہ جس میں منافقین شامل ہیں جو نماز پر یقین نہیں کرتے ہیں البتہ کسی مجبوری کے تحت مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں، مسلمانوں کو اس طرح کے منافق نماز گزاروں سے دھوکہ ہوسکتا ہے جیسا کہ اسلامی تاریخ سے ثابت ہے۔ منافقین کی اس کیفیت کو قرآن مجید میں سورہ توبہ آیت:۵۴ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

وَلَا یَأْتُونَ الصَّلَاۃَ اِلَّا وَھُمْ کُسَالٰی وَلَا یُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَھُمْ کَارِھُوْنَ

نماز میں غفلت کرنے والوں کا دوسرا زُمرہ (group) وہ ہے جس میں لوگ لاپروائی کرکے نماز کے وقت کو ٹال کر نماز ادا کرتے ہیں اور کبھی پڑھتے ہیں کبھی نہیں پڑھتے ہیں اپنی مرضی کے مطابق نماز پڑھتے ہیں۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو لوگ نماز کا وقت ٹال کر نماز پڑھتے ہیں وہ نماز سے غفلت برتتے ہیں۔ اس طرح کی نماز پڑھنے والے اگرچہ دل پسندگی اور دل جمعی سے نماز پڑھتے ہیں لیکن نمازوں کے تعین ان کی لاپرواہی انہیں غافل بنادیتی ہے۔ اس نماز کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

نماز سے غفلت کرنے والے تیسرے زمرے میں وہ لوگ شامل ہیں جو مانتے تو ہیں کہ نماز مومن کی پہچان ہے اور نماز سے ہی مشرک اور مومن کا فرق واضح ہوجاتا ہے۔ اس لیے وہ پابندی سے نماز پڑھتے ہیں، لیکن بشری کمزوری یا نادانستگی سے نماز کے دوران اپنی توجہ ادھر ادھر کرلیتے ہیں۔ یا نماز پڑھتے ہوئے کپڑوں یا جسم کے کسی عضو کو غیر ضروری طور پر ہاتھ لگا کر چھوتے ہیں، جمائیاں لیتے ہیں یا کسی وقت سجدہ کرنا بھول جاتے ہیں یا رکوع میں جانا ہوتا ہے تو سجدے میں جاتے ہیں یا کبھی ایک ہی رکعت کے بعد سلام پھیرتے ہیں۔ اس طرح کی غفلت اور اس طرح کی حرکتوں سے یہ لوگ اچھی طرح نماز تو ادا نہیں کرسکتے ہیں لیکن یہ ایسی حرکتیں نا فہمی اور نا سمجھی کی وجہ سے کرتے ہیں اور ان کی نمازوں میں وہ خشوع و خضوع نہیں ہوتا ہے جو ایک مومن کی نماز میں ہونا چاہیے لیکن انہیں نمازوں پر پورا یقین ہوتا ہے اور وہ نماز پڑھنے سے جی نہیں چراتے ہیں۔ ایسے نماز گزاروں کے لیے اگرچہ نمازوں میں سدھار لانے اور نماز میں اللہ کی طرف توجہ کرنے اور نماز میں دھیان رکھنے کی صلاح دی جاتی ہے تاہم ایسے لوگ منافقوں کے زمرے میں نہیں آتے ہیں۔ ان لوگوں کو صرف نماز کے ارکان سمجھانے کی ضرورت ہے تاکہ وہ خشوع اور خضوع سے نماز ادا کرسکیں گے۔

جو (نمازوں میں) ریاکاری کرتے ہیں

منافق کوئی بھی نیک کام اخلاص نیت سے نہیں کرتے ہیں بلکہ جو کچھ کرتے ہیں دکھانے کے لیے کرتے ہیں۔ نمازوں کا سہارا لے کر اپنے مذموم مفادات حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور لوگوں کو یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ مسلم سماج میں ان کی دین داری کو تسلیم کیا جائے۔ حالانکہ یہ لوگ ہمیشہ اسلامی اقدار اور اسلام بحیثیت ایک مکمل اجتماعی نظام کی مخالفت کرتے ہیں اور سیکولرزم (secularism) کے نام پر مسلمانوں کا استحصال کرتے ہیں انہیں آخرت اور جزا وسزا کا کوئی تصور نہیں ہوتا ہے۔

سورہ النساء آیت:۱۴۲ میں ایسے منافق نمازیوں کے لیے فرمایا گیا ہے:

إِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ يُخَادِعُونَ اللہَ وَھُوَ خَادِعُھُمْ وَإِذَا قَامُوآ إِلَى الصَّلاَةِ قَامُوآ كُسَالَى يُرَآؤُوْنَ النَّاسَ وَلاَيَذْكُرُونَ اللہَ إِلاَّ قَلِيْلاًo

ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس طرح کی نماز پڑھنے سے مراد منافقین کی نماز ہے جو لوگوں کو دکھانے کے لیے نماز پڑھتے ہیں ایسی نمازوں کے بارے میں ہی علامہ اقبال نے بجا طور پر فرمایا ہے:

تیرا امام بے حضور، تیری نماز بے سرور

ایسی نماز سے گزر، ایسے امام سے گزر

اقبالؒ

اور معمولی چیزیں (لوگوں کو) دینے سے گریز کرتے ہیں

علمائے تفسیر کی ایک بڑی جماعت نے جن میں حضرت علیؓ، ابن عمرؓ اور حسن بصری وغیرہ شامل ہیں ماعون سے زکوٰۃ مراد لی ہے لیکن بہت سے مفسرین جن میں ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ اور ابومالکؒ جیسے حضرات شامل ہیں نے اس سے مراد عام ضرورت کی چیزیں جیسے ہنڈیا، ڈول، کلہاڑی، ترازو، نمک، پانی، آگ، چقماق (موجودہ دیاسلائی) وغیرہ لیے ہیں جو لوگ ایک دوسرے سے عموماً عاریۃً! مانگتے ہیں۔

ماعون ایک چھوٹی اور قلیل چیز کو کہتے ہیں اس لحاظ سے ماعون لوگوں کی وہ عام چیزیں ہیں جو زندگی میں عام طور پر استعمال کی جاتی ہیں۔ لیکن کچھ لوگ ماعون کو معمولی شئے سمجھ کر زکوٰۃ مراد لیتے ہیں ان کے نزدیک زکوٰۃ بھی مال کا تھوڑا حصہ ہوتا ہے یا نقد روپے کا تھوڑا حصہ ہوتا ہے جو زکوٰۃ کے طور غریبوں کو دیا جاتا ہے۔ ان لوگوں کی رائے کے مطابق ماعون شَیٌ قلیل کو کہتے ہیں۔ یعنی چھوٹی اور قلیل چیز جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچے اس معنی کے لحاظ زکوٰۃ بھی ماعون ہے کیونکہ وہ بہت مال میں سے تھوڑا سا حصہ ہے جو غریبوں کی مدد کے لیے دیا جاتا ہے اور عام ضرورت کی چیزیں بھی ماعون ہیں جو چھوٹی چھوٹی چیزیں عادۃً ہمسائے ایک دوسرے سے مانگتے رہتے ہیں کیونکہ غریب اور امیر سب کو کسی نہ کسی وقت ان چیزوں کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے اور ایسی چیزوں کو روکنا اخلاقاً ایک ذلیل حرکت ہے کیونکہ ایسی چیزیں استعمال کرکے واپس کی جاتی ہیں۔ اس لیے ان چیزوں کے لین دین میں ایک دوسرے کو مہمان آنے پر بستر فراہم کرنا بھی جائز ہے پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ آخرت کا انکار آدمی کو اتنا تنگ دل بنادیتا ہے کہ وہ دوسروں کے لیے معمولی چیز دینے کو تیار نہیں ہوتا ہے جب کہ وہ معمولی چیز واپس بھی کی جاسکتی ہے۔

ابوبکر الجصاص کہتے ہیں کہ لفظ ماعون کے کئی معنیٰ ہیں مثلاً برتنے کی گھریلو چیزیں۔ حسن سلوک، بھلائی اور فرمانبرداری جو مَعْن سے ماخوذ ہے۔ اس لیے ماعون کے متعلق جو اقوال مروی ہیں ان سب کا مراد ہونا درست ہے۔ الجصاص کے اس قول کے مطابق ماعون لفظ کے جو معنی اور مطلب بیان کیے گئے ہیں وہ سب صحیح ہیں۔ گھریلو زندگی میں استعمال ہونے والی چیزوں کی ایک دوسرے کو ضرورت پیش آتی ہے اور ان ضرورت کی چیزوں سے انکار کرنے والا قابل مذمت ہے اور اس بات سے بخل اور اخلاقی کمزوری کی نشاندہی ہوتی ہے جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے مجھے اس لیے مبعوث کیا گیا کہ میں مکارِم اخلاق کی تکمیل کروں۔ ماعون کا ایک معنی حسن سلوک ہے اس معنی کے لحاظ سے ماعون سے مراد لوگوں سے حسن سلوک کرکے خندہ پیشانی سے پیش آنا ہے۔ بھلائی کے معنی کے لحاظ سے ماعون کا مطلب ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرنا اور ایک دوسرے کی مدد کرنا ہے۔ چاہے ضروریات زندگی کی چیزوں کی مدد ہو یا اپنے مال سے تھوڑا حصہ دے کر ایک دوسرے کی تنگی دور کرنے کی مدد ہو۔ ماعون کا ایک اور معنی فرمانبرداری ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے ماعون سے مراد معاشرے میں ایک دوسرے کی فرمانبرداری کرنا اور ایک دوسرے کو پیار و محبت سے پیش آنا ہے۔ ایک دوسرے کی غیبت نہ کرنا، ایک دوسرے کو تکلیف نہ پہنچانا اور ایک دوسرے کے ساتھ نیک سلوک کرکے زندگی گزارنا اور آپس میں بھائی چارہ قائم رکھنا ہے یہی اسلام کی تعلیم ہے اور یہی اسلام کا دستور ہے۔ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ہیں وہ نہ ایک دوسرے کو معمولی استعمال کی چیزیں عاریتاً دیتے ہیں نہ کسی کی مدد کرتے ہیں نہ لوگوں سے حسن سلوک کرتے ہیں۔ انہیں نہ کسی کی ہمدردی ہوتی ہے اور نہ وہ بھلائی کا کام کرتے ہیں۔ نہ وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور نہ وہ اپنے مال کی زکوٰۃ دیتے ہیں۔ اگرچہ یہ جمع کئے ہوئے مال کا تھوڑا حصہ ہے اور نہ یہ لوگ دل سے نماز پڑھتے ہیں اگر کبھی پڑھتے بھی ہیں تو لوگوں کو دکھانے کے لیے پڑھتے ہیں۔ اسی طرح ماعون کے مطلب اور تشریح کے لیے مجموعی طور سب معنیٰ موزون ہیں۔

سُوْرَۃُ الْکَوْثَرِ

اٰیٰتُھَا: 3 رُکُوْعُھَا: 1

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِنَّاۤ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ ۝ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانۡحَرۡ ۝ اِنَّ شَانِئَکَ ہُوَ الۡاَبۡتَرُ ۝

پس منظر:

تاریخ اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مشیت ایزدی سے آپؐ کی اولاد نرینہ یعنی ان کے دو صاحبزادے قاسم اور عبداللہ بچپن میں ہی فوت ہوئے تو مشرکین نے آپ کو طعنے دینے شروع کردئیے کہ محمدؐ ابتر ہوگئے یعنی ان کی نسل ختم ہوگئی اور وہ لاوارث ہوگئے۔ مشرکین کے ان طعنوں اور بد اخلاقیوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل مبارک کو صدمہ پہنچا اور وہ غمگین ہوگئے کیونکہ ایک طرف آپؐ کو اپنے دو بیٹوں کی وفات کا غم تھا، جو اولاد کے تئیں محبت کا بشری تقاضا ہے، تو دوسری طرف مشرکین، جن میں آپؐ کے رشتہ دار بھی شامل تھے، آپؐ کے بیٹوں کی موت پر خوشیاں منارہے تھے کہ آپؐ لاوارث ہوگئے۔ ان حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لیے سورہ کوثر نازل ہوا جس میں آپؐ کی حوصلہ افزائی کی گئی اور آپؐ کے غم زدہ دل کی تشفی اور تسکین کے لیے فرمایا گیا کہ لوگ آپؐ کو ابتر یعنی لاوارث اور بے یارومددگار سمجھتے ہیں لیکن انہیں معلوم نہیں ہے کہ اصل میں یہی لوگ ابتر بے کس اور بے یارومددگار ہوکر رہیں گے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک تاقیامت روشن رہے گا اور ان لوگوں کا نام ہی دنیا سے مٹ جائے گا۔ لوگوں کی ایک کثیر تعداد آپؐ کی وارث ہوگی لیکن ان مشرکین کی نسل کا کوئی جاننے والا تک نہ ہوگا جیسا کہ تاریخ نے ثابت کردیا۔ اللہ کے رسولؐ کے دشمنوں کا نام ہی دنیا سے مٹ گیا سوائے ابو جہل اور ابو لہب اور ان جیسے چند افراد کے، جن کا نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نامِ پاک کے ہی توسط سے عبرت کے لیے تاریخ میں موجود ہے۔ جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذرّیت آپؐ کی لختِ جگر حضرت فاطمہؓ کی نسل سے دنیا بھر میں موجود ہے اور دینی و معنوی اعتبار سے پوری دنیا میں آپ کی اولاد ایک بہت بڑی امت کی حیثیت سے موجود ہے جو اللہ کی عبادت کرتی ہے اور اپنے آخری رسول خاتم النبین آقائے نامدار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتی ہے جبکہ ان کو ابتر کہنے والوں کی نسل کا کوئی نام و نشان دُنیا میں موجود نہیں ہے۔

لیکن مسلمانوں کو اس بات کا شعور ہونا چاہیے کہ دین اسلام نسلی بنیادوں پر قائم نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا آفاقی اور عالمگیر دین ہے۔ یہ دین مبین بلا لحاظ رنگ و نسل آزادانہ داخلہ (free admission) پر مبنی ہے۔ یہ دین انسانوں کے لیے خدا کی عطا کی ہوئی عظیم نعمت ہے جو قوم اور وطن کی امتیاز کے بجائے ایمان کی پختگی اور اردوں کی مضبوطی سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہ دین ایک ایسا شجر ہے جسے مالی اور جانی قربانیوں سے سینچا گیا ہے اور جسے ایسی ہی قربانیوں سے سرسبز و شاداب رکھا جا سکتا ہے۔

إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ(١)

(اے محمدؐ) بے شک ہم نے تمہیں کوثر عطا کیا

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ(٢)

لہٰذا اپنے رب کے لیے نماز پڑھو اور قربانی کرو

إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ(٣)

یقینا جو تمہارا دشمن ہے وہی بے نام و نشان ہوگا

اے محمدؐ بے شک ہم نے تمہیں کوثر عطا کیا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کوثر عطا کیا گیا اس کے بے شمار مفاہیم ہیں۔ لغوی لحاظ سے اس کا معنیٰ کثرت ہے اس اعتبار سے اس کا مطلب وہ خیر کثیر ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا گیا۔ یہ صرف ایک خیر یا بھلائی نہیں بلکہ بے شمار بھلائیوں اور نعمتوں کی کثرت ہے۔ چونکہ دشمن یہ سمجھ رہے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہر حیثیت سے تباہ ہو چکے ہیں اور قوم سے کٹ کر رہ گئے ہیں ان کی تجارت بھی تباہ ہو گئی۔ اولاد نرینہ، جس سے ان کی نسل آگے بڑھ کر موجود رہتی وہ بھی وفات پا گئی اور تھوڑے سے لوگوں کے بغیر ان کا کوئی ساتھ نہیں دیتا ہے۔ اس لیے وہ (العیاذ باللہ) ناکامی اور نامرادی سے دوچار ہو گئے ہیں اور جب وفات پائیں گے تو دنیا میں ان کا کوئی نام نہ لے گا! ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے اعلان کر دیا کہ اے محمدؐ ہم نے تمہیں کوثر عطا کیا ہے یعنی ہم نے تمہیں خیر کثیر سے نواز دیا ہے۔ اور اس سے مراد ہر قسم کے خیر کی کثرت ہے، یعنی انہیں سب سے پہلے نبوت کی نعمت سے نوازا گیا جس میں قران، علم و حکمت، توحید، بلند مرتبہ، بلند کردار، عظیم شرافت، بلند اخلاق، نرم گفتگو، گرم جستجو، صبر و استقلال، ہمت مردانہ، ایثار نفس، نیت خیر، عادلانہ اور مدبرانہ صلاحیتیں، بردباری و سمجھ داری اور بہت ساری نعمتیں شامل ہیں جن کی بدولت آپؐ مثل آفتاب روشن ہیں اور ان ساری نعمتوں کے فیض سے دنیا کو لگاتار روشن کر رہے ہیں اور ان شاء اللہ تا قیامت روشن کرتے رہیں گے۔ آپؐ کو جو توحید کی نعمت مل گئی اس کی بدولت دنیا کی اکثر آبادی شرک و بدعات، توہم پرستی اور بت پرستی کی غلاظت سے پاک ہو گئی۔ رفع ذکر کی نعمت کی بدولت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ آج تک دنیا کے گوشے گوشے میں ہو رہا ہے اور ان شاء اللہ قیامت تک بلند ہوتا رہے گا۔ آپؐ کی دعوت سے ایک ایسی عالمگیر اُمت وجود میں آگئی جو دنیا میں دین حق کی علمبردار ہے اور جسے حضورؐ نے اپنی زندگی میں ہی دیکھ لیا کہ آپ کے مبارک ہاتھوں ایک ایسی جماعت تیار ہو گئی جو پوری دنیا پر چھا جانے کی طاقت رکھتی ہے۔ آپؐ کو ایک اور نعمت یہ بھی حاصل ہوئی کہ آپ کی ایک ہی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کی اولاد دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذرّیّت سے ہی جانی جاتی ہے۔

عرب کے قبیلوں میں چونکہ نرینہ اولاد کو ہی وارث مانا جاتا تھا اس لیے اولاد نرینہ کی نسل کو ہی یہ لوگ اپنی نسل سمجھتے تھے چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی نرینہ اولاد موجود نہ رہی تھی اس لیے مشرکین سمجھتے تھے کہ ان کی نسل ختم ہوگئی ہے اس لیے یہ ابتر ہیں اس لیے ابولہب نے حضورؐ کے دوسرے صاحبزادے کے انتقال پر مشرکین کو خوش خبری دی بتر محمد ﷺ ۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جڑ کٹ گئی یعنی وہ لاوارث ہوگئے۔

بیٹی کی اولاد کو یہ لوگ وارث نہیں مانتے تھے اور نہ ان کو اپنی اولاد میں شمار کرتے تھے لیکن قران کی رو سے بیٹی کی اولاد بھی وارث ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ابراہیم کی اولاد میں زکریا، یحیٰ اور عیسیٰ کو بھی ہدایت دی انعام:۸۵ ۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام بھی ابراہیم کی اولاد میں سے ہیں، حالانکہ ان کا باپ تھا ہی نہیں بلکہ وہ حضرت ابراہیم کی ذریت میں سے حضرت مریم کے فرزند ہیں۔ اس لیے قرآن کی اس آیت کی رو سے ایک آدمی کی بیٹی کی اولاد بھی اس کی وارث ہوتی ہے۔

کوثر سے مراد وہ حوض کوثر بھی بتایا گیا ہے جو قیامت کے دن آپؐ کو میدان حشر میں ملے گا جبکہ ہر ایک اَلعَطَش اَلعَطَش کر رہا ہوگا یعنی ہر ایک اپنی پیاس بجھانے کے لیے پانی کی خواہش کر رہا ہوگا۔ آپ کی اُمت آپ کے پاس اس حوض کوثر پر حاضر ہوگی اور اس حوض سے پانی پی کر سیراب ہوجائے گی۔
بخاری کی ایک حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ''میں حوض کوثر پر تم سے پہلے پہنچنے والا ہوں اور تم پر گواہی دوں گا اور خدا کی قسم میں اپنے حوض کو اس وقت دیکھ رہا ہوں''
حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن عاص کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا خبردار ہو، میری اور تمہاری ملاقات میرے حوض کوثر پر ہوگی۔ اس حوض کی کیفیت حضورؐ نے یہ فرمائی ہے کہ اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید، برف سے زیادہ ٹھنڈا اور شہد سے زیادہ میٹھا ہوگا۔ جو اس کا پانی پیے گا اسے پھر کبھی پیاس نہ لگے گی۔ اس حوض کے بارے میں حضورؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ جو لوگ میرے طریقے کو بدلیں گے ان کو میرے اس حوض کوثر سے ہٹا دیا جائے گا۔ میں جب کہوں گا یہ میرے اصحاب ہیں تو مجھ سے کہا جائے گا کہ آپ کو نہیں معلوم کہ آپ کے بعد انہوں نے کیا کیا یعنی انہوں نے آپ کے بعد اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور آپ کے طریقہ کو چھوڑ دیا۔ پھر میں ان کو دفع کردوں گا۔ ایک اور موقعہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''خبردار میں تم سے آگے حوض پر پہنچا ہوا ہوں گا اور تمہارے ذریعہ سے دوسری امتوں کے مقابلے میں اپنی امت کی کثرت پر فخر کروں گا خبردار اس وقت میرا منہ کالا نہ کروانا کچھ لوگوں کو میں چھڑاؤں گا اور کچھ لوگ مجھ سے چھڑائے جائیں گے یعنی ان کو مجھ سے واپس لیا جائے گا، اور جب میں کہوں گا اے میرے پروردگار یہ تو میرے صحابہ ہیں وہ فرمائے گا تم نہیں جانتے انہوں نے تمہارے بعد کیا برے کام کئے ہیں۔

بکثرت روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ جنت میں کوثر نامی نہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کی جائے گی اور جب معراج کے موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت کی سیر کرائی گئی اس موقعہ پر آپ کو یہ نہر دکھائی گئی جس کے کناروں پر موتی اور ہیرے تھے جو نہر کے حسن و خوبصورتی میں اضافہ کر رہے تھے۔ مُسند احمد کی ایک روایت ہے کہ حضورؐ نے نہر کوثر کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کی تہہ میں کنکریوں کے بجائے موتی پڑے ہوئے ہیں۔ واللہ اعلم۔

لہٰذا اپنے رب کے لیے نماز پڑھو اور قربانی کرو

بعض علما کے نزدیک اس نماز سے مراد پانچ وقت کی فرض نماز ہے۔ بعض اسے عید قربان کی نماز مراد لیتے ہیں اسی طرح نحر کرنے سے بعض نے کہا کہ اس سے مراد سینے پر ہاتھ باندھنا اور نماز پڑھنا ہے۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد دونوں ہاتھ اٹھا کر تکبیر کہنا ہے اور بعض کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد ہاتھ اٹھا کر رفع یدین کرنا ہے اور بعض لوگوں نے سمجھا ہے کہ نحر سے مراد عید قربان کے دن نماز پڑھنا اور اس کے بعد جانور کی قربانی کرنا ہے۔ لیکن آیت پر اچھی طرح غور کرنے سے مطلب صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو مخاطب کرکے فرمایا ہے کہ اے میرے رسول جب میں نے تم کو اتنی کثیر اور عظیم بھلائیاں اور نعمتیں عطا کی ہیں تو تم میرے لیے نماز پڑھو اور میرے ہی لیے قربانی کرو۔ چونکہ مشرکین خود ساختہ معبودوں کی عبادت کرتے تھے اور ان کے استھانوں پر جانوروں کی قربانیاں کرتے تھے۔ پس آپ کو حکم دیا گیا ہے کہ مشرکین کے ان افعال کے برعکس آپ خدا کے حکم کی اطاعت کرکے اس رویہ پر مضبوطی سے قائم رہیں کہ تمہاری نماز اور قربانی صرف خدائے وحدہٗ لاشریک کے لیے ہو، چاہے مشرکین تم سے کتنے ہی ناراض ہوں اور تم کو کتنے ہی طعنے دیں۔ تم ان کی ناراضگی اور طعنہ زنی سے ہمت نہ ہارو بلکہ اپنے معبودِ برحق کی عبادت کرتے رہو۔ نماز پڑھو اور قربانی اسی کے لیے کرو، جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

قُل اِنَّ صَلَاتِیۡ وَنُسُکِیۡ وَمَحۡیَایَ وَ مَمَاتِیۡ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ لَاشَرِیۡکَ لَہٗ وَبِذَالِکَ اُمِرۡتُ وَاَنَا اَوَّلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ط

اے نبیؐ! کہدو کہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ رب العالمین کے لیے جس کا کوئی شریک نہیں، اُسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مدینہ طیبہ میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے عیدالضحیٰ کی نماز ادا کی اور قربانی کی سنت جاری کی تو صَلاتِیۡ وَنُسُکِیۡ اور فصَلِّ لِرَبِّکَ وَنۡحَرۡ کی ترتیب کے مطابق نماز کو مقدم اور قربانی کو مؤخر کیا اس ترتیب کے لحاظ سے عید کی نماز سے پہلے قربانی کرنا جائز نہیں ہے۔

واضح رہے قربانی سے مراد صرف جانوروں کی قربانی نہیں بلکہ مسلمان کی ہر وہ قربانی مراد ہے جو اسے دین کے لیے پیش کرنی ہے۔ اسے دین اسلام کی اشاعت اور پھیلاؤ کے لیے مالی قربانی کے ساتھ ساتھ جانی قربانی سے دریغ نہیں کرنا ہے۔ اسلام کے لیے مسلمانوں نے جب مالی اور جانی دونوں قسم کی قربانی دی تو اس نتیجے میں انہوں نے پوری دنیا میں اسلام کی تعلیم پہنچائی۔ اس وقت اسلام فکری اور نظری بنیادوں پر پوری دنیا میں چھایا ہوا ہے یہ ان مسلمانوں کی اُن ہمہ جہت قربانیوں کا نتیجہ ہے جو انہوں نے اس دین مبین کے لیے پیش کی ہیں، جن کا ریکارڈ نسل انسانی کے لیے چراغِ راہ (beacon light) کی حیثیت رکھتا ہے۔

یقیناً جو تمہارا دشمن ہے وہی بے نام و نشان ہوگا

اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یقین دلایا گیا ہے کہ جو لوگ آپ کو ابتر کہتے ہیں، حقیقت میں وہی لوگ ابتر ہیں۔ ابتر لفظ بہت وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے یہ لفظ بَتَر سے بنا ہوا ہے جس کے معنٰی کاٹنے یا علاحدہ ہونے کے ہیں۔ اکیلا، جڑ کٹا ہوا، بُرا انجام ہونا اور نامراد ہونا ابتر کے معنٰی میں شامل ہیں۔ ذرائع اور وسائل سے خالی، تجارت و کاروبار میں خسارہ یافتہ اور خیر و بھلائی کے جذبے سے محروم شخص کو بھی ابتر کہتے ہیں اور اپنی برادری اور رشتہ داروں سے کٹ کر اکیلے رہنے والے کو بھی ابتر کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ جب کسی آدمی کی اولاد نرینہ نہ ہو یعنی جس کے بیٹے نہ ہوں وہ بھی ابتر کہلاتا ہے کیونکہ اس کے پیچھے اس کا کوئی نام لینے والا باقی نہیں رہتا ہے۔ ان سب معنوں میں کفار قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتر کہتے تھے۔ اس ضمن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے نبیؐ! ابتر آپؐ نہیں بلکہ آپ کے یہ سارے دشمن ابتر ہیں جو ہر حیثیت سے تباہ و برباد اور ناکام ہوجائیں گے۔ محمدؐ کے دشمنوں کو جو ابتر کہا گیا وہ محض کوئی بد دعا نہیں تھی، بلکہ یہ قرآن کی ایک بہت بڑی پیش گوئی تھی جو حرف بہ حرف ثابت ہوئی۔ جس وقت یہ پیش گوئی کی گئی، اس وقت قریش اور دیگر جانکار لوگوں کی نظروں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابتر تھے۔ ان میں کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ قریش کے یہ بڑے بڑے سردار کس طرح ابتر ہوجائیں گے۔ یہ لوگ نہ صرف مکہ میں بلکہ پورے ملک عرب میں نامور تھے اور مال و دولت اور بیٹے رکھتے تھے اور پورے جزیرۃ العرب میں ان کے ہمدرد، مددگار اور وفادار موجود تھے۔ حج کے منتظم اور تجارت کے اجارہ دار ہونے کی وجہ سے عرب کے تمام قبیلوں سے ان کے وسیع تعلقات تھے۔ لیکن چند سال گزرنے کے بعد ہی حالات بالکل پلٹ گئے۔ ۵ھ میں جنگ احزاب کے موقعہ پر قریش نے یہودی قبایل کے ساتھ مل کر مدینہ پر چڑھائی کردی اس وقت مسلمانوں کو محصور ہوکر شہر کے گرد خندق کھود کر دفاعی جنگ (defensive war) لڑنی پڑی لیکن اس واقعہ کے تین سال بعد ہی ۸ ہجری میں جب مسلمانوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں مکہ پر چڑھائی کردی تو اس وقت قریش کا کوئی حامی و مددگار نہ تھا اور انہوں نے بے بسی اور بے کسی کی حالت میں ہتھیار ڈال دیے اور بے یار و مددگار ہونے کی وجہ سے وہ کسی بھی طرح کی مزاحمت نہ کرسکے۔ حتٰی کہ کہیں سے کسی نے کوئی تیر چلانے کی جرأت نہ کی۔ یہ وہی لوگ تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بے یار ومددگار، بے کس اور ابتر سمجھتے تھے۔ آج آپؐ کے سامنے معافی مانگ رہے تھے اور اپنی بے بسی، بے کسی اور ابتر ہونے کا ثبوت پیش کر رہے تھے۔ پھر اس واقعہ کے ایک سال

بعد ہی پورا ملک عرب محمدؐ عربی کی تحویل اور قیادت وسیادت میں آگیا۔ ملک کے گوشے گوشے سے لوگ وفدوں کی صورت میں آپؐ کے دست مبارک پر بیعت کرنے کے لیے حاضر ہو رہے تھے اور اس طرح آپؐ کے سارے دشمن بے یار ومددگار ہوکر رہ گئے اور دیکھتے دیکھتے عرب کے سب لوگ آپؐ کے دست مبارک پر بیعت کرکے اسلام کے دائرے میں شامل ہوگئے اور آپؐ کے دشمن ایسے بے نام و نشان ہوگئے کہ ان کی اولاد اگر دنیا میں موجود بھی رہی تو کسی کو معلوم نہیں کہ دشمنان اسلام کی اولاد میں سے دنیا میں کوئی موجود ہے۔ اس کے برعکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد دنیا بھر میں اس طرح موجود ہے کہ ان پر درود بھیجی جارہی ہے۔ اَللّٰھُمَ صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍوَّعَلیٰ آلِ مُحَمَّدٍ۔ اے اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی اولاد پر رحمت بھیج۔ دنیا میں کروڑوں مسلمان آپؐ سے نسبت رکھنے والوں پر فخر کرتے ہیں اور آپ کے خاندان اور نسل سے تعلق رکھنے والوں کو قابل عزت سمجھتے ہیں اور اُن سے محبت کرتے ہیں۔ آپ کے خاندان اور آپ سے تعلق رکھنے والا کوئی سید، کوئی علوی، کوئی عباسی، کوئی ہاشمی، کوئی صدیقی، کوئی فاروقی، کوئی عثمانی، کوئی زبیری اور کوئی انصاری کی نسبت سے موجود ہے لیکن کسی ابو جہلی یا ابو لہبی کے نام اور نسل سے کوئی شخص معلوم نہیں ہے۔ اس طرح تاریخ سے ثابت ہے کہ حضورؐ سے نسبت رکھنے والے کروڑوں لوگ دنیا میں موجود ہیں جب کہ آپ کے دشمنوں کا نام و نشان ہی مٹ چکا ہے اور یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ محمدؐ کو ابتر کہنے والے ابتر تھے اور وہ بے نام و نشان ہوکر رہ گئے ہیں۔ دنیا میں آج بھی کروڑوں انسان محمدؐ کے نام لیوا ہیں جن میں غیر مسلم بھی شامل ہیں۔ ؎

وہ جس کا ذکر ہوتا ہے زمیں اور آسمانوں میں

فرشتوں کی دعاؤں میں مؤذن کی اذانوں میں

اور

ہرکہ عشق مصطفیٰؐ سامانِ اوست

بحر و بر گوشۂ دامانِ اوست

سورۃ الکافرون

اٰیاتہا:6 رکوعُھا:1

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قُلۡ یَا أَیُّہَا الۡکَافِرُونَ o لَا أَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُونَ o وَلَا أَنۡتُمۡ عَابِدُونَ مَا أَعۡبُدُ o وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدتُّمۡ o وَلَا أَنۡتُمۡ عَابِدُونَ مَا أَعۡبُدُ o لَکُمۡ دِینُکُمۡ وَلِیَ دِینِ o

جب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔ آپؐ نے توحید کی دعوت شروع کردی لوگوں کو بت پرستی چھوڑنے اور خدائے وحدہٗ لاشریک کی عبادت کرنے کی تعلیم شروع کردی۔ دعوت حق کا اعلان اور اس کا آغاز مکہ میں ہوا تو مکہ کے بیشتر مشرکین نے اس دعوت سے اختلاف کیا اور رفتہ رفتہ اس اختلاف نے دشمنی کی صورت اختیار کرلی اور جس قدر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش کردہ دعوتِ توحید آگے بڑھتی گئی مشرکوں کی مخالفت نے بھی زور پکڑا جب انہیں اس بات کا یقین ہوگیا کہ محمدؐ کے نئے دین کی دعوت زور پکڑتی جارہی ہے تو انہوں نے اس کو بزور بازو خوف ودہشت کے ذریعے دبانا چاہا، لیکن جب وہ اس زور وزبردستی میں کامیاب نہ ہوسکے تو انہوں نے اس تحریک کو دبانے کے لیے نت نئے ہتھکنڈے اپنانے شروع کردیئے اور نئے نئے حربے استعمال کئے۔ دعوت کی مزاحمت کا اولین طریقہ کار انہوں نے آپؐ کے چچا ابو طالب کو ڈرانے دھمکانے کی صورت میں اختیار کیا۔ انہوں نے ان سے کہا کہ اپنے بھتیجے محمدؐ کو نئے دین کی دعوت سے روک دیں یا کم سے کم آپؐ کی حمایت سے دست کش ہوجائیں کیونکہ وہ ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہتا ہے اور ہمارے دین کی تردید اور توہین کرتا ہے۔ وہ ہمارے اجداد کو گمراہ کہتا ہے۔ ابو طالب نے ان لوگوں کو نرمی سے سمجھایا اور وہ واپس چلے گئے۔ پھر وَاَنذِرۡ عَشِيرَتَكَ الۡاَقۡرَبِيۡنَ (آپ رشتہ داروں کو خبردار کرو) کے حکم کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ حکم نازل ہوا (فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ وَاَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِكِيۡنَ) (الحجر:۹۴) اے نبی جن باتوں کا تمہیں حکم دیا جارہا ہے ان باتوں کا ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کردو اور مشرکوں کی پروا نہ کرو) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کمر کس کر دعوت دین کے کام پر لگ گئے اور بت پرستی کی سرعام مخالفت اور مذمت شروع کردی۔ جب قریش نے دیکھا کہ محمدؐ کی نئی دعوت کے اثرات پورے معاشرے میں پھیل رہے ہیں اور اس دعوت سے ان کی مذہبی اجارہ داری کو چوٹ لگ رہی ہے تو وہ غضبناک ہوکر دوبارہ آپ کے چچا ابو طالب کے پاس آگئے اور سختی سے کہنے لگے کہ ہم نے آپ سے کہا تھا کہ اپنے بھتیجے کو ہمارے معبودوں کی مخالفت سے روک لیں مگر آپ نے ان کو نہیں روکا اب ہم دوبارہ آپ سے کہتے ہیں کہ اگر آپ نے اپنے بھتیجے کو نہ روکا تو ہم آپ کے ساتھ فیصلہ کن جنگ لڑیں گے یہاں تک کہ ہم دونوں میں سے کوئی ایک فریق ختم ہوجائے۔ اس موقعہ پر ابو طالب گھبرا گئے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا مشن (mission) چھوڑنے کے لیے کہا لیکن رسول اللہؐ نے جواب دیا کہ لوگ اگر میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی لا کر رکھ

دیں اور مطالبہ کریں کہ میں اپنے مشن (تبلیغ دین) کو چھوڑ دوں تب بھی میں اللہ رب العزت کے دین کی دعوت دینے سے باز نہ آؤں گا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس دین کو غالب کردے یا میں اپنی جان جانِ آفرین کو سپرد کروں۔ اس وقت جذبات کی شدت سے آپؐ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہمت اور جذبہ کو دیکھ کر چچا جان نے اپنے بھتیجے کی بھرپور حمایت جاری رکھنے کا فیصلہ کردیا انہوں نے زندگی بھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس حمایت کو جاری رکھا اور دشمنوں کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن کر کھڑا رہے۔ جب مخالفین اس حربہ میں بھی ناکام ہوئے تو انہوں نے ایک نئے حربے کا استعمال کرکے رسول اللہؐ پر تہمتیں لگانی شروع کردیں کہنے لگے کہ محمدؐ جنونی ہیں اس تہمت کو قران نے اس طرح بیان کیا ہے وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ۔ اور وہ (کافر) کہتے ہیں کہ یہ شخص پاگل ہے اور اس تہمت کو قرآن نے یوں رد کردیا۔ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍo آپ اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہیں۔ (سورہ القلم)

اس کے بعد جادوگر ہونے کا الزام لگایا۔ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ۔ کافروں نے کہا یہ بڑا جھوٹا جادوگر ہے۔ پھر کہا کہ یہ پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں جو اس نے لکھوائی ہیں۔

وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا (الفرقان:۵)

انہوں نے یہ بھی کہا کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل نہیں ہوا بلکہ یہ انسانی تخلیق ہے: وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ (النحل:۱۰۳) یقینا ہم جانتے ہیں کہ وہ کافر کہتے ہیں کہ اسے تو ایک آدمی سکھاتا ہے۔

جب یہ سارے الزامات قرآن نے رد کردئے تو پھر انہوں نے رسول اللہؐ کے ساتھ استہزا کرنا شروع کردیا جس میں ابوجہل پیش پیش تھا۔ اور اس طرح رسول اللہ کو تشویش میں ڈالنے اور پریشان کرنے کی مہم چلائی۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ۔ کافروں نے کہا اس قرآن کو مت سنو اور شور شرابا کرو۔

ان کافروں اور مشرکوں نے کبھی محمدؐ سے کہا کہ اس قرآن کو بدل ڈالو اور کوئی نیا قران لے آؤ پھر ہم ایمان لائیں گے اور کبھی یہ کہا کہ یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے او بازاروں میں چلتا پھرتا ہے جب قران نے ان بے ہودہ حرکتوں کو مسترد کردیا تو اس کے بعد یہ لوگ گالی گلوچ پر اتر آئے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اونچی آواز میں قران پڑھ کر نماز پڑھاتے تھے تو کافر نہ صرف شور مچاتے تھے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھ نماز پڑھنے والوں کو گالیاں دیتے تھے اور جب آپؐ اپنی آواز پست کرکے نماز پڑھاتے تھے تو جو مسلمان کافروں کے ڈر کے مارے چھپ چھپ کر قرآن سنتے تھے وہ قرآن کو سن نہ پاتے تھے تب یہ آیت نازل ہوئی۔

وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا۝

اور جب مسلمان کافروں کے بتوں کو بُرا کہتے تو مشرکین ضد میں آکر جہالت سے اللہ تعالیٰ کی ذات

مقدس کو برا کہنے لگتے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم اتارا

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ

جب محمدؐ کے خلاف قریش کی سب تدبیریں ناکام ہوئیں تو انہوںنے فیصلہ کیا کہ محمدؐ کو لالچ دے کر اپنے پیش کردہ دین سے انکار کروائیں۔ اس تدبیر کے تحت انہوں نے ایک سردار عتبہ بن ربیعہ کو رسول اللہؐ کے پاس بھیجا جس نے آپؐ کے سامنے چند تجاویزپیش کیں کہ اگر تم اپنی تحریک کے ذریعے سے مال حاصل کرنا چاہتے ہو تو ہم اتنا مال جمع کرکے دیں گے کہ آپ ہم سب سے زیادہ مالدار ہوجاؤگے۔ اگر سرداری کا منصب چاہتے ہو تو ہم آپ کو اپنا بادشاہ تسلیم کرتے ہیں اگر آپ کو کوئی دماغی عارضہ ہے جس کے آگے آپ بے بس ہیں تو ہم آپ کا بہترین علاج کرادیتے ہیں۔ جب عتبہ نے اپنی بات ختم کردی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ حم السجدہ کی ابتدائی ۱۳ آیات تلاوت فرمائی جن میں قوم عاد اور ثمود کی تباہی بیان ہوئی ہے۔ آیات سن کر عتبہ واپس اپنی برادری میں حاضر ہوا اور کہا کہ جو کلام میں نے سنا وہ نہ شعر ہے اور نہ جادو۔ میں تم سے اپیل کرتا ہوں کہ محمدؐ کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ لیکن مشرکین نے عتبہ کی بات نہ مانی اور اپنی مخالفت جاری رکھی۔

ان تمام حربوں کے بعد مشرکین نے گہری سازش کے تحت ایک اور چال چلائی۔ انہوں نے پلان بنایا کہ اسلام اور جاہلیت کو آپس میں گڈمڈ کریں تاکہ مشرکوں کے دین پر اسلام کا غلبہ نہ ہوجائے۔ مشرکین کی اس مکروہ تجویز کی شرائط یہ تھیں کہ مشرکین اپنی بعض باتیں چھوڑ دیں اور نبی کریمؐ بھی اپنی کچھ باتوں سے دست بردار ہوجائیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ ○ (القلم:۹) وہ چاہتے کہ آپ کچھ نرمی کریں وہ بھی نرمی اختیار کرلیں۔ اس مکروہ تجویز کی آڑ میں کافروں نےپیش کش کی کہ ایک دن آپ ہمارے معبودوں کی عبادت کیا کریں اور ایک دن ہم آپ کے معبودکی عبادت کیا کریں گے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے سورہ کافرون نازل فرمائی جس میں اس فضول اور بے ہودہ سودے بازی کا قصہ ہی تمام کردیا گیا۔

مشرکوں اور کافروں کے اس سودائے خام کے بارے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جب نبیؐ کی دعوت کو دبانے کے لیے مشرکین اور کافرین کی سب مکروہ چالیں ناکام ہوگئیں تو انہوں نے ایک وفد ابو طالب کے پاس بھیجا تاکہ ان کے بھتیجے محمدؐ سے بات چیت کی جائے وفد جب ابو طالب کے پاس پہنچا تو اس نے ابو طالب سے کہا کہ محمدؐ سے ہمارا معاہدہ کروائیں ابوطالب نے اپنے بھتیجے رسول اللہؐ کو اپنے پاس بلایا اور کہا کہ یہ وفد میرے پاس اس لیے آیا کہ آپ سے اس بات پر معاہدہ کریں کہ آپ سے کچھ لیں اور کچھ دیں۔ رسول اللہؐ نے فرمایا جی ہاں ''یہ لوگ مجھے صرف ایک کلمہ دے دیں اس کے ذریعے سے یہ پورے عرب کے بادشاہ بن جائیں گے اور سارے عجم ان کے تابع ہوجائیں گے'' وفد کے لوگوں نے حیران ہوکر کہا صرف ایک کلمہ؟ آپؐ نے فرمایا ہاں صرف ایک کلمہ ابوجہل نے کہا ہاں تمہارے باپ کی قسم دس کلمے لے لو آپ نے فرمایا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کہدو اور اپنے تمام معبودوں سے دست بردار ہوجاؤ اور صرف ایک اللہ کی عبادت کرو۔ انہوں نے حیرت سے ہاتھ بجا کر کہا اے محمدؐ تم ہمارے تمام معبودوں کے بجائے صرف ایک معبود بنانے لگے۔ یہ تو بڑے تعجب کی بات ہے۔ اس موقعہ پر سورہ کافرون نازل ہوا۔ (سیرت النبی ابن ہشام) ایک اور روایت کے مطابق قریش کے لوگوں نے رسول اللہؐ سے کہا کہ اگر آپ پسند کریں تو ایک سال ہم آپ کے دین میں داخل ہوجائیں اور ایک سال آپ ہمارے دین میں داخل ہوجاؤ۔ اس طرح کی بہت سی روایات موجود ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ قریش نے اس قسم کی تجویزیں کئی بار پیش کی تھیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے سورہ کافرون نازل کرکے ان کی اس قسم کی ساری امیدیں ہمیشہ کے لیے ختم کردیں اور واضح کردیا کہ رسول اللہؐ دین کے معاملہ میں مصالحت اور مفاہمت نہیں کرسکتے ہیں۔

دراصل محمدؐ کو کفر و شرک کے جھال میں پھنسانے کے اس مشورے کی بنیاد یہ ہے کہ جب نبیؐ مبعوث ہوئے اور انہوں نے دین ابراہیم کا دعویٰ کیا تو اہل عرب نے کہا کہ ہم تو خود دین ابراہیم پر ہیں اس لیے ہمیں اپنے طور طریقے چھوڑنے اور محمدؐ کی اتباع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن دین ابراہیم سے اپنے آپ کو وابستہ کرنے کے دعویٰ سے ان کو خیال آیا کہ ان کے اور رسول اللہؐ کے درمیان زیادہ دوری نہیں ہے اس لیے کوئی مفاہمت ہو سکتی ہے۔ اس لیے آپسی مشورہ کے بعد یہ تجویز پیش کی کہ آپ ان کے خداؤں کو سجدہ کریں تو وہ بھی آپ کے خدا کو سجدہ کریں گے اس طرح ان کی امید بڑھ گئی کہ محمدؐ ان کی اس شرط کو قبول کریں گے اور ان کے خداؤں اور ان کی پرستش کو بُرا بھلا کہنا چھوڑدیں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے سورہ کافرون نازل کرکے کافروں کی امیدوں پر پانی پھیر دیا اور ان کے ناپاک ارادوں کو خاک میں ملادیا۔

سورہ کافرون کے متعلق کچھ نام نہاد روشن خیال لوگوں کا ماننا ہے کہ اس میں مذہبی رواداری کا پیغام ہے۔ اس لیے آدمی جس دین کی پیروی کرنا چاہتا ہو، اس کی پیروی کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے دین کی آزادی کا پیغام دیا ہے اور یہ کہ محمدؐ کے ذریعہ سے کافروں کو اطمینان دلایا گیا کہ اُن کے لیے اُن کا دین اور محمدؐ کے لیے محمدؐ کا لایا ہوا دین ہے۔ لیکن سورہ کے تاریخی پس منظر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس سورہ میں دین کی آزادی اور مذہبی رواداری نہیں ہے بلکہ اس میں کافروں کے دین، ان کی بت پرستی اور ان کے معبودوں سے قطعی بیزاری اور لاتعلقی کا اعلان ہے اور انہیں صاف طور پر بتایا گیا ہے کہ کفر اور اسلام ایک دوسرے سے الگ ہیں اس لیے کفر کے ساتھ مفاہمت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے تمام مسلمانوں کو قیامت تک کے لیے یہ تعلیم دے دی گئی ہے کہ کفر جہاں جس شکل میں ہو اس سے قولاً اور عملاً برأت اور لاتعلقی کا اظہار کرنا چاہیے اور بلا خوف وتردُّد کہہ دینا چاہیے کہ دین کے معاملہ میں وہ کسی قسم کی مصالحت نہیں کرسکتے ہیں۔ اس بات کی تصدیق اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ یہ سورہ کافروں کی تجویز کو مسترد کرنے کے لیے نازل کیا گیا ہے اور تجویز پیش کرنے والوں نے بھی بعد میں اپنے دین کو مسترد کرکے دین محمدؐ میں شمولیت اختیار کرلی اور کافروں سے مصالحت کرنے کے بجائے محمدؐ کے لائے ہوئے دین اسلام پر اپنی جانوں کی قربانیاں پیش کیں اور اس دین کے قاعدوں اور ضابطوں پر سختی سے عمل کرتے رہے۔آج بھی راسخ الاعتقاد مسلمان دین اسلام کی محافظت کرتے ہیں اور کفر سے لاتعلقی اختیار کرتے ہیں کیونکہ کفر سے بیزاری اور لاتعلقی ایمان کا دائمی تقاضا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں اس سورہ کی بڑی اہمیت تھی۔ احادیث سے ثابت ہے کہ حضورؐ فجر کی نماز سے پہلے اور مغرب کی نماز کے بعد کی دو رکعتوں کی سنتوں میں پہلی رکعت میں سورہ کافرون اور دوسری رکعت میں سوہ اخلاص پڑھتے تھے اور جب سونے کے لیے بستر میں لیٹتے تو یہ سورہ کافرون پڑھ لیا کرتے تھے۔ آپؐ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ شرک سے محفوظ رکھنے والا سورہ، سورہ کافرون ہے۔

قُلۡ يَا أَيُّهَا الۡكَافِرُونَ(١)

کہہ دو اے کافرو

لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ(۲)

میں اُن کی عبادت نہیں کرتا ہوں جن کی عبادت تم کرتے ہو

وَلَا أَنتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ(۳)

اور نہ تم اُس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں

وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدتُّمْ(۴)

اور نہ میں اُن کی عبادت کرنے والا ہوں جن کی عبادت تم نے کی ہے

وَلَا أَنتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ(۵)

اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں

لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ (٦)

تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین

کہہ دو 'اے کافرو!'

قرآن نے دین اسلام سے مفاہمت اور مصالحت کی تجویز پیش کرنے والوں کو ان کے منکرانہ اور کافرانہ صفات کی وجہ سے کافرو کے نام سے پکارا ہے۔ کیونکہ وہ صرف ایک خدائے وحدہٗ لاشریک کی عبادت کرنے سے انکار کرتے تھے۔ اس لیے ان کو واضح کردیا گیا ہے کہ تمہاری یہ توحید اور شرک کو یکجا کرنے کی تجویز کسی بھی صورت میں قابل قبول نہیں ہے کیونکہ اسلام کا راستہ الگ ہے کفر و شرک اور الحاد کا راستہ الگ ہے۔ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں کہ 'کافر کا لفظ کوئی گالی نہیں ہے جو اس آیت کے مخاطبوں کو دی گئی ہو بلکہ عربی زبان میں کافر کے معنی انکار کرنے والے (unbeliever) کے ہیں اور اس کے مقابلے میں مومن کا لفظ مان لینے اور تسلیم کرنے والے (believer) کے لیے بولا جاتا ہے۔ لہذا اللہ کے حکم سے نبیؐ کا یہ فرمانا ''اے کافرو!'' دراصل اس

معنیٰ میں ہے ''اے وہ لوگو جنہوں نے میری رسالت اور میری لائی ہوئی تعلیم کو ماننے سے انکار کردیا ہے'' اور اسی طرح جب مومن یہ لفظ کہے گا تو اس کی مراد محمدؐ پر ایمان نہ لانے والے ہوں گے''
(تفہیم القرآن سورہ کافرون)

یہاں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ اللہ کا خطاب بطور خاص صرف ان کافروں سے ہے جن کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو تھا کہ ان کا خاتمہ کفر پر ہوگا، کیونکہ اس سورہ کے نزول کے بعد بہت سارے کافروں نے اسلام قبول کیا اور اسلام کی بھرپور خدمت کی اور یہ بات بھی واضح رہے کہ سورہ میں ''اے کافرو'' فرمایا گیا ہے اور ''اے مشرکو'' نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اعلان برأت ان سب کے لیے ہے جو محمدؐ اور آپ کی لائی ہوئی تعلیم اور آپ کی رسالت کو نہیں مانتے ہیں خواہ وہ یہود ہوں، نصاریٰ ہوں، مجوسی ہوں یا کافر، مشرک اور ملحد، اور یہ خطاب صرف اُس وقت کے قریش کے کافروں اور مشرکوں کے لیے ہی نہیں جو مصالحت کی تجویز لے کر آئے تھے بلکہ سارے جہاں کے ملحدوں، مشرکوں، کافروں اور تمام ان لوگوں کے لیے ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا رسول اور نبی نہیں مانتے ہیں اسی طرح ''کہدو اے محمدؐ'' سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خدا کا قطعی حکم ہے جس سے یہ بات واضح کرنی مقصود ہے کہ کافروں سے مصالحت کرنے کا معاملہ سرتا سر اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے اور محمدؐ کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے کیونکہ اللہ ہی وہ آمِر وحاکم اور ڈکٹیٹر (dictator) ہے جس کے حکم اور ڈکٹیشن (dictation) کو ٹالا نہیں جاسکتا ہے اور وہ ایسا حاکم ہے جس کے حکموں اور فیصلوں کو روکنے والا کوئی نہیں ہے۔

میں اُن کی عبادت نہیں کرتا ہوں جن کی عبادت تم کرتے ہو

اس آیت سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ کفر و شرک اور دین توحید دونوں ایک دوسرے سے بالکل علاحدہ ہیں اس لیے رسول اللہؐ سے فرمایا گیا ہے کہ ان کافروں سے کہہ دو کہ میں ان کی عبادت نہیں کرتا ہوں جن کی عبادت تم کرتے ہو یعنی میری عبادت تمہاری عبادت سے مختلف (different) ہے اور تمہارے یہ معبود جن کی تم عبادت کرتے ہو میرے معبود اللہ وحدہٗ لاشریک سے الگ ہیں اس لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں تمہارے بہت سارے معبودوں کی عبادت کروں۔ تمہارے لیے آسان ہے کہ تم اپنے بہت سارے معبودوں کے ساتھ ایک اور معبود کو شامل کرلیں کیونکہ تمہیں بہت سارے معبودوں کی عبادت کرنے میں نہ کوئی رکاوٹ ہے اور نہ کوئی شرم محسوس ہوتی ہے لیکن میرے لیے صرف ایک معبود ہے جو وحدہٗ لاشریک ہے۔ جس کا نہ کوئی ساتھی ہے نہ ساجھی۔ مجھے اس کے بغیر کسی

ایسے معبود کو ماننے اور اس کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے شرم آتی ہے جسے خود کسی انسان نے بنایا ہو۔

آیت میں جن معبودوں کا ذکر ہے ان میں وہ سب معبود شامل ہیں جن کی عبادت دنیا بھر کے کافر اور مشرک لوگ کرتے ہیں۔ خواہ وہ ملائیکہ ہوں، جن ہوں، انبیا اور اولیاء ہوں، انسانوں کی ارواح ہوں یا سورج چاند اور ستارے ہوں، درخت، جانور، دریا، بت یا دیوی دیوتا ہوں۔ یہ مخلوقات ہیں اور خالقِ حقیقی کی بندگی کے ساتھ ساتھ ان مخلوقات کی پرستش اللہ رب العالمین کی شان کے خلاف ہے۔ مومن کے نزدیک معبودوں کے مجموعے میں سے اللہ ایک معبود نہیں بلکہ وہی ایک تنہا معبود ہے اور معبودوں کے مجموعے کی عبادت سرے سے کوئی عبادت ہی نہیں ہے اگرچہ اس میں ایک اللہ کی عبادت بھی شامل ہو۔ قرآن مجید میں یہ بات صاف طور پر کہی گئی ہے کہ اللہ کی عبادت صرف وہ ہے جس کے ساتھ کسی دوسرے کی عبادت کا شائبہ تک نہ ہو اور جس میں انسان اپنی زندگی، اپنا دین اور اپنی عبادت کو صرف اللہ ہی کے لیے خالص کردے۔

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ (سورہ البینہ:۵)

یہ مضمون پورے زور سے قرآن مجید میں بکثرت مقامات پر وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور حدیث میں بھی اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے ''اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں سب سے بڑھ کر ہر شریک کی شرکت سے بے نیاز ہوں۔ جس شخص نے کوئی ایسا عمل کیا جس میں میرے ساتھ کسی اور کو بھی شریک کیا ہو اُس سے میں بری ہوں اور وہ پورے کا پورا عمل اُسی کے لیے ہے جس کو اس نے شریک کیا۔ (مسلم، مسند احمد) پس اللہ کو بہت سے خداؤں میں سے ایک قرار دینا، چاہے اسے بڑا ہی خدا (God) کیوں نہ مانا جائے، شرک ہے اور اس کے ساتھ دوسروں کی بندگی و پرستش کرنا کفر ہے جسے ترک کرنا اس سورہ کا مقصود و مطلوب ہے۔

اور نہ تم اُس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں

یعنی میری عبادت تمہاری عبادت سے مختلف ہے اور تمہارے معبود میرے یکتا معبود سے الگ ہیں۔ وہ ایک ہی ہے اور تمہارے کئی کئی معبود ہیں۔ یعنی اگر تم اپنے دین پر راضی ہو اور اسے چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہو تو اس صورت میں تم میرے لائے ہوئے دین میں شامل نہ ہوجاؤ گے۔ جو دین اللہ نے تمام انسانوں کے لیے چُن لیا ہے اور تم اس دین کے چننے والے کی عبادت نہیںکرو گے تو پھر تم مجھ سے کس طرح کی توقع کرتے ہو کہ میں تمہارے ان باطل خداؤں کی عبادت کروں جن کو تم نے خود تراشا یا تصور کرلیا ہے؟ کیا آپ کو نہیں لگتا ہے کہ ایسا کرنا انصاف و دیانت کے خلاف ہے!؟ تم لوگ ان باطل خداؤں کی محبت میں گرفتار ہو اور تم ان کو چھوڑنے والے نہیں، کیونکہ یہ تمہارے دماغ پر سوار ہوچکے ہیں اس لیے بت پرستش تم کو ہی مبارک ہو اور مجھ سے اس قسم کی عبادت کی امید رکھنا محض عبث ہے اور جب تم لوگ اپنی اس بے ہودہ عبادت پر راضی ہیں تو میں اپنے خالق حقیقی خدائے وحدہٗ لاشریک کی عبادت پر راضی کیوں نہ ہوں اور مجھے تمہارے ان بے کار اور بے جان بتوں کی عبادت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

آیت میں رسول اللہؐ سے کہلوایا گیا ہے کہ جن صفات کے معبود کی عبادت میں کرتا ہوں تم ان صفات کے معبود کی عبادت کرنے والے نہیں ہو۔یہی وہ حقیقت ہے جس کی بنا پر اسلام تمام ادیان سے قطعی طور پر الگ ہوجاتا ہے کیونکہ اسلام کا خدا ان کے خداؤں سے الگ ہے۔ اُن میں سے کسی کا خدا ایسا ہے جس کو چھ دنوں میں دنیاپیدا کرنے کے بعد ساتویں دن آرام کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ ان کے خیال کے مطابق چھ دنوں کی مسلسل اور لگاتار کام کے بعد خدا نے آرام کرنے کے لیے چھٹی منائی اور اسی عقیدے کے لوگ اس بنا پر چھ دنوں کے کام کاج کے بعد ساتویں دن چھٹی مناتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ خدا ربُ العالمین نہیں ہے بلکہ وہ ربِ بنی اسرائیل ہے اور بنی اسرائیل اس رب کے چہیتے بیٹے ہیں ان کے بغیر کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا اور خدا کے یہ چہیتے جہنم میں نہیں جائیں گے اگر جائیں گے بھی تو چند دنوں کے لیے پھر انہیں جنت میں ڈال دیا جائے گا کیونکہ ان کا خدا سے رشتہ خاص ہے جو دوسرے نسل کے لوگوں کو نہیں ہے۔ ان کا خدا وہ ہے جو حضرت یعقوب علیہ السلام سے کُشتی لڑتا ہے اور ان کو گرا نہیں سکتا ہے اور اُن کا خدا عُزَیر نامی ایک بیٹا بھی رکھتا ہے اور ان کے نزدیک عیسیٰ بھی خدا کا بیٹا ہے جو دوسروں کے گناہوں کا کفارہ دینے کے لیے صلیب پر چڑھا یعنی ان کو پھانسی دے دی گئی۔ ان لوگوں کے نزدیک خدابیوی بچے رکھتا ہے۔ کسی کا خدا انسانی شکل میں آتا ہے اور زمین پر انسانی جسم میں رہ کر انسانوں جیسے کام کرتا ہے۔ کسی کے خیال میں خدا واجب الوجود یعنی اپنی ذات میں کسی کا محتاج نہیں یا علت اولیٰ (first cause) ہے یعنی اس کے خدا نے کائینات بنا کر اس کے نظام کو ایک مرتبہ حرکت دے کر اسے چھوڑ دیا ہے اس کے بعد کائینات خود چل رہی ہے اور انسان کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ خالق کائینات کو انسانوں کی ضرورت ہے اور نہ اس کائینات کے بنانے والے (creator) کو خیال ہے کہ اس نے کائینات اور اس کے اندر موجود مخلوقات کو کیوں بنایا غرض کہ دنیا میں بہت سارے لوگ ایسے ہیں جو خدا کو تو مانتے ہیں لیکن اسے بے حرکت اور بے کار سمجھتے ہیں۔ ان کے مطابق خدا کو دنیا سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔

کچھ لوگ عقیدہ وحدت الوجود (pantheism-monoism) کے قائل ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ خدا ہر چیز میں موجود ہے اس کا کوئی الگ وجود نہیں ہے۔ اس طرح کے بہت سے خود ساختہ دنیاوی مذاہب اختیار کئے گئے ہیں۔ سوشلزم (Socialism) (سماج واد) سیکولرازم (Secularism) (لادینیت-انسانیت) آئیڈیلزم (idealism) (تصوریت)، ریشنلزم (rationalism) (عقلیت پسندی)، کیمونزم (communism) (اشتراکیت) Capitalism (سرمایہ داری) جیسے ناموں پر نئے دنیاوی مذاہب پیش کئے گئے جن کو خدا کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے جو انسانوں کے لیے انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین اور اصولوں پر مبنی ہیں۔

لوگوں نے خدا کے دین کے مقابلے میں جو خودساختہ نظریاتی ادیان پیش کیے ہیں ان کو دین اسلام سے تقابل اور موازنہ کرنے سے پہلے ان کا تعارف ضروری محسوس ہوتا ہے جو کہ حسب ذیل ہے:

1. Pantheism-وحدت وجود:- A doctrine that identifies God with the universe, or regards the universe as a manifestation of God worship that admits or tolerates all gods.

پینتھ ازم - وحدت وجود: ایک ایسا نظریہ جو کائینات کے ذریعے خدا کی شناخت کرتا ہے یا کائینات کو خدا کی عبادت کا مظہر سمجھتا ہے۔ جو تمام خداؤں کو مانتا ہے یا تمام خداؤں کو برداشت کرتا ہے۔

2. Socialism- سماج واد:- A political and economic theory of social organization that advocates that the means of production, distribution and exchange should be owned or regulated by the community as a whole.

سوشلزم: سماج واد: معاشی تنظیم کا ایک سیاسی اور معاشی نظریہ جو اس بات کی وکالت کرتا ہے کہ پیداوار کی تقسیم اورپیداوار کے ذرائع پوری طور پر معاشرے کے پاس ہوں۔

3. Secularism - لادینیت:- Belief that humanity is capable of morality and self-fulfilment without belief in God. It denotes the attitudes, activities have no religious or spiritual basis.

سیکولرازم- لادینت: یہ عقیدہ کہ انسانیت اخلاقیات اور خود پرستی پر قادر ہے۔ خدا پر اعتماد کے بغیر یہ اس رویے کی نشاندہی کرتا ہے کہ سرگرمیوں کی کوئی مذہبی یا روحانی اساس نہیں ہوتی ہے۔

4. Idealism - تصّوریت:- The practice of forming or pursuing ideals, especially unrealistically. Any of the variouss systems of thought in which the objects of knowledge are held to be in some way dependent on the activity of mind.

آئیڈیلزم- تصوریت: نظریات کی تشکیل یا ان کا پیچھا کرنے کا عمل بالخصوص غیر حقیقی طور پر۔ فکر کا کوئی بھی ایسا نظام جس میں علم کے ایٹمز(items) کو کسی طرح ذہن کی سرگرمی پر منحصر رکھا جائے۔

5. Individualism- انفرادیت:- The habit or principle of being independent and self-reliant, a social theory favouring freedom of action for individuals over collective or state control.

انڈیوجولزم- انفرادیت: آزادی و خود انحصاری کی عادت یا اصول، ایک معاشرتی نظریہ جو اجتماعی یا ریاستی کنٹرول سے زیادہ افراد کی آزادی کے حق میں ہے۔

6. Capitalism- سرمایہ دارانہ نظام :- An economic and political system in which country's trade and industry are controlled by private owners for profit, rather than by the state.

کیپٹلزم- سرمایہ دارانہ نظام:- ایک معاشی، سیاسی نظام جس میں کسی ملک کی تجارت اور صنعت کو ریاست کے بجائے منافع کے لیے نجی مالکان کے ذریعہ کنٹرول کیا جاتا ہے۔

7. Rationalism- عقلیت پسندی:- A belief or theory that opinions and actions should be based on reason and knowledge rather than on rligious belief or emotional respons.

ریشنلزم - عقلیت پسندی:- ایک ایسا عقیدہ یا نظریہ جس میں رائے اور افکار مذہبی عقیدے یا جذباتی ردعمل کے بجائے استدلال اور علم پر مبنی ہوتے ہیں۔

8. Communism -ماشتراکیت:- A political theory derived from Karl Marx advocating class war and leading to a society in which property is publically owned and each person works and is paid according to their abilities and needs.

کیمونزم- اشتراکیت:- کارل مارکس کے افکار سے ماخوذ ایک سیاسی نظریہ جو طبقاتی جنگ کی حمایت کرتا ہے اور ایک ایسے معاشرے کی طرف جاتا ہے جس میں تمام املاک عوامی ملکیت میں ہے اور ہر فرد

کام کرتا ہے اور ان کی صلاحیتوں اور ضروریات کے مطابق ان کو معاوضہ دیا جاتا ہے۔

9. Realism- حقیقت پسندی:- The attitude or practice of accepting a situation as it is and being prepared to deal with it accordingly. The quality or fact of representing a person, thing or situation accurately or in a way that is true to life.

ریلزم: حقیقت پسندی:- کسی صورت حال کو اپنی اصل کے مطابق قبول کرنے کا رویہ یا عمل اور اس کے مطابق اس کے ساتھ نمٹنے کے لیے تیار رہنا، کسی شخص کی چیز یا صورت حال کی درستگی یا توانائی کی نمائندگی کرنے کا معیار جو ہموار زندگی کے لیے درست ہے۔

10. Pragmatism - عملیت پسندی :- An approach that assesses the truth of meaning of theories or beliefs in terms of success of their practical application.

پریگمیٹزم - عملیت پسندی : - ایک ایسا نقطۂ نظر جو عملی اطلاق کی بنیاد پر کامیابی کے لحاظ سے نظریات یا عقائد کے معنی کی سچائی کا اندازہ کرتا ہے۔

11. Pluralism - تکثیریت :- A condition or system in which two or more states, groups, principals, sources of authority etc co-exist the practice of holding more than one office or church benefice at a time.

پلورلزم - تکثیریت:- ایسی حالت یا نظام جس میں دو یا دو سے زیادہ ریاستیں، گروہ، اصول، یا ذرائع اختیار وغیرہ بیک وقت ایک سے زیادہ اداروں یا کلیساووں کا انصرام کرنے کے لیے بقائے باہم کے تحت قائم ہوں۔

12. Communalism - فرقہ واریت :- A principal of political organisation based on federated communes allegiance to one's own ethenic group rather than to the wider society.

کمیونلزم - فرقہ واریت:- ایک سیاسی تنظیم کا ایک اصول جو وسیع معاشرے کے بجائے اپنے اپنے نسل گروہ سے سیاسی بیعت پر مبنی ہے۔

13. Deism - آستیکتا :- Belief in the existence of a supreme being specifically of a creator who does not intervene in the universe.

ڈی ازم - آستیکتا:- ایک ایسا عقیدہ ہے جو خاص طور پر ایسے خالق کی ذات پر یقین رکھتا ہے جو کائینات میں مداخلت نہیں کرتا ہے

انسانوں کے بنائے ہوئے اِن ادیان Man made religions or isms کو جب اللہ تعالیٰ کے دین کے سامنے تحقیق اور تقابل کے لیے پیش کیا جاتا ہے تو غیر مُتعصب (unbiased) انسان کو یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ انسان کے تیار کردہ یہ نظریاتی ادیان غلطیوں اور کوتاہیوں سے بھرے پڑے ہیں۔ چونکہ یہ ادیان انسانوں نے اپنی عقل کے مطابق تیار کیے ہیں اس لیے یہ ناقص ہیں۔ کیونکہ انسان بذات خود محدود العقل ہے۔ اگرچہ اس نے دنیاوی علوم میں بے حد ترقی کی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلے میں اس کا علم و بصیرت نہ ہونے کے برابر ہے اللہ کے پاس جو علم ہے وہ وسیع، مکمل اور لامحدود ہے۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ کی ذاتِ مقدس بشری جذبات، خواہشات اور

کمزوریوں سے یکسر منزّہ اور پاک ہے۔ لہٰذا اُس کا علم بھی ان چیزوں سے بالا و اعلیٰ ہے۔ اس لیے صحیح ، مکمل اور غلطیوں سے پاک دین صرف اسلام ہے۔ کیونکہ یہ دین اسی رب العالمین کا عطا کردہ ہے جس نے بشمول انسان تمام مخلوقات کو پیدا کیا ہے اور جسے معلوم ہے کہ انسان کو کن کن مسائل حیات و روح سے سابقہ ہے، جن کے حل کے لیے اُسے آسمانی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اس لیے اُس نے علیم الخبیر ہونے کی بنیاد پر دین حق اپنے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے انسانوں تک پہنچا دیا جس کی بنیاد اُس کی نازل کردہ کتاب قرآن مجید پر ہے۔ اسی کتاب سے انسانی زندگی کے لیے قوانین اور ضوابط اخذ کئے گئے جو انسانی زندگی کے لیے مکمل لائحہ عمل بن گیا یہی اللہ کا دین کہلاتا ہے۔ اس دین کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :

هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ وَلَوۡ کَرِهَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ۝ (سورہ صف:۹)

خدا کو وحدہٗ لاشریک ماننے کا مطلب یہ ہے کہ اُس خدا کو تسلیم کیا جائے جو ساری کائینات کا خالق، مالک، مدبر، منتظم اور حاکم ہے جس نے کائینات کو بنایا اور اس کا نظام چلا رہا ہے اور اس کائینات میں ہر وقت اسی کا حکم چل رہا ہے جو ہر عیب اور ہر نقص وکمزوری سے پاک ہے جس کا کوئی ساجھی اور ساتھی نہیں ہے جس کی ذات و صفات میں کوئی شریک نہیں اور جس کے اختیارات میں کسی کی حصہ داری نہیں ہے وہ نہ کسی کی اولاد ہے اور نہ اسے کسی کو بیٹا بنانے کی ضرورت ہے اور نہ اسے کسی قوم اور نسل سے کوئی رشتہ ہے۔ اس کے سامنے سب لوگ اپنے اعمال کے لیے جواب دہ ہیں وہی مرنے کے بعد سب کو دوبارہ زندہ کرنے والا ہے۔ وہی آخرت میں جزا وسزا دینے پر قادر ہے۔

اور نہ میں ان کی عبادت کرنے والا ہوں جن کی عبادت تم نے کی ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے کہ ان کافروں سے کہہ دو کہ میں ماضی میں بھی کبھی ان چیزوں کا پرستار نہیں رہا جن کی تم نے پرستش کی ہے یعنی اگر ہمارے درمیان ایسا دور گزرا ہوتا جب میں تمہارے اس دین شرک میں شریک رہا ہوتا تو تم مجھ سے یہ توقع کرسکتے کہ شاید میں سابق دین اختیار کرنے پر پھر آمادہ ہوجاؤں لیکن جب میرا دامن قبل از نبوت زمانہ میں بھی شرک سے داغ دار نہ ہوا تو اب مجھ سے اس کی توقع کیسے کر رہے ہو۔ (تدبر القرآن- سورہ کافرون)

اس آیت میں کافروں کو ان کا گزشتہ دور (past period) یاد دلایا گیا ہے کہ وہ ذرا غور کریں کہ ان لوگوں نے گزشتہ زمانے میں بھی ان ہی بتوں کی پوجا کی ہے اور اب یہ نبیؐ کو اس بُت پرستی میں شامل کرنا چاہتے ہیں اس لیے تنبیہ کی جارہی ہے کہ جن لوگوں نے گزشتہ زمانے میں لگاتار شرک کی لعنت میں بتلا ہوکر بت پرستی کی ہو ان سے دین اسلام میں شامل ہونے کی اس بنیاد پر توقع کرنا کہ آپ کچھ عرصہ کے لیے ان کے دین میں شامل ہوجائیں غیر منطقی، غیر ضروری، غیر معتبر اور بے معنی حرکت ہے اور اس قسم کی تجویز پیش کرنا فضول ہے اور اسے درخورِ اعتنا لانا بھی آپ کے لیے شایان شان نہیں ہے اس لیے ان سے برأت لینے اور ان کو اپنے حال پر چھوڑنے اور ان سے لاتعلقی کا حکم جاری کیا گیا ہے اور ان سے اور ان کے معبودوں سے مسلمانوں کو دور رہنے کی ہدایت دے دی گئی ہے۔

اور نہ تم اُس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں

مولانا احسن اصلاحی اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ یہ آیت لفظاً اسی سورہ کی آیت نمبر ۳ کا اعادہ ہے لیکن معناً یہ اس سے مختلف ہے۔ اس کا تعلق آیت چار کی طرح دور ماضی سے ہے جبکہ آیت تین کا تعلق جیسا کہ واضح ہوا ہے مستقبل سے ہے یعنی قریش کے لیڈروں کو آگاہ فرمایا گیا ہے کہ تم اگر اس مغالطہ میں بتلا ہو کہ ماضی میں تم بھی اُسی معبود کی پوجا کرتے رہے ہو جس کی میں پوجا کرتا رہا ہوں تو یہ محض تمہاری خام خیالی ہے۔ شرک کے ساتھ میرے معبود کی پرستش کا جیسا کہ اوپر واضح ہو چکا ہے، کوئی امکان نہیں ہے اور تم شرک سے کبھی پاک نہ ہوئے اس وجہ سے نہ میں کبھی تمہارا دینی بھائی بنا اور نہ تم میرے دینی بھائی بنے تو پھر یہ توقع تم کس طرح کرتے ہو کہ اپنی اس گندگی میں لتھڑے ہوئے تم مجھے اپنا دینی بھائی بنانے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ (تدبر القرآن: سورہ کافرون)

در حقیقت آیت کا مفہوم یہ ہے کہ نہ تم اس معبود واحد کی عبادت کرنے والے نظر آتے ہو اور نہ میرے لیے ممکن ہے کہ جن جن کو تم نے اور تمہارے اسلاف نے پوجا ہے، میں اُن کا پجاری بن جاؤں آپ کا اس طرح سوچنا بے سود ہے اور تم لوگ بہت سے معبودوں کی بندگی چھوڑنے اور ایک معبود کی بندگی کے لیے تیار نہیں ہیں اس بنا پر تم سے یہ توقع نہیں ہے کہ اپنی اس غلط روش سے تم باز آجاؤ گے اور اس کی عبادت کرنے والے بن جاؤ گے جس کی عبادت میں کرتا ہوں اس لیے تم اس کی عبادت کرنے والے نہ بنو گے جس کی عبادت میں کرتا ہوں کیونکہ تم لوگ جن معبودوں کی جس طرح عبادت کرتے تھے تم اسی طرح کی بت پرستی میں ملوث رہو گے اس لیے تم سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی ہے کہ تم میرے معبود وحدہٗ لاشریک کی عبادت میں شامل ہو جاؤ گے۔

تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین

یعنی اے کافرو تم نے جب میری دعوت قبول نہیں کی اور میرا دین جو خدا کا خالص دین ہے تسلیم نہیں کیا تو پھر میرے اور تمہارے درمیان ملنے کا کوئی راستہ نہیں ہے اور نہ مجھے تم سے ملانے والی کوئی گزرگاہ ہے۔ اس لیے تمہاری یہ کچھ لو اور کچھ دو کی تجویز مجھے قبول نہیں ہے اگر تم لوگوں کو میری دعوت حق قبول نہیں ہے تو پھر میں تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دیتا ہوں اور جس بت پرستی کے دین کو تم اختیار کئے ہوئے ہیں اسے اگر تم چھوڑنا نہیں چاہتے ہو تو پھر میں تم کو زبردستی اپنے دین میں شامل نہیں کرسکتا ہوں۔ اس لیے تمہارا دین تم کو ہی مبارک ہو اور میرے لیے میرا دین کافی اور شافی ہے۔ کیونکہ میرا دین الگ ہے اور تمہارا دین الگ ہے۔ میں تمہارے معبودوں کا پرستار نہیں اور تم میرے معبود کے پرستار نہیں۔ اس لیے میرا اور تمہارا دین ایک نہیں ہوسکتا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں کہ ''یہ کفار کو رواداری کا پیغام نہیں ہے بلکہ جب تک وہ کافر ہیں ان سے ہمیشہ کے لیے برأت، بیزاری اور لاتعلقی کا اعلان ہے اور اس سے مقصود ان کو اس امر سے قطعی اور آخری طور پر مایوس کردینا ہے کہ دین کے معاملہ میں اللہ کا رسول اور اس پر ایمان لانے والوں کا گروہ کبھی ان سے کوئی مصالحت کرے'' (تفہیم القران: سورہ کافرون)

دین کے معاملے میں سمجھوتہ سازی اور 'کچھ لے کچھ دے' کی سطحی سوچ رکھنے والے لوگوں سے اعلان برأت اور اظہار بے زاری قران مجید میں کئی مقامات پر وارد ہے۔ سورہ یونس میں فرمایا گیا ہے ''اگر یہ تجھے جھٹلاتے ہیں تو کہدے کہ میرا عمل میرے لیے ہے اور تمہارا عمل تمہارے لیے ہے جو کچھ میں کرتا ہوں اس کی ذمہ داری سے تم بری ہو اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی ذمہ داری سے میں بری ہوں'' (آیت:۴) اسی طرح سورہ سبا میں فرمایا گیا ہے: ''ان سے کہہ دو، جو قصور ہم نے کیا ہو اس کی باز پرس تم سے نہ ہوگی اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی کوئی جواب طلبی ہم سے نہیں کی جائے گی'' (آیت:۲۵، ۲۶) قرآن مجید کی ان آیات سے معلوم ہوتا ہے۔ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نبیؐ کافروں سے کہیں کہ تم اپنے دین پر قائم رہو اور مجھے اپنے دین پر چلنے دو، بلکہ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تم اللہ کے لیے اپنے دین کو خالص کرکے صرف اسی کی بندگی کرو اور کافروں کے دین کے ساتھ مصالحت مت کرو اور ان کو اُن کے حال پر چھوڑدو۔ یہ جن جن کی بندگی کرنا چاہیں، کریں، کیونکہ دین میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ اس لیے تم ان کو ایسا کرنے سے زبردستی نہیں روک سکتے لیکن ان کو ان کے حال پر چھوڑ دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلام کے بغیر کسی اور دین پر چلنے پر آخرت میں ان سے کوئی حساب نہ لیا جائے گا اور نہ ان کو ان کے برے عملوں پر عذاب دیا جائے گا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کافروں کے دین کو اللہ تعالیٰ نے رد کردیا ہے اب اگر یہ اسی دین پر قائم رہنا چاہتے ہیں تو ان کو رہنے دو۔ کل قیامت کے دن انہیں اس کی سزا ملے گی اور اے نبی تمہارے لیے تمہارا دین، مکمل ضابطۂ حیات ہے جو شرک کی غلاظت سے پاک ہے پس آپ کے ساتھ جو بھی لوگ اس دین پر قائم رہیں گے ان کو قیامت کے دن اس کی جزا ملے گی یعنی وہ جنتوں میں ہمیشہ کی زندگی گزاریں گے۔

امام ابو حنیفہ اور مام شافعی نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ کافروں کے مذاہب چاہے آپس میں کتنے ہی مختلف ہوں لیکن مجموعی طور پر کفر ایک ہی ملت ہے۔ اس لیے اسلام کے بغیر جتنے بھی مذاہب ہیں ان کے پیرو کار ایک دوسرے کے وارث ہیں کیونکہ اسلام سے باہر ہر مذہب سے تعلق رکھنے والا کسی نہ کسی طرح کے کفر و شرک میں ملوث ہے کوئی خدا کا بیٹا بنا کر اس کی عبادت کرتا ہے اور کوئی خدا کی بیٹیاں بنا کر ان کی پوجا کرتا ہے اور کوئی اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے بتوں کی پرستش کرتا ہے۔ اس طرح یہ سب اللہ کے دین سے کفر کرتے ہیں اور کافروں میں شمار ہیں اس حیثیت سے یہ ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہیں اور ایک دوسرے کے وارث ہیں حنفی مسلک کے مشہور امام شمس الائمہ سَرَخسی کے مطابق کفار ان سب اسباب کی بنا پر آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے بس دو ہی دین قرار دیے ہیں ایک دین اسلام دوسرا دین کفر جو اسلام کے بغیر باقی سارے ادیان کا مجموعہ (amalgamation) ہے لہٰذا لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَلِیَ دِیۡنِ سے یہی مراد ہے کہ اللہ نے لوگوں کے دو ہی فریق رکھے ہیں ایک فریقِ موحدّین ہے اور دوسرا وہ فریق ہے جو بحیثیت مجموعی تمام کافروں پر مشتمل ہے اور قرآن نے دو ہی گروہوں کو ایک دوسرے کا مخالف قرار دیا ہے جیسا کہ ارشاد ہے۔ هَذَانِ خَصۡمَانِ اخۡتَصَمُوا فِیۡ رَبِّهِمۡ (سورہ الحج:۱۹) یہ دو فریق ہیں جن کے درمیان اپنے رب کے بارے میں جھگڑا ہے۔ حدیث نبوی ہے کہ لَایَتَوَارثُ اَھۡلُ مِلَّتَیۡنِ دو ملتیں ایک دوسرے کی وارث نہیں ہو سکتی ہیں اور آپؐ نے فرمایا ہے کہ مسلمان کافر کا وارث نہیں ہو سکتا ہے اور نہ کافر مسلمان کا وارث ہو سکتا ہے۔ دو ملتوں سے مراد ملت اسلامی اور دیگر تمام ملتیں جو اسلام سے باہر ہیں وہ بحیثیت ایک ملت کے ہیں۔

لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَلِيَ دِيْنِ کی آیت میں دراصل حق و باطل کے درمیان افتراق و اختلاف کی نشاندہی کی گئی ہے جو صحیح راہ اختیار کرنے کے لیے ناگزیر تھا۔ جس سے ثابت کیا گیا ہے کہ حق وباطل کے درمیان کوئی درمیانی راستہ اختیار کرنا نامناسب اور ناجائز ہے۔ توحید ایک نظام ہے اور شرک دوسرا نظام ہے۔ یہ ایک دوسرے کے ساتھ قطعاً میل نہیں کھاتے ہیں توحید کے نتیجے میں انسان پوری کائینات کے ساتھ اللہ وحدہٗ لاشریک کی طرف متوجہ ہوتا ہے یہ نظام ہدایت کا وہ سرچشمہ ہے جہاں سے انسان کو اپنا عقیدہ، اپنا ضابطۂ حیات، اپنی قدریں، اپنے پیمانے، اپنے آداب و اخلاق اور اپنی زندگی کے طور طریقے اور تصورات اخذ کرنے ہیں یہ وہ منبع ہے جہاں سے انسان کو سب کچھ حاصل کرنا ہے تاکہ اس کی پوری زندگی توحید کی بنیاد پر قائم ہو بشرطیکہ اس کے تصورات اور خیالات میں کسی بھی ظاہری یا مخفی شرک کی آمیزش نہ ہو۔

حق و باطل کی یہ تفریق، امتیاز اور اختلاف ایک داعی کے لیے بھی ضروری ہے اور ان کے لیے بھی جنہیں دعوت دی جارہی ہو حقیقت یہ ہے کہ کفر اور ایمان کے ایک دوسرے کے ساتھ گڈمڈ ہونے کے خدشات سماج میں ہمیشہ سے موجود ہیں۔ شیطان اور شیطانی صفات رکھنے والے انسانوں کی جدوجہد بھی سماج میں موجود ہے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خود ایک داعی جو سماج میں فاسد عناصر کو درست کرنا چاہتا ہے فریب کا شکار ہوجاتا ہے وہ سماج کو حق کی طرف لانے کے لیے مصالحت کا راستہ اختیار کرلیتا ہے یا کسی وقت اپنے تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے غیروں سے مفاہمت کا راستہ اختیار کرلیتا ہے۔ اس طرح کی حرکت کرنے یا اس طرح کی توقعات قائم کرنے سے انتہائی خطرناک نتائج برآمد ہوتے ہیں کیونکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ڈوبنے والوں کی کشتی کو بچاتے ہوئے اپنی کشتی بھی ڈوب جاتی ہے۔ اسی طرح اچھے لوگوں کی برے لوگوں سے دوستی کرنے کا نتیجہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اچھے لوگ برے بن جائیں۔ اس لیے مسلمانوں کو اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ کفر و اسلام کے درمیان مفاہمت اور مصالحت کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ کفر وشرک کو چھوڑ کر انسان اسلام کی طرف آجائے اس سلسلے میں داعی کو پورا شعور ہونا چاہیے کہ شرک کی دوستی اور مذہبی رواداری سے مکمل کنارہ کشی ہی اسلام کی ترجمانی ہے۔ کفر کے ساتھ کوئی سازوباز اور کوئی سمجھوتہ نہ ہو کوئی مصالحت و مفاہمت نہ ہو خواہ یہ کفر و شرک اسلام کا لبادہ اوڑھ کر آئے یا اسلام کا ہمدرد بن کر آئے یا کوئی اور صورت اختیار کرکے آئے داعی کو اس بات کا بھی شعور ہونا چاہیے کہ وہ ان لوگوں سے بالکل مختلف شئے ہے اوراس کا راستہ الگ ہے اور اُن کا راستہ الگ ہے اور داعی کا کام صرف یہ ہے کہ وہ بلا کسی خوشامد اور اپنے دین کے اصولوں سے دست بردار ہوئے بغیر اپنی دعوت کوپیش کرے اور اگر دعوت سننے والے دین میں شامل ہونے کے لیے تیار نہ ہوں تو ان سے مکمل برأت، کامل افتراق، صَریح جدائی اور تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین کا اعلان کردینا دین اسلام کی صحیح حفاظت ہے۔

سورۃُ النَّصر

اٰیاتُھا:3 رُکُوعُھا:1

بسم االله الرّحمٰن الرّحيم

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللهِ وَالْفَتْحُ o وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللهِ أَفْوَاجًا o فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْ□□□ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا o

پس منظر:

تین آیات کے اس مختصر سورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک فتح عظیم کی بشارت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کی مدد آئے گی اور ان کے لیے ایک بہت بڑی فتح ہوگی جب لوگ اللہ کے دین میں فوج درجوج داخل ہوجائیں گے۔ اس بشارت کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ اس حقیقت کی طرف بھی مبذول کرائی گئی ہے کہ جب اللہ کی یہ فتحِ عظیم حاصل ہوجائے گی اور لوگ جوق درجوق اللہ کے دین میں شامل ہوجائیں گے اور یوں آپؐ کی پہچان ایک عظیم فاتح کی حیثیت سے ہوگی تو اس مقام بلند پر پہنچ کر آپ اپنے رب کی تسبیح کریں اور حمد و استغفار کے ساتھ اللہ کی طرف متوجہ ہوجائیں۔

اس سورہ کے سلسلے میں متعدد روایات پائی جاتی ہیں۔ ایک روایت ہے کہ عائشہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زندگی کے آخری دور میں

سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ وَاَتُوْبُ اِلَیْہِ۔ ''پاک وبرتر ہے اللہ، میں اس کی حمد وثنا کرتا ہوں... کثرت سے پڑھتے تھے۔'' آپؐ نے فرمایا کہ میرے رب نے مجھے بتایا کہ میں عنقریب اپنی امت کے سلسلے میں ایک نشانی دیکھوں گا اور جب میں وہ نشانی دیکھ لوں تو اللہ کی حمد وثنا کے ساتھ اس کی تسبیح کروں اور اس سے مغفرت چاہوں تو میں نے وہ نشانی دیکھ لی پھر آپؐ نے سورہ نصر تلاوت کی اور فرمایا یہی وہ نشانی ہے جو مجھے اپنی امت کے سلسلے میں دکھائی گئی ہے۔

ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ جب یہ سورۃ نازل ہوئی تو حضورؐ نے فرمایا مجھے میری وفات کی خبر دے دی گئی ہے اور میرا وقت آن پہنچا ہے۔ ایک روایت حضرت عبداللہ بن عباس سے منقول ہے کہ اس سورہ کے نزول سے حضورؐ نے یہ سمجھ لیا تھا کہ آپؐ کو دنیا سے رخصت ہونے کی اطلاع دے دی گئی ہے۔

عبداللہ بن عباس سے یہ روایت منقول ہے کہ جب سورۃ نصر نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ کو اپنے پاس بلایا اور فرمایا کہ مجھے میری موت کی اطلاع دی گئی ہے تو وہ رو پڑیں پھر آپؐ نے انہیں دوبارہ بلایا اور کان میں کچھ فرمادیا اس پر وہ ہنسنے لگی۔ جب آپؓ سے پہلی بار رونے اور دوسری بار ہنسنے کی وجہ پوچھی گئی تو آپ نے جواب دیا کہ پہلی بار آپؐ نے مجھے اپنی موت کی خبر دی تو میں رو پڑی پھر جب دوسری بار بلایا تو اس وقت آپؐ نے مجھ سے فرمایا کہ صبر کرو میرے گھر والوں میں سے تم سب سے پہلے مجھ سے آکر ملوگی تو میں ہنس پڑی۔ اس روایت کا مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رب کے درمیان ایک نشانی مقرر تھی وہ نشانی اِذَاجَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَالۡفَتۡحُ تھی۔ جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح نصیب ہوجائے۔ جب اللہ کی مدد آگئی اور فتح نصیب ہوگئی تو آپؐ نے جان لیا کہ رب سے ملاقات کا وقت قریب ہے اس لیے اپنی بیٹی حضرت فاطمہؓ کو بلاکر ان سے سرگوشی کی۔

اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بتادیا تھا کہ جب عرب میں اسلام کی فتح مکمل ہوجائے اور لوگ اللہ کے دین میں فوج درفوج داخل ہونے لگیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ کام مکمل ہوگیا ہے جس کے لیے آپ دنیا میں بھیجے گئے تھے۔ اس کے بعد آپ کو حکم دیا گیا کہ آپ اللہ کی حمد اور تسبیح کرنے میں مشغول ہوجائیں کہ اس کے فضل سے آپ اتنا بڑا کام انجام دینے میں کامیاب ہوگئے اور اس سے دعا کریں کہ اس خدمت کی انجادم دہی میں جو بھول چوک یا کوتاہی آپ سے ہوئی ہو اسے وہ معاف فرمادے۔ یہاں اس بات پر غور کرنا ضروری ہے کہ دنیادار راہنما کو جب کوئی بڑا انقلاب برپا کرنے میں کامیابی مل جاتی ہے یا کسی ملک کو فتح کرتا ہے تو وہ بڑے پیمانے پر جشن منانے کا حکم دیتا ہے اور اپنی کامیابیوں پر فخر کرتا ہے۔ مگر اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ۲۳ سال کی زبردست جدوجہد کے بعد جو عظیم کامیابی حاصل ہوئی اس پر جشن منانے کے بجائے آپؐ اللہ کی ہدایت کے مطابق اُس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرنا اور مغفرت کی دعا مانگنا شروع کردیتے ہیں اور اللہ کی عبادت میں رات دن مشغول ہوجاتے ہیں۔ جیسا کہ ابن عباس کا بیان ہے کہ اس سورۃ کے نازل ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخرت کے لیے محنت و ریاضت کرنے میں اتنے مشغول ہوگئے جتنے اس سے پہلے کبھی نہ ہوئے تھے۔

لیکن اس بات کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا ہے کہ جب مسلمانوں نے دنیاوی امور کی بہتر انجام دہی کے ساتھ ساتھ دین اسلام کے لیے جانی اور مالی قربانیاں دیں تب ہی انہیں اللہ تعالیٰ نے عظیم فتوحات سے نوازا اور صحابہ کبارؓ نے رسولؐ خدا کی مَعیت میں اپنی بے مثال مالی وجانی قربانیوں کے بعد ہی اللہ کے فضل وکرم سے فتح مکہ کی عظیم کامیابی حاصل کی جو آنے والی نسلوں کے لیے قیامت تک کے لیے راہنمائی کا روشن مینار ہے۔

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ (۱)

جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح نصیب ہوجائے

وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللهِ أَفْوَاجاً(٢)

اور (اے نبی) تم لوگوں کو دیکھ لو کہ وہ اللہ کے دین میں فوج درفوج شامل ہورہے ہیں

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهُ كَانَ تَوَّاباً(٣)

پس اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرو اور بخشش مانگو بے شک وہی توبہ قبول کرنے والا ہے

جب اللہ کی مدد آئے اور فتح نصیب ہوجائے

اکثر علمائے تفسیر نے فتح کو فتح مکہ قرار دیا ہے۔ بعض مشایخ بدر نے کہا ہے کہ جب ہمیں فتح اور کامیابی سے نوازا گیا تو ہمیں حمد واستغفار کرنے کا حکم دیا گیا۔ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہم کے نزدیک اس سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہے۔ بعض صحابہ کرام نے اس کی تفسیریوں کی ہے کہ جب اللہ نے ہمارے لیے شہر اور قلع فتح کردئے تو ہمیں حکم دیا کہ ہم اللہ کی حمد کریں۔ اس کا شکر ادا کریں اور اس کی تسبیح کریں یعنی نماز ادا کریں اور استغفار کریں حضرت عمرؓ نے اس سورۃ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اس سورۃ میں آقائے نامدار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارکہ کے دنیا سے تشریف لے جانے کی خبر دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ جب آپ مکہ فتح کرلیں گے جو آپ کی آبائی بستی ہے جس سے آپ کو نکالا گیا اس وقت لوگ جوق درجوق دین میں داخل ہوں گے آپ دنیا میں اپنا فرض ادا کرچکے ہوں گے چونکہ آخرت آپ کے لیے دنیا سے بہتر ہے اس لیے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح اور استغفار کریں بے شک وہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔

آیت پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ فتح سے مراد صرف فتح مکہ نہیں بلکہ اس سے مراد بہت ساری فتوحات ہیں جو اللہ تعالیٰ کی مدد سے مسلمانوں کو نصیب ہوئیں اور جن کے بعد کسی اسلام دشمن قوت کو ہمت نہ ہوئی کہ وہ مسلمانوں سے ٹکر لینے کی جرأت کرسکے یہ وہ فتوحات ہیں جن سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ دین اسلام کو اب دنیا میں غالب ہوکر رہنا ہے۔ پہلی بڑی فتح جو مسلمانوں کو حاصل ہوئی وہ جنگ بدر کی فتح ہے جس میں مسلمانوں نے کافروں کے ایک ہزار تین سو کے لشکر کو تین سو تیرہ کی تعداد سے شکست فاش دے دی۔ یہ مسلمانو کی پہلی فتح عظیم تھی، جس میں مسلمانوں کی بقائے دوام تھی۔ جب مسلمان میدان جنگ میں ثابت قدم رہے اور اپنی جانیں خدا کی راہ میں نچھاور کرنے کی ٹھان لی تب رحمت الٰہی جوش میں آئی اور فرشتے بھیج کر مسلمانوں کی مدد فرمائی جیسا کہ قرآن میں بیان ہوا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ سے مدد مانگی تو اس نے ایک ہزار فرشتوں کے ذریعے مسلمانوں کی مدد فرمائی۔

إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُم بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ ○ (انفال:۹)

اس کے بعد مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے فتح کے بعد فتح سے نوازا۔ جنگ اُحد میں مسلمانوں کو اگرچہ کافی جانی نقصان ہوا تاہم میدان جنگ کی باگ ڈور انہی کے ہاتھ میں رہی۔ اس کے بعد جب پورے عرب سے کافروں اور مشرکوں کے لشکروں نے مدینہ کا گھراؤ کیا تو مسلمانوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں مدینہ کے اردگرد خندق کھود کر دفاعی جنگ لڑی اور عرب کے ان لشکروں کو اپنی حکمت عملی اور جرأت مندی سے واپس جانے پر مجبور کردیا۔ اگرچہ یہ ایک دفاعی جنگ (defensive war) تھی اور اس میں دونوں اطراف سے کوئی زیادہ جانی نقصان نہیں ہوا تھا لیکن مسلمانوں کے لیے ایک فتح عظیم سے کم نہ تھی۔ کیونکہ بدر میں انہوں نے اپنی بقا کی جو جنگ جیت لی تھی جنگ خندق میں کامیابی پاکر انہوں نے اس کو برقرار رکھا۔ مسلمانوں کے لیے صلح حدیبیہ بھی ایک بہت بڑی فتح تھی۔ جب پندرہ سو مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عمرہ کرنے کے لیے مکہ کی طرف روانہ ہوئی تو مشرکین مکہ نے مکہ کے نزدیک پہنچ کر مسلمانوں کا راستہ روک لیا پھر جب مسلمانونے واپس جانے اور اگلے سال عمرہ کرنے کا مشرکوں سے معاہدہ کیا اور مسلمانوں میں واپس جانے کے فیصلے پر بے چینی پھیل گئی تو اس وقت سورۃ الفتح نازل ہوئی جس میں مسلمانوں کے اس فیصلے کو اللہ نے فَتْحًا مُّبِيْنًا ایک کھلی فتح قرار دے دیا۔

فتح مکہ یقینا مسلمانوں کی ایک عظیم فتح کے ساتھ اسلامی نظام اور اقتدار کی فتح تھی لیکن اس کے بعد بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں کئی معرکوں میں مسلمانوں کو کامیابی حاصل ہوئی تبوک میں کامیابی ہوئی حنین کا میدان ہاتھ آیا۔ اس طرح پورے عرب پر مسلمانوں نے دھاک بٹھائی۔ آپؐ کی وفات کے بعد مسلمانوں کو جو فتوحات حاصل ہوئیں ان میں ہر ایک فتح اپنی جگہ ایک عظیم فتح تھی اور ہر ایک فتح میں لوگ فوج درفوج اسلام میں داخل ہوتے رہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد فرمایا تھا کہ عرب کے خطے میں صرف دین اسلام رہے گا اور انہوں نے یہ بھی اشارہ دیا تھا کہ اسلام دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچ جائے گا اور لوگ جوق درجوق دین اسلام میں شامل ہوجائیں گے اور فتح مکہ کے بعد بھی لوگ جوق درجوق دین اسلام میں داخل ہوگئے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ترک بڑی مدت تک اسلام کی مخالفت کرتے رہے ان کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

اور (اے نبی) تم لوگوں کو دیکھ لوگے کہ وہ اللہ کے دین میں فوج درفوج شامل ہورہے ہیں

یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خوش خبری دی جارہی ہے کہ تمہارے لیے فتوحات کا ایسا دور آئے گا کہ لوگ جوق درجوق اسلام میں شمولیت اختیار کرلیں گے اور قبیلوں کے قبیلے اور خاص و عام مسلمان ہوجائیں گے۔ یہ بشارت ہر لحاظ سے پوری ہوگئی۔ ۸ ہجری میںجب فتح مکہ ہوئی تو اس کے فوراً بعد ۹ ہجری کے آغاز میں لوگ عرب کے کونے کونے سے وفدوں کی صورت میں آکر رسول اللہ سے بیعت لے رہے تھے۔ اسی وجہ سے اس سال کو سال وفود کہا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ۱۰ ہجری میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے لیے تشریف لے گئے اس وقت پورا عرب اسلام کے زیر نگین آگیا تھا اور عرب کے گھر گھر میں دین داخل ہوچکا تھا اور جزیرۃ العرب میں کوئی مشرک قبیلہ باقی نہ رہ گیا الا یہ کہ کچھ لوگ متفرق طور پر رہ گئے ہوں۔

فتوحات کا یہ عمل ملک عرب تک ہی محدود نہ رہا بلکہ مسلمانو نے اپنے نبی کے وصال کے بعد اُن کے مشن کی پیروی کرتے ہوئے دین حق کو حتی الامکان دنیا کے تمام قابل ذکر ممالک تک پہنچایا۔
سنہ ٦ ہجری میں اسپین (Spain) پر مسلمانوں نے قبضہ کرکے وہاں اسلامی حکومت قائم کردی، جہا ں چھ سو سال تک مسلمانوں کی حکومت رہی۔ پھر مسلمانوں کی لاپرواہی کی وجہ سے انہیں 600 سال کی حکومت کرنے کے بعد اسپین سے نکلنا پڑا اور اپنی لاپرواہی کی سزا مل پائی۔ ٦ ہجری میں ہی ہندوستان کی سرزمین پر مسلمانوں نے جب محمد بن قاسم کی قیادت میں اپنے قدم جمائے تو لوگ فوج درفوج اسلام میں شامل ہونے لگے مگر مسلمان حکمرانوں نے پھر وہی اسپین کی غلطی دہرائی کہ محمد بن قاسم کو انتقام گیری کی بنیاد پر واپس بلا کر قید کردیا جس کی وجہ سے ہندوستان میں اسلامی تحریک مدہم پڑ گئی۔
لیکن داعیانِ دین اور علماء کی کوششوں سے اس کے باوجود ہندوستان کی آبادی کی ایک معتدبہ تعداد نے اسلام قبول کیا۔ اسی دوران سید علی ہمدانیؒ وادی کشمیر تشریف لے آئے کشمیر کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس اعلان کے مطابق کہ ''جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح نصیب ہوجائے (اے نبی) آپ دیکھ لیں گے کہ لوگ دین اسلام میں فوج درفوج داخل ہوں گے'' کشمیر کے لوگوں نے بت پرستی کا چولا اتار پھینک کر حضرت سید علی ہمدانیؒ پر بیعت کرکے اسلام میں جوق در جوق شمولیت اختیار کی۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی تعمیل میں لوگ تا قیامت دین اسلام میں شامل ہوتے رہیں گے۔ جیسا کہ آج بھی اس دین مُبین میں لوگوں کے شامل ہونے کا سلسلہ جاری ہے اور ان شاء اللہ جب تک اللہ کی مرضی ہو یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

پس اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرو اور بخشش مانگو بے شک وہی توبہ قبول کرنے والا ہے

جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد آتی ہے اور فتوحات حاصل ہوجاتی ہیں تو پیغمبرؐ کو اور اُن کی وساطت سے عام مسلمانوں کو ہدایت دی جاتی ہے کہ گمراہ اور متکبر لوگوں کی طرح ان فتوحات پر بینڈ باجوں اور ناچ نغموں کی نازیبا حرکتوں سے اپنی گمراہی اور تکبر کا مظاہرہ نہیں کرنا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی حمد اور اس کی تسبیح کرنے میں مشغول ہوجانا چاہیے۔ ان فتوحات اور کامیابیوں کے متعلق تمہارے دلوں میں کبھی یہ خیال تک نہ گزرے کہ یہ تمہارے کمال کا نتیجہ ہے بلکہ ان کو سراسر اللہ کا فضل وکرم سمجھو اور اُن پر اُس کا شکر ادا کرو اور زبان ودل سے اعتراف کرو کہ ان کامیابیوں کی ساری تعریف اللہ کو ہی سزاوار ہے اور اس بات پر یقین کرو کہ خدا تمہاری ان تعریفوں، تسبیحوں اور تحمیدوں کا محتاج نہیں ہے بلکہ تمہاری یہ کامیابیاں اللہ تعالیٰ کی مدد کی محتاج ہیں اور اسی کی مدد پر ہی تمہاری کامیابیوں کا انحصار ہے۔ وہ جس بندے سے چاہتا ہے اپنا کام لے سکتا ہے اور تم پر اس کا یہ احسان ہے کہ اس نے تم سے خدمت لی اور تمہیں خدا کے دین کی خدمت کرنے کا اعزاز بخشا۔

انسان کو جب توقع سے زیادہ کوئی چیز ملتی ہے تو اسے حیرت ہوجاتی ہے اس لیے اس موقع پر اسے سبحان اللہ کہنا چاہیے یعنی اللہ (کمزوریوں سے) پاک ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان تسلیم کرلیتا ہے کہ اللہ کی قدرت سے ہی انسان کو یہ حیرت انگیز چیز حاصل ہوئی اور اسی کی مدد سے وہ حیرت انگیز کارنامے انجام دیتا ہے ورنہ کسی انسان یا طاقت کے بس میں نہیں ہے کہ وہ ایسا کام انجام دے اور نہ کوئی واقعہ خدا کی مرضی کے بغیر رونما ہوسکتا ہے، نا ہی کوئی کامیابی اللہ کی مدد کے بغیر حاصل ہوسکتی ہے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دی گئی ہے کہ جو کامیابیاں آپ نے حاصل کی ہیں یہ سب اللہ کی مدد اور اس کے فضل سے حاصل ہوئیں لہذا ان کامیابیوں پر اللہ کی حمد و تسبیح کریں۔

نبیؐ سے فرمایا جارہا ہے کہ آپ خدا کی حمد اور تسبیح میں مشغول ہوجائیں آپ اپنے رب سے دعا مانگیں کہ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں جو بھول چوک یا کوتاہی ہوئی ہو وہ معاف کریں۔ اسلام مسلمانوں کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ انسان اللہ کے دین میں خواہ بڑی سے بڑی قربانی پیش کرے اور بڑی سے بڑی خدمتیں انجام دے لیکن اس کے دل میں کبھی یہ خیال تک نہ آنا چاہیے کہ میرے اوپر میرے رب کا جو حق تھا وہ میں نے پورے کا پورا ادا کردیا بلکہ اسے ہمیشہ یہ سمجھنا چاہیے کہ جو کچھ مجھے کرنا چاہیے تھا وہ میں نہیں کرسکا اور اللہ سے یہی دعا مانگنی چاہیے کہ اے اللہ جس طرح مجھے آپ کے دین اور آپ کی عبادت کا حق تھا، بے شک میں نے ادا نہیں کیا۔ اس حق کو ادا کرنے میں مجھ سے جو کوتاہی ہوئی اسے درگزر فرما اور میری حقیر سی خدمت قبول فرما۔ آپ معاف کرنے والے اور مغفرت کرنے والے ہیں میری کمزوریوں اور کوتاہیوں کو معاف فرمادیں۔ داعیانِ دین اپنی انتھک جدوجہد کے باوجود اس طرح کی دعائیں مانگتے تھے داعی اسلام حضرت سید علی ہمدانیؒ کے مُرتبہ مجموعۂ وظائف ''اوراد فتیحہ'' میں اسی طرح کی ایک دل رُبا دعا ایک جگہ درج ہے:

سُبْحَانَکَ مَا عَبَدْنَاکَ حَقَّ عِبَادَتِکَ

اے اللہ تو پاک ہے ہم نے تیری عبادت نہیں کی جیسا کہ تیری عبادت کرنے کا حق تھا

سُبْحَانَکَ مَا عَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ

اے اللہ تو پاک ہے ہم نے تجھے نہیں پہچانا جیسا کہ تجھے پہنچاننے کا حق تھا

سُبْحَانَکَ مَا ذَکَرْنَاکَ حَقَّ ذِکْرِکَ

اے اللہ تو پاک ہے ہم نے تیرا ذکر اس طرح نہیں کیا جیسا کہ تیرا ذکر کرنے کا حق تھا۔

سُبْحَانَکَ مَا شَکَرْنَاکَ حَقَّ شُکْرِکَ

اے میرے پروردگار! تو سب کمزوریوں سے پاک ہے۔ ہم نے تیرا شکرانہ ادا نہیں کیا جیسا کہ تیرا شکر بجا لانے کا ہم پر حق تھا۔

عاجزی اور انکساری کے ساتھ مغفرت مانگنے کی دعا جب رسول اللہؐ کو سکھائی گئی جن سے بڑھ کر خدا کی راہ میں جدوجہد کرنے والے کسی انسان کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا ہے تو کوئی اپنے عمل کو کس طرح ایک بڑا عمل سمجھے گا اور اس پر فخر و ناز کرے گا۔ جس نے اللہ کی راہ میں کوئی نیک عمل کیا، اس نے اللہ ہی کی توفیق سے وہ حق ادا کیا جو اس پر واجب تھا اور اس نے صرف وہ ذمہ داری نبھائی جو اللہ نے اس پر ڈالی تھی۔ بقول غالب مرحوم:

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

سورۃ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی یہی ہے کہ دین کے امور و فرائض کو اہل ایمان انجام دیں۔ اللہ نے انہیں اس کا نگران اور امین بنادیا ہے اور اس کام کو بحسن خوبی انجام دینا ان کی ذمہ داری ہے لہٰذا جو کام وہ ان سے لینا چاہے، ان کو چاہیے کہ غیرت مندی، دیانت داری اور بلامعاوضہ انجام دیں۔

واضح رہے کہ طویل جدوجہد اور شدید آزمائشوں کے بعد جب انسان کو کامیابی نصیب ہوتی ہے تو مسرت اور فرحت سے اس کے دل پر فخر وغرور کا احساس چھاجانے کا احتمال ہوتا ہے اس کیفیت سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی حمد اور استغفار کرنے کی تلقین کی گئی ہے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شدید کشمکش اور مشکلات کا سامنا کرنے اور اللہ کے وعدوں کے پورا ہونے میں اس کی مصلحت کے تحت تاخیر کی وجہ سے اہل ایمان کو تذبذب کا خطرہ لاحق ہوتا ہے اور بشر ہونے کی وجہ سے پریشانی کی حالت میں مایوسانہ کلمات کہنے لگتے ہیں جیسا کہ قران میں بیان ہوا ہے۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُواْ الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ الَّذِينَ خَلَوْاْ مِن قَبْلِكُم مَّسَّتْهُمُ الْبَأْسَاء وَالضَّرَّاء وَزُلْزِلُواْ حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُواْ مَعَهُ مَتَى نَصْرُ اللّهِ أَلا إِنَّ نَصْرَ اللّهِ قَرِيبٌ o (سورہ البقرۃ:۲۱۴)

ان شدید حالات سے گزرنے اور مشکلات کا سامنا کرنے کے دوران بشری تقاضوں کے تحت جب مسلمان تنگی محسوس کرتے ہیں تو وہ ہل جاتے ہیں ان سے بے صبری کی لغزش بھی ہو سکتی ہے۔ اس لیے فتح پانے کے موقعہ پر ان لغزشوں کو معاف کروانے کے لیے انہیں اللہ سے استغفار کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب ان شدید مشکلات کے بعد مسلمانوں کو فتح نصیب ہوجاتی ہے تو خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ان سے فخر و ناز کی خطا کا احتمال ہوتا ہے۔ اس لیے فتح اور کامیابی کے موقعہ پر انہیں اللہ سے مغفرت مانگنے کی تاکید کی گئی ہے۔

توبہ واستغفار بنی آدم کی رونق ہے یہ مسلمان کے پاس اللہ کی عطا کی ہوئی وہ چابی ہے جس سے وہ جنت کا تالا کھول سکتا ہے اور وہاں داخلہ لے سکتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ دنیا میں جو انقلابات رونما ہوئے

ان میں سے غالب آنے والوں نے مغلوبوں پر کس طرح کا ظلم کیا انتقام گیری میں لاکھوں لوگوں کا قتل عام کیا گیا ۔ اس حقیقت کو کتاب لایزال میں یوں بیان کیا گیا ہے:

إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً... (النحل:۳۴) (ملکہ نے کہا کہ) بادشاہ جب کسی ملک میں گھُس آتے ہیں تو اسے خراب اور اس کے عزت والوں کو ذلیل کردیتے ہیں۔

اللہ کا خوف نہ ہوتو فاتح مفتوحوں سے انتقام لیے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔ اس لیے فتح کے موقعہ پر اللہ کی حمد اور توبہ واستغفار میں مشغول ہونا اللہ کی نعمت ہے جو انسان کو تکبر اور غرور سے محفوظ رکھتی ہے۔

یہی ہے وہ اعلیٰ معیار جو ہمیشہ نبیوں کا سرمایہ رہا اور اسی معیار تک اللہ تعالیٰ انسانیت کو پہنچانا چاہتا ہے۔یہی اخلاقی معیار حضرت یوسف علیہ السلام نے اس وقت قائم رکھا جب مصر کی سلطنت کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں آگئی تو وہ اللہ کے حضور سربسجود ہوکر یوں محوِ دعا ہوئے:

رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِي مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِي مِن تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ فَاطِرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ أَنتَ وَلِيِّي فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ تَوَفَّنِي مُسْلِماً وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ o (سورہ یوسف:۱۰۱)

حضرت یوسف علیہ السلام نے جوں ہی ملک کا اقتدار سنبھال لیا تو جشن منانے کے بجائے خدا کی حمد میں مشغول ہوگئے۔ خدا کا خوف ان پر اس قدر طاری تھا کہ گڑگڑا کر دعا کررہے ہیں۔ اے میرے رب دم واپسیں تک مجھے اسلام پر قائم رکھ اور مجھے اسلام پر موت دے اور مجھے اپنے فضل و کرام سے صالحین اور نیکوکاروں کے زمرے میں شامل فرما۔

ایسا ہی کردار حضرت سلیمان علیہ السلام نےپیش کیا جب انہوں نے ملکہ سبا کے تختِ شاہی کو پلک جھپکنے سے پہلے اپنے پاس موجود پایا اُن کی اس وقت کی کیفیت کو قرآن نے یوں بیان فرمایا ہے۔

فَلَمَّا رَآهُ مُسْتَقِرّاً عِندَهُ قَالَ هَذَا مِن فَضْلِ رَبِّي لِيَبْلُوَنِي أَأَشْكُرُ أَمْ أَكْفُرُ وَمَن شَكَرَ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ وَمَن كَفَرَ فَإِنَّ رَبِّي غَنِيٌّ كَرِيمٌ o (سورۃ النمل:۴۰)

یہی طریقہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ اور دیگر فتوحات کے مواقع پر اپنایا جو دنیا بھر کی آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ اہل مکہ نے آپ کو انتہائی اذیتیں پہنچائی تھیں آپ سے جنگوں کا سلسلہ جاری رکھا تھا اور اسلام کی دعوت کی راہ میں مخالفت کی دیوار بن کر کھڑے ہوگئے تھے،

مگر فتح مکہ کے وقت جب آپ مکہ میں داخل ہوئے تو جذبہ شکر سے آپ اپنی سواری پر خدا کے حضور جھکے ہوئے تھے اور فتح وکامرانیوں کی مسرتوں کو فراموش کرکے آپ ایک شکرگزار بندے کی حیثیت سے خدا کی بارگاہ میں جھک گئے اور جس طرح رب نے آپ کو تاکید کی تھی، اسی طرح تسبیح وتحمید اور توبہ استغفار میں مشغول ہوگئے اور آخر دم تک آپ زیادہ تر تسبیح و تحمید اور توبہ واستغفار میں مشغول رہے۔

سورۃ اللَّھَب

آیاتُھا:5 رکوعُھا:1

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ o مَا أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ o سَيَصْلَىٰ نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ o وَامْرَأَتُهُ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ o فِي جِيدِهَا حَبْلٌ مِّن مَّسَدٍ o

پس منظر:

یہ قرآن مجید کی واحد سورت ہے جس میں کسی اسلام دشمن شخص کا نام لے کر مذمت کی گئی ہے حالانکہ اعلان نبوت کے بعد بہت سے لوگ ایسے تھے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور آپ کی نبوت ورسالت کی مذمت کرتے تھے اور آپؐ کو کافی تکلیف دیتے تھے دیکھنا یہ ہے کہ جس شخص کا نام لے کر مذمت کی گئی ہے اس کی خصوصیت اور اہمیت کیا تھی کہ قرآن میں نام لے کر اس کی مذمت کی گئی۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے عربی معاشرے اور اس شخص کے کردار، گفتار اور معاملات کو سمجھنا ضروری ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان نبوت کے وقت عرب میں ہر طرف بدامنی اور غارت گری کا ماحول تھا۔ ایسے میں کسی بھی شخص کے لیے اپنے خاندان اور رشتہ داروں کی حمایت کے بغیر اطمینان اور آرام سے جینا بہت مشکل تھا۔ اس قبائلی نظام میں ہر شخص کے لیے اپنے خاندان اور اپنے رشتہ داروں کی حمایت حاصل کرنے اور حمایت کے لیے حاضر باش ہونا ضروری تھا۔

اس لیے بدامنی کے اس ماحول میں صلہ رحمی یعنی رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کو بہت اہمیت حاصل تھی اور قطع رحمی یعنی رشتہ داروں سے لاتعلق ہونے کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کی دعوت لے کر اٹھے تو قریش کے سارے خاندانوں نے آپ کی شدید مخالفت کی مگر بنی ہاشم جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان تھا نے کوئی مخالفت نہ کی بلکہ آپؐ کی حمایت میں ڈٹے رہے۔ حالانکہ ان میں سے اکثر لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان نہیں لایا تھا۔ قریش کے دوسرے خاندان خود بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرنے کے باوجود آپؐ کے رشتہ داروں کی حمایت اور ہمدردی کو اخلاقی روایات کے عین مطابق سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ بنی ہاشم کو یہ طعنہ نہیں دیتے تھے کہ تم اپنے اُس رشتہ دار کی حمایت کرتے ہیں جس نے ہمارے دین کے خلاف ایک نیا دین لا کے کھڑا کر دیا ہے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ کسی خاندان کے لوگ اپنے ہی خاندان کے فرد کو کسی بھی حالت میں دشمنوں کے حوالے نہیں کرسکتے ہیں۔ بلکہ ایسا کرنا ان کے نزدیک ایک بہت بڑا اخلاقی جرم تھا۔ عرب کے اس سماجی اصول، جسے لوگ واجب الاحترام سمجھتے تھے، کو صرف ایک شخص ابولہب نے توڑ ڈالا۔ ابولہب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا تھا۔ عرب میں چچا کو باپ کا مقام حاصل تھا اور معاشرے میں چچا سے بجا طور پر یہ توقع کی جاتی کہ باپ کے انتقال کے بعد اپنے بھائی کے بچوں کی پرورش کرے گا، لیکن ابولہب نے اپنے بھتیجے محمدؐ کی سب سے بڑھ کر مخالفت کی اور اسلام دشمنی اور کفر کی محبت میں عرب کی اس صدیوں پرانی روایت کو پامال کردیا۔

ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت عام پیش کرنے کا حکم دیا گیا اور یہ حکم بھی ملا کہ آپ اپنے قریب ترین عزیزوں کو سب سے پہلے خدا کے عذاب سے ڈرائیں تو آپؐ نے صبح سویرے کوہ صفا پر چڑھ کر بلند آواز سے پکارا۔ یا صباحاہ (ہائے صبح کی آفت)۔ عرب میں یہ آواز وہ شخص لگاتا تھا جو صبح کے وقت کسی دشمن کو اپنے قبیلے پر حملہ کرنے کے لیے آتے دیکھ لیتا تھا۔ لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ محمدؐ پکار رہے ہیں تو قریش کے سارے خاندانوں کے لوگ آپؐ کی طرف دوڑ پڑے۔ جب سب لوگ جمع ہوگئے تو آپ نے قریش کے ایک ایک خاندان کے نام سے پکارا۔ اے بنی ہاشم، اے بنی عبدالمُطلِب، اے بنی فہر، اے بنی فلاں، اے بنی فلاں اگر میں تمہیں بتاؤں کہ پہاڑ کے پیچھے ایک لشکر تم پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہے تو تم میری بات سچ مانو گے؟ لوگوں نے کہا ہاں کیونکہ ہم نے کبھی تم سے جھوٹ نہیں سنا ہے۔ آپ نے فرمایا تو میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ آگے سخت عذاب آرہا ہے۔ اس سے قبل کہ کوئی اور بولتا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابولہب نے کہاتَبّاً لَکَ اِلھٰذَا جَمَعْتَنَا ستیاناس ہوجائے تیرا، کیا اس لیے تو نے ہمیں جمع کیا تھا؟!

ابولہب ایک متکبر سردار تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ اُس نے ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اگر میں تمہارے دین کو مان لوں تو مجھے کیا ملے گا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو اور سب ایمان لانے والوں کو ملے گا۔ اس نے کہا، کیا میرے لیے کوئی فضیلت نہیں ہے۔ آپؐ نے فرمایا نہیں، اسلام میں مساوات ہے جس کا جتنا زیادہ عمل ہو اسے اتنا زیادہ ملے گا۔ اس پر ابو لہب نے کہا

تَبّاً لِھٰذَاالدِّینِ تَبّاً اَنْ اَکُوْنَ وَھٰؤُلَاءِ سَوَآءً

ستیاناس جائے اس دین کا جس میں، میںاور یہ دوسرے لوگ برابر ہوں۔

مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابولہب کے گھر پاس پاس تھے یعنی ابولہب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بغل کا ہمسایہ (next door neighbour) تھا اس کے علاوہ آس پاس کے کئی گھرانے تھے جو آپؐ کے ہمسایہ تھے۔ یہ لوگ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چین سے رہنے نہیں دیتے تھے۔ آپؐ کو بہت ستاتے تھے۔ ان لوگوں میں ابولہب کی بیوی اُم جمیل جو ابوسفیان کی بہن تھی، آپ کو ستانے میں پیش پیش ہوتی تھی۔ یہ عورت راتوں کو آپ کے گھر کے دروازے پر خاردار جھاڑیاں ڈال دیتی تھی تاکہ صبح سویرے آپ باہر نکلیں تو کوئی کانٹا آپ کے پاؤں میں چُبھ جائے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحبزادیاں ابولہب کے دو بیٹوں عُتْبَہ اور عُتَیْبَہ سے بیاہی ہوئی تھیں۔ جب آپؐ نے اسلام کی دعوت دینی شروع کردی تو ابولہب نے دونوں بیٹوں کو حکم دیا کہ محمدؐ کی بیٹیوں کو طلاق دو۔ چنانچہ دونوں نے طلاق دے دی۔ عُتَیْبَہ جہالت میں اس قدر آگے بڑھ گیا کہ ایک روز اس ملعون نے حضورؐ کی طرف تھوکا جو آپ پر نہیں پڑا اس وقت حضورؐ نے فرمایا اے اللہ اس پر اپنے کتوں میں سے ایک کتے کو مسلط کردے۔ اس کے بعد عُتَیْبَہ اپنے باپ کے ساتھ شام کے سفر پر روانہ ہوگیا دوران سفر انہیں رات کو ایک ایسی جگہ پر ٹھہرنا پڑا جہاں رات کو درندے آتے تھے۔
ابولہب نے بیٹے کی حفاظت کا زبردست انتظام کیا کیونکہ اسے محمدؐ کی بد دعا کا خوف تھا لیکن اس زبردست انتظام کے باوجود رات کو شیر آیا اور اونٹوں کے حلقے سے گزر کر اس نے عُتَیْبَہ کو پھاڑ کھایا اور اس طرح وہ حضورؐ کی بددعا سے درندے کا شکار ہوا۔

جب رسول اللہ کے دوسرے صاحبزادے حضرت عبداللہ کا بھی انتقال ہوگیا تو ابولہب اپنے بھتیجے محمدؐ کے غم میں شریک ہونے کے بجائے خوشی میں جھومتے ہوئے دوڑ کر قریش کے سرداروں کے پاس پہنچا اور اُن کو خبر دی کہ آج محمدؐ کا دوسرا بیٹا انتقال کرگیا اس لیے وہ بے نام و نشان ہوگیا۔

ربیعہ بن عبادبیان کرتے ہیں کہ نوعمری میں ایک دن میں اپنے باپ کے ساتھ بازارِ ذوالمجاز میں تھا میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مختلف قبائل کے پاس جاتے اور فرماتے اے فلاں قبیلہ کے لوگو! میں اللہ کا رسول ہوں۔ میں تم کو حکم دیتا ہوں کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ میری تصدیق کرو اور میری مدد کرو تاکہ خدا نے مجھے جس دین کے ساتھ بھیجا ہے میں اسے جاری اور نافذ کرسکوں۔ آپ کی بات جب ختم ہوتی تو پیچھے سے ایک شعلہ رو، بڑے بڑے بالوں والا جسیم شخص آتا اور قبیلہ کے لوگوں سے کہتا کہ یہ شخص چاہتا ہے کہ تم لات اور عزیٰ سے رشتہ توڑلو اور اس کے نئے دین کو اختیار کرلو، خبردار! اس کی بات نہ سننا اور اس کی پیروی نہ کرنا۔ میں نے اپنے باپ سے پوچھا یہ کون ہے تو انہوں نے کہا یہ ان کا چچا ابولہب ہے جو لات اور عزیٰ کی حمایت میں اپنے بھتیجے کی مخالفت کرتا ہے۔ لات اور عزیٰ بت تھے جن کی پرستش عرب کے لوگ کرتے تھے۔

نبوت کے ساتویں سال میں جب قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے خاندان کا سماجی مقاطعہ (social boycott) کیا تو اس وقت بنوہاشم اور بنو مطّلب نے نبی کریم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا ساتھ دیا اور ان کی حمایت میں ثابت قدم رہتے ہوئے شِعَبِ ابی طالب میں محصور ہوگئے۔ ابو لہب اس خاندان کا واحد شخص تھا جس نے اپنے خاندان کے بجائے کافروں کا ساتھ دیا۔ یہ مقاطعہ (boycott) تین سال تک جاری رہا۔ اس دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کو فاقہ کشی کرنی پڑی لیکن ابولہب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اس طرح مہم چلارہا تھا کہ محصورین میں سے جب کوئی خوراک کا سامان خریدنے کے لیے بازار میں آتا تو یہ مردود شخص تاجروں سے کہتا کہ اس سے اتنی قیمت مانگو جو یہ ادا نہ کرسکے۔ اس طرح تم لوگوں کو جو خسارہ ہوگا اسے میں پورا کروں گا۔ خریدار بیچارہ سامان خریدنے کی قوت نہ رکھتے ہوئے خالی ہاتھ واپس چلا جاتا تھا۔ پھر ابولہب تاجروں سے وہ چیزیں مہنگے داموں خریدتا تھا۔

ایسی ہی ناشائستہ حرکتوں کی بنا پر اس سورہ میں ابولہب کا نام لے کر اس کی مذمت کی گئی۔ نام لے کر اس کی مذمت کی ضرورت اس لیے بھی پیش آئی کہ مکہ سے باہر جو لوگ حج کے لیے آتے تھے۔ اُن کے سامنے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا اپنے بھتیجے محمدؐ کی مخالفت کرتا تھا تو لوگ سمجھتے تھے کہ کوئی چچا بلاوجہ دوسروں کے سامنے اپنے بھتیجے کو برا بھلا کیسے کہے۔ اس طرح وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں شک میں پڑجاتے۔ جب یہ سورت نازل ہوئی اور ابولہب کا نام لے کر علی اعلان اس کی مذمت کی گئی اور اسے رسوا کردیا گیا تو غصے میں آکر اس نے جب اول فَول بکنا شروع کردیا تو اُس کی پول کھل گئی۔ لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ ابو لہب ذاتی دشمنی اور حسد کی وجہ سے اپنے بھتیجے کو ستاتا ہے۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں ابولہب کا قول بے اعتبار بن گیا اور لوگ سمجھ گئے کہ یہ شخص اپنے بھتیجے کی دشمنی میں دیوانہ ہوگیا ہے اس کے علاوہ نام لے کر جب قران میں ابولہب کی مذمت کی گئی تو لوگ سمجھ گئے کہ جس دین کے معاملے میں نبیؐ کے چچا کا لحاظ نہیں کیا گیا تو اس دین میں کسی دشمن کے لیے کوئی رعایت اور مداہنت کیسے ہوسکتی ہے۔ یہ ایسا دین ہے جس میں غیر اپنا ہوسکتا ہے اگر وہ ایمان لے آئے اور اپنا غیر ہوجاتا ہے اگر وہ کفر کرے۔ یہ محمدؐ کا خود ساختہ دین نہیں بلکہ یہ اللہ کا نازل کردہ دین ہے ۔ یہ مساوات کا دین ہے۔ یہ دین ایک علیم و حکیم ذات کی طرف سے ایک عظیم اور مخلص بندے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے لوگوں تک پہنچایا جارہا ہے جو اس دین کی پیروی کرے وہ بلا لحاظ رنگ و نسل فلاح پائے گا اور جو اس کا انکار کرے گا وہ مکمل طور پر برباد ہوجائے گا۔

تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ(١)

ٹوٹ گئے ابولہب کے ہاتھ اور نامراد ہوگیا وہ

مَا أَغْنَى عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ(٢)

اُس کا مال اور جو کچھ اُس نے کمایا وہ اُس کے کسی کام نہ آیا

سَيَصْلَىٰ نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ(۳)

ضرور وہ شُعلہ زن آگ میں ڈالا جائے گا

وَامْرَأَتُهُ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ(۴)

اور اُس کی لکڑی اٹھانے والی بیوی بھی (آگ میں جائے گی)

فِي جِيدِهَا حَبْلٌ مِّن مَّسَدٍ(۵)

اس کی گردن میں مونجھ کی رسی ہوگی

ٹوٹ گئے ابو لہب کے ہاتھ اور نامراد ہوگیا وہ

ابو لہب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا تھا۔ اس کا اصلی نام عبدالعزیٰ بن عبدالمُطّلِب تھا۔ اسے ابو لہب اس لیے کہا جاتا تھا کہ اس کا رنگ چمکتا ہوا سرخ و سفید تھا۔ ابو لہب کا لفظی معنی شعلہ رُو ہے۔ یعنی دمکتے چہرے والا۔ قرآن میں اس کا ذکر اس کے اصلی نام کے بجائے اس کی کنیت سے کیا گیا اس کی کئی وجوہات بتائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اپنے اصلی نام کے بجائے اپنی کنیت سے ہی معروف تھا۔ دوسری یہ کہ اس کا جو انجام بیان کیا گیا وہ اس کی کنیت سے ہی زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ ابو لہب کی سزا کا ذکر قرآن میں اس طرح کیا گیا کہ اُسے شعلہ زن آگ میں ڈال دیا جائے گا چونکہ اس کی کنیت ابو لہب یعنی شعلہ رُو ہے اس لیے اسی کنیت کی مناسبت سے اسے شعلہ زن- شعلوں والی آگ میں ڈالا جائے گا جہاں وہ ہمیشہ جلتا رہے گا۔ اس لیے اس کا نام اس کی کنیت سے لیا گیا ہے۔

تیسری یہ کہ اس کا اصلی نام عبدالعزیٰ تھا یعنی ''عزیٰ کا بندہ'' عزیٰ ایک بت کا نام تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے بت کے بندے جیسے مشرکانہ نام سے اس کا تذکرہ کرنا پسند نہیں فرمایا، کیونکہ اللہ کے نزدیک شرک سب سے بڑا ظلم ہے کنیت سے پکارنے کی یہ ایک معقول اور موزون وجہ معلوم ہوتی ہے۔ (واللہ اعلم)

تَبَت یَدَی اَبِیۡ لَھَبٍ کا ترجمہ بعض مفسرین نے مستقبل کے حوالے سے کیا ہے یعنی ابو لہب کے ہاتھ ٹوٹ جائیں گے لیکن جمہور نے اسے ماضی کے صیغے میں لیا ہے یعنی ابو لہب کے ہاتھ ٹوٹ گئے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کو علیم الخبیر ہونے کی حیثیت سے معلوم تھا کہ ابو لہب زندگی بھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرتا رہے گا اور ایمان نہیں لائے گا۔ اس کی شدید مخالفت کی وجہ سے اسے آگ کے شعلوں کی نذر ہوئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے مقدر کا فیصلہ صادر فرمادیا کہ ابو لہب چونکہ اس کے رسول کا دشمن ہے اور اپنی دشمنانہ کاروائیوں سے وہ باز نہیں آئے گا، لہٰذا اس کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ تباہ وبرباد ہوگیا۔ اگر آیت کا ترجمہ مستقبل کے صیغے میں کیا جائے کہ ابو لہب کے ہاتھ ٹوٹ جائیں گے اور اس کا مال اس کے کسی کام نہ آئے گا۔ تو قرآن کی یہ پیش گوئی اس کی زندگی کے آخری لمحات تک توبہ کرنے یا نہ کرنے سے مشروط ہوجاتی تو اس صورت میں اس کو جہنم رسید کیا جائے گا ورنہ اللہ تعالیٰ کی سنت کے تحت زندگی کے آخری دم تک بندہ کے لیے توبہ کے دروازے کھلے رہتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے علیم الخبیر ہونے کی بنیاد پر ہاتھ ٹوٹ جائیں گے ابو لہب کے اور وہ تباہ و برباد ہوجائے گا کے بجائے فرمادیا کہ ہاتھ ٹوٹ گئے ابو لہب کے اور وہ تباہ وبرباد ہوگیا۔ مشرکین مکہ نے اس کی تباہی کا حال بچشم خود دیکھ لیا جب آخر کار وہی ہوا جس کی پیش گوئی اللہ تعالیٰ نے فرمادی تھی۔ کہ وہ ہلاک اور برباد ہوگیا اور اس کی اولاد اور اس کا مال اس کے کسی کام نہ آیا۔ ہاتھ ٹوٹنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جسمانی طور ابو لہب کے ہاتھ ٹوٹ گئے بلکہ معنوی لحاظ سے ابو لہب کے ہاتھ ٹوٹ گئے۔ یعنی اس کا سارا کاروبار ختم ہوگیا اوراسی کے ساتھ عرب میں اس کا سارا زور بھی ختم ہوگیا۔

نہ تو اس کا مال اس کے کام آیا اور نہ اس کی کمائی

ابو لہب ایک بہت بڑا مالدار آدمی تھا وہ بڑا بخیل اور زر پرست آدمی تھا۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے کعبہ کے خزانے سے دو سونے کے ہرن چرا لیے تھے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مکہ کے لوگ اسے بُری نظر سے دیکھتے تھے۔ البتہ مالدار ہونے کی حیثیت سے وہ مکہ کے بڑے بڑے مالداروں میں شمار ہوتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مکہ کے ان چار آدمیوں میں سے ایک تھا جن کے پاس کافی دولت تھی۔ اس کے مال دار ہونے کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ جنگ بدر کے موقع پر جس میں کافروں اور مسلمانوں کے درمیان حق و باطل کا فیصلہ ہونے والا تھا، جس میں قریش کے بڑے بڑے سرداروں نے حصہ لیا تھا۔ اس موقع پر ابو لہب نے عاص بن ہشام کو چار ہزار درہم کے عوض اپنی طرف سے لڑنے کے لیے بھیج دیا تھا۔ اسلام دشمنی کی وجہ سے اس کا یہ مال اس کے کچھ کام نہ آیا۔ بعض مفسرین نے مَاکَسَبَ کو اس کی کمائی مراد لی ہے اور بعض نے اس سے مراد اس کی اولاد لی ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ آدمی کا بیٹا بھی اس کا کَسَب ہے بہرحال دونوں معنوں کے لحاظ سے ابو لہب برباد ہوگیا نہ اس کا مال اس کے کام آیا اور نہ اس کی اولاد اس سورت کے نازل ہونے کے صرف آٹھ سال بعد جب جنگ بدر میں قریش کے اکثر بڑے بڑے سردار مارے گئے جو اسلام دشمنی میں ابو لہب کے ساتھی تھے۔ تو یہ خبر سن کر ابو لہب کو اتنا رنج ہوا کہ اس خبر کے بعد وہ آٹھ دن سے زیادہ زندہ نہ رہ سکا۔ اس کی موت بھی عبرت ناک تھی۔ وہ عَدَسَہ (Malignant tumour pustule disease) کی مہلک بیماری میں مبتلا ہوگیا۔

Malignant Tumour is a disease which tends to spread to other parts of body and ultimately leads to death.

مہلک ٹیومر وہ بیماری ہے جو جسم کے دوسرے حصوں میں پھیل جاتی ہے جو آخر میں موت کا باعث بن جاتی ہے۔

Pustule (آبلہ) is a blister, small raised area on the skin containing pus.

آبلہ ایک پھوڑا ہوتا ہے جو جلد میں ابھر آتا ہے جس میں پیپ ہوتا ہے اس بیماری کی وجہ سے اس کا جسم سڑنے لگا جس سے بدبو آرہی تھی۔ اُس کے گھر والوں نے اسے علاحدہ رکھا کیونکہ یہ چھوت کی بیماری (contagious disease) تھی۔ یوں اس کی رہائش ایک موری(drain) یا ایک kennel کتے کے گھر میں تبدیل ہوگیا جس میں اس کے گھر والے دور سے کھانا پھینک دیتے تھے۔ آخر وہ اسی بے کسی اور بے عزتی کی حالت میں بے یارومددگار مرگیا۔ مرنے کے بعد اس کے بیٹوں نے ایک روایت کے مطابق حبشی غلاموں کو پیسے دے کر اس کی لاش کو لکڑی کے ڈنڈوں سے نکلوا کر ہاتھ لگائے بغیر زمین بوس کردیا۔ اس طرح مال اور اولاد کے نشے میں چُور شعلہ رو متکبر کو نہ اس کا مال کام آیا اور نہ اس کی اولاد۔

اس کی موت کے بعد اس کی اولاد نے اسی دین اسلام کو قبول کیا جس دین کی اُس نے شدید مخالفت کرلی تھی۔ اس کی بیٹی دُرہ مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ پہنچی اور اسلام قبول کیا۔ فتح مکہ کے موقع پر اُس کے دونوں بیٹے عُتبہ اور مُعَتَّب حضرت عباسؓ کی وساطت سے حضور کے سامنے پیش ہوئے اور اسلام قبول کیا۔

میلگننٹ (malignant) کا لفظی معنی مہلک (fatal) ہے اور Malignant disease کسی مہلک بیماری کو کہتے ہیں۔ لیکن Malignant کا مجازی معنی (Figurative meaning) کینہ پرور اور نقصان پہنچانے کی خواہش (desire to cause harm) ہے اور Malignant person کسی کینہ پرور اور نقصان پہنچانے کی شدید خواہش رکھنے والے آدمی کو کہتے ہیں۔ ایسا آدمی ایک مہلک روحانی بیماری میں بتلا ہوتا ہے چونکہ ابولہب اسی بیماری میں بتلا تھا۔ وہ ہمیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف اور نقصان پہنچانے کی خواہش میں بتلا تھا۔ ہمیشہ اس انتظار میں ہوتا تھا کہ کب اور کس طرح آپؐ کو نقصان پہنچے اور ہمیشہ آپؐ کے قتل کی سازشوں میں بھی شامل رہتا تھا۔ آپؐ کے نقصان پر خوشیاں مناتا تھا۔ اس کی کینہ پروری اور نقصان پہنچانے کی خواہش کا اظہار اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ جب محمدؐ کے دوسرے بیٹے عبداللہ کا انتقال ہوا، اُس نے دوڑ لگا کر آپؐ کے دشمنوں تک یہ خبر پہنچادی کہ محمدؐ کا دوسرا لڑکا بھی فوت ہوگیا اب اس کا کوئی وارث نہ رہا اللہ تعالیٰ نے اس کی اس روحانی بیماری کے

بدے میں اُسے ایسی ہی جسمانی مہلک بیماری (malignant disease) میں مبتلا کر دیا۔

وہ شعلہ زن آگ میں ڈالا جائے گا

ابو لہب کو دنیا میں اسلام دشمنی کی یہ سزا ہوئی کہ اس کی اولاد اور اس کا مال اس کے کچھ کام نہ آیا۔ لیکن دنیا کی یہ سزا اس کے لیے کافی نہیں ہے آخرت میں اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے شعلوں والی آگ تیار رکھی ہے اس شعلہ رُو آدمی کو شعلوں والی آگ میں ڈال دیا جائے گا جہاں وہ ہمیشہ کے لیے جلتا رہے گا اور اس کی آگ میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ جہنم کی آگ کی یہ سزا صرف ایک ابو لہب کے لیے نہیں ہے بلکہ جو لوگ ابو لہب کی طرح اسلام دشمن رہے یا دشمنی کر رہے ہیں یا دشمنی کرتے رہیں گے وہ ابو لہب کی طرح شعلہ زن آگ میں جلتے رہیں گے ماسوائے ان لوگوں کے جنہوں نے توبہ کی جس طرح ابو لہب کے دو بیٹے توبہ کر کے اسلام میں شامل ہو گئے۔

اور اس کی لکڑی اٹھانے والی بیوی بھی (اس کے ساتھ آگ میں ڈال دی جائے گی)

ابو لہب کی بیوی کا نام اَرْدمیٰ تھا اور ام جمیل اس کی کنیت تھی۔ یہ ابو سفیان کی بہن تھی یہ عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف دینے اور مخالفت کرنے میں اپنے خاوند ابو لہب سے کسی طرح کم نہ تھی۔ مالدار ہونے کے باوجود یہ عورت سخت بخیل تھی کہ خود جنگل سے لکڑیاں چن کر لاتی تھی وہ کانٹے دار جھاڑیاں لا کر حضورؐ کی راہ میں ڈال دیتی تھی تاکہ آپؐ کو تکلیف پہنچے۔

ابن اسحاق کا بیان ہے کہ جب ابو لہب کی بیوی نے سورہ لہب کی ان آیات کو سنا جو اس کے شوہر اور خود اس کے سلسلے میں قرآن مجید میں نازل ہوئی تھیں تو وہ غصے میں بپھری ہوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی۔ آپؐ خانہ کعبہ کے پاس تشریف فرما تھے اور آپ کے پاس ابوبکر صدیقؓ بھی بیٹھے ہوئے تھے اُس کی مٹھی پتھروں سے بھری ہوئی تھی جب وہ آپؐ کے پاس پہنچی تو اللہ کی قدرت سے اس کی آنکھوں کی حالت ایسی ہو گئی کہ وہ صرف ابوبکر صدیقؓ کو دیکھ رہی تھی اور حضوؐر کو نہیں دیکھ پائی۔ اس نے کہا ابوبکر! تمہارا ساتھی کہاں ہے؟ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس نے میری ہجو کی ہے خدا کی قسم اگر میں نے اسے پا لیا تو پتھر اس کے منہ پر دے ماروں گی میں شاعرہ ہوں پھر اس نے یہ شعر پڑھا

مُذَمَّماً عَصَيْنَا

وَاَمْرَهُ اَبَيْنَا

وہ (محمدؐ) مذمت کیا ہوا ہے جس نے ہماری نافرمانی کی

(تعریف کیا ہوا نہیں ہے)

ہم نے اس کا حکم ماننے سے انکار کیا

(ہم نے اس کا کہنا نہیں مانا)

پھر جب وہ واپس چلی گئی تو حضرت ابوبکر نے پوچھا۔ اے اللہ کے رسولؐ کیا اس نے آپ کو دیکھا۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا اللہ کے حکم سے اس کی آنکھیں مجھے دیکھ نہ سکیں۔

دوسری روایت میں یہ ہے کہ جب ابولہب کی بیوی حضوؐر کو تلاش کرنے کے لیے نکلی تو اس وقت آپؐ حضرت ابوبکرؓ کے پاس تشریف فرما تھے۔ ابولہب کی بیوی کو دیکھ کر انہوں نے حضورؐ سے کہا آپ ہٹ جائیں تاکہ یہ عورت آپ کو تکلیف نہ پہنچا سکے گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے اس سے بچا لیا جائے گا۔ ابولہب کی بیوی حضرت ابوبکر کے پاس کھڑی ہو گئی اور کہا ابوبکر تمہارے دوست نے میرے اور میرے خاوند کی ہجو کی۔ حضرت ابوبکر نے کہا اس گھر۔ خانہ کعبہ کی قسم وہ نہ شعر کہتے ہیں نہ پڑھتے ہیں ابولہب کی بیوی نے کہا سچ کہتے ہو اور وہ واپس چلی گئی حضرت ابوبکر نے حضورؐ سے پوچھا کیا اس عورت نے آپ کو نہیں دیکھا۔ آپ نے فرمایا نہیں، ایک فرشتے نے مجھے اس کی نظروں سے چھپائے رکھا یہاں تک کہ وہ چلی گئی۔ اس سورہ کے متعلق ابولہب کی بیوی خیال رکھتی تھی کہ یہ ہجو کے اشعار ہیں جو محمدؐ نے میرے اور میرے شوہر کے متعلق کہے ہیں۔ اس لیے اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں یہ شعر کہا اور حضرت ابوبکر نے جب یہ جواب دیا کہ محمدؐ شعر نہیں کہتے تو وہ اپنے قول میں سچے تھے کیونکہ آپ یقینا شاعر نہیں تھے اور نہ قران شاعرانہ کلام ہے بلکہ یہ اللہ کا کلام ہے جو اس کی طرف سے محمدؐ پر نازل ہوا ہے۔

ابولہب کی بیوی کے اظہار ناراضگی اور احتجاج سے سورہ میں نہ کوئی تبدیلی آئی اور نہ اس کی کوئی آیت منسوخ کردی گئی بلکہ یہ سورت تا قیامت اللہ کی کتاب قرآن حکیم میں محفوظ ہو گئی اور نشان عبرت بن کر رہ گئی۔

اس عورت کو اللہ تعالیٰ نے لکڑیاں اٹھانے والی کے نام سے پکارا ہے۔ اس کے متعلق مفسرین کی مختلف آرأ ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ یہ عورت رات کو خاردار ٹہنیاں لاکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان کے صحن کے اندر داخل ہونے والے راستے پر ڈال دیتی تھی تاکہ آپؐ کے پاؤں میں کانٹے چُبھ جائیں اور انہیں تکلیف پہنچ جائے۔ اس وجہ سے اسے لکڑیاں اٹھانے والی کہا گیا ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ بد خصلت عورت چغلیاں کھا کر لوگوں میں فساد ڈلواتی تھی۔ اس لیے عربی محاورے کے مطابق اسے لکڑیاں اٹھانے والی کہا گیا ہے۔ کیونکہ عرب میں چغلیاں کھانے والے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کہہ کر لوگوں میں فساد ڈلوانے والے کو لکڑیاں اٹھانے والا کہتے ہیں۔ اس محاورے کے لحاظ سے قرآن نے اسے چغلیاں کھانے والی اور لوگوں میں فساد کی آگ بھڑکانے والی عورت کے نام سے پکارا ہے۔ عربی محاورہ ہے کہ فَلَانٌ یَحْطِبُ عَلَی ظَھْرِہٖ فلاں شخص اپنی پیٹھ پر لکڑیاں لا رہا ہے پس حَمَالَۃَ الْحَطَبِ کا مطلب گناہوں کا بوجھ اٹھانے والی عورت ہے۔ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ یہ عورت جس طرح دنیا میں دین حق کی دشمنی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی میں اپنے شوہر کی مددگار تھی۔ اسی طرح وہ دوزخ میں بھی اس کی شریک اور مددگار ہوگی۔ وہ جس طرح جنگل سے خاردار لکڑیاں لاکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے پر ڈال دیتی تھی اور اپنے حسد کی پیاس بجھا دیتی تھی اسی طرح آخرت میں بھی وہ لکڑیاں اٹھا کر ابو لہب کے آگ میں ایندھن کے طور پر ڈال دے گی جو ابو لہب کے آگ میں جلتی پر تیل چھڑکنے کا کام کرے اور اس طرح اپنے شوہر کے جلانے والی آگ کو بھڑکا کر اس کی پوری مدد کرے گی اور آخر میں اسے بھی اسی آگ میں ڈال دیا جائے گا جہاں وہ اپنے شوہر کے ساتھ ہمیشہ جلتی رہے گی اور اس طرح اپنے شوہر کی معاون اور مددگار ساتھی بن کر رہے گی۔ (واللہ اعلم)

اس کی گردن میں مونجھ کی رسی ہوگی

اس عورت کے متعلق روایات میں آیا ہے کہ یہ گلے میں ایک قیمتی ہار پہنتی تھی اور اس پر فخر کر کے اس کی نمائش کرتی تھی اور دولتمندی کے نشے میں آکر کہتی تھی کہ لات اور عزیٰ کی قسم میں اپنا یہ قیمتی ہار بیچ کر اس کی قیمت محمدؐ کی مخالفت اور عداوت میں خرچ کروں گی اس لیے فرمایا گیا ہے کہ اس کے گلے میں اس ہار کے بدلے جہنم میں آگ کی رسی پڑے گی۔ یہ طنز کے الفاظ ہیں جس طرح قرآن میں کئی جگہوں پر فرمایا گیا ہے۔ بَشِّرۡهُم بِعَذَابٍ اَلِيمٍ (ان کو دردناک عذاب کی خوش خبری دو) جبکہ دردناک عذاب کسی کے لیے خوشخبری نہیں بلکہ بری خبری ہے۔ اسی طرح جس ہار پر یہ خبیث عورت ناز کرتی ہے اور محمدؐ کی مخالفت کے لیے اس کی قیمت خرچ کرنے کی بات کرتی ہے۔ اس کے بدلے میں قیامت کے روز اس کی گردن میں رسی ڈال دی جائے گی۔ رسی آدمی کے گلے میں اس وقت ڈال دی جاتی ہے جب اسے مجرم کی حیثیت سے پیشِ حاکم کیا جاتا ہے یا جب اسے پھانسی دی جاتی ہے۔ ابو لہب کی بیوی کی گردن میں جب رسی ڈال دی جائے گی تو یہ اس کی سزا کی نشانی ہوگی یعنی اس کی گردن میں یہ رسی جہنم میں جانے کا ٹوکن (token) ہوگا۔

اس رسی کے متعلق مفسرین کے کئی اقوال ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ کھجور کی چھال سے بنی ہوئی ہوگی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ رسی لوہے کی تاروں سے بنی ہوئی ہوگی جہنم کی آگ میں خوب گرم ہوگی۔ اس رسی کو اس کی گردن میں ڈال کر اسے عذاب دیا جائے گا۔ ایک اور قول کے مطابق یہ خالص آگ کی رسی ہوگی جو اس سونے کے ہار کے بدلے میں اس عورت کے گلے میں ڈال دی جائے گی جس کو پہن کر دنیا میں تکبر میں چلتی پھرتی تھی اور جس کو وہ محمدؐ کی ایذا رسانی کے لیے بیچنے کی دھمکی دیتی تھی۔

سورۃ الاِخلاص

آیا تُھا:۴ رکوعھا:۱

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

قُلۡ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ o اللّٰهُ الصَّمَدُ o لَمۡ یَلِدۡ وَلَمۡ یُوۡلَدۡ o وَلَمۡ یَکُنۡ لَّهٗ کُفُوًا اَحَدٌ o

تعارف و پس منظر:

اس سورہ کانام سورہ اخلاص ہے کیونکہ اس میں خالص توحید ہے۔ اس میں خدا کی وحدانیت، اَحَدِیَت اور یکتائی بیان ہوئی ہے اور اس میں شرک سے خلاصی پانے کی ہدایت ہے۔ جو شخص اس سورہ کو غور سے پڑھے گا وہ ہر قسم کے شرک سے چھٹکارا پائے گا اور اسے سب سے بڑے ظلم سے نجات ملے گی۔ کیونکہ قران نے شرک کو سب سے بڑا ظلم قرار دیا ہے۔

اِنَّ الشِّرۡکَ لَظُلۡمٌ عَظِیۡمٌ (سورہ لقمان:۱۳)

یقینا شرک ظلم عظیم ہے۔

اس سورۃ کے شان نزول کے بارے میں مختلف روایات ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ قریش کے لوگوں نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ ہمیں اپنے رب کا نسب بتائیے تو ہم ایمان لائیں گے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورۃ نازل فرمائی چونکہ اہل عرب کا دستور تھا کہ جب وہ کسی اجنبی شخص سے تعارف حاصل کرنا چاہتے تھے تو کہتے تھے اِنْسَبْہُ لَنَا ''اس کا نسب ہمیں بتاؤ'' اس لیے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی جس میں صرف ایک خدا کی عبادت اور بندگی کرنے کی تعلیم تھی تو لوگوں نے آپؐ سے یہ پوچھنا شروع کردیا کہ آپ کا رب کون ہے اور کیسا ہے جس کی ہم عبادت کریں گے کیونکہ وہ بتوں کی پوجا کرتے تھے اور ایک خدا کے بجائے بہت سے خداؤں کو مانتے تھے۔ انہیں صرف ایک خدا کا تصور تھا ہی نہیں اس لیے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا اِنْسَبْہُ لَنَا رَبَّکَ ''ہمیں اپنے رب کا نسب بتائیے''

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ یہودیوں کا ایک گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا جن میں کعب بن اشرب بھی تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہمیں بتائیے آپ کا وہ رب کیسا ہے جس نے آپ کو بھیجا ہے اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورۃ نازل فرمائی۔

ایک اور روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ کا رب کس چیز سے بنا ہے، سونے سے بنا ہے، تانبے سے بنا ہے، پیتل سے بنا ہے، لوہے سے بنا ہے یا چاندی سے بنا ہے ، اس کی جنس کیا ہے اور وہ کیا کھاتا ہے اور کیا پیتا ہے، اس نے کس سے وراثت پائی اور اس کا وارث کون ہے اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورۃ نازل فرمائی۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ مختلف موقعوں پر مختلف لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس معبود کی ماہیت اور کیفیت دریافت کی جس کی بندگی اور عبادت کی طرف آپؐ انہیں دعوت دیتے تھے اور ہر موقعہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی سورۃ سنائی تھی سب سے پہلے مکہ میں مشرکین نے آپ سے یہ سوال کیا تو اس وقت یہ سورۃ نازل ہوئی اس کے بعد مدینہ طیبہ میں یہودیوں، عیسائیوں اور عرب کے دوسرے لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح کے سوالات کئے اور ہر مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں یہی سورۃ سنادی۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ لوگوں نے مختلف عقائد کے لحاظ سے خدا کے وجود کو جاننے کے لیے اپنی اپنی سطح کے مطابق آنحضور صی اللہ علیہ وسلم سے سوالات کئے اور آپ نے سارے عقیدوں کو سورہ اخلاص سنا کر ہر بار رد کردیا اور واضح کیا کہ خدا ایک ہی ہے وہ بے نیاز ہے نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ اس کی کوئی اولاد ہے۔ اس طرح لوگوں کے اس غلط عقیدے کو ہمیشہ کے لیے ختم کردیا گیا کہ اللہ کی کوئی شکل و صورت ہے یا وہ انسانوں کی طرح کھاتا پیتا ہے یا اس کی بیوی بچے ہیں یا اس نے اپنی مدد کے لیے کسی کو شریک بنایا ہے۔ وہ ان سب چیزوں سے پاک ہے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم توحید کی دعوت لے کر اٹھے اس وقت دنیا میں مذہب کے بارے میں عجیب قسم کے تصورات تھے۔ بت پرست ان مختلف بے جان چیزوں کو خدا مان کر پوجتے تھے جو لکڑی، پتھر، سونا، چاندی، لوہے، پیتل وغیرہ کے بنے ہوئے ہوتے تھے۔ ان لوگوں نے دیوی اور دیوتا کی صورت میں خدا کی جنس بھی بنا رکھی تھی۔ کوئی دیوی شوہر کے بغیر نہ ہوتی تھی اور کوئی دیوتا بیوی کے بغیر نہیں۔ بے جان ہونے کے باوجود ان کو کھانے پینے کی ضرورت ہوتی تھی اور ان کے سامنے مختلف قسم کے کھانے رکھے جاتے تھے۔ مشرکین کی ایک بہت بڑی تعداد اس بات کی قائل تھی کہ خدا زمین سے گناہ مٹانے اور لوگوں کی اصلاح کے لیے انسانی شکل میں ظاہر ہوتا ہے جو اوتار کہلاتا ہے۔ ہندوں میں آج بھی یہ عقیدہ موجود ہے۔ یہود اور عیسائی اگرچہ ایک خدا کو ماننے کا دعویٰ کرتے تھے تاہم ان دونوں کا عقیدہ تھا (جو آج بھی ان میں موجود ہے) کہ خدا کی اولاد ہے۔ جیسا کہ عیسائیوں کا عقیدہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کا بیٹا ہے اور باپ بیٹے کے ساتھ روح القدس بھی خدائی میں شریک ہے۔ یہود عُزَیر کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں۔ لوگوں کے ایسے بھی عقیدے تھے جن کے مطابق خدا کی ماں اور ساس ہوتی تھی۔ یہود کہتے تھے کہ خدا نے حضرت یعقوبؑ سے کشتی لڑی جس میں (نعوذ باللہ) خدا نے ہار مان لی۔ ان نام نہاد مذہبی گروہوں کے علاوہ مجوسی (آتش پرست) اور صابیٔ (ستارہ پرست) بھی تھے۔ ان حالات میں جب لوگوں کو دعوت دی گئی کہ وہ اللہ کو وحدہٗ لاشریک کی حیثیت سے مانیں تو ان کے ذہن میں اس طرح کے سوالات کا پیدا ہونا ایک لازمی امر تھا کہ وہ رب کس قسم کا ہے جس کی تمام معبودوں کو چھوڑ کر بندگی کرنے کی دعوت دی جارہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ اخلاص نازل کرکے ان تمام سوالات کا تسلی بخش جواب دے کر اپنی ذات و صفات اور اپنی ہستی کی حقیقت پیش کردی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سورۃ کی بڑی فضیلت بیان فرمائی ہے کیونکہ یہ سورۃ اسلام کے بنیادی عقیدہٴ توحید کو مختصر فقروں میں بیان کردیتی ہے۔ احادیث میں کثرت سے یہ روایت بیان ہوئی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف موقعوں پر لوگوں کو بتایا کہ یہ سورۃ ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔ مثلاً آپ سے پوچھا گیا کہ ایک سفر میں کسی نے ہر نماز میں سورہ اخلاص پر قرأت ختم کردی تو آپؐ نے فرمایا خَبِّرُوْہُ اِنَّ اللہ تَعَالیٰ یُحِبُہٗ ''اس کو خبر دو کہ اللہ تعالیٰ اُسے محبوب رکھتا ہے'' اسی طرح کئی بار لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ فلاں صحابی نے نماز پڑھائی اور آخری رکعت میں قل ھواللہ احد یعنی سورہ اخلاص پڑھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی سراہنا لی۔ ایک بار اسی طرح کی نماز پڑھانے والے صحابی سے فرمایا حُبُّکَ اِیَّاھَا اَدْخَلَکَ الْجَنَّۃَ ''اس سورۃ سے تمہاری محبت نے تمہیں جنت میں داخل کردیا''۔

اس چھوٹی سی سورت کی اس قدر فضیلت کے معاملے میں حیرت و تعجب کی کوئی بات نہیں ہے کیونکہ اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے ایسے عقیدے کا اعلان فرمادیا ہے جس میں مکمل نظام زندگی ہے جس میں اللہ کی وحدانیت اور یکتائی بیان کی گئی ہے کہ اس کے وجود کے سوا کسی شئے کا وجود اس کی مرضی کے بغیر باقی رہنے والا نہیں ہے۔ اس کی قدرت سے کائنات اور کائنات کی ہر چیز پیدا ہوئی ہے اور ہر چیز اس کے خالق ہونے اور اس کی وحدانیت کی گواہی دے رہی ہے جو کوئی خالق حقیقی خدائے وحدہٗ لاشریک سے تعلق رکھتا ہے وہ تمام خود ساختہ خداؤں اور معبودوں سے چھٹکارا پاتا ہے اور ہر طرح کی باطل زنجیروں کو توڑ کر انسانوں اور نقلی (fictitious) معبودوں کی غلامی سے آزاد ہوکر رب العالمین کی غلامی اور حفاظت میں آجاتا ہے وہ لوگوں کے خوف سے آزاد ہوکر اللہ کی پناہ میں آجاتا ہے صرف اسی کا خوف رکھتا ہے اور اسی سے ڈرتا ہے۔ جس نے اس عظیم ہستی رب العالمین وحدہٗ لاشریک کو پالیا اس نے سب کچھ پالیا۔

قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ(۱)

کہو وہ اللہ ہے ۔ یکتا

اللَّهُ الصَّمَدُ(۲)

اللہ بے نیاز ہے، سب اس کے محتاج ہیں

لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ(۳)

نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے

وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ(۴)

اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے

کہو وہ اللہ ہے ۔ یکتا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطِب ہوکر اللہ تعالیٰ نوعِ انسانی کو خطاب فرما رہے ہیں کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ لوگ جس رب کا تعارف حاصل کرنا چاہتے ہیں ان سے کہہ دو وہ رب کوئی اور نہیں ہے بلکہ اللہ ہے یہ وہی رب ہے جسے تم اللہ کے نام سے جانتے ہو۔ میں تمہیں سب معبودوں کو چھوڑ کر اسی ایک اللہ سے جوڑنا چاہتا ہوں۔

چونکہ اللہ عربوں کے لیے کوئی اجنبی لفظ نہ تھا قدیم زمانے سے وہ خالق کائینات کے لیے یہی لفظ استعمال کررہے تھے اور دوسرے معبودوں کے لیے جن کی وہ عبادت کرتے تھے اللہ (God)کا لفظ استعمال نہیں کرتے تھے۔ دوسرے معبودوں کے لیے یہ لوگ اِلٰہ (god) کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ اللہ کو یہ لوگ قوت اعلیٰ (supreme power) اور اعلیٰ قدرت رکھنے والی ذات (supreme being) مانتے تھے لیکن یہ لوگ چھوٹے چھوٹے خداؤں، دیویوں اور دیوتاؤں، جن کو یہ gods (اِلٰہ) کہتے تھے، کو بھی اس حیثیت سے مانتے تھے کہ ان کے پاس بھی انسانوں کو نفع و نقصان پہنچانے کی قوت اور طاقت ہے۔ اس لیے یہ بتوں کی شکل میں ان کی پوجا کرتے تھے ۔ ان سے اپنی حاجتیں طلب کرتے تھے۔ ان لوگوں نے عزیٰ، لات اور منات جیسے مختلف ناموں پر بت بنائے تھے جن کی وہ پوجا کرتے تھے اور ان سے اپنی حاجت روائی کے لیے دعائیں مانگتے تھے۔ عرب سے باہر کی دنیا خاص طور ہندوستان اور چین جیسے ایشائی ملکوں میں ہندومت (Hinduism)، بدھ مت (Buddhism) ، جین مت(Jainism) کے مذاہب پائے جاتے تھے۔ ان مذاہب کے ماننے والوں نے بھی اپنے عقائد کے مطابق سینکڑوں، بلکہ ہزاروں دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں اور بت بنا رکھے تھے، جنہیں یہ ''پرم ایشور (God of all gods) کے ساتھ ساتھ پوجتے تھے۔

جب ابرہہ نے مکہ پر چڑھائی کردی اس وقت خانہ کعبہ میں تین سو سٹھ بت موجود تھے مگر مشرکین نے کعبہ کی حفاظت کے لیے ان سب بتوں کو چھوڑ کر صرف ایک اللہ سے دعائیں مانگیں گویا وہ جانتے تھے کہ اس نازک وقت میں اللہ کے سوا کوئی ان کی مدد نہیں کرسکتا تھا۔کعبے کو بھی وہ ان الٰہوں (gods) کے نام سے ''بَیتُ اِلاٰلہہ'' یعنی اِلاہوں کے گھر سے نہیں بلکہ بیت اللہ یعنی اللہ (God) کے گھر سے پکارتے تھے۔ مشرکین عرب کے اللہ تعالیٰ سے متعلق عقیدہ کے بارے میں قرآن میں مختلف مقامات

پریوں روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۱) اگر تم ان سے پوچھو کہ انہیں کس نے پیدا کیا ہے تو وہ ضرور کہیں گے اللہ نے (زُخۡرُف:۸۲)

(۲) اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا اور سورج اور چاند کو انسان کے لیے کس نے مُسخّر کیا تو یہ ضرور کہیں گے اللہ نے(سورہ العنکبوت: ٦١)

(۳) ان سے کہو بتاؤ اگر تم جانتے ہو یہ زمین اور اس کی ساری آبادی کس کی ہے یہ ضرور کہیں گے اللہ لی۔ (مومنون:۸۴)

(۴) ان سے پوچھو کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے یہ کہیں گے اللہ۔ (یونس:۳۱)

(۵) جب تم کشتیوں پر سوار ہوکر باد موافق پر خوشی سے سفر کررہے ہوتے ہو اور پھر اچانک باد مخالف کا زور ہوتا ہے اور ہر طرف سے موجوں سے ٹکرانے لگتے ہیں اور مسافر سمجھ لیتے ہیں کہ طوفان میں گرگئے ہیں اس وقت سب اپنے دین کو اللہ ہی کے لیے خالص کرکے اسی سے دعائیں مانگتے ہیں کہ اگر تو نے ہمیں اس بلا سے نجات دے دی تو ہم شکرگزار بندے بنیں گے مگر جب وہ ان کو بچا لیتا ہے تو پھر وہی لوگ حق سے منحرف ہوکر زمین میں بغاوت کرنے لگتے ہیں۔ (یونس: ۲۲، ۲۳)

مذکورہ آیات پر غور کرنے سے یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ جب لوگوں نے پوچھا کہ تمہارا وہ رب کون ہے اور کیسا ہے جس کی بندگی اور عبادت کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو تو اس کے جواب میں فرمایا گیا ہے کہ ھُوَاللہُ ''وہ اللہ ہے'' یعنی جس معبود کو تم لوگ جاننا چاہتے ہو کہ وہ کون ہے اور کیسا ہے وہ وہی معبود حقیقی ہے جسے تم اللہ کے نام سے جانتے ہو اور جس کے نام سے تم کعبہ کو بیت اللہ کہتے ہو اور جسے تم خود اپنا اور ساری کائنات کا خالق، مالک، رازق اور مدبر و منتظم مانتے ہو اور جسے مشکلات میں تم سب معبودوں اور الٰہوں کو چھوڑ کر مدد کے لیے پکارتے ہو وہی ہم سب کا رب ہے اور اسی کی بندگی کی طرف میں تم لوگوں کو بلاتا ہوں۔

ھُوَاللہُ ''وہ اللہ ہے'' سے اللہ تعالیٰ کا تعارف ہوا کہ وہ اللہ کون ہے اور کیسا ہے اور مشرکین سے کہا گیا یہ وہی اللہ ہے جس کو تم جانتے ہو اور جس کے تم نے شریک ٹھہرائے ہیں۔ اَحَد سے واضح کردیا گیا

ہے کہ وہ اللہ جس کو تم جانتے ہو وہ احد ہے، یکتا ہے، ایک ہے اور بالکل اکیلا ہے۔ اس کی کوئی نظیر نہیں، اس کا کوئی وزیر نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں، اس کا کوئی مثیل نہیں اور اس واحد ذاتِ مقدس اللہ کے علاوہ کسی اور پر اَحَدٌ لفظ کا اطلاق نہیں ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنی تمام صفات اور افعال میں کامل ہے۔

اَحَد اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے چونکہ مشرکین نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے رب کے بارے میں سوالات کئے تھے اور ان سوالات کا جواب ہُوَاللہ اَحَدٌ سے دیا گیا ہے۔ پہلے فرمایا گیا کہ وہ اللہ ہے اس فقرہ میں اعلان کیا گیا کہ جس رب کے بارے میں تم لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرتے ہو کہ تمہارا رب کون ہے، کیسا ہے، سنو! وہ رب اللہ ہے اسی کے ساتھ فرمایا گیا ''اَحَدٌ'' مراد وہ صرف ایک رب ہے جو رب العالمین ہے، جس نے اس کائینات کو بنایا ہے اور اس کے اندر جو کچھ ہے وہ سب اسی کا پیدا کردہ ہے۔ لفظ اَحَد کے معنیٰ یہ ہیں:

۱) وہ اکیلا رب ہے، اس کی ربوبیت میں کسی کی حصہ داری نہیں ہے، وہی ایک مالک اور پروردگار ہے۔

۲) وہی تنہا کائنات کا خالق ہے اور کائنات کی تخلیق میں اس کا کوئی شریک اور معاون نہیں ہے، وہی اس نظام عالم کا مدبّر و منتظم ہے، وہی اپنی مخلوقات کو رزق دینے والا ہے اور وہی لوگوں کی فریاد سننے والا ہے، وہی زندگی اور موت دینے والا ہے، اس لیے خدائی کے ان کاموں میں کسی دوسرے کا قطعاً کوئی حصہ نہیں ہے۔ مشرکین کے سوالات کہ تمہارا خدا کس چیز سے بنا ہے، اس کا نسب کیا ہے، وہ کس جنس کا ہے، اس کا وارث کون ہے اور اس نے کس سے میراث پائی ہے؟ کا جواب اللہ تعالیٰ نے صرف ایک لفظ اَحَد بول کر دے دیا۔ یعنی خدا ایک ہی ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا نہ اس سے پہلے کوئی خدا تھا اور نہ اس کے بعد کوئی خدا ہوگا، اور خدا کی کوئی جنس نہیں ہے، خدا اکیلا ہے، کوئی اس کا ہم جنس نہیں ہے، اس کی ذات نہ صرف واحد ہے بلکہ اَحَد ہے، اس کی کوئی شکل و صورت نہیں اس کی کوئی سمت (direction) نہیں ہے، وہ بیک وقت ہر طرف اور ہر جگہ نظر رکھے ہوئے ہے، اس کی روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے، وہ ہر لحاظ سے اَحَد (unique) ہے۔ واضح رہے کہ اگرچہ وَاحِدٌ کا معنیٰ بھی ایک ہے، تاہم یہ کسی مجموعہ کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے جیسے ایک قوم یا ایک جماعت لیکن قوم یا جماعت خود افراد (individuals) پر مشتمل ہوتی ہے۔ لیکن اَحَد کوئی مجموعاتی (collective) اصطلاح نہیں ہے بلکہ اَحَد اللہ کا وہ صفاتی نام ہے جس کا معنی یہ ہے کہ وہ اللہ ایک ہی ہے وہ کسی مجموعہ کا ایک نہیں ہے، وہ کسی قوم کے باشندوں کی طرح ایک نہیں بلکہ وہ بذات خود ایک ہے اور ایک ہی ہے اس لیے اللہ کے لیے احد کا لفظ استعمال کیا گیا ہے کہ اس کا وجود ایک ہے اور اس کی ذات یکتا و تنہا ہے جو دوسروں کی شراکت سے پاک ہے اور جس کی وحدانیت ہر لحاظ سے کامل ہے۔

خیال رہے کہ خلافتِ راشدہ کے سقوط کے بعد، خاص کر عباسی ملوکیت کے دوران مسلمانوں میں علم الکلام کے دروازے سے غیر اسلامی فکر و فلسفہ سیلاب کی طرح در آیا۔ نتیجتاً اللہ کی وحدانیت کو مختلف مکتب فِکر کے لوگوں نے مختلف انداز میں مختلف ناموں اور نظریات کی روشنی میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی، سب سے پہلے جنید بغدادیؒ نے وحدت الشہود (Unity of vision) کا نظریہ پیش کیا یہ صوفیوں کی اصطلاح ہے۔ اس نظریہ کے مطابق انسان سلوک کے راستے سے ایسے درجے پر پہنچ جاتا ہے جہاں اسے ہر چیز میں خدا نظر آتا ہے۔ یعنی ہر کوئی چیز خدا کی گواہی دیتی ہے جنید بغدادی کے اس نظریہ کی بنیاد توحیدی اصول (doctrine of unificaion) پر تھی کہ خدا ایک ہے اور اس کا جلوہ ہر شئے میں ہے۔

پھر ابن عربی نے وحدت الشہود کے بجائے وحدت الوجود (Unity of all beings) کا نظریہ بڑھا چڑھا کر پیش کردیا۔ اس کا نظریہ توحید (Monotheism) کی وضاحت میں تھا لیکن اس کے نظریہ نے شرک (Pantheism) کی آبیاری کی جس میں کہا گیا ہے کہ خدا کا وجود کائینات کی ہر شئے میں ہے اس لیے ہر شئے کی عبادت کی جا سکتی ہے۔

Patheism is the doctrine of belief in existence of many gods and wrosip of many gods according to this belief God exists in everything.

شرک ''پین تھی ازم'' ایک ایسا اصول ہے جس کا عقیدہ ہے کہ کئی خداؤں کا وجود ہے اور کئی خداؤں کی عبادت کی جا سکتی ہے اس عقیدے کے مطابق خدا ہر چیز میں موجود ہے۔ ابن عربی نے اپنے نظریہ کی توجیہ اس طرح کی کہ اللہ کے بغیر کسی چیز کی عبادت نہیں کی جاتی ہے یعنی اس کا خیال یہ تھا کہ خدا ہر چیز میں موجود ہے لہذا جس چیز کی عبادت کی جائے وہ عبادت دراصل خدا کی ہی عبادت ہے اس لیے وہ خدا کا منکر نہیں تھا بلکہ اس کا خیال تھا کہ ہر چیز کی عبادت کرنے سے دراصل خدا کی ہی عبادت کی جاتی ہے لیکن اس قسم کی عبادت سے تمام قسم کی عبادات اور تمام قسم کے معبودوں کی عبادت کرنے کی اجازت مل جاتی ہے۔ اس فلسفے اور نظریے کا نام ابن عربی نے وحدت الوجود رکھا جو شرک

اور کفر سے کسی درجے کم نہیں۔

Montheism is the doctrine of belief that there is only one God and everything in the universe is the evidence of God.

توحید ''مانی تھی ازم'' ایک ایسا اصول ہے جس کا عقیدہ ہے کہ خدا ایک ہے اور اس کائینات کی ہر چیز خدا کی گواہی دیتی ہے۔

اس کے نظریے کی بنیاد اس عقیدے پر تھی کہ خدا کی ذات ہر شئے میں موجود ہے۔ The absolute unity of all things is God، جب کہ اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ ہر ایک چیز میں اللہ کی قدرت اور کاریگری ہے اور ہر ایک چیز خدا کی نگاہ میں اور اس کے اختیار میں ہے۔ اللہ کی ذات نہ صرف واحد ہے بلکہ وہ اَحَد ہے۔ اس لیے اس کی ذات، اس کی صفات اور اس کی عبادت میںکسی کو شریک نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس حیثیت سے وحدۃ الوجود کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا وجود واحد ہے اور اس کے وجود اور قدرت سے ہر شئے وجود میں آگئی ہے لیکن ابن عربی نے اس حقیقت کو غلط جامہ پہنا کر لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی کہ اللہ کا وجود ہر شئے میں ہے اور وہ کسی شئے سے الگ کوئی ہستی نہیں ہے اور اس طرح خدا کی پیدا کردہ ہر شئے کو اس نے اِلٰہ (god) قرار دیا اور ہر شئے میں اللہ(God) موجود ہونے کا دعویٰ کیا۔ اس نے خدا کے وجود کے متعلق یہاں تک کہہ دیا کہ ہمیں خدا کو کسی خاص عقیدے میں محدود نہیں کرنا چاہیے بلکہ اسے تمام عقیدوں کے ساتھ تسلیم کرنا چاہیے جو غیر شعوری طور شرک عظیم ہے۔ قرآن مجید کائینات اور اس کی اشیاء کا بار بار اس طرح تذکرہ کرتا ہے کہ واقعی طور وہ موجود ہیں البتہ وہ مخلوق ہیں۔ خدا نے ان کوپیدا کیا ہے اور جب خدا ہی ان چیزوں کا خالق ہے تو خالق کو مخلوق میں کس طرح ضم کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے اس کاپیش کردہ وحدت الوجود کا نظریہ نہ قرآن سے ثابت ہے اورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تلقین کی اورنہ صحابہ کرامؓ، ایمۂ حدیث و فقہ نے اس طرح کی کوئی بات کہی ہے۔ یہ فلسفہ یونان اور ہندوستان کی دین ہے۔ یہ ویدانت کا فلسلفہ ہے۔ حسین بن منصور حلاج نے اسے ویدوں کے فلسفے سے حاصل کرکے اَنَا الْحَقّ ''میں حق ہوںیعنی میں خدا ہوں'' سُبْحَانِیْ مَا اَعْظَمَ الشَّانِیْ ''پاک و برتر ہوں میں، کتنی عظیم ہے میری شان'' اور مَافِیْ جُبَّتِیْ غَیْرُ اللہ ''میرے جبہ میں اللہ کے سوا کوئی نہیں'' جیسی خرافات کی باتیں کہیں۔ دوسری طرف اولیااللہ کے متعلق اس عقیدے نے جنم لیا کہ وہ کائینات میں فاعل اور مُتَصَرِف ہیں یعنی کائینات میں ان کا عمل دخل ہے۔ انہوں نے اللہ کی رضا جوئی اور فلاح و آخرت کے بجائے فنا فی اللہ ہونا زندگی کا مقصد قرار دیا۔ آخرت کی اجر جنت کے حصول اور جہنم کے عذاب سے بچنے کے لیے خدا کی عبادت کو یہ لوگ ریاکاری سمجھنے لگے اور ترک دنیا و ترک آخرت کا سبق دیا۔ خلافت ارضی کی ذمہ داریوں اور عملی زندگی سے کنارہ کشی کا رجحان لوگوں میںپیدا کردیا گیا اور صوفی نظریہ (Sofism) کو عام کرنے کی کوشش لی گئی جس کے ذریعے لوگوں کو یہ تاثر دیا گیا کہ جب خدا کی پہچان ہو اور خدا کی معرفت دل میں داخل

ہوجائے تو پھر ہاتھ پاؤں ہلا کر اس کی بندگی اور عبادت کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے بلکہ خدا کی محبت جب دل میں پیدا ہوجاتی ہے تو اس سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں ہے اور پھر عملی طور نمازوں اور دیگر طریقوں سے خدا کی عبادت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ انہوں نے نماز، جہاد، دین کے لیے جدوجہد اور یتیموں اور غریبوں کی مدد کرنے کے بدلے ایک ہی نعرہ (slogan) پیش کیا کہ دست با کار دل با یار باید (ہاتھ کو اپنے کام میں مشغول رکھو اور دل میں خدا کی یاد کرو) بس وہی خدا کی بندگی ہے اور وہی دین کی خدمت ہے اور خدا پر توکل کرنے کی اس طرح کی تعلیم دی کہ انسان اپنے آپ کو اس طرح خدا کے سپرد کردے جس طرح ایک مردہ غَسال کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ جس طرح غَسال چاہتا مردے کو حرکت دیتا ہے۔ اس قسم کی مردگی کا رجحان مسلمانوں میں پیدا کرنے کی کوشش کی گئی یہاں تک کہ اکابر صوفیوں سے منقول ہے کہ تصوف کی راہ میں ایسا بلند مقام بھی آتا ہے جب آدمی کو شریعت کی ذمہ داریوں سے آزاد کردیا جاتا ہے۔ حالانکہ اسلام کی رو سے انبیاء تک شریعت کی ذمہ داریوں سے آزاد نہیں ہوتے ہیں اور آخرت کی کامیابی کے لیے شریعت الٰہی کی پیروی اور خلافت ارضی کی ذمہ داریوں کو نبھانا مومن کا مقصد حیات ہے۔ اس لیے اسلام عملی زندگی اور اسباب کی فراہمی پر انتہائی زور دیتا ہے۔ مومن اسباب کو بروئے کار لاکر کام کرتا ہے لیکن ہر کام کا انجام خدا کی مشیت پر ڈال دیتا ہے۔

اَنَا الْحَقّ کا نعرہ لگانے والے منصور حلاج کو پھانسی پر لٹکانے کے بعد محی الدین ابن عربی نے اس فلسفے کا صور اتنی قوت اور زور سے پھونکا کہ یہ فلسفلہ بہت سے مسلمانوں کے دل و دماغ پر چھاگیا۔ اس فلسفہ کے رو سے کائینات اور انسان عین خدا قرار پاتے ہیں۔ توحید شریعت اور عملی زندگی کی ذمہ داریاں سب بے معنی ہوجاتی ہیں اور اللہ کی رضا جوئی اس کے قانون کی پیروی اور خلافت ارضی و اقامت دین کے بجائے خدا کی ذات میں گم ہوکر فنا فی اللہ ہوجاتی ہیں۔ اس سلسلے میں ابن عربی اور دوسرے اکابر صوفیا سے ایسی ایسی باتیں منقول ہیں کہ توحید اور شریعت کا قائل دل کانپ اٹھتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ اسلام کی ہمدردی اور اس کی اشاعت کے نام پر اسلام کو کفر و شرک میں تبدیل کرنے والوں کے خاتمہ کے لیے ہر دور میں اسلام کے ہمدردوں اور بہی خواہوں کو پیدا کرتا ہے جو دین اسلام پر اچھالی ہوئی کیچڑ کو صاف کردیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے امام ابن تیمیہؒ اور مجدد الف الثانی کے ذریعے دین اسلام پر اچھالی ہوئی کیچڑ کو صاف کروادیا۔ جنہوں نے ابن عربی اور منصور حلاج دونوں کے نظریوں کو زندقہ اور دونوں اشخاص کو زندیق قرار دے دیا۔

اللہ بے نیاز ہے

مفسرین نے اس آیت کا مطلب اور معنیٰ صحابہ اور تابعین کی تفسیر کے مطابق سمجھانے کی کوشش کی ہے جس کی مختصر تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) صمد وہ ہے جس سے بالاتر کوئی نہ ہو۔ حضرت علیؓ

(۲) صمد اس سردار کو کہتے ہیں جس کی سیادت کامل ہو۔ (حضرت عبداللہ بن مسعودؓ)

(۳) صمد وہ ہے جس کی طرف لوگ کسی بلا یا مصیبت کے وقت رجوع کریں۔ (حضرت عبداللہ بن عباسؓ)

(۴) صمد وہ ہے جو سب سے بے نیاز ہو اور سب اس کے محتاج ہوں۔ (حضرت ابوہریرہؓ)

(۵) صمد وہ ہے جو نہ کچھ کھاتا ہو اور نہ پیتا ہو۔ (عِکرمہؒ)

(٦) صمد وہ ہے جو اپنی صفات اور اعمال میں کامل ہو۔ (سعید بن جبیرؒ)

(۷) صمد وہ ہے جس پر کوئی آفت نہ آتی ہو وہ جو بے عیب ہو۔ (ربی بن انسؒ)

(۸) صمد وہ ہے جو باقی رہنے والا اور لازوال ہو۔ (حسن بصریؒ)

(۹) صمد وہ ہے جس کی طرف لوگ حاجتوں کے لیے رجوع کریں۔ (ابراہیم نَخْعَیؒ)

(۱۰) اہل لغت کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ صمد اس سردار کو کہتے ہیں جس سے بالا تر کوئی اور سردار نہ ہو اور جس کی طرف لوگ اپنے معاملات میں رجوع کریں۔ (ابوبکر لانباری) (بحوالہ تفہیم القرآن)

اَحَد اور صمد دونوں خدا کے صفاتی نام ہیں لیکن اَحَد کا لفظ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور کسی اور کے لیے سرے سے مستعمل ہی نہیں ہے البتہ صمد کا لفظ انسان کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے لیکن اصلی اور حقیقی صمد اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ مخلوق اگر کسی ایک حیثیت سے صمد ہو بھی تو دوسری حیثیات سے وہ صمد نہیں ہے کیونکہ وہ فانی ہے لافانی نہیں۔ مخلوقات بعض امور میں ایک دوسرے کی محتاج ہوتی ہیں۔ انسان خدا کی مخلوق ہے وہ کسی بھی صورت میں خود کفیل (Self sufficient) نہیں ہے۔ انسانوں کی زندگی ایک دوسرے کی مدد پر منحصر ہے۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کی صمدیت ہر لحاظ سے کامل ہے۔ ساری دنیا اس کی محتاج ہے اور وہ کسی کا محتاج نہیں۔ دنیا کی ہر شئے اور ہر مخلوق چار وناچار شعوری یا غیر شعوری طور اللہ کی محتاج ہے کیونکہ ہر چیز اور ہر مخلوق کو اسی نےپیدا کیا اور ان سب کی زندگی کا دارومدار اَحَد اور صمد کی صفات سے مُتَّصِف خدائے وحدہٗ لاشریک پر ہے۔ اس کی قدرت اور اس کی خدائی میں کسی کو ذرہ برابر عمل دخل نہیں ہے۔ وہ جو چاہے کرے سب اس کے محتاج ہیں وہ کسی کا محتاج نہیں۔

لفظ 'صمد' کا عربی لغت میں ایک اور مفہوم ہے۔ یہ لفظ اس بڑی چٹان کے لیے بھی بولا جاتا ہے جس کی دشمن کے حملے کے وقت پناہ لی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے لوگ قوم کے سردار کو مجازاً صمد کہتے ہیں کیونکہ سردار قوم کا پشت پناہ ہوتا ہے قوم اس کی پناہ میں ہوتی ہے۔ آسمانی صحیفوں میں کئی جگہ اللہ تعالیٰ کو مدد کی چٹان کہا گیا ہے۔ اَحَد کے بعد صمد کی صفت بیان کی گئی ہے کیونکہ اَحَد کی صفت سے خدا کی یکتائی اور بے مثل ہونے کا تصور سامنے آتا ہے۔ اللہ احد کے بعد اللہ صمد کہہ کر وضاحت فرمادی گئی کہ بے شک اللہ یکتا ہے، سب سے الگ ہے، بے نیاز بے مثل اور بے عیب ہے۔ لیکن وہ اپنی بنائی ہوئی کائینات اور اس میں پیدا کی ہوئی مخلوقات سے بے تعلق اور بے کار بیٹھا ہوا نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس کائینات کے نظام کو خود چلارہا ہے وہ سب کی خبر گیری اور دست گیری کرتا ہے۔ وہ سب کے لیے پناہ لی چٹان ہے۔ وہ سب کا معآویٰ اور ملجا ہے۔ اس کے بندے جب اس سے فریاد کرتے ہیں تو وہ ان لی فریاد رسی کرتا ہے۔ اُس نے ہر مخلوق کو پیدا کیا ہے اور ہر مخلوق اس کی نظر میں اور اس کی حفاظت میں ہے۔

کوئی تو ہے جو نظام ہستی چلا رہا ہے وہی خدا ہے

نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے

مشرکین کو خدا کے بارے میں ہمیشہ سے یہ تصور تھا کہ ایک بڑے معبود(God) کے علاوہ چھوٹے چھوٹے معبود (gods) بھی موجود ہوتے ہیں جن کی بڑے معبود کے ساتھ ساتھ عبادت کرنا ضروری ہے ان کا یہ تصور بھی تھا کہ ان معبودوں کی انسانوں کی طرح جنس ہوتی ہے اور یہ شادی بیاہ بھی کرتے ہیں اور ان کی نسل بھی ہوتی ہے۔ اس جاہلانہ تصور کے نتیجے میں انہوں نے اللہ رب العالمین کے لیے بھی اولاد تجویز کی۔ چنانچہ عرب کے لوگ فرشتوں کو، جیسا کہ قرآن میں بیان ہوا ہے، خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے اور اہل کتاب بھی کسی انسان کو خدا کا بیٹا قرار دیتے تھے جیسا کہ یہود عزیر کو اور عیسائی حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں اور مسئلہ ثلاثہ (Theory of Trinity)پیش کر کے خدا، عیسیٰ اور مریم کو خدائی میں شریک کر دیتے ہیں۔ اس طرح انہوں نے بھی خدا کو تولُد و تناسُل یعنی اولاد کو جنم دینے سے پاک نہ رکھا۔ جب لوگوں کو گمان ہو کہ انسان کی طرح خدا کے ہاں بھی اولاد پیدا ہوتی ہے تو پھر انسان کا ذہن اس گمان سے کیسے محفوظ رہ سکتا ہے کہ خدا کسی کی اولاد ہے اور اس کی بھی اولاد ہے۔یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرب کے لوگوں نے جو سوالات پوچھے ان میں یہ سوال بھی تھا کہ اللہ کا نسب کیا ہے؟ اس نے کس سے خدائیت کی میراث پائی اور اس کے بعد اس کا وارث کون ہوگا۔

چونکہ یہ لوگ ایک خدا (God) کے علاوہ کئی معبودوں کو مانتے تھے ۔ اس لیے ان کا خیال تھا کہ ان معبودوں کی جنس ہوتی ہے اور ان میں نر اور مادہ بھی ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے مشرکین خیال کرتے تھے کہ ان معبودوں کی اولاد بھی ہوتی ہے۔ اس بنا پر انہوں نے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دے دیا۔

ان تمام مفروضات کی جڑ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اَحَد اور صمد کی صفات بیان کرنے سے کاٹ دی لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے اس بے ہودہ کلام کو کہ اللہ کی بھی اولاد ہے اس آیت سے صاف کر دیا کہ اللہ کی نہ کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔ ذات باری تعالیٰ کے حق میں اس قسم کے خیالات کی مذمت اور تردید صرف سورہ اخلاص میں ہی نہیں بلکہ قرآن میں مختلف مقامات پر اس

قسم کی بے ہودگیوں اور خرافات کو مسترد کیا گیا ہے، مثلاً

(۱) اللہ تو بس ایک ہی خدا ہے وہ پاک ہے اس سے کہ کوئی اس کا بیٹا ہو۔ (النسا: ۱۷۱)

(۲) خوب سن رکھو یہ لوگ دراصل اپنی من گھڑت سے یہ بات کہتے ہیں کہ اللہ اولاد رکھتا ہے یہ قطعی جھوٹے ہیں۔ (الصٰفٰت: ۱۵۱-۱۵۲)

(۳) انہوں نے اللہ اور جنوں کے درمیان نسب کا رشتہ بنا رکھا ہے۔ حالانکہ جن خوب جانتے ہیں کہ یہ لوگ (مجرموں کی حیثیت سے) پیش کیے جانے والے ہیں۔ (الصّٰفّٰت: ۱۵۸)

(۴) لوگوں نے اس کے بندوں میں سے بعض کو اس کا جزبنا ڈالا حقیقت یہ ہے کہ انسان کھلا احسان فراموش ہے۔ (زخرف:۱۵)

(۵) اور لوگوں نے جنوں کو اللہ کا شریک ٹھہرایا حالانکہ وہ ان کا خالق ہے اور انہوں نے بے جانے بوجھے اس کے لیے بیٹے اور بیٹیاں گڑ لیں حالانکہ وہ پاک اور بالا تر ہے ان باتوں سے جو وہ کہتے ہیں۔ وہ تو آسمانوں اور زمین کا موجد ہے اس کا کوئی بیٹا کیسے ہو سکتا ہے جب کہ کوئی اس کا شریک زندگی ہی نہیں اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے۔ (انعام:۱۰۰، ۱۰۱)

(٦) اور ان لوگوں نے کہا خدائے رحمان نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔ پاک ہے وہ بلکہ (جن کو یہ اس کی اولاد کہتے ہیں) وہ تو بندے ہیں جنہیں عزت دی گئی ہے۔ (الانبیا:۲٦)

(۷) لوگوں نے کہہ دیا کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا۔ سبحان اللہ! وہ تو بے نیاز ہے۔ آسمانوں میں جو کچھ ہے سب اس کی مِلک ہے تم اللہ کے بارے میں وہ باتیں کہتے ہو جنہیں تم نہیں جانتے۔ (یونس:٦۸)

(۸) اور اے نبی کہو تعریف ہے اس خدا کے لیے جس نے نہ کسی کو بیٹا بنایا اور نہ کوئی بادشاہی میں اس کا شریک ہے اور نہ وہ عاجز ہے کہ کوئی اس کا پُشتی بان ہو۔ (بنی اسرائیل:۱۱۱)

(۹) اللہ نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا اور کوئی دوسرا خدا اس کے ساتھ نہیں۔ (المومنون:۹۱)

مذکوہ بالا آیات میں ہر طرح سے ان لوگوں کے عقیدے کی تردید کردی گئی ہے جو اللہ کے لیے نسبی یا متبنٰی اولاد تجویز کرتے ہیں اور قرآن سے دلائل دے کر اس عقیدے کو غلط ثابت کردیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں اس طرح کی آیات سے بار بار اس مفروضہ کو مسترد کردیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت مبارکہ کو نازل کرکے اپنی ذات مقدس کو اس طرح کے گمراہ کن عقائد سے بری کردیا اور اپنی اَحَدیت، صَمَدیت اور ربوبیت کو روز روشن کی طرح ظاہر کردیا کہ نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ اس کی کوئی اولاد ہے۔

اور اس کا کوئی ہمسر نہیں ہے

یہ آیت دراصل اَحَد اور صَمَد کی مزید تاکید و تفصیل ہے اور یہ اس عقیدہ کی تردید ہے کہ خیر کا خدا الگ اور شر کا الگ ہے نور اور تاریکی کے خدا الگ الگ ہیں۔ یا یہ کہ الگ الگ خداؤں کے الگ الگ کام اور اختیارات ہیں۔ سورہ اخلاص میں لوگوں کی ان سب بے ہودہ باتوں کا ابطال کیا گیا اور فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا نہ کوئی شریک ہے اور نہ اس کی کوئی نظیر۔ وہ بے نظیر و بے مثال اور بے زوال ہے۔ اس ساری کائینات میں نہ کوئی اللہ کے مانند ہے اور نہ کوئی اس کا ہم مرتبہ ہے اور نہ کوئی اس کی صفات، افعال اور اختیارات میں اُس سے کسی درجہ میں بھی مشابہت رکھتا وہ آپ سے آپ موجود ہے اس کا کوئی بنانے والا نہیں ہے وہ اکیلا ہے اس کا کوئی ساجھی نہیں، اُس نے کائینات بنائی اور خود اس کا انتظام چلارہا ہے۔ وہ خود اس کا مدبر ہے اسے وزیروں اور مشیروں کی ضرورت نہیں وہ ان ساری بے ہودہ باتوں سے پاک ہے۔ وہ اَحَد ہے صمد ہے۔ اس کی کوئی اولاد نہیں اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے، وہ اپنی ذات اور صفات میں بھی اکیلا ہے۔ نہ اس جیسا کوئی ہے، نہ تھا اور نہ ہوگا۔ یہ حقیقت ان بے ہودہ باتیں کرنے والوں کو اس دن معلوم ہوجائے گی جس دن زندگی کی آمد و رفت کا سلسلہ رُک جائے گا اور کلُ من علیھا فان (الرحمٰن) کی اطلاع کے مطابق ہر چیز فنا ہوجائے گی اور ہر ایک شخص اپنے اپنے اعمال کے ساتھ باقی رہنے والی ذات کی بارگاہ میں حاضر ہوجائے گا۔ اُس دن مشرک جان لیں گے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی ذات والا صفات کے مدّمقابل انہوں نے جو خدا بنا رکھے تھے، وہ خالی خولی نام تھے جنہیں کوئی خدائی کی سند حاصل نہیں تھی اور یہ کہ ان کا شرک کسی علم کی بنیاد پر نہیں بلکہ صرف وہم و گمان پر قائم تھا۔

مُعَوِّذَتَیْن

سورۃ الْفَلَقْ و سورۃ النَّاس

بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیمِ

قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ o مِن شَرِّ مَا خَلَقَ o وَمِن شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ o وَمِن شَرِّ النَّفَّاثَاتِ فِي الْعُقَدِ o وَمِن شَرِّ

حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَo

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِo مَلِكِ النَّاسِo إِلٰهِ النَّاسِo مِن شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِo الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِo مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِo

مشترکہ پس منظر:

قرآن مجید کی دو آخری سورتوں - سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کے درمیان باہم گہرا تعلق ہے اور ان کے مضامین میں بھی قریبی مناسبت ہے۔ اس بنا پر ان دونوں سورتوں کا ایک مشترکہ نام معوذتین (پناہ مانگنے والی دو سورتیں) رکھا گیا ہے۔ روایات کے مطابق یہ دونوں سورتیں ایک ساتھ نازل ہوئی ہیں۔ اس لیے دونوں کا مشترکہ نام مُعَوذَتین رکھا گیا ہے اور اکثر مفسرین نے ان دونوں سورتوں کا ایک ہی دیباچہ بھی لکھا ہے۔

یہ دو سورتیں اہل ایمان کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتی ہیں کہ انہیں خالق حقیقی رب الکریم اپنی آغوش رحمت میں پناہ لینے کے لیے بلا رہے ہیں۔ اس نے ان کے لیے اپنی بارگاہ رحمت کے دروازے کھلے چھوڑ رکھے ہیں تاکہ اس کے بندے ہر مخفی اور ظاہری مصیبت اور خطرات و مشکلات سے نجات پانے کے لیے اس کی طرف رجوع کرکے پناہ حاصل کرلیں۔ اس لیے خدا کے ہر مومن بندے کو مشکلات اور مصیبت کے وقت، شیطانی خیالات اور وسوسوں سے بچنے کے لیے اور انسانوں اور جنوں اور اپنے نفس کے شرور سے بچنے کے لیے ان دو سورتوں کی تلاوت کرکے اللہ کی پناہ میں آنا چاہیے۔ اس سلسلے میں متعدد احادیث آئی ہیں جو سب اس حقیقت سے ہم آہنگ ہیں کہ ہر مصیبت کے وقت اللہ کی پناہ میں آنے کے لیے ان دو سورتوں کا پڑھنا فائدہ مند ہے۔

یہ دو سورتیں اس وقت نازل ہوئیں جب کفار قریش کی مخالفت میں شدید اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ جب تک انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی طرح کی سودے بازی کی امید برقرار تھی اس وقت تک ان لوگوں کی اسلام دشمنی میں زیادہ زور نہ تھا لیکن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو شرک اور توحید کی مفاہمت سے مایوس کردیا اور ان پر واضح کردیا کہ ان کے ساتھ دین کے معاملے میں کسی مصالحت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے اور یوں ان کے ارادوں اور امیدوں پر پانی پھیر دیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ میرا راستہ الگ ہے اور تمہارا راستہ الگ تو اس کے بعد کفار کی دشمنی نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ اب گھر گھر سے آپؐ کی مخالفت شروع ہوگئی۔ آپؐ کے قتل کی سازشیں ہونے لگیں۔ آپؐ پر جادو کیا جانے لگا تاکہ آپؐ بیمار ہوجائیں یا معاذاللہ دیوانے ہوجائیں۔ شیاطینِ جن و انس بھی ہر طرف

پھیل گئے تاکہ لوگوں کے دلوں میں آپؐ کے اور آپ کے دین کے خلاف وسوسہ ڈال دیں تاکہ لوگ بدظن اور بدگمان ہو کر آپؐ سے اور آپ کے دین سے دور رہیں۔

دوسری طرف بہت سے لوگوں کے دلوں میں حسد کی بیماری لگ گئی تھی کیونکہ وہ اپنے سوا یا اپنے قبیلے سے باہر کسی دوسرے شخص کو پیغمبر نہیں دیکھنا چاہتے تھے اور اس حسد کی بنیاد پر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ مثلاً ابو جہل جس وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں حد سے بڑھا ہوا تھا اس کی وجہ وہ خود بیان کرتا ہے کہ ہمارا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کا آپس میں برابر کا مقابلہ تھا۔ انہوں نے کھانے کھلائے تو ہم نے بھی کھلائے، انہوں نے لوگوں کو سواریاں دیں تو ہم نے بھی دیں، انہوں نے عطیے دیے تو ہم نے بھی دیے۔ یہاں تک کہ وہ اور ہم عزت و شرف میں برابر تھے۔ تو اب ان کے خاندان کے ایک فرد نے نبی ہونے کا دعویٰ کیا تو ہم اس کو نبی کیسے مانیں گے۔ جب کہ ہمارے خاندان کے کسی شخص نے اس طرح کا کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ ان حالات میں محسوس ہو رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گویا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا ہے کیونکہ ہر طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کی مخالفت ہو رہی تھی۔ کچھ لوگ نسب کی بنیاد پر، کچھ حسد کی وجہ سے اور کچھ ان کے مشرکانہ عقائد کو ٹھیس پہنچنے کی بنیاد پر مخالفت کر رہے تھے۔ الغرض ہر طرف سے مشرکین نے مخالفت کا محاذ کھڑا کر دیا تھا اور چند گنے چنے اہلِ ایمان کے سوا ہر ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نقصان پہنچانے کا خوگر تھا۔ یہ لوگ ہر وقت آپؐ کے درپے آزار تھے۔ آپؐ کو قتل کرنے کی سازشیں ہو رہی تھیں۔ جادو کر کے آپ کو پریشان کرنے کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ یعنی دشمن اسلام کسی بھی صورت میں آپ کو صفحۂ ہستی سے مٹانا چاہتے تھے لیکن ان کو کیا خبر تھی کہ

فانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے

وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

مخالفت اور دشمنی کے ان ہی جان سوز حالات میں یہ دو سورتیں نازل ہوئیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا کہ کہہ دو کہ میں پناہ مانگتا ہوں صبح کے رُب کی۔ تمام مخلوقات کے شر سے، رات کے اندھیرے سے، جادو گروں اور جادو گرنیوں کے شر سے اور حاسدوں کے شر سے؛ اور میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب کی، انسانوں کے بادشاہ کی اور انسانوں کے حقیقی معبود کی! اس وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے جو بار بار پلٹ کر آتا ہے اور لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈال دیتا ہے خواہ وہ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔ اسی طرح کی پناہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس وقت مانگی جس وقت فرعون نے بھرے دربار میں ان کے قتل کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ انہوں نے فرمایا تھا اِنِّیۡ عُذۡتُ بِرَبِّیۡ وَرَبِّکُمۡ مِّن کُلِّ مُتَکَبِّرٍ لَّا یُؤۡمِنُ بِیَوۡمِ الۡحِسَابِ (سورۃ المومن:۲۷) ''میں نے اپنے اور تمہارے رب کی پناہ لی ہے ہر اس متکبر (کے شر) سے جو یوم حساب پر ایمان نہیں رکھتا'' اور دوسرے موقعہ پر فرمایا۔ وَاِنِّیۡ عُذۡتُ بِرَبِّیۡ وَرَبِّکُمۡ اَن تَرۡجُمُونِo (سورۃ الدخان:۲۰) ''اور میں اپنے اور تمہارے رب کی پناہ لے چکا ہوں اس بات سے کہ تم مجھ پر حملہ آور ہو''۔

امام احمد اور طبرانی نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت نقل کی ہے کہ وہ ان دو سورتوں کو قرآن میں شمار نہیں کرتے تھے کیونکہ وہ کہتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان دو سورتوں (دعاؤں) سے صرف پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس لیے وہ نماز میں ان دو سورتوں کی تلاوت نہیں کرتے تھے۔

قرآن مجید کی متعدد آیات میں تعوُّذ کا مضمون موجود ہے۔ خود قرآن کی تلاوت و قرأت سے قبل شیطانِ مردود کے شر سے بچنے کے لیے اللہ کی پناہ حاصل کیے جانے کی ہدایت یوں دی گئی ہے: فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ o (النحل:۹۸) (پھر جب تم قرآن پڑھنے لگو تو پہلے اللہ کی پناہ چاہو شیطٰنِ مردود کے شر سے۔) فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ کے الفاظ قرآنِ پاک میں بار بار دہرائے گئے ہیں، مثلاً سورہ غافر، حٰم السجدہ، الاعراف وغیرہ۔ حالانکہ یہ روایت خود ان محدثین کی دلیل سے ہی ناقابل اعتبار قرار پاتی ہے۔ جب طبرانی ہی سند حسن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا کہ ''مجھ پر ایسی آیتیں نازل ہوئی ہیں جن کی مَثَل (مثال) مجھ پر نازل نہیں ہوئی اور وہ معوذتین ہیں''۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ان دونوں سورتوں سے واقف تھے کہ یہ قرآن کی آخری دو سورتیں ہیں اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابن مسعود سے معوذتین سے متعلق جو روایت منسوب ہے، وہ خبر آحاد میسے ہے۔ خبر احاد وہ حدیث ہیں جسے ہر دور کے ایک آدمی نے بیان کیا ہو اور حدیث آحاد وہ حدیث نبوی ہے جس کی روایت شخص واحد سے شخص واحد تک ہوتی ہوئی پہنچی ہو۔ برخلاف ایسی حدیثوں کے جنہیں ایک راوی نے کئی آدمیوں سے بیان کیا ہو۔

ابن مسعودؓ ایسے صحابی تھے جو ہمیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہا کرتے تھے اور آپؐ کے پیچھے نمازیں پڑھتے تھے اور آپ کی تلاوت سنتے تھے۔ اس صورت میں انہوں نے آپؐ کی زبان مبارک سے ان دو سورتوں کی تلاوت بھی سنی ہوگی۔ لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ انہوں نے ان دو سورتوں کو قرآن سے خارج قرار دیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ چند ایمۂ نے جن میں امام نووی اور امام فخرالدین رازی شامل ہیں، اس بات کو جھوٹ اور باطل قرار دیا ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعود سے منسوب کی گئی ہے۔ قرآن مجید کے بارے میں جو بھی شُبہات ظاہر کیے گئے ہیں ان کو اس حقیقت کے پیش نظر یکسر (Outrightly) مسترد کیا جاتا ہے کہ قرآن کو دوران نزول وحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت پر صحابہ کرام بڑی احتیاط اور چوکسی کے ساتھ تحریر کرتے تھے اور ساتھ ساتھ حفظ بھی کرتے تھے پھر حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے دوران تمام صحابہ کی تائید سے ایک مصحف تیار کیا گیا اور پھر حضرت عثمانؓ کی خلافت کے دوران اسی مصحفِ اشرف کے نسخے تیار کرکے عالمِ اسلام میں سرکاری اعزاز کے ساتھ بھیجے گئے اور آج تک تمام دنیائے اسلام میں اسی مصحف پر اجماع ہے اور اسی رسم الخط میں ان دونوں سورتوں فلق اور الناس کے ساتھ قران مجید موجود اور محفوظ ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس قرآن کی حفاظت کا جو وعدہ فرمایا ہے کہ اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَo ''ہم نے ہی اس قرآن کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں'' (حجر:۹) وہ پورا ہوا اور قیامت تک اللہ کی لی ہوئی یہ ذمہ داری جاری رہے گی اور قرآن ہر دور میں محفوظ رہے گا۔ اللہ کی حفاظت کے اس وعدے کے مطابق قرآن مجید کے ایک حرف (letter) کو کسی نے تبدیل کرنے کی جرأت نہ کی۔

عبداللہ بن مسعودؓ کی اس غلط فہمی کے بارے میں جب حضرت اُبَیّ بن کعب سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں سوال کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ مجھ سے کہا گیا قُل تو میں نے بھی کہا قُل اس لیے ہم بھی اسی طرح کہتے ہیں جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کہتے تھے۔ حضرت اُبَیّ بن کعب کے الفاظ اس طرح ہیں (میں شہادت دیتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بتایا کہ جبرئیل علیہ السلام نے آپ سے قل اعوذ برب الفلق کہا تھا اس لیے آپ نے بھی ایسا ہی کہا، اور انہوں نے قل اعوذ برب الناس کہا تھا اس لیے آپ نے بھی ایسا ہی کہا لہٰذا ہم بھی اُسی طرح کہتے ہیں جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا) حضرت اُبَیّ کے اس بیان کے بعد ان دونوں سورتوں کا قران کی سورتیں ہونے میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہتی ہے اور قرآن کے بارے میں یقین کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ خدا کی بھیجی ہوئی اس کتاب میں کوئی غلطی نہیں ہے اور نہ اس بات سے اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ جیسے عظیم صحابی سے ایسی کوئی غلطی ہوئی ہو کہ انہوں نے معوذتین کو قرآن کا حصہ ماننے سے انکار کر دیا ہو اور اگر بالفرض ان سے ایسی غلطی سرزد ہوئی بھی ہو یہ ان کی بشریت کی وجہ سے ہوئی ہو جو انہیں صحابہ کی فہرست سے خارج نہیں کر سکتی ہے اور نہ کسی صحابی نے ان کے بارے میں کسی طرح کی سخن سازی کی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کا اثر

مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا گیا تھا اور اس جادو کا آپ پر اثر بھی ہوا تھا وہ کہتے ہیں کہ ''روایت کی رو سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا گیا تھا اور اس کے اثر سے آپ بیمار ہوگئے تھے اور اس اثر کو دور کرنے کے لیے جبرئیل علیہ السلام نے آکر آپ کو یہ سورتیں پڑھنے کی ہدایت کی تھی۔ اس پر قدیم اور جدید زمانے کے بہت سے عقلیت پسندوں نے اعتراض کیا ہے کہ یہ روایات اگر صحیح مان لی جائیں تو شریعت ساری کی ساری مشتبہ ہوجاتی ہے کیونکہ اگر نبی پر جادو کا اثر ہوسکتا تھا اور ان روایات کی رو سے ہوگیا تھا تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ مخالفین نے جادو کے زور پر نبی سے کیا کیا کہلوا اور کروالیا ہو اور اس کی دی ہوئی تعلیم میں کتنی چیزیں خدا کی طرف سے ہوں اور کتنی جادو کے اثر سے۔یہی نہیں بلکہ وہ کہتے ہیں کہ اس بات کو سچ مان لینے کے بعد تو یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ جادو ہی کے ذریعہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کے دعوے پر اکسایا گیا ہو اور نبی نے غلط فہمیں میں بتلا ہوکر یہ سمجھ لیا ہو کہ اس کے پاس فرشتہ آیا ہے۔ان کا استدلال یہ بھی ہے کہ یہ احادیث قرآن مجید سے متصادم ہیں قرآن میں تو کفار کا یہ الزام بیان کیا گیا ہے کہ نبی ایک مسحور یعنی سحرزدہ آدمی ہے: إِذْ يَقُولُ الظَّالِمُونَ إِن تَتَّبِعُونَ إِلاَّ رَجُلاً مَّسْحُوراًo (بنی اسرائیل:۴۷) مگر یہ احادیث کفار کے الزام کی تصدیق کرتی ہیں کہ واقعی نبیؐ پر سحر کا اثر ہوا تھا''

مودودی صاحب نے تاریخی حوالوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کا اثر ہوا تھا۔ لیکن ان کے مشن اور نزول قرآن پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ وہ فرماتے ہیں ''جہاں تک تاریخی حیثیت کا تعلق ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کے اثر ہونے کا واقعہ قطعی طور ثابت ہے اور علمی تنقید سے اس کو اگر غلط ثابت کیا جاسکتا ہو پھر دنیا کا کوئی تاریخی واقعہ بھی صحیح ثابت نہیں کیا جاسکتا ہے'' (تفہم القرآن جلد ششم)

رسول اللہ ﷺ پر جادو ر کرنے کا واقعہ ایک تاریخی واقعہ ہے

صلح حدیبیہ کے بعد جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ واپس تشریف لائے تو محرم ۷ ہجری میں خیبر سے یہودیوں کا ایک وفد مدینہ آیا اور ایک مشہور جادوگر لبید بن اعصم کے ذریعے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کروایا جسے کھجور کے خوشے کے غلاف میں رکھ کر بنی زُرَیق کے کنویں کی تہہ میں ایک پتھر کے نیچے دبادیا گیا اور ایک سال کے اندر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کا اثر ہوگیا اور ان کے مزاج میں تبدیلی آنی شروع ہوگئی۔ یہاں تک کہ وہ کسی کام کے متعلق خیال فرماتے کہ وہ کر لیا ہے مگر نہیں کیا ہوتا تھا اور بعض اوقات آپ کو اپنی نظر پر شُبہ ہوتا تھا کہ کسی چیز کو دیکھا ہے مگر نہیں دیکھا ہوتا تھا۔ لیکن آپ کی نبوت کے فرائض کے اندر کوئی خلل واقع نہ ہونے پایا۔ اس دوران نہ آپ قرآن کی کوئی آیت بھول گئے اور نہ کوئی آیت غلط پڑھی اور نہ ان کے وعظوں اور خطبوں کے اندر کوئی فرق واضح ہوگیا اور نہ آپ نے کوئی ایسا کلام پیش کردیا جو آپ پر نازل نہ ہوا تھا اور نہ کوئی نماز آپ سے چھوٹ گئی۔ اگر ایسی کوئی بات پیش آئی ہوتی تو پورے عرب میں اودھم مچ جاتی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جادو کے ذریعے معاذ اللہ پاگل کردیا گیا۔ لیکن آپ کی نبوت اس سے بالکل غیر متاثر رہی اور صرف اپنی ذاتی زندگی میں آپ اپنی جگہ اسے محسوس کرکے پریشان ہوتے رہے۔ آخرکار ایک روز آپؐ کو نیند کی حالت میں خبر دی گئی کہ کھجور کے خوشے کے غلاف میں آپ کے کچھ بال رکھ کر آپ پر جادو کیا گیا ہے اور اسے زریق کے کنویں میں پتھر کے نیچے رکھ دیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ اطلاع پاتے ہی چند صحابہ کے ساتھ اس کنویں کے پاس پہنچ گئے کنویں سے پانی نکالا گیا اور غلاف برآمد کرلیا گیا۔ جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور انہوں نے بتایا کہ آپؐ معوذتین یعنی سورۃ الفلق اور سورۃ الناس پڑھیں جونہی یہ دو سورتیں پڑھی گئیں اور غلاف کو کھول دیا گیا تو اسی کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جادو کا اثر ختم ہوگیا اور آپ نے ایسا محسوس کیا جیسے وہ بندھے ہوئے تھے، پھر کھل گئے۔ اس کے بعد آپ نے لبید کو بلایا اور اس سے بازپرس کی اس نے جب اپنے قصور کا اعتراف کیا تو اسے چھوڑ دیا گیا کیوں کہ اپنی ذات کے لیے آپ نے کبھی کسی سے انتقام نہ لیا۔ اس جادو میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس کی وجہ سے آپ کی نبوت متاثر ہوسکتی تھی۔ اس کا اثر اس طرح تھا جس طرح ذاتی حیثیت سے آپ جنگ اُحد میں زخمی ہوگئے گھوڑے سے گرکر چوٹ کھائی۔ آپ کو بچھو نے کاٹا لیکن یہ چیزیں آپ کی نبوت کے منافی نہیں تھیں تو ذاتی حیثیت میں جادو کے اثر سے آپ کے بیمار ہونے سے آپ کی نبوت پر کس طرح اثر پڑ سکتا تھا۔ نبی پر جادو کا اثر ہوسکتا ہے یہ بات تو قرآن مجید

سے بھی ثابت ہے سورہ اعراف میں فرعون کے جادوگروں کے متعلق بیان ہوا ہے کہ حضرت موسیٰ کے مقابلے میں جب وہ آئے تو انہوں نے ہزاروں آدمیوں کے پورے مجمع کی نگاہوں پر جادو کردیا جو مقابلہ دیکھنے کے لیے جمع ہوا تھا۔

قَالَ أَلْقُوْا فَلَمَّا أَلْقَوْا سَحَرُوا أَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوهُمْ وَجَاءُوا بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ... (سورہ اعراف:۱۱۶) ''انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کردیا۔''

سورۃ طٰہٰ میں ہے: قَالَ بَلْ أَلْقُوا فَإِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِن سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَىo فَأَوْجَسَ فِي نَفْسِهِ خِيفَةً مُّوسَىo قُلْنَا لَا تَخَفْ إِنَّكَ أَنتَ الْأَعْلَىo وَأَلْقِ مَا فِي يَمِينِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوا إِنَّمَا صَنَعُوا كَيْدُ سَاحِرٍ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ أَتَىo ''کہ جو لاٹھیاں اور رسیاں انہوں نے پھینکی تھیں ان کے متعلق عام لوگوں نے ہی نہیں بلکہ حضرت موسیٰ نے بھی سمجھا کہ وہ ان کی طرف سانپوں کی طرح دوڑ کر آرہی ہیں اور اسے حضرت موسیٰ خوفزدہ ہوگئے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی نازل کی کہ خوف نہ کرو تم ہی غالب رہو گے ذرا اپنا عصا پھینکو۔ (طٰہٰ:٦٦تا ٦٩)

یہ بات قابل غور ہے کہ مشرکین مکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر الزام لگاتے تھے کہ وہ سحرزدہ آدمی ہے تو آپ پر جادو کرنے اور اس کا اثر ہونے کے واقعہ سے ان کے الزام کی تصدیق ہوجاتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سحرزدہ آدمی تھے یعنی اس بات سے دشمنوں کو آپؐ کو سحرزدہ آدمی کہنے کا جواز مل جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سحرزدہ آدمی اس معنی میں نہیں کہتے تھے کہ آپ کسی جادوگر کے جادو کرنے سے بیمار ہوگئے ہیں اور ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے ہیں بلکہ وہ اس معنیٰ میں آپ کو سحرزدہ کہتے تھے کہ کسی جادوگر نے آپ کو جادوئی کلام سکھا کر معاذاللہ پاگل کردیا ہے اور اس جادوئی کلام سے آپ نبوت کا دعویٰ کرتے ہیں اور جنت و دوزخ کے افسانے سنارہے ہیں۔ ورنہ ان کو معلوم تھا کہ جادو کا اثر صرف ذات محمد پر ہوا تھا اور محمد کی نبوت اس سے غیر متاثر رہی۔

جو لوگ جادو کو وہم کے سوا کچھ نہیں سمجھتے ہیں ان کی نظروں میں جادو کے اثرات کی کوئی سائنسی (Scientific) دلیل نہیں ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ جادو وغیرہ ایک نفسیاتی اثر (Psychological effect) ہے جس کی وجہ سے انسان کے دماغ پر دباؤ بڑھ جاتا ہے اور اسے کچھ چیزیں اصلی روپ سے ہٹ کر دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ دنیا میں بہت سی چیزیں تجربے اور مشاہدے میں آتی ہیں لیکن سائنسی (Scientific) علم کے ذریعے یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ وہ چیزیں کیسے رونما ہوتی ہیں۔ جادو دراصل ایک نفسیاتی اثر ہے جو جسم کو اس طرح متاثر کردیتا ہے جس طرح ایک جسمانی بیماری انسان کے نفس کو متاثر کردیتی ہے۔ جس طرح خوف (Fear) ایک نفسیاتی چیز ہے مگر اس کا اثر جسم پر بھی ہوتا ہے۔ جب کسی پر خوف طاری ہوتا ہے تو اس کے جسم میں تھر تھراہٹ پیدا ہوجاتی ہے جو وہم نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ جادو سے تو حقیقت تبدیل نہیں ہوتی ہے لیکن انسانی نفس محسوس کرنے لگتا ہے کہ جسم میں کوئی تبدیلی آگئی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف جادو گروں نے جو لاٹھیاں اور رسیاں پھینکی تھیں وہ حقیقت میں سانپ نہیں بن گئی تھیں لیکن لوگوں کی آنکھوں پر ایسا جادو ہوا کہ انہیں یہ سانپ دکھائی دئے۔ قرآن مجید میں سورہ بقرہ آیت:۱۰۲ میں بیان کیا گیا ہے کہ بابل میں ہاروت اور ماروت دو فرشتوں سے لوگ وہ جادو سیکھتے تھے جو شوہر اور بیوی میں جدائی ڈال دیتا تھا۔ یہ بھی ایک نفسیاتی اثر کا نتیجہ تھا جس کی وجہ سے میاں بیوی میں جدائی ہوتی تھی۔ لوگوں کو اس میں کامیابی نظر آتی تھی تو وہ اس پر عمل کرتے تھے۔ حالانکہ جادو کا مؤثر ہونا اللہ کے اذن کے بغیر ممکن نہیں ہے مگر اس حقیقت کے باوجود جو چیز ہزاروں سال سے انسان کے تجربے اور مشاہدے میں آئی ہو اور جسے تاریخی حیثیت سے بھی قبول کیا گیا ہو اسے یکسر جھٹلانا ٹھیک نہیں ہے۔

ابو بکر جصاص جادو کے متعلق لکھتے ہیں کہ اہل لغت کے مطابق سحر ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو بہت لطیف (Minute) اور ضعیف ہو جس کا سبب (Cause) نظروں سے مخفی ہو لیکن جادو کا ایک معنیٰ یہ بھی ہے کہ کوئی کلام یا کام جادوئی اثر رکھنے والا ہوتا ہے۔ یعنی یہ کام یا کلام بہت اثر کرنے والا ہوتا ہے۔ ابن عمرؓ سے ایک روایت منسوب ہے کہ انہوں نے کہا کہ دو آدمی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور ان میں سے ایک نے خطبہ دیا اور لوگ خطبہ سن کر متاثر ہوئے۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بعض بیان میں جادو ہوتا ہے ۔ حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ بعض بیان میں جادو ہوتا ہے۔ بعض بیان میں 'جادو ہوتا ہے' کے ارشاد سے مراد یہ ہے کہ ایک شخص پر کسی کا حق واجب الادا ہوتا ہے لیکن وہ اپنے دلائل مؤثر انداز میں پیش کر کے حق دار کا حق ہتھیا لیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جادو اس لیے فرمایا کیوں کہ جادو بیان شخص کا انداز بیان بہت خوبصورت ہوتا ہے اور اس کی زبان میں قدرت ہوتی ہے کہ اگر وہ چاہے تو ایک حق پر مبنی بات کو جس میں ناراضگی کا اندیشہ ہو اپنی جادو بیانی سے پیش کر کے ناراضگی کے خدشات کو دور کر دے۔ یہی وہ جائز جادو بیانی تھی جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی موقعوں پر برقرار رہنے دیا تاکہ لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو کر اظہار ناراضگی نہ کریں۔ کیونکہ بعض لوگوں کا طرز کلام ایسا ہوتا ہے کہ ان کی اصل بات بھی لوگوں کو سمجھ میں نہیں آتی ہے۔

روایت ہے کہ ایک شخص نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ کے پاس آکر بڑے بلیغ و فصیح انداز میں گفتگو کی جسے سن کر خلیفہ نے فرمایا کہ یہی حلال جادو ہے۔ یہ شخص اگر چاہے تو اپنی جادو بیانی سے ایک باطل بات کو حق کی صورت میں پیش کرے جسے لوگ آسانی سے قبول کریں۔ جہاں یہ بات ثابت کی جاتی ہے کہ ایک باطل بات کو جب ایک جادو بیان شخص اپنی جادو بیان زبان سے حق بات میں تبدیل کرکے لوگوں سے حق ماننے پر تیار کرواتا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا ہے کہ باطل حقیقی طور سے حق بن گیا بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ لوگ دھوکے میں آکر باطل کو حق مان گئے۔ ورنہ حق اپنی جگہ حق ہے۔ وہ باطل کی صورت اختیار نہیں کرسکتا ہے۔ اسی طرح جادوئی کام سے چیزوں میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی ہے بلکہ ان کاموں سے چیزوں میں نمایاں تبدیلی دکھائی دیتی ہے جو حقیقت میں آنکھوں کا دھوکہ اور وہم و گمان ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: سَحَرُوۡۤا اَعۡیُنَ النَّاسِ ''انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کردیا'' یعنی فرعون کے جادو گروں نے لوگوں کے سامنے ایسی فن کاری کا مظاہرہ کیا کہ انہیں ان کی رسیاں اور لاٹھیاں سانپوں کی طرح دوڑتی ہوئی محسوس ہوئیں اور ارشاد ہوا یُخَیَّلُ اِلَیۡہِ مِنۡ سِحۡرِہِمۡ اَنَّہَا تَسۡعٰی ''ان کے جادو کے زور سے یہ (رسیاں اور لاٹھیاں) دوڑتی ہوئی نظر آنے لگیں''
(احکام القرآن)

عرب کے لوگ مُلَمَّع شدہ زیورات (ornaments) کو مسحور کا نام دیتے ہیں کیوں کہ ایسے زیورات کو ظاہری خوبصورتی کے لیے اوپری سطح پر سونا چاندی سے gilt کرکے چمکایا جاتا ہے جو دیکھنے والوں کو اپنی چمک دھمک سے مسحور کردیتے ہیں۔ (واللہ اعلم)

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب جادو بیان مقرر کی مسحور کن تقریر جائز ہے تو جادو گر کے جادوئی کھیل تماشے جائز کیوں نہیں ہیں۔ حالانکہ جادو بیان شخص کسی اچھی اور صحیح بات کو بری اور غلط بات میں تبدیل کر سکتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اس کلام کو جادو زبان میں بیان کرنا جائز قرار دیا ہے جو حق پر مبنی ہو۔ جو چیز حق نہ ہو اسے جادوئی زبان میں حق ثابت کرنے کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔ الغرض جادو کا اثر مجازی ہوتا ہے حقیقی نہیں اس سے دھوکہ دہی، تلبیس اور فریب مقصود ہوتا ہے۔ نیز جادو سے ایسی بات کا اظہار مطلوب ہوتا ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی ہے اور نہ اسے کوئی ثبات و قرار حاصل ہوتا ہے۔ صاحب معارف القرآن مولانا مفتی محمد شفیعؒ سحر کی حقیقت کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ''سحر لغت میں ہر ایسے اثر کو کہتے ہیں جس کا سبب ظاہر نہ ہو، عرف عام میں سحر (جادو) ان چیزوں کو کہا جاتا ہے جن میں جنات اور شیاطین کا عمل دخل ہو یا قوتِ خیالیہ (Mesmerism-Hypnotism) یا کچھ الفاظ و کلمات کا دخل ہو۔ کیونکہ یہ بات تجربہ اور مشاہدے میں آئی ہے اور قدیم و جدید فلاسفر بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ حروف و کلمات میں بھی کچھ تاثیرات ہوتی ہیں۔ کسی خاص حرف یا کلمہ کو خاص تعداد میں پڑھنے یا لکھنے وغیرہ سے خاص خاص تاثیرات کا مشاہدہ کیا گیا ہے۔ یا ایسی تاثیرات جو انسانی بالوں یا ناخنوں وغیرہ یا اس کے استعمال کے کپڑوں کے ساتھ کچھ دوسری چیزیں شامل کرکے پیدا کی جاتی ہیں جن کو عرف عام میں ٹونا ٹوٹکا-جنتر منتر-کہا جاتا ہے ۔ اصطلاح قرآن و حدیث میں سحر ایسے امر عجیب کو کہا جاتا ہے جس سے شیاطین کو خوش کرکے ان کی مدد حاصل کی گئی ہو۔ پھر شیاطین کو راضی کرنے کی مختلف صورتیں ہیں۔ کبھی ایسے منتر تیار کیے جاتے ہیں جن میں کفر و شرک کے کلمات ہوں اور شیاطین کی مداح کی گئی ہو یا کواکب و نجوم کی عبادت کی گئی ہو۔ جس سے شیطان خوش ہوجاتا ہے۔ کبھی ایسے اعمال بھی اختیار کیے جاتے ہیں جو شیطان کو پسند ہیں مثلاً کسی کو ناحق قتل کرکے اس کا خون استعمال کرنا یا جنابت و نجاست کی حالت میں رہنا، طہارت سے اجتناب کرنا وغیرہ جس طرح اللہ تعالیٰ کے پاک فرشتوں کی مدد ان اقول و افعال سے حاصل کی جاتی ہے جن کو فرشتے پسند کرتے ہیں۔ مثلاً تقویٰ، طہارت اور پاکیزگی بدبودار اور نجاست سے اجتناب، ذکراللہ اور اعمال خیر۔ اسی طرح شیاطین کی امداد ایسے اقوال و افعال سے حاصل ہوتی ہے جو شیطان کو پسند ہیں۔ اسی لیے سحر صرف ایسے ہی لوگوں کا کامیاب ہوجاتا ہے جو گندے اور نجس رہیں۔ پاکی اور اللہ کے نام سے دور رہیں، خبیث کاموں کے عادی

ہوں۔ عورتیں بھی ایام حیض میں یہ کام کرتی ہیں جو مؤثر ہوتے ہیں۔ باقی شعبدے اور ٹوٹکے یا ہاتھ کی صفائی کے کام میسمرازم (Mesmerism) وغیرہ ان کو مجازاً سحر کہہ دیا جاتا ہے''۔ (روح المعانی)

جادو (سحر) کی کئی قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک قسم اہل بابل کا جادو ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ان الفاظ میں فرمایا ہے: یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَا اُنْزِلَ عَلَی الْمَلَکَیْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ''وہ لوگوں کو جادو گری کی تعلیم دیتے تھے اور وہ پیچھے پڑے اس چیز کے جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت اور ماروت پر نازل کی گئی تھی''۔

اہل بابل صابیئن تھے اور ستاروں کی پرستش کرتے تھے وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ کائینات میں پیش آنے والے تمام واقعات ان ستاروں کے افعال و حرکات کے نتائج ہیں۔ ان لوگوں کے علوم شعبدہ بازیوں، مکاریوں اور ستاروں کے متعلق امور و احکام پر مشتمل تھے۔ یہ لوگ ان بتوں کی پوجا کرتے تھے جنہیں یہ لوگ ستاروں کے نام پر بناتے تھے۔ وہ اپنے اپنے عقیدہ کے مطابق خیر یا شر کی طلب میں مخصوص ستارے کا تقرب حاصل کرتے تھے اور اسے راضی کرنے کے لیے مخصوص کام کرتے تھے۔ مثلاً جو شخص خیر اور اصلاح کا طلبگار ہوتا تھا وہ مشتری (مبارک) نام کے ستارے کے بت کے پاس جاکر تعویز گنڈے بناتا اور منتر پڑھ کر ان پر پھونکتا اور جو شخص اپنے مخالفین کے لیے تباہ کاری، موت اور شر وفساد کا طالب ہوتا وہ زُحَل (نامبارک) ستارے کے بت کے پاس جاکر مخصوص طریقے سے پوجا پاٹ کرتا اور جو شخص بجلی گرنے، آگ لگنے اور طاعون کی بیماری پھیلنے کا طلب گار ہوتا وہ مِریخ (منحوس) ستارے کے بت کے پاس جاکر جانوروں کے خون کا نذرانہ پیش کرتا ۔ اس طرح کی پوجا پاٹ اور جاڑ پھونک کی تمام رسمیں یہ لوگ ادا کرتے تھے اور ان بتوں سے اپنی مرادیں مانگتے تھے اور ان کے عقیدہ کے مطابق مذکورہ بت ان کی مرادیں پوری کردیتے۔ اس طرح کی جھاڑ پھونک کرکے اور گنڈے اور منتروں کی رسمیں بجالاکر یہ لوگ سمجھتے تھے کہ اب وہ دوسروں پر ہاتھ لگائے بغیر برے یا بھلے اثرات پیدا کرسکتے ہیں۔ اس قسم کا جادو سیکھنے والا جادوگر لوگوں کو اس زعم میں مبتلا کردیتا ہے کہ وہ انسان کو گدھا، کتا یا کوئی اور جانور بنا سکتا ہے اور پھر جب چاہے اسے اس کی اصل صورت میں واپس لاسکتا ہے۔ ان کے بادشاہوں کو جادوگروں کے اس طرز عمل پر کوئی اعتراض نہ ہوتا تھا۔ بلکہ ان کے ہاں ان جادوگروں کو سب سے اونچا مرتبہ حاصل ہوتا تھا کیونکہ عام لوگوں کے دلوں میں ان کی تعظیم ہوتی تھی۔ لہٰذا بادشاہ خود ان تمام باتوں کو مانتے تھے۔ اور ان پر عمل بھی کرتے تھے۔ حکمران طبقے ہمیشہ عام لوگوں کے عقیدے کی قدر کرتے ہیں چاہے ان کا عقیدہ صحیح ہو یا غلط کیونکہ انہیں اپنی حکومت کے لیے تحفظ کی ضرورت ہوتی ہے کسی خاص عقیدے کی نہیں۔

اس پس منظر میں اللہ تعالیٰ نے بابل میں ان لوگوں کی طرف دو فرشتے بھیجے جو ان کے سامنے جادو گروں کے دعوؤں کی حقیقت سے پردہ اٹھاتے تھے۔ ان کا بطلان کرتے تھے اور ان کی مَلمع کاری (Gilting) اور فن کاری کا پول کھول دیتے تھے اور انہیں جادوگرو ںکے جھاڑ پھونک اور ان کے منتروں اور تعویز گنڈوں کے مہمل ہونے سے آگاہ کرتے تھے اور بتاتے تھے کہ یہ سراسر شرک اور کفر ہے۔ وہ لوگوں کو ان جادوگروں کے حیلوں اور شعبدوں سے بھی آگاہ کرتے تھے۔ جن کے ذریعے وہ عام لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکتے تھے ۔ قرآن کے الفاظ یہ ہیں: اِنَّمَا نَحۡنُ فِتۡنَۃٌ فَلَا تَکۡفُرۡ ''دیکھو ہم تو محض ایک آزمائش ہیں کفر میں بتلا نہ ہو''۔

بابل کے لوگ جادوگری اور شعبدہ بازی کے تمام طریقے استعمال کرتے تھے اور جادوگری کے فن کو چمکادیتے تھے اور اس طرح لوگوں کو ستاروں کی پرستش کا معتقد بنادیتے تھے۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے ہاروت اور ماروت دو فرشتوں کو اس طرح کے جادو کے ساتھ لوگوں کی آزمائش کے لیے بھیج دیا جو ان کو جادو سیکھنے سے پہلے بتادیتے تھے یہ صرف آزمائش ہے۔ اس میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔

جادو میں زیادہ تر تخیل کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ جس میں ظاہر حقائق کے خلاف ہوتا ہے۔ جب انسان کسی چیز پر حد سے زیادہ تخیل کرتا ہے تو اسے وہ چیز اسی طرح کی دکھائی دیتی ہے جس طرح کا وہ خیال کرتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص اگر خوف کی وجہ سے کسی چیز کو اپنے لیے خطرہ سمجھے تو جتنا وہ خوف کرے اور اس چیز پر جتنا وہ شک کرے اتنا ہی وہ چیز اُس کے لیے خطرے کی علامت بن جاتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص رسی کو سانپ سمجھ کر ڈر جائے تو خوف غالب ہونے کی وجہ سے اسے رسی بھی سانپ دکھائی گے گی۔ اس شخص کو اسی چیز کا اصل سے زیادہ گمان کرنے سے اس کے دماغ پر نفسیاتی اثر پڑھ جاتا ہے۔ اور وہ اسی چیز کی اصلیت پر شک کرنے لگتا ہے اور جتنا وہ اس چیز پر شک کرتا ہے اتنا وہ اس چیز کو دوسری صورت میں دیکھتا ہے۔

امام راغب اصفہانی نے سحر کی کئی اقسام بیان کی ہیں۔ ایک یہ کہ شعبدہ باز اپنے ہاتھ کی صفائی اور چالاکی سے ایسے کام لیتے ہیں کہ عام لوگوں کی نظریں اس کو دیکھنے سے قاصر رہتی ہیں۔ یا قوت خیالیہ (میسمرزم) (Mesmerism) یا ہپناٹزم (Hypnotism) وغیرہ کے ذریعے کسی کے دماغ پر ایسا اثر ڈالا جائے کہ وہ ایک چیز کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا اور محسوس کرتا ہے مگر اس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی ہے۔ کبھی یہ کام شیطان کے اثر سے بھی ہو سکتا ہے کہ مسحور کی آنکھوں اور دماغ پر ایسا اثر ڈالا جائے جس سے وہ ایک غیر واقعی چیز کو حقیقت سمجھنے لگے۔ قرآن پاک میں فرعونی ساحروں کے جس سحر کا ذکر ہے وہ اس قسم کا سحر تھا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ ''انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا'' اور يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ''ان کے سحر سے موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں یہ آنے لگا کہ یہ رسیوں کے سانپ دوڑ رہے ہیں'' اس میں يُخَيَّلُ کے لفظ سے یہ بتا دیا گیا کہ یہ رسیاں اور لاٹھیاں جو ساحروں نے ڈالی تھیں جو نہ در حقیقت سانپ بنی اور نہ انہوں نے کوئی حرکت لی بلکہ حضرت موسیٰ کی قوت مُتَخَیِّلہ متاثر ہو کر ان کو دوڑنے والے سانپ سمجھنے لگی۔

دوسری قسم کا جادو اس طرح کا تخیل اور نظربندی ہے جو بعض اوقات شیاطین کے اثر سے ہو سکتی ہے جو قرآن کریم کی اس آیت سے معلوم ہوتی ہے: هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيَاطِينُ تَنَزَّلُ عَلَى كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ (الشعراء: ۲۲۱) ''میں تمہیں بتلاتا ہوں کہ کن لوگوں پر شیاطین اترتے ہیں ہر بہتان باندھنے والے گنہگار پر اترتے ہیں'' دوسری جگہ ارشاد ہے وَلَكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ (البقرہ: ۱۰۲) ''یعنی شیاطین نے کفر اختیار کیا لوگوں کو جادو سکھانے کے لیے'' تیسری قسم یہ ہے کہ سحر کے ذریعے ایک شئے کی حقیقت ہی بدل جائے۔ جیسے کہ انسان یا جاندار کو پتھر یا کوئی اور جانور بنادیں لیکن امام راغب اصفہانی اور ابوبکر جصاص اور معتزلین اس قسم کے جادو سے انکار کرتے ہیں کہ سحر کے ذریعے کسی چیز کی حقیقت بدل جائے۔ مگر جمہور علما کی تحقیق یہ ہے کہ قرآن میں فرعونی ساحروں کے سحر کو جو تخیل قرار دیا گیا ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ ہر سحر تخیل ہی ہو اور اس کے علاوہ کچھ نہ ہو۔ اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے بعض حضرات نے کعب احبار کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے جو مؤطا امام مالک میں بروایت قعقاع بن حکیم منقول ہے لَوْلَا كَلِمَاتٌ أَقُولُهُنَّ لَجَعَلَتْنِي الْيَهُودُ حِمَارًا ''اگر چند کلمات نہ ہوتے جن کو میں پابندی سے پڑھتا ہوں تو یہودی مجھے گدھا بنادیتے'' جب لوگوں نے پوچھا وہ کلمات کیا تھے تو آپ نے یہ کلمات بتلادئے۔ أَعُوذُ بِاللهِ الْعَظِيمِ الَّذِي لَيْسَ بِشَيْءٍ أَعْظَمُ مِنْهُ وَبِكَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّاتِ الَّتِي لَا يُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَلَا فَاجِرٌ وَبِأَسْمَاءِ اللهِ الْحُسْنَى كُلِّهَا مَا عَلِمْتُ مِنْهَا وَمَا لَمْ أَعْلَمْ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَبَرَأَ وَذَرَأَ ''میں اللہ عظیم کی پناہ لیتا ہوں جس سے بڑا کوئی نہیں اور پناہ لیتا ہوں اللہ کے کلمات تامات کی جن سے کوئی نیک و بد انسان آگے نہیں نکل سکتا اور پناہ لیتا ہوں اللہ کے تمام اسمائِ حسنیٰ کی جن کو میں جانتا ہوں اور جن کو نہیں جانتا ہوں، ہر اس چیز کے شر سے جس کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اور جو بویا اور پھیلایا ہے''

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ سحر کے ذریعے ایک شئے کی حقیقت بدل جاتی ہے جیسے کہ انسان کو کسی بے جان چیز پتھر یا جاندار کی شکل میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ جو لوگ سحر کے ذریعے ایک شئے کی حقیقت بدل جانے پر یقین رکھتے ہیں وہ دلیل کے طور پر اسی حدیث کو پیش کرتے ہیں۔ لیکن جو کہتے ہیں کہ جادو سے کسی چیز کی حقیقت نہیں بدل سکتی ہے وہ اس حدیث کی دلیل اس طرح پیش کرتے ہیں کہ گدھا بنا دینے کا لفظ مجازی طور پر بیوقوف بنانے کے معنیٰ میں استعمال کیا گیا ہے۔ حدیث سے مراد یہودوں کا حقیقی طور گدھا بنانا نہیں بلکہ مجازی طور گدھا بنانا یعنی بیوقوف بنانا۔ گدھا سارے حیوانوں میں بے سمجھ اور بے سدھ حیوان سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے بے سمجھ اور بیوقوف انسان کے لیے کسی کو گدھے سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ (واللہ اعلم)

واضح رہے کہ اصل میں شعبدہ بازوں کی یہ تمام کارگزاریاں اور کارستانیاں محض جعلسازی اور چالبازی پر مبنی ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر جادوؤں اور منتروں کے ذریعے عملیات کرنے والے نفع و نقصان پہنچانے پر قدرت رکھتے جس کا وہ دعویٰ کرتے ہیں، اسی طرح ان کے لیے اگر ہوا میں اڑنا، غیب کی باتیں بتانا، دور دراز ممالک سے خبریں لانا، اسرار یعنی پوشیدہ باتوں سے پردہ ہٹانا، چوریاں معلوم کرنا اور لوگوں کو نفع و نقصان پہنچانا ممکن ہوتا تو یہ لوگ حکومتیں الٹا دینے، زمین میں مدفون خزانوں کو نکال لینے اور بادشاہوں کو قتل کر کے ان کی سلطنتوں پر قبضہ جمانے پر قادر ہوتے۔ تو کسی دِقّت کے بغیر وہ جسے چاہتے نقصان پہنچاتے اور بادشاہوں کو قتل کر کے یا انہیں اقتدار سے ہٹا کر ان کی سلطنتوں پر قبضہ کر لیتے اور یوں عوام کے سامنے دست دراز کرنے کی ذلت نہ اٹھاتے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی حالت دوسرے لوگوں کے مقابلے میں کمزور ہوتی ہے اور وہ دوسروں سے بڑھ کر لالچی اور دولت کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ اپنی تمام فنکاری کے باوجود ان پر دوسروں کی بہ نسبت زیادہ بدحالی اور تنگدستی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوجاتی ہے کہ انہیں کسی چیز کی قدرت حاصل نہیں ہوتی ہے اور ان کے تمام دعوے باطل اور جھوٹے ہوتے ہیں۔

انبیاء علیہم السّلام کے معجزات اور جادو کے درمیان فرق

انبیاء علیہم السّلام کے معجزات اور جادوگروں کے درمیان فرق یہ ہے کہ معجزات حقائق پر مبنی ہوتے ہیں اور ان کا ظاہر و باطن ایک ہوتا ہے۔ اگر ساری مخلوق ان معجزات کے مقابلے میں کوئی چیز پیش کرنے کے لیے ایڑھی چوٹی کا زور لگائے تو بھی وہ ناکام رہے گی۔ جس طرح حضرت موسیٰ کے معجزوں کے مقابلے میں فرعون کے جادوگروں کا پیش کیا ہوا جادو ناکام رہا۔ جادوگروں کی جادوگری خرق عادات، تخیلات و خیالات یعنی خیالی امور شعبدہ بازی اور چابک دستی پر مبنی ہوتی ہے۔ ان ہنروں کے ذریعے جادوگر لوگوں کے سامنے ایسی چیزیں پیش کرتے ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی ہے۔ جو لوگ ان جادوئی چیزوں پر اچھی طرح سے غور کرتے ہیں وہ اچھی طرح سے سمجھ سکتے ہیں کہ جادو صرف نظروں کا دھوکہ ہے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی ہے۔ جب کوئی شخص اس طرح کی خرق عادات اور تخیلات کی چیزیں سیکھتا ہے تو اس طرح کے کرتب دکھا سکتا ہے جو معمول سے ہٹ کر ہوتے ہیں۔ کرتب کے ذریعے کسی چیز کو ہاتھ میں رکھا جاتا ہے اور پھر مٹھی بند کرکے جب دوبارہ کھول دی جاتی ہے تو مٹھی میں رکھی ہوئی چیز غائب ہوتی ہے اور اسی طرح کی بہت سی حرکتیں کی جاتی ہیں۔ جن کو فریب کاری (Trick) سے عمل میں لایا جاتا ہے۔ جسے جادو کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ ساری حرکتیں بے بنیاد ہوتی ہیں اور یہ سارے کرتب بے معنیٰ ہوتے ہیں۔ لیکن معجزے ٹھوس شکل میں ہوتے ہیں جن میں ایکشن (Action) اور اثر کرنے کی طاقت ہوتی ہے اور یہ خدا کے عطا کیے ہوتے ہیں۔ جادو سے ظاہر ہونے والے تمام آثار طبیعی (جسمانی) اسباب کے ماتحت ہوتے ہیں۔ یہ اسباب جادوگر کے پاس پوشیدہ ہوتے ہیں جب کہ معجزوں میں طبیعی اسباب کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ یہ بلاواسطہ حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے۔ یہ بات قرآن سے ثابت ہے۔ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (الانفال:۱۷) ''کنکریوں کی مٹھی جو آپ نے پھینکی درحقیقت وہ اللہ نے پھینکی''

معجزات اور جادو کے متعلق مفسروں اور فقہا نے طویل بحثیں کی ہیں اور جادو اور جادو کرنے والوں کے لیے شرعی احکام بھی مفصل طور بیان کیے ہیں۔ یہاں ہم ان شرعی احکام کا مختصر جائزہ پیش کرتے ہیں:

جادو اور جادو کرنے والوں کے متعلق فقہا کا آپس میں اختلاف ہے۔ لیکن قریب قریب سب کا فتویٰ جادو کے خلاف ہے۔

* ایک حدیث عبداللہؓ سے منسوب ہے کہ انہوں نے فرمایا جو شخص کسی کاہن، نجومی یا کسی جادوگر کے پاس جاکر اس کی باتوں کی تصدیق کرے تو گویا اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی کتاب (قرآن مجید) یا شریعت کے ساتھ کفر کیا۔

* حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ حفصہؓ کی ایک لونڈی نے ان پر جادو کیا تو انہوں نے لونڈی کو قتل کرنے کا حکم دیا اور اسے قتل کیا گیا۔ یہ بات جب امیر المومنین حضرت عثمانؓ کو پہنچ گئی تو آپ نے اسے ناپسند فرمایا۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے اپنی ناپسندی کا اظہار صرف اس بنا پر کیا کہ لونڈی کو ان کی اجازت کے بغیر قتل کردیا گیا۔

* حضرت عمرؓ سے ایک روایت منسوب ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ جادوگر اور جادوگرنی کو قتل کردو۔

* حسن بصریؒ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا جادوگر کو قتل کردیا جائے اور اس کی توبہ تسلیم نہ کی جائے۔

* عمر بن شعیب سے روایت بیان کی گئی ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک جادوگر کو پکڑا اور اسے سینے تک زمین کے اندر دفن کردیا اور اسے اسی طرح رہنے دیا یہاں تک کہ وہ اسی حالت میں مرگیا۔

* اسود بن ہلال سے روایت بیان ہوئی ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ جو شخص کسی کاہن کے پاس جاکر اس کی باتوں کا یقین کرے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ شریعت سے بری ہوجائے گا۔

* ایک روایت (جسے زہری نے بیان کیا) یہ ہے کہ جادو کرنے والے کو قتل نہ کیا جائے کیونکہ جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا تھا آپؐ نے انہیں معاف کردیا تھا۔ لیکن اس روایت کے خلاف عمر بن عبدالعزیز خلیفہ سے مروی ہے کہ جادو گر کو قتل کردیا جائے۔

* ابوبکر جصاص کہتے ہیں کہ اکثر سلف ساحر کے قتل کے وجوب پر متفق ہیں ۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ سے روایت منسوب ہے کہ انہوں نے فرمایا اگر ساحر کے بارے میں پتہ چل جائے کہ وہ ساحر ہے تو اسے قتل کردیا جائے اور اس کی توبہ تسلیم نہ کی جائے۔ جب وہ اقرار کرلے کہ وہ جادوگر ہے تو اس کا خون حلال ہوجائے گا اور اگر دو گواہ اس کے خلاف گواہی دیں کہ وہ جادوگر ہے اور اس کی کیفیت اس طرح بیان کردیں جس سے معلوم ہوجائے کہ وہ جادوگر ہے تو اسے قتل کردیا جائے۔ اس کی توبہ تسلیم نہ کی جائے۔ لیکن اگر وہ اس بات کا اعتراف کرلے کہ وہ جادو کیا کرتا تھا لیکن کافی عرصہ پہلے اس نے یہ کام چھوڑ دیا ہے تو اس صورت میں اس کی توبہ قبول کرلی جائے اور اسے قتل نہ کیا جائے۔ اسی طرح اگر اس کے خلاف یہ گواہی دی جائے کہ وہ کبھی جادوگر تھا اور کافی عرصہ ہوا کہ اس نے یہ کام ترک کردیا ہے تو اسے قتل نہ کیا جائے۔ البتہ اگر گواہ یہ گواہی دیں کہ وہ ابھی تک جادو کرتا ہے اور وہ خود اس بات کا اعتراف کرلے تو اسے قتل کردیا جائے گا۔

* جادوگرنی کے متعلق ابو حنیفہؒ کا فتویٰ ہے کہ اگر عورت کے خلاف لوگ گواہی دیں کہ وہ جادوگرنی ہے یا وہ خود اس کا اعتراف کرلے تو اسے قتل نہیں کیا جائے۔ بلکہ اسے قید میں ڈال دیا جائے اور اس کی پٹائی کی جائے۔ یہاں تک کہ لوگوں کو یقین آجائے کہ اس نے یہ دھندا چھوڑ دیا ہے۔

* جادوگرنی کے متعلق امام شافعی کا قول یہ ہے کہ اگر اس نے اپنے جادو سے کسی کو قتل کردیا ہو تو پھر اسے قتل کردیا جائے۔

* امام مالک نے جادوگر کو زندیق کے درجے میں رکھا ہے اور اس کی توبہ اس طرح ناقابل قبول قرار دی جس طرح زندیق (زرتُشت کے مذہب اور کتاب کو ماننے والا) کی توبہ ناقابل قبول ہے۔

* جادوگر کو قتل نہ کرنے کی ایک روایت اس واقعہ کے پیش نظر بھی روایات میں وارد ہوئی ہے کہ جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا تھا انہیں اپنا جرم تسلیم کرنے کے باوجود آپؐ نے

قتل نہیں کیا اور نہ ان کو کوئی سزا دی بلکہ جرم تسلیم کرنے کے بعد ان کو چھوڑ دیا گیا۔ اس لیے جادوگر کو قتل کرنا یا کوئی اور طرح کی سزا دینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کے خلاف ہے۔

اس بات کی حمایت (Support) میں ایک اور واقعہ بطور دلیل پیش کیا گیا ہے کہ یہودیوں نے ایک بڑی سازش کے تحت آپ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا جس میں ایک یہودی عورت نے آپؐ کو دعوت پر بلایا اور بکری کا گوشت پیش کیا جس میں زہر ملایا گیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے سے ہاتھ اٹھایا اور خدا کے فضل وکرم سے بال بال بچ گئے۔ لیکن جو صحابی آپ کے ساتھ دعوت میں شریک تھے انہوں نے ایک دو لقمے کھائے تھے اور وہ شہید ہوگئے۔ اس معاملے میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں سے کوئی بدلہ نہ لیا۔ بلکہ معاف کردیا۔ اس لیے جو لوگ جادو گر کے قتل کرنے کے حکم کو ممنوع قرار دیتے ہیں۔ وہ ان واقعات کے پیش نظر ایسی باتیں کرتے ہیںاور کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جادوگروں سے اس لیے بدلہ نہ لیا کیوں کہ جادو کرنے سے ان پر کوئی اثر نہ پڑا تھا اور نہ آپ کو اسے کوئی نقصان پہنچا تھا۔ جیسا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جادو کے اثر سے آپ بے قرار ہوگئے تھے۔ ان لوگوں کے کہنے کے مطابق ایسا کہنا غلط ہے اور یہودی عورت کو کھانے میں زہر ملانے اور صحابی کے شہید ہونے کے بدلے میں اس لیے قتل نہیں کیا گیا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کو قتل کرنے کے قائل نہ تھے۔

اسلام میں جھاڑ پھونک کی حیثیت

معوذتین (الفلق اور الناس) کی دو سورتوں میں جادو کی حیثیت اور اصلیت بیان کرنے کے بعد جھاڑ پھونک کی حیثیت کا معاملہ سامنے آتا ہے کہ آیا جھاڑ پھونک اسلام میں جائز ہے یا نہیں اور یہ مؤثر (effective) ہے یا نہیں۔ اس سلسلے میں کئی احادیث بیان کی گئی ہیں۔

* صحیح احادیث میں یہ ذکر آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر رات کو سوتے وقت اور بیماری کی حالت میں تین مرتبہ معوذتین یعنی سورہ فلق اور الناس پڑھ کر اپنے دونوں ہاتھوں پر پھونکتے اور پھر پورے جسم پر جہاں جہاں تک ان کے ہاتھ پہنچتے پھیرتے تھے۔

* حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری

امت کے وہ لوگ بلا حساب جنت میں داخل ہوں گے جو نہ داغنے کا علاج کرتے ہیں نہ جھاڑ پھونک کراتے ہیں نہ فعال لیتے ہیں بلکہ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔ (مسلم)

* حضرت مغیرہ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے داغنے سے علاج کروایا اور جھاڑ پھونک کرائی وہ اللہ پر توکل سے بے تعلق ہوگیا۔

* حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دس چیزوں کو ناپسند فرماتے تھے جن میں سے ایک جھاڑ پھونک بھی ہے سوائے معوذتین جھاڑ پھونک کرنا آپ نے ناپسند فرمایا ہے۔ ... (ابو داؤد- احمد، نسائی)

* بعض احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جھاڑ پھونک سے منع فرمایا تھا۔ لیکن بعد میں اس شرط کے ساتھ اس کی اجازت دے دی کہ اس میں شرک نہ ہو۔ اللہ کے پاک ناموں یا اس کے کلام سے جھاڑا جائے، کلام ایسا ہو جو سمجھ آئے اور یہ معلوم ہوجائے کہ اس میں کوئی گناہ کی چیز نہیں ہے اور جھاڑ پھونک پر بھروسہ نہ کیا جائے کہ وہ بجائے خود شفا دینے والی ہے بلکہ اللہ پر اعتماد ہو کہ وہ چاہے گا تو اسے نافع بنادے گا۔

بہت سی روایات میں جھاڑ پھونک کو جائز قرار دیا گیا ہے

* طبرانی نے حضرت علیؓ کی روایت نقل کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک دفعہ نماز کی حالت میں بچھو نے کاٹا۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو نمک اور پانی منگوایا اور جہاں بچھو نے کاٹا تھا وہاں پر چہار قل (یعنی قل یا ایھا لکافرون، قل ھواللہ احد، قل اعوذبرب الفلق اور قل اعوذ برب الناس) پڑھتے ہوئے نمکین پانی مل لیا۔

* ابن عباس سے روایت منقول ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسنؓ اور حسینؓ پر یہ دعا پڑھتے تھے اُعِیذُکُمَا بِکَلِمَاتِ اللّٰہِ التَّامَّۃِ مِنْ کُلِّ شَیْطَانٍ وَّھَامَّۃٍ وَّمِنْ کُلِّ عَیْنٍ لَّآمَّۃٍ ''میں تم کو اللہ کے بے عیب کلمات میں دیتا ہوں ہر شیطان اور موذی سے اور نظر بد سے۔'' ... (البخاری)

* عثمان بن العاص سے یہ روایت منسوب ہے کہ انہوں نے کہا کہ مجھے ایک درد بہت تکلیف دیتا تھا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس درد کی شکایت کی تو آپؐ نے فرمایا اپنا سیدھا ہاتھ اس جگہ پر رکھو جہاں پر درد ہوتا ہے پھر تین دفعہ بسم اللہ پڑھو اور سات مرتبہ اَعوذ باللہ ِ و قدرتہٖ مِن شر ما اَجِدُ واُحاذِرُ

''میں اللہ اور اس کی قدرت کی پناہ مانگتا ہوں اس چیز کے شر سے جس کو میں محسوس کرتا ہوں اور جس کے لاحق ہونے کا مجھے خوف ہے، پڑھ کر ہاتھ پھیرو۔ (مسلم ، موطا، طَبرانی)

٭ مُسند احمد میں طَلَق بن علیؓ کی روایت ہے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں بچھو نے کاٹ لیا۔ حضور نے مجھ پر پڑھ کر پھونکا اور اس جگہ پر ہاتھ پھیرا۔

* مسلم میں ابو سعید خُدری کی روایت ہے ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوئے تو جبرئیل آئے اور کہا باسم اللہِ أَرقِیکَ مِنْ کُلِّ شَیئٍ یُؤذِیکَ مِنْ شَرِّ کُلِّ نَفْسٍ اَوعَیْنٍ حَاسِدٍ، اللہُ یَشْفِیکَ باسم اللہِ أَرقِیکَ ''میں اللہ کے نام پر آپ کو جھاڑتا ہوں ہر اس چیز سے جو آپ کو اذیت دے اور ہر نفس اور حاسد کی نظر کی شر سے اللہ آپ کو شفا دے۔ میں اس کے نام پر آپ کو جھاڑتا ہوں۔''

* مسلم میں عوف بن مالک کی روایت ہے کہ جاہلیت کے زمانے میں ہم لوگ جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس معاملہ میں رائے پوچھی تو آپؐ نے فرمایا جھاڑنے میں مضائقہ نہیں جب تک کہ اس میں شرک نہ ہو۔

* مسلم اور مُسند احمد میں حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس عمرو بن حزم کے خاندان کے لوگ آئے اور کہا کہ ہمارے پاس ایک عمل تھا جس سے ہم بچھو یا سانپ کاٹے کو جھاڑتے تھے مگر آپ نے اس کام سے منع فرمادیا پھر انہوں نے وہ چیز آپ کو سنائی جسے پڑھ کر وہ جھاڑتے تھے تو آپ نے فرمایا میں اس میں کوئی مضائقہ نہیں پاتا ہوں۔ اس لیے تم میں سے جو کوئی اپنے کسی بھائی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے وہ ضرور پہنچائے۔

* مسلم اور مُسند احمد میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک انصاری کے خاندان کو ہر زہریلے جانور کے کاٹے کو جھاڑنے کی اجازت فرمائی۔

* مُوطا میں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اپنی صاحبزادی حضرت عائشہؓ کے گھر تشریف لے گئے تو دیکھا کہ وہ بیمار ہیں اور ایک یہودیہ ان کو جھاڑ رہی ہے۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ کتاب اللہ پڑھ کر جھاڑ۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہل کتاب اگر تورات یا انجیل کی آیات پڑھ کر جھاڑیں تب بھی یہ جائز ہے لیکن قران کی آیات پڑھ کر جھاڑنا بہتر اور افضل ہے۔

جھاڑ پھونک کا جواز اور اس کے اثرات

کیا جھاڑ پھونک جائز ہے اور کیا یہ مؤثر (Effective) ہے یا نہیں، ان باتوں پر الجھنے کے بجائے قرآن مجید کی ہر آیت کو سمجھنا اور انسان کے لیے باعث شفا ہونے کا عقیدہ رکھنا بہتر ہے۔ کیونکہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے کئی جگہوں پر فرمایا ہے کہ اس میں انسانوں کے لیے شفا ہے۔ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إِلَّا خَسَارًا (سورہ بنی اسرائیل:۸۲) ''ہم اس قرآن کے سلسلہ نزیل میں وہ کچھ نازل کررہے ہیں جو ماننے والوں کے لیے تو شفا اور رحمت ہے، مگر ظالموں کے لیے خسارے کے سوا اور کسی چیز میں اضافہ نہیں کرتا'' اگرچہ اس آیت میں شفا سے اولین مراد روحانی شفا ہے یعنی کفر و نفاق، شکوک و شبہات اور جہالت جیسے روحانی بیماریوں کی شفا مراد ہے مگر اس کے احکام پر عمل کرنے سے انسان جسمانی بیماریوں سے بھی شفا پاتا ہے اور ان سے محفوظ رہتا ہے۔ جو شخص قرآن پاک کے فرمودات پر عمل کرے گا وہ اعتقادی اور اخلاقی بیماریوں سے محفوظ ہوجائے گا۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ یہ ان بیماریوں کے لیے شفا ہے جو لوگوں کے دلوں میں جاگزیں ہوتی ہیں۔ شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ (یونس:۵۷) اگرچہ یہاں پر ظاہری بیماریوں کا ذکر نہیں کیا گیا ہے تاہم بالطبع ایسا بھی ہوجاتا ہے کہ قرآن پاک کی کوئی آیت پڑھ کر پھونک ماردی جائے تو اللہ تعالیٰ ظاہری بیماری سے بھی شفا عطا کردیتا ہے۔ لیکن یہ قرآن کا موضوع نہیں ہے بلکہ ایک زائد چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن پاک کی برکت سے ظاہری بیماریوں کو بھی دور کردیتا ہے۔ ابن ماجہ کی روایت میں ہے عَلَيْكُمْ بِالشِّفَائَيْنِ ''یعنی اپنے اوپر دو شفاؤں کو لازم سمجھو'' یعنی دو چیزیں باعث شفا ہیں ایک شہد اور دوسری قرآن۔ مکھی کے پیٹ سے نکلنے والی شہد کے متعلق سورہ نحل میں ہے فِيهِ شِفَاءٌ لِّلنَّاسِ ''یعنی اس میں لوگوں کے لیے شفا ہے'' قرآن پاک کے لیے شفا کا لفظ کئی جگہوں پر آیا ہے مگر اس حدیث کا یہ مفہوم بتایا گیا ہے کہ شہد جسمانی بیماریوں کا علاج ہے اور قرآن پاک روحانی بیماریوں کا علاج ہے۔ (واللہ اعلم)

بہرحال قرآن پاک کو اللہ تعالیٰ نے شفا قرار دیا ہے۔ اس لیے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا ہے کہ وہ یہ فیصلہ کرے کہ قرآن صرف روحانی بیماریوں کے لیے شفا ہے اور جسمانی بیماریوں کے لیے نہیں اور نہ کوئی یہ کہنے کا مجاز ہے کہ قرآنی آیات پڑھ کر کسی پر پھونکنا ممنوع ہے اور نہ کسی کو یہ کہنے کا اختیار ہے کہ اگر کوئی جھاڑ پھونک کے بجائے طبی علاج کرائے وہ منکر حدیث ہے۔

قرآن و حدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی آیات پڑھ کر بیمار پر جھاڑ پھونک کی جائے یا اس کے لیے بیماری سے شفا پانے کے لیے اللہ سے دعا کی جائے اس میں کوئی شرک کی بات نہیں کیونکہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ اس لیے اس کلام کو پڑھ کر کسی پر دم کرنا یا بیمار کی شفا پانے کی دعا کرنا ممنوع قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ روایات سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جھاڑ پھونک کی اجازت دے دی ہے۔ رہا ان احادیث کا معاملہ، جن میں جھاڑ پھونک کو ممنوع قرار دیا گیا ہے ان کے پیش نظر اگر کوئی جھاڑ پھونک سے احتراض کرے تو یہ بھی کوئی خلاف سنت بات نہیں ہے۔ دونوں صورتوں کے متعلق جو احادیث پیش کی گئی ہیں ان کو زیر نظر رکھ کر ان مسائل میں الجھنا کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے اور ان باتوں میں الجھنے سے مسلمان اسلام کی خدمت اور حفاظت کرنے کے بجائے اسلامی اتحاد کو ہی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیماری کے لیے علاج معالجہ اور دوا دارُو سے منع نہیں فرمایا ہے۔ بلکہ فرمایا کہ اللہ نے ہر مرض کی دوا پیدا کی ہے۔ اس لیے تم لوگ بیماری سے نجات پانے کے لیے دوا کیا کرو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود لوگوں کو بعض امراض کے علاج بتادئے ہیں۔ جیسا کہ کتاب الطب سے معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس بات پر مکمل ایمان ہونا چاہیے کہ دوا بھی اللہ کے حکم اور اذن سے ہی نافع ہوتی ہے۔ ورنہ اگر دوا اور طبی علاج معالجہ ہر حال میں نافع ہوتا تو پھر ہسپتالوں میں زیر علاج بیماروں میں سے دوائی کھانے کے بعد کوئی نہ مرتا۔ اب اگر دوا اور علاج و معالجہ کے ساتھ اللہ کے کلام اور اس کے اسمائے حُسنٰی سے بھی استفادہ کیا جائے یا ایسی جگہ جہاں کوئی طبی امداد یعنی علاج و معالجہ اور دوا دارُو میسر نہ ہو اللہ کی طرف رجوع کرکے اس کے کلام اور اس کے اسماء وصفات سے مدد لی جائے تو یہ چیز مادہ پرستوں (Materialists) اور لادینوں (Athiests) کے بغیر کسی کی عقل کے خلاف نہیں ہے۔ البتہ یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ جہاں دوا اور علاج میسر ہو وہاں جان بوجھ کر اسے چھوڑ کر صرف جھاڑ پھونک پر انحصار کیا جائے اور علاج معالجہ کو چھوڑ کر چند عملیات اور تعویذوں کا پیشہ اختیار کرکے اسے کمائی کا ذریعہ بنایا جائے اور ہسپتالوں اور ڈاکٹروں کے کلینکس (Clinics) کی طرح جھاڑ پھونک اور تعویز و تبرکات کے اڈے قائم کردئے جائیں اسلام میں یہ قطعاً جائز نہیں ہے۔

جھاڑ پھونک کرکے معاوضہ لینے کے معاملہ میں بہت سے لوگ حضرت ابو سعید خُدری کی اس روایت سے استدلال کرتے ہیں جو بخاری، مسلم، ترمذی، مُسند احمد، ابوداؤد اور ابن ماجہ میں منقول ہے۔ بخاری میں ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مہم پر اپنے چند اصحاب کو بھیجا جن میں ابو سعید خُدری بھی تھے۔ یہ حضرات راستے میں عرب کے ایک قبیلے کی بستی پر جاکر ٹھہر گئے قبیلے کے ایک سردار کو بچھو نے کاٹ لیا۔ قبیلے کے لوگ ان مسافروں کے پاس آئے اور ان سے اپنے سردار کو علاج کرنے کی درخواست کی۔ ابو سعید خُدری نے جاکر اس سردار پر سورہ فاتحہ پڑھی جس سے بچھو کا اثر زائل ہوگیا تو قبیلے والوں نے ان کو بکریوں کا ایک ریوڑ دیا جس میں بعض روایات کے مطابق تیس بکریاں تھیں۔ جب یہ لوگ مہم سے واپس آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے اپنا ماجرہ سنایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بکریاں لے لو اور اس میں میرا حصہ بھی لگا لو۔

لیکن اس حدیث سے تعویز گنڈے اور جھاڑ پھونک کا پیشہ اختیار کرنے کا جواز نکالنے والوں کو پہلے عرب کے اُن حالات کو نگاہ میں رکھنا چاہیے جن میں مہم پر گئے ہوئے اصحاب نے یہ کام کیا۔ جسے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف جائز قرار دیا بلکہ آپ کا حصہ لگانے کے لیے بھی فرمایا۔ آپ کا حصہ لگانے کا مقصد یہ تھا کہ اصحاب کی حوصلہ افزائی ہوجائے اور ان کے دلوں میں کسی قسم کا شُبہ نہ رہ جائے۔ اُس زمانے میں عرب کے حالات یہ تھے کہ سینکڑوں میل کی دوری تک آدمی کو ایک بستی سے چل کر دوسری بستی نہیں ملتی۔ بستیاں بھی اس وقت ایسی ہوتی تھیں جن میں ہوٹل، سرائے یا کھانے پینے کی دکانیں موجود نہ ہوتی تھیں جہاں مسافر کئی کئی روز تک مصافت طے کرکے پہنچ کر خوردونوش کی چیزیں خرید سکتے۔ ان حالات میں یہ بات عرب کے معروف اخلاقی اصول میں شامل تھی کہ مسافر جب کسی بستی پر پہنچیں تو بستی کے لوگ ان کی میزبانی کریں۔ کیونکہ میزبانی نہ کرنے کے طرز عمل کو عرب کے لوگ معیوب سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے اس جھاڑ پھونک کے عمل کو نہ صرف جائز قرار دیا بلکہ اس کا معاوضہ لینے کو بھی حلال قرار دیا۔ لیکن صحابہ کے عمل کا یہ واقعہ ان لوگوں کے لیے مثال نہیں بن سکتی ہے کہ جو لوگ شہروں اور قصبوں میں بیٹھ کر جھاڑ پھونک کا کاروبار چلاتے ہیں اور جسے انہوں نے اپنے معاش کا وسیلہ بنا رکھا ہے اور نہ اس کی مثال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ و تابعین اور ائمۂ سلف کے ہاں ملتی ہے۔ اس لیے اس بات پر تمام علمائے اسلام کا اتفاق ہے کہ قرآن مجید انسانوں کی ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے۔ اگرچہ اس کلام میں خیر و برکت اور شفا ہے تاہم یہ جھاڑ پھونک اور تعویز نوسیی کے لیے نہیں اترا ہے۔

معوذتین (سورۃ الفلق اور سورۃ الناس) کی سورہ فاتحہ سے مناسبت

ان دونوں سورتوں کے بارے میں قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان کو سورہ فاتحہ سے مناسبت ہے۔ یعنی قرآن کے آغاز اور اختتام کی ایک دوسرے سے نسبت ہے۔ اگرچہ کہ قرآن کی ترتیب نزول قرآن کے مطابق نہیں ہے بلکہ ۲۳ سال کے دوران مختلف حالات اور مواقع اور ضروریات کے لحاظ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کے حکم سے اسے جس طرح مرتب فرمایا بالکل اسی طرح آج ہمارے پاس کتابی شکل میں موجود ہے۔ اس ترتیب کے لحاظ سے قرآن کا آغاز سورہ فاتحہ سے ہوتا ہے اور اختتام معوذتین (سورۃ الفلق اور سورۃ الناس) پر۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آغاز قرآن یعنی سورہ فاتحہ میں اللہ رب العالمین، رحمٰن و رحیم، مالک یوم الدین کی حمد وثنا کرکے بندہ عرض کرتا ہے کہ آپ ہی کی میں بندگی کرتا ہوں اور آپ ہی سے مدد چاہتا ہوں اور آپ ہی سے صراط المستقیم یعنی سیدھی راہ دکھانے کی درخواست کرتا ہوں۔ جواب میں اللہ تعالیٰ پورا قرآن پیش کرتا ہے۔ جس کا اختتام اس بات پر کیا گیا ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے جو رب الفلق، ربُ النّاس، ملکُ الناس اور الٰہ الناس ہے عرض کرتا ہے کہ میں ہر مخلوق کے فتنے اور شر سے محفوظ رہنے کے لیے آپ ہی کی پناہ لیتا ہوں اور خاص طور شیاطین جن و انس کے وسوسوں سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں کیونکہ راہ راست کی پیروی میں وہی سب سے زیادہ مانع ہوتے ہیں۔ قرآن کے اس آغاز کے ساتھ یہ اختتام جو مناسبت رکھتا ہے وہ قابل غور ہے اور یہ کہنا مناسب ہے کہ سورۃ الفاتحہ وہ دعا ہے جو بندہ اپنے رب سے مانگتا ہے اور پورا قرآن مجید اس کی دعا کا جواب ہے۔ اس لیے جو بندہ اس جواب دعا کو سمجھتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے وہ دنیا میں کامیاب ہوکر اللہ کی نعمت پاتا ہے اور جنت کا حق دار بن جاتا ہے اور جو اس سے محروم رہتا ہے وہ اللہ کی نعمتوں سے بھی محروم رہتا ہے، وہ آخرت میں جنت کی نعمت سے بھی محروم رہے گا اور اس کے لیے جہنم کے سوا کوئی جائے پناہ نہ ہوگی۔

سورہ فلق

اٰیاتُھا:۵ رکوعھا:۱

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

قُلۡ أَعُوذُ بِرَبِّ ٱلۡفَلَقِ(١)

کہو میں پناہ مانگتا ہوں صبح کے رب کی

مِن شَرِّ مَا خَلَقَ(٢)

ہر اُس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی ہے

وَمِن شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ(٣)

اور رات کی تاریکی کے شر سے جب کہ وہ چھا جائے

وَمِن شَرِّ ٱلنَّفَّٰثَٰتِ فِي ٱلۡعُقَدِ(٤)

اور گرہوں میں پھونکنے والوں کے شر سے

وَمِن شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ(٥)

اور حاسد کے شر سے جب کہ وہ حسد کرے

لہو میں پناہ مانگتا ہوں صبح کے رب کی

قل (کہو) کا لفظ اللہ کے کلام اور تبلیغ قرآن کا ہی حصہ ہے۔ اگرچہ اس کا مخاطَب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں لیکن آپ سے مخاطِب ہوکر لفظ قل یعنی کہو فرماکر اللہ تعالیٰ ساری انسانیت کو خطاب فرمارہے ہیں کہ انسان کو خطرات اور مشکلات کے وقت اللہ کی پناہ میں آنا چاہیے۔ ایک قسم کی پناہ وہ ہے جو قوانین طبعی کے مطابق کسی چیز یا انسان سے لی جائے۔ جب انسان کسی چیز کا خوف کھاتا ہے اور جان کا خطرہ محسوس کرتا ہے تو وہ فوراً مدد کے لیے اور اپنے آپ کو بچانے کے لیے کسی جگہ یا کسی انسان کی پناہ میں آنے کی کوشش کرتا ہے۔ مثلاً اگر اسے کسی دشمن یا کسی موذی جانور سے واسطہ پڑتا ہے تو وہ اپنے آپ کو بچانے کے لیے کسی بھی طرح کی پناہ ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے۔ تاکہ اسے کسی طرح کا نقصان نہ پہنچے اور اس کی جان بچ جائے۔ خطرے کے وقت وہ ہر طرف دیکھ کر جہاں بھی اسے بچنے کی صورت نظر آتی وہاں وہ پناہ لینے کے لیے دوڑتا ہے۔ اس کے برعکس اخلاقی خرابیوں اور برائیوں اور نقصان پہنچانے والی چیزوں سے کسی فوق الفطرت یا فوق العادات ہستی سے اس بنا پر پناہ مانگی جاتی ہے کہ وہ تمام مخلوق کو پیدا کرنے والی ذات ہے اور اسی کے اختیار (Control) میں ہر ایک مخلوق ہے۔ وہ ذات عظیم ہر اس شخص کی ضرور حفاظت کرتی ہے جو اس کی پناہ میں آتا ہے بشرطیکہ اسے اس قوت عظیم کی پناہ میں آنے کا راسخ عقیدہ ہو۔ قرآن و حدیث میں پناہ مانگنے کا جو ذکر ہے ،اُس سے یہی پناہ مراد ہے۔ پناہ مانگنے کے لیے ضروری ہے کہ پناہ اس سے مانگی جائے جو پناہ دینے کی طاقت رکھتا ہو اور جو پناہ لینے والے کو ہر طرح کے خطرے سے محفوظ رکھنے کی صلاحیت اور طاقت رکھتا ہو اور پناہ لینے والے کو بھی پناہ دینے والے کی قدرت اور حفاظت پر پورا اطمینان اور بھروسہ ہونا چاہیے اور اسے یقین کامل ہونا چاہیے کہ اس کے بغیر اسے کوئی پناہ میں نہیں لے سکتا ہے اور پھر اس عقیدۂ توحید کے ساتھ جب پناہ مانگنے والا اللہ سے پناہ مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایسے بندے کو اپنی تحویل اور حفاظت میں لے کر ہر قسم کی مصیبت اور خطرات سے بچانے کی ذمہ داری لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے سے پناہ مانگنا شرک ہے۔ شرک ایک بڑا ظلم ہے اور جو شرک کرتا ہے وہ اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے۔ مشرکین اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسروں سے پناہ مانگتے ہیں۔ اپنے زعم کے مطابق یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر دیوی دیوتاؤں، جنوں، فرشتوں یا پیروں پیغمبروں کی پناہ لیتے ہیں اور ان سے مدد مانگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ تمام خطرات سے بچنے کے لیے میری پناہ لو۔ کیونکہ تمام خطرات سے میں ہی تمہیں بچا سکتا ہوں۔ مادہ پرست لوگ مادی ذرائع و مسائل ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ کسی

فوق الفطری، غیبی طاقت کے قائل نہیں ہوتے ہیں۔ لیکن مومن تمام آفات اور بلیات کے مقابلے میں صرف اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے اور اسی سے پناہ مانگتا ہے۔ جس مصیبت، تکلیف یا پریشانی کو وہ اللہ کے عطا کردہ وسائل سے خود حل کرسکتا ہے، اسے اللہ کی توفیق سے حل کرلیتا ہے۔ اور جو چیز اس کی طاقت سے باہر ہوتی ہے اس کے لیے صرف اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے اور اسی کی پناہ میں آجاتا ہے۔ مشرکین کے متعلق قرآن میں بیان کیا گیا ہے۔ وَأَنَّهُ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْإِنسِ يَعُوذُونَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوهُمْ رَهَقًا (سورہ جن:٦) ''اور یہ کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں کچھ لوگوں کی پناہ مانگا کرتے تھے''۔

مشرکین عرب کو جب رات کسی سنسان وادی میں گزارنی پڑتی تو وہ پکار کر کہتے ہم اس وادی کے رب یعنی اس جن کی جو اس وادی کا حکمران ہے پناہ مانگتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس قرآن میں خدا پرستوں کا رویہ اس طرح بیان ہوا ہے کہ جس چیز کا بھی وہ خوف محسوس کرتے ہیں خواہ وہ مادی ہو، اخلاقی ہو، یا روحانی، اس کے شر سے بچنے کے لیے وہ خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔ حضرت مریمؑ کے متعلق بیان ہوا ہے کہ جب اچانک تنہائی میں خدا کا فرشتہ ایک مرد کی شکل میں ان کے سامنے آیا تو انہوں نے کہا اعوذ برحمٰن قَالَتۡ اِنِّیۡۤ اَعُوۡذُ بِالرَّحۡمٰنِ مِنۡکَ اِنۡ کُنۡتَ تَقِیًّا o (سورہ مریم:۱۸) ''اگر تو خدا سے ڈرنے والا آدمی ہے تو میں تجھ سے خدائے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں''۔ حضرت نوح علیہ السّلام نے جب اپنے نافرمان بیٹے کو طوفان سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے التجا کی اے میرے رب ! بے شک میرا بیٹا میرے گھر والوں سے ہے اور بے شک تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے ''۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کی پکار رد کردی اور فرمایا ''اے نوح بے شک وہ تیرے گھر والوں سے نہیں بے شک یہ ایسا کام ہے جو اچھا نہیں پس مجھ سے اس بات کا سوال نہ کر جس کا تجھے کچھ علم نہیں''۔ جواب میں جب اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح کو تنبیہ کی کہ مجھ سے ایسا سوال نہ کر جس کا تجھے علم نہیں تو وہ فوراً اللہ کی پناہ میں آگئے اور کہا قَالَ رَبِّ اِنِّیۡۤ اَعُوۡذُ بِکَ اَنۡ اَسۡـَٔلَکَ مَا لَیۡسَ لِیۡ بِہٖ عِلۡمٌ ؕ وَ اِلَّا تَغۡفِرۡ لِیۡ وَ تَرۡحَمۡنِیۡۤ اَکُنۡ مِّنَ الۡخٰسِرِیۡنَ o (ہود:۴۷) ''اے میرے رب میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ میں تجھ سے ایسی چیز کی درخواست کروں جس کا مجھے علم نہیں ہے۔ حضرت موسٰی نے جب بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا اور انہوں نے کہا کہ آپ ہم سے مذاق کرتے ہیں تو انہوں نے جواب میں فرمایا ... اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ اَنۡ اَکُوۡنَ مِنَ الۡجٰہِلِیۡنَ o (البقرۃ:٦٧) ''میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ جاہلوں کی سی باتیں کروں''

تعَوذات کی یہ شان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں کثرت سے دکھائی دیتی ہے۔

* حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعاؤں میں یہ فرمایا کرتے تھے ''خدایا میں تیری پناہ مانگتا ہوں ان کاموں کے شر سے جو میں نے کیے اور ان کاموں کے شر سے جو میں نے نہیں کیے۔ (مسلم)

* ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں سے ایک یہ بھی تھی ''خدایا میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ تیری جو نعمت مجھے حاصل ہے وہ چھن جائے اور میں پناہ مانگتا ہوں تیری ہر طرح کی ناراضی سے'' (مسلم)

* زید بن ارقم کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے ''خدایا میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس علم سے جو نافع نہ ہو، اس دل سے جو تیرا خوف نہ کرے، اس نفس سے جو کبھی سیر نہ ہو اور اس دعا سے جو قبول نہ ہوجائے'' (مسلم)

* حضرت ابو ھریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے ''خدایا میں تیری پناہ مانگتا ہوں بھوک سے کیونکہ وہ بدترین چیز ہے جس کے ساتھ کوئی رات گزارے اور پناہ مانگتا ہوں خیانت سے کیونکہ وہ بدباطنی ہے''۔ (ابوداؤد)

* حضرت اَنسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے ''خدایا میں تیری پناہ مانگتا ہوں کوڑھ اور جنون سے اور جزام اور تمام بری بیماریوں سے'' (ابوداؤد)

* حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کلمات کے ساتھ دعا مانگا کرتے تھے ''خدایا میں تیری پناہ مانگتا ہوں آگ کے فتنے سے اور مالداروں اور مفلسی کے شر سے'' (ترمذی، ابوداؤد)

* قُطبہ بن مالک کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''خدایا میں برے اخلاق اور برے اعمال اور بری خواہشات سے تیری پناہ مانگتا ہوں'' (ترمذی، ابوداؤد)

* انس بن مالک کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے ''خدایا میں تیری پناہ مانگتا ہوں عاجزی اور سستی اور بزدلی اور بڑھاپے اور بخل سے اور تیری پناہ مانگتا ہوں قبر کے عذاب اور زندگی وموت کے فتنے سے اور قرض کے بوجھ سے اور اس بات سے کہ لوگ مجھ پر غالب ہوں۔''

(بخاری، مسلم)

* خَوْلَہ بنت سُلَیمہ کی روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ جو شخص کسی نئی منزل پر اترے اور یہ الفاظ کہے کہ ''میں اللہ کے بے عیب کلمات کی پناہ مانگتا ہوں مخلوقات کے شر سے تو اسے کوئی چیز نقصان نہ پہنچائے گی یہاں تک کہ وہ اس منزل سے کوچ کرجائے۔''

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چند تعوذات (اللہ سے پناہ مانگنے کی دعائیں) ہیجن سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کا کام ہر خطرے اور شر سے خدا کی پناہ مانگنا ہے اسے اللہ کے سوا کسی اور کی پناہ نہیں مانگنی چاہیے اور نہ اسے خدا سے بے نیاز ہوکر اپنے آپ پر بھروسہ کرنا چاہیے کہ میں خود کسی شر یا مصیبت سے نجات پاسکوں مجھے خدا سے پناہ لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ انسان کو جس ہستی نے پیدا کیا ہے مصیبت کے وقت اسے اسی ہستی سے پناہ کی درخواست کرنی چاہیے۔

فلق کے اصلی معنیٰ پھاڑنے کے ہیں۔ مفسرین کی اکثریت نے اس سے رات کی تاریکی کو پھاڑ کر صبح نکالنا یعنی رات سے دن نکالنا مراد لیا ہے۔ کیونکہ عربی میں فلق الصبح کا لفظ طلوع صبح کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے اور قرآن میں بھی فَالق الاصباح یعنی تاریکی کو پھاڑ کر صبح نکالنے والا کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں: إِنَّ اللہَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوَی یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَیِّتِ مِنَ الْحَیِّ ذَلِکُمُ اللہُ فَأَنَّیٰ تُؤْفَکُونَo فَالِقُ الإِصْبَاحِ وَجَعَلَ اللَّیْلَ سَکَناً وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَاناً ذَلِکَ تَقْدِیرُ الْعَزِیزِ الْعَلِیمِo (سورہ انعام:۹۵، ۹۶) ''بے شک اللہ دانے اور گھٹلیوں کو پھاڑنے والا ہے وہ زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالنے والا ہے۔ یہ سارے کام کرنے والا تو اللہ ہے، پھر تم کدھر بہکے چلے جارہے ہو؟ پردۂ شب کو چاک کرکے وہی صبح نکالتا ہے... کئی مفسرین نے فلق کے لفظ کو خلق کے معنی میں لیا ہے اور اس معنی کے لحاظ سے فلق سے مخلوق مراد ہے کیونکہ دنیا میں جتنی چیزیں پیدا ہوتی ہیں وہ کسی نہ کسی چیز کو پھاڑ کر نکلتی ہیں۔ یعنی تمام مخلوقات ایک قدرتی عمل (Natural process) سے وجود میں آتی ہیں۔ مثلاً تمام نباتات زمین کو پھاڑ کر نکلتی ہیں اور تمام حیوانات یا رحم مادر سے برآمد ہوتے ہیں یا انڈا توڑ کر نکلتے ہیں اور وہ حیوانات جو باریک سے باریک تر نہ دکھائی دینے والے (Invisible micro bacteria) ہیں، بھی ایک دوسرے کو جنم دیتے ہیں۔ تمام چشمے زمین پھاڑ کر ہی وجود میں آتے ہیں۔ دن رات کا پردہ چاک کرکے نمودار ہوتا ہے۔ بارش کے قطرے بھی بادلوں کو پھاڑ کر باہر آتے ہیں۔ الغرض زمین پر موجود ہر کوئی چیز کسی نہ کسی طرح کے انشقاق (ٹوٹ کر الگ ہونے) کے نتیجے میں عدم سے وجود پاتی ہے۔ سائنس کے مطابق زمین اور سارے آسمان بھی اکٹھے ملے ہوئے تھے پھر ایک دھماکہ جسے Bigbang کہتے ہیں سے زمین اور دوسرے اجرام فلکی الگ الگ ہوگئے۔ قرآن بھی اس کی تصدیق کرتا ہے۔ أَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوا أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضَ کَانَتَا رَتْقاً فَفَتَقْنَاھُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ کُلَّ شَیْئٍ حَیٍّ أَفَلَا یُؤْمِنُونَo (سورہ انبیا:۳۰) ''اور کیا جن لوگوں نے کفر کیا یہ نہیں دیکھا کہ بے شک سارے آسمان اور زمین آپس میں ملے ہوئے تھے تو ہم نے انہیں پھاڑ کر الگ کیا''۔ اس لحاظ سے فلق کا معنی پھاڑ کر الگ ہونا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ جو رات سے دن کو پھاڑ کر نکالنے والا ہے، کی میں پناہ مانگتا ہوں۔ فلق کو اگر اس معنی میں لیا جائے کہ کائینات کی ساری موجود چیزیں پھاڑ کر پیدا کی گئی ہیں۔ تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اس رب کی پناہ میں آتا ہوں جس نے کائینات کی ساری چیزیں پھاڑ کر پیدا کی ہیں۔ الغرض رب الفلق سے اگر طلوع صبح یا رات سے دن پھاڑنے والا رب مراد لیا جائے تو اس کی پناہ

لینے کے معنی یہ ہوں گے کہ جو رب تاریکی سے صبح روشن کرتا ہے یا اندھیری رات سے روشن دن نکالتا ہے میں اسی کی پناہ لیتا ہوں تاکہ اندھیرے سے نکل کر روشنی یعنی خدا کے نور سے اپنے دل کو منور کرکے خدا کی بندگی کرسکوں اور شرک والحاد کی غلاظت و گندگی سے نجات پاسکوں۔ اگر اس سے رب خلق یعنی تمام مخلوقات کوپیدا کرنے والے رب کے معنی میں لیا جائے تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں ساری مخلوقات کےپیدا کرنے والے اور ذرے ذرے پر نظر اور کنٹرول رکھنے والے رب العالمین کی پناہ میں آتا ہوں تاکہ وہ خالق کائینات جو ہر چھوٹے بڑے، ظاہر اور باطن شئے پر قدرت رکھنے والا ہے، مجھے ہر مخلوق کی شر سے محفوظ رکھے۔

(پناہ مانگتا ہوں) ہر اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی ہے

چونکہ ہر چیز کو اللہ تعالیٰ نے ہی پیدا کیا ہے اور وہی ان کی حفاظت کرنے والا ہے۔ اس لیے مخلوقات کی پیدائش کی نسبت رب العالمین سے ہے اور شر کی نسبت مخلوقات کی طرف بیان ہوئی ہے۔ کیونکہ اللہ نے ان مخلوقات کو پیدا کیا ہے۔ اس لیے ان کے شر سے پناہ لینے کے لائق وہی ہے۔ چونکہ سب مخلوقات اللہ کی ہی پیدا کردہ ہیں اور وہی ہر ایک مخلوق پر غالب ہے اور وہی ہر چیز کے شر کو جانتا ہے اور وہی یہ علم رکھتا ہے کہ کس چیز میں کس انسان کے لیے خیر یا شر ہے۔ اس لیے جب انسان خالق کلِّ شَیۡئٍ کی پناہ میں آجائے گا وہ ہر چیز کے شر سے محفوظ رہے گا۔ خواہ اسے وہ شر معلوم ہو یا نہیں۔ اس طرح وہ اللہ کی ساری مخلوقات کے شر سے اور اپنے نفس کے شرور سے محفوظ رہے گا۔

دوسری بات یہ ہے کہ انسان کا غم، تکلیف، نقصان، بیماری، بھوک، حادثات اور مصیبتیں وغیرہ سب ایسی حالتیں ہیں جن میں انسانی نفس کے لیے شر یعنی ناگواری ہے اور اس کے علاہ کفر، شرک، ظلم، بے راہ روی اور بے حیائی، لوٹ مار اور قتل وغارت، غیبت، نفاق اور بدکاری وزناکاری جیسی برائیاں ایسے افعال ہیں جن میں انسانی زندگی کے لیے شرانگیزی ہے۔ اس لیے ان تمام چیزوں کے شرور سے اللہ کی پناہ میں آنے کے سوا انسان کو کوئی چارہ نہیں ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے تاکید فرمائی کہ چونکہ صرف اللہ ہی چارہ ساز اور چارہ پرداز ہے۔ اسی کی پناہ میں آجاؤ اور اسی سے ہر چیز کے شر سے پناہ مانگو۔ کیونکہ وہی ایک طاقت ہے جس کی پناہ میں آنے سے انسان اپنے نفس اور ہر چیز کے شر سے نجات پاسکتا ہے۔

اور (میں پناہ مانگتا ہوں) رات کی تاریکی کے شر سے جب کہ وہ چھا جائے

رات کی تاریکی چونکہ فطرتاً خوفناک اور وحشت انگیز ہوتی ہے۔ پھر اس میں نادیدہ اور نامعلوم خطرات کا اندیشہ بھی رہتا ہے۔ کوئی درندہ حملہ آور نہ ہوجائے۔ کوئی قاتل و رہزن گھر میں گھس نہ آئے۔ کوئی دشمن رات کے اندھیرے میں موقعہ پاکر حملہ نہ کرے۔ کوئی زہریلا کیڑا یا سانپ، بچھو وغیرہ ڈھس نہ لے۔ جرائم اور مظالم کے اکثر واقعات رات کے وقت ہی پیش آتے ہیں۔ وحشی جانور بھی رات کو ہی نکلتے ہیں۔ نزول قرآن کے زمانے میں عرب کی راتیں بہت خوفناک ہوتی تھیں۔ کیونکہ رات کے اندھیرے میں چھاپہ مار لٹیرے بستیوں پر غارت گری کے لیے ٹوٹ پڑتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن اور ان کے خون کےپیاسے بھی آپ کے خلاف اپنے ناپاک ارادوں اور سازشوں کے جھال زیادہ تر رات کو ہی بچھاتے تھے۔اس کے علاوہ شیطانی وساوس اور برے خیالات انسانی احساسات اور شرافت کا گلہ رات میں ہی گھونٹ دیتے ہیں۔ ان وجوہات کی بنا پر رات کی تاریکی سے پناہ مانگنے کی تاکید کی گئی ہے اور رات کی تاریکی کے خطرات کےپیش نظر ہی شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے اِنَّ الشَّمْسَ اِذَا غَرَبَتْ اَنْتَشَرَ شَیَاطِیْنَ۔ ''جب سورج غروب ہوجائے تو شیاطین ہر طرف پھیل جاتے ہیں''۔ لہٰذا اپنے بچوں کو گھروں میں سمیٹ لو اور اپنے جانوروں کو باندھ رکھو جب تک رات کی تاریکی ختم نہ ہوجائے۔ انسان کو ہمیشہ گناہوں کے اندھیرے میں بھٹکنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لیے اسے ان گناہوں کے اندھیرے سے نجات پانے کے لیے اللہ کی پناہ درکار ہے۔ جو اسے خدا کے بغیر کوئی نہیں دے سکتا ہے۔

اور (میں پناہ مانگتا ہوں) پھونکنے والوں یا پھونکنے والیوں کے شر سے

نفسات فی العقد (پھونکے والوں) سے مراد وہ جادو گر ہیں جو جادو پھونک کر انسانوں کے حواس، احساسات، اعصاب اور دلوں کو متاثر کرکے تکلیف پہنچاتے ہیں۔ یہ اپنے جادو کی ہنر سے لوگوں کو اس طرح مسحور کرتے ہیں کہ ان کی دکھائی گئی چیزیں انہیں الٹی پلٹی دکھائی دیتی ہیں۔ وہ کسی ڈورے یا رومال میں گرہیں لگاتے ہیں اور اس میں کچھ پڑھ کر پھونکتے ہیں اور اس عمل کو یہ لوگ جادو کا نام دیتے ہیں۔ جادو سے چیزوں کی فطرت و طبعیت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ہے اور نہ کسی چیز کی ہئیت اور حقیقت بدل جاتی ہے، البتہ حواس اور احساسات میں تبدیلی آکر دیکھنے والوں کو جادوگروں کے ہنر سے چیزیں اس طرح کی دکھائی دیتی ہیں جس طرح جادو گر چاہتا ہے۔ یہ وہ سحر ہے جس کی تصویر کشی قران کریم نے موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں کی ہے۔ ...(سورہ طٰہٰ:٦٥) جب انہوں نے اپنی لاٹھیاں اور رسیاں پھینکیں تو ان کے جادو کی وجہ سے وہ دوڑتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ حضرت موسیٰ نے اپنی دل میں ایک خوف محسوس کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے موسٰی خوف نہ کر یقینا آپ ہی غالب رہیں گے۔ سورہ اعراف میں ارشاد فرمایا کہ: وَأَوْحَيْنَا إِلَى مُوسَى أَنْ أَلْقِ عَصَاكَ فَإِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُونَ o (اعراف:١١٧) ''اور ہم نے موسٰی کی طرف وحی کی کہ اپنی لاٹھی پھینک تو اچانک وہ ان چیزوں کو نگلنے لگی جو وہ جھوٹ موٹ بنا رہے تھے''۔

جادوگروں کی رسیاں حقیقت میں سانپ نہیں بن گئی تھیں بلکہ ان کی پھینکی ہوئی رسیاں اور لاٹھیاں حضرت موسیٰ کو دوڑتے ہوئے سانپ محسوس ہونے لگیں اور اس نے اپنے دل میں خوف محسوس کیا اور یہ خوف اس وقت دور ہوا جب اللہ تبارک و تعالیٰ نے انہیں تسلی دی کہ تم ڈرو مت تم ہی ان پر غالب آؤ گے۔ پھر حقیقت اس وقت سامنے آئی کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے اپنی لاٹھی پھینکی تو وہ اصلی سانپ بن گئی اور اس نے جادوگروں کی رسیوں اور لاٹھیوں سے بنے ہوئے نقلی سانپوں کو نگل ڈالا۔ یعنی جو رسیاں اور لاٹھیاں لوگوں کو دوڑتے ہوئے سانپ دکھائی دے رہی تھی ان کو اصلی سانپ نے نگل ڈالا۔ جسے اللہ تعالیٰ نے معجزاتی طور پر موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی سے پیدا کیا تھا۔ ان کے اثر سے لوگوں میں ایسے احساسات رونما ہوتے ہیں جس کے باعث وہ ڈرتے ہیں۔ انہیں تکلیف ہوتی ہے اور ان کا رخ اس طرف جاتا ہے جس طرف جادوگر انہیں موڑنا چاہتا ہے۔ جادو دراصل ایک نفسیاتی اثر (Psychological effect) ہے جو انسان کو متاثر کردیتا ہے۔

جادو کی حقیقت کو ہمیں بس اس حد تک سمجھنا چاہیے کہ یہ ایک شر ہے جسے بچنے کے لیے اللہ سے پناہ مانگنی چاہیے اور اُس کی حفاظت میں آنا چاہیے تاکہ جادو اور جادوگروں کے ناپاک ارادوں سے نجات مل سکے۔ گزشتہ صفحات میں لبید بن اعصم نامی یہودی جادوگر کا واقعہ بہ تفصیل بیان ہوا ہے۔ روایت کے مطابق اس کے اثر سے آپ کو خیال ہوتا تھا کہ آپ نے فلاں کام کرلیا ہے حالانکہ نہ کیا ہوتا۔ یہاں تک کہ آپ کو دھیان نہیں رہتا تھا کہ آپ اپنی فلاں بیوی کے پاس گئے ہیں یا نہیں پھر معوذتین (سورۃ الفلق اور سورۃ الناس) نازل ہوئیں تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کئے گئے جادو کو دور کیا جائے۔ آپ کو خواب میں دکھایا گیا کہ آپ پر جادو کیا گیا ہے۔ جسے گرہیں باندھ کر کپڑے کے ٹکرے میں گانٹھ دے کر ایک کنوے میں پتھر کے نیچے دبادیا گیا ہے اور جب یہ دونوں سورتیں پڑھی گئیں تو گرہیں کھل گئیں اور جادو کے برے اثرات آپؐ سے دور ہوگئے۔ واللہ العلم۔ جادو کی حقیقت تسلیم نہ کرنے والے چند مفسرین نے نفاسات فی العقد کا ایک اور مفہوم بیان کیا ہے۔ وہ یہ کہ اس سے مراد عورتوں کی مکاری اور مردوں کی شہوت پرستی ہے۔ جس سے وہ ایک دوسرے پر جادوئی اثر ڈالتے ہیں۔ مرد عورتوں کی محبت میں گرفتار ہوجاتے ہیں اور ان کا حال اس طرح ہوجاتا ہے کہ جیسے عورتوں نے ان پر جادو کیا ہے اور یہی حال عورتوں کا ہے۔ وہ بھی مردوں پر اس طرح فریفتہ ہوجاتی ہیں جیسے کسی نے ان پر جادو کیا ہے۔ اس کے برعکس کئی مفسرین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کرنے اور اس کے اثرات ہونے کو حقیقت تسلیم کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ واقعہ صحیحین میں موجود ہے جس پر آج تک کسی محدث نے جرح نہیں کی اور اس طرح کی کیفیت منصب رسالت کے قطعاً منافی نہیں۔ جیسے آپ کبھی کبھی بیمار ہوئے۔ بعض اوقات آپ پر غشی طاری ہوگئی یا کئی مرتبہ نماز میں آپ کو سہو ہوگیا اور آپ نے فرمایا اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ اَنْسیٰ کَمَا تَنْسَوْنَ فَاِذَا نَسِیْتُ فَذَکِّرُوْنِیْ ''میں بھی ایک بشر ہوں جیسے تم بھولتے ہو میں بھی بھولتا ہوں۔ اگر میں بھول جاؤں تو مجھے یاد دلایا کرو۔ جس طرح آپ کی غشی کی کیفیت اور بھول جانے کے سہو کے بعد کوئی شخص یہ نہیںکہہ سکتا ہے کہ آپ کی وحی اور دوسری باتوں پر کیسے یقین کریں ممکن ہے کہ ان میں بھی سہو اور بھول چوک ہوگئی ہو اور ظاہر ہے کہ آج تک کسی نے ایسی بات نہیں کہی ہے۔ آپؐ اگر جادوگروں کے جادو سے متاثر ہوکر بیمار ہوئے تو آپ کی وحی کس طرح مشکوک ہوسکتی ہے۔ اگر آپ کی زندگی میں سہو اور ان کی بھول چوک کو وحی کے لیے کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا گیا تو آپ پر اگر جادو کیا گیا اور جادو سے آپ متاثر ہوئے اور کئی روز تک آپ پر جادو کا

اثر رہا تو اس وجہ سے آپ کی وحی کیسے متاثر ہوگئی۔ اگر سہو و نسیان کے ثبوت سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ آپ کی وحی مشکوک ہو تو اتنی سی بات سے کہ آپ کوئی کام کرتے تھے تو پھر خیال نہ رہتا تھا کہ وہ کام کیا تھا یا نہیں۔ وحی کس طرح مشکوک بن سکتی ہے۔ چونکہ سہو و نسیان، مرض اور غشی بشریت ہے اور انبیا بشر ہیں اور ان میں بشریت کا پایا جانا ان کے رتبہ کو کم نہیں کرتا ہے اور جس شخص پر ایمان ہو کہ وہ اللہ کا بندہ اور رسول ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ ان کے دل و دماغ کی حفاظت فرماتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اس کی عصمت و عفت کا کفیل ہے۔ وہی اپنے نبی کو وحی یاد کرنے سمجھانے اور پہنچانے کا ذمہ دار ہے۔ اس لیے ناممکن ہے کہ اس کے فرائضِ دعوت و تبلیغ کی انجام دہی میں کوئی طاقت خلل ڈال سکے۔ نفس ہو یا شیطان، مرض ہو یا جادو کوئی بھی چیز ان امور میں رخنہ اندازی نہیں کر سکتی جو منصب رسالت اور مقصد رسالت سے متعلق ہیں۔ کافرین جو انبیا کو مسحور کہتے تھے ان کا ان الزامات سے یہ مطلب ہوتا تھا کہ نبوت کے انکار کا جواز پیدا کر سکیں۔ اس لیے وہ پروپگنڈہ کرتے تھے کہ جادو کے اثر سے آپ کی عقل ٹھیک نہ رہی حالانکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسحور کہتے تھے۔ لیکن مسحور کے معنی وہ مجنون لیتے تھے اور وحی الٰہی کو وہ جوش و جنون قرار دیتے تھے۔(العیاذ باللہ) اس لیے قرآن میں اُن کی تکذیب و تردید ضروری ہوئی۔ یہ دعویٰ کہیں نہیں کیا گیا کہ انبیا علیہم السلام بشریت سے مُستثنیٰ ہیں اور کوئی نبی سحر یا جادو سے متاثر نہیں ہو سکتا ہے۔ بلکہ حضرت موسیٰ جس طرح جادو سے متاثر ہو کر ڈر گئے بالکل اسی طرح رسول جادو یا سحر سے متاثر ہوئے اور بیمار ہو کر کئی دنوں تک ذاتی حیثیت میں پریشان رہے۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے معوذتین کی یاد دہانی کر کے آپ کی پریشانی دور کردی۔

واضح رہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جادو کو ایسے سات بڑے گناہوں میں شمار کیا ہے جو انسان کی آخرت کو برباد کردینے والے ہیں۔ وہ سات گناہ یہ ہیں۔ ۱) خدا کے ساتھ کسی کو شریک کرنا۔ ۲) جادو کرنا۔ ۳) کسی جان کو ناحق قتل کرنا جسے اللہ نے حرام کیا ہے۔ ۴) سود کھانا۔ ۵) یتیم کا مال کھانا۔ ٦) جہاد میں دشمن کے مقابلہ سے پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلنا۔ ۷) بھولی بھالی عفیف پاک دامن مومن عورتوں پر زنا کی تہمت لگانا۔

چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جادو کو سات بڑے گناہوں میں شمار کیا ہے۔ اس لیے کچھ لوگوں نے اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ جادو کا اثر انسان پر ہوجاتا ہے اور اسے نقصان بھی پہنچ جاتا ہے۔ اس لیے اسے بڑے گناہوں میں شمار کیا گیا ہے۔ لیکن کچھ لوگوں نے اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ درحقیقت خبیث روحوں اور ستاروں کی مدد لینے سے کسی پر اگر جادو کیا جائے تاکہ اسے نقصان پہنچے تو اس خبیث عمل سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا ہے اور اگر قرآنی آیات پڑھ کر بھی کسی پر جادو کیا جائے تو اس سے بھی کسی پر کوئی اثر نہیں ہوتا ہے اور نہ اسے کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ کیونکہ اول تو یہ ایک بڑا گناہ ہے اور شریعت کے لحاظ سے جائز نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ اس قسم کے جادو سے انسان کو نقصان نہیں پہنچ سکتا ہے کیونکہ قرآن انسانوں کے لیے شفا ہے۔ لہٰذا اس میں کوئی نقصان اور شر نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

اور (میں پناہ مانگتا ہوں) حسد کرنے والے کے شر سے جبکہ وہ حسد کرے

حسد اس قلبی کیفیت کا نام ہے جو کسی بندے پر اللہ تعالیٰ کے فضل کے مقابلہ میں حاسد کے دل میں پیدا ہوتی ہے اور وہ تمنا کرتا ہے کہ یہ نعمت اُس بندے سے چھن جائے۔ پھر کسی حاسد کے دل میں یہ کیفیت صرف اس حد تک رہتی ہے کہ وہ حسد، کینہ اور بغض کے باوجود محسود کو نعمت سے محروم کرنے کے لیے کوئی عملی اقدام نہیں کرتا ہے اور اپنے حسد کو صرف قلبی کیفیت تک ہی محدود رکھتا ہے جب کہ کوئی حاسد اپنے محسود (جس کے ساتھ حسد کیا جائے) سے اللہ کی عطا کی ہوئی نعمت کو چھین لینے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ اگرچہ حسد کرنے والے کے حسد کے اثرات محسود پر نہیں پڑ سکتے ہیں۔ بلکہ حاسد خود ہی حسد کی آگ سے اپنے آپ کو جلاتا رہتا ہے اور اپنے آپ کو ایک شدید عذاب میں مبتلا کردیتا ہے۔ لیکن پھر بھی محسود پر ہمیشہ حاسد کے برے ارادوں کے خطرات منڈلاتے رہتے ہیں۔

بہرحال حاسد کا حسد بھی ایک شر ہے اور اس شر سے بچنے کے لیے ہمیں اللہ سے پناہ مانگنی چاہیے اور اسی کی حفاظت و نگہبانی کا سہارا لینا چاہیے۔

حسد کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کو اللہ تعالیٰ نے جو نعمت، فضیلت یا کوئی خوبی عطا کی ہو تو اس پر کوئی دوسرا شخص جلتا ہے اور وہ خواہش کرتا ہے کہ اللہ کا عطا کیا ہوا فضل اُس سے چھن جائے اور اسے مل جائے یا اگر اسے حاصل نہ ہوجائے تو کم سے کم مُنعَم سے چھن جائے۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ خواہش کرے کہ جو نعمت کسی کو مل گئی ہو وہ مجھے بھی مل جائے تو یہ حسد نہیں ہے بلکہ رشک ہے۔ حسد آدمی کو اللہ کی نافرمانی کی طرف لے جاتا ہے۔ بارگاہ الٰہی میں سب سے پہلی نافرمانی حسد کی وجہ سے ہی ہوئی جب ابلیس نے آدم علیہ السلام پر حسد کرکے سجدہ کرنے سے انکار کردیا اور اللہ کی مخلوقات میں وہ پہلا وجود قرار پایا جس نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کی اور راندۂ دربار ہوا اور لعنت میں گرفتار ہوگیا۔ آدم علیہ السّلام کے دو بیٹوں میں سے ایک نے دوسرے کو قتل کیا اس کا باعث بھی حسد تھا۔ برادران یوسف نے اپنے بھائی حضرت یوسف علیہ السّلام پر جو ظلم کیا اس کا باعث بھی حسد تھا۔ یہودیوں نے یہ جانتے ہوئے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول برحق ہیں حسد کی بنیاد پر آپ پر ایمان نہ لایا اور آپ پر جادو کردیا۔ حاسد ایک بہت بڑے عذاب اور مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اسے اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ ابو لہب نے اپنے بھتیجے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی مخالفت حسد کی بنیاد پر کی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے رسوا کردیا۔ سورہ لہب میں تَبَّتْ یَدَا اَبِیْ لَہَبٍ ''ہاتھ ٹوٹ گئے ابو لہب کے'' فرماکر اسے رسوا کردیا اور جب تک قرآن موجود ہے تب تک اس کی رسوائی بیان ہوتی رہے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حسد رکھنے کی بنا پر ابو جہل ہدایت سے محروم رہا اور جنگ بدر میں اپنی گردن کٹوائی۔ امید بن صلت ساری عمر سچے مذہب کی تلاش میں عرب کی سرزمین میں پھرتا رہا۔ کیونکہ وہ بت پرستی کے مذہب سے بیزار تھا۔ سچے مذہب کی تلاش میں وہ کبھی عیسائی بنا، کبھی یہودیت اختیار کی مگر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو یہ بدبخت حسد میں مبتلا ہوگیا اور کہنے لگا کہ وحی مجھ پر کیوں نہیں آئی اور اسی حسد کی بیماری میں اس کی موت واقع ہوئی۔ حالانکہ وہ بڑا ہونہار اور اعلیٰ پایہ کا شاعر تھا۔ اس کی شاعری سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس قدر حق کا طالب تھا مگر حسد کی وجہ سے کفر کی موت مرا۔

حسد کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حسد ایسی بیماری ہے جو نیکیوں کو اس طرح کھاجاتی ہے جس طرح آگ خشک لکڑیوں کو جلادیتی ہے اور حسد ایک ایسی مہلک بیماری ہے جس پر قابو پانا انسان کے لیے مشکل ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے تاکید فرمائی ہے کہ حسد کرنے والے کے حسد کے شر سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے۔ کیونکہ اللہ کی پناہ میں آنے سے محسود یعنی جس پر حسد کیا جاتا ہے کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا ہے۔ اللہ کی پناہ گاہ میں ہی انسان محفوظ ہے۔

لیکن حسد کے بارے میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ بعض اوقات حسد کا لفظ غَیرَطۃ یعنی رشک کے معنی میں آتا ہے۔ مثلاً کسی شخص پر اللہ کا فضل اور نعمت دیکھ کر کوئی یہ خواہش کرتا ہے کہ مجھے بھی یہ نعمت مل جائے۔ مگر یہ خواہش نہیں رکھتا ہے کہ جس کے پاس اللہ کا فضل اور نعمت ہے وہ اسے چھن جائے۔ اس طرح کا حسد کرنا حرام نہیں بلکہ جائز ہے۔ ابن عمرؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایادو چیزوں پر حسد کرنا ٹھیک ہے ایک وہ آدمی جسے اللہ نے قرآن دیا (یعنی جس نے قرآن سیکھا) تو وہ دن اور رات کے اوقات میں اس کے ساتھ قائم رہتا ہے اور دوسرا وہ آدمی جسے اللہ نے مال دیا ہے تو وہ رات اور دن اس میں سے خدا کی راہ میں خدا کی رضا کے لیے خرچ کرتا رہتا ہے۔یہاں حسد کا معنی رشک ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے ساتھ قائم رہنے والے اور خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے والے پر اگر حسد کیا جائے وہ جائز ہے۔ کیونکہ اس طرح کا حسد کرنے والا خواہش کرتا ہے کہ میں بھی قرآن پڑھنے والے اور زکوٰۃ دینے والے کی طرح بنوں اس لیے اس طرح کا حسد کرنا جائز ہے اور یہ رشک (غیطۃ) کہلاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور اپنے فضل و کرم کی طرف متوجہ فرماتے ہیں کہ آپ اور آپ کی امت حاسدوں کے شرور سے بچنے کے لیے اللہ کی پناہ مانگیں اور یقین رکھیں کہ جب وہ اللہ کی پناہ میں آجائیں تو اللہ انہیں اپنے حفظ وامان میں رکھے گا اور جب اللہ تعالیٰ کسی کو اپنے حفظ وامان میں رکھے گا تو کس کی مجال کہ اللہ کی پناہ میں آئے ہوئے شخص کو حسد کے شر سے نقصان پہنچائے یا اسے پریشان کردے۔

یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ حاسد یعنی حسد کرنے والا شخص حسد کی بیماری میں بتلا ہو کر عذاب میں بتلا ہوجاتا ہے۔ لیکن محسود (جس پر حسد کیا جاتا ہے) کس طرح کے عذاب میں بتلا ہوجاتا ہے اور اسے کس طرح نقصان پہنچ سکتا ہے۔ جب کہ اسے معلوم بھی نہیں ہوتا ہے کہ کوئی اس پر حسد کرتا ہے اور اسے نقصان پہنچنے کی خواہش کرتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حاسد جس پر حسد کرتا ہے اسے اگرچہ معلوم نہیں ہوتا ہے کہ کوئی اس پر حسد کرتا ہے۔ اس لیے اس پر کسی کے حسد کرنے کا کوئی اثر نہیں پڑسکتا ہے۔ لیکن حاسد کے طرز عمل (Behaviour) سے محسود متاثر ہوسکتا ہے علی الخصوص جب حاسد محسود کو نقصان پہنچانے پر تلا ہوا ہو۔ اس لیے وہ محسود کے ساتھ کبھی خوش اخلاقی سے بات نہیں کرتا ہے۔ وہ اس کے لیے دوست نما دشمن ہوتا ہے۔ اس طرح ایک تو محسود پر ہمیشہ حاسد کی طرف سے خطرات کے بادل منڈلاتے رہتے ہیں۔ دوسری طرف اس کی بدسلوکی و بدمزاجی سے اس کے دل و دماغ پر اثرات پڑسکتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اسے تکلیف پہنچ سکتی ہے۔ چونکہ علم نفسیات (Psychology) سے یہ بات ثابت ہے کہ ایک انسان کے طرز عمل (Behaviour) سے دوسرے انسان کے دل و ماغ پر کافی اثر پڑسکتا ہے۔ جسے نفسیاتی اثر (Psychological effect) کہتے ہیں۔ جو کسی بھی وقت تکلیف دہ ثابت ہوسکتا ہے۔ یعنی حاسد کے طرز عمل سے محسود کے دل و دماغ پر برے اثرات ضرور پڑسکتے ہیں۔ اس لیے حاسد اور محسود دونوں کو حسد کے شر سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے۔

یہاں اس بات کو سمجھنا ضروری ہے کہ محسود کو ہمیشہ خدا کی پناہ مانگنی چاہیے اور اسے اپنی طرف سے حاسد کے خلاف کوئی اقدام نہ کرنا چاہیے۔ لیکن حاسد کے شر سے بچنے کے لیے احتیاطی تدابیر کو عمل میں لانا ضروری ہے جن میں پہلی تدبیر یہ ہے کہ اللہ کی پناہ مانگی جائے، دوسری یہ کہ انسان اللہ پر بھروسہ کرے اور یقین رکھے کہ جب تک اللہ نہ چاہیے کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ہے تیسری یہ کہ حاسد کی باتوں پر انسان صبر کرے اور بے صبر ہو کر ایسی کوئی کاروائی نہ کرے جس سے وہ بداخلاقی کا شکار ہو، چوتھی یہ کہ حاسد کیسی بھی بیہودہ حرکتیں کرے محسود بہرحال تقویٰ پر قائم رہے، پانچویں یہ کہ حاسد کے ساتھ بدی سے پیش نہ آئے بلکہ ہر وقت اس سے بھلائی اور احسان کا برتاؤ کرے، چھٹی یہ کہ محسود توحید کے عقیدے پر ثابت قدم رہے اور اس بات پر یقین رکھے کہ خدا کے اذن کے بغیر کسی مچھر کے پر کو نقصان نہیں پہنچ سکتا ہے اور خدا کے خوف کے سوا وہ کسی اور کے خوف کو دل میں جگہ نہ دے۔

سورۃٌ النَّاس

اٰیاتُھا:6 رکوعھا:1

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

قُلۡ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ(۱)

کہو میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب کی

مَلِکِ النَّاسِ(۲)

انسانوں کے بادشاہ کی

إِلَهِ النَّاسِ(۳)

انسانوں کے حقیقی معبود کی

مِن شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ(۴)

اُس وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے، جو بار بار پلٹ کر آتا ہے

الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ(۵)

جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے

مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ (٦)

خواہ وہ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے

کہوں میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب کی

یہ زندگی ایک امتحان ہے اور جو شخص اس امتحان میں کامیاب ہوجائے گا وہ قیامت کے دن فلاح پائے گا۔ زندگی کے اس امتحان کے دوران انسان کو بے شمار دنیاوی شرور اور اپنے نفس کے شرور کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان تمام قسم کے شرور سے اسے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے تاکہ وہ آخرت میں کامیاب ہوجائے۔ خدا کی پناہ میں آنے کے بغیر انسان دنیائی زندگی کے شرور سے نجات نہیں پا سکتا ہے کیونکہ شیاطین جن و انس اُس کے پیچھے پڑے ہوئے ہوتے ہیں جن سے نجات پانے کے لیے اسے اپنے رب کی پناہ میں آنا ضروری ہے۔ رب النّاس سے مراد تمام لوگوں کا پالنے والا پروردگار ہے۔ وہی تمام

پالنے والوں کا پالنے والا ہے اور وہی رب العالمین یعنی تمام جہانوں کا پالنے والا ہے اور وہی کل عالم کا پروردگار ہے۔ اس لیے اس کے بغیر انسانوں کے لیے پناہ لینے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔

(میں پناہ مانگتا ہوں) انسانوں کے مَلِک -بادشاہ کی

رب النّاس یعنی اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کا پالنہار و پرودگار ہے، کی اس صفت کے بعد اللہ تعالیٰ اپنی ایک اور صفت بیان فرماتے ہیں کہ وہ نہ صرف تمام لوگوں کا رب ہے بلکہ وہ ان کا حاکم اور بادشاہ بھی ہے۔ اس آیت کی ایک قرأت مالک النّاس ہے۔ اس لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کا مالک (Owner) ہے۔ کیونکہ اسی نے ان کو پیدا کیا ہے لہٰذا وہی ان کا مالک ہے۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ مشرکین اور دیگر اکثر مذاہب کے پیروکار بادشاہ کو ہی اپنی زندگی کا مالک سمجھتے تھے۔ وہ ان پر حکومت کرتا ہے۔ اس لیے اس کے اختیار میں ہے کہ وہ جسے رزق دے وہ کھا سکتا ہے اور جس کا رزق بادشاہ بند کردینے کا حکم جاری کردے وہ رزق نہیں پا سکتا ہے اور اپنی رَعیت میں جسے وہ زندہ رکھنا چاہے اسے زندہ رکھتا ہے اور جسے مارنا چاہے اسے مار سکتا ہے قَالَ أَنَا أُحْيِيْ وَأُمِيْتُ (بقرۃ:۲۵۸)۔ اُس سے پوچھنے والا کوئی نہیں ہے۔ لہٰذا انسانوں کو سمجھایا جاتا ہے کہ اُن کا اصلی مالک اور بادشاہ اللہ ہے زندہ رکھنے اور مارنے کا اختیار اُسی کو ہے۔ کسی دنیائی بادشاہ کو نہیں۔ اس لیے فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہی انسانوں کو پیدا کیا ہے اور وہی ان کا مالک اور بادشاہ ہے۔ وہی مالِکُ المُلک ہے وہی مالک حقیقی اور مالکِ مُطلَق ہے۔ مراد ہر کام کا مالک وہی ہے اور ساری کائنات اور سارے انسانوں کے مالکانہ حقوق اسی کے پاس ہیں۔ وہی بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ وہی رزق دینے والا ہے۔ وہ جس طرح چاہتا، رزق دیتا ہے ۔ وہی زندگی اور موت دیتا ہے اور وہی آخرت میں اعمال کا حساب لینے کے لیے دوبارہ زندہ کرے گا۔

مغربی مادّہ پرستانہ فکر و فلسفہ سے متاثر عقلیت پسند مستشرقین (Orientalists) اور معتزلہ (Nonformists) اللہ تعالیٰ کو بادشاہ حقیقی ماننے سے انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو حقیقی بادشاہ ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ وہ اپنی ضروریات زندگی کے مطابق ہی قانون بنا سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنی ضروریات کو زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس قسم کا سوچ رکھنے والوں نے ڈی ازم (Deism) نظریہ پیش کردیا۔ (تفصیل سورۂ اخلاص کے مضمون میں آچکی ہے)

اس کائنات اور اس کے اندر موجود مخلوقات کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اور ان مخلوقات کا رب یعنی پالنے والا اور مالک و بادشاہ سنبھالنے والا وہی ہے جس نے ان کو پیدا کیا ہے۔ مَلِک النّاس لوگوں کا

بادشاہ کی آیت کا یہی مفہوم ہے۔

(میں پناہ مانگتا ہوں) انسانوں کے اِلٰہ (معبود) کی

یہاں اللہ تعالیٰ اپنی ایک اور صفت سے انسانوں کو روشناس کرتے ہیں، یعنی ان کا اِلٰہ (معبود) بھی وہی ہے جس نے ان کو پیدا کیا ہے۔

زمانہ جاہلیت میں مشرکین عرب بتوں کی پوجا کرتے تھے جنہیں یہ لوگ اِلٰہ (god) کہتے تھے۔ جیسا کہ آج بھی دنیا میں اس طرح کی پوجا کرنے والے موجود ہیں۔ اس لیے اِلٰہِ النّاس فرما کر واضح کردیا گیا کہ کوئی اِلٰہ (god) عبادت کے لائق نہیں ہے اور جن ہستیوں کو اِلٰہ مان کر آپ اُن کی عبادت کرتے ہیں وہ سراسر باطل ہے۔ عبادت کے لائق صرف ایک اللہ (God) ہے جس نے ان تمہارے بے جان معبودوں کا مادّۂ تخلیق بھی بنایا ہے جنہیں تم اپنے ہاتھوں سے تراشتے ہو اور پھر ان کی عبادت کرتے ہیں۔ اس حقیقت کی گواہی دینا مسلمان کے لیے ضروری ہے۔ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیکَ لَہٗ ''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے''۔

اُس وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے جو بار بار پلٹ کر آتا ہے

اس آیت میں ارشاد ہے کہ جس چیز کے شر سے لوگوں کو اللہ، جو اُن کا رب بھی ہے، مالک اور بادشاہ بھی ہے اور اِلٰہ و معبود بھی ہے، کی پناہ میں آنے کی تاکید کی گئی ہے، وہ شیطان کے وسوسے ڈالنے کا شر ہے۔ اس لیے فرمایا گیا ہے کہ شیطان کے ان وسوسوں کے شر سے اللہ کی پناہ حاصل کرلو جو وہ بار بار آکر انسانوں کے دلوں میں ڈال دیتا ہے۔ یہ شیاطین پے درپے انسانوں پر وسوسہ ڈالنے کے حملے کرتے رہتے ہیں۔ چونکہ شیاطین اللہ تعالیٰ کی ایک ایسی مخلوق ہے جن کے حملے غائبانہ ہوتے ہیں جو انسان کو دکھائی نہیں دیتے ہیں تاہم وہ صرف ان حملوں کے اثرات کو محسوس کرسکتا ہے۔ ان کا مقابلہ کرنا انسان کے بس میں نہیں۔ اس لیے ان سے بچنے کے لیے اللہ کی پناہ میں آنے کی تاکید فرمادی گئی ہے۔

شیاطین کے وسوسہ ڈالنے کی کئی صورتیں ہیں اور انسانوں کو بہکانے کے لیے مختلف صورتوں میں شیاطین ان کے پاس آتے ہیں۔ مثلاً کچھ لوگ مربی، محسن، ہمدرد اور خیر خواہ بن کر انسانوں کے سامنے آتے ہیں اور ان کی خیر خواہی جتاتے ہیں۔ شیطان کی یہ صورت کوئی قریبی رشتہ دار، دوست حتیٰ کہ والدین بھی اختیار کرسکتے ہیں اور خیر خواہی جتاکر انسانوں کو اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی پر آمادہ کرسکتے ہیں۔ یہ شعوری یا غیر شعوری طور پر کسی برے کام کا مشورہ دے کر انسان کو شیطان کے جال میں پھنسا دیتے ہیں۔ اس صورت میں باپ بیٹے کو اور بیٹا باپ کو، بھائی بھائی کو، بہن بھائی کو، بھائی بہن کو، بہن بہن کو، بیوی خاوند کو اور خاوند بیوی کو اس قسم کے خیر خواہ بن کر شیطانی کام کرواسکتے ہیں۔ کچھ لوگ طاقت و اقتدار کے بل بوتے پر خدا کی نافرمانی کا جال پھیلاتے ہیں۔ وہ خدا کی حاکمیت کے بجائے اپنی حاکمیت اور حکمرانی کا رعب جماتے ہیں اور خدا کے قانون اور اس کی مرضی کے بجائے اپنا قانون اور اپنی مرضی نافذ کرتے ہیں اور اس طرح انسانوں کے خدا بن بیٹھتے ہیں۔ کچھ لوگ خدائی طاقتوں کے مدعی بن کر لوگوں کو تعویذ گنڈے دے کر گمراہ کردیتے ہیں۔ کچھ لوگ عبادت وریاضت کا ڈھونگ رچاکر انسانوں کے معبود بن بیٹھتے ہیں۔ کچھ لوگ خانقاہوں، درگاہوں، آستانوں اور مقبروں پر نظرانے ہتھیاکر شیطانی کاموں میں مدد کرتے ہیں۔ کچھ لوگ پیروں فقیروں کو خدائی طاقتوں کا مالک سمجھتے ہیں اور ان کی خواہشات کو حکم خداوندی سمجھتے ہیں اور ان کی خرافات اور لغویات کو مقدس سمجھ کر ان کے قدموں میں جان و مال، عزت و آبرو، عقل و ہوش سب کچھ نچھاور کردیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان تمام شیطانی حربوں کو اپنی ان تین صفات سے پاش پاش کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ اللہ کا ربُّ النّاس، مَلِک النّاس اور اِلٰہِ النّاس ہونے کا تقاضا ہے کہ تم اُسی کی عبادت کرو، اُسی کی اطاعت کرو اور اسی کی پناہ میں آجاؤ وہی کائینات اور کائینات کے اندر موجود تمام مخلوقات کا حقیقی فرمانروا ہے اور اسی نے تمام انسانوں کوپیدا کیا ہے۔ اسی کا قانون صحیح ہے اس لیے اسی کو اپنا حاکم مانو، اسی کے قانون کی پیروی کرو، وہی معبود برحق ہے اور وہی انسانوں کا خالق، مالک اور حاکم ہے۔ اُس کے سوا جتنے خدا اور معبود لوگوں نے بنارکھے ہیں وہ سب جھوٹے اور فرضی ہیں۔ کسی میں کوئی خدائی طاقت نہیں ہے۔ وہی ایک معبود برحق -اللہ- بندگی کے لائق ہے اور عبادت و پرستش سب اُسی کے لیے ہے۔ اُس کے بغیر جو بھی پرستش اور عبادت کی جاتی ہے وہ سب باطل ہے۔ خدا کی ان تین صفات سے وابستہ ہوکر شیاطین کے وسوسوں سے اُس کی پناہ میں آنے سے ہی انسان کامیابی

حاصل کر سکتا ہے۔ جو انسان اللہ کی پناہ حاصل نہیں کر سکتا ہے وہ شیطان کے جال میں آسانی سے پھنس جاتا ہے۔

(شیطان) جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے

شیطان بڑی چالاکی اور ہنرمندی سے لوگوں میں وسوسہ اندازی کا کام شروع کردیتا ہے۔ پہلے وہ انسان کو اپنے ہمدردانہ مشوروں سے نوازنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ بات سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ میں جو بات کہوں یا مشورہ دوں وہ تمہاری بھلائی کے لیے ہے۔ میرا اس میں کوئی ذاتی غرض نہیں ہے۔ اس طرح وہ اسے کفر، شرک، دہریت، سوشلزم، کمیونزم، مارکسزم وغیرہ کی تعلیم دے کر اللہ اور اُس کے رسول کے خلاف بغاوت پر اُکساتا ہے اور انسان کے دین اور ایمان کو تذبذب میں ڈال کر مشکوک بنادیتا ہے۔ اگر اس میں ناکامی ہوئی تو پھر اسے کسی نہ کسی طرح کے بدعت کی راہ دکھاتا ہے۔ یہ بھی نہ ہوسکے تو گناہوں کی طرف اکساتا ہے۔ خدا کے احکام کو یہ کہہ کر تبدیل کرنے کا مشورہ دیتا ہے کہ دور جدید میں پرانے قوانین پر عمل نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے ان میں ترمیم (Amendment) کی ضرورت ہے۔ مثلاً سود حرام ہے لیکن شیطان انسانوں میں وسوسہ ڈال کر اسے جائز اور حلال قرار دلواتا ہے۔ شراب مسلمانوں پر حرام ہے لیکن شیطان انسانوں میں وسوسہ ڈال کر اسے بھی کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کے لیے جائز قرار دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح کے اور بہت سے گناہ ہیں جو انسان شیطان کی وسوسہ اندازی سے انجام دے کر اپنی آخرت کو برباد کردیتا ہے۔ اگر کوئی شخص شیطان کی ان تمام چالوں کو ناکام کردیتا ہے اور اپنے آپ کو اس کے سارے حربوں سے محفوظ رکھنے میں کامیاب ہوجاتا ہے تو پھر شیاطین جن و انس کی پوری پارٹی ایسے آدمی پر حملہ کردیتی ہے اور اس کے خلاف لوگوں کو اُکساتی اور بھڑکاتی ہے۔ اس پر طرح طرح کے الزامات لگواتی ہے۔ اسے ہر طرف بدنام کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ پھر شیطان اس مرد مومن کے پاس آتا ہے اور اسے یہ کہہ کر غصہ دلاتا ہے کہ تمہارے خلاف جو یہ مخالفت کا پروپگنڈا ہورہا ہے اسے برداشت کرنا بزدلی ہے۔ تمہارا حق بنتا ہے کہ تیرے اوپر جو الزامات لگائے جاتے ہیں اور جس طرح تجھے بدنام کیا جاتا ہے، بے شک تیرا حق ہے کہ تو ایسے دشمنوں اور بہی خواہوں کے خلاف سینہ سپر ہوجائے۔ یہ شیطان کا آخری حربہ ہوتا ہے۔ جس سے وہ دعوت حق کی راہ کھوٹی کرانے اور داعی حق کو فتنوں اور فسادات میں الجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس سے بھی اگر مرد مومن اور داعیٔ حق بچ نکلے تو شیطان اس کے آگے بے بس ہوجاتا ہے۔ شیطان کے حملوں سے بچنے کے لیے قرآن نے یہ نسخہ پیش کیا ہے۔ إِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوْا فَإِذَا هُم مُّبْصِرُونَ (سورہ اعراف: ۲۰۱) ''حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ متقی ہیں (ان کا حال یہ ہے) کہ جب انہیں کوئی برا خیال شیطان (کے اثر) سے چھو جاتا ہے تو فوراً

چوکنے ہوجاتے ہیں اور پھر انہیں صاف نظر آنے لگتا ہے کہ اصل بات کیا ہے۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا اِذَا مَسَّہُمۡ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیۡطٰنِ تَذَکَّرُوۡا فَاِذَا ہُمۡ مُّبۡصِرُوۡنَ o (سورہ اعراف: ۲۰۱) ''حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ متقی ہیں (ان کا حال یہ ہے) کہ جب انہیں کوئی برا خیال شیطان (کے اثر) سے چھو جاتا ہے تو فوراً چوکنے ہوجاتے ہیں اور پھر انہیں صاف نظر آنے لگتا ہے کہ اصل بات کیا ہے۔'' وَقُلۡ رَّبِّ اَعُوۡذُبِکَ مِنۡ ہَمَزٰتِ الشَّیٰطِیۡنِ o (المومنون: ۹۷) ''اور دعا کرو اے میرے رب میں شیطانوں کی اکساہٹوں سے تیری پناہ طلب کرتا ہوں'' وَاِمَّا یَنۡزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰہِ اِنَّہٗ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ o (سورہ اعراف: ۲۰۰) ''اور اگر کبھی تم کو شیطان کسی وسوسہ سے اُکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو بے شک وہ ہر بات سننے والا اور جاننے والا ہے''۔

خواہ وہ (شیطان) جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے

انسان کے دل میں وسوسہ اندازی صرف باہر سے شیطان جن و انس ہی نہیں کرتے ہیں بلکہ اندر سے خود انسان کا نفس بھی اسے وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ اس کے اپنے غلط خیالات، تصورات اور نظریات اس کو گمراہ کردیتے ہیں۔ یہ غلط نظریات، خیالات اور تصورات اس کی عقل کو خراب کردیتے ہیں۔ اس کی اپنی بری خواہشات اس کی قوت ارادہ اور قوت فیصلہ کو گمراہ کردیتی ہیں۔ یعنی اس کے اندر کا شیطان بھی اسے برائیوں کی طرف اکساتا اور بہکاتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسوِسُ بِہٖ نَفْسُہٗ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیدِo (سورہ ق:١٦) ''یقینا ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم اس کے نفس سے ابھرنے والے وسوسوں کو جانتے ہیں اور ہم اس کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔''

اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر خطبہ کے آغاز میں تعُّوذ کی یہ دعا ہمیشہ مانگا کرتے تھے: نَعُوْذُ بِا اللہ مِنْ شَرُرِ اَنْفُسِنَا ''ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں اپنے نفس کی شرارتوں سے''۔ قرآن اور حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ وسوسہ اندازی کا کام شیٰطین جن بھی کرتے ہیں اور شیٰطین انس بھی۔ دونوں کے شرور و شرارت سے پناہ مانگنے کی یہاں تلقین کی گئی ہے۔ اس حقیقت کی تصدیق قرآن و حدیث سے ہوتی ہے۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ وَکَذَالِکَ جَعَلْنَا لِکُلِّ نَبِیٍّ عَدُوّاً شَیَاطِیْنَ الاِنسِ وَالجِنِّ یُوحِیْ بَعْضُہُمْ اِلَی بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوراً (سورہ انعام:١١٢) ''اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے انسانوں اور جنوں کے شیطانوں کو دشمن بنایا ان میں سے بعض بعض کی طرف مَلمَع کی ہوئی بات دھوکہ دینے کے لیے دل میں ڈالتا رہتا ہے''۔ حدیث میں امام احمد اور نسائی ابو ذر کی روایت نقل کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شیاطین انس اور شیاطین جن کے شرور سے اللہ کی پناہ مانگو۔

انسانوں میں شیاطین ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کچھ لوگ شیطانی صفات اور شیطانی خیالات رکھتے ہیں۔ وہ لوگوں میں شیطانی وسواس ڈال کر فتنے اور فسادات برپا کردیتے ہیں اور انہیں برائیوں پر اُکساتے رہتے ہیں۔

یہ شیاطین جن و انس رات دن اپنے کام میں لگے رہتے ہیں۔ ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگوں سے ایسے کام کرواتے ہیں جن کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے بار بار شیطانی کاموں اور شیطانی وسوسوں کا ذکر فرمایا ہے اور ان سے خبردار رہنے کی تلقین بھی فرمادی ہے۔ یَا أَیُّہَا النَّاسُ کُلُواْ مِمَّا فِیْ الأَرْضِ حَلاَلاً طَیِّباً وَلاَ تَتَّبِعُواْ خُطُوَاتِ الشَّیْطَانِ إِنَّہُ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌo (سورہ بقرہ:۱٦۸) ''اے لوگو جو چیزیں زمیں میں حلال اور پاکیزہ ہیں وہ کھاؤ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔'' إِنَّمَا یَأْمُرُکُمْ بِالسُّوئِ وَالْفَحْشَاءِ وَأَن تَقُولُواْ عَلَی اللّہِ مَا لاَ تَعْلَمُونَo (بقرۃ:۱٦۹) ''وہ تمہیں برائی اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے اور اس بات کا حکم دیتا ہے کہ تم اللہ کے بارے میں وہ باتیں کہو جن کے متعلق تمہیں علم نہیں(کہ اللہ نے فرمائی ہیں)'' یَا أَیُّہَا الَّذِیْنَ آمَنُواْ ادْخُلُواْ فِیْ السِّلْمِ کَآفَّۃً وَلاَ تَتَّبِعُواْ خُطُوَاتِ الشَّیْطَانِ إِنَّہُ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌo (سورہ بقرہ:۲۰۸) ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو اسلام میں پورے کے پورے داخل ہوجاؤ اور شیطان کے قدموں کے پیچھے مت چلو یقینا وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔'' إِنَّمَا ذَلِکُمُ الشَّیْطَانُ یُخَوِّفُ أَوْلِیَاءہُ فَلاَ تَخَافُوھُمْ وَخَافُونِ إِن کُنتُم مُّؤْمِنِیْنَo (ال عمران:۱۷۵) ''یہ تو شیطان ہی ہے جو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے تو تم ان سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔''

ایک طرف انسان کو شیاطین جن و انس بہکاتے رہتے ہیں تو دوسری طرف اسے اپنے نفس کے شرور بھڑکاتے رہتے ہیں۔ شیاطین پوری شدت اور قوت کے ساتھ اپنا کام کرتے ہیں اور انسانوں کے پیچھے اس طرح پڑجاتے ہیں جس طرح کوئی خون خوار قاتل اپنے دشمن کے پیچھے پڑجاتا ہے۔ یہ شیاطین ہر طرح کے طور طریقوں سے انسانوں کو گناہوں میں بتلا کرکے انہیں ہلاک کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسری طرف انسانوں کے اپنے نفوس کے شرور اور نفسانی خواہشات، شیطانی خیالات اور وسوسوں سے کچھ کم نہیں ہیں۔ ایک انسان کو اپنے نفس کے شرور اور بری خواہشات بھی ہلاک کردیتی ہیں۔ کوئی انسان اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی میں کھلم کھلا، اعلانیہ، بے تکلف اور آزادانہ طور پر ایسے برے کام کرتا ہے جو شیطان کے ذہن میں بھی نہیں آسکتے ہیں۔

وسوسہ اندازی کرنے والے شیطان کو خناس کہا گیا ہے یعنی شیطان چپکے سے آتا ہے اور وسوسہ اندازی کرتا ہے اور یہ بار بار پلٹ کر آتا ہے اور وسوسہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہاں شیطان کی کمزوری کو نمایاں کردیا گیا کہ شیطان اس شخص کے مقابلہ میں کمزور ہے جو اس کی چالوں اور وسوسوں سے چوکنا رہتا ہے اور اپنے دل کی حفاظت کرتا رہتا ہے۔ وسوسہ اندازی کرنے والا شیطان جن ہو یا انسان، جب بھی اس کا مقابلہ کیا جاتا ہے تو وہ چھپ جاتا ہے اور موقعہ پاکر پھر آجاتا ہے۔ جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی لطیف تصویر کشی کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ''مومن جب اللہ کو یاد کرتا ہے تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے اور چھپ جاتا ہے اور جب وہ خدا سے غافل ہوتا ہے تو شیطان وسوسہ اندازی کرنے لگتا ہے''۔ (راوی: ابن عباسؓ) اللہ کے ذکر سے وسوسہ ڈالنے والے شیطان کے مقابلے میں دل کو قوت اور طاقت ملتی ہے۔ چونکہ شیطان خناس ہے وہ پیچھے ہٹ جانے والا اور چھپ جانے والا ہے اور جب مومن مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے تو شیطان کمزور، بے بس اور لاچار ہوجاتا ہے۔

شیطان جب اللہ کے بندوں کو ورغلانے کے لیے نمودار ہوتا ہے اور جب کوئی شخص اس کے چکمہ میں آکر گناہ کربیٹھتا ہے تو شیطان اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دیتا ہے کیونکہ وہ اپنے مریدوں کو دغا دینے والا ہے اور اس کے سارے وعدے محض فریب ہیں۔ جیسا کہ قرآن سے ثابت ہے وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلاً ''اور شیطان ہمیشہ انسان کو چھوڑ جانے والا ہے''۔

شیطان اور انسان کی جنگ تا قیامت جاری رہے گی۔ جیسا کہ سورہ بنی اسرائیل میں بیان ہوا ہے وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَآئِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ قَالَ أَأَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِينًا ''اور اس بات کو یاد کرو کہ ہم نے فرشتوں سے کہا تھا آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا بغیر ابلیس کے اس نے کہا کیا میں اسے سجدہ کروں جسے تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔'' قَالَ أَرَأَيْتَكَ هَذَا الَّذِي كَرَّمْتَ عَلَيَّ لَئِنْ أَخَّرْتَنِ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَأَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهُ إِلَّا قَلِيلًا ''اُس نے کہا ذرا دیکھ تو اُس کو جسے تو نے مجھ پر فضیلت بخشی اگر تو مجھے قیامت کے دن تک مہلت دے تو میں بہت تھوڑے لوگوں کے سوا اس کی اولاد کو جڑ سے اکھاڑ دوں گا''۔ قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَإِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَاءً مَوْفُورًا ''اللہ نے فرمایا جا جو ان میں سے تیری پیروی کریں گے، تجھ سمیت ان سب کے لیے جہنم پورا پورا بدلہ ہے۔'' وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَأَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ وَعِدْهُمْ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا ''اور ان میں سے جن جن پر تیرا بس چلے اپنی دعوت سے پھسلا لے ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھالا اور مال اور اولاد میں ان کا ساتھی بن اور ان سے جھوٹے وعدے کر اور شیطان ان سے محض دھوکے کے وعدے کرتا ہے۔'' إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ وَكَفَى بِرَبِّكَ وَكِيلًا (بنی اسرائیل: ٦١تا ٦٥) بے شک میرے بندوں پر تیرا کوئی زور نہ ہوگا اور تیرا رب کافی کارساز ہے۔''

یہ شیطان اور انسان کے درمیان آپسی جنگ کا اعلان ہے لیکن شیطان اور انسان کے مابین جنگ میں انسان مغلوب و ناتوان نہیں ہے۔ اُس کے رب اور معبود برحق اللہ تعالیٰ کا اقتدار اور تسلط تمام مخلوقات پر قائم ہے۔ اُس نے ابلیس کو اگرچہ انسان کے ساتھ جنگ کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ لیکن اس نے ابلیس کو یہ زور اور طاقت نہیں دی ہے کہ وہ انسان پر زبردستی سے حاوی اور غالب آجائے۔ اُس نے شیطان کو صرف ان لوگوں پر مسلط ہونے کی اجازت دے دی ہے جو اپنے رب سے غافل ہیں اور اُس کی نافرمانی کرتے ہیں۔ جو بندے خدا کو ہمیشہ یاد کرتے ہیں اور اس کی بندگی کرتے ہیں اپنے آپ کو گناہوں سے دور رکھتے ہیں وہ شیطان کے اغوا اور اہوا سے بچ جاتے ہیں۔ قیامت کے دن وہ لوگ سرخرو ہوں گے۔ ان کے چہرے خوشی سے کِھل جائیں گے جب انہیں معلوم ہوجائے گا کہ ان کا ٹھکانا جنت میں ہے اور جو بندے شیطان کے جال میں پھنس جاتے ہیں اور خدا کی نافرمانی کرکے گناہ پر گناہ کرتے ہیں اور خدا سے بے خوف ہوکر اپنی خواہشات کے غلام بن جاتے ہیں۔ قیامت کے روز اپنے کالے کرتوتوں کو دیکھ کر ان کے چہرے سیاہ ہوں گے اور جہنم میں اپنا ٹھکانا دیکھ کر ان کے چہروں کی سیاہی میں مزید اضافہ ہوتا رہے گا۔یہاں تک کہ وہ جہنم میں پہنچ جائیں گے۔

قیامت کے دن جب انسانوں کے اعمال کا فیصلہ کردیا جائے گا تو اس وقت شیطان اعلان کردے گا کہ میں انسانوں سے صرف دھوکہ دہی کا کام کرتا تھا جیسا کہ قران مجید میں ارشاد ہوا ہے وَقَالَ الشَّيْطَانُ لَمَّا قُضِيَ الْأَمْرُ إِنَّ اللَّهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدتُّكُمْ فَأَخْلَفْتُكُمْ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُم مِّن سُلْطَانٍ إِلَّا أَن دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي فَلَا تَلُومُونِي وَلُومُوا أَنفُسَكُم (سورہ ابراہیم:۲۲) ''جب فیصلہ چکایا جائے گا تو شیطان کہے گا کہ بے شک اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے بھی تم سے وعدہ کیا لیکن میں نے ان میں سے کوئی بھی وعدہ پورا نہ کیا لیکن میرا تم پر کوئی زور نہ تھا میں نے تم کو دعوت دی تھی اور تم نے میری دعوت پر لبیک کہا سو تم مجھے ملامت مت کرو بلکہ اپنے آپ ہی کو ملامت کرو''

ایک طرف شیطان اور اس کے پیروکاروں کے درمیان بارگاہ الٰہی میں اس طرح کی گفتگو (conversation) ہوگی تو دوسری طرف گمراہ لیڈروں، پیروکاروں اور ان کے پیروؤں کے درمیان اسی طرح کی گفتگو ہوگی۔ قرآن میں کئی جگہ گمراہ لیڈروں اور ان کی پیروی کرنے والوں کی اس توتکار (جھگڑے) کی تصویر کھینچی گئی ہے جو ان کے درمیان قیامت کے دن برپا ہوگی۔ عوام اپنے لیڈروں سے کہیں گے کہ ہم نے آپ کی پیروی کی اور اس کے نتیجے میں یہاں پہنچے۔ تو کیا آپ لوگ ہمارے اس عذاب میں ہمارے ساتھ شامل ہوکر ہماری مدد کریں گے۔ لیڈر فوراً جواب دیں گے کہ تم لوگ خود شامت زدہ تھے کہ تم نے ہماری پیروی کی ہم کو تمہارے اوپر کوئی زور تو نہ تھا۔ تم جس عذاب میں مبتلا ہوگئے ہو یہ تم کو اپنے کیے کی سزا ہے۔ وَبَرَزُوا لِلّٰهِ جَمِيعًا فَقَالَ الضُّعَفَاءُ لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ أَنْتُمْ مُغْنُونَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ط قَالُوا لَوْ هَدَانَا اللّٰهُ لَهَدَيْنَاكُمْ سَوَاءٌ عَلَيْنَا أَجَزِعْنَا أَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَحِيصٍ o (سورہ ابراہیم: ۲۱) ''اور جب سب اللہ کے حضور پیش ہوں گے تو کمزور لوگ ان سے کہیں گے جو دنیا میں بڑے بنے ہوئے تھے کہ یقینا ہم تمہارے تابع تھے تو کیا تم ہمیں خدا کے عذاب سے بچا سکتے ہو وہ جواب دیں گے اگر اللہ نے ہمیں نجات کی راہ دکھائی ہوتی تو ہم ضرور تمہیں دکھا دیتے اب تو یکسان ہے ہمارے لیے خواہ روئیں، پیٹیں ہم یا صبر کریں ہمارے لیے اب بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔''

بعض مجرم ایسے ہوں گے کہ وہ قیامت کے دن اپنے جرم کا اقرار کرنے سے انکار کریں گے اور کہیں گے کہ ہم نے کوئی جرم کیا ہی نہیں وہ گواہوں کو جھٹلائیں گے اور نامۂ اعمال کو بھی جھوٹ قرار دیں گے اور اپنے بے گناہ ہونے کی قسمیں کھائیں گے۔ جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ۔ ''پھر ان کا فریب اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ وہ کہیں گے اللہ کی قسم جو ہمارا رب ہے ہم مشرک نہ تھے'' یہ لوگ قسمیں کھاکر دل میں سمجھیں گے کہ جس طرح دنیا میں جھوٹ چلتا تھا اب بھی چل جائے گا۔ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيعًا فَيَحْلِفُونَ لَهُ كَمَا يَحْلِفُونَ لَكُمْ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ عَلَى شَيْءٍ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْكَاذِبُونَ o (سورہ المجادلہ: ۱۸) ''جس دن اللہ ان سب کو اٹھائے گا تو وہ اس کے سامنے قسمیں کھائیں گے جس طرح تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں اور گمان کریں گے کہ بے شک وہ کسی چیز پر قائم ہیں سن لو یقینا وہ اصلی جھوٹے ہیں''۔

ان خوفناک مجرموں کے متعلق سورہ یٰس میں فرمایا گیا ہے اَلۡیَوۡمَ نَخۡتِمُ عَلٰۤی اَفۡوَاهِهِمۡ وَتُكَلِّمُنَاۤ اَیۡدِیۡهِمۡ وَتَشۡهَدُ اَرۡجُلُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا یَكۡسِبُوۡنَ۝(یٰس:٦٥) ''آج ہم ان کے مونہوں پر مہر لگادیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے باتیں کریں گے اور ان کے پاؤں اس کی گواہی دیں گے جو وہ کرتے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ایک ایسا ہی مجرم پیش کیا جائے گا جو اپنے گناہوں سے انکار کرے گا اور اس کے انکار کی صورت میں اُس کے ہاتھ اور پاؤں گواہی دیں گے کہ اُس نے دنیا میں رہ کر ہم سے کیا کام لیا۔

اس سلسلے میں اَنس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے کہ آپؐ اچانک ہنس دئے اور فرمایا ''جانتے ہو میں کس بات پر ہنسا ہوں؟'' ہم نے کہا اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیںتو آپؐ نے فرمایا میں بندے کی اپنے رب سے گفتگو پر ہنسا ہوں جو وہ قیامت کے دن کرے گا۔ وہ کہے گا ''اے میرے رب کیا تم مجھے ظلم سے پناہ نہیں دے چکا'' رب فرمائے گا کیوں نہیں؟ وہ کہے گا ''میں اپنے سوا کسی گواہ کی گواہی اپنے خلاف منظور نہیں کروں گا (میرا بدن اپنا ہے باقی سب میرے دشمن ہیں)'' اللہ تعالیٰ فرمائے گا آج تیری ذات ہی تیرے خلاف بطور گواہ کافی ہے۔ چنانچہ اس کے منہ پر مہر لگادی جائے گی اور اُس کے جسم کے اعضا سے کہا جائے گا 'بولو' تو اس کے سارے اعضا بول کر بتائیں گے کہ اس شخص نے ہم سے کون کون سے کام کرائے۔ پھر اسے جب بولنے کی اجازت دی جائے گی تو اپنے اعضا سے کہے گا ''تمہارا ستیاناس ہو اور تم مجھ سے دور ہوجاؤ میں تو تمہارا ہی دفاع کررہا تھا لیکن تم نے اپنے خلاف خود گواہی دی۔

خاندانوں کی روزمرہ زندگی میں شیطانی عمل دخل کا اہم رول ہوتا ہے وہ خاندانوں اور برادریوں میں پھوٹ ڈالتا رہتا ہے۔ بھائی کو بھائی سے لڑاتا ہے اور باپ بیٹے، بہن بھائی اور میاں بیوی میں فساد ڈالتا رہتا ہے۔ خاص طور پر میاں بیوی کی زندگی میں رخنہ ڈالنا شیطان کا پسندیدہ ترین مشغلہ ہے اسے جب کسی جوڑے کی ازدواجی زندگی کے پرامن ماحول کی اطلاع ملتی ہے تو وہ فوراً اس فکر میں بتلا ہوجاتا ہے کہ کب اور کس طرح اس پُرامن ازدواجی زندگی میں رخنہ ڈالکر اسے ناکام بنادے۔ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب شیطان اپنے کارندوں کو لوگوں میں وسوسہ ڈالنے اور فتنہ وفساد برپا کرنے کے لیے بھیجتا ہے تو واپس آکر ہر ایک کارندہ اپنی رپورٹ پیش کرتا ہے۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ہر ایک نے جب اپنی اپنی رپورٹ پیش کی تو کسی نہ کہا کہ میں نے ایک برادری میں فتنہ ڈال کر ان کو آپس میں لڑوایا یہاں تک کہ انہوں نے قتل کیا۔ کسی نے کہا کہ میں نے ایک بستی کے لوگوں کو بے حیائی کی تعلیم دی یہاں تک کہ وہ بدکاریوں پر اتر آئے۔ اس طرح سے ہر کوئی کارندہ آتا اور اپنے کام کی رپورٹ پیش کرکے بیٹھ جاتا آخر میں ایک کارندہ آیا جس نے اپنی کہانی یوں سنائی کہ میں نے ایک میاں بیوی کی خوشحال اور باوقار زندگی میں اس طرح کا فساد ڈالا کہ وہ ایک دوسرے سے جدا ہوگئے یہ خبر سن کر شیطان اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس طرح کی خبر دینے والے کو گلے لگایا اور شاباشی دے کر کہا کہ تم نے ایک ایسا کام کیا جو قابل تعریف اور قابل التفات ہے۔

یش لظ

یش لفظ

دیباچہ

دیباچہ

دیباچہ

دیباچہ

دیباچہ

دیباچہ

دیباچہ

دیباچہ

مقدمہ

مقدمہ

مقدمہ

مقدمہ

مقدمہ

مقدمہ

مقدمہ

سورة الفاتحة

سورة الفاتحة

سورة الفاتحة

سورة الفاتحة

سورة الفاتحة

سورة الفاتحة

سورة الفاتحة

سورة الفاتحة

سورة الفاتحة

سورة الفاتحة

سورة الفاتحة

سورة الفاتحة

سورة الفاتحة

سورة الفاتحة

سورة الفاتحة

سورة الفاتحة

سورة الفاتحة

سورة الفاتحة

سورة الفاتحة

سورة الفاتحة

سورة الفاتحة

سورة الفاتحة

سورة الفاتحة

سورة الفاتحة

سورة الفاتحة

سورة الفاتحة

سورة الفاتحة

سورة الفاتحة

سورة الفاتحة

سورة الفاتحة

سورة الفاتحة

سورة الفاتحة

سورة الفاتحة

سورة الفاتحة

سورة الفاتحة

سورة الفاتحة

سورة الفاتحة

سورة الفاتحة

سورة الفاتحة

سورة الفاتحة

سورة الفاتحة

سورة الفاتحة

سورۃ الفاتحۃ

سورۃ الفاتحۃ

سورۃ الفاتحۃ

سورۃ الفاتحۃ

سورۃ الفاتحۃ

سورۃ الفاتحۃ

پارہ عم ایک نظر میں

پارہ عم ایک نظر میں

پارہ عم ایک نظر میں

پارہ عم ایک نظر میں

پارہ عم ایک نظر میں

پارہ عم ایک نظر میں

پارہ عم ایک نظر میں

٧٨: سورة النباء
٧٨: سورة النباء
٧٨: سورة النباء
٧٨: سورة النباء
٧٨: سورة النباء
٧٨: سورة النباء
٧٨: سورة النباء
٧٨: سورة النباء
٧٨: سورة النباء

٧٨: سورة النباء
٧٨: سورة النباء
٧٨: سورة النباء
٧٨: سورة النباء
٧٨: سورة النباء
٧٨: سورة النباء
٧٨: سورة النباء
٧٨: سورة النباء
٧٨: سورة النباء
٧٨: سورة النباء
٧٨: سورة النباء
٧٨: سورة النباء
٧٨: سورة النباء

٧٨: سورة النباء
٧٨: سورة النباء
٧٨: سورة النباء
٧٨: سورة النباء
٧٨: سورة النباء
٧٨: سورة النباء
٧٨: سورة النباء
٧٨: سورة النباء
٧٨: سورة النباء
٧٨: سورة النباء
٧٨: سورة النباء
٧٨: سورة النباء
٧٨: سورة النباء

٧٨: سورة النباء

٧٨: سورة النباء

٧٨: سورة النباء

٧٩: سورة النازعات

٧٩: سورة النازعات

٧٩: سورة النازعات

٧٩: سورة النازعات

٧٩: سورة النازعات

٧٩: سورة النازعات

٧٩: سورة النازعات

٧٩: سورة النازعات

٧٩: سورة النازعات

٧٩: سورة النازعات

٧٩: سورة النازعات

٧٩: سورة النازعات

٧٩: سورة النازعات

٧٩: سورة النازعات

٧٩: سورة النازعات

٧٩: سورة النازعات

٧٩: سورة النازعات

٧٩: سورة النازعات

٧٩: سورة النازعات

٧٩: سورة النازعات

٧٩: سورة النازعات

٧٩: سورة النازعات

٧٩: سورة النازعات

٧٩: سورة النازعات

٧٩: سورة النازعات

٧٩: سورة النازعات

٧٩: سورة النازعات

٧٩: سورة النازعات

٧٩: سورة النازعات

٧٩: سورة النازعات

٧٩: سورة النازعات

٧٩: سورة النازعات

٧٩: سورة النازعات

٧٩: سورة النازعات

٧٩: سورة النازعات

٧٩: سورة النازعات

۸۰: سوره عَبَسَ

۸۰: سوره عَبَسَ

۸۰: سوره عَبَسَ

۸۰: سوره عَبَسَ

۸۰: سوره عَبَسَ

۸۰: سوره عَبَسَ

۸۰: سوره عَبَسَ

۸۰: سوره عَبَسَ

۸۰: سوره عَبَسَ

۸۰: سوره عَبَسَ

۸۰: سوره عَبَسَ

۸۰: سوره عَبَسَ

۸۰: سوره عَبَسَ

۸۰: سوره عَبَسَ

۸۰: سوره عَبَسَ

۸۰: سوره عَبَسَ

۸۰: سوره عَبَسَ

۸۰: سوره عَبَسَ

۸۰: سوره عَبَسَ

۸۰: سوره عَبَسَ

۸۰: سوره عَبَسَ

۸۰: سوره عَبَسَ

۸۰: سوره عَبَسَ

۸۰: سوره عَبَسَ

۸۰: سوره عَبَسَ

۸۰: سوره عَبَسَ

۸۰: سوره عَبَسَ

۸۰: سوره عَبَسَ

۸۰: سوره عَبَسَ

۸۱: سورة التكوير

۸۱: سورة التكوير

۸۱: سورة التكوير

۸۱: سورة التكوير

۸۱: سورة التكوير

۸۱: سورة التكوير

۸۱: سورة التكوير

۸۱: سورة التكوير

۸۱: سورة التكوير

۸۱: سورة التكوير

۸۱: سورة التكوير

۸۱: سورة التكوير

۸۱: سورة التكوير

٨١: سورة التكوير

٨١: سورة التكوير

٨١: سورة التكوير

٨١: سورة التكوير

٨١: سورة التكوير

٨١: سورة التكوير

٨١: سورة التكوير

٨١: سورة التكوير

٨١: سورة التكوير

٨١: سورة التكوير

٨١: سورة التكوير

٨١: سورة التكوير

٨٢: سورة الانفطار

٨٢: سورة الانفطار

٨٢: سورة الانفطار

٨٢: سورة الانفطار

٨٢: سورة الانفطار

٨٢: سورة الانفطار

٨٢: سورة الانفطار

٨٢: سورة الانفطار

٨٢: سورة الانفطار

٨٢: سورة الانفطار

٨٢: سورة الانفطار

٨٢: سورة الانفطار

٨٢: سورة الانفطار

٨٢: سورة الانفطار

٨٢: سورة الانفطار

٨٢: سورة الانفطار

٨٢: سورة الانفطار

٨٣: سورة المطففين

٨٣: سورة المطففين

٨٣: سورة المطففين

٨٣: سورة المطففين

٨٣: سورة المطففين

٨٣: سورة المطففين

٨٣: سورة المطففين

٨٣: سورة المطففين

٨٣: سورة المطففين

٨٣: سورة المطففين

٨٣: سورة المطففين

٨٣: سورة المطففين

٨٣: سورة المطففين

٨٣: سورة المطففين

٨٣: سورة المطففين

٨٣: سورة المطففين

٨٣: سورة المطففين

٨٣: سورة المطففين

٨٣: سورة المطففين

٨٣: سورة المطففين

٨٣: سورة المطففين

٨٤: سورة الانشقاق

٨٤: سورة الانشقاق

٨٤: سورة الانشقاق

٨٤: سورة الانشقاق

٨٤: سورة الانشقاق

٨٤: سورة الانشقاق

٨٤: سورة الانشقاق

٨٤: سورة الانشقاق

٨٤: سورة الانشقاق

٨٤: سورة الانشقاق

٨٤: سورة الانشقاق

٨٤: سورة الانشقاق

٨٥: سورة البروج

٨٥: سورة البروج

٨٥: سورة البروج

٨٥: سورة البروج

٨٥: سورة البروج

٨٥: سورة البروج

٨٥: سورة البروج

٨٥: سورة البروج

٨٥: سورة البروج

٨٥: سورة البروج

٨٥: سورة البروج

٨٥: سورة البروج

٨٥: سورة البروج

٨٥: سورة البروج

٨٥: سورة البروج

٨٥: سورة البروج

٨٦: سورة الطَّارق

٨٦: سورة الطَّارق

٨٦: سورة الطَّارق

٨٦: سورة الطَّارق

٨٦: سورة الطَّارق

٨٦: سورة الطَّارق

٨٦: سورة الطَّارق

٨٦: سورة الطَّارق

٨٦: سورة الطَّارق

٨٦: سورة الطَّارق

٨٦: سورة الطَّارق

٨٦: سورة الطَّارق

٨٧: سورة الاعلیٰ

٨٧: سورة الاعلیٰ

٨٧: سورة الاعلیٰ

٨٧: سورة الاعلیٰ

٨٧: سورة الاعلیٰ

٨٧: سورة الاعلیٰ

٨٧: سورة الاعلیٰ

٨٧: سورة الاعلیٰ

٨٧: سورة الاعلیٰ

٨٧: سورة الاعلیٰ

٨٧: سورة الاعلیٰ

٨٧: سورة الاعلیٰ

٨٧: سورة الاعلیٰ

٨٧: سورة الاعلیٰ

٨٧: سورة الاعلیٰ

٨٧: سورة الاعلیٰ

٨٧: سورة الاعلیٰ

٨٧: سورة الاعلیٰ

٨٨: سورة الغاشیہ

٨٨: سورة الغاشیہ

۸۸: سورة الغاشیه
۸۸: سورة الغاشیه
۸۸: سورة الغاشیه
۸۸: سورة الغاشیه
۸۸: سورة الغاشیه
۸۸: سورة الغاشیه
۸۸: سورة الغاشیه
۸۸: سورة الغاشیه
۸۸: سورة الغاشیه
۸۸: سورة الغاشیه
۸۸: سورة الغاشیه
۸۸: سورة الغاشیه
۸۸: سورة الغاشیه

٨٩: سورة الفجر

٨٩: سورة الفجر

٨٩: سورة الفجر

٨٩: سورة الفجر

٨٩: سورة الفجر

٨٩: سورة الفجر

٨٩: سورة الفجر

٨٩: سورة الفجر

٨٩: سورة الفجر

٨٩: سورة الفجر

٨٩: سورة الفجر

٨٩: سورة الفجر

٨٩: سورة الفجر

٨٩: سورة الفجر

٨٩: سورة الفجر

٨٩: سورة الفجر

٨٩: سورة الفجر

٨٩: سورة الفجر

٨٩: سورة الفجر

٨٩: سورة الفجر

٨٩: سورة الفجر

٨٩: سورة الفجر

٨٩: سورة الفجر

٨٩: سورة الفجر

٨٩: سورة الفجر

٨٩: سورة الفجر

٨٩: سورة الفجر

٨٩: سورة الفجر

٨٩: سورة الفجر

٩٠: سورة البلد

٩٠: سورة البلد

٩٠: سورة البلد

٩٠: سورة البلد

٩٠: سورة البلد

٩٠: سورة البلد

٩٠: سورة البلد

٩٠: سورة البلد

٩٠: سورة البلد

٩٠: سورة البلد

٩٠: سورة البلد

٩٠: سورة البلد

٩٠: سورة البلد

٩٠: سورة البلد

٩٠: سورة البلد

٩٠: سورة البلد

٩٠: سورة البلد

٩٠: سورة البلد

٩٠: سورة البلد

٩٠: سورة البلد

٩٠: سورة البلد

٩٠: سورة البلد

٩٠: سورة البلد

٩٠: سورة البلد

٩٠: سورة البلد

٩٠: سورة البلد

٩٠: سورة البلد

٩١: سورة الشمس
٩١: سورة الشمس
٩١: سورة الشمس
٩١: سورة الشمس
٩١: سورة الشمس
٩١: سورة الشمس
٩١: سورة الشمس
٩١: سورة الشمس
٩١: سورة الشمس
٩١: سورة الشمس
٩١: سورة الشمس
٩١: سورة الشمس
٩١: سورة الشمس

٩١: سورة الشمس

٩١: سورة الشمس

٩١: سورة الشمس

٩٢: سورة اللَّيل

٩٢: سورة اللَّيل

٩٢: سورة اللَّيل

٩٢: سورة اللَّيل

٩٢: سورة اللَّيل

٩٢: سورة اللَّيل

٩٢: سورة اللَّيل

٩٢: سورة اللَّيل

٩٢: سورة اللَّيل

٩٢: سورة اَلَيَّل

٩٢: سورة اَلَيَّل

٩٢: سورة اَلَيَّل

٩٢: سورة اَلَيَّل

٩٢: سورة اَلَيَّل

٩٢: سورة اَلَيَّل

٩٢: سورة اَلَيَّل

٩٣: سورة اَلضُّحٰى

٩٣: سورة اَلضُّحٰى

٩٣: سورة اَلضُّحٰى

٩٣: سورة اَلضُّحٰى

٩٣: سورة اَلضُّحٰى

٩٣: سورة اَلضُّحٰى

٩٣: سورة اَلضُّحٰى

٩٣: سورة الضُّحَىٰ

٩٣: سورة الضُّحَىٰ

٩٣: سورة الضُّحَىٰ

٩٣: سورة الضُّحَىٰ

٩٣: سورة الضُّحَىٰ

٩٣: سورة الضُّحَىٰ

٩٣: سورة الضّحٰى

٩٣: سورة اَلضُّحٰى

٩٤: سورة الم نشرح

٩٤: سورة الم نشرح

٩٤: سورة الم نشرح

٩٤: سورة الم نشرح

٩٤: سورة الم نشرح

٩٤: سورة الم نشرح

٩٤: سورة الم نشرح

٩٤: سورة الم نشرح

٩٤: سورة الم نشرح

٩٤: سورة الم نشرح

٩٤: سورة الم نشرح

۹۴: سورة الم نشرح

۹۴: سورة الم نشرح

۹۴: سورة الم نشرح

۹۴: سورة الم نشرح

۹۵: سورة التين

۹۵: سورة التين

۹۵: سورة التين

۹۵: سورة التين

۹۵: سورة التين

۹۵: سورة التين

۹۵: سورة التين

۹۵: سورة التين

٩٥: سورة التين

٩٥: سورة التين

٩٥: سورة التين

٩٦: سورة العلق

٩٦: سورة العلق

٩٦: سورة العلق

٩٦: سورة العلق

٩٦: سورة العلق

٩٦: سورة العلق

٩٦: سورة العلق

٩٦: سورة العلق

٩٦: سورة العلق

٩٦: سورة العلق

٩٦: سورة العلق

٩٦: سورة العلق

٩٦: سورة العلق

٩٦: سورة العلق

٩٦: سورة العلق

٩٦: سورة العلق

٩٦: سورة العلق

٩٦: سورة العلق

٩٧: سورة القدر

٩٧: سورة القدر

٩٧: سورة القدر

٩٧: سورة القدر

۹۷: سورة القدر

۹۷: سورة القدر

۹۸: سورة البينه

۹۸: سورة البينه

۹۸: سورة البينه

۹۸: سورة البينه

۹۸: سورة البينه

۹۸: سورة البينه

۹۸: سورة البينه

۹۸: سورة البينه

۹۸: سورة البينه

۹۸: سورة البينه

۹۸: سورة البينه

۹۸: سورة البينه

٩٨: سورة البينه

٩٨: سورة البينه

٩٨: سورة البينه

٩٨: سورة البينه

٩٨: سورة البينه

٩٨: سورة البينه

٩٩: سورة الزلزال

٩٩: سورة الزلزال

٩٩: سورة الزلزال

٩٩: سورة الزلزال

٩٩: سورة الزلزال

٩٩: سورة الزلزال

۹۹: سورۃ الزلزال

۹۹: سورۃ الزلزال

۹۹: سورۃ الزلزال

۹۹: سورۃ الزلزال

۹۹: سورۃ الزلزال

۹۹: سورۃ الزلزال

۱۰۰: سورۃ العٰدیٰت

۱۰۰: سورۃ العٰدیٰت

۱۰۰: سورۃ العٰدیٰت

۱۰۰: سورۃ العٰدیٰت

۱۰۰: سورۃ العٰدیٰت

۱۰۰: سورۃ العٰدیٰت

۱۰۰: سورۃ العٰدیٰت

١٠٠: سورة العٰديٰت

١٠٠: سورة العٰديٰت

١٠٠: سورة العٰديٰت

١٠٠: سورة العٰديٰت

١٠١: سورة القارعة

١٠١: سورة القارعة

١٠١: سورة القارعة

١٠١: سورة القارعة

١٠١: سورة القارعة

١٠١: سورة القارعة

١٠١: سورة القارعة

١٠٢: سورة التكاثر

١٠٢: سورة التكاثر

١٠٢: سورة التكاثر

١٠٢: سورة التكاثر

١٠٢: سورة التكاثر

١٠٢: سورة التكاثر

١٠٢: سورة التكاثر

١٠٢: سورة التكاثر

١٠٣: سورة العصر

١٠٣: سورة العصر

١٠٣: سورة العصر

١٠٣: سورة العصر

١٠٣: سورة العصر

١٠٣: سورة العصر

١٠٣: سورة العصر

١٠٣: سورة العصر

١٠٣: سورة العصر

١٠٤: سورة الهمزة

١٠٤: سورة الهمزة

١٠٤: سورة الهمزة

١٠٤: سورة الهمزة

١٠٤: سورة الهمزة

١٠٤: سورة الهمزة

١٠٥: سورة الفيل

١٠٥: سورة الفيل

١٠٥: سورة الفيل

١٠٥: سورة الفيل

١٠٥: سورة الفيل

١٠٥: سورة الفيل

١٠٥: سورة الفيل

١٠٥: سورة الفيل

١٠٥: سورة الفيل

١٠٥: سورة الفيل

١٠٥: سورة الفيل

١٠٥: سورة الفيل

١٠٥: سورة الفيل

١٠٦: سورة القريش

١٠٦: سورة القريش

١٠٦: سورة القريش

١٠٦: سورة القريش

١٠٦: سورة القريش

١٠٦: سورة القريش

١٠٦: سورة القريش

١٠٧: سورة الماعون

١٠٧: سورة الماعون

١٠٧: سورة الماعون

١٠٧: سورة الماعون

١٠٧: سورة الماعون

١٠٧: سورة الماعون

١٠٧: سورة الماعون

١٠٧: سورة الماعون

۱۰۷: سورۃ الماعون

١٠٧: سورة الماعون

١٠٧: سورة الماعون

١٠٨: سورة الكوثر

١٠٨: سورة الكوثر

١٠٨: سورة الكوثر

١٠٨: سورة الكوثر

١٠٨: سورة الكوثر

١٠٨: سورة الكوثر

١٠٨: سورة الكوثر

١٠٨: سورة الكوثر

١٠٩: سورة الكافرون

١٠٩: سورة الكافرون

١٠٩: سورة الكافرون

١٠٩: سورة الكافرون

١٠٩: سورة الكافرون

١٠٩: سورة الكافرون

١٠٩: سورة الكافرون

١٠٩: سورة الكافرون

١٠٩: سورة الكافرون

١٠٩: سورة الكافرون

١٠٩: سورة الكافرون

١٠٩: سورة الكافرون

١٠٩: سورة الكافرون

١٠٩: سورة الكافرون

١٠٩: سورة الكافرون

١٠٩: سورة الكافرون

١٠٩: سورة الكافرون

١٠٩: سورة الكافرون

١٠٩: سورة الكافرون

١٠٩: سورة الكافرون

١٠٩: سورة الكافرون

١٠٩: سورة الكافرون

١١٠: سورة النَّصر

١١٠: سورة النَّصر

١١٠: سورة النَّصر

١١٠: سورة النَّصر

١١٠: سورة النَّصر

١١٠: سورة النَّصر

١١٠: سورة النَّصر

١١٠: سورة النَّصر

١١٠: سورة النَّصر

١١٠: سورة النَّصر

١١٠: سورة النَّصر

١١٠: سورة النَّصر

١١١: سورة اللَّهَب

١١١: سورة اللَّهَب

١١١: سورة اللَّهَب

١١١: سورة اللَّهَب

١١١: سورة اللَّهَب

١١١: سورة اللَّهَب

١١١: سورة اللَّهَب

١١١: سورة اَلَّهَب

١١١: سورة اَلَّهَب

١١١: سورة اَلَّهَب

١١١: سورة اَلَّهَب

١١١: سورة اَلَّهَب

١١٢: سورة الاخلاص

١١٢: سورة الاخلاص

١١٢: سورة الاخلاص

١١٢: سورة الاخلاص

١١٢: سورة الاخلاص

١١٢: سورة الاخلاص

١١٢: سورة الاخلاص

۱۱۲: سورة الاخلاص

۱۱۲: سورة الاخلاص

۱۱۲: سورة الاخلاص

۱۱۲: سورة الاخلاص

۱۱۲: سورة الاخلاص

۱۱۲: سورة الاخلاص

۱۱۲: سورة الاخلاص

۱۱۲: سورة الاخلاص

۱۱۲: سورة الاخلاص

معوذتین

معوذتین

معوذتین

معوذتین

معوذتین

معوذتین

معوذتین

معوذتین

معوذتین

معوذتین

معوذتین

معوذتین

معوذتین

معوذتین

معوذتین

معوذتین

معوذتین

معوذتین

معوذتین

معوذتین

معوذتین

معوذتین

معوذتین

معوذتین

معوذتین

معوذتین

معوذتین

معوذتین

۱۱۳: سورۃ الفلق

۱۱۳: سورۃ الفلق

۱۱۳: سورۃ الفلق

١١٣: سورة الفلق

١١٣: سورة الفلق

١١٣: سورة الفلق

١١٣: سورة الفلق

١١٣: سورة الفلق

١١٣: سورة الفلق

١١٣: سورة الفلق

١١٣: سورة الفلق

١١٣: سورة الفلق

١١٣: سورة الفلق

١١٣: سورة الفلق

١١٣: سورة الفلق

١١٣: سورة الفلق

١١٤: سورة النَّاس

١١٤: سورة النَّاس

١١٤: سورة النَّاس

١١٤: سورة النَّاس

١١٤: سورة النَّاس

١١٤: سورة النَّاس

١١٤: سورة النَّاس

١١٤: سورة النَّاس

١١٤: سورة النَّاس

١١٤: سورة النَّاس

١١٤: سورة النَّاس

١١٤: سورة النَّاس

١١٤: سورة النَّاس

١١٤: سورة النَّاس

١٤: سورة النَّاس

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن

جمال القرآن